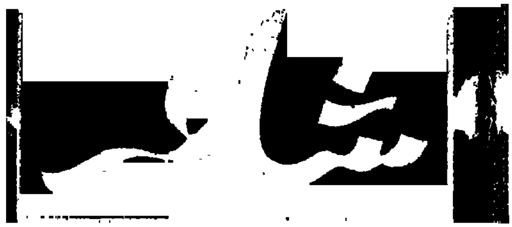
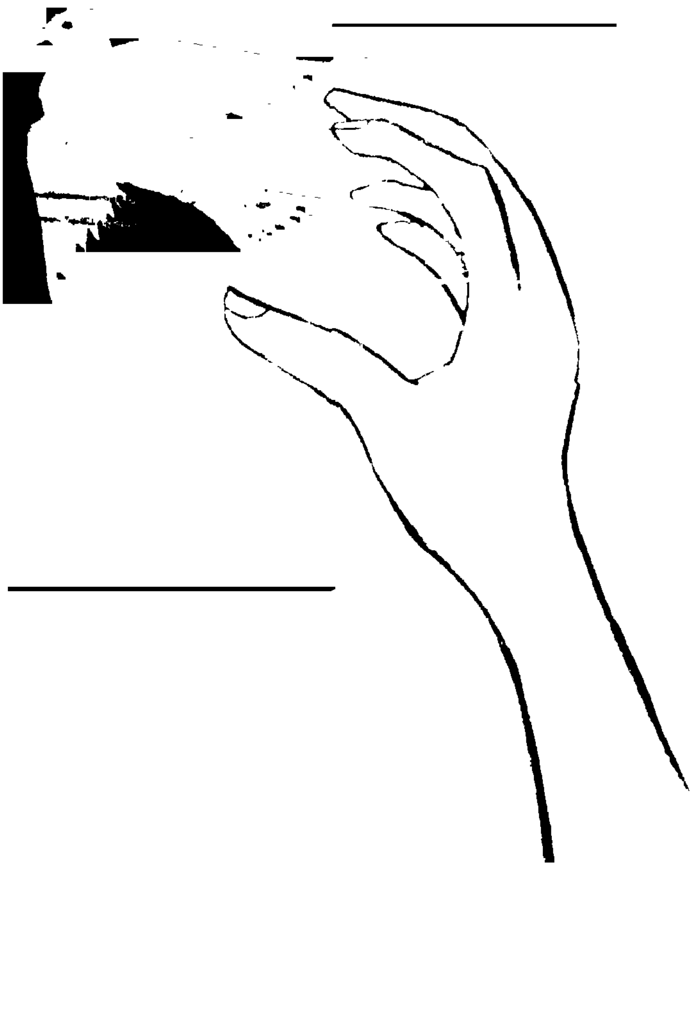




پ: ۱۸۸۰ء آگرہ ◆ **سیماب اکبرآبادی** ◆ م: ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء کراچی

ادیب و شاعرِ مشرق، امام و عالمِ فن
رہے گا تا بہ ابد ہند میں ترا چرچا
نظامِ شام و سحر لاکھ کروٹیں بدلے
نہ کر سکے گا مگر تجھ سا مجتہد پیدا

شیخ عاشق حسین [سیماب] ابن مولانا محمد حسین صدیقی [الفقیر] شاگرد نواب داغ دہلوی۔ ایک نہایت ہی فعال علمی، ادبی اور صحافیانہ زندگی بسر کی۔ پوری زندگی کا احاطہ چند سطروں میں ممکن نہیں۔ حیاتِ سیماب ایک مستقل تحقیقی موضوع ہے۔ اس سلسلے کی دو اہم کتابیں داستانِ چند از راز چاندپوری [۱۹۶۸] ذکرِ سیماب اکبرآبادی [۱۹۸۴] اور ایک کتابچہ سیماب لفظ لفظ از مظہر صدیقی [۱۹۷۹] ان کتابوں سے کچھ سوانحی سلسلے بنتے ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد مضامین [illegible] میں سوانحی اشارے موجود ہیں۔ ذیل میں صرف چند مشہور تصنیفاتِ سیماب کا تحقیقی احوال دیا جا رہا ہے۔ مختلف حوالوں سے سیماب کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصنیفات و تالیفات کی تعداد تقریباً تین سو بنتی ہے۔ ذکرِ سیماب میں ضیا صاحب نے مطبوعہ کتابوں میں نظم کی ۲۲ اور نثر کی ۵۲ کتابوں کی فہرست [illegible] مختلف رسائل و کتب میں سیماب کے مضامین نظم و نثر کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ کئی کتابیں نایاب ہیں۔ ناول، ڈرامے، منظوم تراجم، افسانے، بچوں کا ادب، تذکرے، تنقیدی و تحقیقی مباحث، تبصرے، یادداشتیں، موضوعاتی نظمیں، رباعیاں، قطعات، خطبات اور تاریخی قطعات وغیرہ مختلف النوع مواد کا پھیلاؤ چھوٹی بڑی بیسیوں کتابوں کو محیط کر سکتا ہے، اور یہ اپنے آپ میں ایک تاریخی واقعہ ہے۔

○ **نظم**: نیستاں [اسلامی نظمیں ۱۹۲۳ء] کارِ امروز [نظمیں ۱۹۳۴ء] کلیمِ عجم [غزلیں ۱۹۳۶ء] ساز و آہنگ [نظمیں ۱۹۴۱ء] سرودِ غم [سلام و نوحے ۱۹۴۱ء] کرشن گیتا [سری کرشن سے متعلق نظمیں ۱۹۴۲ء] نفیرِ غم [سلام اور نوحے ۱۹۴۳ء] عالم آشوب [جنگ سے متعلق رباعیات ۱۹۴۳ء] سدرۃ المنتہیٰ [غزلیں ۱۹۴۶ء] شعرِ انقلاب [نظمیں ۱۹۴۷ء] لوحِ محفوظ [غزلیں ۱۹۷۹ء] سازِ حجاز [نعتیں اور سلام، نظمیں ۱۹۸۲ء] الہامِ منظوم [مثنوی مولانا روم کا منظوم ترجمہ ۹ جلدوں میں ۱۹۴۲ء] وحیِ منظوم [قرآن مجید کا مکمل منظوم [illegible]

○ **نثر**: رازِ عروض [۱۹۴۰ء] دستور الاصلاح [اصولِ اصلاح پر پہلی کتاب ۱۹۴۰ء]

شاعر

بانی ملت سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۶۲ واں سال

علمی ادبی تہذیبی ماہنامہ

جلد — ۶۲

شمارہ — ۱

فون: ۳۵۹۹۰۳

مدیر
افتخار امام صدیقی

●

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت :- ۴ روپے

ممالک غیر سے	معاونین سے	تاعمر خریداری
۳۵۰ روپے	۱۰۰ روپے	۱۰۰۰ روپے

لائبریریوں سے	زرِ سالانہ
۶۰ روپے	۵۰ روپے

دفتر: مکتبہ قصر الادب، بمبئی سینٹرل پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۸

فکرِ امروز



شاعر کے لیے اپنی اصلاح کی بھی ضرورت ہے سیرت اور فطرت دو مختلف چیزیں ہیں۔ فطرت کسی خارجی اثر کو قبول نہیں کرتی اور اپنی جگہ ناقابل تبدیل ہوتی ہے مگر سیرت خارجی اثرات کو قبول کر لیتی ہے جس کے ماتحت اس کی تبدیلی کا امکان رہتا ہے۔ جس طرح فطرت پہ داخلی عناصر کا اثر پڑتا ہے اسی طرح سیرت پہ کچھ خارجی عناصر اثر انداز رہتے ہیں۔ شاعر کو ان خارجی عناصر کے ردّ و قبول میں قوتِ انتخاب سے کام لینا چاہیئے اور جو عنصر سیرت پہ برا اثر ڈالے خواہ وہ دوسروں کی نگاہ میں کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو، اس سے متاثر نہ ہونا چاہیئے

[دستور الاصلاح مطبوعہ ۱۹۴۰ء]

(۲)

غالب شناس کالی داس گپتا رضا
کا ایک اور تحقیقی و تنقیدی کارنامہ
غالبیات کے باب میں

غالب

کی

بعض تصانیف کے بارے میں

چند عنوانات

- غالب کی زندگی میں مطبوعات غالب
- دیوان غالب اردو
- پنج آہنگ کے چند اہم نسخے
- مثنوی بیانِ نموداریٔ شانِ نبوت و ولایت
- غالب۔ ارسطو جاہ نسخۂ ارسطو جاہ۔ مہر نیم روز
- غالب کی زندگی میں مہر نیم روز کی اشاعتیں
- دعائے صبح
- اور دیگر چار اہم تحقیقی، تنقیدی مضامین، ایک جامع اشاریہ

خوب صورت سرورق ● دیدہ زیب کتابت و طباعت ● مضبوط جلد

ضخامت ۱۸۴ صفحات ــــ قیمت ۸۰ اسّی روپے

رابطہ:
ساکار پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ
جولی بھون ۱۔ ۱۰ نیو مرین لائنز بمبئی نمبر ۴۰۰۰۲۰

SAKAR
PUBLICATIONS PVT. LTD.
JOLY BHAVAN-1, 10, NEW MARINE LINES
BOMBAY-400 020.

ترتیب

شمارہ نمبر ـ ۱ [جنوری ۱۹۹۱ء] جلد ـ ۶۲

سرورق: لمحہ

عمل: سلطان سبحانی

پہلی بات

صرف آپ کی توجہ کی ضرورت ہے

شاعر کا یہ شمارہ ۱۹۹۱ء کی اشاعت اولین ہے۔ جنوری اور اس کے بعد فروری کے یہ دونوں شمارے شاعر کے متنوع روایتی معیار کی توسیع کریں گے۔ مارچ اور اپریل کے شمارے اپریل کے اواخر یا مئی کے اوائل تک آپ کو مل جائیں گے۔ مئی، جون سے آپ کا محبوب ادبی ماہنامہ وقت پر شائع ہونے لگے گا۔ رسالے کو وقت پر شائع کرنے کی بے انتہا کوششوں کے سبب مجوزہ اقبال نمبر اور ضخیم خاص نمبر کی اشاعتیں التوا میں پڑ گئی ہیں مگر ہمارے لیے یہ ناگزیر تھا کہ رسالہ پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع کیا جائے۔

شاعر کے گزشتہ شمارے میں ہم نے بہت تفصیل کے ساتھ اپنے مصائب و مسائل کا ذکر کیا تھا۔ ہمارے بہت سے قارئین اس طرف متوجہ تو ہوئے تاہم بہت سست روی کے ساتھ۔ ہم مکرر گذارش کر رہے ہیں کہ: اپنا زر سالانہ بروقت ارسال کیجیے۔ اپنے بقایاجات کی فوری ادائیگی کیجیے۔ نئے سالانہ خریدار یا تا عمر خریدار فراہم کیجیے۔ شاعر کے لیے اشتہارات کا اہتمام کیجیے۔ شاعر کا ہر قاری سال میں ایک صفحے کا اشتہار بھی فراہم کروائے تو رسالے کی ریڑھ کی ہڈی مضبوط ہو سکتی ہے۔

شاعر کے کئی موضوعی شمارے زیر ترتیب ہیں۔ مواد و ہیئت کی تبدیلیاں متوقع ہیں۔ کئی نئے ابواب شروع کیے جائیں گے، شاعر کے صفحات میں اضافہ کیا جا رہا ہے تاکہ رسالہ زیادہ سے زیادہ تازہ و زندہ ہو سکے۔ مگر آپ کے تعاون کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں۔

ملک کے موجودہ حالات نے زندگی کے تمام شعبوں کو بے طرح متزلزل کیا ہے کہ عام آدمی کو اپنی سانسیں بے ترتیب معلوم ہونے لگی ہیں۔ شاعر پر بھی اس کے اثرات پڑے ہیں۔ شاعر ایک ادبی رسالہ ہی نہیں ایک بلند قامت ادبی شخصیت بن گیا ہے، اس کا اپنا ایک واضح چہرہ ہے۔ اردو کے تمام تر مسائل میں شاعر کی بقا بھی ایک اہم ترین مسئلہ ہے اور اس مسئلے کا حل ہندوستان کی تمام اردو اکاڈمیوں، اردو کے بڑے اداروں اور بے شمار اردو بولنے والوں کے پاس ہے۔

شاعر کے لیے آپ کے مفید مشوروں اور عملی تعاون کا انتظار رہے گا۔

[ادارہ]

مٹھی بھر غزلیں

وحید اختر



...س دن افق صبح پہ چمکا ترا چہرہ
...ورخا کو ملی اور ضیا ، اور بھی چمکا

...پنے تیرے رکھدیں مرے ہونٹوں پہ جو شمعیں
...زنوں میں مرا کوکب بخت اور بھی چمکا

...سوں میں پہلے ہی سے تھی ہلکی سی شوخی
...ہے پہ جو سہا رنگ تب اور بھی چمکا

...ن بھی تیرے قدموں سے چمکا، یا آنگن
...ب آئی تو نقش کف پا اور بھی چمکا

...س چہرہ ہے پیدا کی پروا نہیں نظر میں
...ہ چہرہ پس ابر ردا اور بھی چمکا

...ب چاند نے چاندنی کو کیا فرش زمیں پر
...تھا ترا اسے مہر لعت اور بھی چمکا

...و سورجوں کو دیکھ کے اک شب ماہ میں ماہتاب
...شا تو سرہند تب اور بھی چمکا

...ولت کیا پاشدگی سے اور ہوئی تیرہ
...کم ہوئی ، فانوس میں تھا اور بھی چمکا

تم بھی کب دیکھتے تھے دیدۂ گریاں کی طرف
اب گلا کیوں ہے کہ ہیں سب لبِ خنداں کی طرف

اہلِ منبر کے دل و چشم بھی رب بستہ نہیں
دل ہے میخانے میں، آنکھیں ہیں نگاراں کی طرف

وہ ہلال اک افقِ رخ پہ ہیں روشن ہر دم
یہ تو دیکھتا ہے ابروئے جاناں کی طرف

ذلت و خاک ہے طوقِ در دولت کا ثمر
رخ ہے آزادی و افغاں کا زنداں کی طرف

دیں بھی، دنیا بھی، حکومت بھی ہیں نشے ہی تو ہم
چھوڑ کر سب کو چلیں حلقۂ زنداں کی طرف

ہے خدا منتقل و زنداں میں بھی لے کعبہ نشیں!
چل کبھی دشتِ عطش، گنجِ شہیداں کی طرف

شہنکوں سے جشنِ چراغاں کا سماں دیکھنے آ
خیمۂ سوختۂ شامِ غریباں کی طرف

صرف اک کوچۂ دل پہلے نکلتا تھا دھواں
اب بہت راستے ہیں شہرِ نگاراں کی طرف

نقشِ پا ہر طرف اتنے تھے کہاں رکھتے قدم
ہم پلٹ کر نہ گئے کوچۂ جاناں کی طرف

تم تو تھے اپنی ہی چشمِ متبسم کے اسیر
ملتفت آج ہو کیوں چاکِ گریباں کی طرف

دیکھو باہر تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے وحید
رخ ہے ہر نور کا خلوت کدۂ جاں کی طرف

● صدر شعبۂ فلسفہ، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ یوپی

کہیں شنوائی نہیں حسن کی محفل کے خلاف
گل نہ کیوں ہنستے رہیں شورِ عنادل کے خلاف

جان و ایماں بھی وہی دشمنِ جان و ایماں
ہم گواہی بھی نہ دیں گے کہیں قاتل کے خلاف

کسی جادے پہ چلو، چھوڑیگی تنہائی نہ ساتھ
قدم اٹھیں تو کدھر عشق کی منزل کے خلاف

بزمِ یاراں ہو کہ ہے نغمہ کہ فیضانِ سخن
سب ہی سازش میں شریک آج کی میرے دل کے خلاف

ہجر میں جی کے بہلنے کے تھے جتنے حیلے
وحشت اک ساتھ رہی ہو گئے سب مل کے خلاف

آنکھیں ملتے ہی سپر ڈال دی، پھینکی تلوار
حربے بیکار ہیں سب چشمِ مقابل کے خلاف

اپنی آغوش میں دم توڑیگی آ کر موجیں
بھاگتی پھرتی ہیں بیکار ہی ساحل کے خلاف

دھار پر تیغ کی لوٹیں گی نگاہیں سب کی
انگلیاں اٹھیں گی محشر میں بھی بسمل کے خلاف

عقلِ دنیا کا تمہیں دعویٰ ہے بے وجہ وحید
دو قدم چل نہیں سکتے کبھی تم دل کے خلاف

دل کا حال عجب ہوتا ہے	پہروں جاگ کے جب سوتا ہے
مفت میں اپنا ہنر کھوتا ہے	بجز خاک میں کیا بوتا ہے
خود پہ ہنسنا سیکھا تھا	اپنے حال پہ کیوں روتا ہے
پھول کھلے ہیں جس دھرتی پر	صدیوں خزاں نے اسے جوتا ہے
بستہ ذہن، آموختہ باتیں	قیدِ قفس میں اک توتا ہے
ابہام و اشکال ہیں باطل	حرفِ حق روشن ہوتا ہے
مفلس کو خوفِ نقصاں کیا	دولت والا ہی کھوتا ہے
جاگیں جس میں سات سمندر	میری آنکھ میں وہ سوتا ہے
تم جاگو تو دنیا جاگے	میں جاگوں، عالم سوتا ہے
قاتل یہ تمغے ہیں تیرے	دامن سے خوں کیوں دھوتا ہے

سادہ حرف غزل بن جائے
کم کو نصیب یہ فن ہوتا ہے

عالم آشوب

افتخار امام صدیقی

فارسی اور اردو میں "شہر آشوب" کو ۹ صدیاں ہو چکی ہیں۔ "شہر آشوب" کے نام سے قدیم ترین مواد مسعود سعد سلمان [م: ۵۱۵ھ] کی ۲۲ فارسی قطعات کا مجموعہ ہے جو ان کے کلیات میں شامل ہے۔ شہر انگیز سے شہر آشوب اور عالم آشوب سے دہر آشوب تک اس طویل ترین سفر میں بے شمار نظمیں کتب و رسائل میں موجود ہیں۔

شہر آشوب اپنی ابتدائی ہیئت میں قطعات و رباعیات، مختصر مثنویوں یا مفرد اشعار کی شکل میں ملتا ہے اور بہ اعتبار موضوع ان میں مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کے حسن اور ان کی دلکش اداؤں کا احوال ملتا ہے۔ اس کے بعد کی شہر آشوب نظموں میں مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کا ذکر ہمدردانہ رنگ یا پھر تضحیک آمیز انداز میں رقم کیا گیا۔ یہ شہر آشوب قصیدہ، مثنوی، مخمس یا مسدس کے فارم میں ہیں۔ یہ شہر آشوب کی معنوی تبدیلیوں میں ایسی نظمیں ملتی ہیں جن میں کسی شہر کی تباہی اور اس شہر کی بدحالی کا بیان کیا گیا ہے، یہ شہر آشوب زیادہ تر مخمس یا مسدس کے فارم میں لکھے گئے تھے۔

اردو میں شہر آشوب کے ذیل میں فرہنگ آصفیہ میں ایک قطعہ امیر خسرو سے منسوب کیا گیا ہے۔ محمد شاکر ناجی نے مخمس کی شکل میں شہر آشوب کہا تھا۔ مشہور ہجو گو پیر خاں کمترین نے ۷ سو اشعار کا ایک طویل شہر آشوب لکھا تھا۔ شاہ حاتم کی دو نظمیں "۱۲ صدی"، "در نایاب زمانہ بیاض" [مولفہ عبدالباری آسی مطبوعہ ۱۹۴۴ء] میں شامل ہیں۔ دونوں نظمیں بہ لحاظِ ہیئت مخمس اور موضوع کے اعتبار سے شہر آشوب ہیں۔ ۱۲ صدی سے مراد بارہویں صدی ہجری ہے جس میں شاہ حاتم کی زندگی گذر رہی تھی۔ اس شہر آشوب کا بنیادی موضوع وہ سماجی انقلاب ہے جو نادر شاہ کے حملے سے وجود میں آ رہا تھا۔

لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی نے "حسبِ حال زمانہ"، کے عنوان سے قصیدے کی ہیئت میں ایک شہر آشوب لکھا۔ میر حسن کے کلیات میں ۱۴ رباعیاں ہیں جن میں مختلف طبقوں کے لڑکوں کا ذکر ملتا ہے جو اپنے ابتدائی مفہوم میں "شہر آشوب" کے ذیل میں آتے ہیں۔ سودا کے دو شہر آشوب قصیدہ اور مخمس کے فارم میں ہیں۔ قصیدہ شہر آشوب ۹۶ شعر کی طویل نظم ہے اس میں اہلِ دہلی کی مفلسی اور اہلِ کمال کی ناقدری اور مختلف پیشوں اور طبقوں کا ذکر ملتا ہے۔ میر تقی میر نے کوئی باقاعدہ شہر آشوب نہیں کہا لیکن ان مخمسوں میں یہاں وہاں شہر آشوب کی جھلک ملتی ہے۔ میر کی غزلوں کے اشعار میں بھی شہر آشوب کا رنگ ملتا ہے۔ قائم چاندپوری نے ۳۵ بند پر مشتمل ایک مخمس شہر آشوب لکھا تھا جس میں ملک کی تباہی و بدحالی کو موضوع بنایا گیا۔ جعفر علی حسرت کا شہر آشوب مخمس "در احوال دہلی" کے عنوان سے ان کے کلیات میں موجود ہے اس میں چالیس بند ہیں۔ راسخ عظیم آبادی نے مثنوی کے فارم میں ایک شہر آشوب کہا جو "مثنوی در بیان انقلاب زمانہ و شکایتِ فلک" کے عنوان سے ہے۔ نظیر اکبر آبادی کا مخمس شہر آشوب ۴۵ بندوں پر مشتمل ہے۔

اردو میں شہر آشوب، غزل اور قصیدے کی ہیئت میں بھی تخلیق کیے گئے لیکن سودا کے عہد میں یہ عام طور پر مخمس ہی کے فارم میں لکھے گئے۔ اس نوع کی نظموں کا ایک مجموعہ منشی تفضل حسین خاں کوکب نے فغان دہلی مطبوعہ احسن المطابع ۱۲۸۰ھ کے عنوان سے مرتب کر کے شائع کیا تھا اس میں بیشتر نظمیں مسدس کے فارم میں ہیں یا پھر قطعات کی شکل میں ملتی ہیں۔

شہر آشوب کے طرز پر عالم آشوب اور دہر آشوب بھی کہے گئے ہیں بقول سید مسعود حسن رضوی ادیب [شہر آشوب کا فن اور موضوع مطبوعہ "نگار" اصناف شاعری نمبر ۱۹۶۷ء کراچی] پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے ایک عالم آشوب ۱۹۲۲ء میں کہی تھی اپنی اس نظم کے بارے میں کیفی مرحوم نے ادیب صاحب کو تحریر کیا تھا:

"یہ نظم شہر آشوباں سے مختلف ہے ان میں اکثر تضحیک یا ایک قسم کی ہجو کا پہلو ہوا کرتا تھا، یہ عین عرضِ حال ہے۔"

یہ عالم آشوب قصیدے کے فارم میں ایک طویل نظم ہے جس میں ہندوستان کے افلاس کو نظم کیا گیا ہے، مختلف طبقوں کی پریشانیوں کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ شہر آشوب کے روایتی مفہوم سے ہٹ کر بعض حصوں میں عالم گیر افلاس کے اسباب وغیرہ کو بھی نظم کیا گیا ہے۔ اس طرح شہر آشوب سے عالم آشوب تک مفہوم و موضوع میں ایک نئی تبدیلی آئی۔ صفی لکھنوی نے اپنی مثنوی تنظیم الحیات [مطبوعہ ۱۹۲۸ء] کے دیباچے میں ۳۱ شعر کا ایک دہر آشوب لکھا جس کا ایک شعر ہے:

اگلوں نے لکھے تھے شہر آشوب — مجھ کو لکھنا ہے دہر آشوب

روایتی مفہوم میں وسعت بیان بھی ملتی ہے۔ شہر آشوب سے عالم آشوب اور دہر آشوب کسی شہر یا ملک کے احوال تک محدود ہے اور سیاسی، سماجی و معاشی تبدیلیوں ہی کو موضوع بنایا گیا۔

علامہ سیماب اکبر آبادی کی ۳۲۷ رباعیوں کا مجموعہ عالم آشوب [اس شعری ترکیب میں فکِ اضافت بھی ہے اور اضافتِ مقلوب بھی]

اُردو شاعری میں ہر اعتبار سے بہت مختلف و منفرد ہے کہ انھوں نے شہر آشوب کے ابتدائی بعد اور مابعد مفہوم و موضوع کو نہ صرف تبدیل کیا بلکہ رباعی کے فارم میں صحیح معنوں میں شہر آشوب کو عالم آشوب بنادیا۔

جنگ کے موضوع پر اُردو میں سرمایۂ نثر و نظم کی کمی نہیں لیکن جنگ کی نفسیات کو موضوع بناکر عالم گیر مسائل پر اتنی بڑی تعداد میں رباعیاں نہیں ملتیں۔ عمر خیام نے شراب کے موضوع پر رباعیاں تخلیق کرکے فنِ رباعی کو بہ لحاظ موضوع و مواد اور شاعری، درجۂ کمال عطا کیا کہ شراب اپنے لغوی معنی سے نکل کر ایک شعری استعارہ بن گئی۔ سیماب نے بھی "جنگ" کو شعری استعارہ بنادیا۔

عالم آشوب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۴ء میں مکتبہ قصر الادب آگرہ سے طبع ہوا تھا۔ چھوٹے سائز چار سو تیس صفحات پر محیط اس شعری مجموعے کا پیش لفظ محمود اکبر آبادی نے تحریر کیا تھا جسے کتاب کے ابتدائی صفحات میں الف تا ع دیا گیا ہے۔ ماہ و سال کی ترتیب کے التزام سے [اواخر مئی ۱۹۴۰ء تا دسمبر ۱۹۴۳ء] اس مجموعے میں ایک تاریخی شان پیدا ہوگئی ہے یعنی جنگِ عالم گیر کا نہایت ہی جامع منظر نامہ تیار ہوگیا ہے۔ ماہنامہ شاعر (آگرہ) میں ۱۵ ماہ یہ رباعیاں شائع ہوئی تھیں۔ عالم آشوب مذکورہ رباعیوں کا ایک خوب صورت انتخاب ہے۔

دوسری عالمی جنگ عظیم کے موضوع پر تخلیق کی گئی ان رباعیوں میں شعری پیش گوئیاں بیشتر پیشین گوئیاں بن گئی تھیں۔ آج اس مجموعے کا تعارف کئی اعتبار سے اہم ہوگیا ہے کہ نصف صدی قبل کی یہ رباعیاں عصری عالمی صورتِ حال کے تناظر میں آج بھی تازہ معلوم ہوتی ہیں۔ عراق و امریکہ کی جنگ اور تیسری عالمی جنگ کے امکانات میں بعض رباعیاں بہ طور پیش گوئی، پیش گوئیاں بن گئی ہیں یا بن جائیں گی۔

بغیر کسی انتخاب کے شاعر میں عالم آشوب کے بعض صفحات کا عکس دیا جارہا ہے یہ کتاب کا صرف ایک اجمالی تعارف ہے، ابھی اس کا شعری، فنی و لسانی جائزہ و تجزیہ ہونا باقی ہے۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع نہیں ہوا تھا۔

شہر آشوب کے فن اور موضوع پر سید مسعود حسن رضوی ادیب کا مبسوط مقالہ اپنے موضوع پر سب سے اہم ماخذ ہے۔ میرے یہاں بیشتر حوالے انھیں کے مقالے سے ماخوذ ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مسعود صاحب نے اُردو کے وہ شہر آشوب جوان کے علم میں آئے انھیں تاریخی ترتیب سے پیش کردیا تاہم سیماب کی عالم آشوب جیسی اہم کتاب کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ ہئیت و موضوع کے تنوع کی یہ ایک قابلِ غور مثال تھی جسے نظر انداز کیا گیا جبکہ اخبار ہمدم (لکھنؤ) کی ۱۳ دسمبر ۱۹۴۶ء کی اشاعت میں ایک کم معروف شاعر "شیریں باسی" کے ۴۴ بند کا مخمس شہر آشوب شائع ہوا تھا مذکورہ مقالے میں اس کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ گیان چند جین صاحب نے اپنی تازہ کتاب "ادبی اصناف" [مطبوعہ گجرات اردو اکاڈمی، ستمبر ۱۹۸۹ء] میں اردو کی اپنی موضوعی اصناف کے ذیل میں صفحہ نمبر ۶ پر "شہر آشوب" کی تعریف بیان کی ہے تاہم وہ اس صنف یا اصطلاح (۹) کی توسیعی شکلوں کا ذکر نہیں کرسکے یعنی "شہر انگیز"، "عالم آشوب" یا "دہر آشوب" وغیرہ۔ ایک اہم ترین اور مستند کتاب میں تمام ممکنہ حوالوں کا اندراج ضروری تھا۔

بقیہ صفحہ ۱۶ بند

"سُنیے" —— میرے قدم رُک گئے۔

"بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔"

میں خاموش رہا، قدرے توقف کے بعد وہ بولا:

"آپ اوروں کی ٹوہ میں نہ رہا کریں، اس کے بجائے آپ اپنا گم شدہ تلاش کریں۔" یہ کہہ کر وہ خلا میں گھورنے لگا۔ گویا میرے بجائے میرے ہمزاد سے مخاطب ہو۔

وہ پھر بولا:

"آپ کی دنیا کی تقریباً تمام عمارتوں میں لفٹ ہے، دُکھ کی بات یہ ہے کہ لفٹ اُوپر ہی کو جاتی ہے" . . . . . وہ خاموش ہوگیا۔

کچھ وقفے کے بعد وہ پھر گویا ہوا۔

"بہت کم لوگ اِس حقیقت سے واقف ہیں کہ ہر عمارت میں ایک تہہ خانہ بھی ہوتا ہے۔ آپ کی عمارت میں بھی ہے۔ اُس کی صفائی کرائیے۔ اُس میں روشنی کیجیے، پھر تہہ خانے میں اُتریئے۔ دیکھیے کہ اُس راستے آپ کہاں پہنچتے ہیں۔"

تشکر آمیز نظروں سے میں نے اُسے آخری بار دیکھا۔ وہ بدستور مسکرائے جارہا تھا۔ پھر میں اُس پُراسرار عمارت کے باہر چلا آیا۔ میرے باہر نکلتے ہی وہ دروازہ بند ہوگیا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے اندر سے دروازے کو مُہر بند کرنے کی آواز سُنائی دینے لگی۔

میں نے اِرد گرد نظر ڈالی تو دیکھا تو باہر کی دُنیا میں وہی لیلا رچی ہوئی ہے۔

عالم آشوب

نغمات جنگ [illegible]

تین سو سے زیادہ انسانی و تاریخی رباعیاں

[illegible]

— مصنف —

سیماب اکبرآبادی

— ناشر —

مکتبہ قصر الادب دفتر شاعر آگرہ

ہر سمت ہے [illegible] کا عالم ہے
[illegible] کا عالم ہے
[illegible] انقلاب [illegible]
[illegible] کا عالم ہے

کیا برق کے سامنے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ارزاں نہ [illegible] قیمت ہوتی
انسان [illegible] ہوتی
[illegible]
اے کاش [illegible] قیمت ہوتی

[illegible] مصیبت [illegible] پیاری ہے
[illegible] دنیا [illegible] ہماری ہے
[illegible]
[illegible] بیماری ہے

پیری میں [illegible] جوانی
[illegible] الفت کا سودا [illegible]
[illegible]
[illegible] دنیا [illegible]

اک شور [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

دونوں کو [illegible] کھیل ٹھیک
[illegible] کھیل ٹھیک
[illegible]
[illegible] کھیل ٹھیک

[illegible] کا حال
[illegible] کا حال
[illegible]
انسان [illegible] دنیا کا حال

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

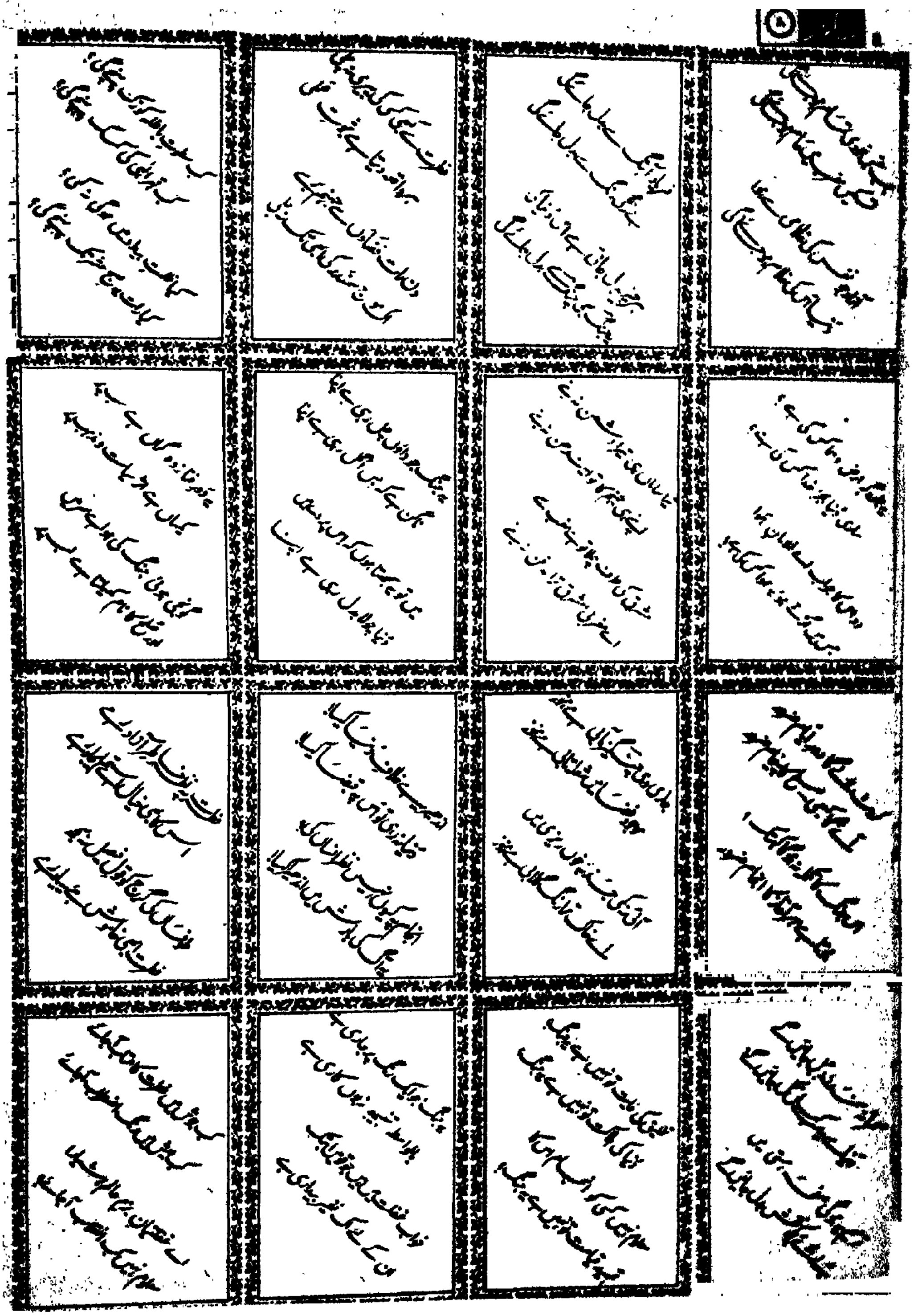
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] ہیں
انسان [illegible] ہیں
[illegible] تہذیب [illegible] ہیں
انسان [illegible] ہیں

[illegible] کردیں
شاید [illegible] کردیں
[illegible]
[illegible] کردیں

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] انتظار [illegible]
انسان [illegible]
[illegible]
[illegible]



[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

تعلق قیامت سے بھی جا ملتی
ہے [illegible] بھی جا ملتی
رہا ہے جو خون سے [illegible]
تیرا [illegible] ہی مل جاتی

گزر چکی [illegible] زمانہ کے
[illegible] ہے جو زمانہ کے
[illegible]
[illegible] کے

[illegible]

[illegible]
[illegible] ہوتا ہے

انسان [illegible] ہو جاتے ہیں
[illegible] دنیا کے ایک ہو جاتے ہیں
وہی انسان سے [illegible]
اور وہ [illegible] ہو جاتے ہیں

دنیا میں کسی کا [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] کمال نہ ملی
[illegible] باقی نہ ملی
[illegible]
[illegible] باقی نہ ملی

[illegible]
[illegible]

[illegible] انسان کی دنیا [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] بھی تو باقی نہ رہا
[illegible] بھی تو باقی نہ رہا
[illegible] باقی
[illegible] بھی تو باقی نہ رہا

ہر حال ہے ایک ارادی قوت
[illegible] ارادی قوت
[illegible]
[illegible] قوت

[illegible]

[illegible]
[illegible]
انسان [illegible]
[illegible] جہاں

[illegible] کی [illegible]
[illegible]
[illegible] کی [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] جہاں سے ملے
[illegible]
[illegible] آسماں [illegible]؟
[illegible]

محبت [illegible] وصل ہو جائے
[illegible] کا وصل ہو جائے
[illegible]
انسان کی زندگی [illegible] ہو جائے

[illegible] ہیں
[illegible] ہیں
[illegible] دنیا [illegible]
[illegible] بھی ہیں

[illegible] دری
[illegible] انسان [illegible] دری
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] جنگ سے [illegible] نہیں
دنیا میں [illegible] رنگ نہیں
[illegible]
[illegible]

[illegible] دنیا ہو
[illegible] آگیا ہو
[illegible]
شاید کوئی پیغام [illegible] آیا ہو

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] پریشاں سے عزیز
انسان [illegible] انساں سے عزیز
[illegible] جنگ [illegible]
[illegible] پریشاں سے عزیز

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

مظہر امام

◆

پھر برگ برگ گل سے جو سر پیکار دیکھنا!
موسم کے ہاتھ میں نئی تلوار دیکھنا
کیا ہے دل کی خاک کو بیکار دیکھنا!
ہے وہ جو کیوں زوال کے آثار دیکھنا
پھر انتساب شوق سے اشعار دیکھنا!
آس کا ذرا سلیقۂ گفتار دیکھنا
اب اس کا وار تجھ پہ بھی خالی نہ جائے گا
میرے لہو میں تر مری تلوار دیکھنا
زخموں کے پھول اتنے طرحدار تو نہ تھے
اب کے صبا چلی ہے تو رفتار دیکھنا!
اس راہ مستقیم پہ دنیا بچھڑ نہ جائے
ہر موڑ پر ضمیر "خبردار!" دیکھنا!
دنیا ہی مقصد تھا کہ گھر چھوڑ کر چلے
مڑ مڑ کے پھر یہ کیوں در و دیوار دیکھنا
یہ منظر بھی خوب ہے اے آمد خزاں!
ہر شاخ گل کو زیر سایۂ دیوار دیکھنا
جیتا ہے نے اتار دیا ہے لباس شب
ہونٹوں پہ انتظار کے اسرار دیکھنا!
اس میں کہیں پہ ہوگی ہماری خبر ضرور
پھر ایک بار آج کا اخبار دیکھنا

◆

ادھر یہ کسی برات کی تھی
یا آہ کا مناجات کی تھی

کیوں تم نے بڑھا دی شمع کی لو!
ہم نے تو سحر کی بات کی تھی!

ہم بزم سے کب کے اٹھ چکے تھے
تشویش تیری ذات کی تھی

کھیلے گئے شان سے بہت ہم
بازی وہ اگرچہ مات کی تھی

معلوم آپ آپ سے پوچھتے ہیں
کل ہم سے کس نے بات کی تھی

اب رات سے صبح کر رہے ہیں
جس طرح سحر سے رات کی تھی

اے جشن فنا: گواہ رہنا
ہم نے بھی کبھی حیات کی تھی!



◆

یہ کیسے موڑ پر وہ ہمسفر ہے
یہ رستہ اب بہت ہی مختصر ہے

تھکن سوئی ہوئی ہے جانے کب سے
شجر کی گود اب تک بے خبر ہے

دیا دہلیز پر اک جل رہا ہے
مگر خالی مکینوں سے یہ گھر ہے

خود اپنے بے طرح ہم تجھ کو چاہیں
ہمارے پاس ایسا بھی ہنر ہے

ہمارے ہاتھ تو کیوں کٹ سے گئے ہیں
یہ کس کا باغ ہے، کیسا ثمر ہے!

امیر منزل، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ ۸۴۶۰۰۴



انور قیصر

۱۳۔ اے۔ گل اپارٹمنٹس۔ ۲۴۴ بی، سینٹ انڈریوز روڈ، باندرہ بمبئی۔ ۵۰

مہر بند

میں عرصے سے ہائپر ٹینشن کا شکار تھا۔ دراصل میں عمر کی جس منزل میں تھا اُس منزل پر پہنچ کر لوگوں کو عموماً اس قسم کے عارضے ہو جایا کرتے ہیں، شہر میں رہنے اور سیڈینٹری لائف جینے کا تاوان بھی جزیہ ادا کریں۔!

طبیب نے کئی قسم کے پکوان میرے حق میں مضر قرار دے دیئے تھے، زندگی بھر باقاعدہ علاج جاری رکھنے کا مشورہ دیا تھا، شوقِ عبادت نہ تھا تو پیدا کرنے، نیز میڈی ٹیٹ کرنے کی صلاح بھی دی تھی۔ گرچہ میں موٹر نشین نہ تھا اس کے باوجود مجھ پر صبح کی سیر کی پابندی عائد کر دی گئی تھی۔

گھر سے دو ڈھائی سو قدم کے فاصلے پر سمندر تھا، جس کے کنارے کنارے جنوب سے شمال کو ایک سڑک جاتی تھی۔ سڑک کے انتہائی جنوب میں مچھیروں کی بستی تھی اور شمالی سرے پر مچھیرے تو بستے ہی تھے، لیکن ان کے درمیان مزدور پیشہ افراد بھی اپنے کنبوں سمیت آن بسے تھے۔

میرا معمول تھا کہ فجر سے پہلے میں حوائج ضروریہ سے فارغ ہو جاتا اور فجر ہوتے ہی گھر سے سیر کو نکل پڑتا۔ دو چار چھوٹی چھوٹی گلیوں سے گزر کر میں چند ہی منٹوں میں سمندر کے کنارے پہنچ جاتا۔ چند لوگ جو مجھ سے عمر میں بڑے تھے حسبِ معمول وہاں موجود ہوتے اور اپنے اپنے اشغال میں مشغول۔ کوئی پدما آسن جمائے گیان دھیان میں محو ہوتا، کوئی پی ٹی ورزشیں کرتا، تو کوئی چرانایام کے ذریعہ سوانس بھرنے اور چھوڑنے کی مشق کرتا۔ دو چار رفقا بھی اپنے فرائض سے اس وقت تک فارغ ہو چکے ہوتے، لہٰذا بنچوں پہ بیٹھے وہ خوش گپیاں کیا کرتے۔

لیکن وہ، اُن سبھوں سے قطعی بالکل الگ تھلگ بیٹھا سمندر کو ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتا۔ میں جانتا تھا کہ نظریں تو اُس کی اُفق میں گڑی ہیں، لیکن ذہن کہیں اور غلطاں و پیچاں ہے۔ جسم موجود ہے مگر روح عالمِ دیگراں کی سیر کر رہی ہے۔

میں اکثر اُسی کے متعلق سوچا کرتا۔ اُس دو ڈھائی کیلو میٹر لمبی سڑک کے شمالی سرے تک جا پہنچتا اور لوٹ کر تقریباً گھنٹے بھر بعد پھر اُسی مقام پر آتا، تو اُسے وہاں جوں کا توں بیٹھا پاتا۔ مجھے لگتا کہ فریم تصویر سے خالی ہو چکا ہے اور منظر کس قدر اجڑا اجڑا سا لگ رہا ہے۔ گھر لوٹتے ہوئے بھی میں اُسی کے متعلق سوچتا۔ کہاں گیا ہوگا؟ اگر اپنے گھر گیا ہے، تو اس کا گھر کہاں ہے؟ کیا اسی علاقے میں۔ کس عمارت میں رہتا ہوگا؟ یہاں پر تو سینکڑوں چھوٹی بڑی عمارتیں ہیں۔ یہ تنہا رہتا ہے، یا اپنے کنبے کے ساتھ؟ کیا کرتا ہوگا یہ دن بھر؟ اخبار تو بھی پڑھتے ہیں، اس کی عمر کے لوگ تو اشتہار بھی نہیں چھوڑتے . . . یہ کم خور ہے یا بسیار خور؟ اپنے حلیے سے تو بلا کا ڈسپلنڈ آدمی لگتا ہے۔ چست اور پھرتیلا۔ اسے گھر کے بچوں کو پارک میں لے جانا تو نہیں پڑتا؟ اسکول کے دیئے ہوئے ہوم ورک میں کیا بچے اُن کا ہاتھ بٹاتا ہے؟ شام میں ٹی وی پر وگرام ضرور دیکھتا ہوگا، اس کا پسندیدہ سیریل کون سا ہے؟ کہیں اسے شام ڈھلے چراغ جلانے کی لت تو نہیں؟ دو ڈھائی پیگ لینے کے بعد اس کے ذہن میں کیسے کیسے رومانی خیال آتے ہوں گے؟ بچپن کی شرارتیں، جوانی کی لغزشیں اور سچے جھوٹے عشق کے واقعے یاد کر کے یہ مسکرا دیا کرتا ہوگا۔ اسے کلاسیکل سنگیت پسند ہے یا انسٹرومینٹل، کون ہے اُس کا پسندیدہ کلاکار؟ سونے سے پہلے کیا اس کے رشتے دار اسے دن بھر کی روداد سناتے ہوں گے؟ کیا آپس میں سماجی اور سیاسی مسئلوں پہ بات چیت کرتے ہوں گے؟ اُن کے افکار یقیناً جدا ہوں گے تاہم گھر کا بزرگ ہونے کے ناطے سبھوں کو اس کے نظریے سے اتفاق کرنا پڑتا ہوگا۔!

یہ اور ایسے سینکڑوں خیالات اُس کے متعلق میرے ذہن میں آتے۔ کبھی میں اُن سے لطف اندوز ہوتا تو کبھی ڈسٹرب۔

عرصہ ہوا میں بھول چکا تھا کہ طبیب نے ہائپر ٹینشن سے راحت پانے کی غرض سے مجھ پر صبح کی سیر فرض قرار دی تھی مگر اب تو میں اُسی شخص کی دید کا اشتیاق لے کر گھر سے نکلا کرتا تھا، جوں ہی میں اُسے بنچ پر بیٹھا ہوا دیکھتا، ویسے ہی مجھے قرار آ جاتا۔

ایک روز میں اُس سے کچھ فاصلے پر بچھی ہوئی بنچ پہ جا بیٹھا۔ اُس روز میں تہیہ کر چکا تھا کہ اس شخص کے کل احوال معلوم کیے بنا نہ رہوں گا۔ وہ شخص بیٹھا

سمندر کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ سمندر شانت تھا۔ کافی فاصلے پر ایک لانچ رواں تھا۔ اس کی جانب کوئی موٹر بوٹ دھواں اڑاتی چلی جا رہی تھی۔ چند آبی پرندے چارے کی تلاش میں سمندر پر چکرا رہے تھے اور کبھی کبھار سمندر کی سطح پر غوطہ بھی لگا دیتے تھے۔

میں کسی صورت میں اس کے مخیّلہ فریم میں داخل ہو جانا چاہتا تھا اور اندر جانا چاہتا تھا کہ اس وقت اس فضا کا اس پر کیا اثر ہو رہا ہے۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ میں اس سے رسم و راہ پیدا کرتا، پھر رفتہ رفتہ اس کے متعلق وہ ساری باتیں معلوم کر لیتا جن کے جاننے کا میں مشتاق تھا۔ دوسری ترکیب یہ تھی کہ ایک ملاقاتی کی حیثیت سے اس سے ملتا اور اس کی ڈسپلنڈ لائف کی تعریف میں چند جملے کہنے کے بعد اس کے ذاتی احاطے میں داخل ہونے کی کوشش کرتا۔ لیکن مجھ میں ایسا کوئی قدم اٹھانے کی جرأت نہ تھی لہٰذا میں بنچ پر پہلو بدلتا، اس کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔

اپنے مقررہ وقت پر وہ اطمینان سے اٹھا، پھر اس نے بڑی شردھا سے سوریہ نمسکار کیا۔ غالباً وہ آج کے درشن مکمل کر چکا تھا لہٰذا وہ جنوبی سمت میں واقع مچھیروں کی بستی کو روانہ ہوا۔ اپنے اور اس کے درمیان کچھ فاصلے قائم کر کے میں اس کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ بستی میں چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ وہ جھونپڑوں کے درمیان بنی ہوئی تنگ راہوں سے گزرتا ہوا بستی کے آخری سرے پر چلا گیا تھا۔

بستی کے اس سرے پر پتھریلا ساحل تھا۔ سمندر میں چوں کہ جزر تھا لہٰذا چٹانیں خشک ہو چکی تھیں۔ ایک لمحہ گنوائے بغیر وہ ان پر نپے تلے قدم رکھتا ہوا سمندر کے متوازی آگے بڑھنے لگا۔ اس راستے وہ ایک اور چوڑی سڑک کی سمت چلا جا رہا تھا جو انتہائی جنوب میں ایک ٹیلے تک جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ تین چار منٹوں میں وہ اس سڑک پر پہنچ گیا۔ چوں کہ چٹانیں سیلن زدہ تھیں لہٰذا مجھے ان پر اپنا قدم رکھتے ہوئے خوف محسوس ہوتا تھا۔ دو ایک بار میں پھسلا بھی اور ان کی رگڑ سے اپنی ٹانگ چھلوا بیٹھا۔ اس کے باوجود میں نے تعاقب جاری رکھا اور بالآخر میں بھی اس سڑک پر پہنچ گیا۔

سڑک پر موٹروں کی آمد و رفت نہ ہونے کی بنا پر سڑک ویران پڑی تھی۔ کبھی کبھار کوئی موٹر کسی وحشت زدہ عورت کی طرح چیختی چلاتی تیز رفتاری سے گزر جاتی۔ اکا دکا راہ گیر ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ لیکن اس کا دور دور تک کہیں نام و نشان نہ تھا۔ میں طے نہ کر پا رہا تھا کہ وہ دائیں جانب گیا ہے یا بائیں۔ دل کہتا تھا کہ تو دائیں اور بڑھ، وہ اسی سمت گیا ہے۔ دماغ قدم روکتا تھا۔ اسی کشمکش میں دو ایک منٹ گزر گئے۔ آخرکار میں دل کی آواز پر لبیک کہتا ہوا دائیں جانب چل پڑا۔

قدم تیزی سے اٹھتے چلے جا رہے تھے۔ اپنی غیر معمولی رفتار پر مسرت ہو رہی تھی۔ عرصے تک صبح کی گئی سیر کا فیض مجھے اب مل رہا تھا۔ ایک شخص اچانک مجھے اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ چند لمحوں میں وہ میرے قریب آ گیا۔ میں نے اسے روکا۔ پھر اسے اس آدمی کا حلیہ بتا کر پوچھا کہ کیا اس حلیے کا آدمی راہ میں اسے دکھائی دیا ہے۔ اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور سڑک کے بالکل آخری سرے پر واقع ایک اجڑی ہوئی سی گول عمارت کی جانب اشارہ کرتا ہوا بولا کہ اس نے مذکورہ شخص کو اس عمارت میں داخل ہوتے ہوئے چند منٹ پہلے دیکھا ہے۔ اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا، میں اس مکان کی جانب چل پڑا۔ جوں جوں میں مکان کے قریب ہوتا جاتا تھا، توں توں مکان کی ہیئت واضح ہوتی جاتی تھی۔ مکان بیلن نما تھا اور دو منزلہ تھا۔ پلاستر یا تو اس پر شروع ہی سے کیا نہیں گیا تھا، یا مرورِ زمانہ کے ہاتھوں جھڑ چکا تھا۔ اس کی چھت پر نہ تو کوئی انٹینا تھا، نہ کسی قسم کی کوئی اور فٹنگ۔ اس کی کسی منزل سے کوئی تار باہر کو جھولتا ہوا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کی تقریباً دو درجن کھڑکیوں پر پلائی چڑھا کر انھیں مہر بند کر دیا گیا تھا۔ اسی ترکیب سے عمارت کے متعدد دروازے بھی سیل کر دیے گئے تھے۔

میں نے اپنی حیرت و استعجاب پر قابو رکھتے ہوئے اس پُراسرار عمارت کے دو تین چکر لگائے۔ میری کوشش تھی کہ میں اس عمارت کا کوئی ایسا دروازہ ڈھونڈ نکالوں جو مہر بند نہ ہو اور میں اس راستے سے عمارت میں داخل ہو جاؤں۔

جب میں عمارت کے دو چار چکر لگا چکا تو اچانک مجھے خیال آیا کہ اس راہ گیر نے میری غلط رہنمائی تو نہیں کی اور مجھے مسخرہ بنا کر چلتا بنا۔ جی میں آیا کہ ایک آخری چکر عمارت کے گرد اور لگاؤں اور خوب ٹٹول ٹٹول کر ہر ایک دروازے کو دیکھ لوں۔ اپنی ناکامی کا اعتراف کر لینے سے قبل اپنی تمام تر کوششوں کو بروئے کار لانا کسی حد تک لازمی تھا۔

پہلا، دوسرا، تیسرا، غرض یہ کہ میں نے چھ دروازے دیکھ لیے۔ وہ سب کے سب مکمل طور پر بند تھے۔ بادلِ ناخواستہ میں ساتویں دروازے کو ایک نابینا کی طرح ٹٹولنے لگا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ دروازہ میرے ہاتھ کے دباؤ سے اندر کی طرف کھل گیا۔ اندر اندھیرا تھا، یا کہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا اس کا اندازہ میں فوراً نہ کر سکا۔ میرے حواس معطل ہو چکے تھے اور میری رہنمائی نہیں کر پا رہے تھے۔ اس کے باوجود میں دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔ چند قدم آگے مجھے دھواں چھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ آگے انتہائی کمزور پیلی سی روشنی ہو رہی تھی۔ لہٰذا میری ہمت بندھی۔ میں آگے بڑھا۔ سارے میں ایک ناقابلِ بیان بو سی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی بو جو عرصے تک مکان بند رکھنے سے [illegible]

پیدا ہو جاتی ہے۔ آگے ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی جس پر چادر تانے کوئی سو رہا تھا۔ میں چارپائی کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔ میں نے اُس کمزور میلی سی روشنی میں دیکھا، چارپائی پر ایک جواں سال لڑکا سو رہا ہے۔ رسوئی میں استعمال ہونے والا سامان زمین پر بے ترتیبی سے پڑا ہے۔

میں نے آہستہ سے آواز دی "میاں! آنکھیں کھولو"

لڑکے نے آنکھیں کھول دیں۔ اُس نے دھیمی آواز میں پوچھا "آپ.... آپ کون ہیں؟"

اب میرے لیے اپنا تعارف کرانا مشکل تھا۔ کچھ سوچ کر میں نے کہا "اسی علاقے میں رہتا ہوں، ایک صاحب سے ملنے آیا ہوں"۔

"سوائے میرے اِس عمارت میں اور کوئی نہیں رہتا"

"تمہارے ابا کوئی اور رشتہ دار ــــ؟"

"جی نہیں، میرے والد کا تو عرصہ ہوا انتقال ہو چکا ہے"۔

"اچھا!" میں نے لہجے سے اپنے دُکھ کا اظہار کیا۔

اِس درمیان میں، میں کُرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ کُرسی ایسی تھی کہ جس کا ہتھا اُکھڑ چکا تھا۔ لڑکا بھی اٹھ کر دیوار کے سہارے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔

میں نے پوچھا "اس عمارت میں اندھیرا کیوں ہے، اس کی کھڑکیاں اور دروازے کیوں مُہر بند کر دیے گئے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم، ابا کہتے تھے یہ عمارت شروع ہی سے اسی وضع کی ہے"۔

"مگر اُنھوں نے اِن کھڑکیوں اور دروازوں کو کھولنے کی کوشش نہیں کی؟"

"جی نہیں۔ اُن کا کہنا تھا یہ عمارت جس حال میں ہمیں نصیب ہوئی ہے ہمیں اِسے اُسی حال میں رکھنا چاہیے، ہم کون ہوتے ہیں، اس کی وضع بدلنے والے"۔

"تمہارے والد کا انتقال کب ہوا؟"

"برسوں بیت گئے۔ میں بہت چھوٹا تھا۔ سات، آٹھ سال کا"۔

قدرے توقف کے بعد اُس نے کہا "ایک بات پوچھوں"

"ضرور پوچھو" میں بولا۔

"کہیں آپ کسی شخص کے تعاقب میں تو یہاں نہیں آئے؟"

"کیا!" میں نے انتہائی حیرت کا اظہار کیا۔

"گزشتہ سال میں دو چار افراد کسی ایسے ہی پُراسرار شخص کا سُراغ ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں تک آ جاتے ہیں"۔

"میں اپنی خِفت مٹانے کو بولا "یہ سچ ہے کہ میں ایک شخص کے تعاقب ہی میں یہاں آیا ہوں، لیکن میں نہیں جانتا کہ اب وہ کہاں ہے"۔

اُس نے کہا "وہ جو کوئی بھی ہو، میں اُس کے وجود سے قطعی لاعلم ہوں۔ بہر صورت میرے والد بڑے مُتقی اور پرہیزگار انسان تھے۔ وہ گھنٹوں سمندر کے کنارے بیٹھے یادِ الٰہی میں مشغول رہا کرتے تھے۔ اکثر ان کا توشہ سمندر سے آتا تھا"

"سمندر سے آتا تھا" میں تقریباً چیخ کر بولا... تمہارے والد سمندر کنارے؟

مجھے اپنے حواس معطل ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"تم کہہ رہے تھے کہ اُن کا توشہ سمندر سے آتا تھا۔ تم دِل لگی تو نہیں کر رہے ہو مجھ سے؟"

"ہرگز نہیں۔ جانے کیوں آپ کو میری بات ناقابلِ یقین لگ رہی ہے"۔

اُس کے لہجے سے خفگی عیاں تھی۔ اُس نے پھر کہا:

"آپ نے اب تک میرے طرزِ زندگی پر توجہ ہی نہیں کی۔ میں نے اُس عمارت میں اپنے آپ کو محصور کر لیا ہے۔ میں اس کی حدود سے باہر نہیں جاتا۔ میں نے اس دُنیا کا داخلہ اپنے اُوپر بند کر لیا ہے"۔

"لیکن تمہارے والد نے تو کوئی حصار اپنے گرد نہیں کھینچا تھا۔ ابھی تم کہہ رہے تھے کہ اُن کا تو دُنیا جہاں سے باقاعدہ تال میل تھا"۔

"یقیناً تھا۔ یُوں تو میری بھی رسم و راہ کسی حد تک دُنیا والوں سے تھی۔ ایک روز میں اپنے والد کے ساتھ سمندر کے کنارے بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص بڑی ہیبت کے عالم میں میرے والد کے قریب آیا اور کہنے لگا کہ اس بچے کو اکسپوزر سے بچاؤ، اس پر پردہ چھوڑو۔ والد نے تابڑ توڑ مجھے چادر میں ڈھک لیا اور گود میں لیے گھر آ گئے۔ اس دن کے بعد میں نے اپنی دہلیز کے باہر قدم نہیں رکھا"۔

"تو کیا، تمہارے لیے اب اِس دُنیا میں کوئی کشش باقی نہیں رہی؟"

"قطعی نہیں" اُس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ اُس نے پھر کہا:

"اب یہ دُنیا قطعاً ویسی نہیں رہی۔ آپ ہی بتائیے، آپ کے لیے اِس میں کیا کشش ہے؟"

اس سوال کا مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

وہ مجھے اُلجھن میں ڈال چکا تھا۔ میں کیوں کر اُس کی بات کا یقین کر لیتا۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اس کے اپنے آپ کو اس قدر پُراسرار ظاہر کرنے میں آخر کیا تُک تھی۔ کہیں اشارے کنایوں میں یہ مجھے ڈفر تو نہیں سمجھ رہا تھا۔ یہ مجھ سے کیا توقع رکھتا ہے۔ میں نے پوچھا:

"اِس عمارت میں سدا قید رہنے سے تمہارا جی نہیں گھبراتا؟"

"نہیں جناب! نہ تو میں تحید ہوں، نہ اس عمارت کے حصار میں ہوں شاید آپ کو علم ہو کہ ہر عمارت میں ایک تہہ خانہ ہوتا ہے۔ اس عمارت میں بھی ہے۔ تہہ خانے اگر استعمال میں نہیں رکھے جاتے تو ان میں حشرات الارض بسیرا کرنے لگتے ہیں۔ بابا نے جب مجھے باہر کی دنیا سے پردہ کر لینے کی ہدایت کی تو انھوں نے اُس تہہ خانے سے بھی مجھے واقف کرا دیا۔ انھوں نے یہ بات بھی میرے ذہن نشین کرائی کہ جب کبھی دل گھبرانے لگے یا حبس محسوس ہو تو میں اس تہہ خانے میں اُتر جایا کروں میرا اضطراب کم ہو گا اور میں تازہ دم ہو جایا کروں گا۔"

میں نے پوچھا "تو کیا تم تہہ خانے میں اُترا کرتے ہو؟"

"اکثر کبھی دن میں دو، دو تین تین بار اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ میں وہاں سے سطح پر آتا ہی نہیں۔ دو دو، چار چار روز کے لیے میں وہیں رک جاتا ہوں۔"

مجھے اس لڑکے کی باتیں اب میرے فہم سے بالا ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ اسرار کی تہوں میں چھپا چلا جا رہا تھا۔

میں نے ازراہِ گفت گو کہا "کہاں ہے وہ تہہ خانہ؟"

اُس نے شہادت کی انگلی سے مغربی دیوار میں بنے ہوئے ایک دریچے کی طرف اشارہ کیا،

"اُدھر رہا۔"

میں بولا "کیا میں دیکھ سکتا ہوں؟"

اُس نے کہا "یقیناً۔ پر ذرا ٹھہریئے، میں آپ کو لالٹین لا دوں۔"

وہ آہستہ سے اُٹھا۔ اس نے چارپائی کے نیچے سے لالٹین نکالی۔ اُس کی چمنی صاف کی، اُس کی بتی اونچی کی پھر چولھے کے پاس پڑی ہوئی ماچس سے اُسے روشن کیا۔ لالٹین کے روشن ہوتے ہی سارا کمرہ مجھ پر ایک کتاب کی طرح کھل گیا۔ ہر چیز انتہائی قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ اس کا بستر پاک وصاف تھا۔ تکیے کے غلاف پر نہ کوئی دھبہ نہ چادر پر۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ ناگوار سی بُو اب تازہ پھولوں کی خوشبو میں بدل چکی تھی۔ میں نے اسی روشنی میں دیکھا کہ لڑکے کا چہرہ کمین شیوہ ہے۔ اُس کی آنکھیں بڑی بڑی اور روشن ہیں، ناک ستواں ہے اور پیشانی کشادہ۔ وہ تازہ دھلے ہوئے مشرقی وضع کے کپڑوں میں ملبوس تھا۔

وہ میرے ساتھ ساتھ اُس دریچے تک آیا۔ اُس کی کنڈی کھسکائی، اور دریچہ کھول دیا۔ دریچے کے کھلتے ہی تازہ اور فرحت بخش ہوا کا جھونکا آیا۔ اُس نے لالٹین مجھ کو تھماتے ہوئے کہا: "اسے سنبھالیے اور ذرا احتیاط سے سیڑھیاں اتریئے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ______ آپ کے لوٹنے تک میں چائے دم کر رکھوں گا۔"

مجھے اچانک محسوس ہوا کہ میں کسی بھنور میں آ پڑا ہوں۔ میں کس غرض سے تیر کو نکلا کرتا تھا۔ میں نے اُس شخص میں بلا وجہ دلچسپی لی۔ ایسی کون سی ادا بھا گئی مجھے اُس کی کہ میں اپنا کام دھندا چھوڑ کر اُس کا پتہ ٹھکانا معلوم کرنے پر آمادہ ہوا۔ اب جو اس عمارت میں داخل ہوا ہوں تو وہ شخص تو لاپتہ ہے، اس لڑکے سے رسم و راہ پیدا ہو چکی ہے اور اُس کے موہ میں آ کر ایک تہہ خانے میں، جس میں تاریکی ہی تاریکی ہے۔ اترنے پر کمر بستہ ہوں۔ کیا میں اپنی سوجھ بوجھ کھو چکا ہوں یا میری قوتِ تمیز زائل ہو چکی ہے۔ میں کسی طلسم کا شکار تو نہیں ہوں!؟

لڑکے نے مسکرا کر پوچھا "آپ کس سوچ میں پڑ گئے؟"

"کیا بتاؤں، اپنے اعمال، اپنی حرکات غرضیکہ اپنی زندگی کی بے معنویت کا مجھے اچانک احساس پیدا ہوا ہے۔ میں سراغ رساں ہوں، نہ پچھلے عہد کا کوئی خلیفہ، جو دوسروں کے آلام و مصائب دور کرنے کی خاطر گھر سے نکلا کرتا تھا میری حقیقت اُس بھٹکے ہوئے مسافر کی سی ہے جسے اپنی منزل کا پتا نہیں، نہ ہی اپنے مسکن کا علم تو سبھوں کو ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اُسے اپنے مسکن کو لوٹ جانا چاہیے۔"

میں نے آہستہ سے دریچہ بند کر دیا، چٹخنی چڑھا دی اور نڈھال قدموں سے پھر اُسی کرسی پر آ بیٹھا۔ مجھے پھر خاک لگا۔ اُس کرسی کے دونوں دستے صحیح و سلامت تھے۔ چند منٹوں بعد ہم دونوں نے ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر چائے پی۔ چائے پیتے ہوئے وہ بدستور مسکرائے جا رہا تھا۔ جانے کیوں اُسے مسکراتے دیکھ کر مجھے اُس پر غصّہ نہیں آیا۔ چائے ختم کر کے میں اُٹھا: اچھا میاں، چلتا ہوں، خوش رہو،

یہ بول کر میں نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھا دیا۔ اُس نے جھک کر بڑے تپاک سے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولا "خدا حافظ"

میں عمارت سے باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف چلا تو میں نے دیکھا کہ میں عمارت کے بالکل وسط میں کھڑا ہوں، میرے چاروں طرف دروازے ہی دروازے ہیں پر سبھی دروازے مقفل! میری دشواری کا اندازہ غالباً وہ کر چکا تھا۔

"دائیں سے ساتواں در"

اُس نے مشکل کشائی کی۔ ایک پل گنوائے بغیر میں اُس دروازے تک جا پہنچا۔ جوں ہی دروازے کو میں نے اپنی جانب کھولا، توں ہی دروازہ کھل گیا۔ میں نے الوداعی نظر اُس پر ڈالی اور اُس تہہ خانے پر بھی۔ اس درمیان میں وہ میرے قریب آ چکا تھا، مسکراہٹ بدستور اُس کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔ باہر کی روشنی میں اُس کا چہرہ تازہ گلاب کا سا لگ رہا تھا تیز اس کی آنکھوں سے رحمت ٹپک رہی تھی۔

[باقی صفحہ ۴ پر دیکھیے]



رفعت سروش

رفاقت

ہم اکثر بیٹھے رہتے ہیں
خاموشی کی چادر اوڑھے
آنکھوں میں پڑھتے رہتے ہیں
کچھ مبہم مبہم افسانے
اک عمر میں آکر راز کھلا
مفہوم سے عاری ہوتے ہیں
اکثر فقرے، اکثر باتیں
کیا صوت و صدا کیا لفظ و بیاں
جب روحیں وجد میں آجائیں
ہم دل کی کہانی کہتے ہیں
ہم اکثر بیٹھے رہتے ہیں

● ۲-بی پاکٹ سی سدھارتھ ایکسٹینشن، نئی دھلی

تنہائی کا موسم

اک شجر پر،
اک شگوفہ مسکراتا ہے اکیلا
ایک پتہ،
دیکھتا ہے آئینے میں اپنا چہرہ
ایک چڑیا،
اڑتے اڑتے تھک گئی جب،
خشک ٹہنی پر پروں کو باندھ کر بیٹھی ہوئی ہے
خامشی کا سُر ہے مدھم
آگیا ہے دل میں تنہائی کا موسم

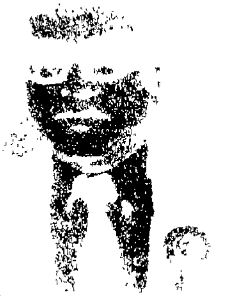


مجاز نوری

دف طرز

لفظ اور معنی کا مسئلہ پرانا ہے
غم کا شاخسانہ ہے
قرضِ زندگی کا ہے ہر نفس کی گردن پر
قرض کو چکانا ہے
وہ جو ہر گھڑی ہم کو یاد آتا رہتا ہے
اس کو بھول جانا ہے
یہ بھی ایک مصیبت ہے بارِ غم نہیں اٹھتا
بارِ غم اٹھانا ہے
وہ بڑا ستمگر ہے دشمنی نبھاتا ہے
دوستی بہانا ہے
آج پھر اسے مجھکو
آزمانا ہے
آیئے میاں نوری آتی جاتی سانسوں کا
کیا بھلا ٹھکانا ہے

● اردو ہاؤس، نور الحسن لین، دربھنگہ ۸۴۶۰۰۴



اسریٰ ارشد

فرحت کلینک، دوائۃ، بہار شریف۔ ۸۰۳۱۰۱ (بہار)

جاتک۔ ایک مختصر جائزہ

چھٹی صدی قبل عیسیٰ کا ہندوستان برہمنوں کے تسلط کا ہندوستان تھا۔ ذات پات کے جھگڑے عام تھے۔ اور اسی تفریق پر ظلم وستم کو جائز تصور کیا گیا تھا۔ رسومات، قاعدے اور ضابطے بے حساب تھے۔ "اپانشد" اور "منوسمرتی" قانون تھے۔ "یگ" کے نام پر دھرم میں کرم کانڈ دکھاوا اور ڈھونگ اپنی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ سنسکرت زبان میں ہندو دھرم تھا۔ عام زبان پالی پراکرت تھی۔ اور سنسکرت صرف برہمن ہی پڑھ سکتے تھے۔ جانوروں کی بلی (قربانی) عام تھی یہاں تک کہ بعض موقعوں پر شودروں کو بھی محض بھگوان کو خوش کرنے کے لئے قربان کر دیا جاتا تھا۔ انسان بکتے تھے۔ ان حالات کے کینوس پر ایک روشنی ابھری نیپال کی ترائی کی ایک ریاست "کپل وستو" میں ایک راج کمار پیدا ہوا اس نوزائیدہ بچے کا نام "سدھارتھ" تھا۔ نہایت ہی عیش وآرام کے ساتھ اس کی زندگی کی نشوونما ہو رہی تھی۔ "سدھارتھ" کے والد راجہ شدھودھن نے اپنے بیٹے کو دنیاوی کاموں میں مصروف رکھنے کی کوشش کی۔ اس کی شادی ایک نہایت حسین شاہزادی "یشودھرا" سے کر دی۔ ایک لڑکا بھی اس کے بطن سے پیدا ہوا۔ جس کا نام راہل رکھا گیا۔ لیکن رشیوں نے پیش گوئی کر دی تھی کہ راجہ سدھارتھ بیراگی ہو جائے گا۔ اور ہوا بھی یہی۔ انسانی تکالیف کے تین نقشے دیکھ کر وہ جنگل کو چل پڑا۔ وہ تھے۔ مریض۔ ضعیف اور مردہ، بڑھاپا، روگ اور موت ان سب پر فتح پانے کیلئے اس نے دنیا تج دی۔ اور فقیر بن گیا۔ پھلگو ندی کے کنارے بودھ گیا میں پیپل کے ایک گھنے درخت کے نیچے بیٹھ کر زبردست تپیا کی اور پھر ایک دن پو پھٹتے پھٹتے اسے گیان کی روشنی مل گئی۔ بودھی مل گئی۔ اس لئے اس کا نام "بودھ" ہو گیا۔

جنگل سے واپس آکر اس نے اپدیش دینا شروع کر دیا۔ اس وقت کے سماج اور اہل پاٹلی کے خلاف سخت ترین مشکلیں درپیش ہوئیں لیکن وہ بودھی علم جہد اور علم کی روشنی کا استعارہ بن گیا۔ یہ تھے گوتم بدھ:

"کوئی چھوٹا بڑا نہیں۔ کوئی اچھا برا نہیں۔ سب کرموں [اعمال] کے پھل ہیں۔ خدا نہیں۔ روح نہیں یہ زندگی ہی زندگی ہے۔ وقت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ اور پھر نروان [نجات] پانے کو دوبارہ نئی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جنم لیتی ہے۔ اچھے کاموں کے لئے اچھی شکلیں اور برے کاموں کے عوض بری شکلیں۔ بدھ میں یقین رکھو۔ سنگھ میں یقین رکھو اور اس کی پاک کتابوں کو مانو۔"

بدھنگ شرنگ گچھامی
دھمنگ شرنگ گچھامی
سنگھنگ شرنگ گچھامی

ان کا اپدیش دینے کا ایک خاص طریقہ تھا۔ کہانیاں کہنا۔ یہ کہانیاں نہایت ہی سبق آموز، دلچسپ اور پر اثر ہوتی تھیں۔ ان کہانیوں کی ایک خاص بات تھی۔ ان کہانیوں میں بودھ اپنی گذشتہ ہوئی زندگی کی باتیں دہراتے اور انکشاف کرتے جاتے کہ کن کن حالات میں انہیں جنم لینا پڑا اور انہوں نے پچھلے جنموں میں کون کون سے کام کئے اور ان کے کیا نتائج ہوئے۔ بودھ کا یہ کہنا کہ زندگی بار بار جنم لیتی ہے ان کہانیوں سے ثابت ہوتا ہے۔ شروع میں یہ کہانیاں صرف اشعار کی شکل میں کہی گئیں جن کو "گاتھا" کہتے ہیں گاتھاؤں کا نام جاتک ہوا۔ وقتاً فوقتاً راہبوں کے علاوہ راجہ اشوک کے بیٹے مہندر اور بیٹی سنگھ مترا کے ساتھ "جاتک کتھا ونّنا" لنکا پہنچا اور سنگھلی زبان میں پہلی بار ان گاتھاؤں پر تشریحی مضامین لکھے گئے۔ سنہ ۴۳۰ء میں بدھ گھوش نے جو ہندوستانی تھے۔ پالی زبان میں ترجمہ کیا۔ پروفیسر "راتھس ڈیوڈس" نے اپنی کتاب "بودھسٹ برتھ اسٹوریز" "BUDDHIST BIRTH STORIES" میں اس واقعہ کو لکھا ہے۔ بدھ گھوش نے کہانیوں کو موجودہ شکل دی۔ اور پالی میں یہ "جاتک"

کے نام سے مشہور ہوئیں۔ "جاتک" کتابیں ایک ہزار برس تک ادھر ادھر گھومتی ہوئی یورپ پہنچیں۔ ۱۸۷۷ء ۔ ۱۸۹۷ء کے درمیان فاسبول نے رومن رسم الخط میں "جاتک" کو چھ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا۔ رائس ڈیوس کی "بودھسٹ برتھ اسٹوریز" ۱۸۸۰ء میں لندن سے شائع ہوئی تھی۔ ۱۸۹۵ء ۔ ۱۹۱۲ء کے درمیان ای۔ بی کوول E.B. COWELL کی ادارت میں "جاتک" کی کہانیاں چھ جلدوں میں چھپیں۔ جس کا ترجمہ آنند کوشلیان نے ہندی میں ۱۹۴۱ء میں چھپوانا شروع کیا۔ سلطنت سیام کی رانیوں نے سیامی زبان میں "جاتک" کو دس جلدوں میں ۱۹۲۵ء میں شائع کیا۔ ایشان چندر کا بنگالی زبان میں "جاتک" بھی کافی مشہور ہے۔ اس کے علاوہ سنگھالی، برمی، چینی، جرمنی اور دوسری یورپی زبانوں میں بھی جاتک ہیں۔ لیکن عربی فارسی اور اردو زبانوں میں اب تک "جاتک" نہیں چھپ سکا ہے۔

۱۹۷۰ء میں میری ملاقات پروفیسر جگدیش کشیپ سے ہوئی۔ وہ نالندہ پالی انسٹی ٹیوٹ کے پروفیسر تھے۔ پروفیسر موصوف اب پراکرت جین انسٹی ٹیوٹ، ویشالی کے ڈائرکٹر ہیں۔ انہوں نے نالندہ میں مجھے "جاتک" کتابیں دکھائیں۔ اردو میں اس کا کہیں تذکرہ نہ ملنے کی وجہ سے میں نے اپنی لاعلمی ظاہر کی۔ اس پر پروفیسر موصوف نے تلقین کی کہ میں اردو میں اس کا ترجمہ کروں۔ کہ اس سے نہ صرف اردو زبان و ادب کی خدمت ہوگی بلکہ بودھ مذہب کے لئے بھی ایک بڑا کام ہوگا۔ اور دنیا اس ترجمے کا خیر مقدم کرے گی۔ لہٰذا میں نے انہیں کی تحریک پر ترجمہ کا کام شروع کر دیا ہے۔ اسی ضمن میں کوول کی کتاب نشانِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور بحمد اللہ "جاتک" کا تعارف آپ کے سامنے ہے۔ میں اہل قلم تو نہیں۔ یہ صرف ایک کوشش ہے ایک ناتمام سعی جسے اس یقین کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے کہ انہیں قبولیت کا درجہ حاصل ہوگا۔

در اصل پالی "تری پٹک" کے کھدک نکائے "خدکا" "جاتک" دسواں "پرشدہ گرنتھ" ہے۔ بودھ مذہب کی متبرک کتابوں کو "تری پٹک" کہتے ہیں۔ ان کتابوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ "ونے پٹک": ۔ اس میں راہبانہ زندگی کے اصول درج ہیں۔ اور سنگھوں کے نظم و نسق کا پورا بیان ہے۔

۲۔ "سُتّ پٹک": ۔ اس میں مہاتما بدھ کے اپدیش پند و نصائح اور جاتک کتھائیں ہیں۔ ان کہانیوں میں بھگوان بدھ کی زندگی اور ماضی میں گزری زندگی کی کہانیاں ہیں۔ اس کے علاوہ گوتم بدھ سے پہلے جو ۲۴ بودھ گذرے ہیں ان کا بھی ذکر ہے۔

۳۔ "ابھی دھم پٹک": ۔ اس میں بھگوان بدھ کے اصولوں کی فلسفیانہ تشریح ہے۔ اور ان کی قدروں کا ذکر ہے۔

یہ اُپاسکوں، عابدوں اور راہبوں کے لئے نشانِ راہ ہے اور عمیق غور و فکر کرنے والوں کیلئے مشعلِ راہ ہے۔

"جاتک" شبد کا ارتھ ہے جنم سمبندھی۔ گوتم بدھ کو "بودھ ستو" سے "بودھ" بننے کے لئے کئی جنم دھارن کرنے پڑے "بودھ" بننے سے پورب [قبل] اپنے سب پچھلے جنموں تتھا انتم [آخری] جنم ان کی سنگیا [حیثیت] "بودھی ستو" رہی۔ بودھی کا ارتھ [معنی] بودھ گیان اور ستو کا ارتھ پرانی [انسان ہوتا ہے] اس لئے "بودھ ستو" کے معنی ہوئے "بودھی گیان" کے لئے پرتن شیل پرانی۔

یعنی "جاتک" لفظ کے معنی ہیں زندگی سے تعلق رکھنے والی چیزیں۔ گوتم بدھ کو بودھی ستو سے "بودھ" بننے کے لئے کئی مرتبہ پیدا ہونا پڑا۔ اور آخری بار "بودھی ستو" کی تھی۔ یعنی وہ انسان جس کو روشنی ملنے والی ہو۔

A CANDIDATE FOR BUDHAHOOD

"جاتک" میں "بودھی ستو" کے پانچ سو سینتالیس [۵۴۷] جنموں کا الیکھ [بیان] ہے۔

مہاتما بدھ جب گیا سے واپس ہوئے تو اسو تک نروان [نجات] پا چکے تھے۔ اور کامل روشنی تھے۔ جہاں جہاں جاتے اپدیش دیتے۔ "جاتک" کی مجموعی تعداد ۵۵۰ یا پانچ سو پچاس ہے۔ برما، سیلون اور سیام میں مشہور ہے۔ لیکن آج کل ہندوستان اور یورپ میں اس کی تعداد ۵۴۷ اور ۵۴۸ بتائی جاتی ہے۔

"جاتک" کہانیاں صرف جاتک ہی میں نہیں بلکہ "سُتّ پٹک" اور "ونے پٹک" کی دوسری کتابوں میں بھی ان کا ذکر پایا جاتا ہے۔ "جاتک" کہانیاں اگر الگ الگ کر دی جائیں تو ان کی تعداد بڑھ سکتی ہے۔ کیوں کہ بعض کہانیوں میں کئی اور کہانیاں بھی ملی ہوئی ہیں۔ ان کی تعداد کچھ کم بھی ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ بعض کہانیاں بالکل ایک جیسی ہیں صرف نام اور مقام بدلے ہوئے ہیں۔ جاتک کی کہانیاں اگر بڑھائی جائیں تو کل تعداد ۳۰۰۰ ہو جائے گی۔

بودھ گھوش نے جو جاتک مرتب کیا ہے اس کا ایک خاص اسلوب ہے۔ اور اسی وجہ سے ہر جگہ یکسانیت پائی جاتی ہے۔ "مثلاً" بہت دن بیت گئے برہمدت راج کرتے تھے۔ اس وقت بودھی ستو .... وغیرہ وغیرہ۔

بھرت سنگھ اپادھیائے کے خیال کے مطابق ہر کہانی مندرجہ ذیل پانچ حصوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

۱۔ پچوپنہ وتھو ۲۔ ایتت وتھو ۳۔ گاتھا ۴۔ ویاکرن یا ایتھہ وتّا اور ۵۔ سموددھان

لیکن کوشیلیہ نے ان کہانیوں کو کوول COWELL کی طرح چار حصوں میں تقسیم کیا ہے

۱۔ پچوپنہ وتھو ۲۔ ایتت وتھو ۳۔ ات وتّا اور ۴۔ سموددھان

مجاہد نے بھی ان کہانیوں کو چار حصوں میں رکھنے کا منصوبہ بنایا ہے:

۱۔ احوالِ حاضر ۲۔ سرگذشتِ ماضی ۳۔ درس و تدریس ۴۔ انکشاف

"پچوپنہ وتھو" کے معنی ہوتے ہیں ورتمان یعنی احوالِ حاضر۔ یعنی وہ واقعات جو بودھ کی زندگی میں گذرے۔ اور جن کی وجہ سے انہوں نے ماضی کے واقعات کو بیان کیا ہے۔ "ایتت وتھو" کو سرگذشتِ ماضی کہنا چاہئے۔ اس میں بھگوان بدھ نے اپنے پچھلے جنم کا ذکر کیا ہے۔ "اتھ وتّا" سے مراد تشریح ہے جس کو تدریس بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس میں گاتھا کی تشریح اور جو کہانی کہی گئی ہے۔ اس سے کیا سبق حاصل ہوا اس کا ذکر ہے۔ "سموددھان" سے یہ مراد ہے کہ جاتک کہانی کی موجودہ زندگی اور ماضی کی زندگی سے کیا تعلق ہے۔ اس کو انکشاف کہنا چاہئے۔

"جاتک" کہانیوں کی جاذبیت، روحانیت، لطافت، فصاحت و بلاغت، تاریخی حیثیت اور ادبی قدر و قیمت اپنی جگہ پر مسلّم ہے۔ اس میں سماجی زندگی کا انکشاف ہے۔ ظاہری طور پر مذہبی رنگ ہے۔ اور باطن میں بودھ کے وقت کے ہندوستان کی سماجی زندگی کی پوری عکاسی ہے۔ اس وقت کی عورتوں اور ان کے اقدار کی صاف جھلک نظر آتی ہے۔ ان کی خوبصورتی، ان کی بے وفائیاں، نوک جھونک اور طنز یہ و مزاحیہ انداز من کو بھاتے ہیں۔ "بودھ کالین بھارت کے سماج" دھرم، رشی منی، بھوگول، لوگ، وشواس، آرتھک ایوم پارک آوستھا ایوم سرؤ سدھارن جیون کی سمگر کی جھلک ہمیں "جاتک" میں ملتی ہے۔"

[یعنی بودھ کے وقت کے ہندوستانی سماج، مذہب، حکومت، جغرافیہ، عام عقیدہ، معاشی اور تجارتی حالت اور عام زندگی کی پوری تصویر ہمیں "جاتک" میں ملتی ہے:]

"جاتک" تو بودھوں کے لئے مذہبی کتاب ہے لیکن ادبِ عالیہ میں بھی "جاتک" کہانیوں کا اپنا ایک ادبی مقام ہے۔

"جاتک" کی کہانیاں ہندوستان کی دیہاتی کہانیوں سے لی گئی ہیں۔ ان کتھاؤں کی شکل عوامی ہے۔ سبھی جاتک کہانیوں کے الگ الگ نام ہیں اور نام ہی سے کہانیوں کے معنی نکل آتے ہیں مثلاً "بکس جاتک" نمبرہ ۲۸ جس میں بچھڑوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ "وراکا جاتک" میں ایک بیوقوف کتے کا ذکر ہے۔ ونٹر نٹز WINTER NITZ نے جاتک کہانیوں کو سات حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ۱۔ روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھنے والی کہانیاں ۲۔ جانوروں کی کہانیاں ۳۔ پرلطف کہانیاں ۴۔ رومانی طویل کہانیاں ۵۔ اصولی کہانیاں ۶۔ چٹکلے ۷۔ مذہبی کہانیاں۔

یہ کہانیاں مکمل طور پر طنز و مزاح سے مملو ہیں۔ ایک جاتک میں کہانی یوں ہے کہ "ایک بندر اپنے جنگل کو چھوڑ کر انسانوں کے درمیان رہنے لگا۔ مگر وہاں چین سکون نہ پا کر پھر اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ ساتھی اسے دیکھ کر فوراً اس سے سوال کرتے ہیں اور وہ ان کے استفسار کا جواب دیتا ہے۔

ایک بندر "بھائی آپ تو انسانوں کے بیچ رہ کر آئے ہیں۔ کچھ ان کے بارے میں بتائیں۔ ہم سننے کے مشتاق ہیں" جواب میں وہ بندر کہتا ہے۔ "انسانوں کے کرتوت مجھ سے نہ پوچھو۔"

پہلا بندر اصرار کرتا ہوا کہتا ہے۔ "کہئے نا ہم سننا چاہتے ہیں۔"

بندر یوں کہنا شروع کرتا ہے۔ "چاندی میری سونا میرا یہی وہ دن رات چلاتے ہیں۔ گھر میں دو جنے رہتے ہیں ایک کو مونچھ ہوتی ہے۔ ایک کو مونچھ نہیں ہوتی۔ اس کے لمبے لمبے بال ہوتے ہیں ناک میں ہیرا اور کان میں چھید ہوتے ہیں۔ انہیں بہت دولت سے خریدا جاتا ہے۔ وہ سب لوگ کو بہت تکلیف دیتا ہے۔" بندر کہہ رہا تھا کہ ساتھیوں نے کان بند کر لئے۔ اور یک زبان ہو کر کہنے لگے۔ مت کہئے! مت کہئے!!"

اس طرح کے سیتے چٹکلے، طنز جاتک میں بہت ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ برہمنوں کی زندگی، ان کی زیادتیاں، کھوکھلا پن اور حرص و ہوس کا بھی کافی ذکر ہے کوول COWELL نے کہا ہے "جاتک کہانیاں بودھ مذہب کا لٹریچر ہونے کے علاوہ اس دور کی عکاسی بھی کرتی ہیں۔"

"THE JATAKAS THEMSELVES ARE OF COURSE INTERESTING AS SPECIMENS OF BUDDHIST LITERATURE; BUT THEIR FORE MOST INTEREST TO US CONSISTS IN THEIR RELATION TO FOLKLORE AND THE LIGHT WHICH THEY OFTEN THROW ON THOSE POPULAR STORIES WHICH ILLUSTRATE SO VIVIDLY THE IDEAS AND SUPERSTITIONS OF THE EARLY TIMES OF CIVILISATION."

بنفے BEN FEY کا خیال ہے کہ ہندوستانی فوک ٹیل لوک کتھا بودھ مذہب کے ماننے والوں کے وقت سے شروع ہوا لیکن جدید تحقیقات نے اب ثابت کر دیا ہے کہ جاتک کہانیاں بذات خود ہندوستانی فوک ٹیل سے لی گئی ہیں۔ بہت سی کہانیاں بدھ کے ظہور سے پہلے ہی دیہاتوں میں رائج تھیں [عام یا پھیلی ہوئی تھیں] ہاں! بودھ نے انکو اپنا رنگ دیا تاکہ عوام تک ان کی ترسیل ہو سکے۔ عوام کی باتوں ہی سے عوام کو سمجھایا۔ بنفے نے "پنچ تنتر" کہانیوں کے پیش نظر اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر ہارٹل DR. HARTEL کی تحقیق کے مطابق "پنچ تنتر" اور جاتک سے کہیں پہلے برہمنی دور میں کہانی کی ایک ایک کتاب سنسکرت زبان میں لکھی گئی تھی۔ جس کا نام "تنتر کھیانے کا" تھا اور زیادہ تر پنچ تنتر کی کہانیاں اسی سے لی گئی ہیں۔ جانوروں کی کہانیوں کو دیکھ کر بنفے نے یہ بھی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ یہ جانوروں کی کہانیاں اے سوپ AESOP کی کہانیوں سے لی گئی ہیں۔ اور یہ کہ ایسوپ کی یہ کہانیاں یونانی ہندوستان لائے تھے۔ لیکن الہ آباد کے نزدیک سبار ہٹ میں پائی گئی مورتیوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ جانوروں کی کہانیاں یورپ سے نہیں لی گئی ہیں۔ کیوں کہ ان مورتیوں کا وجود چار سو برس قبل مسیح ہے۔ جبکہ ایسوپ کی کہانیاں دو سو سال قبل مسیح لکھی گئیں۔

اوپادھیائے کا خیال ہے کہ دنیا کی تمام عظیم کہانیاں جو لوک کتھا یا فوک ٹیل کی شکل میں رہ گئی ہیں۔ وہ سبھی جاتک کی دین ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایسوپ AESOP کی زیادہ تر کہانیوں کا ماخذ جاتک ہے یہی بات الف لیلہ کی کہانیوں کے بارے میں بھی ہیں۔ آٹھویں صدی عیسوی میں عربوں نے یورپ پر حملہ کیا۔ اسپین، اٹلی وغیرہ پر دندنا ڈالا۔ انکے ساتھ ہی جاتک کہانیاں یورپ پہنچ گئیں۔ اور رفتہ رفتہ یورپ کے سارے ادب پر اثر انداز ہوئیں۔ فرانسیسی ادیبوں نے فرنچ زبان و ادب کے فکشن پر جاتک کے اثر کو تسلیم کیا ہے۔ اوپادھیائے جی آگے لکھتے ہیں کہ مہاکشو شیل بھدر یا جی نے ٹھوس مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ منی جاتک [۱۴۰] چودہویں صدی عیسوی ہی میں اٹالین شاعر دانتے کی مشہور تصنیف ڈوائن کامیڈی DEVINE COMMEDY کا محرک بنا۔

گویا کہ جاتک کی کہانیاں بذات خود "تنتر کھانکا" سے لی گئی ہیں اور ان پر بودھ کی قلعی چڑھا کر اکثر کو جاتک کی شکل دے دی گئی ہے۔ جاتک کو راہبوں نے چین، جاپان، مشرقی ایشیا، اور مغربی ایشیا تک پہنچایا اور عربوں نے اسکو یورپ پہنچا دیا۔ ہندوستان سے یورپ اور دنیا کے مختلف حصوں میں جانے والا جاتک، اب از سر نو مغربی ممالک بالخصوص اہل یورپ کے ذریعہ ہندوستان میں داخل ہو رہا ہے۔

ماخذ

1. H.T.F. AND E.J. THOMAS --- JATAK TALES PAGE—1
2. B.S. UPADHYAYA --- PALI SAHITYS ITIHAS PAGE—272
3. B. SHEILBHORYS --- INFULENCE OF BUDDHIST JATAKAS ON THE EUROPEAN LITERATURE
4. C. SANDEYS --- AESOP'S FALBLES
5. E.B. COWELL --- THE JATAKAS_ VOL I._PAGE IX
6. G.D.E --- SIGNIFICANCE AND IMPORTANCE OF JATAKAS PAGE—111X
7. B.A. KAUSHALYA --- JATAKAS_ VOL I PAGE—XI
8. HISTORY OF INDIAN LITERATURE PAGE—125
9. INDIAN HISTORY --- CAREER DIGEST PUBLICATION PAGE—93
10. L. SCHULBERG --- HISTORIC PAGE—57
11. WINTER NITZ --- INDIAN LITERATURE_ VOL I PAGE—113

بقیہ صفحہ ۲۲ مکش جاتک

اژدہا کا تھا:-

نادان دوست سے دانا دشمن بہتر
دیکھو بیٹا چلا مارنے پتھر
پتھر تو نکل بھاگا اڑ کر
باپ کا لیکن ہو گیا دو ٹکڑے سر
یہ جاتک بودھ کی ستو تیکے ہیں اور رشتہ داروں کی اس پر ہیں

جسم کو نذر آتش کر دیا۔

انکشاف:- شاستا [بھگوان بودھ] نے کہا ہے کہ اس طرح قدیم ویدک پیروں کو ماننے کے پھیر میں خود ایک دوسرے کو مار ڈالنے والے انسان موجود تھے۔ یہ اپدیش دے کر انہوں نے جاتک کے راز کا سارا انکشاف کیا۔ یعنی اس وقت کا قتل کرنے والا تاجر میں ہی تھا۔ [یعنی بودھ کو جنم سے پہلے بھگوان بدھ تھے]

ترجمہ کہانی نمبر ۴۴

مکس جاتک

[احوالِ حاضر: بیتو اچیا نیتا... بیوقوف دوست۔
یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب بھگوان بودھ نے مگدھ دیش میں گھومتے گھومتے ایک گاؤں میں بیوقوفوں، جاہلوں اور ناسمجھوں کے بارے میں کہا تھا۔]

بودھ گھومتے گھومتے۔ سراوستی سے چل کر مگدھ کی سرحد میں داخل ہو ایک گاؤں میں قیام کیا۔ اس گاؤں کے اکثر باشی بیوقوف اور ناسمجھ تھے۔ ان ناسمجھوں نے مشورہ کیا کہ جنگل میں کام کرتے وقت ہمیں مچھر بہت تنگ کرتے ہیں کیوں نہ ہم سب لوگ مل کر مچھروں کو مار ڈالیں۔ یہ صلاح کر کے سبھی لوگ تیر و تفنگ لے کر جنگل پہنچ گئے، وہاں پہنچ کر مچھروں کو اپنے تیر کا نشانہ بنایا لیکن مچھر تو مرے نہیں البتہ ان کے تیر آپس ہی میں ایک دوسرے کے جسم میں پیوست ہو گئے، بہت سے لوگ گھائل ہو گئے اور لڑکھڑاتے ہوئے دیہات کے باہر چیختے رہے پھر آ کر زمین پر گر گئے۔ اسی وقت بھگوان بودھ نے اپنے راہبوں کے ساتھ اس گاؤں میں قدم رکھا۔ عاقلوں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ گاؤں کے باہر ایک بڑا سا پنڈال بنایا۔ راہبوں کو کھانا کھلایا اور بھگوان کے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھ گئے۔ بودھ نے جہاں تہاں لوگوں کو گھائل پڑا دیکھ کر دریافت کیا۔ "کیا بات ہے بچو!" میں بہت سے زخمی لوگوں کو ادھر ادھر پڑا دیکھ رہا ہوں۔

- بیٹھتے! [حضور] ان لوگوں نے مچھروں کو ختم کرنے کا ارادہ کیا تھا اور یہ صلاح کی تھی کہ ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں گے۔ لیکن مچھروں کو مارنے کے خاطر یہ لوگ خود ہی گھائل ہو گئے۔"

بودھ نے ارشاد فرمایا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ان لوگوں نے پہلے دور میں بھی مچھروں کو ختم کرنے کے پیچھے ایک انسان ہی کو دنیا سے کوچ کرا دیا تھا۔ ان باتوں کو سن کر عاقلوں کا اشتیاق بڑھا۔ اور بار بار درخواست کرنے لگے حضور اس واقعہ کو بیان فرمائیے۔ ارشاد ہوا ------

سرگذشتِ ماضی:- تو سنو! بہت دن بیتے راجہ برہمدت راج کرتے تھے ان کے دورِ حکومت میں بودھی ستو تجارت سے اپنی گزر اوقات کرتے تھے۔ اس وقت کاشی کے پاس گاؤں میں بہت سے بڑھئی رہتے تھے۔ ایک بڑھا بڑھئی اکثر لکڑیاں پھاڑا کرتا تھا۔ اس کے تانبے جیسے چکنے گنجے سر پر ایک دن ایک مچھر نے خوب زور سے کاٹا۔ جیسے اس پر کسی نے برچھا سے وار کیا ہو وہ بلبلا کر اپنے بیٹے سے بولا "تات! [بیٹا] میرے سر پر مچھر ایسے کاٹ رہا ہے جیسے کوئی بھاری آری چلا رہا ہو۔" "بابو جی صبر کیجئے! ذرا ٹھہریے۔ ہلئے بھی نہیں بس ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کئے دیتا ہوں۔" لڑکے نے کہا۔ اس وقت بودھی ستو بھی اس بڑھئی کے گھر پہنچے ہوئے تھے۔ بڑھئی چلایا! "تات"! اس مچھر نامراد کو جلد ہٹا۔ اف! دیر نہ کر کتنا کاٹ رہا ہے جلدی کر۔" بیٹے نے کلہاڑی لی باپ کی پیٹھ کی طرف دبے پاؤں گیا اور یہ سوچ کر کہ نامراد مچھر کا ابھی کام تمام کرتا ہوں تیز کلہاڑی باپ کے سر پر دے ماری۔ مچھر اڑ گیا۔ سر کے دو ٹکڑے ہو گئے اور بڑھا وہیں ڈھیر ہو گیا۔

"بودھی ستو نے اس کے اس کام کو دیکھ کر سوچا۔ عقل مند دشمن کہیں اچھا ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ یہ سوچ کر کہ میں ماروں گا تو مجھے بھی سزا بھگتنی پڑے گی۔ انسان کو تکلیف دینے سے احتراز کرتا ہے۔ یہی سوچتے سوچتے یہ گاتھا پڑھی

> تدرسیں سیوّیو امیتو نیتا۔ ادپیے تو
> نتّو لو متو متی دپئ ہی تو
> مکسم۔ بدھی سنتی ہی ایے لے موگو
> بتّو تو ابھی وا اتمنگم

ترجمہ:- عقل مند دشمن اچھا ہے۔
بیوقوف دوست اچھا نہیں ہے۔
لائق بیٹے نے، مچھر کو ماروں گا۔
سوچ کر باپ کے سر کو پھاڑ ڈالا۔

[باقی صفحہ ۱۱۴ پر دیکھئے]



ظفر غوری

خواب رنگوں سے بُنی ہے یاد تازہ
دھوپ لکھ لائی مبارک باد تازہ

چشمِ ویراں میں وہ زخمی عکس زندہ
قریہ قریہ اک ستم آباد تازہ

پھر بہا لے جائے گا لاوا لہو کا
سنگِ دل پر گھر کی رکھ بنیاد تازہ

آبِ تازہ خنجرِ خاموش کو دے
ہے بریدہ لب پہ اک فریاد تازہ

بے ستونی پھر اٹھائے سنگِ سر ہے
چاہتی ہے جوئے خوں فرہاد تازہ

بے چراغاں بستیوں کو زندگی دے
اک ستم ایسا بھی کر ایجاد تازہ

آسماں سر پر بھی کیا قائم نہیں ہے!
کچھ تو کہہ لے عقدۂ افتاد تازہ

ایسی سنگینیں چپ کہ دل پھٹنے لگا ہے
کچھ تو لے شعلہ نوا ارشاد تازہ

● ۔۔۔ کالا ستھان، کوٹہ (راجستھان)

کبھی سایہ تو کبھی دھوپ کا منظر بدلے
در و دیوار ہوئے دشت نما گھر بدلے

موسموں نے تو درختوں کو دیے پیراہن
اور ہواؤں نے اڑانوں کیلئے پَر بدلے

اس نے چٹان میں اک پھول کھلایا تو کیا
"پتھروں کو نہ بدلنا تھا نہ پتھر بدلے"

ریگ زاروں میں چلا قافلۂ موجِ حیات
تشنگی! ریت کے صحرا میں سمندر بدلے

اک ترے غم کے اُجالوں کی ردائیں ملجائیں
زندگی جسم کی یہ میلی سی چادر بدلے



مختار تبسم

تمام دن کی مسافتوں کا صلہ ملا ہے
بدن کی ٹوٹی طناب خیمہ اُلٹ گیا ہے

یہ گھر کے دیوار و در کی خاموشیاں بتائیں
ہمارے آنگن میں دھوپ سائے کا کھیل کیا ہے

نہ جانے کس سمت کو ہے اب وہ ہوا کا جھونکا
نہ جانے کن آہٹوں میں گم ہو کے رہ گیا ہے!

اب اسکی تحریر بھی نئے کاٹ عجب طرح کی
اب اسکو میرے تراشنا بھی تو آ گیا ہے

وہ ایک چہرہ جو دشتِ غربت میں یاد آئے
وہ ایک ہالہ سا چاند کے گرد پڑ گیا ہے

وہ ایک خوشبو مشامِ جاں کو نوید ہے جو
وہ عنبریں دستِ یاد کے شانے پہ کھلا ہے

تمام دشتِ حیات میں آرزو کا حاصل
یہ میرے اندر گلاب جیسا جو کھِل رہا ہے

● الیف ۲۰، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کیمپس، اندور (ایم۔پی)

جوگندر پال

۳۳ سنداکنی انکلیو، کالکاجی نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۱۹

خواب رو

قسط نمبر ۱۰

دیوانے مولوی صاحب نواب محل سے کوئی ڈیڑھ فرلانگ کی دوری پر حکیم معز الدین کے مطب میں ان سے گپ شپ اڑا رہے ہیں۔ حکیم معز الدین ان کے پرانے دوست ہیں۔ اور ان کے خالی اوقات میں دونوں دوستوں کے درمیان حکیم معز الدین کی کوئی نہ کوئی نئی طبی دریافت زیر بحث رہتی ہے۔ اور اپنے دوست کو ہمہ تن گوش سنتے ہوئے دیوانے مولوی صاحب کو گمان ہونے لگتا ہے کہ کسی بیماری کی تفصیلات پیش کی جا رہی ہیں۔ ان کی ساری علامتیں ان میں موجود ہیں۔

"خدا کا شکر ہے معز الدین نے اس بیماری کا علاج دریافت کر لیا ہے مگر پہنچ کر ابھی بیگم کو بتایا کرتے ہیں۔" "ورنہ میں انجانے میں ہی مارا جاتا۔"

"میری مانو دیوانے مولوی صاحب۔" ابھی بیگم انہیں چمک کر جواب دیتی ہے۔ "تو اپنے اس کلموہے دوست کی سنگت چھوڑ دو۔ وہ آپ کے سامنے ہر نئی بیماری کی صفات کی گو آمیز کرتا ہے کہ آپ کے منہ میں پانی بھر آتا ہے اور آپ اسے میری سوت بنا کر گھر میں ڈال لیتے ہیں۔"

"ارے بیگم! بڑا قابل حکیم ہے۔ تمہارے بھائی بھی مشکل میں پڑ جائیں تو جھٹ اسی سے مشورہ کرتے ہیں۔"

"بھائی جان کو کیا پڑی ہے کہ اس ادھ پکے حکیم سے مشورہ کرتے پھریں؟" ابھی بیگم سر جھٹک کر کہتی ہے۔ "لیجئے، میں پانی ابال لائی ہوں۔ اب آپ خود ہی معز و حکیم کی دوا اس میں گھولتے رہئے!"

اس وقت دیوانے مولوی صاحب اپنے دوست کے مطب میں انہیں بتا رہے ہیں۔ "بھئی حکیم بادشاہ، نا معلوم ہماری بیگم آپ سے اتنی خفا کیوں رہتی ہیں۔"

"آپ کو نا آپا طلائی کشتے جو کھلاتا رہتا ہوں دیوانے مولوی صاحب۔"

دونوں دوستوں کا قہقہہ ابھی ان کے گلوں میں ہی ہے کہ نواب محل کے اطراف سے ایک فلک شگاف دھماکا ہوتا ہے جسے سن کر دیوانے مولوی صاحب کا رنگ اڑ گیا ہے۔ انہیں دیکھ کر حکیم معز الدین پہلے تو چونک گئے۔ اور پھر انہیں بغور دیکھنے لگے ہیں

اور محسوس کرنے لگے ہیں گویا دھماکے سے پہلے وہ یہیں تھے مگر اب دھماکے کے بعد کہیں اور جا پہنچے ہیں۔

"مولوی صاحب!" حکیم معز الدین صاحب اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب آ گئے ہیں۔ "بیٹھ جائیے۔ آپ کھڑے کیوں ہو گئے ہیں؟" انہوں نے دیوانے مولوی صاحب کو کندھوں سے بہ نہایت نرمی سے داب کر بٹھا دیا ہے "میں آپ کو پانی دیتا ہوں۔"

پانی پی کر دیوانے مولوی صاحب سکتے سے باہر آ گئے ہیں۔ اور گھبراہٹ سے کہنے لگے ہیں "میرا دل ڈول رہا ہے حکیم بادشاہ۔ کوئی بہت بڑا حادثہ رونما ہوا ہے۔"

"حادثہ نہیں مولوی صاحب۔ معلوم ہوتا ہے آج پھر سائنس لوگوں نے اپنا کرتب دکھایا ہے۔"

"دھماکا ادھر سے سنائی دیا ہے نا؟" انہوں نے نواب محل کی طرف اشارہ کیا اور بوکھلا کر پھر کھڑے ہو گئے ہیں۔

"بیٹھ جائیے مولوی صاحب آپ ناحق پریشان ہیں۔" حکیم معز الدین بڑی فکرمندی سے ان کے چہرے کا معائنہ کر رہے ہیں۔ اور شوا کر کیا کچھ پوچھا کر انہیں تشویش سی لاحق ہونے لگی ہے۔ کہ ابھی ابھی وہ صاف اپنے خون میں گردش کرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ مگر اب صرف ان کا خون ان کی رگوں میں گردش کر رہا ہے۔ وہ آپ کہاں چلے گئے۔ پہلے بھی دیوانے اور آپ بھی دیوانے۔ حتیٰ کی نزاکت کے احساس کے باوجود حکیم معز الدین کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ دوڑ گئی ہے۔ اسی لئے تو دیوانے ہیں کہ آگے پیچھے دیوانے ہیں! "اور پانی پئیں گے دیوانے مولوی؟"

"نہیں۔"

"تو پھر اطمینان سے بیٹھ جائیے۔ دھماکے تو اب معمول میں شامل ہو گئے ہیں۔ بس تو اس وقت ہوتے ہیں جب لگنے بند ہو جاتے ہیں۔" حکیم معز الدین

دیوانے مولوی صاحب کو قطعی طور پر جنسی کا نا اہل پا کر ان کے حصے کا بھی ختم سے لگیں۔

"ارے بھئی بیٹھو نا بیٹے، ناگہانی ہے آپ پتھر چلا گا کر کیا پھر کتنے مارے گئے۔"

"نہیں میں چلتا ہوں۔" دیوانے مولوی صاحب نے حکیم معزالدین کی بجائے اپنے آپ سے اجازت طلب کی ہے۔ اور طب یا جنگل کر اتنا زور لگا کے قدم اٹھا رہے ہیں۔ جیسے سامنے کی ہوا انہیں پیچھے دھکیل رہی ہو۔

انہیں وہم سا ہے کہ دھماکہ کہیں نواب محل میں ہی نہ ہوا ہو۔ خدانخواستہ اگر ایسا ہی ہوا۔ تو محل کی چھتیں تو ایک ہی بار گری ہوں گی مگر وہ محل کی دیواروں کو بار بار گرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ اور متوحش بے تحاشہ پن سے آگے پیچھے قدم اٹھاتے ہوئے محل کا رخ کئے ہوئے ہیں۔ ایک دو تو ایک گاڑی کے نیچے آنے سے بال بال بچے ہیں۔ اور وہاں سے ذرا آگے آ کے ایک برقع پوش خاتون سے ٹکرا گئے ہیں۔

"جہنم کا راستہ ادھر کھلا پڑا ہے بڈھے۔" برقع کے پیچھے سے تیز جملہ ہے "ادھر کاہے کو چلے آ رہے ہو؟"

دیوانے مولوی صاحب کو اس پاگل پن میں کچھ سوجھ نہیں رہا ہے۔ اور نواب محل کے قریب پہنچ کر وہ مزید مجذوبانہ حواس ہو کر چلنے لگے ہیں۔ اور خدا رحم کرے دیوانے مولوی صاحب نے دور سے جو کچھ دیکھا ہے۔ اس پر یقین نہ آنے پر آنکھوں پر بار بار زور ڈالا ہے۔ ان کے گھر کو لوگوں کا ایک جم غفیر گھیرے ہوئے ہیں۔!

(۱۱) نواب محل کے پائیں باغ میں پھٹنے والا بم اتنا طاقتور تھا کہ کوئی کہہ رہا تھا یہاں امین آباد میں پھٹا ہے۔ کوئی نذیر آباد میں اور کوئی ماموں کی قبر میں۔ سبھی لکھنؤ والوں کو لگا کہ انہیں کے گرد و نواح میں کہیں دھماکہ ہوا ہے۔ شہر بھر میں کہرام سا مچ گیا۔

جو دھماکے میں کام آ گئے وہ تو کچھ پانے سے رہے۔ سامنے گھر سے نواب مرزا کا ایک لڑکا اور ایک لڑکی بیگی، اور سائیں بابا لڑکا اور لڑکی پائیں باغ میں ہی بہت فاصلے پر لکن چھپن کھیل رہے تھے۔ انہیں کیا خبر، ان کے والدین کو ان کے کھیل میں حصہ لینے کے لئے ایسے چھپیں گے کہ ان سے عمر بھر ملنا نصیب نہ ہوگا۔ سائیں بابا اس لئے بچ گیا کہ واردات کے وقت وہ کافی فاصلے پر سبز ملوں کے باغ میں پودوں کو پانی دینے نکلا ہوا تھا مدد بھاگنے دار۔ سائیں ہاک میں آنے سے پہلے ہی نواب سائیں کو جھنجھوڑ گئی ان کی تیتیاں کھو ایک گئیں سائیں۔ سو کا کر کے پورن کے کھانے پھوٹ کر آرام کر رہے تھے وہ بستر پر لیٹے تھے اور چھوٹی بی بی سائیں ان کا سر دبا رہی تھیں۔ اور ان کے پلنگ پر گڑیا سائیں کہیں کھیلنے کو گئی تھیں۔ انہیں جانے

دے کر میں بڑی بی بی سائیں کے کمرے میں گئی تا کہ ان سے پوچھ لوں، انہیں کچھ چاہیئے۔ عام طور پر دوپہر کے کھانے کے بعد وہ ایک آدھ گھنٹہ سو جاتی ہیں۔ مگر آج میں نے ان کو سجدے میں گرا پایا۔ پتہ نہیں سائیں، دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کے وہ اللہ تعالیٰ سے کیا مانگ رہی تھیں۔ شاید اپنے گھٹنوں کی تکلیف سے نجات کی بھیک۔ میں، انہیں کچھ کہہ کر لئے پیر چلا آیا تا کہ بچیوں کی پیاس بجھا آؤں۔"

پولیس انسپکٹر نے اسے ٹوک کر پوچھا۔ جب دھماکہ ہوا، تم کیا کر رہے تھے؟

"سچ ہی تو بتا رہا ہوں تھانیدار سائیں۔ میں ادھر پودوں کی پیاس بجھا رہا تھا کہ ایک دم دھما۔ دھم سی ہوئی۔ اس کے بعد میں جو ہڑبڑا کے اٹھا تو کیا دیکھتا ہوں، ہمارا خوب صورت محل کا سارا پچھلا حصہ کوڑے کے ڈھیر ڈھیر سا ہو گیا اور جلد میں ہماری بڑی بی بی سائیں۔ چھوٹی بی بی سائیں، اپنی بیٹی اور ہماری شاہ جہاں گڑیا بیٹھے بھی دیکھا تھی وہاں۔"

"اس وقت بابا لوگ کدھر تھے؟" پولیس انسپکٹر نے پوچھا تھا۔

"بابا لوگ؟" سائیں بابا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ "بابا لوگ تو ایک میں ہی بابا سو سائیں، میں تو اپنے باغ میں کام کے پیچھے لگا تھا۔ کدھر جاتا؟"

"نہیں، بچہ لوگ۔ مطلب، دونوں بچے؟" "ہمارا شاہ جہاں سلیم اور شاہ جہاں دل نواز اپنی لکن چھپن بھول کر محل سے تھوڑی دور ایک درخت سے چپکے کھڑے تھے اور جلتے ہیں میں نے کیا دیکھا؟ بچوں کو معلوم نہ تھا کہ ان کے پیروں میں ایک کالا ناگ سارے کام بھول کے ان کی حفاظت کے لئے پھن پھیلائے ہوئے آ بیٹھے۔ تھانیدار۔ سائیں، کالے ناگ نے بھی معصوموں کی نگہبانی کی تھی۔ پھر اللہ میاں نے انہیں یتیم ہونے سے کیوں نہ بچایا؟"

پولیس اپنی کئی دن کی تفتیش کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ مجرم نواب محل کی پشت کی دیوار پھاند کر باغ میں داخل ہوئے۔ اور محل کی عقبی عمارت کے قریب موتیا کے جھاڑ کے نیچے اپنا بم پلانٹ کر کے چلتے بنے۔ پھر باقی جو ہونا تھا وہ ہونا ہی تھا۔

دیوانے مولوی صاحب جب حکیم معزالدین کے مطب سے لوٹ کر نواب محل کے ارد گرد کی بھیڑ کو چیرتے ہوئے محل میں داخل ہوئے تو ان کے غم کا اندازہ کرنے والے ان کے غم کا باب ادا کر کے پرلوک سدھار چکے تھے۔ ان کی اپنی بیگم اور نواب بیٹا اور چاند بہادر چھوٹی گڑیا ملبے کی تہہ میں دفن تھے اور ان کی بجائے ایک غیر شخص، ان کا ادھ چچا، جس کے ہم ذاتوں کے باعث یہ بلا نازل ہوئی تھی۔ انہیں سہارا دینے کے لئے ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب اور کوئی نہ ہوا اور دشمن ہی سہارا دینے کے لئے بڑھ آئے تو عجیب سا لگتا ہے اور اسی کی بانہوں میں سر دے کر پھوٹ پھوٹ کر رو دینے سے چین آتا ہے۔ مولوی صاحب بھی بے اختیار سائیں بابا کے سینے سے آ لگے۔ اور اتنا رو دئیے

تماشا ہے کہ ان کے ہوش و حواس بحال ہونے لگے!

(۲۱) بالکل اسی طرح ہوش بحال ہوتے ہی دیوانے مولوی صاحب کو پتہ چل گیا ہے کہ وہ لکھنؤ کی بجائے کراچی میں ہیں۔ یعنی اس وقت سے کراچی میں ہی ہیں جب سے ان کے ہوش بحال ہوئے ہیں، لیکن اب ان کا پاگل پن یوں شروع ہو گیا ہے کہ وہ نہایت معصومیت سے کہتے ہیں وہ ساٹھ برس بلا مرنی الحقیقت لکھنؤ ہی میں مقیم تھے، اور ابھی ابھی پنجاب سے چند روز کے لئے کراچی آئے ہیں۔ ابھی بیگم انہیں آنے نہ دیتی تھی۔ نواب مرزا اور جانو بی بی بھی ان کی دیوانگی پر خوش ہوتے تھے۔ اور ان کی نہایت محبوب پوتی، فرخی۔ فرخی نے تو اپنے ننھے منے ہاتھ پھیلا کر ان کا راستہ روک لیا تھا۔ "نہیں بڑے ابی جی میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی۔"

"نہیں، فرخی بیٹا، ضد نہیں کرتے۔"

"آپ بھلا اماں کو کیسا اکیلا چھوڑے جا رہے ہیں، یہ کیوں نہیں؟ تمہارے بھائی اور ابا بھی بڑے ہو گئے ہیں، بیٹا۔ تم بھی بڑی ہو جاؤ گی تو۔"

"نہیں بڑے ابو۔"

"ضد مت کرو فرخی، دیکھو فرخی۔ دیکھو ہم یہ گئے اور یہ آئے۔" دیوانے مولوی صاحب نے کئی بار فیصلہ کیا کہ اب انہیں فی الفور لکھنؤ لوٹ جانا چاہئے۔ ابھی بیگم ہر روز مخصوص اوقات پر ان کے لئے پان کے بیڑے بنا کر رکھ دیتی ہوں گی اور اب تو ابھی دیوانے مولوی صاحب، میں بھی تمہارے ساتھ دیوانی ہو گئی تو آپ کی دیکھ بھال کون کرے گا؟"

ابھی بیگم کی یاد میں ان کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ ان کی میری کیا پوچھتی ہو ابھی بیگم! مجھے تو یہاں سدا یہی معلوم ہوتا رہا تم میرے ساتھ ہی ہو۔

وہ اپنے آپ کو متنبہ کرتے رہتے ہیں کہ اب مجھے فی الفور لوٹ جانا چاہئے ملیح آباد سے حکیم صاحب ان چند ماہ میں کئی دفعہ انہیں بہلانے پھسلانے کو نواب محل آئے مگر اپنے دیوانے بہنوئی کی ذہنی کیفیت محسوس کر کے انہیں مکمل حالات کرنے کا حوصلہ نہ ہوتا۔ اور وہ اپنی بھیگی آنکھوں کو چھپا لینے کے لئے پریشان ہونے لگتے۔

"ارے حکیم صاحب، کبھی رونے کو رہ گئے ہیں؟ ہم پھر آ جائیں گے۔"، ایسے موقعوں پر دیوانے مولوی صاحب محبت سے حکیم صاحب کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیتے ہیں "آئندہ آئیں گے تو آپ کی بہن کو بھی ساتھ لائیں گے۔ یہ کیا بات ہے۔"

نواب اسحٰق، تم کہاں رہے ہو؟ ہاں بھئی، تمہارے بھائی جان سجاد میاں اور ثریا کو بھی لائیں گے۔ دیکھو اب کے بھی سلیم اور دلو کو تم سے ہی آئے۔ ان کا یہی اتنا دل لگ گیا ہے کہ اپنے ماں باپ کو بھی بھول گئے ہیں۔ ہاں، آئندہ سبھی کو ساتھ لاؤں گا۔" وہ اپنے بھتیجے نواب اسحٰق مرزا کی پیٹھ تھپکنے لگتے ہیں۔ "اگلی بار سے مستقل ہو گا ہم سب مل جل کر رہیں گے۔ تمہیں، چھوٹے نواب، بھائی فکر مت کیا کرو۔ تمہارے بھائی جان اور بھابھی بیگم اور تمہاری امی کو سر آنکھوں پر بٹھا کر رکھتے ہیں۔ بڑے نیک اور فرمانبردار ہیں ماشاءاللہ۔"

اسحٰق مرزا سوچنے لگتے ہیں کہ شاید ہوئے سے دیوانے ابا اپنا بھلا اس طرح پورا کریں۔ اللہ انہیں جوار رحمت میں جگہ دے۔ مگر وہ فوراً فکر کر جاتے ہیں اللہ انہیں خضر کی عمر عطا کرے!

اسحٰق مرزا گزشتہ چند ماہ سے بیوی بچوں سمیت سندھی کالونی سے یہیں اٹھ آیا ہے۔ اس کی سندھی بیوی سلمٰی بیگم نے دونوں یتیم بچوں کو اپنی نگرانی میں لے کر اپنے سفید پر دلکا اپنا سایہ ان پر پھیلا دیا ہے اور اپنے انور اور جلیل اور سوید اکو کلی طور پر ان کے باپ کو سونپ دیا ہے۔ سلمٰی بیگم کی گود کی بیسکر ان میں اپنی اجل کرد اور مندر کا مکمل اہتمام محسوس کر کے سلیم اور دل نواز آپ ہی آپ اسے امی کہہ کر پکارنے لگے ہیں۔ اور سلمٰی بیگم ان کے اس معصوم جذبے کو تقویت پہنچانے کے ذرائع کو وسیع کیے جانے کی سوچتی رہتی ہے۔

"امی! امی!" چہار سالہ دلو اس کا منہ چوم کر بے ساختہ کہا کرتا ہے "ہماری امی آئے گی تو ہم اس سے کہیں گے، تم ہماری امی نہیں ہو۔ امی ہماری امی ہے۔ ہے نا امی؟" وہ ایک بار پھر اس کا منہ چوم لیتا ہے۔ "ہماری امی کب آئے گی امی؟ ہمارے ابا کب آئیں گے امی؟"

سلمٰی اور اسحٰق اور اس کے ماموں اور ممانی اور ان کے بچے بیٹوں اور ان کی بیگمات اور پاس پڑوس کے لوگوں کے دلوں میں بھولی بھالی باتیں سن سن کر ہول اٹھنے لگتا ہے۔ اور ان کا جی چاہتا کہ وہ جی بھر کے رو لیں۔ اور وہ دل ہی دل میں روتے روتے مسکرا مسکرا کر دلو کی باتیں سنتے رہتے ہیں مگر دیوانے مولوی صاحب اس وقت آگے بڑھ کر دلو کو اپنے بازوؤں میں لے لیتے ہیں۔ "سو تو بیٹا، ہم دو ایک دن میں ہی تمہاری امی اور ابا کے پاس جا پہنچیں گے۔"

"نہیں، ہم ہماری امی کے پاس نہیں جائیں گے۔ سوری کی امی ہی ہماری امی ہے۔ بڑے ابو۔"

دیوانے مولوی صاحب نے اپنا اور بچوں کا سفری سامان باندھ کر تیار رکھا ہوا ہے۔ اور ہر روز اپنے لئے اپنے کمرے کی الماری سے کپڑے نکالنے کی بجائے وہ انہیں سوٹ کیس سے نکال کر پہن لیتے ہیں اور سلمٰی بیگم کو ہدایت کر دیتے ہیں کہ میلے کپڑوں کو فوراً دھلا دے تاکہ وہ انہیں سنبھال کر رکھ لیں۔ دلو اور سلیم کے سامان کے بارے میں بھی انہوں نے اپنی بہو کو تاکید کر رکھی ہے کہ وہ بستہ تیار رکھے۔ میں اب جلد سے جلد گھر لوٹنا چاہتا ہوں!

"مگر ابو!" اسحٰق مرزا کے منہ میں آ کے آتے رہ جاتا ہے، کہ آپ کیوں نہیں سمجھتے ابو، امی جان، اور بھائی جان، اور جانو بھابی اور ثریا، سب کے

[باقی صفحہ ۲۹ پر دیکھئے]





عصمت مظفری

عورت

مہکی ہوئی کلی ہے
اک پھول کی ہنسی ہے
گرما کی چاندنی ہے
آنکھوں کی روشنی ہے
رنگین پھلجھڑی ہے
ہیرے کی اک کنی ہے
گنے کی اک چھڑی ہے
مصری کی اک ڈلی ہے
تعبیر خواب کی ہے
کھیتی ہری بھری ہے
وہ مادرِ رشی ہے
وہ مادرِ نبی ہے
اک حور ہے پری ہے
بہتی ہوئی ندی ہے
عورت ـــــــ ہائے
[illegible]

● ۱۴-۷-۱۳، شاہ پورہ ، اسٹریٹ ، ورنگل آندھرا پردیش

جینت پرمار

افریقہ

آدھی رات کو
اسپیشل برانچ کے گورے افسر
حبشی لڑکے اور لڑکیوں کی لاشوں کو
ٹانگیں پکڑ کر
گھسیٹ لے آئے
ان کے مردہ جسم سے سارے کپڑے اتارے
اک کالی لڑکی نے نیلے رنگ کا بلاؤز پہنا تھا
جس پہ صاف نظر آتے ہیں
بندوق کی گولیوں کے نشاں
دو فٹ کی ہی دوری سے
جس کو گولی ماری تھی
مردہ گھر میں ہتھیاروں نے
وہسکی پی اور زور زور سے
گیت خوشی کے گائے

ساری کتابیں
میں نے رکھ دیں الماری میں
گھر کے اک کونے میں پڑی
بندوق اٹھائی
اور مٹی کے تیل سے صاف کیا اس کو
ہٹلر اب بھی زندہ ہے

● ۱۰۳/۳۰۰، [illegible]، شاہ پور-۱ احمد آباد

محی الدین عادل

قیامت

سپر جیٹ سے تیز رفتار زندگی
شور و غل کی آوازیں
مکروہ صدائیں سنتے سنتے کان پک جاتے ہیں۔
افراط و تفریط
بے ترتیب گہما گہمی
بے معنی بھاگ دوڑ
جس کا مفہوم کسی زبان کی لغت میں نہیں
زیست جس کی منزل کا یقین بھی نہیں
نہ سنگ میل، نہ راہوں کا پتہ
تب میں کسی کی یاد میں گم ہو کر کچھ نظمیں لکھ لیتا ہوں،
اور محسوس کرتا ہوں جیسے مونالزا کی خوبصورتی ترتیب دے رہا ہوں
میں جانتا ہوں اس دور میں یہ بھی تضیع اوقات ہے
مگر افراط و تفریط
گہما گہمی
بے معنی بھاگ دوڑ سے "یہ" اچھا لگتا ہے

● گلاب [illegible]



ندا فاضلی
١٠٣ - امرا پارٹمنٹ، ڈانڈا پاڑہ - ١٠ کھار (ویسٹ) بمبئی ٥٢ ٠٠٠ ٤٠٠

دیواروں کے بیچ

قسط نمبر ١٦

برسات شروع ہو چکی ہے۔ دہلی میں ہر موسم دوسری جگہوں سے مختلف ہوتا ہے۔ ان میں شدتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ سردی میں زیادہ سردی، گرمی میں زیادہ گرمی برسات میں زیادہ برسات۔ یہاں کے موسموں کی طرح یہاں کے تعلقات بھی قبائلی تیور لئے ہوتے ہیں۔ خفا ہوتے ہیں تو برسوں خفگی کو پالتے پوستے ہیں، ہر طرح سے اس کی دیکھ ریکھ کرتے ہیں۔ خوش ہوتے ہیں تو کسی کو کبھی لال قلعہ، چاندنی چوک اور قطب کی لاٹ کے عطیات سے نواز دیتے ہیں۔ دہلی کے راستے رات کو دیر تک گھومنے پھرنے کے عادی نہیں۔ ساری سیاسی، ادبی، اور تہذیبی بحثیں سورج غروب ہونے کے کچھ دیر بعد خاموش ہو کر تانگوں، سائیکل رکشاؤں یا سرکاری بسوں میں سوار ہو جاتی ہیں۔ روز کے ملنے جلنے والے، بندگی بکی، زندگیوں کے معمولات میں رد و بدل کے قائل ہیں۔ دفتر، ادب، گھر سب کا وقت متعین ہے۔ ان تعینات میں اگر کبھی کبھار کوئی تبدیلی ہو جاتی ہے تو ہفتے کے ساتوں دنوں کے شیڈیول پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ سرکاری بابوؤں کی اس بستی میں باہر سے آنے والوں کے دن بھی سہ پہر پانچ بجے کے بعد شروع ہوتے ہیں۔ اور رات نو بجے کے بعد ختم ہو جاتی ہیں۔ شہر کے اس مزاج میں ڈھلنے میں نوواردوں کو کافی وقت لگتا ہے۔ یہاں کے ادیبوں اور شاعروں میں کوئی ندا کی طرح بے گھر اور بے روزگار نہیں ہے۔ سب کے اپنے خاندان ہیں، نوکریاں ہیں۔ ہر جگہ گھڑی کی سوئیوں اور کلنڈر کی تاریخوں میں وقت منقسم ہے۔ ندا اور وقت کے درمیان ایسا کوئی معاہدہ نہیں ہے۔ اس کی دلی بھی اسی لحاظ سے دوسروں کے شہر سے زیادہ پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں دور پاس کی درگاہیں بھی شامل ہیں، ادھر ادھر پھیلے ہوئے تاریخی کھنڈرات بھی ہیں۔ اجنبی راستوں میں بھٹکتے ہوئے جانے پہچانے کتے بھی ہیں۔ راستوں کے بیچ بنے ہوئے باغوں میں بن بیاہے تماشے بھی ہیں۔ پیڑوں کی چھاؤں میں تاش کھیلتی دوپہریں بھی ہیں..... یہ لمبی چوڑی دلی ہر روز اسے اسی طرح تھکا دیتی ہے جب وہ زیادہ تھک جاتا ہے تو کسی درگاہ میں جاکر ماتھا ٹیکتا ہے اور دیر تک یونہی انجان درختوں کی چڑیوں، قبروں کے کتبوں یا فرش پر بکھرے پیلے پتوں سے خاموش مکالمے میں کھویا رہتا ہے۔

دلی میں اسے اب کئی مہینے ہو گئے ہیں۔ کئی سفارشی خطوں کے سہارے ادھر ادھر بھٹک کر اب وہ اکتا چلا ہے۔ صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے پھر دوسرا دن شروع ہو جاتا ہے۔ اور یوں ہی وقت گذرتا جاتا ہے۔ وہ خود بھی اپنے تعلق سے شاید سنجیدہ نہیں ہے۔ یار دوست مدد کرنا چاہتے ہیں، وہ اپنے طور پر خود بھی کوشش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ہوتے ہوتے کچھ ایسا ہوتا ہے کہ کچھ نہیں ہوتا۔ گھر سے جدا ہوئے اسے اب کافی عرصہ بیت چکا ہے۔ گھر والے پاکستان میں بس گئے ہیں۔ ایک بھائی ڈاکٹر بن کر پاکستان کی طرف سے سعودی عرب میں ڈاکٹری کر رہا ہے۔ بڑے بھائی پاکستانی شپنگ کارپوریشن میں بڑی پوسٹ پر ہیں۔ کئی کمروں کی ایک سہ منزلہ کوٹھی ناظم آباد میں بن گئی ہے۔ اس کے باہر دروازہ پر دوسروں کے ساتھ ندا کا نام بھی سنگ مرمر پر کندہ ہے۔ ہندوستان کے نقشے میں پاکستان کا علاقہ ایک موٹی سی لکیر کے ذریعہ الگ کر دیا گیا ہے۔ پاکستان نئے سرے سے، زمینی رشتوں پر کتابی رشتوں کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ ہزاروں سال کی تہذیب سمٹ کر قومی شناخت کا مسئلہ بن گئی ہے۔ ہندوستان میں زبانوں کو مذاہب میں اور انسانوں کو علاقوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ ورنگ سسٹم نے ایک ہندوستان میں کئی ہندوستان پیدا کر دیئے تھے۔ پاکستان میں مسلمان سنی، شیعہ، اور قادیانی بن گئے ہیں۔ اور کہیں سندھی اور بنگالی اور مہاجرین میں منقسم ہو چکے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی دشمنی کو جینے کا سہارا بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن ندا ابھی تک وہیں ٹھہرا ہوا ہے۔ جہاں سیاست نے اسے اچانک گھر سے بے گھر کر دیا تھا۔ وہ اس سانحہ پر ابھی تک قابو نہیں پا سکا ہے۔ وہ گھر والوں سے دور ہوتے ہوئے بھی ابھی تک انہیں کے ساتھ ہے۔ اس ذہنی تضاد نے اس کے مزاج اور سوچ میں نئی نئی گتھیاں پیدا کر دی ہیں۔ وہ قدم قدم پر اس کے اور ارد گرد کے ماحول کے درمیان حائل ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ ان سے واقف نہیں ہے یا ان کے تجزیے سے محروم ہے۔ پھر بھی وہ وقت بے وقت جو ہے سو ہے سے پہلے بھٹکنے لگتا ہے۔ اس میں ایک عجیب سی خود رحمی ابھار دیتی ہے۔ مجمع سے وہ شعوری سطح پر ہمیشہ بیزار رہتا ہے۔ پاکستان وہ جانا نہیں چاہتا۔ ہندوستان میں [illegible]

بے خواب ہے معلوم نہیں کیوں، کے بحران کا شکار ہے۔ اسے ساری زندگی ایک تماشہ محسوس ہوتی ہے۔ اس تماشے میں وہ جو ہے اس سے مختلف روپ میں وہ سر دن کے سامنے خود کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کی حالت ان دنوں اس اپاہج جیسی ہے جو ہر اونچائی کو تصور میں سر کر لیتا ہے۔ لیکن حقیقت جہاں ہے وہ اس کو نصیب بھی ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کبھی اس کی تربیت کی وجہ بھی یہی ہے۔ عملی سطح پر فعال نہ ہونے کی وجہ سے طرح طرح کے وہم اس کے من در آئے ہیں۔ ایک دفعہ وہ جدھر سے ہو کر گزرتا ہے اس راہ کے بارے میں کوئی رائے قائم کر کے یا تو راستہ بدل لیتا ہے یا پھر کچھ دن دور اور نزدیک کا فرق کئے بغیر ادھر سے ہی آتا جاتا ہے اسی طرح درخت وہ کانوں کے سائن بورڈ اور جانور بھی بدشگونی اور خوش شگونی کی علامتیں بن گئے ہیں۔ روز کے پہننے والے کپڑوں کے ساتھ بھی اس کا یہی رویہ ہے کسی قمیص کو پہن کر اچھا اچھا لگتا ہے کوئی ایسی بات نہیں ہوتی جو ناگوار محسوس ہو۔ دوسرا لباس اس طرح اثر انداز ہوتا ہے کہ بنتا ہوا کام بھی بگڑ جاتا ہے پچھلے کئی دنوں سے وہ ایک جنتر اعتقادوں کا ڈمہ دار چاندی کی ایک انگوٹھی پہنے ہوئے ہے۔ اس کے نگ نے جو بظاہر ایک شیشے کا جو کور ٹکڑا ہے۔ آسمان کے کسی ستارے سے ساز باز کر کے کئی الجھنیں پیدا کر دی ہیں۔ مسجد کے حجرہ کی مرمت ہونا ہے۔ اس لئے جلد ہی اسے خالی کرنا ہے۔ دوسری جگہ کا انتظام مشکل ہے۔ وقت سے پہلے آنے جانے پر پابندی عائد کر دی ہے۔ لگاتار دو مشاعرے ملتوی ہو گئے۔ ایک جگہ ہندو مسلم فساد نے بلا وجہ ندا کے معاوضہ پر ہاتھ مارا۔ دوسری جگہ ترقی پسند ادب کے مزدوروں نے فیکٹری میں بونس کا مسئلہ اٹھا کر اس کے ساتھ ناانصافی کی۔ اسی دوران زبیر رضوی دہلی کے ایک مشاعرہ میں مدعو کرتے ہیں۔ مشاعرہ رام لیلا گراؤنڈ میں ہے۔ ندا وہاں چھوٹی چھوٹی گھریلو نظمیں سناتا ہے۔ سامعین اسے پرشور تالیوں سے نوازتے ہیں۔ دوبارہ پڑھنے کے لئے اصرار کیا جاتا ہے۔ دوسری بار وہ دوسری نظم پھر نوں اٹھا پڑھتا ہے۔ یہ نظم ابھی مشکل سے آدھی ہوپائی ہے کہ دہلی کی ایک معزز خاتون حمیدہ سلطان کو یہ فحش محسوس ہوتی ہے اور وہ احتجاجاً بیچ مشاعرہ کھڑی ہو کر اپنی رائے کا اظہار فرماتی ہیں۔ سالہ۔ سل بٹہ، برتن، انگی جیسے الفاظ معیوب ٹھہرتے ہیں۔ سامعین نظم کو مکمل سننے کی ضد کرتے ہیں اور محترمہ گلی کی ماؤں بہنوں بیٹیوں کی اکیلی نمائندگی کرتے ہوتے اس کو ادھورا چھوڑنے پر مصر ہیں۔ منتشر ہوتے ہوئے اس مشاعرہ کو مخدوم محی الدین مائک پر آ کر سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنی تقریر میں ندا کی نظم میں لب و لہجہ کی تازگی کو سراہتے ہیں۔ حمیدہ سلطان کے اعتراض کو غلط ٹھہراتے ہیں۔ اور کئی کلاسکی مثالوں سے نظم کا دفاع کرتے ہیں۔ مگر وہ ادب کی اپنی متعین تعریف کو بدلنے پر تیار نہیں ہوتیں۔ مشاعرہ میں اس اچانک بدنظمی کا رشتہ بھی ندا اسی انگوٹھی سے جوڑتا ہے اور دوسرے دن اسے صندوق میں بند کر کے ہی باہر نکلتا ہے۔ [باقی آئندہ]

بقیہ صفحہ ۲۶ خواب رو

سب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

"مگر فکر کی بات نہیں، اسحٰق میاں، اللہ تم پر اپنا کرم رکھے۔ تمہاری کراچی ہم نے بہت دیکھ لی۔ اب ہم گھر کے لئے اداس ہیں۔ خدا کے لئے ہمیں ہمارے لکھنؤ بھیج دو۔ ہو سکے تو آج ہی۔ بلکہ ابھی بیٹا، اسی وقت!"

اسحٰق کی آنکھوں میں نمی سی ابھر آئی ہے۔ اور اپنے دیوانے ابو کو سینے سے لگا کر وہ بے ساختہ پکار اٹھتا ہے، "ابو جان! میرے سب سے اچھے ابو جان! مجھے آپ کی اشد ضرورت ہے۔ خدارا آپ جانے کی بات مت کیجئے، کم سے کم ابھی نہ کیجئے۔"

دیوانے مولوی صاحب اسے جواب دینے کے لئے منہ کھولنا چاہتے ہیں مگر اسحٰق ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ "آپ کو میری جان کی قسم!"

چند روز گزر جانے کے بعد آج پھر دیوانے مولوی صاحب کے دل میں سمایا کہ وطن جو سمایا ہے تو وہ اپنی روانگی پر اڑ گئے ہیں۔ انہوں نے سعید کی اداسے سے اپنے سوٹ کیس میں سارے کپڑے خوب جما کر کے رکھ لئے ہیں۔ اور بستر کس کر باندھ لیا ہے اور بہو سے کہا ہے کہ دونوں بچوں کا سامان تیار کر کے ان کے کمرے میں بھیج دے۔ اسی دوران سلیم گیند کھیلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں سے گزرنے لگا ہے۔ انہوں نے اسے روک کر بتایا ہے "تیار ہو جاؤ بیٹے، اب ہم جا رہے ہیں۔"

"کہاں بڑے ابو؟"

"لکھنؤ بیٹے، ہمارا لکھنؤ!"

سلیم کی سمجھ میں نہیں آیا ہے کہ اس کے بڑے ابو کس لکھنؤ کا ذکر کر رہے ہیں۔ وہ کورے کا کورا گیند سے کھیلنے لگا ہے جو اچانک کمرے سے باہر لڑھک گئی ہے اور وہ یہ جواب دے کر گیند کے پیچھے بھاگ گیا ہے۔

"لکھنؤ بہت دور ہے، بڑے ابو!"

[ختم شد]

دھنک رنگ

شفق سوپوری

ضمیر موجِ نفوس حباب میں، نہیں میں
یہ کیسے ہو کہ ترے فکر و خواب میں نہیں میں
کہیں تو جلدِ شبنم میں ذکر ہے میرا
اگرچہ خوابِ شبِ ماہتاب میں نہیں میں
میں دام سوجۂ افلاک کا سفینہ ہوں
فریب گاہِ طلسمِ سراب میں نہیں میں
وہ کوئی اور ہے، واماندۂ جمالِ بتاں
کتابِ عشق کے پہلے ہی باب میں نہیں میں
میں گمشدہ سی کرن سینۂ صدف میں ہوں
یہ اصبات کہ اب آفتاب میں نہیں میں

● نشر پیر، سوپور (کشمیر)

پروین راجہ

یہ اندھیرا میرے سینے میں نہاں ہو جائے گا
دیکھ منظر خوشنما اب ناگہاں ہو جائے گا
میں تو شب کے آنچ ہوں سرگوشیاں ہیں چاند کی
گم دھوئیں کے بادلوں میں آسماں ہو جائیگا
تم سفر کی اس ریاضت میں اگر ٹوٹے کہیں
وادیٔ آشوب میں سب رائیگاں ہو جائیگا
اک تڑپتی موج میں ہے کیا تلاطم ہر طرف
اب یہی دریا سمندر میں رواں ہو جائے گا
شہر کا تاراج منظر سامنے جب آئے گا
ساتھ میرے ہر کوئی پھر نوحہ خواں ہو جائیگا

● بٹ مالو، بلدان چھتر، سری نگر (کشمیر)

اشعر علیگ

میں آدمی ہوں مرا کام لغزشیں کرنا
ترا شعار خدایا! ہے بخششیں کرنا
ہے ایک جہدِ مسلسل مآلِ ناکامی
فصیلِ غم سے گذرنے کی کوششیں کرنا
مجھے تو آگ کے صحرا کو پار کرنا ہے
تمھاری مرضی ہے جب چاہے بارشیں کرنا
سکونِ دل بھی میسر ہو شہر میں بھی رہو
کبھی بھی ایسی نہ معصوم خواہشیں کرنا
شکستگی میں بھی تازہ ہے جستجو کا عمل
قدم قدم پہ نئی پھر سے کاوشیں کرنا

● ۵/۸، بادشاہ نگر کالونی، لکھنؤ-۶

سعید عارفی

جسم کی اک اک طلب جب در بہ در لیجائے گی
روح کی خواہش نہیں جانے کدھر لے جائے گی
مرحلہ در مرحلہ مٹ جائے گی چہروں کی بھیڑ
دور اتنی دور یہ گردِ سفر لے جائے گی
موسموں کی یہ ہوا کیا ہے کبھی سوچا نہ تھا
پھول، خوشبو، تتلیاں، برگ و ثمر لے جائیگی
جانتا ہوں تشنگی کے شہر میں سیلِ بلا
موجِ خوں کیساتھ آکر کتنے سر لیجائیگی
کیا خبر تھی وقت کی آندھی ہر اک جذبے کیساتھ
ہوشیاری، تمکنت، فکر و نظر لے جائیگی

● قانون گو پورہ، بہرائچ (یو-پی)

اشعر ہاشمی

کیا قدرِ انا ہو گی، جبیں جان ر[...]
جس شہر میں سجدوں ہی کی پہچان [...]
کچھ ہم نے بھی دنیا کو ستایا ہے [...]
کچھ اپنی طبیعت سے بھی ہلکان [...]
مضبوط رہا حسنِ نظر سے مرا رشـ[...]
جب تک وہ مرے شہر میں مہمان ر[...]
اس کو تو سفر کرتے نہیں دیکھا کسی
راہوں کی مگر دھول اسے پہچان ر[...]
کیا جانے کہاں ختم ہوا شہر کی کہ[...]
اب تک تو ہر اک درد کا عنوان ر[...]

● ۱۲ بشیر الدین منشی لین، باڑھ

شیدا بگھونوی

سراپا زندگی اک حادثہ ہے
ہماری ہر خوشی اک حادثہ ہے
کوئی کب تک یہاں خود کو [...]
یہاں ہر آدمی اک حاد[...]
اجالوں سے گھٹن ہونے لگی پھر
دیئے کی روشنی اک حادثہ ہے
میں مانندِ ہوا ساکت ہوں [...]
مگر یہ خامشی اک حا[...]
میں ہوں نذرِ صلیبِ وقت شیدا
مری زندہ دلی اک حادثہ ہے

● شاہ پور، بگھونی، سستی پور

مکتوب

چترن رستوگی ــــــ بسنت بازار، گورکھپور ۲۷۳۰۰۱

شمارہ ۳ر ۹۲ کا اداریہ بہت خوب ہے اور اس میں جن سوالات کو اٹھایا گیا ہے فی الواقع بہت اہم ہیں۔ واقعاتی اور تاریخی اعتبار سے سماجی اور سیاسی مساوات و تشکیلات سے گذر رہے ہیں۔ اور یہ جمہوری دور انتشار و انہدام کا ہے۔

شاعر کا ہر شمارہ افادیت سے بھرپور ہوتا ہے اور زیرِ نظر شمارہ نئے آفاق پیش کرتا معلوم ہوتا ہے۔ فکرِ امروز کے تحت ... ہادی کے ملفوظات پُرمعنی ہوتے ہیں، کتنی اچھی بات ہے ... مفکر نہیں تو میں اسے شاعر ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں ... مرحوم کے کلام میں انسانِ کامل کا تصور پایا جاتا ہے جو بہت ... کے نظریات سے ہم آہنگ بھی ہے اور ہندوستانی ثقافت ... بھی ہے۔ انسانِ کامل میں اقبال کے تردید یا بلیس جارحیت ... کی۔ افسوس ہے کہ میں ہنوز اس پہلو پر روشنی نہیں ڈال سکا۔

... الحق حقی کی تحریر "زبان کے معیار کا مسئلہ" اور علی جواد زیدی کا "معیاری زبان کا سوال" دونوں کسی بھرپور آگہی کا ثبوت ہیں۔ علی جواد زیدی نے "دریائے لطافت" سے اقتباسات لیے ہیں جن سے اس کے اردو ترجمہ پر کچھ شک سا ہونے لگا۔ ... دریائے لطافت (فارسی) میرے پاس ہے، ... لفظ "اردو" بالکل دیکھنے میں نہیں آیا ... کے تحت "ہندوی" کا ترجمہ "اردو" کر ڈالا۔ کیفی نے ... یا نہیں لیے نہیں معلوم کیوں کہ اردو ترجمہ میرے پاس نہیں ہے۔

شاعر: اقبال خصوصی نمبر نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا اور میں نے اپنی انگریزی تصنیف IQBAL IN FINAL COUNT DOWN کے حوالے دیے ہیں اور وہ سوالات جو مدیرِ شاعر نے اٹھائے ... توجہ صرف کی ہے۔ آج کل اس کتاب کے پروف دیکھ رہا ہوں ... تصنیف مارچ تا اپریل ۱۹۹۳ تک بازار میں پہنچ جائے گی۔

... کی غزلوں میں آبداری نہیں رہی ہے اور محسن زیدی ... کے معیار پر پوری نہیں اتری۔

... کی تحریر بہت معیاری ہوتی ہے۔ شاعر میں جو مکتوبات ... ہیں اکثر انکشافات کے حامل ہوتے ہیں۔ اس موضوع ... بلد کچھ لکھوں گا۔

... کا شکار ہو گیا ہوں اور ویسے بھی ۸۲ سالہ بڈھا کھوسٹ ... پر پڑھتا بھی ہوں اور لکھتا بھی ہوں۔ کب تک؟

رفیع ــــــ ۳۶ آشیانہ ... پٹنہ، بہار

شاعر کا تازہ شمارہ پٹنہ سے گیا تک ہم سفر رہا۔ علی جواد ... "معیاری زبان کا سوال" ہم اردو والوں سے بہت سامنے ... انکے مشورے بے حد مفید ہیں۔

... الحق کی کہانی "کہا سے میں خواب" کے بارے میں جس قدر ... بہتر ہے LESS SAID THE BETTER ... ان دنوں ... صرف شائع ہونے کے لیے لکھا جا رہا ہے ...

بہت اچھا اور عصری مسائل سے جڑا ہوا تھا۔ مگر اسے جلد بازی میں بگاڑ دیا گیا۔

یہاں میں آپ کے اداریے سے ہی اپنی بات کی وضاحت کرنا چاہوں گا "کیا آج شعر و ادب کی ضرورت ہے! اگر ہے تو کس لیے؟ اگر ضرورت نہیں ہے تو پھر کیوں بے جان، بے روح لفظوں اور جملوں کی کاریگری کا بازار گرم ہے؟"

شعر و ادب کی ضرورت ابدی ہے مگر بے روح لفظوں اور جملوں کی گرم بازاری نے ہمیں اس قدر مایوس کر دیا ہے کہ اب گھبرا کے کہتے ہیں کہ شعر و ادب کی ضرورت نہیں یعنی ایسے ہونے سے نہ ہونا ہی بہتر ہے۔

قسط وار خواب رو (جوگندر پال) "دیواروں کے بیچ" بہرحال قاری کو گرفت میں لیے ہوئے ہیں۔

زاہدہ زیدی کا ایک داخلی منظر مشرقی یورپ کے نظریاتی انہدام کا نوحہ ہے۔ جب کہ مبین رشید "سمندر کا خیال" کے ذریعہ ذہن کی نہائیوں میں داخل ہوتے نظر آتے ہیں۔ انہیں ایک اچھی نظم کے لیے مبارکباد۔ فضا ابن فیضی حسبِ معمول اپنے QUANTITATIVE FORM میں ہیں۔ خدا کرے ان کا قلم اسی طرح فعال رہے۔

ظفر ہاشمی ۔ ایل ۵/۱۳، روڈ ۳، ایل ایچ ایریا، کدما، جمشید پور

شاعر کا ہر شمارہ اپنی پوری تابانی کے ساتھ نکلتا ہے۔ اس تناظر میں شمارہ نمبر ۳ بھی اپنی قدروں کے بطن سے طلوع ہوتا ہوا نئی کرنوں کی جگمگاہٹ دیتا ہے۔ "فکرِ امروز"، "تجربات"، "آثار لفظ لفظ"، اور منظر صدیقی کا "طرز نگارش" بھی اسی سیاق و سباق میں ہیں۔

مضامین کی ترتیب و تہذیب بھی انا دیت، انفرادیت اور جدت رکھتی ہے۔ اس پس منظر میں علی جواد زیدی اور شان الحق حقی کی معیار بندی زبان و ادب میں ایک معنوی ربط بھی ہے اور ضبط بھی۔ یعنی ایک سوال بھی ہے اور اس کا جواب بھی۔

افسانوں کے انتخاب میں بھی یہی تکمیلیت ملتی ہے۔ مثلاً حسین الحق کا افسانہ نہ صرف خوابوں میں رہنے والوں کو جھنجھوڑتا ہے بلکہ ملکی اور بیرونی حالات کا استعارہ بن کر آفاقی بھی بن گیا ہے۔ اسی طرح اپنے کینوس پر ایم سوجہ، نوین جوشی، جاوید اقبال سب اپنے فن کی معنویت اور آفاقیت سے ہمیں روشناس کراتے ہیں۔

غزلوں کے گوشوں میں بھی یہی ہم آہنگی ملتی ہے۔ "سمٹی بھر غزلیں" میں فضا ابن فیضی اپنی پوری نمائندگی کرتے ہیں۔

محمد اسلم ــــــ پوسٹ بکس نمبر ۲۷۳۶، اندھیری (ویسٹ) بمبئی ۵۸

شمارہ نمبر ۳ میں آپ کا اداریہ خوب ہے لیکن کیا شعر بھی ہے؟

شاہد احمد دہلوی کا خط پڑھا۔ اور آپ کا دیا ہوا فٹ نوٹ بھی۔ خواہش ہوئی کہ شاہد احمد دہلوی اور جوش دونوں کے مضامین پڑھے جائیں۔ اتفاق سے نقوش کا ادبی معرکے نمبر میرے پاس تھا جس میں یہ دونوں مضامین مل گئے لطف آگیا۔ جس طرح آپ نے معیاری زبان کا سوال کے ساتھ زبان کے معیار کا مسئلہ مضمون بھی شائع فرمایا اسی طرح یہ دونوں مضامین بھی شائع فرما دیجیے تو شاعر کے قارئین کا بھلا ہو جائے۔

ان دنوں آپ کے رسالے میں نقد و تبصرہ اور ادب کی اطلاعات جیسے کالم شائع نہیں ہوتے۔ مکتوبات نے صفحہ گھیر لیا ہے۔ وہ دونوں کالم اہم تھے۔

آج کل اردو میں صرف شاعری اور چند افسانے ہی پڑھنے کو ملتے ہیں۔ تحقیقی کام بہت کم ہو رہا ہے۔ ریاستی سطح پر جو رسائل شائع ہوتے ہیں وہ بھی محض پروپیگنڈا ہوتے ہیں۔ اکاڈمیاں بگ شو کے لیے کوئی خاص کام نہیں کر رہی ہیں۔

رؤف خیر ــــــ رسالہ بازار، گولکنڈہ، حیدرآباد ـ ۸

ندا فاضلی "دیواروں کے بیچ" دھیرے دھیرے عریاں ہوتے جا رہے ہیں، حالانکہ دیواروں کے نہ صرف کان ہوتے ہیں بلکہ آنکھیں بھی ہوتی ہیں اور میر کو تو ... ہے

مت تڑکیا سنے ہیں دیواروں کے بیچ

شیخ سلیم احمد ــــ ۱۰۸ بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی ـ ۱۳

شاعر میں اب مجھے سب سے قلم کاروں کے لیے تہنیتی سخن خوب ہے۔ میں انھیں میر تقی کی پیداوار کہتا تھا، وہ تو بچہ ہی نکلے۔

صبا علی ــــــ اصغر منزل، ۲۰ صولہ، بھوپال

مکتوبات کے باب میں شمیم قاسمی نے پنہاں کے اس مطلع کی بیجا تعریف کی ہے:

دو بدن کے بھی سب دل میں رہتے ہیں
اب کشتوں کے دریا اسے بہتے ہیں

کوئی چھ سال پہلے رسالہ شاعر میں بھر اس کے بعد بشیر بدر کے مجموعہ "آمد" میں یہ شعر بھی درج ہے:

اب کے آنسو آنکھوں سے دل میں اترے
رخ بدلا دریا نے کیسا بہنے کا؟

اور سوچیے کہ نیا کتنا حال ہے۔

کرشن ادیب ــ اے۔ ۹۸ کچہری نگر، لدھیانہ (پنجاب)

شاعر سے متعلق بہت کچھ سوچا اور سنا بھی۔ ہندوستان میں یہ واحد ادبی جریدہ ہے جسے ادبی نقطۂ نگاہ سے خالص ادبی پرچہ کہا جا سکتا ہے اور جسے آپ اپنی ذاتی محنت اور کوششوں سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ درمیان میں اشاعت کا وقفہ ذرا طویل ہو جاتا ہے اور میں ندا فاضلی کی گزشتہ قسط بھول چکا ہوتا ہوں۔ یہ خود نوشت اپنے اندر زبان کی ندرت اور اسلوب کی بے پناہ کشش رکھتی ہے جو منفرد ہے۔ مجھے لکھیے کہ یہ کب تک کتابی صورت میں شائع ہوگی؟

سلیمان آصف ــــــ ۲۶ ... ناس، ... نسیں

جدید حسن، طرزِ نگارش کا پرتو شاعر اپنی ایک الگ انفرادیت اور شناخت رکھتا ہے جو ہند و پاک کے دیگر رسائل و جرائد کو نصیب نہیں۔ اس پرچے کی ترتیب و تدوین میں آپ کے حسن سلیقہ اور علمی شائستگی کو بڑا دخل ہے۔ اس پر آشوب اور دورِ تشنگی میں شاعر جیسے ادبی جریدے کو جاری رکھنا یقیناً ایک کرامت ہے۔ اور کرامت کا یہ چراغ آپ کے دم سے ہی کبھی نہ بجھے گا۔ ان شاء اللہ۔

حکومت مہاراشٹر یوم جمہوریہ کی ۴۱ ویں سالگرہ پر اپنے سارے عوام خصوصاً ادیباسی، دلت، بے زمین غرباء اور خواتین کے لیے معاشی اور سماجی انصاف کا اعادہ کرتی ہے۔ اس تعلق سے جو ترقیاتی پروگرام شروع کیے گئے ہیں وہ سبھوں کی خوشحالی کے لئے ہیں۔

پروگرام پر ایک نظر

- ستر کروڑ روپے کے باغبانی کے ترقیاتی پروگرام کو بے کار، بنجر اور پانی سے آلودہ زمین کو منافع بخش بنانا۔
- ۶۵ گروتھ سینٹروں کی شناخت کی گئی ہے اور پسماندہ علاقوں میں صنعتی ترقی کو بڑھاوا دینے کیلئے اقدامات اٹھائے گئے ہیں۔ ۷۵ صنعتی یونٹ قائم کرنے کیلئے غیر رہائش پذیر ہندوستانیوں کی شمولیت حاصل کی گئی ہے تاکہ ان کی خوشحالی اور تجربے سے فائدہ اٹھایا جائے۔
- مہاراشٹر اسٹیٹ کھادی اور ولیج انڈسٹریز بورڈ کے تعاون سے آٹھویں پنچ سالہ منصوبہ کے دوران دیہاتوں میں کاٹیج انڈسٹری کے ذریعہ چھ لاکھ روزگار کے مواقع پیدا کرنے کا پروگرام۔
- لاکھوں مستحق کاشتکاروں اور دستکاروں کو پانچ سو کروڑ روپے سے زائد کے قرضہ جات کی راحت۔
- مہاراشٹر کی باوقار اور عظیم روزگار ضمانت اسکیم کو دیہی ترقیات لانے کے لئے تقرری قوت کے حصول کے لئے نیا رخ دیا گیا۔
- **گڈچرولی** - چندرپور اور دھولے اضلاع کے ادیباسیوں کی تیز رفتار ہمہ گیر ترقی کے لیے مقررہ میعاد کے خصوصی ایکشن پلان پر عمل۔
- **مہاراشٹر** نے کوکن ریلوے پروجیکٹ میں پہل کی اس کی لاگت میں وسیع رقم دی۔ پروجیکٹ ریاست کے ۷۲۰ کیلومیٹر کے طویل ساحلی علاقہ کی ہمہ گیر ترقی کے لیے تحفہ ہے۔
- مہاتما جیوتیبا پھولے اور ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کی تحریریں اور مکمل کام علی الترتیب ان کی حالیہ جینتی اور پیدائش کی صدی اور تقریبات کے دوران شائع کی جائیں گی۔
- اس سال رزمیہ مثنوی کی تحریر کے سات سو (۷۰۰) سال کی تقریبات کے دوران "دیانیشوری" کے پاپولر ایڈیشن کی دوبارہ طباعت۔ سنت تکارام کا شاہکار "گاتھا" بھی دوبارہ طبع کیا جائے گا۔

فکر امروز



خدا جانے مشاعروں میں یہ "آداب عرض" کا رواج کب سے اور کیوں شروع ہوا ہے؟ اگر کوئی داد دیتا ہے تو اس کے جواب میں اسے سلام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ داد دینے والا اگر کوئی بزرگ شاعر یا اپنا استاد یا قوم و وطن کا کوئی مخصوص رکن ہو تو اسے ایک دو مرتبہ اخلاقاً سلام کرنے میں کوئی حرج نہیں مگر ہر شخص کی داد کے جواب میں آداب عرض کہہ دینا خواہ ایک جاہل لڑکا ہی کیوں نہ ہو اور خواہ داد رسمی یا مصنوعی ہی کیوں نہ ہو، بڑی حماقت ہے۔ اگر ضرورت ہو تو داد کا "شکریہ" سنجیدگی اور متانت سے الفاظ میں ادا کر دینا چاہیے، ہاتھ پاؤں ہلانے کی مطلق ضرورت نہیں۔ یہ باتیں ایک شاعر کے لیے سبب نازش نہیں بلکہ ذریعۂ توہین و تضحیک ہیں اور میں انھیں "ادبی بدعات" سے موسوم کرتا ہوں۔

[دستور الاصلاح مطبوعہ ۱۹۴۰ء]

سیماب اکبر آبادی

شاعر

اشاعت کا ۶۲ واں سال

جلد — ۶۲
شمارہ — ۲

فون: ۳۵۹۹۰۳۰

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت: — ۴ روپے

زر سالانہ — ۵۰ روپے
لائبریریوں سے — ۶۰ روپے

تاحیات خریداری — ۱۰۰۰ روپے
معاونین سے — ۱۰۰ روپے
ممالک غیر سے — ۳۴۰ روپے

اُردو کی ایک یادگار کتاب

اُڑتے ہوئے لمحات کو زنجیر کیا ہے
تاریخ کو تصویر میں تحریر کیا ہے
(صابر دت)

چند تصویرِ بتاں

(ایک البم)

اُردو زبان و ادب کی تاریخ ——— تصویروں میں

۱۹۳۰ء / ۱۲۵۳ء

مرتب : ——— صابر دت

قیمت : ——— پانچسو روپے

اپنی کاپی طلب کیجئے

جاری کردہ : ——— **انور سلطانہ**

ساحر پبلشنگ ہاؤس "پرچھائیاں" اے۔ بی۔ نائر روڈ۔ جوہو چرچ۔ بمبئی ۴۹ فون 202837،

Regd. Office : PARCHHAIYAN, A. B. NAIR ROAD, JUHU CHURCH, BOMBAY-400 049.

ترتیب

شمارہ نمبر ۲ [فروری ۱۹۹۱] جلد ۴۲

سرورق

جوش ملیح آبادی ۔ بشکریہ انکار (کراچی) جوش نمبر مطبوعہ اکتوبر ۱۹۶۱ء

اردو کی عظیم شاعری کا تصور صرف غزل سے عبارت نہیں بلکہ نظم کی دیگر اصناف نے اسے لازوال شعری سرمایہ عطا کیا ہے۔ باکمال فنکاروں نے اپنے تربیت یافتہ خلاقانہ ذہن سے حرف و لفظ کی روحانی تہوں کی غواصی کر کے بے شمار نامعلوم جہانوں کی سیاحی اور دنیا کے ارتقائی رنگ و روپ کی صورت گری کی ہے۔ غیر معمولی فن پاروں نے خیال و جذبے کی جو بھی کائنات خلق کی وہ حیرت و تحیر اور تلاش و جستجو کی ادبی تاریخ بھی بنی۔ اردو کی شعری اصناف کا تنوع بہ لحاظ ہیئت و موضوع، فنکاروں کے داخلی آہنگ کی ترتیب و تہذیب کا سبب بنا۔ یہ شعری اصناف تمام بڑے فنکاروں کا وسیلۂ اظہار تھیں کہ محض غزل میں عصری حسیت کی سمائی ممکن نہیں تھی حالاں کہ موزونیت پر مکمل گرفت شاعری کا عرفان اور علوم متداول کے ساتھ بے مثال ذخیرۂ الفاظ، حرف و لفظ سے دوستی، لغت سے یاری، باضابطہ درس و تدریس اور بے پناہ ریاضت نے عجز کلام کی کم سے کم گنجائشیں رکھیں لیکن اردو مثنوی، مرثیہ، قصیدہ اور بے شمار پابند نظمیہ فن پاروں نے غزل کی جادوگری سے الگ اردو زبان کو عظیم شعری ورثہ عطا کیا۔ ماضی کا یہ ورثہ ہماری عظیم روایت تو بن گیا تاہم یہ روایت آج دوسرے درجے کی اردو شاعری کا مذاق اڑا رہی ہے کہ آج غزل، آزاد نظم اور نثری نظموں میں شاعری کا وہ عرفان نہیں ملتا جو ہمارے بزرگ شعراء نے نظم کی مختلف اصناف میں کلاسیکی شاعری کے ذریعہ ہمیں عطا کیا۔ ہزاروں شعر تخلیق کرنے والے ماضی کے فنکاروں کا سلسلہ آج کی نسل سے صرف چار سو، پانچ سو شعر تک پہنچا ہے، اور پھر یہ شاعری بھی کیا؟ عجز کلام اور حشو و زوائد سے مملو۔ شعر کی پہلی و دوسری سطح سے کلام کرنے والے بے ہنر تربیت یافتہ ذہن، عالم آشوب، مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، واسوخت، رباعی اور نظم کی دیگر اصناف سے بہت دور ہو گئے ہیں۔ عظیم پابند نظمیں تو اب ماضی کا ورثہ بن گئی ہیں کہ غزل، آزاد نظم اور نثری نظموں میں لفظ و ہیئت کے بجائے صرف خیال رہ گیا ہے اور یہ خیال بھی زیادہ تر اکہرے، بیانیہ اور بیشتر پا افتادہ ہی ہیں۔ شاعری کی روح ختم ہو گئی ہے، بے رس مصرعے، شعر اور نثر پارے تخلیقیت کے نام پر منفرد انداز، مختلف اسلوب، لہجہ اور نہ جانے کیا کیا بنتے جا رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ غزل کا سفر تو صدیوں پرانا ہے اور اب یہ دنیا کے ساتھ ہی جائے گا لیکن ہماری شعری روایت کتنا باقی صرف غزل سے چھین، آج کی اردو شاعری اپنی روایت کو آئندہ نسلوں تک کن اصناف کے ساتھ لے جائے گی؟ کیا آج کی غزلیہ شاعری، آزاد نظمیں اور نثری نظمیں ہماری شعری روایت کا حصہ بن سکیں گی؟؟ ۔ ۱۴ ۔ ۱

جوش ملیح آبادی
بنام
مرزا جعفر حسین

(۱)

فاطر بلیس
[illegible] روڈ
پونا
۲۰ [illegible]

حضرۃ میرزا صاحب، مدت دراز کے بعد آج خط لکھنے کی [illegible] شامل حال ہوئی ہے۔ اس طویل خاموشی کی داستان طویل ہے اور تلخ بھی۔

[illegible] کوئی ایسی بات جو عجیب ہو۔

[illegible] کی پیروی اس طرح کیجیے کہ [illegible] زیادہ پاسکے اور [illegible] ڈگری ہو جائے [illegible] دیجیے گا۔ [illegible] دگری میں [illegible] بڑا اثر پڑ سکتا ہے۔

میرزا صاحب، میں کیا لکھوں، اعصاب کا یہ عالم ہے کہ بہت سنبھل سنبھل کر خط لکھ رہا ہوں اور قلب کی کیفیت یہ ہے کہ [illegible] ہیں۔

یہ سب کچھ کیا ہے؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ [illegible] ہے دل کی دنیا۔ [illegible] دل مرحوم کے اندر۔

اپنی بیگم سے سلام، اور بچوں سے دعا کہیے۔ اور زیادہ سے زیادہ جیتے رہیے [illegible] اور آپ بیٹھے رہ جائیں۔

احتشام سے بھی دعا کہیے۔ اور حکیم صاحب سے [illegible] کیجیے۔ [illegible]

آپ کا
[illegible]

(۲)

فاطر بلیس
[illegible] روڈ
پونا [illegible]

میرزا صاحب، آپ کو جاننا چاہیے کہ [illegible] حضرت [illegible] اور اس قدر شدید بخار [illegible] اور [illegible] اور آپ کے ساتھ گزرے [illegible] کیا حالت ہو گئی [illegible] اور اب بھی [illegible] ہیں [illegible] اب [illegible] کے ساتھ [illegible] اس کے بعد [illegible] کی زیارت کروں گا۔

[illegible] خضاب، اور [illegible] جلد سے جلد وی پی کر دیجیے۔ پارسل میں [illegible] وی پی کرنے میں تکلف کیا تو [illegible] برا ہوگا۔

حکیم صاحب، احتشام [illegible] وزیر صاحب، [illegible] صاحب [illegible] حکیم صاحب کی [illegible] مسکراتے تھے۔

[illegible] اور [illegible] اپنے گھر میں سلام اور بچوں کو دعا کہیے۔

[illegible]

جوش ملیح آبادی معروف شاعر [illegible] پیش کر رہے ہیں [illegible] یہ تمام خطوط جوش نے مرحوم شہنشاہ ظرافت مرزا جعفر حسین کو بغرض اشاعت ارسال کیے تھے۔ ایک مدت تک ان خطوط کی اشاعت ممکن نہیں ہو سکی۔ [illegible] مکاتیب جوش بنام [illegible] کی اشاعت [illegible] [ادارہ]

٣

جناب میرزا صاحب: آپ [illegible]

[illegible] مبارک باد قبول کیجئے۔

[illegible] آپ [illegible]

[illegible]

[illegible] دیکھیگا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہوجائیگا۔

بیگم صاحبہ اور بچوں سے دعا کہیے۔

[illegible]

[illegible]

کلکتہ کا موسم آجکل کیسا ہے؟

[illegible]

٤

[illegible]

۴ ●●●● [redacted]

۵

DAWAKHANA MADEN-UL-ADVIA,

VICTORIA STREET, LUCKNOW.

[illegible]

MASHUR ALAM DAWAKHANA

मशहूर आलम दवाखाना

Ref. No. ... Dated ... 190

حضرت مرزا صاحب آخری بار یا ہزاراں
مرشد دیا ہے سالہا سال کا دوران تجربات شفا لکھنؤ
سے مشہور خاندان کا جواب ہے
اگر خدا نخواستہ زندہ رہا تو سال آئندہ گورنر کا
... پیش ... جمعہ جمعہ کو استعمال کرونگا
... میں آمد ہے آپ کی با خبر نہ رہے
... "عرض داشت" اور ...
... روپے ادا کر دی
آپ کو مسلم ہو گیا ہے کہ اب جب آپ ... تشریف
لائے تو ... کچھ کہنے سے ... ہے
... استقبال کرونگا۔

جوش
۹ ...

"Shahjahan" ...

۶

حضرت ... ہے ... سے ...
... روزانہ ... ہوجاونگا۔
... اور ... استعمال کر کے
جلتے وقت ... کر دونگا۔
... اور ... بس
... خدا حافظ
جوش
... اور ... خرید کیا
... ہے

[redacted] ۷

نئی دلی۔ عبد الحمید علوی

حضرت جعفر صاحب! میرا سلام قبول کیجیے۔ [illegible] کیا اب بھی وہ دور [illegible] کہ دوسری کتاب جس کا [illegible] اور [illegible] تمام رباعیوں کو [illegible] [illegible] اور [illegible] گزارش ہے۔

جانے کو [illegible] کو دعا۔

[illegible]

جعفر [illegible]

پیامِ خاطر بر جعفر میاں زادۂ

جہاں زحمت ہے پامال ہر خوشی جو ہے

سبق ہے خدا کا اک نیک آدمی جیسا

خود اپنی ذات ہے اپنی دشمنی کا گواہ

خدا گواہ وہ [illegible] [illegible] جو ہے

قبول جو ہے تجھ سے بت [illegible] [illegible]

ادھر [illegible] خود [illegible] جو ہے

[illegible] زندگی [illegible] [illegible]

نہ زندگی [illegible] نہ [illegible] جو ہے

خدا کی [illegible] امید!! [illegible] کی حد کر دی

یقین اب مجھ کو آیا کہ جنتی جو ہے

زمانہ میری طرف [illegible] التفات کرے

علی [illegible] جو ہے [illegible] جو ہے

[illegible] ان کا ذکر ہی کیا [illegible]

علی جی [illegible] سے خفا ہے وہ [illegible] جو ہے

جی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

۸

میر جعفر صاحب! [illegible] کی نازکی، [illegible] توقع اور [illegible] کی شگفتگی کا نام [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]۔

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] جا سکتا۔

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] باقی رہیگا؟

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] نہیں سکتا!

[illegible] جعفر صاحب! [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] نہیں کیا جا سکتا۔

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

ماجرا!!

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] — [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] آمین! یا رب العالمین!! [illegible]

A 0000[redacted]

(۹)

لاہور [illegible] ۔
[illegible] روڈ ۔
[illegible]

اے دگرہا، دگرم تو میری نیست !

حضرت میرزا صاحب: رباعیات مع والہانہ پیرہن، شکریہ قبول فرمایے ۔ لیکن کتاب
تو پھر دیکھ لیجیے، یہاں موجود نہیں ہے ۔ یا کم سے کم ملتی نہیں رہی ہے ۔
آپ کے گرامی نامے کے جواب میں گزارش ہے کہ آپ میری کسی بھی [illegible] کر کے جیسے بھی
"دل دوستی" اور "[illegible]" کر سکتے ہیں، اپنی وضع داری اور قدیم ملاقات کا رشتہ
کیسے منقطع فرمائیں ۔ ورنہ تو بہت فرق میان عشق و تو حبیب، بگو؟
آپ [illegible] جب بھی خود تشریف لائیے ۔ کیونکہ جب [illegible] والا ہوں،
اس سے کم از کم ایک ہفتہ پیشتر مجھے مطلع کریں، تاکہ چند ضروری چیزیں ساتھ [illegible]
روپیہ روانہ کر سکوں ۔
یہ [illegible] کا وقت ہے، کہ [illegible] اور [illegible] آرام نہ کرنے کا باعث طبیعت میں،
چڑچڑا پن، [illegible] افسردگی ہے ۔ [illegible] زیادہ نہیں لکھ سکوں گا، بلکہ [illegible]
ہے جو کہ [illegible] ہو گی ۔
آپ جانتے ہیں کہ آپ کو کس قدر چاہتا تھا ۔ اُس محبت کی نسبت سے آپ پر غصہ بھی
آیا ۔ [illegible] تو میرے کان پر جوں تک نہ رینگتی، لیکن آپ کے نہ آنے نے
دل پر نشتر چلا دیا ۔
جب آپ [illegible] کہ [illegible] سے کوئی واقف ہوں، ایک عاشق نے اپنی معشوقہ کو لکھا
پیاری جب تمہارے واسطے [illegible] قربان کر سکتا ہوں، تمہارا مزاج ناساز ہے، میں
آج شام کو مزاج پرسی کے واسطے ضرور آؤں گا اگر [illegible] اُس وقت بارش نہیں ہو رہی ہو

لیکن میری جان، [illegible] آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کو کتنا چاہتا تھا [illegible] خدا کے لیے [illegible] نکال [illegible] اب [illegible]
[illegible] تمام دنیا کی [illegible] ۔ [illegible]
کے تمام [illegible] محبت کا جواب [illegible] کسی جانور [illegible]
[illegible]
[illegible] بیا بیا، کہ ترا [illegible] در [illegible] =

[illegible] جوش

[redacted] 00009

پبلیکیشنز ڈویژن
منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ
اولڈ سیکریٹریٹ
دہلی

(۱۰)

سیاسی و تمدنی مصور ماہنامہ
"بساط عالم"
۱۹-۱۰-۴۸
نمبر

حضورِ والا! میں بیان سے باہر ہے کہ آپ کی اشاعتیں یا زیادہ سے زیادہ انتخابیں ہیں – یہ غلط
ہے یقینی طور پر ان کی اشاعت کی رات کو روانہ ہو کر اور انتخاب کی صبح کو افقِ لکھنؤ پر طالع
ہو کر اسٹیشن سے براہِ راست اور ہمارا ادارہ قیام بلکہ روز آپ کے دولت کدے پر ایک عدد سفر کر کے
شاعر کو بغل میں دبائے وارد ہو جاؤں گا ہے

لہٰذا آپ کو دیکھ کر سکندر ہے اور یہ وقت آمد کارآمد ثابت ہو رہے۔

سب کو سلام – بچوں کو دعا۔ خبر کرو مرے عزیز کے خوش چینوں کو۔

جوش

طاہر پاسس۔
شنکر سیٹھ روڈ
پونا ۲

لکھنؤ

(۱۱)

حضرت میرزا صاحب! آپ دہلی میں نہ ہوئے دوبارہ چلے ہی ہیں اور بارہا
تشریف لے گئے، بہت ہی اچھا کیا ہے۔ میں بھی ایک عرصے میں لکھنؤ نہیں
گیا، بہت ہی خوب ہوا۔
میرے پاس وقت بہت تھوڑا ہے چھوڑنے کی فرصت نہیں، صرف کام کی بات کروں گا!
اور وہ یہ ہے کہ ... بحیثیت ... نے خواجہ حسن کے روبرو کا ...
ترتیب میرے مضمون زیرِ انجمن خان اور محمد شمیم خان ہیں ڈگری کرا لی ہے، میں
نے ... مضمون کو ... دیا ہے، لیکن کل رقم یک مشت ادا نہیں
کر سکتا، اس لیے آپ گزشتہ قسط ملکی قسطیں مقرر کرا دیجے۔
یہ ... کو ... آپ سے ملیے، ان کے ڈگری کی نقل اور
دیگر ... آپ کو ... – اور ... ہو ...
... گا –
جاؤں گا اور
میں ... ۲۲ روز کر دہلی ~~...~~ – اور ... روز قیام کر کے
لکھنؤ آؤں گا۔ خدا کرے آپ کو کم سے کم اس قدر فرصت ضرور مل جائے
کہ آپ صرف ایک بار، ... ایک میرے ناکارہ آدمی سے
بھی مل لیں –

جوش

سب کو سلام، بچوں کو دعا –

1• [redacted]

(۳)

Ajkal
Old Secretariat,
Delhi

۱-۲-۴۹

(پریشانیوں)
میری جان، شدید ترین نزلے اور متعدد ذہنی الجھنوں میں مبتلا ہوں، اس لیے زیادہ لکھ نہیں سکوں گا۔

مطلب میرا آپ کی طرف سے پیشتر ہی آ گیا تھا، وہ تدبیر، کہ فلاں صاحب تدبیر نہیں، تدبیر آپ نکالیں
صاف میں کر دوں گا۔

آپ بیچ اور میرے شیشے پر زمین کھسکا کر آگ لگا دیجیے، جدھر جدھر آگ ہو جائے گی
آپ ۵ گھنٹے آدھے جلیں گے، یوں اور ڈگی دوڑ جائیں۔
وسیلہ کا بیان جلد ہی آپ سے ملاقات کر دوں گا۔
یہاں کے حالات اور مجبوریوں سے ... ہے، دونوں ... پریشان ہیں
میرا اب لکھا نہیں جاتا۔

آپ کا مجبور
جوش

[redacted] ●●●●● II

(۱۴)

PUBLICATIONS DIVISION
...try of Information & Broadcasting
Old Secretariat,
Delhi.

Dated ۲۷ ۹/۵۰

مرزا صاحب، جموعہ پہ ہزار بار لعنت۔ آج کل تپ دست سے بھی کچھ زیادہ خوب گئی۔

قسطوں نے دم نکال رکھا ہے، نو سو اسی (۹۸۰) میں سے صرف چار سو چالیس

بچے ہیں، اور مصارف کا عالم وہی ہے۔ کیونکہ جو رہ جوے، بیرونی چھوٹے۔

ایک عشرہ سے تو یہ عالم ہے کہ ہر فی روپیہ سود پر سخاوت کہیں سے قرض

لا رہا ہے، جس سے گھر کا کام چل رہا ہے۔ U Thanten

اگر میرے پاس اس وقت روپیہ ہوتا تو یقین جانیے تار کے ذریعے

روپیہ کرتا ہے۔ آپ کو ہیضہ تو ہے لیکن پورا پورا اندازہ نہیں کہ

مجھے آپ سے کس قدر محبت ہے۔

مزا تو یہ ہے کہ ہمارے یار بھی ہماری ہی طرح کب کے کب

مفلسی میں ساجھے، مدد کرے تو کون کرے

اب رہے مالدار احباب، سو وہ مادر ... قبلہ جوش صاحب، تو

کہتے ہیں، کتنی تیمارداری سے بتا دیتے ہیں کہ ہم زر کی طلبی میں ...

مجھ تو بڑی الجھن ہے کہ آپ کیسے اچھے ہوں گے۔ ارے صاحب روپیہ ہی

نہیں تو علاج کیسا۔ کوئی نہیں کمبخت جو قرض دے دے؟

آج کون کس کے کام آتا ہے۔

تمہاری جیوتی کے ... دل، اور گلا ... [illegible]

بیوی بچوں کو سلام - بچوں کو پیار - ... [illegible]

لطف آگر ... [illegible] ... زیادہ ... [illegible]

والسلام ... [illegible]

جوش



مرزا جعفر حسین

(سوانحی خاکہ)

ولادت فیض آباد ۱۰ جنوری ۱۸۹۹ء۔ پدری سلسلۂ نسب سلطنت اودھ کی مشہور سیاسی اور علمی شخصیت خانِ علامہ نواب مرزا تفضل حسین خاں سے ملتا تھا۔ نانا شفاء الدولہ حکیم سید افضل علی فیض آبادی تھے۔ انھیں کے محلات میں رئیسانہ انداز میں پرورش ہوئی۔ ابتدائی تعلیم قدیم طرز کی ہوئی لیکن اصرار کر کے اپنے لیے انگریزی تعلیم کا بھی انتظام کرایا۔ نویں جماعت تک فیض آباد کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں پڑھتے رہے۔ والدہ کی وفات کی وجہ سے نویں میں فیل ہو گئے۔ اس کے بعد لکھنؤ آ کر اسلامیہ ہائی اسکول میں نام لکھایا اور اسلامیہ لاج نامی ہوسٹل میں رہنے لگے جہاں سید مسعود حسن رضوی ادیب اور علی عباس حسینی بھی رہتے تھے۔ ان دونوں سے مرزا صاحب کے قریبی مراسم ہو گئے۔ بیخود موہانی اور یاس یگانہ سے بھی اسی زمانے میں تعارف ہوا۔

فیض آباد کی جائیداد سے آمدنی کا سلسلہ موقوف ہوا تو مرزا صاحب نے مٹی کا تیل فروخت کر کے خرچ چلایا۔ کیننگ کالج [موجودہ لکھنؤ یونیورسٹی] سے انٹر اور بی اے پاس کیا اور اسی زمانے میں لکھنؤ کے متعدد عمائد اور شاعروں ادیبوں سے تعارف اور دوستی ہوئی۔ مطالعے کا بھی شوق بڑھا اور انگریزی زبان پر عبور حاصل ہو گیا۔ مذہبی خیالات میں بھی انقلاب آتے رہے۔ باری باری ہندو دھرم، دہریت، عیسائیت اور لامذہبیت کی طرف مائل ہوئے۔ آخر پھر اسلام کی طرف آ گئے۔ جوش ملیح آبادی سے بے تکلف دوستی کا بھی یہی زمانہ تھا۔ شہر کے ماحول کی رنگینیوں سے بھی متاثر ہوئے اور مے نوشی اور طوائفوں کا شوق پیدا ہوا۔ اسی زمانے میں شادی ہوئی۔ وکالت کا امتحان پاس کیا اور پریکٹس بہت اچھی چلنے لگی۔

۱۹۳۰ء میں اہلیہ کی وفات سے متاثر ہو کر وکالت ترک کر دی۔ آخر مہاراجہ محمود آباد نے انھیں دو سو روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا۔ مہاراجہ کے اثر سے قومی سیاست اور تحریکِ آزادی میں عملی دلچسپی پیدا ہوئی۔ مہاتما گاندھی، مسٹر جناح، مسز سروجنی نائیڈو، پنڈت نہرو اور مولانا آزاد وغیرہ سے ملاقاتیں رہیں۔ ایک عرصے تک مذہبی سیاست میں بھی سرگرم رہے۔ عوامی زندگی کی مصروفیتوں نے معاش کو متاثر کیا اور اس کے بعد انھیں مکمل اقتصادی اطمینان میسر نہ آیا۔ تقسیم ہند کے بعد عملی زندگی سے کنارہ کش ہو گئے۔

ادب سے دلچسپی ہمیشہ قائم رہی۔ شاعری بھی کی تمکین تخلص رکھا تھا۔ موسیٰ لاف کے نام سے انگریزی میں اور پیامِ نو کے نام سے اردو میں اخبار نکالتے تھے۔ اردو کے ممتاز رسالوں میں بہت مضامین لکھے اور اخراجات چلانے کے لیے دوسروں کے نام سے متوسط قسم کے ناول بھی بہت لکھے۔ مطبوعہ کتابوں کی فہرست درج ذیل ہے: ۱۔ ہماری حکایات ۲۔ سنائے غالب ۳۔ بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں ۴۔ مسعود حسن رضوی حیات و خدمات ۵۔ ادبیات و شخصیات ۶۔ لکھنؤ کا شاہی دسترخوان ۷۔ قدیم لکھنؤ کی آخری بہار ۸۔ کشمکشِ حیات (آپ بیتی) ان کے علاوہ غیر مطبوعہ مسودے اور متفرق تحریریں بڑی تعداد میں ہیں۔ مرزا جعفر حسین کی زندگی کا آخری دور امراض اور افلاس میں گذرا۔ مختلف اداروں کی ناکافی مالی امداد پر بسر اوقات رہ گئی تھی۔ بینائی تقریباً ختم ہو چکی تھی اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے لیکن زندہ دلی برقرار اور یادداشت قابلِ رشک تھی۔ ۱۸ جون ۱۹۸۹ء کو وفات ہوئی۔ [ڈاکٹر نیر مسعود، لکھنؤ]

راغب مرادآبادی

میں ہی بولوں گا نہ تو ہی بولے گا
بے گناہوں کا لہو بولے گا

موسمِ گل میں یہ اعجازِ جنوں
ایک اک تارِ رفو بولے گا

مے کدہ بھی ہے کرامت کا مقام
دستِ ساقی میں سبو بولے گا

فصلِ گل آئی تو اک اک غنچہ
پی کے صہبائے نمو بولے گا

پاسِ پیمانِ محبت ہے مجھے
چپ رہیں دوست عدو بولے گا

تیری انگشتِ حنائی میں ہے سحر
سنگِ خارا کو بھی چھو بولے گا

ہوگا جب داخلِ مسجد کوئی رند
پاک ہے ظرفِ وضو بولے گا

میں بد اخلاق نہیں ہوں مجھ سے
کیوں بتِ عربدہ جو بولے گا

جرمِ حق گوئی میں سر جانے پہ
ہر اک اک بنِ مو بولے گا

ملک اس کا ہے، اسی کیلئے حمد
ایک اک ذرہ لہٗ بولے گا

ہوک اُٹھے گی مرے دل سے راغب
جب یہ پیاسا لبِ جو بولے گا

۱۱۰۱-۱۷/۳-۲۰، فیڈرل بی ایریا کراچی

غلام ربّانی تاباں

شمع جلی پروانے آئے
مقتل میں دیوانے آئے

غم کی محفل سب کی محفل
اپنے کیا بیگانے آئے

سنگِ ملامت، سنگِ جراحت
اکثر جی بہلانے آئے

اپنا اپنا دامن سی کر
لوگ جنوں سکھلانے آئے

تارے گن کر رات گزاری
یاد کئی افسانے آئے

دیر و حرم بھی خوب تھے تاباں
راس مگر میخانے آئے

۲۲- ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵-

شروَن کمار ورما

۱۱/۱۸۰۔ کوچہ لبان۔ امرتسر ۱۴۳۰۰۶ (پنجاب)

منجو ڈیئر



Nahvi Kashmiri

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ منجو نے نائٹ گاؤن شانوں پہ ڈالا اور دروازہ کھول دیا۔

"ممّی آپ ــــ !اس وقت ــــ !"

ممّی نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور کہا ــ "گاؤن ڈھنگ سے پہنا کرو بند کرو سامنے سے"۔ ان کا لہجہ کسی سخت مزاج ہیڈ چڑچڑی وارڈن کی طرح کُھردرا تھا ــــ یہ سب کیا ہے ــ ؟ وہ کمرے میں بکھری چیزوں کو دیکھ رہی تھیں۔

منجو کے کپڑے کرسی پر پڑے تھے۔ سلیپر کا ایک پاؤں باتھ روم کے باہر اوندھا پڑا تھا۔ دوسرا پلنگ کے نیچے سے جھانک رہا تھا۔ ٹیپ ریکارڈر قالین پر تھا قریب ہی چائے کی پیالیاں بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔ کتابیں رسالے کچھ بھی اپنی جگہ پر نہیں تھا سنگھار میز پر ہر چیز جیسے نظر انداز کئے جانے کی شکایت کر رہی تھی۔ لگتا تھا، منجو رات بھر ہر چیز سے لڑتی رہی ہے۔

"یہ کمرہ ــــ کیا تم اس میں رہتی ہو"۔ ممّی مایوسی سے بولیں "ڈِس گس ٹنگ" (DISGUSTING)

"آپ بہت دن بعد آئی ہیں نا ــ اسی لیے"۔ منجو مسکرائی میلی اُداس سی مسکراہٹ۔

"تم ایسی تو نہیں تھیں ــ" ممّی نے تکیئے کے نیچے سے جھانکتی خواب آور دوا کی شیشی اُٹھالی ــ کیا ہے یہ۔ شرم آنے لگی ہے مجھے تمہاری عادتوں پر ــ مینڈیو رویز"

منجو نے لاڈ سے باہیں ماں کی گردن میں ڈال دیں اور پیار سے اُس کا منہ چوم لیا ــ "اوہ ــ کم ممّی ــ"

"ڈونٹ بی سِلی ــ" ممّی نے اُسے الگ کر کے خود کو آئینے میں دیکھا بال سنوارے جو انھوں نے شوہر کی مرضی کے خلاف کٹوا دیئے تھے منجو نے بھی اعتراض کیا تھا ــ آپ کے چہرے پر بھرا بھرا جوڑا ہی اچھا لگتا ہے"۔ ممّی نے باپ بیٹی کسی کی بھی پروا نہیں کی تھی ــ کہا تھا ــ تم لوگ میری کون سی بات مانتے ہو"۔ رخساروں پر پوڈر اور روج کی تہہ جما کر انھوں نے بیٹی کی طرف دیکھا اور کہا ــ "تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا ہے ــ ؟"

"رات ٹھیک سے نیند نہیں آئی سلیپنگ پلز لی تھیں"

"بی کیئر فُل مائی چائلڈ"۔ ممّی نے کسی تجربہ کار نرس کی طرح نصیحت کی اور دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ قالین پر ایک ویڈیو کیسٹ سے ٹھوکر کھا کر ناراضگی سے بولیں ــ "منجو ڈیئر، یُو آر لُوزنگ انٹرسٹ اِن تھنگز ویری بیڈ ــ !"

منجو ہنس دی۔ گاؤن کی ڈوری کس کر باندھی اور بولی "نو ممّی اٹ از آل ــ" ماں کا سپاٹ خالی چہرہ دیکھ کر وہ بات بھول گئی۔

"ٹیک کیئر آف یُو ــ" ممی نے نصیحت کی اور جیسے کچھ یاد آ جانے پر بڑبڑپن سے بولیں ــ سلویا کو بھیجتی ہوں کمرہ ٹھیک کرنے کو اور ہاں میں دوسری فلائٹ سے دہلی جا رہی ہوں ــــ"

ممّی کے جانے پر منجو نے دروازہ بند کر لیا۔ کمرے میں مخصوص فرانسیسی عطر کی مہک رہ گئی تھی جو ممّی استعمال کرتی تھیں۔ ان کے بدن کی خوشبو اسکن کلوشوارلس کو تو وہ ترس گئی تھی ــ کتنا من کرتا تھا ممّی سے لپٹ کر رونے کو ــ وہ ممتا بھری مہک، جو اس نے بچپن میں محسوس کی تھی اور جو اب اس کے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں چپک کر رہ گئی تھی ــــ فرانسیسی عطر انگریزی لوشنز کی تیز خوشبوؤں میں گم ہو گیا تھا ایک یاد رہ گئی تھی ــ چھپتی ہوئی، رُلاتی ہوئی، پریشان اور اداس کرتی ہوئی گھبرا کر وہ گھر سے نکل جاتی ــ کسی ریستوراں کے شور میں، کسی سنیما گھر کے اندھیرے میں، سڑکوں کی بھیڑ میں وہ اُس چبھن سے بچنے کی کوشش کرتی، کھلنڈرے بے فکر، ابھرتا دوستوں بیک جھگڑوں میں وہ من کی شانتی اور چین ڈھونڈتی۔ سگریٹ اور بیئر کے سہارے وہ راستہ تلاش کرتی اور اکیلی رہ جاتی۔

کون تھی یہ عورت ـــ خالی بوتل جس پر لیبل لگا رہ جاتا ہے۔ اُس نے کڑواہٹ سے سوچا ـ ممی اُسے ہمیشہ اسی سوال کے دلدل میں ڈال جایا کرتی تھی ـ پاپا کلکتہ میں نئی مل لگانے کے چکر میں ـ ممی دہلی میں ـ کسی سیکریٹری سے اُس مل کے لیے لائسنس حاصل کرنے کے چکر میں۔ آنٹی روپا آتما کی شانتی کے لیے کسی سوامی کے چکر میں شوبھا ہندوستان سے مایوس ہو کر STATES جانے کے چکر میں ــ وہ ہنس دی اور آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی ـــ گاؤن اتار دیا ـــ کپڑے پہنتی تو لگتا جھوٹ بول رہی ہے ـ کتنا کچھ بدل گیا ہے ـــ کورد کشیتر، پانی پت فقط شہروں کے نام ہی نہیں ـــ اِن جنگوں میں وہ بھی تو برابر کی شریک رہی ہے ـ بس اب ہر رشیا ـ ٹیک کیئر آف یو ـ منجو ڈیئر ـــ' اُس نے ممی کے لہجے میں خود سے کہا اور کھلکھلا کر ہنس دی ـ ممی اور گریٹ

اور یہ تم ہو ـ پہچانتی ہو خود کو ـ اور یہ تصویر ـ تم کھڑی ہو یہ بوگن ویلیا کی بیل کے پاس ـ پھولوں سے لدی بیل ـــ وہ لڑکی کہاں گئی؟ اس بیل کے پیلے پھول سے تر و تازہ اور ہر لمس سے انجان ـــ تصویر والی بیل تو کبھی کی سوکھ گئی ـ پتائی کرنے والے نے جڑ سے کا گھول اس کی جڑوں میں انڈیل دیا تھا ـ پاپا تب بھی باہر گئے ہوئے تھے، ماما سنگاپور میں تھیں ـــ اُن کا لایا ہوا کرسٹل، وہی لاؤنج میں آج بھی رکھا ہے ـــ یو آر لونگ انٹرسٹ ان تھنگز ـ کیا ہو گیا ہے تمہیں، منجو ڈیئر ـــ بہت دنوں بعد کمرہ کھولو تو اندر گرد ہی ملتی ہے ـ گھر بند اور خالی نہیں رہنا چاہیے ـــ بھوت بسیرا بن جاتا ہے ـــ

وہ ڈر گئی ـــ پھر ہنس دی ـ کیوں دیکھتی ہو اب یہ آئینہ ـ پکا حرامی ہے یہ ـــ یہ تو سوئیاں ہی چبھوئے گا ـــ دوست نہیں ہوتا کسی کا ـ لیکن آئینہ دیکھنے کا شوق تو آپ سے آپ ہی پیدا ہو گیا تھا۔ اُس دن سے جب اسے اپنے بدن میں ہونے والی خوشگوار لیکن حیران کن تبدیلیوں کا احساس ہونے لگا تھا۔ اُس کی رگوں میں لہو کھولنے لگا تھا جیسے اُسے مدھم آنچ پر رکھ دیا گیا ہو ـــ وکی انہیں دنوں تو ملا تھا۔ اُس نے منجو کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا تھا تمہارے لہو کی بھاشا میں سمجھتا ہوں ـــ تم اکیلی اسے ڈی کوڈ نہیں کر سکو گی ـــ وکی تجربہ کار تھا کتنے موسم بدل گئے تھے تب سے ـ بوگن ویلیا کی وہ بیل پھر ہری نہیں ہوئی۔ مالی نے معائنہ کرنے کے بعد کہا تھا ـ بہت گہرا گڑھا زمین میں کھودنا ہو گی، صاف کرنا ہو گا چونا، مٹی بدلنا ہو گی ـــ ناممکن سا تھا یہ سب آئینے کے سامنے کھڑے کھڑے اُس نے پورے بدن پر خوشبودار امپورٹڈ لوشن کی ہلکی ہلکی مالش کی لیکن وہ بیل والی منجو مسحور نہیں ہوئی تو آئینہ شرارت سے مسکرایا اُس نے سوچا، تو ڈالوں کم بخت کو ـ دشمن جان کا ـ پہلے پہل جب آئینہ ٹوٹا تھا تو وہ ڈر گئی تھی ـــ اُس نے اور وکی نے ساری کرچیں سمندر میں پھینک دی تھیں ـــ سمندر میں تو سارے شہر کے گٹر آ کر گرتے ہیں ـ اور وکی نے کہا تھا ـ منجو ڈیئر اس پریشان ہونے یا ڈرنے کی کیا بات ہے ـ آئینے تو ٹوٹتے ہی ہیں ـ دیوار کے سنگ ہیں ـــ وہ کہیں کہہ رہا تھا ـ منجو کچھ بھی تو کچھ نہیں ـ

وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ بستر پر با تصویر سالانہ کھلا پڑا تھا ـ سالانہ ڈائجسٹ دیتی کہ وہ پڑھتی رہی تھی ـ ہاؤ ٹو کیپ یور سیلف فٹ اینڈ فائن ـــ خوراک، ورزش مالش، لوشنز، دوائیں ـ کمرے میں کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں تھی منجو ڈیئر یو آر لوزنگ انٹرسٹ ان تھنگز ـــ

پھر دستک ہوئی۔ اُس نے پھر گاؤن پہنا ـ کیا مصیبت ہے ـــ اُس نے دروازہ کھولا ـ سلویا چائے کی ٹرے لیے کھڑی تھی ـ

"گڈ مارننگ بے بی ـ میڈم بولا ـ بے بی کو چائے دینے کا اور ویٹ کرنے کا"۔ وہ مسکرائی ـــ

اندر قالین پر بیٹھ کر وہ چائے بنانے لگی۔ پیالی منجو کو تھماتے ہوئے کچھ رازداری، کچھ شرارت سے بولی ـ "بے بی تم نے گاؤن ٹھیک سے نہیں پہنا، لو اینڈ ویئر بیڈ ٹیسٹ ـ"

"اِس سے کیا فرق پڑتا ہے ـ" منجو نے اُداسی سے کہا اور سگریٹ سلگا لیا۔ سلویا چیزیں قرینے سے رکھنے لگی۔ منجو کٹ گلاس کے فرانسیسی فانوس کو دیکھ رہی تھی ـ کیسا خالی خالی اور بے رنگ لگ رہا تھا جب بلب روشن ہوتے ہیں تو بات بنتی ہے ـــ

"منجو ڈیئر، اصل چیز تو اندر کی روشنی ہے ـ" راکی نے اُسے باہوں میں بھر کر فلسفیانہ انداز میں کہا تھا ـ "باہر کا شیشہ تو جھوٹ ہے، خوبصورت جھوٹ۔ اندر کی روشنی مت بجھنے دو ـ" وہ بلیک آؤٹ کی رات تھی اور دشمن کے جہاز فضا کو چیرتے گزر گئے تھے ـ فائر، دھماکہ اور ایک شعلہ قلابازیاں کھاتا سمندر کی طرف گرتا چلا گیا تھا پھر آل کلیئر کا سائرن ـــ پھر راکی برازیل چلا گیا ـ میکسیکو چلا جاتا تو کیا فرق پڑتا۔

سلویا نے ہر چیز ٹھکانے پر رکھ دی تھی بالکونی کا دروازہ کھول دیا تھا سمندر کی طرف سے آنے والی ہوا میں نمک تھا ـ سلویا برتن لے کر چلی گئی۔ منجو نے دروازہ بند کیا اور گاؤن اُتار دیا۔ کمرے میں کھڑے اُس نے سوچا ـ کیا ڈھونڈتی ہے وہ اپنے آپ میں اسی کھنڈر میں کہیں ایک دیا ہے چھوٹا سا ـ کسی نے کہا تھا یاد نہیں کون تھا ـــ آئینے میں وہ اپنے اندر تو نہیں دیکھ سکتی ـ صرف جسم دکھائی دیتا ہے ـــ اصل چیز تو اندر کی روشنی ہے ـ باہر کا شیشہ تو جھوٹ ہے ـــ مایا ہے ـــ دھرتی کا جو حصہ سورج کے سامنے آتا ہے وہی روشن ہوتا ہے ـ روشنی نے اسے چھوم کر دیا تھا ـــ میرے سامنے ما کر دو ـ دھرتی کی طرح ـ وکی، راکی، روشی سب ایک ہی طرح سوچتے اور باتیں کرتے ہیں ـ لیکن آئینہ تو کچھ اور ہی کہتا ہے ـ پتہ نہیں کون جھوٹا ہے ـــ !

وہ کونے میں رکھے ستار تک گئی ـ غلاف کی گرد تو سلویا نے جھاڑ دی تھی بہت دنوں سے اُسے نہیں نکالا گیا تھا۔ پتہ نہیں وہ مضراب ان دنوں کہاں کھو گئی ـ ممی نے پیا میری شکایت کی تھی ـ منجو ڈیئر تم آج کل کس سُر میں نہیں ہو ـــ اُس نے

ستار اٹھایا، تار پر انگلی رکھی تو مُردہ سی جھنکار ہو کر رہ گئی — تمام تار ڈھیلے ہو رہے تھے
اس نے ستار غلاف میں رکھ دیا اور بستر پر جا لیٹی — زیر جامے جو سلوا کے تکیے پر رکھ
گئی تھی کوڑے میں پھینک دیئے۔ جانے کیوں ان کے نمبر بڑھتے جا رہے تھے۔

"منجو ڈیئر — تم نے بتایا نہیں تمہارا فون نمبر بدل گیا ہے —" شوہر نے
ایسے کہا تھا جیسے اس سے بہت اہم بھول ہو چکی ہو۔ کچھ دن کے بعد ہر کوئی
شکایت کرنے لگتا تھا — کیوں ہوتا ہے ایسا اس کے ساتھ — کم از کم سات گھنٹے
سویا کرو، فیملی ڈاکٹر نے نصیحت کی تھی — اپنا خیال رکھا کرو — دیرا نے سمجھایا تھا
یہ کہاں کی دوستی ہے — منجو نے سلیپنگ پلز کی تعداد بڑھا دی۔

وہ بالکونی میں جا کھڑی ہوئی۔ سمندری ہوا کا نمکین بوجھل جھونکا اس
سے لپٹ گیا۔ ریلنگ پر کھڑی وہ بوڑھے سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے ہتھیلیاں
بھیگی محسوس کیں — دونوں ہتھیلیاں دیکھیں۔ گوپی نے بھی دیکھی تھیں اور چوم لی
تھیں۔ سوئمنگ پول پر بیئر پیتے ہوئے اس نے کہا تھا — "ونڈر فُل، تم سب سے
الگ ہو، گریٹ اینڈ فائن، کبھی کسی سے نفرت نہیں کر سکو گی۔ تم صرف محبت کرنے
کے لیے پیدا ہوئی ہو — یہ لکیر دیکھی — معاف کر دو گی ہر غلطی ہر گناہ — یو آر ویری گریٹ"
وہ مسکرا دی تھی — اور کیا کرتی — دستِ رنگیں کی لکیروں میں یہی لکھا ہے۔ اس سے
دو سال چھوٹا گوپی خود اعتمادی سے کہہ رہا تھا — منجو بیئر کے دو گلاس چڑھا گئی تھی
گوپی اُسے سہارا دے کر اندر کمرے میں لے گیا — اور جب وہ واپس آئے تو گوپی سوئمنگ پول
سے نکل کر سمندر کی طرف چلا گیا تھا — اس نے بہت چاہا کہ گوپی سے نفرت کرنے لگے لیکن
یہ تو اُس کے ہاتھ کی لکیروں میں لکھا ہی نہیں تھا۔

بہت نیچے سڑک کا دل دھڑک رہا تھا۔ سامنے سمندر تھکا ہوا اور شانت تھا
دور تک پھیلا ہوا — ایلی فینٹا کیوز کی طرف بڑھتی ہوئی ایک لانچ تھی — سمندر آگے
پیچھے لہرا رہا تھا — بابا اُس نے سوچا تھا کہ سمندر کا دوسرا کنارہ دیکھے — ادم نے کہا
تھا سمندر کا دوسرا کنارہ نہیں ہوتا — پھر بھی تلاش کرو — زندگی نام ہے تلاش کا —
آگے اور پیچھے پل سے کٹ کر جیو۔

"تم مرچنٹ نیوی چھوڑ دو یہیں رہ جاؤ میرے پاس۔"

"منجو ڈیئر تم زندہ رہنا بھول رہی ہو — دکھ ہی سمندر ہے نہ جہاز نہ کنارہ، زمین
نہ تم سب خواب ہے خیال ہے جھوٹ ہے۔ اس لیے خوبصورت اور پُرکشش ہے۔ اُسے
پکڑ کر مت پورا ہیں کرنے کی خواہش سے اُدھر اٹھ جاؤ — یہی سچا سکھ، من کی شانتی اور
آتما کی روشنی ہے — تب وہ اُسے سمندر اور ساحل کا راز سمجھانے شہر چھوڑ سمندر کے کنا
رے گیا تھا۔ سمندر چاند کی طرف اُچھل رہا تھا، چاند اُس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا۔ ایک
آوارہ آبی پرندہ فضا میں غوطے لگا کر چیخ رہا تھا۔ شاید اپنے ساتھی کو بلا رہا تھا۔ بیئر کی خالی
بوتلیں ریت پر پڑی تھیں۔ تنہا نربھیک، سمندر شانت تھا — منجو نے خود کو سمیٹنا چاہا تو

بکھر گئی — وہ آبی پرندہ پھر آیا — لیکن چٹان پر خاموش بیٹھ گیا — ادم وہاں تک گیا تھا
سمندر جھاگ چھوڑ رہا تھا — لوٹا تو اس کے ہاتھ میں خالی ٹوٹی ہوئی سیپی تھی — منجو
کی مٹھی میں ریت تھی — آخر ہتھیلی میں خراش کا احساس رہ گیا — خالی پن کا اذیت
ناک احساس — وہ ہنس دی تھی۔

"ہنس کیوں رہی ہو —؟"

"رویا نہیں جا رہا —"

تو اس پل منجو بالکونی میں اکیلی کھڑی تھی اور ہنس رہی تھی — سمندر اس
سمے شانت تھا یا شاید ایسا لگ رہا تھا۔ سورج سمندر کے بغیر جل رہا تھا۔ سورج کا سمندر
سے وہ رشتہ نہیں جو چاند کا ہے — سورج تو اُسے قطرہ قطرہ پیتا ہے — وہ پلٹی — منی
پلانٹ کی بیل نے اُسے روک لیا۔ یہ بیل بھی زرد ہونے لگی تھی — رشی نے کہا تھا — اس
چھوٹے سے گملے میں اب اور جان نہیں رہی۔ کھاد ڈالو گی تو جڑیں جل جائیں گی — اس
کے لیے پلاسٹک کا منی پلانٹ لے آیا تھا، جسے منجو سمندر میں پھینک آئی تھی — ایک
زرد پتہ ٹوٹ کر گرا — وہ اُداس ہو گئی۔ لگا اس کے اندر کچھ ٹوٹ کر گرتا چلا جا رہا ہے
وہی دستک سنائی دی۔ کمرے میں آئی تو آئینے کے سامنے پہنچ کر احساس
ہوا کہ وہ بے لباس ہے — یو آر لُکنگ انٹرسٹ اِن تھنگز — منجو ڈیئر — گاؤن
پہن کر اُس نے دروازہ کھولا — کوئی نہیں تھا۔ برآمدہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔
دروازہ بند کر کے وہ نہانے چلی گئی۔ شفاف باتھ ٹب، خوشبودار صابن، پینٹنگ سالٹ
کا مہکتا جھاگ — وہ اُس میں اتر گئی۔ کتنا من چاہا تھا اسی طرح سمندر میں اترنے
کو — ایلی فنٹا کیوز جاتے ہوئے۔ اس نے کنارا بجاتے جمی سے اپنی اس خواہش کا
اظہار کیا تھا — وہ ڈر گیا تھا — یو آر پی کنگ آفلی ڈفی کلٹ ڈیئر ڈیئر، جمی نے خوف
اور پریشانی سے کہا تھا —

پاپا کلکتہ میں تھے۔ ممی دلی میں۔ گھر میں قیمتی فرنیچر تھا، قالین تھے، نمائشی
اور آرائشی سامان تھا، پینٹنگز تھیں۔ ٹی وی اور وی سی آر تھا، فریج تھا، کتابیں اور
رسالے، اخبار، کاریں، نوکر، ٹیلی فون — پھر بھی اُسے گھر سے وحشت ہوتی تھی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف گوپی
تھا۔ اُسے سوئمنگ پول پر بلا رہا تھا۔ اس نے ایک بار گوپی سے پوچھا تھا — جب تم
لڑکیوں کے ہاتھ دیکھتے ہو تو کیسا لگتا ہے —؟ وہ ہنسا تھا — جیسا کسی بڑھیا
ریستوراں یا فاسٹ فوڈ شاپ سے لذیذ کھانا کھا کر نکلنے پر محسوس ہوتا ہے —" وہ
سمجھ گئی تھی کہ بات جہاں احساس کی نہیں بھوک کی تھی اور وہ بجائے سوئمنگ پول پر
جانے کے سمندر کی طرف چلی گئی تھی۔

سمندر ریت پر خالی سیپیاں اور جھاگ چھوڑ رہا تھا اور مضطرب نظر آ رہا تھا۔
آبی پرندے غوطے لگا رہے تھے اور چیخ رہے تھے کسی نے بیئر کی خالی بوتل چٹان پر

بلراج کومل

ستارے جام میں اتر آئے

ستارے جام میں
اس وقت تک
اترے نہیں تھے

چار سو، گہرا اندھیرا تھا
کوئی آواز گونجی تھی
اٹھی تھی درد کی اک موج
کھڑکی بند تھی
دیوار و در میں
ایک دستک سی معلق تھی
برستے بادلوں کے درمیاں
ہم دیر سے خاموش تھے
پھر ایکا ایکی تم نے پوچھا
رات کا ہے، دن کا ہے
یہ کون سے موسم کا منظر
یہ دستک میرے دل پر
یا کوئی خواب ہے
جو تم کو روز و شب جلاتا
ان پھر مسلسل ہو گئی تھی
اور ستارے جام
[illegible] اتر آئے ـــ

ایک بے عنوان تصویر پیشانی پر

برگد کا اک پیڑ پرانا
چتکبرے سانپوں کا سایہ
ابھی شاخوں کے گھیرے میں
خون میں لت پت ایک آنکھ
کٹا پھٹا سا ایک کان ہے
پیلے گھوڑے کے دولب ہیں
گردن سوکھی، سیخ، سلائی
چٹیل، کھوکھل، بنجر سینہ
پیٹ کے ایک شگاف میں روشن
چوہے کتے، چار مسافر
ٹانگوں کی محراب سے بہتا
سرخ، سلگتا، جلتا، لاوا
پاؤں میں کالے پتھر کی بھاری

کوئی بھی عنوان نہیں ہے
بجلی کے کھمبے والی، بس
خطرے کی تصویر بنی ہے

۱۳۶-۵۱ کالکاجی، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹

عبدالعزیز خان

امت بلڈنگ، چوتھا منزلہ فلیٹ نمبر ۱۲۱ ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی۔۳.



چہرے

اس نے آئینہ دیکھا۔ ہلکا سا میک اپ کیا۔ بال سنوارے۔ مسکرائی سوچا اپنے آپ کو کتنا بدلنا پڑتا ہے۔ گھر میں ایک چہرا۔ باہر دوسرا۔ اور سیکڑوں چہرے۔ آج کالج جلد جانا ہے۔ سالانہ جلسے کی تیاری جو کرنی ہے۔

"ماں میرے کپڑے بدل دو؟"

نوکرانی بھی مصروفیت کے وقت ہیڈ لیٹ آتی ہے۔ اس نے نوکرانی سے کہا تھا، "جلد آجایا کر۔ بابا کو دیکھ لیا کر۔ وہ معذور ہے!"

بینک میں آفیسر ہیں اس کے شوہر جو ابھی تک سو رہے ہیں! رات دیر سے آئے تھے۔ کبھی اس معصوم بچے کی طرف دھیان ہی نہیں دیتے؟ دوسرا بچہ بے ہی ٹھیک ہے۔ مگر انہوں نے کبھی اس کی طرف بھی پیار سے نہیں دیکھا۔ چند پوچھا کہ اسکول میں کیا چل رہا ہے۔ کیا بچوں کو خوشی نہیں ہوتی، ان کے پاپا ان سے پوچھیں یا ان سے پیار کریں!۔ بس وہ جو ہے ہر جگہ مرنے کٹنے کے لئے موجود۔ بچوں کے لئے بھی جو کچھ ہے وہی ہے! چکری کی طرح گھومتی ہوئی دن بھر وہ جتنا گھومتی ہے اتنا زمین سال بھر میں کیا گھومتی ہوگی؟ اب تو بس کے آگے یہ سوال سر اٹھائے کھڑا رہتا ہے کہ۔ زمین تو اپنے محور پر گھوم رہی ہے اور اس کا تو کوئی محور ہی نہیں؟

کالج۔ شوہر۔ بچے۔ خود وہ۔ بہت سی باتیں ہیں ان دونوں کے بیچ جن پر بحث ہونی چاہئے۔ بہت سے سوال ہیں اس کے پاس جن کا جواب چاہئے۔ آج کروں گی۔ کل کروں گی۔ کچھ وہ جھکے گی۔ کچھ انہیں جھکائے گی۔ کچھ پرابلم حل ہو جائیں گے۔ پھر کچھ سمجھوتے کر لیں گے۔ مگر روز مرہ کے معمولات ذرا دم لینے دیتے تو۔ کتنی مرتبہ سوچا ہے آج طے کر لوں گی۔ آج بات کروں گی مگر کیا کروں! کام اتنا ہے کہ اسے جھٹکا بھی نہیں جا سکتا۔

بچہ پولیو کا مریض ہے۔ بچپن میں کچھ ضروری ٹیکے اور انجکشن دیئے تھے شاید پولیو کا ڈوز۔ انجکشن نہیں دیا گیا۔ بچہ بستر پر پڑا رہتا ہے۔ جو اس سے ہوتا ہے کر لیتا ہے۔

دیکھ بھال، اس بچے کی طرف دیکھ کر اس کے مستقبل کا سوچ وہ اور بھی رنجیدہ ہو جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ دعا کرتی ہے،

"اے اوپر والے بابا کو ٹھیک سے چلنے پھرنے کھیلنے کودنے کی دے! یا پھر اسے......... ارے! وہ کیا سوچنے لگی۔ وہ تو اس کے دل کا ٹکڑا ہے۔ اسے صحت مند ہونا ہی چاہئے۔!

"ماں! ——— ماں!" وہ پکار رہا ہے۔

ارے ابھی آئی بیٹا۔ تجھے دوا بھی تو دینی ہے۔" وہ اسے اٹھا بٹھاتی ہے۔ اس کے کپڑے تبدیل کرتی ہے۔ دوا پلاتی ہے۔ پھر دھیرے دھیرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتی ہے،

"بابا تو تو راجہ بیٹا ہے۔ نوکرانی سے مالش کروا لینا؟ جانے کہاں کہاں سے کتنی ہی تیل کی بوتلیں منگوا کر مالش کرا چکی۔ مگر فائدہ نہیں،

"نہیں ماں: میں نوکرانی سے مالش نہیں کراؤں گا۔ وہ بہت زور دباتی ہے۔ میں تو تم سے مالش کراؤں گا۔"

وہ رنجیدہ دل سے گھڑی دیکھتی ہے کیا چھوڑے کیا پکڑے رہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

اس کا شوہر بیڈ روم میں سویا ہے۔ اس کے خراٹے باہر تک سنے جا رہے ہیں۔ اسے کوئی فکر نہیں ہے۔ جیسے گھر کا ذمہ اس نے ہی لے لیا! اور شوہر کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ وہ سوئے ہوئے شوہر کو دیکھتی ہے۔ اور سارے مناظر اس کے ذہن میں گھوم جاتے ہیں۔...... وہ پہلے ایسے نہ تھے۔ شادی سے پہلے کالج کی وہ ملاقاتیں۔ دونوں ایم۔ اے۔ کر رہے تھے وہ کیسے بے تاب رہتے تھے کہ کب کلاس آتی ہے۔ کب باتیں ہوتی ہیں۔ وہ وعدے بھری باتیں۔ ساتھ نبھانے اور زندگی بھر پیار کئے جانے کی قسمیں۔ اور آج بدل گیا ہے سب کچھ۔

لو میرج۔ ان کے گھر کے لوگ اب تک ناراض ہیں۔ پھر ذرا ناراضگی دور ہوئی تو ساس بہو کے روایتی جھگڑے شروع ہو گئے۔ انہوں نے گھر الگ لے لیا۔ ٹھیک ٹھیک یاد نہیں۔ اس کے شوہر اس طرح کب سے بدل گئے۔ اس نے تو بہت دنوں بعد محسوس کیا۔

بے بی کو اسکول بھیج دیا ہے کبھی کبھی وہ سوچتی ہے کہ نوکری چھوڑ دے اور گھر میں رہے۔ مگر اسے بے بی کو اونچی تعلیم دلانی ہے۔ بابا کا بھرپور علاج کرانا ہے۔ ان کی کمائی تو ریس اور جوئے میں چلی جاتی ہے۔ وہ تو کبھی کبھی ڈر جاتی ہے کہ کہیں وہ اسے بھی جوئے میں نہ ہار جائیں!

اس کے شوہر کے لئے گھر، گھر نہیں ہے۔ جب جی چاہا آ گئے۔ بظاہر دنیا کی نظروں میں وہ شوہر ہیں اس کے۔ مگر کیا سچ مچ وہ شوہر ہیں؟ نہ پیار نہ ہمدردی بس اپنے کام میں کھوئے ہوئے۔ جیسے آس پاس کوئی نہ ہو۔ نہ بیوی نہ بچے:

شروع میں اسے کہانیاں لکھنے کا شوق تھا۔ ڈانس کا شوق تھا۔ مگر دونوں ادھورے سے دھرے رہ گئے۔ وہ اپنے یہ شوق چاہتے ہوئے بھی پورے نہ کر پائی۔

ایسا لگتا وہ بھی ایک ریس کی گھوڑی ہے۔ جانے کسے ہرا کے فتح مند کرنا ہے۔ ریس کی گھوڑی! بس بے تکان بھاگی چلی جا رہی ہے یا اپنی کولیگز اور سہیلیوں کے درمیان اسے لگتا وہ۔ وہ خود بھی پولیو زدہ ہے۔ اس کی ساری دنیا پولیو زدہ ہے۔ اور تیل مالش کرنے والا کوئی نہیں! ایسے میں شوہر اگر ساتھ دیتا تو بات ہی کچھ اور ہوتی!

کیا فائدہ ہے اس طرح سے ساتھ رہنے کا؟ چھوڑ دے ساتھ؟ مگر پھر سوچتی ہے۔ چلو منگل سوتر تو ہے گلے میں! برائے نام ہی سہی! انسانوں کے اس جنگل میں قدم قدم پر گھات میں بیٹھے آدم خوروں سے یہی منگل سوتر تو بچائے رکھتا ہے۔ وہ اپنی کولیگز اور سہیلیوں میں جب گپ شپ لڑاتی ہے تو کوئی نہیں جانتا کہ اس کے اندر کتنے دکھ ہیں۔ اس کی دنیا کتنی درد بھری ہے۔ وہ ہنستا مسکراتا چہرہ اوڑھ کر تمام لوگوں سے ملتی ہے۔ مسکراتی ہے۔ ہنساتی ہے۔ یہ اس کے ہاتھ میں بھی نہیں کہ وہ دو گھڑی رو سکے۔ نہ کالج میں رو پاتی ہے نہ گھر میں گھر میں تو لاچاری ہو جاتی ہے۔ اس کا دل ہلکا نہیں ہے۔ وہ اپنے شوہر سے فراغت چاہتی ہے۔ مگر وقت اور فرصت کا انتظار ہے۔ گھر لوٹتی ہے۔ کالج کا چہرہ اتار کر واشنگ مشین میں دھو ڈالتی ہے۔ پھر ایک دوسرا چہرہ چڑھا لیتی ہے۔

کالج کے سالانہ جلسے میں وہ ایک نرتیہ ناٹیکا پیش کر رہی ہے۔ لڑکیوں کو نرتیہ کے لئے تیار کرنا۔ ریہرسل کروانا۔ پورے پندرہ دنوں سے ذرا بھی فرصت نہ ملی۔ بس کل کا آخری دن ہے۔ اور فائنل شو کے بعد پھر فرصت ہی فرصت اس کے بعد پھر حساب کتاب جوڑیں گے۔

ایک دو مرتبہ وہ یہ نرتیہ ناٹیکا کر چکی ہے اور لوگوں نے پسند بھی کیا ہے نرتیہ ناٹیکا میں کئی چہرے اوڑھ کر الگ الگ نرتیہ کر کے اسے اپنی دلی کیفیات کا اظہار کرنا ہے۔ اسے لگتا ہے جیسے چہروں کو اوڑھ اوڑھ کر وہ حقیقی زندگی میں بھی چہروں کو اوڑھنے لگی ہے

ایک سہیلی کہتی ہے، "آپ تو بہت ہی ہنس مکھ ہیں۔ ذرا سی بات پر آپ کھلکھلا پڑتی ہیں۔ اور ساری محفل کو قہقہہ زار بنا دیتی ہیں۔"

وہ خاموش ہو جاتی ہے۔ گھر کا سارا کام بچوں کو کھانا کھلانا کپڑے دھونا وغیرہ وغیرہ۔ یاد آ جاتا ہے۔

سوئے بابا کو گود میں بھر لے۔ بے بی کے سر پر ہاتھ پھیرے یا بابا جانے کیا سوچتا ہے اسے پریشان دیکھ کر۔ دکھی ہو جاتا ہے۔

ایک دن جب اس نے کہا "دیکھو بابا۔ تو اتنا چپ نہ رہا کر!"

وہ بولا، "ماں میں تو پڑھنا چاہتا ہوں۔ پڑھ لکھ کر نوکری کروں گا۔ پھر تمہیں کام نہ کرنے دوں گا!"

اس کا دل بھر آتا ہے۔ آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ وہ بابا کے کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ دیکھا بابا پیشاب کئے پڑا ہے۔ اور نوکرانی باہر کسی سے گپ لڑا رہی ہے۔ اگر وہ معذور نہ ہوتا تو کیا اس گندگی میں پڑا رہتا؟

نوکرانی کو اندر بلا کر خوب ڈانٹا اور کہا، "آج جب تک میں نہ آ جاؤں تم یہیں رہنا۔ مجھے کالج میں کام ہے۔ دیر سے آؤں گی۔"

اس نے بابا کا بستر بدلا۔ تھوڑی دیر بابا کو گود میں لئے بیٹھی رہی۔ تھپکتی رہی۔

اچانک اسے یاد آیا کہ اسے کھانا بھی بنانا ہے۔ بچوں کو کھلانا ہے وہ بابا کو بستر پر بٹھا کر کچھ کھلونے دے کر اپنے کام میں لگ گئی۔

فائنل ریہرسل ٹھیک ہوا۔ تقریباً دس بجے گھر پہنچی۔ وہ بہت تھک چکی تھی۔ نوکرانی کو چھٹی دی۔ بابا جاگ رہا تھا۔

"ماں! تم آ گئیں؟"

بابا اپنے پیر پلنگ کے نیچے لٹکا کر کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا یہ دیکھ کر اس نے باہیں پھیلا دیں۔ لگتا تھا بابا دوڑ کر آ جائے گا اور اس کی باہوں میں جھول جائے گا۔

"بیٹے یہ کیا کر رہے ہو؟ تم گر جاؤ گے، میں تمہارے پاس آتی ہوں"
کپڑے تبدیل کر کے اور منہ دھو کر وہ بابا کے پاس گئی۔ اسے اپنے ساتھ سلایا، اسے پیار کیا۔
"ماں! تمہارے بنا نیند نہیں آتی۔" وہ بولا۔ تھوڑی دیر بعد بابا سو گیا۔
اور پھر لائٹ آف کر کے وہ بھی لیٹ گئی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی کراہ اٹھی۔
اسے کل ہونے والے جلسے کی فکر ہو رہی ہے۔

صبح وہ جلد اٹھی۔ سب کام نپٹا کر کے بیٹی کو اسکول بھیجا۔ اور خود کالج کے لئے تیار ہونے لگی۔ تیار ہو کر بابا کے پاس گئی۔ اسے پیار کر کے جانے ہی لگی تھی کہ بچے نے کس کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"ماں! میں دیدی کے جیسا کبھی چلوں گا؟ کبھی دوڑوں گا؟ کبھی اسکول جاؤں گا؟" اس کا گلا رندھ گیا۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس نے تسلی دی۔ "بیٹا گھبرا نہیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ کچھ ہی دنوں میں تو پولیو کا جوتا پہن کر چلنے پھرنے لگے گا!"

دوپہر کو گھر لوٹی تو بیٹی پٹ کر بولی "ماں! بے اچھا نہیں لگتا تم دیر سے کیوں آتی ہو؟"
"بیٹا! بس آج ہی کی تو بات ہے۔" اس نے سوچا کالج کے جلسے میں بے بی کو لے جائے۔ لیکن بابا کو برا لگے گا۔ وہ دکھی ہوگا۔
اور وہ بابا سے پوچھتی ہے، "بابا کیا حال ہے؟" بابا کل کی طرح پھر کھڑا ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے لگا جیسے دوا فائدہ کر رہی ہے۔
ڈاکٹر نے کہا تھا، "چلنے کے لائق بنا دوں گا۔ لیکن پیر کمزور رہیں گے۔"
خیر، "لائق تو ہو جائے۔"
وہ بابا کو دلاسے کر جلدی جلدی کھانا بنانے لگی۔ نہانے اور تیار ہونے میں چار بج گئے۔ بے بی کو سمجھا کر اور دن کا کھانا روز کی طرح میز پر ڈھک کر رکھ دیا۔ نوکرانی کو بھی نصیحت کرنے کے بعد چلتے وہ بابا کے پاس ایک بار پھر گئی۔ بابا دکھی دل سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ کچھ بولا نہیں۔
"بابا تم جلدی سو جانا۔ اچھا میں جا رہی ہوں۔" وہ گھر سے جلدی جلدی نکلی اور کالج کے لئے رکشا پکڑا۔

جلسہ شروع ہوا۔
[illegible] جلسہ ختم ہوا۔

رکشا چھوڑ کر گھر واپس آئی۔ نوکرانی کو چھٹی دی۔ وہ چار نوالے منہ میں ڈالے۔ بابا کے پاس چلی گئی۔ وہ میٹھی نیند سو رہا تھا اُدھر شوہر بھی خراٹے بھر رہے تھے۔ وہ بجلی لائٹ آف کر کے بابا کے بازو میں لڑھک گئی۔
سویرے جلدی اٹھ کر صاف صفائی کی نہائی دھوئی۔ بے بی کے بعد بابا کو نہلایا۔ ناشتہ تیار کیا شوہر بھی ناشتہ کر کے جائیں گے۔ اندر جانے کب لوٹیں گے پھر یاد آیا۔ ارے ہاں آج بابا کو ڈاکٹر کے یہاں لے جانا ہے۔
"ڈاکٹر نے کہا تھا۔ پولیو کا جوتا خرید لیجئے اور روز پہنا کر چلائیے۔"

دھیرے دھیرے بابا پولیو کا جوتا پہن کر چلنے لگا۔ مگر اس کا ایک پیر لچک جاتا تھا۔ پھر بھی وہ بہت خوش ہوئی۔ بابا کے لئے اس نے ٹیوٹر لگا دیا۔ جون میں جب اسکول کھلے گا تو وہ اسے اسکول بھیجے گی۔ آج کل سرکاری قانون کے مطابق اپاہج بچوں کو اسکولوں کے داخلے میں ترجیح دی جاتی ہے۔ اور پھر بابا اپاہج ہوتے ہوئے بھی پڑھنے میں بہت تیز ہے!
آج سنیچر تھا۔ کمائی لٹانے کا دن یعنی ریس کا دن! اس کے شوہر گھر دیر سے آئے کپڑے بدلے اور سو گئے۔

صبح اس کی آنکھ جلدی ہی کھل گئی۔ نوکرانی چھٹی پر تھی۔ دس بجے تک ہلکا چوکا برتن ہو چکا تھا۔ وہ چائے لے کر شوہر کے کمرے میں پہنچی۔ منہ پر چادر تھی۔ چادر ہٹاتے ہوئے اس نے کہا، "اٹھئے نہیں آج بڑی دیر کر دی۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"
ایک آواز۔ پھر دو آوازیں۔ پھر کئی آوازیں۔ مگر کوئی ہل چل نہیں۔ سر ہاتھ ایک طرف لڑھک گیا۔
اسے یوں لگا جیسے صبح نہیں ہوئی بلکہ رات کے ختم ہوتے ہی دوسری رات شروع ہو گئی۔
"ماں —" بابا کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی ڈبڈبائی آنکھوں کے سامنے پولیو زدہ بیٹا کھڑا تھا۔ جو پولیو کا جوتا پہنے بنا ہی اپنے کمرے سے یہاں تک پتہ نہیں کس طرح چلا آیا تھا۔ جس خوشی کا وہ برسوں سے انتظار کر رہی تھی، اسے نصیب ہوئی بھی تو کب؟ اس نے پلٹ کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ جو ابدی نیند سو چکا تھا۔
اس نے لبوں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ جو اپنی بانہیں پھیلائے اس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ لیکن اس کے اپنے پاؤں جیسے شل ہو چکے تھے اس کے پیروں میں ایک قدم بھی آگے بڑھنے کی سکت نہیں رہی تھی۔

مٹھی بھر غزلیں



بشر نواز

◆

اداس آنکھوں میں جانے کتنے سوال دیکھے
مری نگاہ بھول نے کیسے کیسے وبال دیکھے
کوئی تو ہو جس پہ آئینے کا گماں گزرے
کوئی تو ہو جس میں دل بھی اپنی مثال دیکھے
ہر ایک موسم لہو میں چہکار بن کے گونجا
ہر ایک منظر میں لمس ہی خد و خال دیکھے
اندھیرے بچھلے تو آرزو کے شہاب دمکے
فضا میں کتنے لہو کے شعلے اچھال دیکھے
عجب سفر تھا کہ منزلوں پر تو پہنچے لیکن
قدم قدم اپنے خواب سب پائمال دیکھے
جو پھول جیسے شگفتہ تھے تمنا کے گذریں
انہیں نگاہوں میں کتنے رنگ ملال دیکھے
کہیں زبانی بشر یہ دیکھی سبھی آنچ ہم نے
نئی غزل کے تمام دفتر کنگال دیکھے

◆

وہی گیسو، وہی چہرہ، وہی رنگت نکلے
جب کوئی خواب تراشوں تری مورت نکلے
کسی خوشبو کے تعاقب میں سفر بے پھرے
پھر کوئی دشت نہ ہر راہ کی قیمت نکلے
اسی امید پہ خوابوں سے بسالیں نیندیں
کبھی ممکن ہے کوئی خواب حقیقت نکلے
اس سے وابستہ اک اک چیز کو چھو کر دیکھیں
دل بہل جانے کی شاید کوئی صورت نکلے
زندگی تھی کسی بازار کا منظر جیسے
ہم بھی ماتھے پہ سجائے ہوئے قیمت نکلے

◆

یہ بادل تو یوں ملے اِدھر برسے اُدھر برسے
مگر اپنی زمینوں پر تو جب برسے شرر برسے
بہت کچھ سوچ کر کشتی سمندر میں اتاری تھی
مگر جب بادباں کھولے فضاؤں سے بھنور برسے
بدلتے موسموں کا خاک ہوگا ان کو اندازہ
خبر جن کو نہیں بادل کہاں اُمڈے کدھر برسے
بظاہر ٹھیک ہے سب کچھ مگر کچھ ہو نہ جائے
کہ ہر دیوار و در سے ایک انجانا سا ڈر برسے
یہاں تو سنگ باری روز کا معمول ہے شاید
جو پتھر ہم پہ برسے سب لہو میں تر بتر برسے
دعائیں ساتھ سب کے نکلے ہیں ہم بھی بارش کی
مگر ایسا نہ ہو بادل اُدھر اور پھر اِدھر برسے

◆

دیار دل میں ہیں شمعیں تمہاری باتوں کی
بدل کے رہ گئی قیمت سیاہ راتوں کی
نہ مور ناچے، نہ بادل، نہ موج اب کبھی
وہ نرمیاں ہی عجب تھیں حنائی ہاتھوں کی
دھنک کے رنگ بہاتے گذر گیا بچپن
کسی کو دیکھ کے یاد آئی کتنی باتوں کی
تو میرا غیر بھی اپنا بھی، سچ بھی سپنا بھی
ترا وجود ہے تکمیل سارے ناطوں کی
چراغ اشک کہیں ہے کہیں ہیں زخم کے پھول
غموں کے شہر میں گشت آئی ہے براتوں کی

◆

حبابوں کی طرح بننا، ابھرنا، پھوٹتے رہنا
ہماری ایک اک امید کو بے ٹوٹتے رہنا
دیا سانسوں کا سرمایہ مگر یہ تیرگی کہہ کر
کہ اپنے آپ کو اب زندگی بھر لوٹتے رہنا
ستارہ، پھول، شیشہ ٹوٹتے ہیں ایک دن لیکن
لکھا ہے اپنے حق میں لمحہ لمحہ ٹوٹتے رہنا
سفر وہ ہے کہ آئینگی نہ پیچھا ابھی ساتھ اپنے
ہمیں تو دے گی یہ اب ہر قدم پہ چھوٹتے رہنا
بقا ہر کھیل ہے لیکن کوئی طرف ان دے گا
[illegible] کا سنگ سے سر کو کوٹتے رہنا

◆

چھا قدم ہر راہ پہ چل کر دیکھ لیا لوٹ آئے ہم
تنہے آتے پاس تمہارے کس کس سے ٹکرائے ہم
خوشبو خوشبو پیار تمہارا جیسے بیل چنبیلی کی
دھوپ بہت تھی راہ میں لیکن سائے سائے آئے ہم
الجھے الجھے ریشم جیسی دل کی ساری باتیں ہیں
کیا چاہا ہے آخر ہم سے خود بھی سمجھ نہ پائے ہم
چاند نہیں تو کوئی ستارا کوئی دیا ہی دامن کو
روشنیوں کے ہم جو لی تم ظلمت کے ہمسائے ہم
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

◆

نظر ملی، مگر [illegible]
زندگی ہم نے خواب [illegible]
اور تو کچھ بھی [illegible]
اک ذرا آگ تھی [illegible]
خشک پتے نے [illegible]
پھر وہی داستان [illegible]
لمس تیرا [illegible]
دل ایسے جیسے [illegible]
زندگی بھی [illegible]
دھوپ [illegible]
کہاں [illegible]
کس [illegible]
[illegible]
[illegible]

● [illegible] گھاٹی، اورنگ آباد (مہاراشٹر)



تسکین زیدی
بزم خضر راہ، گوالٹولی، کانپور-۱ یوپی

خواب کی پرچھائیاں

دھوپ پورے کمرے کو اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ اور وہ ایک پتھر کے مجسمے کی طرح آنکھیں بند کئے ہوئے خوابوں کے دھندلکوں میں کھویا ہوا تھا۔ بیس برس کا طویل سفر اس کی آنکھوں میں ہزار ہا رنگ بکھیر رہا تھا۔ وہ خواب جو کچھ دیر پہلے وہ سوتے ہوئے ذہن سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی بکھری کڑیاں یکجا کرنے میں مصروف ہو گیا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی فلم دیکھتے ہوئے درمیان سے نکل چلی گئی ہو اور وہ جیتی جاگتی متحرک زندگی میں آ گیا ہو۔ اور دوبارہ فلم دیکھنے کا منتظر ہو۔ لمحہ لمحہ اس کے ذہن کے کینوس پر ماضی کی تصویریں ابھرنے لگیں۔ پارک میں وہ والی بال کھیل رہا ہے۔ اور سامنے چھت پر کھڑی ایک لڑکی اسے خاموش نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ وہ بھی سب کی نگاہیں بچا کر اسے دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کہ کہیں اس کی چوری نہ پکڑ لی جائے...... وہ میچ جیت گیا ہے سارے دوست اسے مبارکباد دے رہے ہیں۔ اور وہ بھی اس کی کامیابی پر مسرور و شاد ہو رہی ہے۔ اس کے شاداب مسکراتے ہوئے چہرے پر دھنک رنگ بکھری ہوئی ہے فتح مندی کی گونج کا اور پھر منظر بدل جاتا ہے۔ کچھ دوسری تصویریں متحرک ہو جاتی ہیں.......

وہی گھر وہی فضا، وہی مانوس چہرے وہی شفیق اور محبت کرنے والے ماں باپ کا ملائم ہاتھوں کا لمس اور رفاقت کا کیف آگیں احساس جلو میں لئے رہتا تھا۔ سیکڑوں سورج اس کی آنکھوں نے طلوع اور غروب ہوتے ہوئے دیکھے تھے۔ اب وہ بچپن کے شوخی و شرارت بھرے ماحول سے نکل آیا تھا۔ اور ایک سنجیدہ و متین انسان بن گیا تھا۔ وقت ایک نہ رکنے والے پرندے کی مانند ہے۔ جو کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ باپ کی خمیدہ کمر لاٹھی کی محتاج ہو گئی۔ ماں کی زندگی نے کروٹ لی اور ان کا دھیان خدا کی طرف لگ گیا۔ "اللہ اکبر" کی گونج کے سائے میں ماں کی تسبیح کی سرسراہٹ آج بھی سماعت سے ٹکراتی رہتی ہے۔ وہی گھر، وہی گلی، وہی ڈرائنگ روم، جہاں زندگی ہنستی کھیلتی دوستوں کے ہمراہ گزرتی تھی۔ اس موڑ پر آ گئی تھی کہ اب ہر طرف سونے سونے پن کا احساس پھیل گیا تھا۔ چہار سمت سکوت بے کراں سناٹا اور دل دہلانے والی خاموشی، کوئی آواز، کوئی بازگشت، کوئی آہٹ، کوئی صدا، جاگتا ہوا کوئی لمحہ نہیں رہا تھا۔ سب خواب خواب ہو کر دھندلکوں کر راکھ ہو کر اسے اذیت بخشتے رہتے۔ کبھی یہی سناٹے آواز بن جاتے، صدا بن جاتے، ابھی وہ اپنے ماضی کی راکھ کرید ہی رہا تھا کہ ایک نحیف اور کمزور آواز اس کے کانوں سے سرگوشیاں کرنے لگی۔

کیا ڈھونڈ رہے ہو میرے لال؟"

"ماں! میں اپنا ماضی تلاش کر رہا ہوں۔"

"بیٹا! ماضی گزر گیا ـــ راکھ بن کر بکھر گیا۔ اب اسے کیوں ڈھونڈ رہے ہو! پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کیوں ضرورت پیش آئی، میں بیمار پڑی جب تو نہیں آیا۔ تیرے باپ خون تھوکتے ہوئے مر گئے تو نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ میں بیوگی کے دن بے چارگی سے گزارتی رہی تو نے خبر نہ لی اور میں بھی خاک کا پیوند بن گئی لیکن تو اپنی رنگینیوں میں ڈوبا رہا۔ زندگی کی ہنگامہ خیزیوں میں کھویا رہا۔ وقت کے زریں اور تابناک لمحوں کو اپنا غدار مانتا رہا۔ اور آج جب یہ لمحے کسی تیز رو پرندے کی مانند تیری گرفت سے دور نکل گئے ہیں تو تو خبر لینے آیا ہے۔ اب یہاں کیا لے گا؟ راکھ ہوتے ہوئے لمحے تجھے کیا دیں گے؟

اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

یہی ادھورے اور اذیت ناک خواب وہ کئی دنوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ خوابوں کی کڑیاں کسی طرح مل جائیں لیکن خوابوں کی تصویریں مختلف شکلوں کے ساتھ ابھرتیں۔ اور ذہن میں آگ بھر جاتیں۔ پرائمری اسکول کی بوسیدہ عمارت، بچپن کے دوستوں کے ساتھ ہنستا کھیلتا مسکراتا ہوا چہرہ وہ کبھی والی بال کی فیلڈ میں تالیوں کی گونج میں اور کبھی شہناز کے قریب اس کی باتوں کی شیرینی میں خود کو ڈوبتے ہوئے محسوس کرتا۔ وہ سالگرہ کا منظر بھی اس کی نگاہوں میں پھر جاتا جب اس کے ماں باپ اس کی سالگرہ مناتے تھے۔ زندگی ایک پرسکون جھیل کی طرح بہتی رہی ...

اور تو اب میں بڑبڑاتے رہنا اس کی زندگی کا معمول بن گیا تھا۔

بیوی پوچھتی "یہ سب کیا ہے؟ آپ سوتے سوتے جاگ... بڑبڑاتے ہیں اب میں آپ کے کمرے میں نہیں سوؤں گی۔ مجھے آپ سے ڈر لگنے لگا ہے۔"

وہ خاموش رہتا۔ اس کے پاس بیوی کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا ادھر کچھ دنوں سے زیادہ تر اس کے خواب کا محور شبانہ ہوتی۔ وہ اکثر سوچتا کہ ان بیس برسوں کے طویل عرصے میں شبانہ پر کیا گزری ہوگی؟ مدت ہوئی اس نے سنا تھا کہ باپ نے اس کی شادی کسی عمر آدمی سے کر دی تھی انہیں دنوں اس کا ایک خط ملا تھا۔ جس میں اس نے اپنی دکھ بھری داستان تحریر کی تھی لیکن اس نے اس کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ پھر اس کی کچھ خبر نہ ملی اور اب وہی ماضی کے لمحے اسے ناگ بن کر ڈستے ہیں اور عجیب عجیب خواہشیں بیدار ہوتی ہیں کہ کاش ایک بار شبانہ سے ملاقات ہو جائے۔ چند لمحے اس کے ساتھ دکھ سکھ کے گزر جائیں۔

اکثر بیوی پوچھتی "یہ آپ سوتے میں شبانہ۔ شبانہ کیا بڑبڑاتے ہیں؟" "کچھ نہیں! یہ وہی شبانہ ہے کہ جس کے ڈھیر سارے خطوط تم نے مجھ سے نکال کر جلا دیے تھے۔"

"اچھا تو یہ وہی شبانہ ہے جسے آپ اس بڑھاپے میں بھی اپنے خوابوں کا مرکز بنائے ہوئے ہیں۔" "تم کیا جانو کہ ماضی کے سہارے کیا لمحے ہیں؟"

"ماضی ــــ ماضی ــــ ماضی۔ میں تو سنتے سنتے عاجز آگئی۔ حال سے غفلت۔ ماضی سے رغبت۔ آخر کیسے ہیں آپ۔ ٹیچر اور رائٹر۔ ہر وقت خوابوں میں گم رہنے والے جھوٹی سچی کہانیاں لکھنے والے۔ ماضی ــ خواب ــ خیال یہ سب بے سروپا باتیں ہیں ــ شبانہ ــ شبانہ ہر وقت آپ کے خیالوں پر شبانہ ہی حاوی رہتی ہے۔ زندگی اجیرن کر دی ہے اس نے۔ اگر اسے اتنا ہی چاہتے تھے تو مجھ سے شادی کیوں کی ــــ؟ جائیے اس کے پاس میں اپنے میکے چلی جاؤں گی۔" یہ کہہ کر بیوی سسک پڑی۔ "یہ کیا پاگل پن ہے؟ عورت خواہ عمر کی کسی بھی منزل میں پہنچ جائے۔ دوسری عورت کا ذکر برداشت نہیں کر سکتی۔ اس کے اندر رقابت کا مادہ ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔ بھلا میں اس عمر میں عشق کروں گا؟" بیوی بڑبڑاتے ہوئے کچن میں چلی گئی ــــ اور وہ صوفہ پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ بھلا وہ کیسے کہے کہ اس کے خیال و خواب کی دنیا تو اس کا سرمایہ ہے۔ جس سے اسے سکون ملتا ہے یہ دولت، تعلیم، ڈگریاں، کار، بنگلہ، شہرت اور عہدہ اس کی زندگی میں کیا کچھ نہیں تھا لیکن

پھر یہ کیوں اتھل پتھل ہو رہی ہے؟ جب سے اس کی نگرانی میں ریسرچ اسکالر لڑکی صبیحہ آئی ہے۔ جس کا موضوع "خواب" ہے۔ تب سے اس کے خوابوں کو اور جلا مل گئی ہے۔

خواب و خیال کی دنیا سے جب اس نے باہر نکل کر دیکھا تو سورج کی شعاعیں اسے وقت کی اہمیت کا احساس دلا رہی تھیں اور وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

شام اپنی پوری رنگینیوں، رعنائیوں، کیفیتوں، شادابیوں اور جلوہ سامانیوں کے ساتھ اس کے آنگن میں اتر آئی تھی۔ روشنی کی پھوار سب کے چہروں پر مسرت کی کرن بن کر پڑ رہی تھی آج اس کی سالگرہ پارٹی میں صبیحہ آئی تھی۔ حسین و خوشنما لباس، خوبصورت سراپا، پرکشش نقوش، دل فریب ادائیں اور رنگ و نور کا مجسمہ بنی ہوئی۔ ہاتھ میں تحفہ لیے ہوئے۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو سر۔ سالگرہ مبارک ہو۔" وہ صبیحہ کو دیکھ کر چونک پڑا ہے۔ وہ رنگ و روپ کی لہروں میں ڈوب گیا۔ اس کی آنکھوں میں ماضی اپنی بھرپور رعنائیوں کے ساتھ جگمگا اٹھا۔ اور اس کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ (تمہیں بھی شبانہ) صبیحہ حیران کن نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی پھر اس نے سنا کہ وہ بیوی سے پوچھ رہی تھی "آنٹی؟ یہ شبانہ کون ہے؟ اکثر میں نے سر سے یہ نام سنا ہے"

"صبیحہ! یہ ان کے بچپن کی کوئی دوست تھی۔ پتہ نہیں انہیں کیا ہو گیا ہے ہر وقت خواب میں ڈوبے رہتے ہیں۔ میں تو اس نام سے عاجز آگئی ہوں۔" بیوی نے اداسی سے کہا۔ صبیحہ خاموش ہو کر سوچنے لگی کہ سر سے کل شبانہ کے بارے میں معلوم کروں گی۔ ضرور ان کا شبانہ سے افیئر چلا ہوگا لیکن اس عمر میں جبکہ بچے جوان ہیں ــ شبانہ کی یاد۔ بڑی عجیب بات ہے۔ پروفیسر صاحب کا فلسفہ ہے کہ گناہ اور ثواب کیا؟ یہ سوچ کے طریقے ہیں جو چیز آپ کو بری لگتی ہے وہ دوسرے کو بھلی لگتی ہے ـــ عجیب شخصیت ہے؟ خوابوں میں کھوئے رہنا سوچتے رہنا دنیا ومافیہا سے بے خبر ـــ میری ریسرچ بھی ادھوری پڑی ہے کچھ ہی ابواب لکھے گئے ہیں۔

ادھر بیوی کے ذہن میں یہ وہم سر ابھار رہا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ صبیحہ ان کی زندگی میں شبانہ بن کر داخل ہو گئی ہو۔ اور وہ ریسرچ کی آڑ میں رنگ رلیاں منا رہے ہوں۔ اسے یاد آیا کہ ایک دن جب وہ صبیحہ کو کچھ بتا رہے تھے وہ اچانک وہاں پہنچ گئی تو وہ گھبرا گئے تھے۔ وہ صبیحہ کے بہت قریب بیٹھے تھے۔

پھر وہ خیالوں کے ہجوم میں گھری ہوئی سالگرہ کے ہنگامے میں کھو گئی۔ سالگرہ کو ختم ہوئے کئی دن بیت چکے تھے لیکن اس کے ذہن پر ایک بوجھ سا

محسوس ہوتا تھا وہ ایک عجیب اضطراری کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اسے شدت سے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ اب اس کے خوابوں کا مرکز صبیحہ بنتی جا رہی ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں جن میں کبھی شبانہ کا عکس لہرایا کرتا تھا اب صبیحہ کا عکس پھیلنے لگا ہے۔ وہ ادھر کئی دنوں سے بہت مضطرب رہنے لگا، اور کھویا کھویا نظر آ رہا تھا۔ بیوی بھی اس کی اس کیفیت سے فکرمند تھی۔ کہ اسے یہ کیا ہو گیا ہے۔ ادھر صبیحہ بھی نہیں آ رہی تھی کہیں وہ باہر تو نہیں چلی گئی یا بیمار تو نہیں ہو گئی۔ جس کی وجہ سے یہ بے چین اور خاموش نظر آتے ہیں

اور پھر ایک دن بیوی نے پوچھ ہی لیا۔ "یہ آپ خاموش کیوں رہتے ہیں کیا بات ہے؟ ادھر کافی دنوں سے باقاعدگی سے نہیں جا رہے ہیں۔ اور صبیحہ بھی پڑھنے نہیں آتی؟ یہ چہرے پر بے چینی اور اضطراب کی لکیریں کیسی ہیں؟"

"آں! کچھ نہیں! جانے کیوں کچھ طبیعت سست رہتی ہے کوئی کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"اجی ہاں۔ اگر آپ کی طبیعت سست ہے تو ڈاکٹر کو دکھائیے۔ آج کل صبیحہ بھی نہیں آ رہی ہے؟"

"میں نے اسے دوسرے گائیڈ کو ٹرانسفر کر دیا ہے۔"

"کیوں؟"

"اسی کی وجہ سے میرا ذہنی انتشار بڑھ گیا تھا۔ ہر وقت خوابیدہ خیال شرارے۔ چنگاریاں۔ جلتی بجھتی تصویریں۔ شعلے ہی شعلے رقص کرتے نظر آنے لگے تھے۔ اس لیے۔ اس لئے۔ میں نے صبیحہ کو۔

بڑبڑاتے۔ بڑبڑاتے۔ اس پر ایک تشنجی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ نیم بیہوشی کی کیفیت میں صوفہ پر لڑھک گیا۔

ایک لمحے کے لئے بیوی کے چہرے پر جو مسرت کی لہر آئی تھی۔ وہ بے چینی میں بدل گئی۔ اور وہ سوچنے لگی کہ اب خواب ہی ان کی زندگی ہے۔ اس کے بغیر وہ جینے کا تصور نہیں کر سکتے۔ تو کیا۔ تو کیا۔ انہوں نے صبیحہ کو ٹرانسفر کر کے کوئی بھول کی ہے؟ غلط فیصلہ کیا ہے؟ —

بقیہ صفحہ ۱۴ منجو ڈیٹیز

سے دی ماری تھی۔ زرد کا جھنا کا ہوا تھا۔ وہ سمندر میں آگے بڑھ گئی۔

"اے۔ اے لڑکی کہاں جا رہی ہو" ایک بوڑھا گھبرا کے پکار رہا تھا وہ لڑکی کی طرف لپکا۔ "اے۔ اے رکو۔ روکو کوئی اسے۔ پاگل ہوئی ہے۔ رک جاؤ۔"

ایک اونچی بے قرار لہر آئی سمندر میں ڈوب لے گئی۔ ایک آبی پرندہ چیختا ہوا چٹان سے اڑ گیا۔

بیانِ ملکیت اور دیگر تفصیلات "شاعر" بمبئی

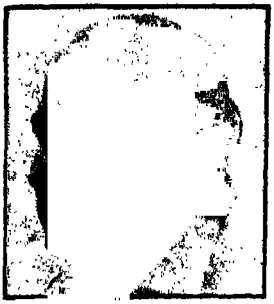
(مطابق فارم نمبر ۴ قاعدہ نمبر ۸)

مقام اشاعت	بمبئی
پرنٹر و پبلشر	ناظر نعمان صدیقی
پتا	دیناتھ بلڈنگ تیسرا منزلہ فاکلنڈ روڈ بمبئی ۴
ایڈیٹر	افتخار امام صدیقی
پتا	دیناتھ بلڈنگ تیسرا منزلہ فاکلنڈ روڈ بمبئی ۴
وقفۂ اشاعت	ماہنامہ
قومیت	ہندوستانی
ملکیت	ناظر نعمان صدیقی
قومیت	ہندوستانی

میں ناظر نعمان صدیقی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط ناظر نعمان صدیقی ۲۸ فروری

بہ خطِ شاعر



ڈاکٹر نریش

تم نے وفا شعاری کی اچھی مثال دی
باقی تھی زندگی کی جو حسرت نکال دی

پہلے تو خوب روئے اُسے یاد کر کے ہم
پھر اک دعائے خیر ہوا میں اُچھال دی

جن کے سروں میں سودا تھا پیروں میں آبلے
ہم نے انہیں متاعِ غمِ دل سنبھال دی

صحرا سے میں نے پوچھا جو مجنوں کا کچھ پتہ
اک مشتِ خاک اس نے مرے سر میں ڈال دی

سو بار امتحانِ بصارت ہوا نریشؔ
تب جا کے اس نے دعوتِ حسن و جمال دی

———

ہیں مطمئن کہ کوئی چشمِ ناز نم تو نہیں
ہمارے بعد کسی کو ہمارا غم تو نہیں

جمالِ یار نمایاں ہے ذرّے ذرّے سے
مری زمیں ترے آسماں سے کم تو نہیں

نماز فرض ہے لیکن نماز سے پہلے
یہ دیکھ لے ترے دل میں کوئی صنم تو نہیں

لکھو زمیں پہ اگر ہے فساد و فتنہ و شر
تمہارے ہاتھ میں تلوار ہے قلم تو نہیں

نریشؔ عزم و عمل سے بدل بھی سکتی ہے
حیات یار کی زلفوں کا پیچ و خم تو نہیں

———

خود کو گہرے کریدنا سیکھو
بند آنکھوں سے دیکھنا سیکھو

ہے جو مقصود تم کو تازہ ہوا
گھر کی دیوار پھاندنا سیکھو

وہ سمجھتا ہے حرفِ دل کی زباں
اس کو دل سے پکارنا سیکھو

ظرف کم ہو تو مے چھلکتی ہے
جامِ مے کو سنبھالنا سیکھو

آگے بڑھنے کا شوق ہے تو نریشؔ
کچھ ذرا پیچھے ہٹنا سیکھو

———

جھوٹ کو سچ کے برابر کر دیا
ہم نے آئینے کو پتھر کر دیا

جذبِ الفت آج ہے جذبِ جنوں
ہم نے قطرے کو سمندر کر دیا

ذہن میں لہرا کے زلفِ یار نے
میری سانسوں کو معطر کر دیا

ساقیا تیرے لبوں کے لمس نے
جامِ مے کو جامِ کوثر کر دیا

دل کے زخموں نے شگفتہ ہو نریشؔ
ہجر کی شب کو منور کر دیا

———

● صدر شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی، چندی گڑھ

ندا فاضلی

۱۰۳ - امر اپارٹمنٹ، ڈانڈ پاڑہ - کھار (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۵۲

[قسط نمبر ۱۷]

دیواروں کے بیچ

رات کو وہ دیر سے دہلی سے دریا گنج کے لئے ایک بس میں سوار ہوتا ہے۔ بس میں ٹکٹ لیتے وقت اچانک اس کی نظر اپنی انگلی پر پڑتی ہے۔ انگوٹھی کی جگہ پر اب انگلی پر اس کا نشان ہی دکھائی دیتا ہے۔ کئی مہینوں کا نشان ہے جلد کو اس نشان کو ختم کرنے میں کئی دن لگیں گے۔ بس میں کافی بھیڑ ہے۔ اسے اپنی سیٹ کے قریب ایک جانا پہچانا چہرہ نظر آتا ہے۔ اب سے پہلے بھی وہ رات کے وقت الگ الگ جگہوں پر مل چکا ہے۔ اس کا نام رام سرن ہے۔ وہ بلند شہر کی کسی بستی سے یہاں آکر پوسٹ آفس میں چپراسی ہوا ہے۔ گاؤں میں اس کی ایک بوڑھی ماں ہے۔ ایک بھائی ہے۔ باپ نے علاقے کے ایک ڈاکو کو پکڑوانے میں پولس کا ساتھ دیا۔ اور اس کے گروہ نے ایک ہفتے کے اندر دن دہاڑے اس ایمانداری کا انتقام لیا۔ پولس نے اس کے مرنے کے بعد مخبری کی رقم ہضم کرلی۔ لیکن گروہ کے نئے سردار نے اس انتقام میں اپنی پرمپرا کو نہیں چھوڑا۔ گاؤں کے ساہوکار کے یہاں سے بیوہ اور اس کے دو بچوں کے لئے کئی مہینے تک پابندی سے اناج آتا رہا۔ جلد ہی جے پرکاش نارائن کی ڈاکو سدھار اسکیم کے تحت، تھانے میں جب اپنے ہتھیار سرکار کے حوالے کر دئے تو ساہوکار نے بھی بے خوف ہوکر اناج دینا بند کر دیا۔ چھوٹی عمر میں گھر کی ساری ذمہ داری رام سرن کے سر آگئی۔ چھ جماعت کے بعد اسکول چھوڑ کر، بچپن میں ہی اسے چھوٹی بڑی مزدوری میں جٹ جانا پڑا۔ اس کا باپ اسے پڑھا لکھا کر بڑا افسر بنانا چاہتا تھا، لیکن قسمت نے چپراسی بنا دیا۔ وہ اپنی بدنصیبی کو، اب اپنی محنت سے چھوٹے بھائی کی خوش نصیبی سے بدل رہا ہے۔ وہ اسکول جاتا ہے۔ دہلی سے ہر ماہ وہ خود روکھی سوکھی کھاکر، جو کچھ بچتا ہے اسے ماں کے پتے پر گاؤں بھیج دیتا ہے۔ اسکول کی تعلیم ختم کرکے بھائی اب شہر کے کالج میں پڑھ رہا ہے۔ کالج کی تعلیم میں فیس اور کتابوں کے ساتھ ڈھنگ کے کپڑوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس بڑھتے ہوئے خرچے کو پورا کرنے کے لئے، وہ آفس کے وقت کے بعد، اسٹیشن پر قلی گیری بھی کرنے چلا جاتا ہے۔ رام سرن سیدھا سادھا گاؤں کا آدمی ہے۔ دوسروں کو اپنے دکھ سکھ میں شریک کرنے کے اس قصباتی سبھاؤ پر ابھی شہری مصلحتوں کی دھول نہیں چڑھی ہے۔ رام سرن کی باتیں سنتے سنتے ندا کی آنکھ لگ جاتی ہے۔ چاندنی چوک کے آخری اسٹاپ پر کنڈکٹر اسے جگاتا ہے۔ پوری بس میں وہ اکیلا ہوتا ہے۔ رام سرن جا چکا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ندا کا فاؤنٹین پین اور جیب کے سارے پیسے بھی راستے میں کہیں نیچے اتر چکے ہیں۔ وہ خالی جیب بس سے اترتا ہے۔ اسے یقین ہے رام سرن نے جس مقصد کو پورا کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس میں وہ ضرور کامیاب ہوگا شہر نے گاؤں کے آدمی کو کامیابی کا راستہ دکھایا ہے۔ وہ اپنی انگلی میں انگوٹھی کے نشان کو سہلاتا ہوا مسجد میں واپس آتا ہے۔ وہاں پاکستان سے آیا ہوا ایک خط اس کے انتظار میں ہے۔ وہ مٹی کی تیل کی ڈبیا روشن کرکے اسے پڑھتا ہے۔ خط بڑی بہن نے لکھا ہے۔

"تم جیسا پتھر دل شاید ہی کوئی ہو۔ ماں جی کی بیماری کی اطلاع تمہیں پہلے دی گئی تھی۔ لیکن تم نہیں آئے۔ مرحومہ آخر وقت تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تمہیں تلاش کرتی رہیں۔ جب بھی بے ہوشی کے وقت میں ہوش کا وقفہ آتا تمہارا نام ان کی زبان پر ہوتا۔ جب تک وہ زندہ رہیں، تمہاری جدائی کے صدمہ کو جھیلتی رہیں، اختر کی ہر خوشی کو آنسوؤں سے بھگوتی رہیں۔ لیکن تم سے اتنا بھی نہ ہوسکا کہ وقت پر آکر مرحومہ سے اپنا دودھ بخشوا لیتے۔"

یہ خط گوالیار سے ری ڈائرکٹ ہوکر دہلی آتا ہے۔ خط پر دو ہفتہ پہلے کی تاریخ ہے۔ پہلے کے خط شاید پوسٹ مین کی نظر میں ضروری نہیں تھے۔ وہ اتنا کمزور نہیں ہے کہ جمیل فاطمہ کے انتقال کی خبر سے اس کی آنکھیں تو نہیں بھیگتیں۔ لیکن جب وہ چراغ بجھا کر سونے کی کوشش کرتا ہے تو آنکھیں پلک سے پلک جوڑ کر بھی نیند سے دور رہتی ہیں۔ وہ اٹھ کر کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے۔ اور پھر اچانک، باہر نکل کر وضو کرتا ہے۔ اور بے وقت کی نماز پڑھنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ مسجد میں قیام کے دوران اب تو ہر صبح کی اذان اسے بستر سے اٹھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ لیکن آج وہ اذان کا بھی انتظار نہیں کرتا بلکہ خدا اور انسان کے درمیان پیش امام کی وساطت کو بھی ضروری نہیں سمجھتا۔ ایسی محویت اس پر نہ اب سے پہلے طاری ہوئی تھی اور نہ بعد میں اس طرح محسوس ہوتی ہے۔ خدا آسمان سے اتر کر موت کی خوشبو کی طرح مسجد کے آنگن میں پھیل جاتا ہے۔ ایک نشے کی سی کیفیت،

ندا کی سوکھے وجود ی ہوا جھی آ ز ا دکر کے اس خوشبو میں تحلیل کرتی جاتی ہے۔ اور وہ آج کی ایک نماز میں آگے پیچھے کی ساری نمازوں کا کفارہ ادا کرتا ہے۔ مسجد میں پہل پہل ہوتے ہی، خدا واپس آسمان کی وسعت بن جاتا ہے۔ اور ندا حجرہ میں آکر اپنے بکھرے ہوئے سامان کو صندوق میں رکھنے لگتا ہے۔ اس نے دہلی چھوڑنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ وہ یہاں سے کہاں جائے گا، اس کے ذہن میں ابھی صاف نقشہ ہے۔ ہندوستان میں بڑی دھوم دھام سے جو اس نے کچھ دن پہلے مونس بھر کر آتا روی تھی، اسے دوبارہ پہن کر وہ اسٹیشن کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ اسٹیشن پہنچ کر وہ بمبئی کا ٹکٹ لیتا ہے۔ لیکن گوالیار کا اسٹیشن آتے ہی وہ بلا ارادہ اتر جاتا ہے۔ وہ وہاں سے سیدھا اس جگہ جاتا ہے جہاں اپنے ماں باپ کی قبروں کے درمیان زہرا بھی مدفون ہے۔ وہ جمیل فاطمہ کے لئے اس کی قبر پر بھی فاتحہ پڑھتا ہے......۔ چہروں اور ناموں کے امتیازات زندگی کے دھوکے ہیں۔ حقیقت صرف مٹی ہے۔ جس کا ہر جگہ ایک نام، ایک چہرہ اور ایک رنگ ہے۔

پنچھی، بالک، پھول، جل، الگ الگ آکار ماٹی کا گھر ایک ہی، سارے رشتے دار

زمینی تقسیم کا وہ سچ جس کی بنیاد پر، سینکڑوں انسانوں کے خون کی سیاہی سے، برصغیر کے نقشے میں سرحدوں کی لکیریں کھینچی گئی تھیں، تقسیم کے چند سال بعد ہی، وقت جھوٹ ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ۴۷ ۱۹ کی تباہ کاریوں کی دردناک داستان دیکھتے دیکھتے اپنے عنوان کا اعتبار کھونے لگی ہے۔ مذہب اور تہذیب کے تصادم میں ڈھاکہ میں عوامی تحریک کا روپ اختیار کر لیا ہے۔ اردو بولنے والے بھی مسلمان ہیں، بنگالی بھاشا میں اپنے دکھ سکھ کا اظہار کرنے والے بھی مسلمان ہیں۔ ایک ہی مذہب کے ماننے والے تہذیبی محاذ پر دو حریفوں کی صورت میں آمنے سامنے ہیں ایک طرف ہتھیاروں کی طاقت ہے۔ دوسری طرف عوامی بغاوت ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان بہاری مسلمان ہیں جو چو طرفہ بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھرے ہوئے آسمان میں اپنے اپنے ستاروں کو تلاش کر رہے ہیں۔ وہ ہندوستان کو چھوڑ کر، اسلامی پاکستان میں اپنے جان و ایمان کے تحفظ کے لئے آئے تھے۔ لیکن ان کی ہجرت سے مدینہ اب تک دور ہے۔

ملکِ خدا میں ساری زمینیں ہیں ایک سی اس دور کے نصیب میں ہجرت نہیں رہی

ان کا سفر ہنوز جاری ہے۔ وہ پھر سے خیمے لپیٹ رہے ہیں۔ ہندوستان کے اخبارات عوامی تحریک کی حمایت کر رہے ہیں۔ دونوں ملکوں میں کشیدگی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کشیدگی کو شہر میں نئی مسلمانوں کی حراست نے اور گہرا کر دیا ہے۔ آسمان کی ویرانی اور چہروں کے سونے پن سے جنگ جھانکنے لگی ہے۔ جن گھروں کے پاکستان سے رشتے ہیں یا خط و کتابت کے تعلق ہیں انہیں مشتبہ نظروں سے دیکھا جا رہا ہے۔ افواہیں جگہ جگہ پاکستانی جاسوسوں اور ان کی کارگزاریوں کی من گھڑت کہانیوں کے ساتھ گشت کر رہی ہیں۔ مسلمانوں کے محلے شام ہوتے قبرستانوں کی طرح خاموش ہو جاتے ہیں۔ پاکستان سے آنے والے خطوط ڈاک والے پہلے کھول کر پڑھ جاتے ہیں۔ بعد میں کافی تاخیر سے تحریر شدہ پتوں پر پہنچتے ہیں۔ شادی کی خبر اس وقت ملتی ہے، جب میاں بیوی، ماں باپ کی ذمہ داریاں نبھانے لگتے ہیں۔ اور موت کی اطلاع آنے تک صاحبِ قبر کی ہڈیاں الگ کر کے دوسرا مردہ اس میں لٹا دیا جاتا ہے۔

ندا کا پاسپورٹ بھی انہیں سیاسی دور اندیشیوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ جمیل فاطمہ نے مرنے کے لئے وقت کا صحیح انتخاب نہیں کیا۔ یوں تو ان کے ہر منصوبہ میں سلیقہ اور تحمل کا عمل دخل رہا ہے۔ اسی سلیقہ مندی نے ان کے تصور کے گھر کو حقیقت کا روپ دیا ہے۔ ان کا شوہر انہیں واپس مل جاتا ہے۔ اس جاگیر میں اب ان کا کوئی سلیقے دار نہیں ہے۔ بچوں کی پڑھائی لکھائی بھی انہیں کے پلان کے مطابق ہوتی ہے۔ ڈاکٹر، انجینئر، ڈائریکٹر سب ایک ہی گھر کا حصہ ہیں۔ ندا کے علاوہ ان کے سارے لڑکے لڑکیاں ان کے ساتھ ہیں۔ بڑے بھائی اور بہن کی شادیاں بھی مناسب وقت پر ہو گئیں۔ خدا، شوہر، گھر، اولاد اور بھائی کو یکجا کرنے انہیں جوانی سے بڑھاپے تک کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ اس سفر میں خدا کی ذات پر اعتماد ہی ان کی مشعل راہ ہے۔ ایک جنون تھا جس نے وقت کے گزرنے کا احساس زائل کر دیا تھا۔ ایک طرح سے وہ اپنے پورے وجود کو اینٹ گارا بنا کر اس گھر کی تعمیر کرتی رہیں۔ اور جب سکون کے چند لمحے برسوں کی ریاضت کے صلہ میں آسمان سے زمین پر اترتے ہیں تو وہ اس گھر کے دیوار و در میں، اس میں رہنے والوں کے چہروں میں وہ تھوڑی تھوڑی ہر طرف نظر آتی ہیں۔ لیکن پوری کہیں نہیں ہوتیں۔ موم بتی روشنی بن کر پگھل جاتی ہے۔ بڑی بہن نے لکھا ہے آخر تک ان کی آنکھوں میں انتظار روشن تھا۔ ہر آہٹ پر پتلیاں پھر جاتی تھیں۔ ان کے پاس وقت کم تھا اور سیاست کو جنگ کی عجلت زیادہ تھی۔ ندا یا...

کوشش کے دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ ان کے غم میں شریک ہونے سے محروم رہتا ہے۔ برسوں کا رشتہ خاموش ہو کر قبر بن جاتا ہے۔

"اللہ نے میری ساری آرزوئیں پوری کر دی ہیں، ایک تمہارا غم ہے جو پیچھا نہیں چھوڑتا۔ شاید یہ میرے ہی کسی گناہ کی سزا ہے۔ جو تم جیتے جی آنکھوں سے دور ہو۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میرا معبود ایک نہ ایک دن میرے گناہ کو معاف کر دے گا۔ اور یہ جدائی کی گھڑیاں ختم ہو جائیں گی۔"

لیکن ان کے معبود کو دو ملکوں کے درمیان جنگ کی مصروفیتوں میں ان کے گناہ معاف کرنے کی مہلت نہیں ملی۔

میں رویا پردیس میں، بھیگا ماں کا پیار   دکھ نے دکھ سے بات کی، بن چٹھی بن تار

عشرت کو عمر اور حالات نے سنجیدہ بنا دیا ہے۔ ندا اور اس کا رشتہ اب یکطرفہ ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ اسی کی خاطر یہاں رکا ہوا ہے۔ وہ ہر روز یہاں سے بھاگ نکلنے کا ارادہ کرتا ہے لیکن شام ہوتے ہی دوسرے دن کی سحر میں ارادہ بدل جاتا ہے۔ زندگی کے تعلق سے ندا کے لاابالی پن سے مایوس ہو کر وہ اپنا رویہ بدلنے پر تیار نہیں ہے۔ لڑکی نے عورت بن کر دوسروں کی نصیحتوں کو سننا شروع کر دیا ہے۔ اس کا نیا دوست اسی کے کالج کا ایک سینئر اسٹوڈنٹ ہے۔ ان دونوں کی قربتوں کو گھر والوں کی تائید حاصل ہے۔ ندا کی محبت، کی طرح کیوپڈ یہاں اندھا نہیں ہے۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور ان میں گھر، بچوں اور مستقل آمدنی کے خواب کی روشنی ہے۔ اس روشنی کی جھلک اسے ندا میں دور دور تک نہیں محسوس ہوئی۔ اس غیر متوقع سانحے سے مطابقت پیدا کرنے میں ندا کو کافی وقت لگتا ہے۔ تنہائی میں وہ عورت اور مرد کے تہذیبی رشتے کو جبلتی ضرورت کے سانچے میں ڈھال کر تسکین پاتا ہے۔ محفلوں میں نئے نئے فارمولوں سے سماج کی اخلاقی قدروں کا پوسٹ مارٹم کرتا ہے۔ اور شام ہوتے ہی بغیر روشنی کے کمرہ میں آسمان پر اڑتے ہوئے ہر جہاز سے اسلامی بم گرنے کا انتظار کرتا ہے۔ ہر رات شہر کئی بار تباہ ہو کر دوسرے دن نئے سرے سے آباد ہوتا ہے۔ اس مشترک خوف نے شہر میں چوریوں اور مذہبی تنازعات کو ختم کر دیا ہے۔ مسجد اور مندر دونوں کی روشنیاں سورج ڈھلتے ہی بجھا دی جاتی ہیں۔ آسمانی دہشت نے زمین پر امن و امان پیدا کر دیا ہے۔ انہیں دنوں میں اس کی ملاقات میر کا رکی طوائف شیلا سے ہوتی ہے۔ بیمار کا کچھ دن سوگ منانے کے بعد اب وہ مستقل کوٹھے پر بیٹھنے لگی ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں میں سونے چاندی کے گہنے اور چہرہ پر خوشحالی کی چمک ہے شیلا اپنے مرحوم عاشق کو اتنا عرصہ گذرنے کے بعد بھی بھول نہیں پائی ہے۔ وہ جب بھی ندا کے ساتھ ہوتی ہے تو پرانی یادوں سے آنکھیں ضرور بھیگتی ہے۔ ان یادوں کے سہارے وہ دونوں اکثر جسمانی دوریوں کو عبور کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ پیشہ ور ہونے کے باوجود ان مشترک یادوں کے احترام میں ندا سے فیس نہیں لیتی۔ وہ جب پیسے دینے پر اصرار کرتا ہے تو شیلا سنجیدگی سے صرف اتنا کہتی ہے۔ "تم میرے مرد کے دوست ہو۔ وہ تمہیں بہت چاہتا تھا، میرے تمہارے بیچ 'گاہکی' کیسے ہوگی۔ گھر کے لوگوں سے بھی کوئی لین دین کرتا ہے ......!!"

شیلا کے خلوص نے ندا کے فرسٹریشن کو مدھم کر دیا ہے۔ اس میں حقائق قبول کرنے کا شعور پیدا ہو گیا ہے۔ وہ عشرت کی سہیلی وجیہہ سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے۔ اس کی مانگ میں سندور اور پیروں میں بچھوے ہیں۔ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ اس کا شوہر گلف میں ایک انگریزی فرم میں انجینیر ہے۔ آج کل ایک مہینہ کی چھٹی پر آیا ہوا ہے۔ وجیہہ اپنی شادی کا البم دکھاتی ہے۔ شادی کی ان کئی تصویروں میں ایک تصویر کے نیچے 'وکرم وجیہہ کا بھائی' لکھا ہوا ہے۔ یہ اسی فوجی کی تصویر ہے جس کے ساتھ وجیہہ اپنی کئی دوپہریں ندا کے پرانے کمرے گذار چکی ہے۔ وکرم سرحد پر لڑتا تھا کی گولی سے زخمی ہو کر فوج سے ریٹائر ہو چکا ہے۔ وہ پنجاب میں رہتا ہے۔ وہیں کسی پنجابن سے اس نے شادی کر لی ہے۔ وجیہہ نے اپنے باپ کا کہنا مان کر اپنی ذات کے ایک مرد کو جیون ساتھی بنا لیا ہے۔ وجیہہ اور وکرم اب بھائی بہن ہیں۔ اس نئے رشتے سے اس کے باپ کی ناراضگی بھی ختم ہو گئی ہے۔ اور یہ دونوں بھی اکثر ایک دوسرے کے یہاں کئی کئی دن کے لئے آ کر، اس رشتہ کا تقدس برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ وجیہہ کالج چھوڑ چکی ہے۔

جب اسے عشرت کے بدلے ہوئے رویے کی اطلاع ملتی ہے تو وہ بہت ناراض ہوتی ہے۔ وہ اس کی بے وفائی پر طنز کرتی ہے۔ لیکن ندا بات کو آگے نہیں بڑھاتا، نہ مصالحت کی سفارش کرتا ہے۔ وہ صرف عشرت کے لکھے ہوئے خطوط اور انگوٹھی اس کے پاس چھوڑ کر واپس آ جاتا ہے۔ اور دو دن بعد ممبئی کے لئے روانہ ہو جاتا ہے۔

[باقی آئندہ]

کشن تلوانی

نثری نظم

اخبار میں چھپی تھی تصویر
اس خبر کے ساتھ
گمشدہ کی تلاش ہے
انعام بھی معقول رکھا تھا
تب سے
میں ڈھونڈ رہا ہوں اس کو
شہر شہر
گلی گلی
چوراہے چوراہے
ہر بھرے بھرے بازار میں
ڈھونڈ رہا ہوں
اس کا چہرہ
تجھ میں
اس میں
اُس میں
لیکن سب بے کار
آخر کار
معلوم ہوا ہے
خودکشی کرنے والے نے
زندہ ہونے کی افواہ پھیلائی تھی
اسی لیے وہ
زندہ ہے اخباروں میں

● اجنتا آرٹ لیتھو پریس نمبا لوکی
گھٹ نمبر ا۔ گوالیار نمبر ا

خاکی نسیمی

زندگی

فکر + پریشانی
خوشی ـ رنج
خواہش + آرزو
کامیابی ÷ امید
زندگی کا حساب چھوٹا سا...!

ھائیکو

آسماں
اوپر بیٹھا دیکھ رہا ہے
نیچے کا آسماں۔

امید
اک ان دیکھی انجانی
طاقت کی تمہید۔

پیار
حوس کے بازار میں
جسموں کا بیوپار

رشوت
ملک کے سینے پہ لگا
تمغۂ نحوست

● بھدرک ۷۵۶۱۰۰ (اڑیسہ)

رفیق اعظم

ماں

ماں!
میری پیاری
شفیق رحم دل ماں
میری تجھ سے ہے التجا
مجھے اپنے وطن سے نہ نکالو
مجھے اپنے رحم سے نہ نکالو
مجھے وہیں ابدی نیند سلادو
جہاں ابھی ہوں میں

یہ نیو کلائی سر سراتی سر پھری تیز ہوا
تیری ممتا کی گھنی چھاؤں چھین لے گی
سر پہ شعلوں کا تاج ہوگا
بصیرت مصلوب ہوگی
عقل مفلوج ہوگی
عرفان معتوب ہوگا
درد کی حدوں سے گذر کر بھی
تجھے کیا ملے گا؟
ماں!
میری پیاری ماں

| الانتا ہم الجمشت ۔ دسادہ

عارج میر

شوخ کھڑکیاں

رقص کرتی رہیں دھوپ پر کھڑکیاں
اپنے حصوں میں گھستی تلذذ کی بو
موسیقی چھوڑتی ادھوری سرگوشیاں
سوچ کو کھولتی سر پھری دستگیر
جسم پر جھیل کے جاگتی کروٹیں
تجھ کو چھیں سطح پر تہہ سے آتی ہوئیں
پتلیاں چار سو لمس لیتی ہوئیں
ثبت ہوتی کہاں
آخرش تشنگی۔

● مین روڈ ناسر شیٹ۔ داسوڈ ۰۶۔ ۴۴۴۹۰۰۶ ۴۱

محمد عظیم اشرف
جتوار پور چوتھ۔ سمستی پور۔ ۸۴۸۱۳۴ بہار

ایک ٹکڑا آگ کا

دریا کے کنارے بسا ہوا یہ شہر بڑا ہی خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ سڑکیں بھی کشادہ اور خوبصورت معلوم ہو رہی تھیں۔ سڑک کے دونوں کنارے پر اونچی اونچی عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ جس سے خوبصورتی میں اور اضافہ ہو رہا تھا۔ سب لوگ اپنے اپنے کام میں مشغول تھے۔ کوئی کسی سے فضول باتیں نہیں کرتا تھا۔ اس شہر کے سبھی بچے اسکول سے آنے کے بعد اسی دریا کے کنارے چلے جاتے تھے۔ اور جب بھر کر کھیلتے تھے۔ اپنی اپنی ٹولی میں سبھی بچے ہنستے کھیلتے اور شام ہوتے ہی اپنی اپنی رہائش گاہ لوٹ جاتے تھے۔ سبھی بچے زیادہ تر گڈا اور گڑیا کا ہی کھیل کھیلتے تھے۔ اور گھروندے بنا بنا کر خوب سجاتے پھر گڈے سے گڑیا کی شادی کراتے۔ باراتیوں کو کھانا کھلاتے اور خود بھی کھاتے۔ پھر اس کے بعد سبھی بچے ایک ساتھ ہنستے گاتے اچھلتے کودتے رہتے تھے۔

آج بھی حسب دستور سبھی بچے آئے اور اپنی اپنی جگہ پر گھروندے بنانے لگے۔ پھر ان گھروندوں کے اندر گڈا اور گڑیا کو رکھ کر بجوب پکانے لگے۔ ان بچوں سے کچھ دوری پر ایک بوڑھا ڈگڈگی بجا رہا تھا۔ ڈگڈگی کی آواز سنتے ہی سارے بچے اس کی جانب دوڑ پڑے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے چاروں جانب سے بچوں نے بوڑھے کو گھیر لیا۔ اب بوڑھا بڑی ہوشیاری سے بندر کو نچانے لگا۔ بچے اس تماشے کو دیکھ کر کافی خوش ہوئے۔ اور سبھی بچے تالیاں بجانے لگے۔ پھر وہ بوڑھا کسی نامعلوم منزل کی طرف بڑھ گیا۔ اور بچے اپنی اپنی جگہ پر واپس آ چکے ہیں۔ مگر یہاں کا منظر اب کچھ اور ہی ہو گیا ہے۔ اب گھروندوں کے نزدیک سبھی بچے زور زور سے رونے لگے ہیں۔ ان کے گھروندے مسمار ہو چکے ہیں۔ کسی کے گھروندے میں گڈا نہیں ہے تو کسی کے گھروندے میں گڑیا نہیں اور کچھ گھروندوں میں گڑیا کا سر ہے تو دھڑ غائب۔ کسی گھروندے میں ہاتھ ہے تو پاؤں غائب۔ اب سب بچے اپنے اپنے گھروندوں کے سامنے رو رہے ہیں۔ کوئی سر لیکر بیٹھ گیا ہے تو کوئی دھڑ اپنی آنکھوں سے لگائے۔ بچوں کے رونے کی آوازیں تیز تر ہوتی جا رہی ہیں۔ اور اب ہر طرف اندھیرے کی حکمرانی ہوتی جا رہی ہے۔ اب بچوں کے رونے کی آوازیں سارے شہر میں پھیل چکی ہیں۔ بچوں کو روتا دیکھ کر دھرتی بھی رونے لگی ہے۔

اب بچے سمجھ چکے ہیں کہ وہ بوڑھا ایک فریبی تھا۔ اگر وہ لوگ اپنا اپنا گھروندا چھوڑ کر نہ جاتے تو یہ نوبت بھی نہ آتی۔ اب وہ کبھی بھی اپنا گھروندا چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔

مگر سماج میں جو دہشت گرد پیدا ہو گئے ہیں ان کا علاج کیا ہوگا؟

وہ خوبصورت شہر جہاں لوگ اپنے کاموں میں مشغول رہتے تھے اور فضول باتوں سے بچتے تھے۔ اب ان میں خوف و ہراس پھیل گیا ہے۔

ایک ٹکڑا آگ کا آوارہ بادل کی طرح آسمان میں ادھر سے ادھر چلتا ہوا نظر آیا۔ ✺

دھنک رنگ

خورشید طلب

ی سراب کبھی مشتعل بھنور میں ہم
نفس ہیں مسلسل کسی سفر میں ہم
اس سے آگے کی منزل خدا ہی جانتا ہے
یوں سے چلے آئے ہیں کھنڈر میں ہم
ام عمر لہو میں فساد جاری رہا
ام عمر رہے خیمۂ شرر میں ہم
باہ ہو گئے جنگل، زمین بانجھ ہوئی
اں سے لائیں توانائی بال و پر میں ہم
کے بیچ فصلیں بلند ہوتی تھیں
ش کرتے رہے گھر کو اپنے گھر میں ہم

کمپیوٹر سیکشن، جی ایم آفس کرنگلی (ایڑو)، گرشیہ (بہار)

ملک زادہ جاوید

پھلوں نے کھو دیا جس دن سے ذائقہ اپنا
کسی نے پیڑ سے رکھا نہ رابطہ اپنا
سلگتی دھوپ مرا امتحان کیا لے گی
جناب میر سے ملتا ہے سلسلہ اپنا
مرے قلم ہی نے بخشی کتاب کو عظمت
ورق تھے سارے تمہارے، تھا حاشیہ اپنا
نہ جانے کون سی آفت ادھر سے گذرے گی
پرندے چھوڑ کے جاتے ہیں گھونسلہ اپنا
مرا مکان کھنڈر ہو گیا ہے اے جاوید
نہ جانے کب وہ سنائے گا فیصلہ اپنا

● ۶۔ یونیورسٹی فلیٹس، بابوگنج، لکھنؤ (یو۔پی)

اشونی کمار اشرف

حسرتِ دیرینہ کو، خوابِ پریشاں کہہ دیا
پایا دل کچھ بھی نہ دکھا دل کو ارزاں کہہ دیا
ریگِ صحرا وادیٔ وحشت کہ ہے ملبوسِ شجر
دشت کو آوارگی نے پا بہ جولاں کہہ دیا
کس چمن کے پھول پہ تیغِ خزاں چلتی رہی
کیا ہوا اگر اس نے گلشن کو بیاباں کہہ دیا
خود بخود سر سے مرے ساری بلائیں ٹل گئیں
جب کوئی مشکل پڑی، مشکل کو آساں کہہ دیا
تھا وہ حسنِ بیکراں، کون و مکاں سے بے نیاز
تشنہ کامی نے جسے رخسار و مژگاں کہہ دیا

● ایم جے کے کالج۔ بتیا۔ چمپارن (بہار)

شوکت یزدانی

آنکھوں سے سب خواب سہانے میرے
اب بیٹھ کے روتے ہیں سرہانے میرے
یادوں کو دبے پاؤں سہی، آنے دو
تو جائیں ذرا زخم پرانے میرے
درد کی خوشبو تھی، کہاں بکتی تھی
تھک کے تعاقب میں زمانے میرے
لیا کیا نہ سجائے تھے، لبوں پر، لیکن
شوقت کی سورش میں ترانے میرے
انی کا زمانہ ہے کسے کیسا کہیئے
دل میں نہیں راز پرانے میرے

۲۳/۳۴، نور محمد منشی لین، ہوڑہ - ۷۱۱۱۰۱

فہیم احمد صدیقی

ایک پرچھائیں کو اس شوخ کا پیکر جانے
دل وہ پیاسا ہے کہ صحرا کو سمندر جانے
اس کا احسان ہے غم اس نے دیئے ہیں مجھ کو
کیسی دنیا ہے اسی کو یہ ستمگر جانے
جاگتے میں بھی کہیں خواب نظر آتے ہیں
کیسے اس گل سے بدن کو کوئی پتھر جانے
ہم سے منسوب ہوا تلخ حقیقت بن کر
وہ فسانہ کہ جسے شہر کا گھر گھر جانے
کیوں میں ہر لمحہ پریشان رہا کرتا ہوں
کون اس راز کو اب آپ سے بہتر جانے

● پرتھا نکیتن، باندرہ گھاٹ، ناندیڑ (مہاراشٹرا)

اظہر نیر

آئینے کے جیسا میں ٹوٹتا رہا لوگو
عمر بھر رکھا لیکن خود کو بے صدا لوگو
ذہن کے دریچوں کو میں نے کھول کر دیکھا
ہر کھنڈر پہ میرا ہی نام تھا لکھا لوگو
روشنی تھی، زینت تھی، گھر میں جس کے دم سے
ایک سال ہی رہ کر وہ اتر گیا لوگو
سلسلہ حوادث کا ہر گھڑی معتبر سے
سن رہا ہوں مدت سے ایک ہی کتھا لوگو
کون سی ہوا اپنے شہر میں چلی نیر
اب کے سارے چہروں کا رنگ اڑ گیا لوگو

● [illegible]

مکتوب

محمد جلال الدین عبد المتین ـ ۲۳ فرنگی محل لکھنؤ ـ

آپ کے موقر ادبی اور ثقافتی رسالہ شاعر کے شمارہ نمبر ۹۹ء جلد ۷۰ میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "کلاسیکی ادب اور توہم پرستی" اور مضمون نگار کا نام سید یحییٰ نشیط ہے۔ میں شاعر کا بہت پرانا قاری ہوں اور اس کا پرانا مداح بھی۔ اس دور کساد بازاری میں ثقافتی رسالہ نکالنا "آندھی میں چراغ جلانا" ہے اور پھر اس چراغ کو نہ بجھنے دینا قریب قریب ناممکن کو ممکن کر دکھانا ہے۔

مذکورہ بالا مضمون کے بارے میں یہ عرض کرنا ہے کہ شاید آپ نے صرف چونکا دینے والے عنوان ہی کو دیکھ کر اس مضمون کو بغیر پڑھے شائع کر دیا ہے۔ شاعر کوئی مذہبی رسالہ تو ہے نہیں جس میں عقیدوں کی بحث ہو "خوف بدعقیدت" کسی عقیدے کو کفر و شرک کی سرحد سے نکل جانے کی بات شائع کرنا آپ کے رسالے کے شایان شان نہیں ہے۔ اس مضمون میں آگے چل کر کسی خاص عقیدہ رکھنے والے کو اس کے انتقال کے بعد رحمۃ اللہ علیہ کہنا توہم پرستی میں شامل کر لیا گیا ہے اور اسی کا رخ مولانا جامی رحمۃ اللہ کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ اس مضمون سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا مولانا جامی کی مثنوی "یوسف زلیخا" اتنی نامعقول ہے کہ مولانا کو ان کے وصال کے بعد رحمۃ اللہ نہیں کہنا چاہیے جبکہ رحمۃ اللہ تو ایک دعا ہوتی ہے یعنی فلاں پر اللہ اپنی رحمت نازل فرمائے یا فلاں پر رحم فرمائے۔ مولانا جامی علیہ الرحمہ کی مثنوی "یوسف زلیخا" فاضل مضمون نگار کے خیال کے مطابق اتنی خراب ہے کہ "معارف جیسے معیاری مجلہ میں بھی کسی مضمون نگار نے جامی کو صوفیا کا گل سر سبد اور ایمان و یقین کا پیکر لکھ دیا تھا اور یہ انتہائی لغویات ہیں۔ فاضل مقالہ نگار کے نزدیک اس مثنوی میں نہایت ہیجان انگیز جنسی واقعات صد درجہ عریاں انداز میں قلم بند کیے گئے ہیں" لیکن موصوف نے ایک بھی شعر مثال کے طور پر تحریر نہیں فرمایا۔ آگے چل کر اس مثنوی کو "بنیاد ضلالت سنت و شریعت ہونے کے علاوہ نص قطعی سے دور کا بھی واسطہ نہ رکھنے" والا بتایا ہے پھر فرماتے ہیں بلکہ باستناد تاریخ بھی یہ مثنوی [illegible] کے لئے بیجا ہی ٹھیری ہے۔ جہاں تک مولانا جامی علیہ الرحمہ کے رتبے کا تعلق ہے تو وہ اپنی مثنوی، نعتیہ شاعری یا شاعری ہی کی وجہ سے مشہور نہیں ہیں وہ اپنی کتاب "نفحات الانس" اور دیگر تصانیف کی وجہ سے علماء اور صوفیائے کرام کے یہاں ایک خاص درجہ رکھتے ہیں۔ نقشبندیہ کے ایک بہت بڑے شیخ عبید اللہ احرار کے مرید خاص تھے۔

فاضل مضمون نگار نے اس مثنوی کو نص قطعی سے دور کا بھی واسطہ نہ رکھنے والا بتایا ہے۔ لیکن مضمون نے یہ بات نظر انداز کر دی کہ اس مثنوی کا نام یوسف زلیخا ہے اور اگر اس مثنوی کے ذریعے وہ بیان کرنا مقصود ہوتا جو قرآن شریف میں ہے تو اس مثنوی کا نام یوسف زلیخا نہ ہوتا اس لیے کہ قرآن مجید میں زلیخا کا نام ہی نہیں ہے۔ البتہ جو کچھ اس مثنوی میں ہے وہ تفسیری روایات اور اسرائیلیات پر مبنی ہے۔ فاضل مضمون نگار کا اسرائیلیات کا مطالعہ بہت وسیع ہوگا لیکن انھیں یہ خیال نہیں رہا کہ صوفیا نے جو مثنویاں تحریر کی ہیں وہ خلاف حقیقت ہیں۔ خود مولانا جامی کی دیگر مثنویاں، نظامی گنجوی کی پنج گنج، حضرت امیر خسرو کی مثنویاں، اور دکن میں قطب شاہی دور کی قدیم مثنویاں ان سب میں علامتوں ہی کے ذریعہ وصل محبوب اللہ کی محبت کا بیان کیا گیا ہے، اور علامتوں ہی کے ذریعہ سے بتایا گیا ہے کہ راہ محبت الٰہی میں کن کن مشکلوں کا سامنا ہوتا ہے، ابلیس کس طرح بھٹکانا چاہتا ہے اور عاشق الٰہی کو کن کن آزمائشوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پوری کی پوری فاضل مضمون نگار کی تحریر کسی بھی طرح کلاسیکل ادب میں توہم پرستی کے زیر عنوان نہیں آتی۔ عربی کے جن دو قصیدوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ایک تو حضرت کعب ابن زہیرؓ کا ہے اور دوسرا حضرت بوصیریؒ کا ہے اول الذکر تو خود رسول اکرمؐ کے سامنے پڑھا گیا تھا دونوں قصیدوں کی تشبیب میں عورتوں کے عشق اور ان کی قیام گاہوں کی یاد دلانا کا تذکرہ ہے ان قصیدوں کے اشعار سے صوفیاء اور علماء برکت حاصل کرتے رہے ہیں اور قصیدہ بردہ کو بعض خاندانوں میں بطور ورد کے پڑھا جاتا ہے۔ بار بار گنڈے تعویذ کے لفظوں کے استعمال سے معلوم نہیں مضمون نگار کا کیا مقصد ہے؟ ایسا تو نہیں کہ مقصد ان لوگوں کو ذلیل کرنا اور توہم پرست قرار دینا ہو جو تعویذوں کی افادیت کے قائل ہیں؟

مذکورہ مضمون میں نقش سلیمانی ایسی اشتہاری اور غیر معتبر کتاب کا حوالہ معلوم نہیں کیوں دیا گیا؟ فاضل مضمون نگار کے علم میں شاید یہ بات نہیں کہ بزرگان دین صرف مخصوص لوگوں ہی کو تعویذ اور مذکورہ قسم کے الفاظ دفع مرض کے لیے بتایا کرتے تھے اور تاکید کر دیتے تھے کہ بغیر اجازت کے ان کے استعمال سے کچھ فائدہ نہ ہوگا صرف یادداشت کے لیے اپنی بیاضوں میں انھیں تحریر کر دیتے تھے وہ لوگ تعویذوں کی کوئی کتاب چھپواتے بھی نہیں تھے بلکہ یہ بیاض ان کے خلیفہ خاص ہی کو ملتی تھی دوسروں کو نہیں۔

کلاسیکی ادب کے نام پر صرف حضرت ابوسعید ابوالخیر کی طرف منسوب ایک رباعی ایک منظوم دعا "اے خالق ہر بلند و پستی الخ" درج ہے۔ میرے محدود مطالعے کے بموجب یہ رباعی کسی معتبر کتاب میں درج نہیں ہے ہاں نقش سلیمانی کی ایسی غیر معتبر کتابوں میں اگر ہو تو نہیں کہا جا سکتا۔

خواجہ حافظ شیرازی کے دیوان سے جہاں تک فال نکالنے کا تعلق ہے تو اس کے قصے اہل اللہ کی طرف منسوب ہیں۔ فال دیکھنا تقویت کے لیے ہوتا ہے نہ کہ پیشین گوئی کے لیے۔ اس سے کوئی لائحہ عمل بھی متعین نہیں کیا جاتا۔ مثال کے طور پر میں مولانا حسرت موہانی علیہ الرحمہ کے چند شعر لکھتا ہوں جو اسی سرخی کے ساتھ دیوان حسرت میں درج ہیں:

تخمیس حسرت موہانی بہ غزل حافظ بسلسلۂ فال دیوان خواجہ
(۱۸ مارچ ۱۹۲۶ء اثنائے راہ دہلی و پشاور۔)

آخری بند یوں ہے:

جب مجھے خواب میں خود آکے وہ شاہ خوباں
جب کہ حافظ بھی مصدق ہو بہ فال دیوان
تجھ کو حسرت یہ مبارک سند مہر و نشاں
پردہ بردار کہ تا سجدہ کنند جملہ جہاں
طاق ابروئے تو محراب جہاں خواہد بود

اردو کلاسیکی ادب سے جو حصہ پیش کیا گیا ہے اسے کلاسیکل میں معلوم نہیں کس طرح فاضل مضمون نگار نے شامل کر دیا۔ مذکورہ کتابوں سے یہ مثالیں زبان کے تدریجی ارتقاء کے سبب میں پیش کی گئی ہیں اور کہیں یہ بتانا مقصود ہے کہ خانقاہوں میں جہاں عربی فارسی کا رواج تھا وہاں کس طرح دیسی زبانیں پائی گئی تھیں۔ ظاہر ہے اس سلسلے میں جو مثالیں پیش کی گئی ہیں ان کا کلاسیکل ادب میں کوئی مقام نہیں ہے۔ جہاں تک برکت حاصل کرنے کا تعلق ہے تو خود فاضل مضمون نگار کے نام کے ساتھ سر تحریر ہے ہم گنڈے تعویذ والے اس لفظ سید سے برکت حاصل کرتے ہیں، سیدوں سے دعا بھی کرواتے ہیں، سیدوں کی تعظیم اور ان سے محبت کی کوشش کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اور محبت کی وجہ سے ان کی اولاد کی تعظیم اور محبت کرنے سے ہمارا رشتہ آنحضرتؐ سے مضبوط ہوگا۔ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبی تعلق اور برکت حصول کے لیے سید یحییٰ نشیط صاحب نے بھی اپنے نام کا جزء بنا لیا ہے۔ نہ معلوم کیوں موصوف نے حضرت یحییٰ منیری اور مولانا سید سلیمان ندوی مرید حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کو بھی [illegible] پرستوں میں شامل کر دیا!

خود مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا حسین احمد مدنی رحمہما اللہ وغیرہ تعویذ دیا کرتے تھے۔ شاید سید صاحب نے مذکورہ مضمون [illegible] تحقیق کے پردے میں کسی خاص عقیدے کی تبلیغ کیلئے تحریر فرمایا ہے۔ اور آپ عنوان سے دھوکا کھا کر اس کو شائع کر بیٹھے۔ بات تو بہت کہنے کی تھیں لیکن شاعر ایک ادبی اور ثقافتی رسالہ ہے وہ ان سب کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

شاعر میں شائع مقالہ "کلاسیکی ادب اور توہم پرستی" سے خدانخواستہ کسی کی توہین مقصود نہیں تھی۔ ایسے ادب کی تخلیق سے کہیں زیادہ ہمارے لئے بزرگان دین کا احترام اور عقیدت مقدم ہے تاہم مذکورہ مقالے میں ایک رخ پیش کیا گیا تھا۔ اس موضوع پر آپ نے دوسرا رخ پیش کر دیا پھر یہ کہ مذہب کے یہ وہ فروعی مسائل ہیں جنھوں نے عقیدتوں کے مختلف خانے بنا دیئے ہیں [illegible]۔ شاعر مذہبی جریدہ تو نہیں ورنہ بحث نکلتی۔

مذکورہ مقالے کی اشاعت سے اگر کسی عقیدے پر ضرب کی دل آزاری ہوئی ہے تو اس کے لیے ادارہ شاعر یقیناً معذرت خواہ ہے ایسے مقالوں کی اشاعت سے احتراز لازم ہے۔ (ادارہ)

فکرِ امروز



ہندوستان کے یہ سیاسی ہنگامے، قومیات کی یہ فرقہ پرور شورشیں، معاشرت کے یہ مغلوب رسم و رواج چوچلے، بیکاری کی لعنتیں، مذہب کے فروعی نزاع، تمدن کے پیچ در پیچ معاملے، تہذیب کے مخلوط و مردود شعبدے، عالمِ حیات کے مصائب، نفسیاتی زندگی کے آلام، انسانی بیکسی و محرومی کے افسانے، خود غرضی و نفس پرستی کے آئین، سرمایہ دار و مزدور کے جھگڑے، دولت و عسرت کی آویزشیں، آزادی و غلامی کی پکار، استعمار و انتداب کی جنگ اور روحانیت و مادیت کے محاربے شاعری اور صرف شاعری کے ذریعے فنا کیے جاسکتے ہیں۔ شاعر کا عالمگیر پیغام ارضِ عالم کی خونریز فضاؤں کو امن و سلام کی بہار سے پھر فردوس بنا سکتا ہے مگر اس کے پیام کی رسائی اور اس کی آواز کی پذیرائی کے لیے سکون و خاموشی کی ضرورت ہے، صلاحیتِ ذوق اور اہلیتِ سماعت کی ضرورت ہے جس کا اس محشرِ غزل خوانی و شعر سرائی میں فقدان ہے۔ نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سن سکتا ہے۔ اور جہاں بے انتہا غوغائیوں کی ہیبل چیخ پکار سے طوفانِ صدا برپا ہو وہاں چند حقیقی شعراء کی تسکین فروشی کیا اہمیت رکھتی ہے؟

[خطبۂ صدارت سے اقتباس، ۱۸ دسمبر ۱۹۲۳ء
مطبوعہ شاعر (آگرہ) فروری ۱۹۳۸ء]

سیماب اکبرآبادی

شاعر

اشاعت کا ۶۲ واں سال

جلد ۶۲
شمارہ ۳

فون: ۳۵۹۹۰۳۰

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت: ۵ روپے

زرِ سالانہ ۵۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۶۰ روپے

تاحیات خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے ◆ ممالکِ غیر سے ۳۵۰ روپے

سرورق

سریندر پرکاش

وحید اختر ـ شکیب ایاز
اظہر افسر ـ شارق مظفرپوری
ارشد عبدالحمید ـ محمد انوار عالم
شمیم طارق ـ تابش مہدی
۲۵

شمارہ نمبر ۳ [۱۹۹۱ء] جلد ۲۳
مارچ ۹۱ء

الیکشن اور اردو

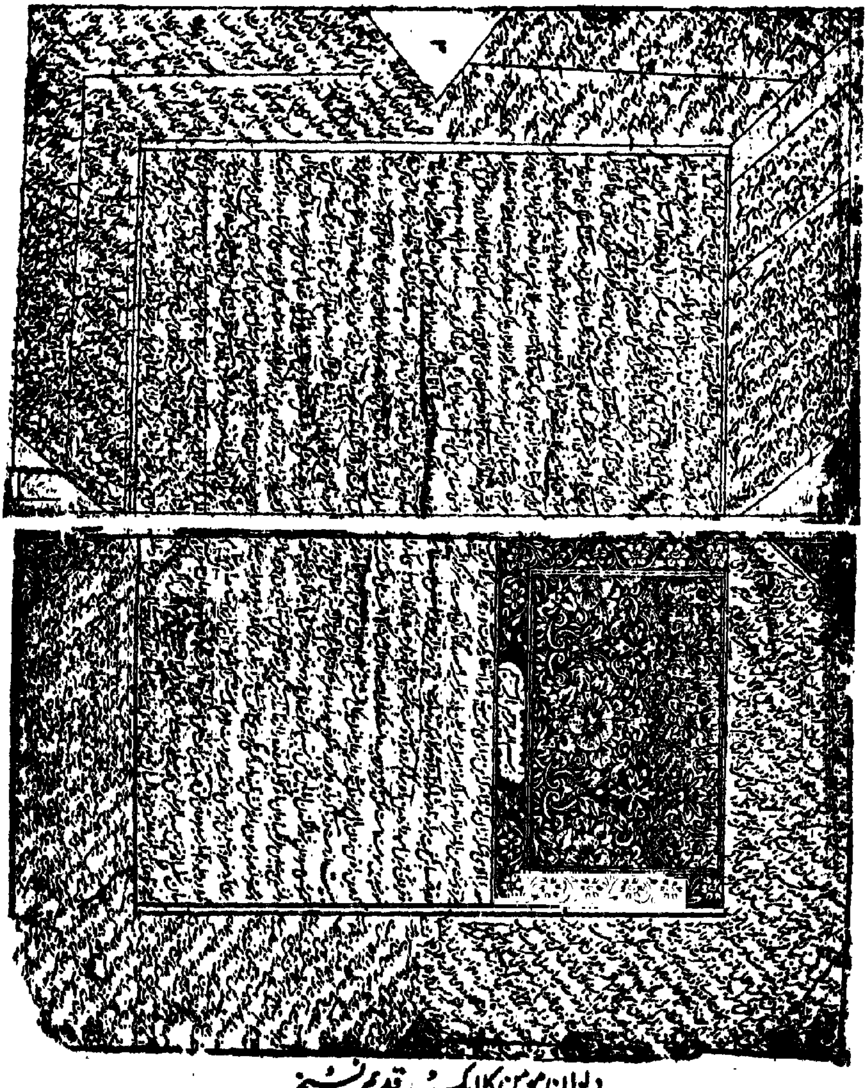
ہندوستان کے سیاسی افق پر ایک بار پھر انتشار کے سرخ بادل گہرے ہوگئے ہیں، نئی پرانی سیاسی پارٹیوں کے ساتھ شخصی یا پھر مذہبی نئی شخصی پارٹیاں بھی ابھر کر آئی ہیں۔ سیاسی پارٹیوں کے امیدوار، پارٹیوں کے الیکشن منشور، دعوے، وعدے، الزامات اور نہ جانے کیا کیا کچھ مگر اقتدار میں آنے والی کسی بھی سیاسی جماعت نے ہندوستان کو اس کے آئین کے مطابق تشکیل نہیں دیا۔ ایک سیاسی کاروبار ہے جو دوسرے سرے تک پھیلا ہوا ہے، اقتدار کی ایک جنگ ہے جو کسی بھی ضابطے کی پابند نہیں۔ گذشتہ کئی سال اور ادھر کئی ماہ ہندوستان پر سخت گذرے ہیں، عالمی سیاسی بحران نے ہندوستان کی سب سے بڑی لعنت، فسادات کو کسی حد تک باندھ دیا تھا مگر اب پھر فسادات کی ہوائیں گرم ہیں، یہاں وہاں سے خبریں ابھرنے لگی ہیں، ابھی الیکشن کی تاریخیں دور ہیں، کچھ بعید نہیں کہ جگہ جگہ فسادات پھوٹ پڑیں کیوں کہ بہت سے مذہبی جنونی اور ان کی سیاسی پارٹیاں اپنی پوری اشتعال انگیزیوں کے ساتھ سرگرم عمل ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ کوئی بھی سیاسی پارٹی اور سیاسی شخصیتیں، ہندوستان جیسے مسائل زدہ پس ماندہ ملک کے جمہوری نظام کو بخوبی چلانے کی اہل نہیں۔ لفظ "حکومت" کی آج کی نفسیات کچھ اور ہی ہے۔ عوام و خواص جانتے ہیں کہ 'آج کا سچ' کیا ہے لیکن ملک کے بنیادی آئین سے الگ آج کا سیاسی ڈھانچہ یکسر الگ اور غلط ہے ایسے میں کوئی بھی توقع سراب صورت ہی ٹھہرے گی، مگر سانسیں ہیں تو پھر جسم چاہے کتنا ہی بے جان کیوں نہ ہو جائے اسے سپرد خاک نہیں کیا جاتا۔

سیاسی پارٹیوں کے منشور نئے نہیں ہیں، گذشتہ انتخابات کے تمام منشور سامنے رکھے جائیں اور آج سے تقابلی جائزہ لیا جائے تو نتائج سے کوئی بہت واضح فرق معلوم نہیں ہوگا۔ اقلیتوں کے جذبات سے کھلواڑ ایک بنیادی سیاسی حربہ ہے لیکن آج یہ حربہ تبدیل ہو کر مذہبی بنیاد پرستی کے نعرے میں تبدیل ہوگیا ہے کہ اکثریت کے جذبات کو زیادہ سے زیادہ ابھارا جائے اور ووٹ حاصل کیے جائیں۔ صوبائی علاحدگی پسندی اور مختلف علاقوں میں بڑھتی ہوئی شورشوں کا ردعمل ان سیاسی پارٹیوں پر بالکل نہیں، اور اگر ہے تو یہ لوگ سنجیدہ نہیں ہیں۔ ملک کے مزید ٹکڑے ہو جائیں ان لوگوں کو اس کی پرواہ نہیں۔ انھیں تو بس حکومت کرنی ہے چاہے جتنا بھی علاقہ مل جائے۔ اکثریت سے ووٹوں کے حصول کے لیے جو منصوبے ان لوگوں نے بنائے ہیں، فی الحال وہی ان کے لیے سب سے اہم ہیں، ملک جائے جہنم میں۔

اتنے پیچیدہ اور ناگفتہ بہ غیر یقینی حالات میں سیاسی بازیگروں سے اردو کے متعلق استفسار کرنا کچھ بے معنی سا لگ رہا ہے کہ زبان اردو اور اردو بولنے والے بے شمار افراد کی یہ حیثیت اب تبدیل ہو چکی ہے۔ اردو کی ترویج و اشاعت سے مراد اردو اکادمیاں، ترقی اردو بورڈ یا اردو کے وہ ادارے جنہیں مرکزی یا صوبائی حکومتوں سے سالانہ امداد ملتی ہے، ان کی کارگزاریوں ہی سے عبارت ہے، اردو والوں کے مطالبات کا شور اب مدھم پڑ گیا ہے۔ جو آوازیں ابھی بازگشت میں تبدیل نہیں ہوئی ہیں انھیں سیاسی بازیگروں نے کسی نہ کسی طرح باقی رکھا ہے اور استعمال کر رہے ہیں۔ انتخابات کی ہماہمی میں اردو کے لیے سرگوشیاں، بازگشت تو ہیں لیکن تیز تر اور چیخنے والی آوازیں سنائی نہیں دے رہی ہیں، تو کیا اب اردو کے تمام مسائل حل ہو گئے؟ تو کیا اردو اب سیاسی حربہ نہیں بنے گی؟ تو کیا اب اردو کی سیاسی حیثیت بھی نہیں رہ جائے گی؟؟ انتخابی منشور اب اردو کے ذکر سے خالی کیوں ہیں؟ باوجود تمام انتشار و اختلاف کے آنے والے الیکشن میں اردو زبان کا کردار کیا ہوگا، اردو والوں کے رویے کیا ہوں؟ اردو کے لیے کیا مطالبات ہوں؟ یہ سب کچھ سوچنے اور عمل کرنے کی بات ہے۔
سچ تو یہ ہے کہ موجودہ سیاسی بحران نے مجبور کر دیا ہے کہ بہت کچھ اب رد کر دیا جائے۔ نئے نئے سوال ابھر رہے ہیں مگر ان سب کا رد بھی ضروری ہے۔ ایک لمحۂ فکریہ ہے جو سوال کی صورت بڑھتا جا رہا ہے اردو والوں کو سوچنا چاہیے کہ اب انھیں کیا کرنا ہے؟

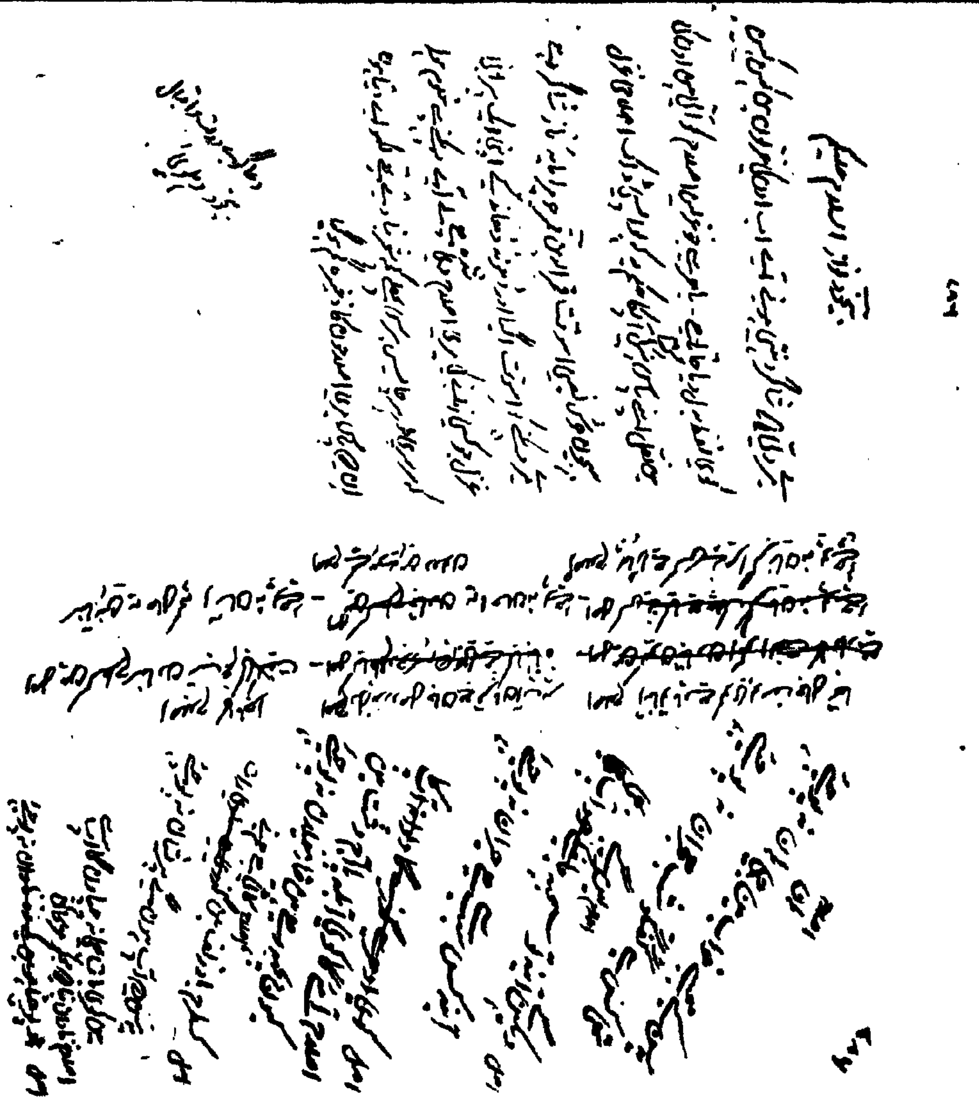
بازیافت



دیوانِ مومن کا ایک قدیم نسخہ

دیوانِ مومن کا یہ ایک قدیم نسخہ ہے۔ مشہور محقق اور ماہرِ غالبیات کالیداس گپتا رضا صاحب نے مذکورہ نسخے کا مطالعہ کر کے بتایا ہے کہ اسے شیفتہ [۱۸۰۶ - ۱۸۶۵] نے ترتیب دیا تھا جو مومن اور غالب دونوں کے شاگرد تھے۔ ان کا خیال ہے کہ ۱۲۴۳ھ اس کا تاریخی نام دیوانِ بے نظیر سے برآمد ہوتا ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ ۱۲۴۳ھ میں مطبع اثنا عشری قائم نہیں ہوا تھا اس لیے یہ بعد کا ایڈیشن معلوم ہوتا ہے۔ ۷۶ صفحات کے اس مکمل دیوان پر سنہ طباعت درج نہیں ہے۔

[رام لعل نابھوی]



بیخود دہلوی [۱۸۵۸ - ۱۹۵۵ء] بنام: اعجاز صدیقی

شاعر [آگرہ، ۱۹۳۰ء تا ۱۹۵۰ء] میں "اصلاحِ سخن" کے عنوان سے ایک مفید سلسلہ بے حد مقبول تھا۔ اساتذہ کی اصلاح کے عکس مع توضیح دیے جاتے تھے۔ بیخود مرحوم کا یہ خط اور اصلاح مذکورہ عنوان ہی کی ایک کڑی ہے۔

ن۔ م۔ راشد

دس نظمیں
جو کسی کتاب میں شامل نہیں

تصوف

ہم تصوف کے خرابوں کے مکیں
وقت کے طولِ المناک کے پروردہ ہیں
ایک تاریک ازل، نورِ ابد سے خالی!

ہم جو صدیوں سے چلے ہیں
تو سمجھتے ہیں کہ ساحل پایا!
اپنی دن رات کی پاکوبی کا حاصل پایا!

ہم تصوف کے جہاں خانوں میں بسنے والے
اپنی پامالی کے افسانوں پہ خوش ہونے والے
ہم سمجھتے ہیں نشانِ سرِ منزل پایا!

پرانی سے نئی پود تک

رات جب باغ کے ہر نخل پہ [illegible]
رات جب باغ کی آنکھوں میں
[illegible]

[illegible]

میں

[illegible]

[illegible]

مسز سالامانکا

[illegible]

(نیویارک ۔ [illegible])

اے وطن اے جان

اے وطن اے جان
[illegible]

اک زہرے کا ہاتھ

[illegible]

آگ اور حنا

بے چارگی

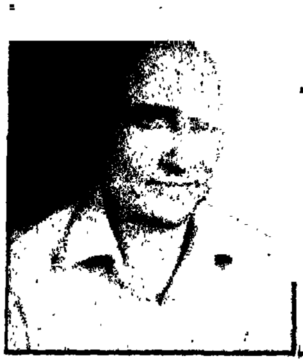
رات عفریت سہی

آؤ احباب کہ پھر جشنِ مسرت کر لیں
پھر تمناؤں کے عارض پہ نیا غازہ کریں
اپنی آدم کا بلند آج پھر آوازہ کریں

برزخ

ن۔م۔ راشد

نام: نذر محمد راشد، قلمی نام: ن۔م۔ راشد
تاریخِ پیدائش: ۹ نومبر ۱۹۱۰ء
وطن: گوجرانوالہ (پاکستان)
شعری مجموعے: ماورا [۱۹۴۱ء]
ایران میں اجنبی [۱۹۵۵ء] لا=انسان
[۱۹۶۹ء] گمان کا ممکن [۱۹۷۷ء]
شہرِ وجود اور مزار [غیر مطبوعہ] وفات:
۹ اکتوبر ۱۹۷۵ء [لندن] ن۔م۔ راشد کی
یہ دس نظمیں ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔
ن۔م۔ راشد: ایک مطالعہ مرتبہ جمیل جالبی
مطبوعہ ۱۹۸۶ء، مکتبہ اسلوب
[کراچی] سے مذکورہ نظمیں لی گئی ہیں
[ادارہ]



سید محمد عقیل

محمود منزل، دریاباد، الہ آباد-۲۱۱۰۰۳

مرثیے کی معنویت پر کچھ باتیں

یہ مقالہ مرثیہ نگاری کے احیا کے لیے نہیں پیش کیا جا رہا ہے اور نہ اس کا مقصد، اس رنگ شاعری کا کوئی ڈیفنس DEFENCE پیش کرنا ہے۔ بلکہ ہر رنگ سخن کی طرح مرثیے کے امکانات، اس زمانے میں تلاش کرنے کی ایک کوشش ہے اور جو کچھ، مرثیے کے نام پر لکھا گیا ہے، اسے بھی سمجھنے کی فکر کی جا رہی ہے۔ اس لیے نہیں کہ لوگ مرثیہ لکھیں، بلکہ اس لیے کہ آج کی نئی زندگی اور عقلیت پسندی کے دور میں، اس رنگ شاعری کے جملہ لوازم، کہاں تک چل سکتے ہیں اور آج کا ذوقِ شاعری، اگر مرثیے کو قبول کر سکتا ہے تو کس حد تک اور کن فنی اور فکری صورتوں کے ساتھ یہ خیال اس لیے بھی پیدا ہوا کہ، درس و تدریس کی دنیا میں فی زمانہ قدیم اور کلاسیکی ادب سے طلبا، اور اساتذہ کا جو رشتہ ٹوٹتا جاتا ہے، اس سے اس قدیم اور کلاسیکی ذخیرے کا نہ صرف یہ کہ کیا بنے گا بلکہ جو فن اور فکر کا خزانہ اس کے ذخیرے میں موجود ہے، اسے کھو کر، ادب کی نئی راہیں اپنا راستہ کس صورت میں بنائیں گی۔ اہلِ علم کے درمیان بھی، اکثر یہ سوال اٹھتا رہتا ہے کہ مرثیے اور قصیدے کیوں؟ آج، ان کا محل اور ان کی معنویت کیا ہے؟ اور یہ بھی کہ اگر ان موضوعات کو آج کے ادب میں شامل کیا بھی جائے تو ان کی شکل اور ان کا مواد کیا ہوگا؟ اس مقالے میں اس طرح کے چند سوالات بھی اٹھائے گئے ہیں اور ان کو سمجھنے کی بھی کوشش ہے۔

یہ سوال صرف مرثیے کا ہی سوال نہیں ہے بلکہ ہر ایسے ادب پارے کے لیے سوال ہے جب وہ اپنی گرم بازاری یا اپنی ہنگامیت ختم کر چکتا ہے تو آنے والی نسلوں کے لیے، اس میں کیا دلچسپی، توجہ طلب صورتیں یا لائقِ اعتنا چیزیں باقی رہ جاتی ہیں۔ کچھ اصناف تو ایسے ہیں جن کا مسالہ، ہر دور کی عصری زندگی سے آتا رہتا ہے۔ مگر کچھ ایسے اصناف بھی ہیں جو محض تاریخی ہو کر رہ جاتے ہیں اور صرف مثالوں اور حوالوں کا کام دیتے ہیں۔ مگر ایسے اصناف جو مردہ نہیں ہوتے اور تاریخیت کے ساتھ اپنے حال میں ماضی والی اور اپنی تہذیب رفتہ کا احساس دلاتے رہتے ہیں جو انسانوں کے ایک بہت بڑے طبقے کے ایمان، روایت اور زندہ حقیقتوں سے وابستہ ہوں، ان کو برتنے اور ان کے مسائل کی تفہیم میں خاصی ادبی ہوشمندی کی ضرورت ہے۔ مرثیہ بھی ایک ایسی ہی صنف ہے جس کی گرمیٔ بازار، وہ تو نہیں رہ گئی، جو لکھنؤ کے ایک مخصوص دور میں تھی اور نہ تاریخ اسلام کا یہ واقعہ محض داستان ہو کر رہ گیا ہے کہ اسے از کار رفتہ سمجھ کر چھوڑ دیا جائے بلکہ اس واقعے کی نامیاتی صورتیں، آج بھی دلوں کو گرماتی رہتی ہیں اور شاید ہر دور، اپنی محرومیوں، ظلم، جبر اور حق و باطل کے مقابلے کے لیے، اس معرکے میں، اپنے جوابات ڈھونڈتا رہے گا، جب بھی کسی دور کے انسان، ان صورتوں سے دوچار ہوں گے۔

اردو مرثیہ، اپنے تاریخی ماضی اور تہذیبی حال کے ساتھ چلا تھا۔ چاہے اس کا مطالعہ، دکن سے شروع کیا جائے یا دلی سے، یا اس کی تفصیلی صورتیں لکھنؤ کے پس منظر میں دیکھی جائیں، ہر جگہ اس کی تاریخیت اور تہذیبی حال، اسے گھیرے میں لیے ہوئے ہیں۔ ایک مخصوص تاریخی اور تہذیبی منزل پر، دکن میں قطب شاہیوں نے مرثیے کو عروج دینے کی کوشش کی۔ شکلی اعتبار سے، شاعری کی جو صورتیں مروج تھیں، مرثیے نے، ان میں سے کچھ شکلوں کو اپنے لیے چن لیا۔ عادل شاہیوں اور مغلیہ دور سے بھی وابستہ رہا اور اپنے بیانات کو وسیع کرتا رہا۔ دیسی رسم و رواج کے ساتھ عرب و عجم کی روایات لیے ہوئے۔ محمد قلی قطب شاہ نے ابتدائی مگر وجہی، مرزا، سیوہ، شاہی، کاظم اور ہاشم علی برہان پوری نے تفصیلات، بیانات اور ماجرے میں اپنے وقت کی تہذیبی صورتوں کو سمو کر مرثیوں میں وہ صورتیں پیدا کیں کہ یہ مرثیے، دکن کی تہذیبی تاریخ بن گئے۔ نصرتی نے "علی نامہ" میں حسینیؑ و علیؑ کی تعریف اور عاشور خانوں کے واقعات کی تفصیل۔ اس دور کے محرم اور مرثیہ گوئیوں کی پیشکش کی ہے، اس سے دکن میں مرثیوں کی عام ہی کا کچھ

اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بادشاہ خود مرثیہ خوانوں کے ساتھ، شبِ عاشور، سارے شہر کا گشت کرتے تھے اور تمام عوام، ان تہذیبی جلوس میں ساتھ ہو۔ رات بھر، چراغاں کے ساتھ بڑے بڑے الاؤ دہکتے رہتے، نُقل سے بھرے تھالوں اور چاندی کی خوبصورت پیالیوں میں رکھی جھن سبیلوں کا ذکر نصرتی کے "علی نامہ" میں ہے، اس سے، دکن کے اس دور کی مرثیہ گوئی اور تہذیبی دلچسپیوں، سب کا پتہ چلتا ہے۔

گولکنڈہ کی فتح (۱۶۸۷ء) کے بعد، پھر یہ مرثیے اورنگ زیب کے سپاہیوں کے ساتھ دلّی پہنچے اور دلّی کی محفلوں میں بھی مرثیے کے چرچے ہونے لگے۔ یہ بات بھی محلِ نظر ہے کہ کیا، اس سے پہلے، دلّی کی تہذیبی اور ادبی محفلیں، مرثیوں سے خالی تھیں؟ اور اگر نہیں تو کون لوگ جو ریختہ شاعری میں پیش قدمی کر رہے تھے؟ اور ان مرثیوں میں کس طرح کی چیزیں بیان کرتے تھے۔ اس کا تحقیقی طور پر کچھ پتہ نہیں چلتا۔ تاہم فضلی کربل کتھا، کیا یک بارگی وجود میں آئی ہوگی؟ پھر مرثیوں کے جس شغف کا تذکرہ درگاہ قلی خاں نے اپنے سفرنامے "مرقع دلّی" میں کیا ہے، وہ کس طرح وجود میں آیا ہوگا۔ یہ بھی رک کر سوچنے کی ضرورت ہے کہ فضلی کی وہ مجلس (۳۳-۱۷۳۲ء) تک کیا دلّی کی فضا میں، مرثیہ گوئی کے کچھ رکاوٹیں تھیں؟ ہو بھی سکتا ہے مگر اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اٹھارویں صدی سے پہلے دلّی میں شاعری کی بساط ہی کیا تھی۔ پھر مرقع اور مآثر الامرا کسی نے بھی ایسی کسی رکاوٹ کا ذکر نہیں کیا، تاہم دلچسپی ہونا ایک الگ بات ہے اور رکاوٹیں پیدا کرنا دوسری بات۔ میرے نہیں کہ کسی مغل بادشاہ کے دور میں کبھی کوئی رکاوٹ عزاداری کے سلسلے میں پیدا کی گئی ہو۔

اگر تاریخی اور تذکرے صحیح اطلاعیں دیتے ہیں تو اٹھارویں صدی سے شمالی ہندوستان کے ریختے میں مرثیہ گوئی کا سلسلہ صلاح، فضلی، غمگین، حزیں اور ندیم وغیرہ سے (ابھی تک کی معلومات کے مطابق) دلّی میں شروع ہوتا ہے۔ پھر دوسری صف میں سودا، میر، محب، پوشدار اور بعد کو میر حسن، شیر علی افسوس، حیدر بخش حیدری، قائم چاندپوری وغیرہ ہیں۔ ادھر بنگال میں مرزا ظہور علی خلیق، راجہ کلیان، عاشق، غلام حسین خاں، محمد حسین محزوں الہ آبادی کا ذکر تذکرہ مسرت افزا میں ملتا ہے اختر اورینوی صاحب نے اپنی کتاب "بہار میں اردو ادب کا ارتقاء" میں شاہ آیت اللہ جوہری (ولادت ۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴ء) شاہ نور الحق طپاں (ولادت ۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء)، مفتی غلام ثروت (ولادت ۱۱۵۴ھ/۱۷۴۱ء) وغیرہ کے نام دیے ہیں۔ ان سب تک چلے آئیے تو اٹھارویں صدی کے شمالی ہندوستان میں، مرثیہ گویوں کی ایک طویل فہرست بہار کے ان مرثیہ گویوں میں اکثریت خانقاہی صوفیوں کی ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ شمال میں صرف دکن سے آئے ہوئے مرثیوں کا اثر نہ تھا بلکہ مقامی طور پر بھی اپنے ڈھنگ سے مرثیے کہے جا رہے تھے جس میں کسی مخصوص عقیدے کی بھی تخصیص نہ تھی اور نہ کسی طرح کی پابندی۔ ایسی صورت میں فضلی کا یہ قول کہ "نواب شرف علی خاں...... ہر سال تعزیہ حضرت ابا عبداللہ الحسین علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بخلوص نیت اندرون محل مخفی بوجہ احسن بجا لاتا تھا" سمجھ میں نہیں آتا۔ درگاہ قلی خاں، دلّی میں نہ صرف مسکین، حزیں، اور غمگین کی مرثیہ گوئی کا تفصیلی تذکرہ کرتے، مرثیہ پڑھنے والے عبداللہ کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ وہ ایسی پرسوز آواز میں مرثیہ پڑھتے تھے کہ سامعین بے اختیار گریہ و بکا کرتے۔ آواز ایسی، استادوں کا خیال تھا کہ اس طرح کا طریقۂ مرثیہ خوانی کوئی نہیں جانتا۔

> "استادانِ موسیقی متفق اللفظ اند کہ ایں خوبیِ مرثیہ خوانی، قدم بہ عالمِ ایجاد نہ گذاشتہ و بہ ایں مواد نشئہ دم ایں سامانِ آہنگ سر از کارخانۂ تکوین بیروں نہ کشیدہ۔ در ماہِ محرم مقدمش ہمہ جا واجب الاحترام"
>
> [مرقع دہلی ص۵۲ مظفر حسین حیدرآبادی ایڈیشن۔]

یہی نہیں بلکہ جس جگہ میر عبداللہ، مرثیہ پڑھتے تھے، ایک مجمع پہلے ہی سے اکٹھا ہو جاتا تھا کہ تل دھرنے کی جگہ نہیں رہ جاتی تھی لوگ ایک دوسرے [illegible] کرتے تھے۔ میر عبداللہ کے گھر پر بھی مرثیہ سیکھنے والوں کا ایک ہجوم ہوتا تھا۔ میر عبداللہ کے علاوہ ایک شیخ سلطان تھے۔ وہ بھی مرثیہ پڑھتے تھے۔ ان کی آواز اور طرزِ مرثیہ خوانی کے متعلق مرقع دہلی میں یہ عبارت ملتی ہے:

> "مرثیہ را خیلے بہ آب و تاب می خواند۔ صدایش خارا گداز است و نشیدش قیامت طراز...... بہر عاشور خانہ کہ وارد می شود۔ مردم را محزوں می کند و صورت ماتم می کشد۔" (ص۵۳)

...... اور اسمٰعیل، میر درویش حسین، حاجی محب اور محمد نعیم کے نام ہیں جو پیدا مرثیہ خوانی میں اپنا جواب

محمد نعیم، مرثیہ گو بھی تھے۔ فارسی اور ریختہ، دونوں میں مرثیہ کہتے تھے۔ ان کے مرثیوں کے لیے مرقع دہلی میں حسب ذیل عبارت ملتی ہے۔

"از ہر لفظ مرثیہ اش، درد می بارد۔ و ہر کلمہ اش خون از دیدہا می چکاند۔ مضامینے در ریختہ می آرد کہ فارسان مضمار فارسی
زمیں گیر می شوند...... سخنش تاثیر عجیبے است و در کلامش تصرف طرفہ" (صفحہ ۵۵)

یہ واضح رہے کہ درگاہ قلی خاں سالار جنگ مصنف مرقع دہلی کا قیام، دہلی میں آخر ماہ ربیع الاول ۱۱۵۱ھ سے ۲۰ جمادی الاول ۱۱۵۴ھ تک رہا یعنی تقریباً تین سال تک۔

ان تمام شواہد سے اس دور میں، دہلی میں مرثیہ گوئی، مرثیہ خوانی، محرم اور عاشور خانوں میں لوگوں کا غم حسین منانے میں شغف، سب کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ فضلی کی اس عبارت کی بھی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے جو اوپر پیش کی گئی اور اس دور میں مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے RELEVANCE کی بھی تفہیم۔ یہ الگ بات ہے کہ ان مرثیوں کی ادبی قدر و قیمت کیا رہی ہوگی۔ اس کا اندازہ کرنا اس لیے بھی مشکل ہے کہ ان میں سے سوا مسکین کے شاید ہی کسی کا مرثیہ دستیاب ہو۔ لیکن درگاہ قلی کے بیانات، دتی میں، اس ماحول کی تہذیبی صورتیں ضرور پیش کر دیتے ہیں جن میں یہ مرثیے پڑھے جاتے تھے۔ نیز یہ بھی کہ مرثیہ گوئی اور محرم کی غم انگیزیاں صرف چند مخصوص لوگوں کی دلچسپیوں تک محدود نہ تھیں۔ خواص و عوام سب کی شرکت کا پتہ، ان بیانات سے ہوتا ہے اور ان عوام و خواص میں بھی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

سودا نے مرثیوں میں تہذیبی جھلکیاں اور مقامی رسم و رواج بالالتزام پیش کرنے شروع کیے۔ مناظر کی پیش کش کے ساتھ، شادی بیاہ کی رسمیں بھی، علی الخصوص وہ رسمیں جو ہندوستانی تہذیب سے مسلمانوں کی زندگی میں داخل ہو گئی تھیں۔ اس کے معنی یہ بھی ہوئے کہ جملہ اصناف سخن کی طرح مرثیے نے بھی اپنی افادیت نہ صرف عزائے حسین کے لیے قائم کی بلکہ ہندوستان کی سماجی اور تہذیبی زندگی کو بھی اپنے اندر سمو لیا جو اس وقت لوگوں کے گرد و پیش تھی۔ مرنے جینے کی رسمیں جن میں اسلامی اور غیر اسلامی، مقامی رسمیں بھی شامل تھیں، سب کا اظہار مرثیوں میں ہوتا ہے۔ اس کو اس طرح بھی سمجھنا چاہیے کہ لوگوں کے جذبات برانگیختہ کرنے کے لیے، مرثیہ گو وہ سماں بھی باندھتے، جس سے سامعین واقف تھے۔ اور جوان کی زندگی کے شب و روز میں آئے دن کی باتیں تھیں ــــــ اس وقت ثواب اُخروی کے ساتھ ہی بانیِ مرثیے وہ مآل مجلس پر، اس طرح بھی نظر رکھتا ہے کہ "غم حسین" میں کسی عصبیت یا ہٹ دھرمی کو جگہ نہیں ملنی چاہیے تاکہ واقعات کربلا کے اثرات کی رسائی، ہر مکتبۂ فکر تک ہو سکے اور پھر ہندوستان جو مختلف مذاہب کی آماجگاہ رہا ہے۔ وہاں یہ واقعات ہر مذہب و ملت کے افراد کے دلوں کو چھو سکیں۔ مرثیے کی یہ کوشش، اگرچہ، اس کی پوری تاریخ میں رہی ہے مگر دلی کی مرثیہ گوئی میں یہ بات خاص طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ اختلافات اور تعصبات، مرثیے کی پیش کش اور مشمولات میں نہیں ہیں بلکہ، ان کی جڑیں، کہیں باہر ہیں۔ جن تہذیبی صورتوں کا ذکر سودا اور ان کے دور کے مرثیہ گویوں میں کیا گیا ان کے کچھ نقشے مثالوں سے دیکھے جا سکتے ہیں جو ایک حقیقی COMPOSITE CULTURE کی دین ہے۔ یہ مثالیں کچھ اس طرح ہیں۔ حضرت قاسم کی شادی سودا کے مرثیوں میں ملاحظہ ہو۔

لاکے اے مالیناں، رن کی چمن سے پھلوار ‖ گوندھو نوشہ کے لیے، آج گل زخم کے ہار
ماتھے کا کرو سہرے سے گوہر کی دھار ‖ گاؤ دروازے پہ تم باندھ کے یہ بندھوار

غم ایں خانہ، بہ ہر خانہ مبارک باشد
درد، کاشانہ بہ کاشانہ مبارک باشد

اور آگے چل کر جعفر علی فصیح کے یہاں حضرت قاسم کی شہادت کے بعد زوجۂ قاسم کو رانڈ کی شکل میں یوں پیش کیا گیا ہے۔

جلد دروازے پہ رنڈسالہ پنہاؤ لاکر ‖ کالی چادر کوئی پاؤ تو اڑھاؤ لاکر
چاند سے ماتھے سے افشاں بھی چھڑاؤ لاکر ‖ ماں سے تھتھری پیاری کی بڑھاؤ لاکر

اوڑھنی دور کرو، کھول دو چہرا لوگو
نوچ کر پھینک دو سہرا لوگو

اسی طرح مرثیے کے دورِ عروج یعنی میر انیس اور مرزا دبیر کے یہاں بھی مختلف مواقع پر اس طرح کی مثالیں ہیں۔ ان میں ہر منزل پہ درجہ بدرجہ تہذیبی ارتقا کی صورتیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان کے مرثیے "مجلس کا اہتمام ای شہر پہ ہے ختم" میں لکھنؤ کی عزاداری اور اس تہذیبی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں جس طرح نصرتی کے علی نامہ، میں دکن میں عزاداری کی تفصیلات۔ لکھنؤ میں جس تہذیبی زندگی کا ارتقا ہو چکا تھا اس میں رسموں میں بھی نفاست ہے اور ان کے برتنے میں بھی۔ ساتھ ہی ساتھ زبان میں بھی وہ سلیقہ آگیا تھا جو ریختے کے دور سے آگے بڑھ کر دلی اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان میں پیدا ہوا تھا میں نے اپنے ایک مقالے "میر انیس کے مرثیوں کا سماجی تجزیہ" میں ایک جگہ لکھا تھا کہ اگر میر انیس فیض آباد اور لکھنؤ کی فضا میں نہ ہوتے جو نصیر الدین حیدر اور واجد علی شاہ کے لکھنؤ کی فضا تھی، تو حسب ذیل اشعار اور مصرعے شاید، اس طرح نہ پیش کیے جاتے۔ لطف یہ ہے کہ یہ سب کچھ تلوار کی تعریف میں ہے۔

چمک ایسی کہ حسینوں کا اشارہ جیسے
چال کیا تھی کہ ہزاروں کے گلے کٹتے تھے

کس کرشمے سے وہ لیلیٰ ظفر راہ چلی
گہ تھمی، گاہ بڑھی، گاہ رکی، گاہ چلی

برچھیاں چل گئیں اس پہ جسے دیکھا بھالا
آگیا دام میں جس شخص پہ ڈورا ڈالا

بجلی کو بھی تڑپا دیا تھا جلوہ گری نے
تاب اس کی نہ تھی، مانگ نکالی تھی پری نے

زلف، رخ، پیار کی باتوں کا تذکرہ، چھپ کر آنا اور بے ملے چلے جانا، ابرو کا اشارہ، کج ادائی، گھوڑے کی دلہن جیسی آمد، ہونٹوں کی خشکی اور آنکھوں کی تری کا بیان (عشق کی نشانیاں) ایک خاص مذاق میں پلے ہوئے، سامعین کے لیے ذہنی ضیافت اور تلذذ کا سامان فراہم کرنا ہے۔ مرثیوں میں ایسی باتوں کا بیان، لکھنؤ کی اس تہذیبی زندگی کو سمجھنے میں بڑی مدد کرتا ہے اور اس میں بھی زندگی کی وہ نامیاتی اور زوال پذیری کی صورتیں ہیں جن سے انیس و دبیر کا لکھنؤ گذر رہا تھا، ان باتوں کو تعصبات کے لیے نہیں بلکہ تجزیے کے لیے پیش کیا گیا۔ "غم حسین" نے الگ ہو کر بھی، مرثیوں کو ایک تہذیبی تاریخ کی ترتیب اور مطالعے کے لیے پڑھنا چاہیے۔ پھر "غم حسین" منانے کے طریقے بھی کس طرح سے بدلتے رہے ہیں اور ان کے پیچھے کون کون سے محرکات کام کرتے رہے ہیں، جب اس جستجو کے ساتھ مرثیوں کا مطالعہ کیا جائے گا تو مرثیے کا ہر دور میں اپنی اہمیت ظاہر کرے گا۔ انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز تک جس سوسائٹی کے لیے یہ مرثیے لکھے جاتے اس سوسائٹی کو ایسی ہی تمام باتوں میں مرثیے کی عظمت، اہمیت اور ایک اچھا معیار نظر آتا تھا۔ مرثیے کے کرداروں کی مدد سے بہتر اخلاقیات، دوستی کی حدیں، جذبۂ ایمانی اور اس دور کے بہت سے تہذیبی مسلمات، مرثیہ گو، اپنے سامعین کے لیے فراہم کرتا جس سے ایک ٹھہرے ہوئے سماج کو اپنی قدیم اقدار اور تہذیبی استواری انھیں راستوں پہ چل کر مسلم معلوم ہوتی تھی۔ اسی سبب سے اس سحر حلال کو علما بھی پسند کرتے کہ ان کی نظر میں مرثیوں کا محور، اخلاق کے ساتھ دینی بھی تھا۔ ایسی شاعری کی بات شعرا کو 'غاوون' کہنے والی صورت سے الگ کر لی گئی تھی کیوں؟ اس کیوں کے جواب کے لیے بہت دور تک دیکھنا پڑے گا کہ اس کے ڈانڈے افلاطون اور اس کی "جمہوریہ" تک پہنچ سکتے ہیں۔

۱۹۱۸ء میں جوش ملیح آبادی نے آوازۂ حق، لکھ کر "غم حسین" منانے کی ادبی صورتوں میں بھی تبدیلی پیدا کی اور مرثیوں کی افادیت اور تاثیر بھی ایک نیا انداز پیدا کیا۔ "آوازۂ حق" کو روایتی مرثیہ نگاروں نے "نظم" اور "مسدس" کہا۔ مگر سچ بات یہ ہے کہ جوش نے اسلوب اور بیان دونوں کو ایک نیا موڑ دیا۔ پھر ۱۹۴۱ء میں "حسین اور انقلاب" کے نام سے ایک اور مسدس پیش کیا تو معلوم ہوا کہ یہ رنگ مرثیے کی صنف کو ایک نئے تجربے سے آشنا کر رہا ہے۔ علامتیں، استعارے، تشبیہات، یہاں تک کہ لفظیات بھی بدلیں۔ سامعین کون تھے؟ روایتی بھی اور وہ لوگ بھی جو ہندوستان کی جنگ آزادی میں دلچسپی لے کر، جنگ آزادی کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں کود گئے تھے۔ پہلے تو روایتی مرثیہ گو، جوش کے ان نئے مرثیوں کو "مسدس" کہہ کر انھیں ٹالتے رہے، یہاں تک کہ "موجد و مفکر" سامنے آیا۔ پھر تو "طلوعِ فکر" "آگ، موت و حیات، قلم اور ۱۹۷۱ء میں "پانی" جیسے مرثیے آئے جن میں وقت کی آواز اور سماجی زندگی کے ساتھ، جوش کے کچھ اقوال بھی مرثیوں کے سلسلے میں پیش ہوئے جو اس طرح تھے۔

۱۔ مرثیوں سے ہمیشہ آنسوؤں اور آہوں کا کام لیا گیا ہے اور کسی ایک مرثیہ گو نے بھی اس جانب توجہ مبذول نہیں کی ہے کہ حسینؑ کے کردار کو پیش کر کے مؤمنین کو یہ سبق دے کہ دیکھو اگر تم حسینی ہو تو باطل کی طاقت کے سامنے کبھی سر نہ جھکانا اور فرماں روایانِ دہر کو خاطر میں نہ لانا۔"

[خراجِ محبت مقدمہ جوش بر عظمتِ انسان مصنفہ آلِ رضا]

۲۔ "جو مرثیہ تاسیِ حسینؑ پہ ابھارے وہ جدید ہے اور وہ مرثیہ تاسیِ حسینؑ پہ نہ ابھارے وہ قدیم کہلائے گا۔"

[جدید مرثیے کے تین معمار ــــــــــــ از ہلال نقوی]

"باطل سے ٹکرانے کی حرارت، سلطان جابر کے سامنے حرفِ حق کہنے کی جرأت اور جذبہ تاسیِ حسینؑ، ان چیزوں کا پیدا کرنا، مرثیہ گو شاعر کا فرض ہونا چاہیئے۔"

[جوش۔ بحوالہ ادبی مقالے ــــــــــــ کاظم علی خان ص۳۰]

جوش کی یہ تمام باتیں بیسویں صدی کی POLITICAL CONCIOUS SOCIETY سوچ اور فکر ہیں۔ بالکل اسی طرح، مرثیوں میں بھی جوش، وہ تیں لانا چاہتے تھے، جس طرح بیسویں صدی کے ہندوستان کا تمام پروگریسیو ادب، انگریزی حکومت کے ظلم و استبداد کے خلاف CONCIOUS ہو گیا تھا۔ جوش کے تمام مرثیے خصوصاً "آوازۂ حق" اور حسین اور انقلاب، یا بعد کے دوسرے مرثیوں کے اکثر بند ہندوستان کو ظالم کے خلاف ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے لیے اکساتے ہیں۔ براہِ راست بھی اور علامتی انداز میں بھی ملاحظہ ہو۔

اب بھی جنھیں ملتی ہے رہِ عشق میں تعزیز صد شکر کہ خوش ہو کے پہن لیتے ہیں زنجیر
ڈرتے ہی نہیں دیکھ کے جلاد کی صورت زنداں میں چلے جاتے ہیں سجاد کی صورت
اک کھیل ہے ان کے لیے شاہوں کی جلالت سینوں میں ہے ایمان، زبانوں پہ صداقت (آوازۂ حق)

تاخیر کا یہ وقت نہیں ہے دلاورو آواز دے رہا ہے زمانہ بڑھو بڑھو
ایسے میں باڑھ پر ہے جوانی بڑھے چلو گرجو مثالِ رعد، گرج کر برس پڑو
ہاں زخم خوردہ شیر کی ڈہکار دوستو
جھنکار، ذوالفقار کی جھنکار دوستو (حسین اور انقلاب)

اموڈ کا HAND OVER موجودہ مفکر میں بھی ہے۔

کر دیا تو نے یہ ثابت اے دلاور آدمی زندگی کیا، موت سے لیتا ہے ٹکر آدمی
کاٹ سکتا ہے رگِ گردن سے خنجر آدمی لشکروں کو روند سکتے ہیں بہتر آدمی

رعبِ سلطانی کو ٹھکراؤ تو لو نامِ حسینؑ ہو لشکروں میں نہ گھبراؤ تو لو نامِ حسینؑ
دشمنوں کی پیاس بجھواؤ تو لو نامِ حسینؑ موت کی چھاتی پہ چڑھ جاؤ تو لو نامِ حسینؑ

ہاں خود اپنے خون میں کشتی جو رکھ سکتا نہیں وہ حسین ابن علی کا نام لے سکتا نہیں

یہ کیفیت، جنگِ آزادی کی انقلابی نظموں سے آئی تھی مگر جوش کی آواز کی یہی جھنکار، آہنگ اور لفظیات سب رحسیا استطاعت تمام جدید مرثیہ ان کے کلام میں داخل ہو گئی ہیں۔ خیالات کے اعتبار سے بھی اور الفاظ و اصوات کی صورت میں بھی۔ جدید مرثیہ کا سارا موڈ اور RELEVANCE نیں خطوط پر ہے۔ جمیل مظہری (عرفانِ عشق)، آلِ رضا (کربلا سے پہلے کربلا کے بعد)، نجم آفندی (معراجِ فکر) یاور عباس (عبادت)، صفدر

حسین (آئینِ وفا)، ساحر لکھنوی (زندق سخن تجلیٔ ایمانِ زندگی) اور امید فاضلی (مترِ نینوا، صبر و رضا، روشنی)، سب کے یہاں جوشؔ کا ECHO ملتا ہے۔ جمیل مظہری، ساحر، یاور عباس اور صفدر حسین کے یہاں تو قدیم روایتیں بھی ہیں مگر امید فاضلی نے اپنے مرثیوں میں تفکر کی گہرائی بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اگرچہ اس میں بھی جوشؔ کے آہنگ کی پرچھائیاں ہیں۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

اک محمد دشمنی کیا کیا قیامت ڈھا گئی　　بدر کی حد بڑھتے بڑھتے کربلا تک آ گئی

آندھیاں چلتی رہیں اور اک دیا جلتا رہا　　قتل گاہوں کا سکوت آواز میں ڈھلتا رہا

ایک طائف کا مسافر، شام تک چلتا رہا　　اور ادھر، اک شیر، ذہنِ وقت میں پلتا رہا

اُس طرف ظلمت کا خنجر مشتعل ہوتا گیا　　نور ادھر جلوہ بہ جلوہ منتقل ہوتا گیا　　(روشنی)

سچ بات تو یہ ہے کہ آج کے عصری مسائل ہی اب مرثیوں کے لیے مواد اور موضوعات فراہم کریں گے۔ عالمی مسائل جس طرح ہر ملک کے شعر و ادب کے لیے مسالہ فراہم کر رہے ہیں، مرثیوں کے لیے بھی یہ مسالہ فراہم ہو سکتا ہے، ایک محدود صورت ہی میں سہی۔ کربلائے حیات، اور کربلائے بیروت، جیسے شگوفے اور ترکیبیں، مرثیے کے گرد و پیش میں ایک نیا دروازہ کھولنے کا اشارہ کر رہے ہیں۔ اور سیاست وقت پھر، انسانیت کی بقا کے لیے ایک چیلنج بن گئی ہے اور بقا نہ صرف حیات کی بلکہ اس تہذیبی تسلسل کی بھی، جو ہزاروں سال سے انسان نے اپنی مسلسل محنت، ذہن کی بالیدگی، نفاست اور سوجھ بوجھ سے پیدا کی ہے۔ ظالم اور مظلوم کی آویزش آج بھی جاری ہے اور اس طرح آج بھی انسان کربلائے حیات سے گذر رہا ہے۔ میں ایک بات کی طرف اور آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ آپ نے فیضؔ کے آخری دور کی شاعری میں "مرثیہ امام"، لاؤ تو قتل نامہ مرا، یہ ماتم وقت کی گھڑی ہے، شامِ غربت، ایک نغمہ کربلائے بیروت کے لیے، اور عشق اپنے مجرموں کو پابہ جولاں لے چلا، جیسی نظمیں اور کربلا کے بہت سے تلازمے دیکھے ہوں گے۔ شاید ان کے "مرثیہ امام" میں یہ بند بھی دیکھا ہو۔

طالب ہیں اگر ہم تو فقط حق کے طلب گار　　باطل کے مقابل میں صداقت کے پرستار

انصاف کے، نیکی کے، مروت کے طرفدار　　ظالم کے مخالف ہیں تو بیکس کے مددگار

جو ظلم پہ لعنت نہ کرے آپ لعیں ہے

جو جبر کا منکر نہیں وہ منکرِ دیں ہے　　(مرثیہ امام۔ فیضؔ از شام شہر یاراں)

اور پھر یہ تضمین بھی دیکھی ہوگی۔

"لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں　　کس کس کی مہر ہے، سرِ محضر لگی ہوئی"

شاید یہ شعر بھی پڑھا ہو ۔

ہر دور میں ملعون، شقاوت ہے شمر کی　　ہر عہد میں مسعود ہے، قربانی شبیر

"غبارِ ایام" کی ایک اور نظم "عشق اپنے مجرموں کو پابجولاں لے چلا" میں یہ اشعار ملتے ہیں۔

گلو میں کبھی طوق کا واہمہ
کبھی پاؤں میں رقصِ زنجیر
اور پھر ایک دن عشق انھیں کی طرح
رسن در گلو، پابجولاں ہمیں
اسی قافلے میں کشاں لے چلا

یہ سب کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟ شاید یہ سب واقعاتِ کربلا اور مرثیوں کی تہذیبی روایت کا ہی نیا کرشمہ ہے جو بڑے لطیف ڈھنگ سے گھوم کر اردو کی شعریات میں داخل ہو رہا ہے۔ مرثیوں کے RELEVANCE پر سوالیہ نشان لگانے والوں کو ان صورتوں پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ ... ، اقدار کربلا کے تلازمے، علامتیں اور اشارے فکری انداز میں داخل ہو رہے ہیں۔ نئی صورت حال کے ساتھ۔ اسے بھی

[باقی صفحہ ۱۸ پر دیکھیے]





محمود ایاز

چشمِ مشتاق نے یہ خواب عجب دیکھے ہیں
دل کے آئینے میں تشنہ عکس ہیں۔ سب تیرے ہیں

زندگی سے بھی نباہیں، تجھے اپنا بھی کہیں
اس کشاکش میں شب و روز گذر جاتے ہیں

خانۂ دل میں تھا کیا کیا نہ امیدوں کا ہجوم
خانہ ویراں ہے تو راضی برضا بیٹھے ہیں

دولتِ غم بھی خس و خاکِ زمانہ بن گئی
تم گئے ہو تو مہ و سال کہاں ٹھہرے ہیں

ابھی کچھ دیر نہ ڈوبے مہِ تابانِ فراق
ابھی کچھ خواب بھی جی بھر کے کہاں دیکھے ہیں

● ۴۴۔ سکنڈ کراس، تھرڈ مین، ڈیفنس کالونی، اندرا نگر، بنگلور

مصور سبزواری

◆

دریا کے پار کون ہے دریا ہی جانتا ہے
ہے قافلہ کہ خاک یہ صحرا ہی جانتا ہے

پہنچیں گے کیا چراغ بھٹک جائے حادثہ تک
سربستہ رازِ شب تو اندھیرا ہی جانتا ہے

پچھلے پہر جھپک گئی تھی چشمِ غم گسارِ ماں
منزل اب اس کی صبح کا تارا ہی جانتا ہے

دیکھے گا کب وہ پردۂ مژگاں اٹھا کے مجھ کو
آہٹ کو میری اجنبی جھونکا ہی جانتا ہے

کاغذ کا ما ثبات بھڑکتے بدن پہ رکھ کر
جل بجھنے کو وہ صرف تماشا ہی جانتا ہے

ان بے طناب خیموں میں گذری ہے عمر اس کی
سائے کو دھوپ کا وہ لبادہ ہی جانتا ہے

● نوح، ضلع گوڑگاؤں (ہریانہ)

◆

بگڑتے بنتے دائرے سوال سوچتے
نجانے کس کے تھے وہ خد و خال سوچتے

جو رونما نہیں ہوا وہ مرحلہ ڈرا گیا
ملیں گے کیسے اس سے ماہ و سال سوچتے

ستارہ در ستارہ شام اتری ہوگی لالہ
اکیلے بیٹھے ہم بصد ملال سوچتے رہے

عجیب موڑ سامنے تھے خواب خواب بستہ
بچھڑ کے باقی عمر کا مآل سوچتے رہ

ملے تھے تم تو ٹوٹ کر ہمیں تھے غیر مطمئن
ہزار فاصلے لیے وصال سوچتے

ہمیں یہاں وہ خوش قیاس خوش گمان
خیامِ ریگ میں جو برشگال سوچتے



رتن سنگھ

۲۲ آدرش نگر، ترپدا روڈ، جبل پور۔ ۴۸۲۰۰۸

مانک موتی

ایک وزیر کو رات میں سوتے وقت دودھ پینے کی عادت تھی۔

ایک بار جب وہ آدی باسی علاقے کے دورے پر گئے تو وہاں انہیں پینے کو دودھ نہیں مل پایا۔ ملتا بھی کیسے؟ آدی باسیوں میں گائے بھینس پالنے کا کوئی چلن ہی نہیں ہے۔

رات کو دودھ نہ ملنے کی وجہ سے صبح کو ان کا جسم کچھ بھاری بھاری سا تھا۔

اتنے میں اس علاقے کے کچھ آدی باسی ان کے پاس درخواست لے کر آئے کہ برسوں سے چلے آ رہے ان کے لکڑی کے کاموں کے لئے قرضے دیئے جائیں۔

وزیر نے ایک دو بار کاغذات پلٹ کر دیکھا اور پھر بولے۔ "آپ لوگ کیا کہتے ہیں بھینس کیوں نہیں پالتے۔ بھینسوں سے کیا کہتے ہیں دودھ ملتا ہے۔ دودھ سے صحت اچھی رہتی ہے۔"

وزیر کی بات سن کر آدی باسی ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ آخر ان کے پردھان نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "حضور گائے بھینس ہم کبھی پالے نہیں۔ آپ تو بس دستکاری کے لئے مہربانی کرو تو ہمارا کچھ بھلا ہو جائے۔"

وزیر وہاں سے جانے لگے تو علاقے کے بڑے افسر نے پوچھا۔ "حضور آدی باسیوں کی درخواست کا کیا کرنا ہے؟"

"اچھا یاد دلایا کیا کہتے ہیں اگلی بار جب ہم آئیں تو دودھ تو پینے کو ملنا ہی چاہئے۔ انہیں گائے بھینس پالنے کے لئے قرضے دلوا دو۔"

۲

"جناب دریا میں باڑھ آگئی ہے اور فصلیں برباد ہو رہی ہیں" کسی نے نیتا سے کہا۔

"فکر نہ کرو بھگوان بھلا کرے گا۔"

"جناب باڑھ کا پانی آبادی کے اندر آ گیا ہے اور لوگوں کے مکان ڈھے رہے ہیں۔"

"فکر نہ کرو بھگوان بھلا کرے گا۔"

"جناب! لوگ بھوک اور بیماری کا شکار ہو رہے ہیں!"

"فکر نہ کرو۔ بھگوان بھلا کرے گا۔"

"جناب باڑھ کا پانی آپ کے گھر کی طرف بڑھ رہا ہے۔"

"فکر نہ کرو بھگوان بھلا کرے گا۔"

لوگوں نے دیکھا کہ ایک ناؤ تیزی سے نیتا جی کے گھر کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھی۔

۳

ایک راجہ کا اپنا قد چھوٹا تھا۔ اس لئے اس نے زیادہ لمبے قد والے کچھ درباریوں کے سر قلم کروا دیئے۔ کچھ کو دربار سے نکلوا دیا اور جو باقی ان سے کہا کہ وہ اس طرح جھک کر چلیں کہ ان کا قد راجہ کے قد سے لمبا دکھائی نہ دے۔

اس طرح اس کے وزیر اس کی افواج کے جرنیل، اس کی ریاست کے سربراہ سب کے سب چھوٹے قد کے بونے آدمی ہو کر رہ گئے۔

پڑوس کے راجہ کو جب مخبر نے یہ خبر دی کہ ان کے پڑوسی راج کی حکومت بونوں کے ہاتھ میں ہے تو اس نے موقع کو غنیمت جان کر حملہ کر کے اس بونے راجہ کو نیست و نابود کر دیا اور اس کے ملک کو اپنے راج میں شامل کر لیا۔

۴

بھگوان کی دو مورتیوں کو دودھ سے اشنان کروایا گیا۔ پھر ریشم کے ساتھ ہیرے جڑے زیور پہنائے گئے۔ پھر لڈوؤں اور مٹھائیوں کا تھال بھگوان کے بھوگ کے لئے رکھ کر آرتی اتاری گئی۔

جب سب لوگ مندر سے باہر چلے گئے تو ایک مورتی نے دوسری مورتی سے حیران ہو کر پوچھا "میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جس ملک میں لاکھوں لوگ بھوکے ننگے ہیں دانے دانے کے محتاج ہیں، جن کے پاس رہنے کو مکان نہیں، سر پر چھوٹا سا آسمان نہیں، وہ لوگ آخر ہمارے لئے اتنا اہتمام کیوں کرتے ہیں۔"

دوسری مورتی کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا اس لئے چپ رہی۔

۵

ایک دن کافی ہاؤس میں ایک دروازے سے زندگی داخل ہوئی اور دوسری سے موت۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ دونوں کے درمیان مسکانوں کا تبادلہ ہوا اور پھر ایک ہی میز پر آکر بیٹھ گئیں۔

"آج تمہیں کافی ہاؤس میں آنے کی فرصت کیسے مل گئی؟" زندگی نے کافی کا گھونٹ پیتے ہوئے موت سے پوچھا۔

"تم نے میرا کام آسان کر دیا ہے۔" موت نے مسکراتے ہوئے بڑے اطمینان سے کافی کا پیالہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اب تو زندگی خود ہی دوسری زندگی کا گلا کاٹتی رہتی ہے۔ میں تو بس دور کھڑی تماشہ دیکھتی رہتی ہوں۔

۶

"تمہارا راجھا فلاں سہیلی کے ساتھ گھڑے اڑا رہا ہے۔" کسی سہیلی نے ہیر کو بتایا۔

"آؤ اس سہیلی کے پاس چلیں۔" ہیر نے کہا۔

"اس سے لڑو گی؟"

"نہیں۔ اس سے اپنے رانجھے کو رجھانے کے ڈھنگ سیکھوں گی۔

۷

پل پل پانی میں گھلتے ہوئے کچے گھڑے پر سوار سوہنی جب مہیوال کو ملنے کے لئے چناب کی تند و تیز لہروں سے لڑ رہی تھی تب لہروں سے ایک نوجوان نمودار ہوا۔ "سوہنی میں اس دیش کا شہزادہ ہوں۔ اگر تم مجھ سے شادی کرنے کا وعدہ کرو تو تمہیں ڈوبنے سے بچا سکتا ہوں۔"

سوہنی نے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اور لہروں میں ہاتھ پیر مارتی آگے بڑھ گئی۔

پھر ایک اور نوجوان آیا۔ "میں یوسف کی طرح سندر ہوں۔ اگر تم مجھ سے..." اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات پوری کرے، سوہنی آگے بڑھ گئی تھی۔

سوہنی جب مجدھار میں پہنچی تو ادھر سے ہی وال بھی اسے بچانے کی کوشش میں خود بھنور میں ڈوبا جا رہا تھا۔

سوہنی جلدی سے اس کے پاس پہنچی اور چناب کی لہروں کو دیکھتے دیکھتے اپنے محبوب کی باہوں میں ڈوب گئی۔

۸

ایک پنڈت کو مندر سے ایک معمولی سی چوری کرنے کی وجہ سے نوکری سے نکال دیا گیا۔

اب پنڈت جی نے برسوں سے دھرم کرم کے کپڑے پہنے ہوئے اتار کر پھینکے تو پھر وہ کھیل کھیلے۔ اب کالے دھندوں میں انہوں نے دو چار سال میں اتنی دولت اکٹھی کر لی کہ ان کے پاس کوٹھی کار نوکر چاکر سب کچھ آ گیا اور شہر کے معتبر لوگوں میں ان کی گنتی ہونے لگی۔

اب وہ جن مذہبی، سماجی اور تعلیمی اداروں کے صدر یا پردھان ہیں ان میں ایک وہ مندر بھی ہے جس میں کبھی وہ پجاری کی نوکری کیا کرتے تھے۔

۹

ایک نیتا لوگوں کے دکھ درد جاننے کے لئے ان سے مل رہے تھے۔

"کہئے آپ کو کاہے کا دکھ ہے۔" انہوں نے ایک مسکین آدمی سے پوچھا

"آپ کے آدمی سے ہمارا آج ہمار دہاڑی لوٹ جاتا ہے اور پھر ایک وقت کھانے کا نہیں ملتا۔"

نیتا اپنا سا منہ لے کر آگے بڑھ گئے۔

۱۰

صدارت کی کرسی پر بیٹھے ایک نیتا کہہ رہے تھے کہ "جب تک نکمے لے ایمان رشوت خور اور دیش دروہی لوگ ہمارے بیچ موجود ہیں تب تک ہمارا دیش ترقی نہیں کر سکتا۔ انہیں تو کرسی سے الگ کرنا ہی ہوگا۔"

سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک نوجوان اٹھا اور اس نیتا کو اسی وقت کرسی سے اٹھا دیا۔

۱۱

ایک چور کی تپسیا پر خوش ہو کر بھگوان پرگٹ ہوئے اور کہا کہ جو ور چاہو مانگ لو۔

چور نے ایک پل کے لئے سوچا اور کہا "بھگوان آپ خوش ہی ہوئے ہو تو یہ ور دے دو کہ جب میں چوری کرنے جاؤں تو کوئی مجھے دیکھ نہ سکے۔"

۲

ایک بھاٹ ملک ملک گھومتا ہوا راجہ کے دربار میں کوئی تاریخی واقعہ بیان کر رہا تھا۔

"حضور اس راجہ کے راج میں ظلم و ستم کا دور دورہ تھا۔ اس کے راج میں شرافت شرمندہ شرمندہ سی سر جھکا کر چلتی تھی اور غنڈہ گردی، ڈگر ڈگر اور نگر نگر پر راج کرتی تھی۔ عہدے دار رشوت خور تھے۔ انصاف پیسے کے ترازو پر تولا جاتا تھا۔ بے ایمانی کے عالیشان گھروں میں خوش حالی کے فانوس جلتے تھے۔ اور ایمان داری در در کی خاک چھانتی رہتی تھی۔ مہنگائی آسمان کو چھو رہی تھی اور......."

پرانے وقتوں کی داستان سناتے ہوئے بھاٹ اپنے آپ میں گم تھا تبھی راجہ اپنے تخت سے اٹھا اور اس نے اپنی تلوار سے بھاٹ کا سر کاٹ کر رکھ دیا۔

۱۳

ملک میں بڑھتی ہوئی بدعنوانیوں کے خلاف مہم شروع کرنے کے لیے نوجوانوں کا گروہ اپنے قومی راہنما کے بت کے پاس کھڑا ہو کر عہد کر رہا تھا۔

"ہم تمہارے چرنوں میں کھڑے ہو کر قسم کھاتے ہیں کہ ہم ملک دشمن عناصر کو مٹا کر ہی دم لیں گے۔"

نوجوانوں کے دیکھتے دیکھتے رہنما کا بت اپنی جگہ سے اکھڑ کر نوجوانوں کے پاؤں میں آگرا۔

۱۴

بستی میں ایک نیم پاگل سا آدمی اپنے دونوں بازو باری باری ہوا میں لہراتا تھا۔

"تم کیا کرتے رہتے ہو؟" کسی نے اس پاگل سے پوچھا۔

"ہوا کو متھ رہا ہوں۔"

"سمندر کے متھنے سے تو امرت نکلا تھا۔ ہوا کے متھنے سے کیا نکلے گا؟"

"ہوا کو متھنے سے ایسے ایسے رتن نکلیں گے کہ دیش کے سارے غریبوں کی دُر درتا دور ہو جائے گی۔" یہ کہہ کر وہ اور زور زور سے ہوا میں بازو چلانے لگا۔

"ارے بھائی یہ پاگل تو ہوائی باتیں کر رہا ہے یہ کوئی سرکاری آدمی معلوم ہوتا ہے۔" اس دن سے لوگوں نے اس میں دلچسپی لینی چھوڑ دی

۱۵

ایک چور سیندھ لگا کر گھر کے اندر پہنچا تو اس نے ایک اور چور کو وہاں پہلے سے موجود پایا۔

"ایک سے دو بھلے۔" نئے آنے والے چور نے کہا مال آدھا آدھا کر لیں گے۔"

زیور اور نقدی اکٹھی کر کے ابھی وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اسے کس طرح آدھا آدھا کیا جائے کہ وہاں تیسرا چور آ گیا۔

"دو سے تین بھلے" اس نے سرگوشی کی مال بانٹنے کے لئے ترازو میں دیتا ہوں جلدی سے تین حصے کر ڈالو۔

"تین سے چار بھلے" صرف ترازو سے کام کیسے ہو گا؟ باٹ تو میرے پاس ہیں۔" چوتھے چور نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ وہ چار برابر حصوں میں مال بانٹ چکے تو چلتے چلتے ایک چور بولا "چلو چوری کا پاپ چار حصوں میں بٹ گیا۔"

"پاپ کیسا بیٹا۔ یہ تو آج کل کا چلن ہے سرکار کی طرف سے وہ جو گریبوں کو مدد دینے والے اور قرضے دینے والے ہوتے ہیں وہ سب یہی کرتے ہیں۔

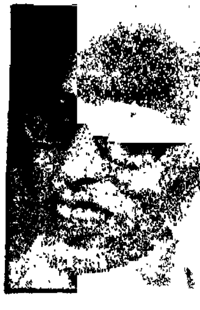
بقیہ صفحہ ۱۲ مرثیہ کی معنویت پر کچھ باتیں

دھیان میں رکھنا چاہیئے۔ واقعہ یہ ہے کہ وقت کی آواز، اس موضوع کو RELEVANCE فراہم کرتی ہے۔ جہاں تک واقعہ کربلا کے RELEVANCE کا تعلق ہے تو اس کا سلسلہ، دنیا بھر کے مظلوموں سے ملا ہوا ہے۔ اگر ظلم کی حدیں قائم ہیں تو مظلوموں کی آواز اور ان کے احتجاج کو بھی کوئی دبا نہیں سکتا۔ بہت پہلے حضرت نجم آفندی نے کہا تھا۔

سب غم ہیں دو روزہ، غم شبیر وہی ہے تیرہ سو برس بعد بھی تاثیر وہی ہے

نجم آفندی نے تو یہ بات عقیدت میں کہی تھی مگر اس میں حقیقت جھلک اٹھی۔ یہ حقیقت تاریخ کربلا ہے۔ اور یہ وہ حقیقت ہے جس کا واسطہ ہر دور کے احتجاج اور ہر دور کے ظالموں کے خلاف مظلوموں کی اٹھتی ہوئی آواز سے بندھا رہے گا۔

بہ خطِ شاعر



بشیر بدر

میں کب تمہارا ہوا تھا، یاد ہوگا
تمہارا فیصلہ تھا یاد ہوگا

بہت سے اُجلے اُجلے پھول لے کر
کوئی تم سے ملا تھا، یاد ہوگا

بجھی شمعیں ہر طرف گیسو ہی آنکھیں
کوئی آنسو گرا تھا، یاد ہوگا

اُداسی اور بڑھتی جا رہی تھی
وہ چہرہ بجھ رہا تھا، یاد ہوگا

وہ خط پاگل ہوا کے آنچلوں پر
کسے تم نے لکھا تھا یاد ہوگا

اگر یقیں نہیں آتا تو آزمائے مجھے
وہ آئینہ ہے تو پتھر سے آزمائے مجھے

عجیب چراغ ہوں دن رات جلتا رہتا ہوں
میں تھک گیا ہوں، ہوا سے کہو بجھائے مجھے

میں جس کی آنکھ کا آنسو تھا اس نے قدر نہ کی
بکھر گیا ہوں تو اب ریت سے اٹھائے مجھے

بہت دنوں سے میں ان پتھروں میں پتھر ہوں
کوئی تو آئے ذرا دیر کو رلائے مجھے

میں چاہتا ہوں کہ تم ہی مجھے اجازت دو
تمہاری طرح سے کوئی گلے لگائے مجھے

بے خبر ہے یہ سفیدی آج بھی بچی نہیں
ان دنوں میں جیسی لڑکی ذہن کی کچی نہیں

نارمل کے چھوڑنے کی یہ علامت صاف ہے
زندگی تجھ میں بھی خالی گری کچھ بھی نہیں

راج دھانی میں جو امریکہ یورپ کے کیمپ
جھونپڑی میں آج بھی ہاتھوں کی اک بچی نہیں

الہرا مندر کے سینے جو زنجیروں کو توڑ دیں
آپ کی دنیا تک کی بنیاد بن بکی نہیں

آدمی ان گاؤں میں کچھ ڈر کے کل موہ کر لے
کون کہتا ہے یہ دنیا اب کہیں سچی نہیں

آپ نے اب دو ہوائے کس لیے یہ چھیڑ کر
آپ کے گھر کی تو وہ اینٹ بن بکی نہیں

چاند کے چاروں طرف پھیلی ردائیں ساتھ ہیں
خاک اپنی سر پہ ہے کس کی دعائیں ساتھ ہیں

ایک عورت سے وفا کرنے کا یہ تحفہ ملا
جانے کتنی عورتوں کی بددعائیں ساتھ ہیں

دن کھلا ہے پھول سا اندر رات بھیگی آنکھ سی
کوئی موسم ہو یہاں دونوں ہوائیں ساتھ ہیں

انگلیاں میری ستاروں تک پہنچ سکتی نہیں
سیپیوں میں [illegible] بددعائیں ساتھ ہیں

بہتے پانی پہ کہاں نام لکھا پایا میرا
راکھ کے ڈھیر پہ گھر کیسا سجایا میرا

میں نے سوچا تھا کہ بلبل کی زباں سمجھو گے
میرے قاتل نے بھی [illegible] بتایا میرا

کیا کروں کتنے خدا دربدر ہیں کب سے
میرا ایمان ہے تو بس یہ خطا پایا میرا

سب کی آنکھوں میں سما جاؤں گا [illegible] نظموں کی طرح
سات پردوں میں اگر نام چھپایا میرا

وہ آنسو گھر کی چوکھٹ پر سو گیا ہوگا
کسی نے رات بھر [illegible] کیا ہوگا

میں [illegible] رہا ہوں لطیفوں کی سنہری [illegible]
وہ میری آنکھوں سے کس وقت رو رہا ہوگا

یہ شہر [illegible] کی طرح کیوں اداس رہتا ہے
مجھے یقین ہے دل اس کا آئینہ ہوگا

میں اس خیال سے اس کے قریب آیا تھا
کہ دوسروں کی طرح وہ بھی بے وفا ہوگا

یہ رنگتوں کی طرح بارشوں میں دھو لیتے
اداس چاند کی آنکھوں سے ہم بھی رو لیتے

خوشی کا بوجھ اکیلے نہیں سنبھلتا ہے
کہیں ملو تو اسے بیٹھ کے [illegible] لیتے

اگر سفر میں ہمارا بھی ہم سفر ہوتا
[illegible]

تمہارے [illegible]
کبھی ہماری طرح اس طرف بھی [illegible]

یہ کیا کہ روز ہی چاند کا بستر ہو
کبھی تو دھوپ کی چادر بچھا کے سو لیتے

میں تم کو بھول بھی سکتا ہوں اس جہاں کے لیے
ذرا سا جھوٹ ضروری ہے داستاں کے لیے

غزل کے فن میں خدا [illegible]
یہ چاند تارے [illegible] آسماں کے لیے

[illegible]
یہ قطرہ کانپ [illegible] نظروں کی طرح

دلوں کو چھیڑنے کا فن [illegible] غزل کا حصہ
یہ [illegible] کے لیے ہے نہ داستاں کے لیے

میں کیا دکھاؤں مرے تار تار دامن میں
نہ کچھ یہاں کے لیے ہے نہ کچھ وہاں کے لیے

غزل بھی اس طرح اس کے حضور لایا ہوں
کہ جیسے بچہ کوئی جائے امتحاں کے لیے

پیار کی نئی دستک دل پہ پھر سنائی دی
چاند سی کوئی صورت خواب [illegible] دکھائی دی

کس نے میری پلکوں پر تتلیوں کے پر رکھ دیے
آج اپنی آہٹ بھی دیر تک سنائی دی

ہم غریب لوگوں کے آج [illegible]
[illegible] رہائی دی

بارشوں کے چہروں پر آنسوؤں [illegible]
کوئی بوند [illegible] روشنائی دی

آسماں زمیں رکھ کر دونوں [illegible]
اک ذرا سی لڑکی نے [illegible] خدائی دی

یہ عجب خرابی تو خیر اس کی فطرت ہے
ورنہ اس نے جب [illegible]

یہ تماشا قدرت نے دونوں [illegible]
مجھ کو [illegible] اس کی [illegible] ادائی دی

وحید منزل، ۲۴۴ ۔ ٹالی پورہ، پیر گیٹ، بھوپال۔



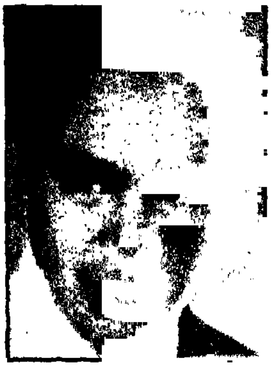
رفعت نواز
بالمقابل اسٹیٹ ہوم، محلہ گھاٹی، اورنگ آباد ۔ ۴۳۱۰۰۱

شک

اس کی زندگی کا یہ سب سے زیادہ تکلیف دہ سفر تھا۔ دل اور دماغ پر ایک خوف طاری تھا۔ اور نہ جانے کب کیا ہو جائے یہ خدشہ پچوکے لگا رہا تھا۔ وقت گذاری اور ذہنی الجھن سے چھٹکارا پانے کے لئے پاس بیٹھے مسافر سے رسالہ مانگ لیا۔ رسالے میں وحشتناک اور بربریت سے بھری کہانیاں تھیں۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر اس کی حالت اور بھی دگرگوں ہو گئی۔ دو راتوں سے وہ سویا نہیں تھا۔ آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی اور جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ پیر پھیلا کر سر پیچھے کی طرف جھکا کر آنکھیں بند کر لیتا تو ذرا سکون ملتا اور جھپکی سی آجاتی لیکن تھوڑی دیر کے بعد کوئی جیسے جھنجھوڑ کر اسے جگا دیتا۔ اڑ گرد بیٹھے مسافر دھیرے دھیرے باتیں کر رہے تھے۔ ان کی باتیں حالات حاضرہ کا بڑا بھیانک منظر پیش کر رہی تھیں۔ مہنگائی، بے روزگاری، اخلاق اقدار کی پامالی، اشراف کی بے بسی، رذیلوں کی سینہ زوری، اور دہشت گردوں کی من مانی۔ زندگی میں جیسے رس ہی نہیں رہا۔ نہ امنگ نہ آرزو بس بے مطلب جیسے جا رہے ہیں۔

کل رات جب سفر پر نکلا تھا تب بھی پریشان تھا۔ بھائی کا بلڈ پریشر ایک دم بڑھ گیا تھا۔ اور اسے ہسپتال میں شریک کر دیا گیا تھا۔ شہر کے حالات بھی تشویشناک تھے۔ اس کا بمبئی پہنچنا ضروری تھا۔ اہم کاغذات اس کے پاس تھے اور میٹنگ سے پہلے ان کاغذات کو بڑے صاحب تک پہنچانا ضروری تھا۔ ڈاکٹر نے دو گھنٹوں کی جدوجہد اور علاج کے بعد بتایا تھا کہ بھائی اب خطرے سے باہر ہے۔ گھر سے ہینڈ بیگ منگوا کر وہ ہسپتال ہی سے ریلوے اسٹیشن چلا گیا تھا۔ دن بھر بے چینی رہی تھی۔ شہر کے حالات اور بھائی کی طرف دھیان لگا ہوا تھا۔ وقت جیسے رک سا گیا تھا۔ بھوک اڑ گئی تھی۔ عجیب سی بے کلی تھی دل بیٹھا جا رہا تھا۔ جوں توں دن گذر گیا اور ٹرین چھوٹنے کا وقت آگیا۔ اسٹیشن پہنچ کر ٹکٹ لیا۔ اور ایک ڈبے میں گھس گیا۔ جو مسافروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بے بسی شاید اس کے چہرے سے عیاں تھی کہ ایک مسافر نے ذرا کھسک کر بیٹھنے کی جگہ دے دی۔ اس نے رندھے گلے سے شکریہ ادا کیا۔ ٹرین تیز رفتار تھی لیکن اسے لگ رہا تھا جیسے گھسٹ رہی ہے۔ ہر اسٹیشن پر گھڑی کی طرف غور سے دیکھتا۔ اور حساب جوڑتا کہ ابھی کتنے گھنٹے اور کتنے منٹ کا سفر باقی رہ گیا ہے۔ پچھلے پچیس سال میں اس نے کئی بار سفر کیا تھا۔ تین تین دن ریل کا سفر بیس بیس گھنٹے بس کا سفر لیکن ایسا تکلیف دہ سفر کبھی نہیں کیا تھا۔ ایسی بے چینی بے اطمینانی اور بے چارگی سے کبھی دوچار نہیں ہوا تھا۔ ہولناک خیالات دماغ کو جکڑے ہوئے تھے۔ یہ سوچ کر ہی ہلکان ہو رہا تھا کہ رات کے ڈھائی بجے ریلوے اسٹیشن سے گھر کیسے جائیگا۔ آٹو رکشہ ملے گا کہ نہیں۔ رکشہ والا نہ جانے کیا کر بیٹھے راستے میں شرپسند نہ گھیر لیں۔ ذہنی اذیت سے تو دوچار تھا ہی اب جسمانی اذیت کے تصور ہی سے دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ جوں جوں منزل قریب آتی جا رہی تھی خوف دہراس بڑھتا جا رہا تھا۔ آس پاس بیٹھے مسافروں پر نظر ڈالتا تو لگتا کہ سبھی خوفزدہ ہیں۔ ڈبے میں کوئی شناسا ہی نظر نہیں آیا۔ کسی اسٹیشن پر شاید کوئی پہچان کا مل جائے۔ اگر کوئی نہ ملا تو شاید صبح تک اسٹیشن پر ٹھہرنا پڑ جائے۔ مطلب یہ کہ اور تین چار گھنٹے ذہنی خلفشار میں مبتلا رہنا پڑیگا۔ اس خیال ہی سے رگ و پے میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ وہ تو جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ بھائی کے بارے میں اور شہر کے حالات کے بارے میں جاننا چاہتا تھا جو بیس گھنٹوں میں نہ جانے کیا کیا ہو گیا ہوگا۔ کسی بھی انہونی کے لئے وہ آمادہ نہیں تھا۔ ڈراؤنے خیالات نے سہما دیا۔ ان ہی طوفانی خیالات کے سمندر میں ہچکولے کھاتے کھاتے سفر تمام ہوا۔ ایک

اضطراری جذبے کے تحت وہ ڈبے سے اترا۔ اور دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ دس پندرہ آٹو رکشہ کھڑے تھے لیکن کوئی شناسا نظر نہ آیا۔ قریب ہی سٹی بس بھی کھڑی تھی لپک کر سوار ہو گیا۔ دوڑتے بھاگتے لوگ بس میں سوار ہو رہے تھے۔ لیکن وہ چیخ پکار وہ کہا گہمی نہیں تھی جو ہمیشہ ہوا کرتی تھی سب ہی خوفزدہ اور ہراساں تھے کنڈکٹر بڑے اطمینان سے ٹکٹ تقسیم کر رہا تھا۔ اسے مطمئن دیکھ کر ڈھارس بندھی کہ شہر پرسکون ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک مسافر نے بس چلانے کے لئے کہا پھر بھی کنڈکٹر اپنا کام کرتا رہا۔ ڈرائیور نیچے کھڑا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ بس چلانے کے لئے آوازیں اٹھنے لگیں تو کنڈکٹر نے اعلان کر دیا کہ تمام مسافروں میں ٹکٹ تقسیم ہو جائیں گے تب ہی بس چلے گی۔ خاموشی چھا گئی۔ کسی نے احتجاج نہیں کیا، ورنہ ایسی بات پر لوگ ہنگامہ کھڑا کر دیتے ہیں۔ مسافر سہمے بیٹھے تھے۔ آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ نہ جگہ کے لئے حجت کر رہے تھے۔ ہر شخص چوکنا اور مشکوک نظر آرہا تھا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ اس نے مفلر لپیٹ لیا۔ جب تمام مسافروں میں ٹکٹ تقسیم ہو گئے تب بس چل پڑی۔ ہسپتال کے موڑ والے اسٹاپ پر اس کے ساتھ ایک اور شخص بس سے اترا تھا۔ اس نے لمبا کوٹ پہن رکھا تھا سر کان اور تقریباً آدھا چہرہ مفلر میں چھپا ہوا تھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں، صرف ایک لمحہ کے لئے، دونوں انجان بنے کھڑے رہے۔ وسوسے نے سر ابھارا نہ جانے یہ کون ہے۔ آنکھوں سے شرارت ٹپکتی ہے۔ کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے کھڑا ہے۔ شاید ہاتھ میں چاقو ہو میرے پاس تو قلم تراش بھی نہیں ہے آگے بڑھوں گا تو پیچھے سے حملہ کر دے گا دوسرا آدمی ہسپتال جانے والی سڑک کی طرف مڑ گیا۔ وہ بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ سڑک سنسان تھی۔ بجلی کے دو ٹیوب فیوز ہو گئے تھے تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ آگے والا آدمی تیز تیز چل رہا تھا وہ بھی چوکنا سا اس سے دس قدم کے فاصلے پر چل رہا تھا۔ جوتوں کی آواز بڑی پراسرار لگ رہی تھی۔ آگے والا آدمی بار بار مڑ کر اسی کی طرف دیکھتا جوں ہی وہ مڑتا اس کے پیچھے والا آدمی ٹھٹھک کر کھڑا ہو جاتا۔ نہ یہ کچھ کہتا نہ وہ بات کرتا۔ ہسپتال کے گیٹ کے قریب پہنچ کر آگے والے شخص نے رک کر جیب سے کوئی چیز نکالی۔ یہ مبہوت سا کھڑا رہ گیا۔ خدشے نے سر اٹھایا۔ گھبراہٹ ہونے لگی، سوچا شاید اس شخص نے چاقو نکالا ہوگا چاقو کھول کر پلٹ کر حملہ کرے گا۔ اور لپک کر سمنٹ کانکریٹ کے جنگل میں کہیں گم ہو جائے گا۔ اس کے پیر سڑک پر چپک سے گئے۔ بدن میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ اور منہ سے دبی دبی چیخ نکل گئی۔ آگے والا چھینک کر کھنکار کر رومال سے ناک پونچھتا ہوا گیٹ میں داخل ہو گیا تو اسے جیسے نئی زندگی مل گئی۔ اور پوری قوت سے پیر اٹھا کر وہ بھی تیز تیز چلنے لگا۔ اور اس شخص سے آگے نکل گیا پھر کچھ سوچ کر رک گیا اور اس شخص کو آگے بڑھ جانے دیا۔ وارڈ نمبر تین کے قریب وہ شخص جا کر رک گیا۔ بڑے اطمینان سے سر سے مفلر ہٹایا۔ اور اس کی طرف مڑ کر کھڑا ہو گیا اب دونوں آمنے سامنے مفلر سے بے نیاز کھلے ہوئے چہرے لئے کھڑے تھے۔ اس شخص کے چہرے پر مطمئن سی مسکراہٹ تھی۔ وہ بھی مسکرا کر وارڈ نمبر ایک کی طرف بڑھ گیا۔ برآمدے میں وارڈ بوائے نے خوشخبری سنائی کہ اس کا بھائی اب نارمل ہے، اور اسے وارڈ نمبر تین کے پہلے والے اسپیشل روم میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ وہ وارڈ نمبر تین میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہی پراسرار شخص ایک پلنگ کے کنارے کھڑا نرس سے باتیں کر رہا ہے۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اور دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ✱



حمید الماس

مثال

سنا ہے
لوگ کہتے ہیں کہ
اس کے جسم سے خوشبو نکلتی ہے
ہوائیں اسکے دروازے پہ رک کر آگے بڑھتی ہیں
خلاء
ایک پالتو کتا ہے
بڑھ کر چاٹتا ہے اس کے تلووں کو
ستارے
اس کی آنکھوں میں ہیں قیدی کی طرح
بادل
اس کے گرد چکر کاٹتے ہیں
چاند اور سورج
ہیں عقیدت مند
یہ دنیا
مجھے یوں دیکھتی ہے
وہ مثالی شخص ہوں گویا

اثاثہ

ساری دنیا طعنہ زن تھی
کس لیے
بیمار پیڑوں
خشک پھولوں
لب دریدہ وادیوں
زخمی پہاڑوں
اور کالے جنگلوں سے
گفتگو کرتی ہے وہ
آج وہ پاگل سی لیکن منفرد لڑکی
بہت مسرور ہے
گرد خوردہ ساری چیزیں
اس کے سینے میں سمٹ کر آگئی ہیں

سلسلہ

ابر کے پیچھے نہاں ہے
صبح کا سورج
دھندلکے میں
دکھائی دے رہی ہے چشم نم کو
مردہ لمحوں کی قطار
وقت رفتہ
ایک آئینہ ہے جس میں
کھو گیا ہے
زندگی کا عکس بھی
منتظر ہے لامکاں آباد ہونے کے
آخری لمحہ گذرتے ہی
خلاء سے
پھر کوئی ذرّہ نہاں کی جستجو میں آ
پھر معطر ارض کے سینے میں
بوئے گا وہی تخم جمیل
کل جو نکلا تھا اسی کی کوکھ سے
آرہی ہے دور سے
بوئے کفن

۲۲، اپ اسٹیرس ۲۸۰ مین ۹، بلاک جیا نگر، بنگلور

تعارف

جون کی چلچلاتی دھوپ، گھنٹہ گھر نے ڈیڑھ بجایا تھا۔ اور وہ جھنگ بازار لائل پور کے داہنے فٹ پاتھ پر چلتا ہوا گھر جا رہا تھا۔ دوپہر کھانا کھانے کے لیے۔ گول بازار کے قریب پہنچ کر وہ ایکا ایکی رک گیا۔ اور اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا۔ انیس سو تیس سے انیس سو سینتالیس۔ سترہ برس کی اس زندگی نے کئی سوال کھڑے کر دیے تھے اس کے سامنے۔ اور وہ چاہتا تھا۔ ہر سوال کا جواب خود دے۔ مگر اس کے پاس علم نہیں تھا۔ سوال بہت سنجیدہ تھے۔ اسی لیے یہ خود کلامی کی کیفیت ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی اور وہ ریگل سینما کے باہر لگے ہوئے اس سائن بورڈ کے سامنے جا کھڑا ہوتا جس پر اس شام دکھائی جانے والی فلم کا اعلان ہوتا تھا۔ "آج شب کو ریگل سینما کے زرّیں اسکرین پر۔۔۔"

اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ کہ اس سائن بورڈ کے اس مسرت کے علاوہ اس میں ایک بہت بڑا بھید چھپا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سائن بورڈ لکڑی کا فریم بنا کر اس پر جستی چادر فٹ کر کے بنا دیا گیا تھا۔ اور اس کے اوپر بجلی کا ایک بلب لگا دیا گیا تھا۔ جس سے تحریر پر روشنی پڑے۔ بجلی کے تاروں کی فٹنگ کچھ اس طرح تھی کہ بورڈ کے نچلے حصے میں سے ایک ابھرے ہوئے لوہے کی کیل کو اگر چھوا جائے تو اس سے کرنٹ نکلتا تھا۔ اس بات کا علم سوائے اس کے اور کسی کو نہ تھا۔ وہ گنے کا ایک لمبا چھلکا زمین سے اٹھاتا اور اس سے اس کیل کو چھوتا۔ بجلی کا کرنٹ اس کے سارے جسم میں رواں دواں ہو جاتا۔ اور پھر وہ گنے کا چھلکا پھینک کر آگے بڑھ جاتا۔ اپنے گھر۔۔۔۔۔۔ لیکن وہ کبھی اسے گھر نہ لگا۔ اس میں اس کی ماں نہیں تھی۔۔۔ وہ کہیں نہیں تھی اس دنیا میں۔ اس کا باپ تھا۔ جو دن بھر دکان پر رہتا۔ بڑا ہی شفیق باپ تھا وہ۔ پھر اچانک اس شہر، اس شہر کے بازاروں اور اس شہر میں بسنے والوں سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ امرت سر ہال بازار۔ ایک چوبارہ جس میں سفید بالوں والا ایک آدمی بیٹھا۔ سرحد پار سے آنے والوں کے دکھ سکھ پوچھ رہا تھا۔ وہ اپنے شفیق باپ کے ساتھ اس کے پاس پہنچا۔ تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ وہاں لوگ رو رو کر اپنی بپتا بیان کر رہے تھے۔ نہ جانے کیوں اسے لگا کہ اس کا دکھ ان سب کے دکھوں سے بہت کم ہے۔

"چلو بابوجی۔ چلیں" اور وہ دونوں وہاں آگئے۔

کناٹ پلیس دلی میں اس نے آواز لگائی۔ "نوٹ کنگھی چار آنے میں"

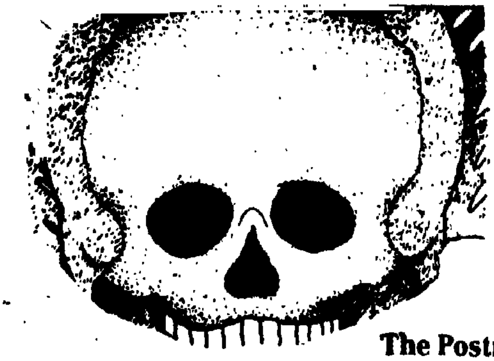
مندروں، گردواروں اور گرجا گھروں کے باہر کھڑے ہو کر آسنے۔ روزانہ گھریلو ضروریات کی چیزیں بیچیں۔ اور پھر اسے ایک بہت ہی منافع بخش کاروبار مل گیا۔ طوائفوں کے کوٹھوں پر رات کو پھولوں کے ہار بیچنا۔ اور دن میں جن پتھ کے کافی ہاؤس میں بیٹھ کر علم حاصل کرنا۔

پھر وہ وہاں سے چلا گیا۔ اندھیرا بہت تھا۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا، جب آنکھ کھلی تو وہ لدھیانہ کی سڑکوں پر سائیکل رکشا چلا رہا تھا اس نے زندگی میں پیشے، سانپ کی کینچلی کی طرح بدلے تھے۔ ریسٹورنٹ کا مالک۔ سوڈا واٹر فیکٹری کا مالک۔ سیلز مین شپ۔ ٹریولنگ سیلز مین۔ اور پھر سارا ملک پاؤں سے کھنگال ڈالا۔ اور ملک کی تہذیب کے بدلتے رنگ۔ تمدن کے روپ دیکھا اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ جس سے اس کی شخصیت کے اندر ایک گہرا شگاف پیدا ہو گیا۔

لیکن اس کی ذہنی اپج نے ہمیشہ ہی یہ بتا دیا۔ کہ کس سائن بورڈ کے کس کونے میں وہ کیل ہے۔ جو پیچھے سے بجلی کے تاروں کو چھوتا ہے۔ اور اسے کرنٹ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے تو سڑکوں پر چلتے چلتے وہ گنے کے کسی لمبے چھلکے کی تلاش میں رہتا ہے۔ اور رک رک کر اپنے آپ سے باتیں کیا کرتا ہے۔

[illegible]

۲۶ر اگست ۱۹۸۲



فسان

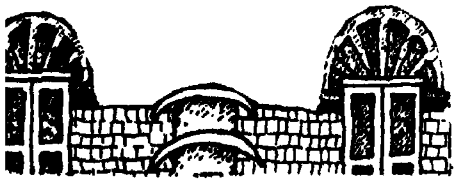
سریندر پرکاش

The Postman's Fear

Prisoners everywhere
Send me all you have
Fears screams and boredom
Fishermen of all beaches
Send me all you have
Empty nets and seasickness

Peasants of every land
Send me all you have
Flowers rags
Mutilated breasts
Ripped-up bellies
And torn-out nails
To my address... any cafe
Any street in the world
I'm preparing a huge file
About human suffering
To present to God
Once it's signed by the lips of the hungry
And the eyelids of those still waiting
You wretched everywhere
What I fear most is
God could be illiterate

Muhammad Al-Maghut



۳۰ رمئی ۱۹۸۸ء

بلراج مینرا کے نام

اب جہاں بھی ہیں، وہیں تک لکھو رودادِ سفر
ہم تو نکلے تھے کہیں اور ہی جانے کے لیے

[ندا فاضلی





سریندر پرکاش

۴/۳۴، یوگی راج آشرم، ہنس بوگرا مارگ، کالینہ، بمبئی ۔۹۸

فسان

[قسط ۱]

تمہید

ہزاروں برس پہلے کی بات ہے۔

چاروں طرف پھیلے ہوئے ریگستان کے وسط میں ایک نخلستان تھا۔

میں وہیں پیدا ہوا تھا۔

اس کے علاوہ بھی کہیں کوئی دنیا ہے، کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا۔ کہ کئی سو دن کی مسافت طے کرنے کے بعد سمندر دکھائی دیتا تھا۔ سمندر کی جانب ہمارے نخلستان کا جو کوئی بھی گیا لوٹ کر کبھی نہ آیا۔

سمندر کیسا ہوتا ہے! یہ جاننے کی خواہش میرے دل میں اکثر موجزن رہتی کہ وہ منظر کیسا ہوگا؟ ریت کی جگہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا لہراتا ہوا پانی ہی پانی نظر آتا ہوگا۔ اور اس پانی میں زندگی کے بھید چھپے ہوئے ہوں گے۔

مگر سمندر تک پہونچنا کوئی کم جوکھم کا کام نہ تھا۔

جیسے ہی میں تحیّر کے عالم سے نکلا تو ایک دن میرے باپ نے مجھے بلایا۔ میں نے پہلی بار اپنے باپ کو دیکھا۔ نورانی چہرہ، سر پر بڑا سا عمامہ، جسم پر لمبی قبا۔ وہ بزرگ میرا باپ تھا۔ جس کی دونوں آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور پیشانی پر گہری لکیریں تھیں۔ اس کے ہاتھ بہت ملائم تھے۔ میں نے اس کے دائیں ہاتھ کی پشت پر احترام سے بوسہ دیا۔ اور بائیں جانب بھی مسند پر دو زانو بیٹھ گیا۔

"میری بات غور سے سنو فرزند!"

میرا باپ گویا ہوا۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"جب ایک باپ کا وقتِ رحلت قریب ہوتا ہے تو وہ اپنے بیٹے کو اپنی ذمہ داریاں سونپ جاتا ہے۔

میں نے حیرت سے اپنے باپ کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ میرے باپ کی آواز گہری اور انتہائی سنجیدہ تھی۔

" اور بیٹے پر بھی فرض عاید ہوتا ہے کہ اپنے باپ کے ادھورے کام پورے کرے۔"

وہ کہہ رہا تھا اور مجھ پر رقّت طاری ہو گئی۔ اس نے اپنی بوجھل پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

وہ میری ساری کیفیت بھانپ گیا تھا۔

" یہ رونے دھونے کا وقت نہیں۔ عزم کرنے کا وقت ہے۔"

اس نے اپنا مہربان ہاتھ میرے کندھے پر رکھا۔

" آؤ میرے ساتھ۔"

اس کی آواز میرے وجود میں پھر گونجی۔

ہم دونوں شہریار کے دربار میں مؤدّب کھڑے تھے۔

بادشاہ تخت پر رونق افروز اور کسی سے آہستہ آہستہ سرگوشیاں کر رہا تھا درباری بھی آپس میں دبی زبان میں کچھ کہہ سن رہے تھے۔ لگتا تھا کوئی اہم معاملہ پا گیا ہے۔ سب ایک دوسرے پر اپنا ردعمل ظاہر کر رہے ہیں۔

تب اچانک بادشاہ کی نگاہ ہم پر پڑی۔

ہم دونوں کی نظریں جھک گئیں۔

بادشاہ نے مجھے غور سے دیکھا اور اپنی مخصوص آواز میں میرے باپ سے پوچھا۔

" تو یہی ہے وہ؟"

"جی عالم پناہ!" میرے باپ نے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا۔

" تو ٹھیک ہے۔ لگتا تو سمجھدار ہے۔"

"جی عالم پناہ۔"

"اسے سب بتا دو۔ اور تمہیں ہماری طرف سے رخصت کرنے کی اجازت ہے۔"

بادشاہ نے اپنا رخ دوسری طرف موڑ لیا۔ اور پھر باپ نے تین الٹے قدم اٹھائے۔ میں بھی ساتھ تھا۔

"سنو فرزند! کل سے تم مقررہ وقت پر دربار میں حاضر ہو جایا کرنا۔ اور میری جگہ فرائض کی انجام دہی کرنا۔

جب اگلے دن میں مقررہ وقت پر دربار میں پہنچا اور اپنے فرائض کی انجام دہی شروع کی تو مجھ پر عیاں ہوا کہ میرا باپ روزنامچہ نویس تھا۔

پس منظر

سمندر تیرا پانی آتا گدلا کیوں کر ہو گیا۔؟ کیا ہماری گاؤں پر جمی ساری برف پگھل گئی۔؟ اور برف میں گڑے ہوئے کہنیوں تک کٹے بازو داکھ بن کر تیرے آنگن میں آ گرے۔؟ یا ہماری مسافت کی دھول سے تیرا چہرا دھندلا گیا۔؟

اب تیرے آئینے میں کائنات کا حسن نہیں دیکھا جا سکتا۔ نہ ہی تیرے بازار میں تیرتی ہوئی جوان اور بوڑھی مچھلیاں دکھائی دیتی ہیں۔ تو یہ بات ٹھیک ہے کہ، کارواں مٹ گئے یا لٹ گئے۔ اب غبار راہ بھی باقی نہیں ہے۔ کہ اس رات جب ہمارا جہاز تیرے ساحل پر لنگر انداز ہوا تو ہم خوشی خوشی ریت پر کود گئے تھے۔ دور دور تک اندھیرا چھایا ہوا تھا صرف ہمارے جہاز میں جلتی مشعلوں کی روشنی ہی راستہ دکھانے کا ذریعہ تھی۔ لیکن اندھیرا بہت تھا۔ گھپ اندھیرا شاید شہر کے سب لوگ چراغ بجھا کر سو گئے تھے۔

ہم خوش تھے۔ ہم نے ساتوں سمندر کھنگال مارے تھے۔ اور اپنے تجارتی سامان کے بدلے سونے کی سلاخیں اور ہیرے کے سچے موتی لے کر آئے تھے۔ ہم دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ جب ہم اپنے گھروں کے دروازوں پر دستک دیں گے تو دروازہ کھولتے ہی ہماری عورتوں کے چہروں پر چراغ جل اٹھیں گے۔ ہم اپنی ساری کمائی ان پر نچھاور کر دیں گے اور وہ کسمسا کر ہماری آغوش میں بیلوں کی طرح سما جائیں گی۔ اور سفر کی ساری تکان پرانے موزوں کی طرح ہمارے جسموں کو چھوڑ دے گی۔

ہم شہر کے دروازے میں داخل ہوئے۔ اندھیرے میں دروازہ یوں لگ رہا تھا۔ جیسے اس کے پائے ستونوں سے جوڑ گئے ہوں۔

ہم محلت میں تھے ہم نے زیادہ دھیان نہ دیا۔ اور گلیوں بازاروں میں اپنے پاؤں کی تال پر چلتے رہے۔ اس گہرے گھپ اندھیرے میں یہ گھر ملبے کا ڈھیر لگ رہے تھے۔ لیکن ہم چلتے رہے۔ اور پھر عجیب بات ہوئی۔ ہم اپنے گھروں کے راستے بھول چکے تھے۔ اپنے گھروں کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ہمیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہم گویا بھٹک گئے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے لگے۔ پھر ایک طرف سے دھڑا دھڑا دھم کی آواز آئی۔ شاید کوئی دیوار گری تھی اور اس کے ملبے سے راستہ بند ہو گیا تھا۔ اندھیرے میں دھول اڑی اور آنکھوں کی بینائی دھوکہ دے گئی۔ ہم نے ہاتھ اٹھا کر ایک دوسرے کو تلاش کرنا شروع کیا۔ جس کے جس انگ سے انگلی چھوتی تھی اس انگ کے رونگٹے ابھر آتے تھے اور حیرانی ایک جسم سے دوسرے جسم میں سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوتی۔ پھر ہم یک زبان چلا اٹھے۔

"یہ سب کیا ہے؟"

"کیا ہے؟ کیا ہے۔؟ کیا ہے۔؟" بازگشت سارے میں چکر لگانے لگی۔ آسمان قدرے اور اونچا ہو گیا اور ہم اپنے آپ میں گویا مزید سکڑ گئے۔ اسی طرح رات بھر بھٹکا کئے۔ رینگتے سایوں سے — پھر سورج طلوع ہوا اور اس کی روشنی نے ہماری رہنمائی کی۔ ہم یہ دیکھ کر رو دیئے کہ ہمارا شہر برباد ہو چکا تھا۔ جگہ، جگہ ملبے کے ڈھیر پڑے تھے کوئی گھر سالم نہ تھا اور ہمارے گھر والے —؟ کسی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ سب نہ پہچانی جانے والی لاشوں میں بدل چکے تھے۔ جو اینٹوں، پلستر، عمارتی لکڑی اور مٹی کے ڈھیروں میں دبی ہوئی تھیں۔

اس شہر کی تعمیر میں کئی صدیاں کام آئی تھیں اور ہزاروں، لاکھوں زندگیاں صرف ہوئی تھیں۔ یہ اجڑے ہوئے گھر کی بکھری ہوئی اینٹوں کے ساتھ جنگل سے شہر تک پہنچنے کی کئی داستانیں وابستہ تھیں۔ وہ صرف ایک شہر نہ تھا۔ تاریخ کا پُرشکوہ سفر تھا۔ اب ہمارے پاس چھوڑ جانے کو کچھ نہ رہ گیا تھا۔

تب ہم نے ملبے کے ڈھیر سے ایک عورت ایک مرد اور دو بچوں کی لاشیں نکالیں۔ اور انہیں ایک کھلی جگہ رکھ کر سورج کی طرف منہ کر کے آگے بڑھنے لگے

ہم نے دیکھا سندھ کا دریا اپنی ہی دھن اور روانی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے شاید کسی حادثے کا علم تک نہ ہوا تھا۔ ہم تعداد میں کتنے تھے! اس کا غم کس کو تھا!

یہی سمندر تب تیرا پانی آتا گدلا تو نہ تھا،

بیسویں صدی کی دوسری دہائی

۱۹۲۱ موہن جوداڑو

سَر جان مارشل نے پلٹ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا، تقریباً سبھی پسینے سے شرابور تھے۔ اس نے اپنی نیکر کی جیب سے سفید رومال نکالا، سر پر سے سولا ہیٹ الگ کیا۔ پہلے پیشانی پر سے پسینہ پونچھا۔ پھر سارا چہرہ صاف کیا۔ خاکی قمیض، خاکی نیکر اور خاکی ہی سولا ہیٹ۔ اس کا سارا وجود خاکی ہو رہا تھا۔ پاؤں میں براؤن شوز تھے اور خاکی ہی لانگ ساکس تھی۔

"ہم بہت دور نہیں ہے۔" اس نے اینگلو انڈین لب و لہجہ میں کہا مقصد اپنے ساتھیوں کو حوصلہ دینا تھا۔

"یس سر! — اوکے سر! — یو آر رائٹ سر"

اس کے ساتھیوں نے ہانپتے ہوئے آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے سورج مغرب میں غروب ہونے لگا۔ اور سامنے دو ٹیلے نظر آ رہے تھے۔ جن کے قریب مزدوروں کے خیمے تھے اور کھدائی کا سامان ادھر ادھر بکھرا پڑا تھا۔ مزدور ایک طرف بیٹھ کر سستا رہے تھے۔ اور آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

سَر جان مارشل کو دیکھ کر ایکسکویشن اوپریشن کا انچارج اپنی کرسی سے اٹھا اور اس کی طرف بڑھا۔

دونوں میں علیک سلیک ہوئی اور پھر سَر جان مارشل نے پوچھا۔

" اینی تھنگ نیو مسٹر مکادم "؟

" جی جناب " مکادم نے اپنے چہرے پر استعجاب لاتے ہوئے جواب دیا۔

" ادھر مشرق کی طرف ٹیلے کی بائیں جانب جب کھدائی شروع کی تو پہلی ہی کدال زمین پر پڑنے سے کسی انسان کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ پہلے تو ہم نے غور نہ کیا سر، لیکن کدال کی ہر چوٹ پر جب کراہنے کی آواز سنائی دینے لگی تو حیرانی ہوئی۔ ہم رک گئے۔ انتظار کرنے لگے۔ پھر یکایک بہت سے بچوں، عورتوں اور مردوں کے رونے کی آواز زمین کے اندر سے سنائی دی۔ اب حیرانی مزید بڑھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے پاؤں کے نیچے کی زمین دھنسنے لگی ہم مارے خوف کے ادھر ادھر بھاگے۔ مگر پھر بھی ایک مزدور زمین میں دھنس گیا وہاں گڑھا ابھی تک موجود ہے۔" وہ ہاتھ اٹھا کر ادھر اشارہ کرنے کے بعد خاموش ہو گیا۔

سب لوگ آہستہ آہستہ اس سمت بڑھے، اور جائے حادثہ پر پہونچے وہاں ابھی تک گڑھا موجود تھا۔ سَر جان مارشل نے سر جھکا کر گڑھے میں جھانک کر دیکھا۔

اس نے دیکھا اندر ایک دنیا آباد تھی — قریب ہی سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا جس کے سینے پر عراق سے آنے والے جہازوں کا ایک قافلہ تیر رہا تھا۔ جہاز کے بادبان ہوا میں پھڑ پھڑا رہے تھے۔ فر..... فر..... فر...

ایک

۱۹۸۴

کے ای ایم ہسپتال، بمبئی۔

فر.... فر.... فر.... فر.....

لگا جیسے آواز دوسرے کنارے سے پھڑ پھڑاتی ہوئی اس کنارے تک آئی ہے۔ بیچ میں ایک بے پایاں، بے کراں سمندر ہے۔ جس پر ہزاروں ابابیلیں اڑ رہی ہیں۔ سمندر میں تیرتے جہازوں کے بادبان پھڑ پھڑا رہے ہیں فر... فر... فر....

یہ کس کی آواز ہے؟ — بھرائی ہوئی سی، پر اسرار... فر... فر... فر....

لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ زمانہ تو شاید ہمارے وجود میں آنے سے بہت پہلے کا ہے۔ ابھی تو سمندر کے بازار میں برف نہیں پگھلی ہے۔ اور سنہری پنکھوں والی نوجوان مچھلیاں چلنا نہیں سیکھ پائی ہیں۔ فر... فر... فر... غڑاپ.... شاید لقمہ نے پانی میں غوطہ لگایا ہے — پھر تھوڑا وقت گذرنے پر دھل دھلا کر، سجی ہو کر سطح سمندر پر ابھرے گا اور، معصوم کے جھاگ سب طرف پھیل جائیں گے۔ فر... فر... فر....

وہ آواز ابھی تک آ رہی ہے، لفظ ڈوب گیا ہے، جھاگ نے پیدا ہونے سے پہلے ہی دم توڑ دیا ہے، سب طرف اندھیرا ہے۔ سارا جسم مارے درد کے پھٹا جا رہا ہے آآ آہ۔!

ایک کراہ اس کے منہ کے دہانے سے ابلی اور پھر اچانک اس نے آنکھیں کھول دیں۔ سب سے پہلے اس کی نظر اونچی دھندلی چھت پر پڑی۔ جس کے ساتھ

ایک کونے میں بڑا سا سیلنگ فین لٹک رہا تھا اور، اپنی مخصوص رفتار میں چلتا ہوا ایک خاص طرح کی آواز نکال رہا تھا۔ فر۔۔۔فر۔۔۔فر۔۔۔

چھت سیاہ تھی۔ پنکھا سفید تھا۔ اونچی اونچی دیواریں بھی سفید تھیں بہت بڑا کمرہ تھا۔ جس میں دیواروں کے ساتھ ساتھ بیڈز کی دو قطاریں تھیں۔ اور ہر بیڈ پر کوئی نہ کوئی آدمی، آڑی ترچھی حالت میں لیٹا ہوا کراہ رہا تھا، یا سویا ہوا تھا۔

سویا ہوا یا مرا ہوا؟

اس کے ذہن میں سوال ابھرا۔ اس نے اپنے بارے میں سوچا کیا وہ زندہ ہے۔؟ اس نے اپنے بائیں جانب دیکھا وہاں ایک پارٹیشن تھا، جس کے ذریعے اس کے پلنگ کو کمرے کے باقی پلنگوں سے الگ کر دیا گیا تھا۔

اس کے قریب ہی آکسیجن کا سلنڈر رکھا تھا۔ جس کی نلکی اس کی ناک میں گھسی تھی۔ ایک اسٹینڈ کے ساتھ خون کی بوتل الٹی لٹک رہی تھی۔ جس کا قطرہ، قطرہ اس کے جسم میں سرایت کر رہا تھا۔ اس کے سینے اور کلائی پر سے ایک تار، قریب رکھے انسٹرومنٹ تک چلا گیا تھا۔ جو اس کی نبض اور دل کی دھڑکن کا حساب رکھے ہوئے تھا۔ کمرہ جیسے ویران تھا۔ کھڑکیوں کے باہر اندھیرا تھا۔ اور دور جھینگروں کی آہ وزاری گونج رہی تھی۔

کمرے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ٹین بلب، زرد اور بیمار سی روشنی پھیلا رہے تھے۔ اس نے ذہن پر زور دیا۔ سوچا کہ وہ کون ہے؟ اس سے پہلے وہ کہاں تھا۔؟ یہاں کب اور کیسے آیا ہے؟ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ لیکن۔۔۔۔ لیکن درد یکا یک بڑھ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ سارا منظر ہیولوں میں بدل گیا۔ اور پورے وژن خوابوں کی طرح ٹکڑے ٹکڑے بکھر کر آہستہ آہستہ زمین پر گرنے لگا۔

آواز پھر ابھری۔۔۔ لیکن یہ آواز مختلف تھی۔۔۔ پہلی آوازوں سے بالکل مختلف۔

"ہاں تو کامریڈ آفتاب! کیا سوچا تم نے؟"

"سچی بات تو یہ ہے کامریڈ چکرورتی کہ میں کسی نتیجے پر پہنچ نہیں پایا ہوں"

"شراب کیسی ہے؟"

"ہونہہ۔! شراب!۔۔۔ شراب ٹھیک ہی ہے۔"

"آفتاب۔! تمہارا نام ہے آفتاب، کامریڈ آفتاب۔ لیکن آفتاب تو مسلمانوں کا نام ہوتا ہے۔"

"ہمارے ہاں شمال مغرب میں نام بڑے کامن ہوتے ہیں کامریڈ چکرورتی، آفتاب احمد بھی اور آفتاب چند بھی۔ میرے والد کا نام اقبال چند تھا، اور محمد اقبال ہمارا شاعر بھی تھا۔ ہمارا کلچر انڈو مسلم کلچر ہے، ہمارے ہاں عورتیں اور مرد بلا لحاظ مذہب شلوار پہنتے تھے۔ میرے والد اقبال چند سبھروال بھی شلوار کے اوپر لمبی قمیض پہنتے تھے۔ سر پر گول کلاہ کے گرد ریشمی صافہ باندھتے تھے۔ پاؤں میں تلّے دار کھسہ پہنتے تھے۔ جس کی پتلی نوکدار زبان ہوتی تھی۔"

"شراب اچھی ہے نا؟"

"ہاں"

"کچھ مزہ آیا، کچھ سرور آیا؟"

"لگ تو رہا ہے۔"

"تم شمال مغرب کے لوگ، بڑے دل دار، بڑے محنتی، بڑے وفادار ہوتے ہو۔" (جاری)

بقیہ صفحہ ۴۶ مکتوبات

ایک ذرا سا دل ہے اپنا   لوگ اس میں کیوں کر رہتے ہیں

ان کی غزل کے مقطعے کا مصرع اولیٰ بحر سے خارج ہے ان کی ایک غزل کے مقطعے میں "خانہ خراب" کو "خانا خراب" پڑھنے کو ملا ایسے سہو کتابت کہنا مناسب ہوگا۔ عطا عابدی کا یہ مصرع کہ: کوئی بے چین روح آتی ہے پھر سنسان وادی میں، بحر سے خارج ہے۔ شاید آپ اپنی مصروفیات کی وجہ سے نگارشوں پر نظر ثانی نہیں کر پاتے۔

بساطِ سخن میں حضرت ناطق گلاوٹھوی کو دیکھ کر تاب ماضی کا ایک باب سامنے آگیا۔



اسلم حنیف

نہ سکون واماں نہ قہر و غضب، یہاں نہ رکو یہاں سے چلو
عجیب ہیں لوگ، شہر عجیب، یہاں نہ رکو یہاں سے چلو

اٹھی ہیں گھٹائیں زہر بھری، چلی ہیں ہوائیں خوف بھری
پڑاؤ یہاں محال ہے اب، یہاں نہ رکو یہاں سے چلو

قیام بنے گا وجہِ خلل، سکوں سے بڑھے گی اور تھکن
طویل بہت ہے راہِ طلب، یہاں نہ رکو یہاں سے چلو

یہ راہِ مفر، یہ سرد ہوا، یہ دشت، شجر، محل یہ کھنڈر
اسیر ہیں گہری نیند کے سب یہاں نہ رکو یہاں سے چلو

فلک سے برس رہا ہے یہ کیا ہماری زمین عذاب میں ہے
اُداس ہے آج منظرِ شب یہاں نہ رکو یہاں سے چلو

ہمارے ٹھہر گئے جو قدم، لرزنے لگا زمیں کا بدن
یہ حادثہ اور بغیر سبب، یہاں نہ رکو یہاں سے چلو

◆

ہیں یہ سنگ میل راہِ حق چاند تارے سب
نظر میں درخشاں رکھ شفق چاند تارے سب

میں غرقاب ہوں جس میں اک ایسا سمندر ہے
ہیں روشن طبق اندر طبق چاند تارے سب

جو محرومیاں جاگیں تو دل میں خیال آیا
میں گھر میں اٹھا لاؤں شفق چاند تارے سب

میں جب فتح کے ان پر علم نصب کر آیا
لگے دل کو مضمون ادق، چاند تارے سب

ہویدا نظر میں ہے سفر کیسی منزل کا
نگوں میرے قدموں میں شفق، چاند، تارے سب

ستاتی ہے پھر ہم کو ضرورت اجالوں کی
کریں دل میں پھر پیدا رمق چاند تارے سب

● قصبہ ککوڑ، ضلع بدایوں — (یو-پی)



مدحت الاختر

بستیوں میں ملے گی نہ بن میں رہتی ہے
وہ اور چیز ہے جو میرے من میں رہتی ہے

ہمارے دور کی دیوانگی نہیں پابند
کبھی یہ دشت کبھی انجمن میں رہتی ہے

یہاں سے لائے گی شائستگی جواب اس کا
وہ تمکنت مرے بے ڈھنگے پن میں رہتی ہے

سدا اس کے پاس رہوں اور خوش رکھوں اس کو
مدارات دن رات جیسے بھولے جتن میں رہتی ہے

سارا روپ جگاتا ہے نت نئے جادو
بستر اک نئی لذت چھون میں رہتی ہے

تمہارے سوا کوئی چھو نہیں سکتا
مری روح تمہارے بدن میں رہتی ہے

) نیا گودام، ۲۷ مئی ۲۰۰۲، مہاراشٹر)

سلیم شہزاد

۳۲۳ منگلوار وارڈ، مالیگاؤں۔ ۴۲۳۲۰۳

جدید نظم کی لفظیات

ایک صنفِ سخن دوسری صنفِ سخن سے متغائر ہوتی ہے اور اس مغائرت کا سبب اصنافِ سخن میں مستعمل مختلف اور متنوع لفظیات کے سوا کچھ نہیں۔ غزل نظم کی ایک مخصوص ہیئت ہونے کی وجہ سے اپنے اظہار کے لئے ایک خاص لفظیات کا انتخاب کرتی ہے جس سے اس کی خارجی اور داخلی ہیئت اور اس کے متفرق اسالیب نمایاں ہوتے ہیں کیونکہ ہر صنف کی ہر الگ الگ لفظیات ہوتی ہے جو اپنی ظاہری شکل سے صنف کی خارجی (اور باطنی شکل یعنی اپنے معنوی ابعاد سے صنف کی) داخلی ہیئت تشکیل دیتی ہے۔ "غزل میں ہر قسم کا مضمون بیان کیا جاسکتا ہے" کا اصول بنا لینے کے باوجود غزل میں ہر طرح کے لسانی اظہار کو بروئے کار نہیں لایا جا سکتا ایک مخصوص لفظیات ہے جس سے ماخوذ الفاظ غزل کے مضامین کو لسانی اظہار دیتے ہیں ورنہ غزل غزل ہی نہ رہے، مرثیہ، مثنوی یا قصیدہ بن جائے جو اپنی مختلف تکنیکی شناخت (اپنی جداگانہ لفظیات) اور منفرد ہیئتیں رکھتے ہیں اور اپنی انفرادیت میں غزل کی طرح شعری اظہار کی وہ شکلیں ہیں جو نظم کی بنیاد سے نمو پاتی ہیں۔ دراصل یہ کسی صنفِ سخن کا موضوع ہوتا ہے جس کے فنی اظہار کے لئے موضوع سے مطابقت و مناسبت رکھنے والی لفظیات زبان کے ذخیرے سے اخذ کی جاتی ہے۔ قصیدے کی زبان میں مرثیہ یا اس کے برعکس مرثیے کی زبان میں قصیدہ لکھا ہی نہیں جاسکتا اور نہ مثنوی غزل کی زبان میں یا غزل مثنوی کی زبان میں لکھی جاسکتی ہے۔ انیس اور دبیر وغیرہ کے مرثیے میں جس کا مقصد نوحہ خوانی اور رزم نگاری ہے، تمام شعری کوائف مثلاً چہرہ یا سراپا نظم کرنے کے لئے، تیر و شمشیر اور دیگر آلاتِ حرب کی اوصاف بیانی کے لئے اور شہسوار کی مردانہ و سپاہیانہ اور اخلاقی اور لسانی صفات کے اظہار کے لئے جو لفظیات منتخب کی گئی ہے وہ صنف مرثیہ ہی کے لئے مخصوص معلوم ہوتی ہے۔ "جواہراتِ انیس" (حصہ اول) سے مقتبس انیس کے مرثیوں کی لفظیات ملاحظہ کریں:

"چلاتی تھی یوں بنتِ نبی کوٹ کے سینہ، مظلومی و تنہائی کا غم ہے زاری کرو فریاد کرو خاک اڑاؤ، ماتم تھا ملائک میں،
کہو درد و غم، کبھی مارا جگر پہ ہاتھ، کیا کیا نہ شہِ حق پہ مصیبت گزر گئی، اعدا کا ظلم افسوس بے چراغ ہوئی بزمِ مومنین، برہنہ
پا، برہنہ سر، جگر غم سے پھٹ گیا، گیسوؤں میں گرد، شہیدِ تیغِ جفا، اب اٹھ گیا زمانے سے ہم بے کسوں کا چین"

مثالوں کی معنویت سے واضح ہوتا ہے کہ یہ اور ایسی ہی بے شمار دوسری مثالیں نوحہ خوانی کا اسلوب تشکیل دیتی ہیں۔

"گاوِ زمیں زمیں کے تلے تھرتھرا گئی، دل ہلنے لگا سینوں میں، چمکے صفتِ شیر، تلوار علم کرکے جو لشکر پہ جھکوں گا، کھینچ لی شمشیر
شرر افشاں، ہر صف پہ گری کوند کے برق، تیغِ رو در دم، گرد آ گئے سب برچھیوں والے، تیغوں سے کٹا جسم بھی خوں کے
بہے نالے، ناگاہ چلی ظلم کی تلوار، کس صولت و اقبال و حشم سے علم آیا، فوجِ ستم، ہتھیار لگائے ہوئے پہنے ہوئے جوشن،
ناگاہ بجا طبل بڑھا لشکرِ سفاک، غلغلۂ کوس آواز دہل، جانباز بڑھے، نمایاں ہوئی تیغیں لہو کی، وہ شیر چلا گھوڑوں
پہ چڑھ کر سوئے جنگاہ، پڑھنے لگے اشعارِ رجز، تیغوں سے قیامت نظر آئی"

ان شعری تراکیب اور شعری فقروں سے وہ لفظیات مرتب ہوتی ہے جس سے انیس کی رزم نگاری کی تخلیق ہوئی ہے۔ مرثیوں میں متعدد مثالیں بکثرت بھی پائی جاتی ہیں بلکہ انیس کے علاوہ دیگر سبھی مرثیہ گو شعرا کے کلام میں اسی یا اس سے مشابہ لفظیات کو رزم نگاری میں بروئے کار لایا گیا ہے۔

"جنگل میں عجب شان سے گل پیرہن آئے، پھولوں سے زمین بس گئی آنے لگی صحرا سے ہوا باغِ ارم کی، گلوں سے جو بھرا دشت کا
دامن، دریا کی ہر اک لہر میں بجلی کی چمک تھی، جب زلف کو کھولے ہوئے لیلائے شب آئی، جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے"

صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور، ٹھنڈی ہوا میں سبزۂ صحرا کی وہ لہک، وہ جھومنا درختوں کا، ہر برگ گل پہ قطرۂ شبنم، درختوں پہ تسبیح خواں طیور، ہرن سبزہ زار میں، ہوا سے آگ برستی تھی، کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثال شب، اڑتی تھی خاک، کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی، پانی تھا آگ، کسی شجر میں نہ گل تھے نہ برگ و بار"۔

زمان و مکان اور موسم و ماحول کی منظر کشی کرنے والی مذکورہ لفظیات مرثیے کے کرداروں اور ان کے افعال و اعمال میں ہم آہنگی کا اظہار کرتی ہے یعنی کردار نگاری جس کا تعلق شعور سے ہو، اس قسم کے لفظیات کے توسط سے افراد کی باطنی کشمکش اور بیرون کی ہنگامہ آرائیوں کے ارتباط و مشابہت کی مثال بن جاتی ہے۔

"تیغ تیز نہیں موت آتی ہے، چمکی، گری، اٹھی، ادھر آئی ادھر گئی، کاٹے کبھی قدم کبھی بالائے سر گئی، تلوار نے سب فوج کا ستھراؤ کیا تھا، بجلی کیطرح لشکر سفاک پہ چمکی، نیزوں تھا ذوالفقار کا پانی چڑھا ہوا، شمشیر تھنا رنگ، تیغ نے ان کو صاف کر دیا تھا، ثانی براق فلک سیر رہا ہوا ادھر ادھر سے تند و تیز، تو بجلی سے بے قرار پامال بدن ہوتے تھے گھوڑے کے قدم سے، اتراہٹ پھر زمیں پہ براق چلنی خرام میں کبک دری کا"۔

واقعۂ کربلا کے ہر مرثیہ گو نے تلوار اور گھوڑے کی تعریف و توصیف میں مسدس کے بند کے بند نظم کئے ہیں۔ مندرجہ مثالوں سے اس کے بیانیہ کے مختص لفظیات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور مجموعی مثالیں اس وضاحت کے لئے کافی ہیں کہ مرثیہ اپنے مواد و موضوع کے پیش نظر ایک مخصوص لفظیات کا متقاضی ہوتا ہے اور اسی خصوصیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ نظم کی ہر صنف اپنے اظہار کے لئے اپنی لفظیات چاہتی ہے۔

مرثیہ، مثنوی اور قصیدہ ہی وہ اصناف ہیں جو غزل کے تسلط کے عہد میں کبھی سر بلند نظر آتی ہیں لیکن نئے عہد میں جب شخصیات سے ربط و انس کے تصورات بدلے، عقائد متزلزل ہوئے اور فکری تجدید کی جگہ مختلف نظریات در آئے تو مرثیے کو زوال آ گیا، مثنوی ختم ہو گئی اور قصیدہ ہوا ہو گیا کہ ممدوحین ہی باقی نہ رہے تھے۔ اب ان اصناف کی بجائے نئی نظم نے مقبولیت حاصل کی۔ نئی نظم جو فطرت پسندی، استدلال، وسیع المشربی اور رومانیت کے علاوہ کر سامنے آئی اور حالی، اقبال اور جوش جس کے نمائندہ فنکار تسلیم کئے گئے۔ اقبال کی نظم تو نئی نظم کے بعد جدید نظم کی پیشرو بن گئی ہے اور اسے یہ مقام اس لفظیات کی انفرادیت نے دیا ہے۔ لفظیات کی انفرادیت جدید نظم میں خاصی نمایاں ہے جس کی ترویج ترقی پسند شعراء کی نظم سے ہوتی ہے۔

اس حقیقت کا اعتراف لازمی ہے کہ جدید نظم کے فروغ میں ان شعراء کا کردار اہمیت کا حامل رہا ہے بلکہ اپنے افادی اظہار کے لئے غزل کو مسترد اور نظم اور گیت کی ہئیتوں کو قبول کر کے انھوں نے جدید نظم کی توسیع کے امکانات روشن کر دئے ویسے مجروح اور ساحر کی غزلوں سے یہ آشکار ہے کہ غزل میں محدود و مخصوص نظریے کی ترویج کی صلاحیت بھی بدرجۂ اتم موجود ہے ترقی پسند شعری روایت اپنی ابتدا ہی سے تبلیغ و خطابت کی روایت رہی ہے۔ چونکہ اس کا مطمح نظر قدامت، کلاسیکیت اور ہر قسم کی ادعائیت سے انحراف، معاشرتی تصورات کی نئی تشکیل اور معاشی اور مادی حصول کے لئے اشتراکیت سے ربط اور اشتراکی بیوہار ہے اس لئے شعر و ادب کے توسط سے ان مقاصد کو شرمندۂ انجام کرنے کے لئے وہ جس شعری لفظیات کو بروئے کار لاتی ہے اس سے روایتی شعری لفظیات سے بڑی حد تک انقطاع ظاہر ہوتا اور اس میں، غزل اور نظم کی تفریق کے بغیر، نظریاتی، افادی اور استعارہ و استعمال مخالف معنوی ابعاد کی فراوانی صاف دکھائی دیتی ہے۔ "ایک خواب اور" سے ماخوذ نظم کی لفظیات کا خاکہ پیش ہے:۔

تشنگی آبلہ پا شعلہ بکف موج سراب، ساعت نایاب، شباب لب کے چہرے پہ سحر آئی ہے خون احباب، تمناؤں کے زخموں کا حساب، سرکشی، شاعر آوارہ و بیباک، اپنیک پھر جذبۂ بیتاب کی عالم پہ کمند، ان ہاتھوں کی تعظیم کرو، تمدن کی بہر چند جوانی، تشنگی کا اوتار، ہاتھ ہمارے روشن اس محنت کے افق کے سیارے، چارہ گران دو جہان، ظلم و ستم کے پیروں کی زنجیر گراں بھوک کا خار زار، قہر کی سرخ آگ، غرور تاجدار، صاحب تاج و تخت، شکست شہریار، بربط انقلاب، ذوق تجسس جوان ہے، جرأت شوق سبیل رواں، ذوق پرواز، رفعت آسماں اور یہی دست جنوں، بجائے اپنی زنجیروں کو زنداں خانہ سے گذرے ہیں، زوج افلاس کا، دولت کی فراوانی، حرف حق دار و رسن، جرأت کردار، کب یہ ظالم رات کٹے گی / کب دا پس آئے گا سویرا، سونے کی تلوار، نظام زر داری مشرق و مغرب کی تقدیریں، وہ آئے بیاں جو رکھتا ہے مرنے کی تڑپ، جیتے

کی لگن، عقاب کے پنجہ ہائے خونیں، وہ بھوک روٹی جو مانگتی تھی / صلیبِ زر پہ چڑھی ہوئی ہے قتل گہ کا نظارہ، سیاہ بارود کی بدلیاں، تیشوں کی دھار، ایک شب کی محنت، حیاتِ نو کے نئے اجنتا، نئے ایلورہ، امنِ عالم کی مراد، زہرِ عزم و ہمت، سیلِ آہن، سیلِ آتش، سیلِ خون، گنجِ شہیداں، بری جنت / میری زمیں، ماں ہے ریشم کے کارخانے میں / باپ معروف سوتی مل میں ہے / اپنے مجبور پیٹ کی خاطر / بھوک سرمائے کی بڑھائے گا، خونیں سرمائے کا نوالہ، مقتلِ تمنا، عظمتِ گلو، ہر لحظہ ہے قتلِ عام، کوئی بھوکا تو سرِ راہ نہیں سوتا ہے، بوسۂ خنجر، عشق و جنوں کے آداب، کوئی نہ ہوگا صاحبِ مال، کوئی نہ رہ جائے گا مفلس، شامِ غم صبحِ عشرت کی تمہید ہے، رُکنے والا نہیں شوق کا کارواں، طویل نظم کا صحرا، طویل جبر کا دشت، تیرگی کی سازش، بے گناہوں کا لہو پھر سحر پیدا ہوئی، مگر یہ جنگ نہیں وہ جو ختم ہو جائے، نکہتِ پیغامِ انقلاب، سحر کے دوش پر اک تازہ آفتاب بلاکشانِ محبت، گریبانِ صبح تو بھی ہے چاک، آئے گا پیغمبرِ مسیحا دست، دل کے طوفانوں کا گیت، پرچم لے کے میداں میں نکلنا ہے ہمیں"۔

بائیں بازو کے شعرا کی جدید نظم کی لفظیات حرکت و جرأت، خوش آیند مستقبل اور ہر شعبۂ زندگی میں اشتراکی تصورات کی قبولیت اور سرایت کی لفظیات ہے، زورِ خطابت کو جس کی اہم اور نمایاں خصوصیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ زورِ خطابت انیس اور دبیر کے مرثیوں میں بھی پایا جاتا ہے لیکن اس خطابت کی ساری ترغیبی کوشش قارئین یا سامعین کے نفسی اور جذباتی تہیجات کو برانگیختہ کر کے ان کے ذاتی مذہبی عقیدے کو مزید نمو دینے میں صرف ہوتی نظر آتی ہے جو مذکورہ فنکاروں کے علاوہ ہر دوسرے مرثیہ گو کے فنی اظہار کا مقصد بھی ہے۔ انیس کی خطیبانہ لفظیات کی ترغیب میں مخصوص مذہب فکر کے سننے والوں ہی کو متاثر کرنے کی نہیں بلکہ مجموعی انسانی ہمدردی و بیداری کو اجاگر کرنے کی غائت درجہ صلاحیت موجود ہے۔ اس کے مقابل سردار جعفری کے زورِ خطابت کی یہ خصوصیت شاعر کے اپنے سیاسی، سماجی اور انسانی نظریے کی عکاسی کرتی ہوئی ہے جس کی تاثر پذیری ہم خیال قارئین ہی تک رسائی رکھتی ہے۔ انیس نہ صرف اپنے ہم مذہب و مسلک کو اپنی طرف متوجہ کر سکتے ہیں بلکہ مخالف فکر کے پیروؤں کو بھی اسی شدت سے متاثر کرتے ہیں جبکہ ترقی پسند شاعر کی خطابت میں وہ زور نہیں پایا جاتا کہ اپنے مخالف کو قائل کر سکے۔ لفظیات کی یہ ایک سطح پر آفاقیت اور دوسری سطح پر تحدید اپنے اس پہلو کی غماز ہے کہ لفظی و معنوی مماثلت کے باوجود مختلف اسالیب کی لفظیات کی شدتِ تاثیر میں خاصا فرق ہوتا ہے چاہے ان اسالیب کے حامل دو مختلف شاعر اعلیٰ فنی مہارت بھی رکھتے ہوں۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک کو لفظیات کو برتنے کے باوجود ایک فنکار کا اسلوبِ بیان دوسرے فنکار کے اسلوبِ بیان سے مختلف ہوتا ہے۔ شعری لفظیات کا یہ رنگ جدید نظم کی لفظیات میں خاصا گہرا دکھائی دیتا ہے۔

جدید غزل کی لفظیات میر و سودا، آتش و ناسخ، انشا و مصحفی، ذوق و غالب اور امیر و داغ کی زبان کا ورثہ ہے جو ترقی پسند غزل کی لفظیات کے اثر و توسط سے اس تک پہنچا ہے[۵۵] لیکن جدید نظم کی لفظیات کا سلسلہ افادی شاعری کی لفظیات سے نہیں ملتا کہ اس میں خطابت، ترغیب اور فوری متوقع ردِعمل سے شعوری گریز کی صورت پائی جاتی ہے۔ دراصل جدید نظم کی مجموعی نمائندہ خصوصیت ہی یہ گریز اور اعراض کی صورتِ حال ہے جس کے اثرات اقبال کی نظم میں بھی نظر آتے ہیں اقبال نے شعوری اظہار میں روایتی ہیئتی پابندیوں سے بڑی حد تک گریز کیا ہے (حوالے کے لئے راقم کا مضمون اقبال کی ہیئتی اختراعات دیکھا جا سکتا ہے۔ مطبوعہ: زبان و ادب مارچ اپریل ۱۹۸۵ء) اور جیسا کہ کہا گیا لفظیات اظہار کی ہیئتوں کے تنوع میں اہم رول ادا کرتی ہے، اقبال کی نظموں میں یہ تنوع خوب اجاگر ہے کہ ان کے موضوعات روایتی نظم سے قطعی جدا نوعیت کے حامل اور نئے فنی آفاق کی دریافت اور ان میں شاعر کی خلاقانہ پروازوں کی مثالیں ہیں۔ اقبال کے بعد جب ترقی پسند شعرا نے جدید نظم کو کچھ اور اجنبی آفاق سے روشناس کرایا تو اس میں نئی لفظیات کے توسط سے نئی جہات آشکار ہوتی نظر آئیں۔ "ایک خواب اور" کی نظموں سے ماخوذ لفظیات جن کی عمدہ مثال ہے۔ پھر جدید شعرا یا جدید شاعری کے عروج کے ساتھ مزید سمتوں کا ارتقا عمل میں آیا۔ اس عہد کی نظم اقبال کی نظم ہی کی طرح ترقی پسند فنی اور فکری ادعائیت سے گریز کرتی، ہیئت کی بے ہیئتی کو اپناتی اور اپنے موضوعات کی آفاقیت کے سبب اس آفاقیت کے مکمل فنی اظہار کی اہل لفظیات کو بروئے کار لاتی ہے۔ ترقی پسند نظم کی طرح اس کا مطمحِ نظر کسی بیرونی سیاسی اور سماجی نظریے کو نظریۂ شعر بنا کر کسی افادی اور افادی مقصد کا حصول نہیں بلکہ اس کے برعکس وہ ہر بیرونی غیر فنی نظریے کے فن پر تسلط کی مخالف اور فن میں فطری آزاد روی کی حامی کی حیثیت سے

[۵۵] حوالہ: "جدید غزل کی لفظیات" (مطبوعہ نئی نسلیں، اکتوبر ۱۹۷۵ء)

نوعیت ادب میں اظہار کرتی ہے۔ اس میں نئی عصری زندگی کے نئے شعری تجربات نئے لسانی اظہارات کے توسط سے پیش کئے ہوئے ملتے ہیں۔ اس کی نئی لفظیات نئی شعری لسانی تشکیل، غیر روایتی شعری قواعد، بڑی حد تک غیر مانوس آہنگ شعری اصوات اور نثری آہنگ کی حامل ہے۔ اسی لئے اس میں بظاہر شعریت مفقود نظر آتی ہے، اظہار مبہم اور مشکل معلوم ہوتا ہے اور خیال کی ترسیل اور تفہیم میں سرعت نہیں ہوتی۔

فکری تجدید سے گریز کے نتیجے میں جدید نظم میں موضوعات کی گوناگونی افکار و خیالات کا تنوع اور اظہار کے اسالیب کے مختلف رنگ نمایاں ہیں۔ قلم برداشتہ قسم کی تنقید نے اس کے جن عمومی موضوعات کی دریافت کی ہے ان کی فہرست میں فرد کی تنہائی، ذات کا غم، احساسِ زیاں، خوابوں کی شکست، بے چہرگی، بے سمتی اور بے زمینی وغیرہ بآسانی پہچان لئے جاتے ہیں لیکن یہ نہ ختم ہونے والی فہرست ہے کہ ہر جدید نظم گو کے یہاں ان موضوعات کے علاوہ متعدد دوسرے ذات اور کائنات کے مسائل پائے جاتے ہیں۔ پھر متغیر عصر کے اثرات بھی وہ قبول کرتا اور متغیر عصر کے تجربات سے وہ ذاتی حیثیت سے گزرتا بھی ہے جن کا عصری زبان میں اظہار اس کے لئے ناگزیر ہے اسی اختلافِ رنگ و بو کے سبب مختلف فنکاروں کے یہاں مختلف اور نئی شعری زبان سے قاری کا سابقہ پڑتا ہے جو پہلی نظر میں مبہم اور غیر واضح معلوم ہوتی ہے:

افق کی ڈور ٹوٹ کر کسی عمیق غار کی سیاہیوں میں کھو گئی، سائے ہی سائے تھے رقصاں، میں انسانوں سے اکتایا ہوا، سا ویران سا آسیب کا مسکن، مگر اس کے خوابوں کو تاب دکر دیا، اب گھڑی میں بیسویں صدی کی رات بج چکی، برگِ خشک یوں بکھر گئے کہ جیسے شہرِ ہست میں یہ نیستی کی گرد کی پکار ہوں، شہرِ نو کے راستے تمام بند ہیں، میں اپنے خواب بیچ چکا/ کر حوصلہ نہیں بے شمار آنکھوں کو چہرے میں لگائے ہوئے استادہ ہے، ترے جسم گرانبار میں بستر پہ بچھا، ہر کرن بے صدا قہقہہ ہے، دل کی اک بوند کو آنکھ میں رکے میں دیکھتا ہی رہا، ایک پھیلا ہوا خشک بے برگ بے رنگ صحرا ہے، اپنے لہو پہ بہتا ہوں مجھے ساحل نہیں ملتا ندی میں بہتی ہوئی ناؤ ہی آئینہ ہے، رات کے پاس اندھیرے کے کچھ بھی نہیں، ایک آواز پیچھا کرے گی، ہمارے دن رات ایک سے ہیں، تم اپنے خواب گھر پہ چھوڑ آؤ، تم ان سب آئینوں کو توڑ دو، ہزار چہرہ آدمی/ خود اپنا چہرہ ڈھونڈتا/ تم جو چہرہ دیکھ رہے ہو/ اس میں ہیں کتنے ہی چہرے، نیا آدمی بوڑھے آدم کا بیٹا، دل و نظر کی یہ درماندگی یہ بے سمتی، ریزہ ریزہ ہوئی ذات کا ایک ہیولیٰ، اجڑے ہوئے شہر کا ایک منظر دکھائے کون ہوتے ہیں اور کون تھا وہ جس پر ہونی نے وار کیا، مرے ہی ہم نفس جو سادگی سے کوئی مشتہر فریب کھا گئے، پرندہ بال و پر ہے، سایوں کے ناخن، سب اجنبی ہیں حیرت و حسرت میں زندہ ہیں میں اک ایسے صحرا میں اب پھر رہا ہوں/ جہاں میں ہی میں ہوں، ہم سب ایک بڑے قبرستان کے آوارہ بھوت ہیں، اب یہ اجالے صرف دھواں ہیں، لہو کی ایک ایک بوند زخم بن گئی، امرت اور زہر ایک ہیں، میں بھی تماشائی ہوں خود اپنے جنم کا مری دنیا تماشا ہے، خزاں زدہ انگلیاں، شب گزیدگاں کے ہجوم سے، ہر ایک لمحہ جہنم ہر ایک خواب سراب، یہ شہر سورج کا شہر ہے اس کے روز و شب کا پتہ نہیں ہے، کہیں کبھی جائے امان نہیں ہے، آدمی ٹرین کی پٹریاں بن گئے، مرے جسم میں کون ہے یہ جو مجھ سے خفا ہے، سمندر خشک ہوتے جا رہے ہیں' لفظوں کا پل ٹوٹ چکا ہے، خواہشوں کے دیے جسم میں بجھ گئے' یہ میری آنکھوں میں کیسا صحرا ابھر رہا ہے، حکایتیں موسموں کی بارش میں ناتمامی سے قد رہی ہیں، طلسم میں جو قید تھا وہ کھو گیا، کس طرح آ گیا میں ہوا کے بھیانک طلسمات میں"

"نئی نظم کا سفر" سے ماخوذ یہ لفظیات کسی حد تک وہ خاکہ واضح کر دیتی ہے جس میں اس کے عمومی موضوعات کو تلاش کیا جا سکے۔ لیکن نظم وہ صنف ہے جسے محدود لفظی یا فقری اخذ و اکتساب کے ذریعے کلی حیثیت سے شناخت نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس میں شعری خیال ابتدا تا آخر ایک اکائی کی طرح مصرع بہ مصرع قدم اٹھاتے ہوئے ہوتا ہے۔ غزل میں یہ مشکل پیش نہیں آتی کہ اس کے معنوی پھیلاؤ کی حد صرف دو مصرعوں تک ہوتی ہے جو اس کی خارجی ہیئت بھی ہے اور ہیئت کی اسی تحدید کے سبب اس کی لفظیات کی اکائی میں کبھی کبھی صرف ایک لفظ بھی شامل ہوتا اور لفظیات کا یہ تکرار استعمال اس کی نمایاں کرِدگی بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ دھوپ، سمندر، سایہ، صحرا، ابر اور چہرہ وغیرہ کو جس طرح بآسانی جدید غزل کی

شناخت قرار دے دیا جاتا ہے اس کے برعکس مخصوص اور مجرّد الفاظ کی موجودگی کو جدید نظم کی مخصوص لفظیات نہیں قرار دیا جاسکتا مندرجہ لفظیات میں یہ خصوصیت پائی بھی نہیں جاتی کہ جسے مجموعی حیثیت سے جدید نظم کی لفظیاتی خصوصیت قرار دیا جاسکے۔ گویا غزل کی طرح مختصر اور محدود شعری ہئیت میں مستقل لفظیات بھی منتخب اور محدود ہی ہوتی ہے اور جدید نظم کی طرح آزاد، سیال اور متغیر ہیئت کی لفظیات کا دائرہ شاعر کے تخیل اور فنطاشی کی طرح لامحدود اور متحرک ہوتا ہے۔ اس موخر الذکر منافی خصوصیت کو جدید نظم میں اس کے متنوع زاویوں سے دیکھنے کے لئے ایسے شعرا کی نظموں سے گزرنا چاہئے جنھوں نے اپنی نظم میں ایک انفرادی اسلوب اور اظہار کا ایک ذاتی لہجہ، جس سے فن اور زبان کے تقاضے بھی پورے ہوتے ہیں، حاصل کر لیا ہے، تاکہ انھیں کی لفظیات کو مجموعی حیثیت سے جدید نظم کی لفظیات قرار دیا جاسکے۔ اگرچہ ایک فنکار کا اسلوب دوسرے کے اسلوب سے جدا نوعیت رکھتا ہے لیکن "با اسلوب" فنکاروں کی تعداد ہر صنف ادب میں کم ہوتی ہے۔ اس صورت حال کے باوجود جدید نظم کی لفظیات کے جائزے سے انھیں منتخب شعرا کی لفظیات کو یہ مقام دیا جانا چاہئے کہ وہ ایک صنف سخن کی پہچان بن جائے۔ یہ پہچان لفظیات کی موضوعاتی (فکری) اور لسانی (فنّی) دو سطحوں پر بنتی ہے:

> میں ایک گرداب کے مانند واپس لوٹتا ہوں، جیسے وقت کچھ نہیں وقت کی طویل دوڑ نے بے ارادہ کر دیا" ہمیشہ کے سمندر" کا بلاواجب وقت بہتا ہے/ تو پھر موجوں میں کب وہ فرق کرتا ہے جیسے یہی ایک لمحہ حقیقت ہے، روز و شب کے بیچ اپنے گھومتے کھلتے رہے، دیوارِ ماہ و سال کے روزن، گہرے نیلے گنبد کے اس پار چلیں، کروڑوں سال کے وہ فاصلے/ ایک پل میں مل گئے' وقت کا بوجھ، وقت کے تیز دھاروں سے کٹ کر، پھول کھلے ہیں آج تو کل یہ کہاں رہیں گے، وقفۂ عمر میں کس نے سمجھا ہے ایک میل/ سیلِ بے کراں، وقت صرف وقت ہے، جانے کل کیا ہو عمر ایک چیخ کی میعاد ہے، ثانیے، ساعتیں، شام اور سحر منزلیں گنتی رہیں، بیچ وقت، ہر یرت ایک یگ کی کہانی ہے وقت کا تیز لاوا، وقت کو تھامنے کی سکت ان میں باقی نہ تھی اجنبی وقت، اکئی نوری برس بیتے، جیتی سانسوں کا کتبہ، چلو وقت ہیں، پھر کہاں گھومتی ہے/ اس کا محور کہاں ہے عمر کی یہ بوسیدہ اترن بیس صدیوں کا ہیولیٰ ہو تم، فصل ست جگ کی، آنے والی یگوں میں میری دھڑکن شامل ہو"
>
> (نجات سے پہلے)

محولہ مخصوص لفظیات فلسفۂ زماں کی مختلف ابعاد کو محیط کرتی ہے۔ زمانے کا ہمہ جہت مسلسل بہاؤ، لموں اور صدیوں کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا، وقت کا قدیم جبر، بے رحمی اور اجنبیت، عمر گذشتہ کا نوحہ، حال اور لمحۂ موجود کی بے یقینی اور وقتِ آئندہ کے تعلق سے فرد کی پر تشکیک فکر وغیرہ افکار اس لفظیات کی معنوی سطحوں سے مترشح ہیں۔ معروضِ زماں کے یہی تصورات متعدد شعرا کی نظموں میں اکثر و بیشتر موجود ملتے ہیں۔ ان کی پیکری استعاراتی اور علامتی خصوصیات بھی مقتبس مثالوں سے واضح ہوتی ہیں اور لسانی اظہار کا طرفگی یعنی اسلوب کی انفرادیت نظم کی سطروں میں الفاظ کی دروبست، شعری خیال کی نامیاتی ہئیت سے ہم آہنگی وغیرہ ایسے نمایاں عناصر ہیں جو نہ صرف "نجات سے پہلے" کی نظموں کا امتیاز نہیں بلکہ ہر اہم جدید نظم گو کے یہاں انھیں بآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

> چہرہ سادہ کاغذ، دل: ریفریجریٹر میں رکھے ہوا گئے، مسکراہٹ: اک لپ اسٹک، میٹنگ میں اٹھیں کرتا ہے ٹیون کوتے مردار خور، اونچے مینار پر چڑھا ہوا ایک میں "وقت کی کھیتی ہیں ہم" ٹیپ پر جاتی ہے بل کھاتی ہوئی آواز، کچھ نہ کچھ ہونے کا احساس گراں ایکس رے اسکرین پر ہیں ہڈیاں تک بے لباس، اب سحر پاؤڈر لگاتی ہے، کاغذی پھول، پلاسٹک کے دل، بلب جلتے ہیں جن میں لہو دھواں، حسن فطرت سینما کا پردہ، یہ ریڈیو یہ کتابیں یہ فلم یہ اخبار/ یہ فائلیں یہ مضامین یہ پیام یہ تار/ انھیں سے عرش کے پیغام کچھ تک آتے ہیں، میں نقطہ ہوں، کون دائروں کی دیواریں اٹھا رہا ہے، سگرٹ کا بجھا بجھا ٹکڑا، فیوز اڑا دیتا ہے، آدمی ٹرین کی پٹریاں بن گئے، جوہری قوت کا اک بھرپور ہاتھ ناگنوں کی بلیوں کی بھیڑیوں کی سرخ آنکھیں/ شیر چیتوں گرگسوں کتوں کے کان، سبزے پر جیسے کوئی جوتے پہنے گھومے، خواب آور گولیاں، حقائق کا نہ میک اپ کر مشینوں میں رہ کر ہوئے سب مشین، میرا دل خالی کنواں ہے کورس گروپ میں اک میں بھی صدا ہوں، اپنے آپ سے

ٹوٹا ہوا ہوں، ایک گھٹن، انجن کی چنگھاڑیں، سائرنوں کی چیخیں، ہڈیوں کی نلکیوں میں گھومتے ہیں، میرے اندر بھوٹتا
ستی، ڈوبتے وجود کی پکار، مجھ کو اپنی بھی پہچان نہیں، بچھڑا ہوا "میں"، میرے معنی کہیں تو ہوں گے ناٹک میں جو رول ملا
تھا/وہ میرا کردار بن گیا (شب گشت)

حوادث سے معمور کائنات میں فرد کا وجود، خود اس کے وجود کا حادثہ اور معمول کی حیثیت سے فرد کی ذات پر حوادث کی تاثر آفرینی وجودیت کے فلسفے کے بنیادی عقائد ہیں جن کا پرتو "شب گشت" کی نظموں میں جا بجا نظر آتا ہے۔ معمول اور معروض کے مقام سے فرد اور ماحول کا رشتہ، ان کی ایک دوسرے سے غیر محسوس (یا محسوس) لاتعلقی (رشتہ اور بے رشتگی کا قولِ محال) جدید نظم کے وسیع تر منظر نامے پر محیط ہے۔ اس اظہار کے لئے شاعر لفظیات بھی وجودیت کے مکتبِ فکر ہی سے اخذ کرتا ہے۔ غیر یقینی صورتِ حال، تشکیک، احساسِ زیاں اور احساسِ شکستِ ذات جس کی نمایاں خصوصیات ہیں شعری ترسیلِ خیال کے وسیلے کے طور پر جو لسانی تشکیل "شب گشت" کی لفظیات کا خاصہ ہے اس میں "غیر شعری لفظیات" کا شعری لوازم کی طرح بے تکان استعمال سرِ فہرست ہے۔ انگریزی اور ہندی کے مانوس اور زیادہ تر غیر مانوس الفاظ اس تشکیل کے عناصر ہیں۔ دیو مالا سے ماخوذ تصورات بھی اپنے اظہار کے لئے اپنے ہی مخصوص لفظی سیاق و سباق کے متقاضی ہوتے ہیں جو "شب گشت" میں ایک فکری تناظر وجودیت کے ساتھ فن کی سطحوں پر اجاگر ہوئے ہیں۔ جدید نظم کی عام لفظیات میں بھی اس تناظر کو دیکھا جا سکتا ہے جس کو پہلو بہ پہلو غیر شعری اور اساطیری لفظیات کے توسط سے کھردری بے آہنگ اور جدید عصری زندگی کی عکاسی جدید زبان کے بے شمار نمونے نظر سے گزرتے ہیں۔:

حوصلوں کے نچے ہوئے بال و پر، آخری شہر جل چکا ہے، رات کا آہنی در (سمندر (جہنم) کی جانب کھلا) میں کون
ہملا تم کون ہو، لمحۂ موجود خنجر کی طرح چبھتا، پھیلتا سمندر، میں صید آئینہ ہوں، منہدم رشتوں کے ساحل پر، پرندہ
سنہری چونچ سے پرواز کرتا ہے، سب اجنبی ہیں، آواز سے آواز کا رشتہ نہیں ہوتا، لفظ دیواریں ہیں، ہمارے سینوں میں خوف
ہی خوف ہے، سیاہ موسم محیط ہے روز و شب کے بے رنگ مرحلوں پر، میرے ہمراہ میرا بھیڑیا، سپید کو سر سے پاؤں تک تیرگی
نے ملفوف کر دیا ہے، وقت کے تیرہ سمندر میں دائرے کا مستقل بے کیف بے معنی سفر، ہر سکوں عارضی ہے کل کے موسم جھوٹے تھے،
ہر راہ گزر اک دریا ہے، سیاہ فام حسرتوں کے غول، نخلِ آرزو کے زرد پتے (روگ) — زندہ ہیں مگر یہ صرف جسموں
میں چھپے ہیں، دھند میں لپٹا ہوا دشتِ نوا، شہر کا سایہ، کھویا ہوا سورج، تماشائی نہیں ہوں میں تو منظر ہوں، ہجوم بے اماں، وہ
شخص کون تھا جو اپنے آپ سے بچھڑ گیا، برف کا موسم مسلط ہے سنگِ سیاہ، ہر ایک شے صرف ایک لفظ ہے، میں بے مصرف خوابوں
میں الجھا رہتا ہوں، پھیلتا مہیب سلگتا دشت، شبِ گراں کے ہزار چہرے، ہوا کا جبر، ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش میں
ہر روز بچھڑ جاتے ہیں، میں ایک ہی جنم میں اربوں جنموں کے جہنم سے گزر گیا، خواب ہر تابوت سے بڑا تابوت ہے ہوا کے خنجر لیے
کے درمیاں، رسمیں ہنسنے رونے کی، سب منظر جھوٹے ہیں، اندر کا وحشی، طائرِ پرشکستہ، پاگل ہوا (نژادِ سنگ)

نفی و اثبات، یقین و گمان اور آس و یاس کی کیفیات مع لفظیات کی معنوی سطحوں سے منعکس ہیں۔ ذہنی کشمکش کی آئینہ دار اور متصادم تصورات کی پیکر تراشی کرنے والی ان مثالوں سے جدید نظم کے وہ زاویے کھلتے ہیں جن سے فرد اپنے وجود کے تماشے کا آپ تماشائی بن کر سامنے آتا ہے۔ جسم و روح، امید و بیم، آب و سراب، صدق و کذب غرض سارے متضاد تجربات ایک ہی ذات میں وارد ہوں تو ان کا شعری اظہار بھی متضاد کیفیات کا حامل ہوتا ہے جیسا کہ "نژادِ سنگ" کی ان مثالوں سے واضح ہے۔ جدید نظم کا طویل منظر نامہ اسی گومگو کیفیت کے رنگوں سے معمور ہے یہ مثالیں اپنے استعاراتی اور علامتی معنوں سے جدید نظم کی زبان کا فنی سطح سے جائزہ بھی پیش کرتی ہیں:

آج کچھ ٹوٹا ہوا ہوں، میں خود اپنے پیٹ کے اندر پڑا ہوں، سارے شبد کتنے اجنبی، میں کہاں ہوں، سارے آدرشوں کو
دیمک کب کی چاٹ چکی ہے، آدمی —— پھر گپھاؤں کی طرف لوٹ گیا، کوئی آزاد نہیں، گھپ اندھیرا ہے، شور ہی شور ہے
چاروں جانب (لفظوں کا پل)
مگر کہیں کوئی چہرہ نظر نہیں آتا، بے حس سمندر، قبر قبر جزیرہ چلو اس شہر سے دور، جنگ گھر گھر بولتی ہے، آدمی — بدل سکتا

نہیں ـــ بیچ سکتا نہیں، چلتا پھرتا میوزیم/ ہر رنگ بکھر جاتا ہے/ جو آگے بڑھتا ہے دو چار کو گراتا ہے، ذہن میں سویا ہوا صدیوں
پرانا جنگل، منہ میں کچھ کھو کھلے بے معنی سے جملے، زمین کھو گئی کہاں، فقط ایک ہی لفظ باقی بچا ہے "نہیں" مشینیں سوچتی ہیں،
اب کسی رنگ کی پہچان نہیں، وہ بھی بے چہرہ/ میں بھی بے چہرہ، کس میں کتنا کون چھپا ہے، کمروں میں قید جنگل (مور ناچ)

تشکیک اور بے اعتقادی پر اعتقاد اس لفظیات کی شناخت ہے۔ جدید صنعتی شہروں کی بے حس لمحہ لمحہ منقسم زندگی کی تصویریں مقتبس مثالوں سے اجاگر ہیں۔ بے سمت راستوں پر کسی انجانی منزل کی طرف فرد کا بے نشان سفر کیے جانا لا حاصل کی تمثیل بن جاتا ہے مجموعی صورت میں محولہ سطور میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جدید نظم کا سب سے نمایاں رجحان یہی لاحاصلی کا رجحان رہا ہے جس کی لفظیات وجودی فلسفے کے مختلف تصورات مثلاً زمان و مکان، موجود و غیر موجود، وحدت و کثرت انفرادو اجتماع، عامل و معمول، ارادہ و اختیار، جبر و قدر وغیرہ سے ماخوذ ہے یہی وجہ ہے کہ جدید نظم پر ایک فلسفیانہ رنگ چڑھا ہوا نظر آتا ہے جس کے مختلف تاثرات مختلف شعراء کے یہاں متنوع اسالیب میں بیان کئے گئے اور کئے جا رہے ہیں۔ ایک سنجیدہ اور ہمہ رس فکر کے زیر اثر جدید نظم کی زبان اپنے پیشرو شعراء کی زبان سے یکسر جدا نوعیت کی حامل ہے۔ اس کی لفظیات میں مخصوص فلسفے سے مستعار ہونے کے باوجود (مذکورہ مکتبۂ فکر کی جڑیں نظریۂ اشتراک و مساوات کے برخلاف ماضی میں قدیم مذاہب، مسالک اور نظریات زندگی سے مربوط ہیں) محدود تکرار کا انداز (مثالی لفظیات ملحوظ رکھتے ہوئے) مفقود ہے، ترقی پسند شعری لفظیات کی طرح ہر شاعر اس کی نقل بھی نہیں کر سکتا کہ یہ شاعر کی ذات سے پھوٹتی اور اس کے ذاتی وجودی تجربے کے اظہار کا وسیلہ ہے، اس کا نجی اسلوب اسی سے نمو پاتا اور اس کے اپنے لسانی، اظہاری اور فنی تجربے کی شکل میں کاغذ پر منتقل ہوتا ہے۔ مثالوں سے واضح ہے کہ جدید نظم کی لفظیات بعض با اسلوب فنکاروں کی حد تک کہیں سادہ و پرکار اور کہیں پیچ در پیچ اور مبہم ہے۔ یہ روایتی قواعد کے اصولوں کا احترام بھی نہیں کرتی جو فن میں ناگزیر نہیں بلکہ بعض شعراء کے یہاں ذاتی لسانی تشکیل کے آثار بھی نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں جنھیں اظہار و بیان کی ہر روایت اور ہر اصول سے انحراف کی مثالیں کہا جا سکتا ہے:

لہو لذت کا خمیازہ/ کوئی طاؤس یا آہو اکیلا چشم حیرت وا کر خم ہو تو آنکھوں میں نئی بینائی لہرائے/ مگر منظر پس منظر کوئی سایہ کوئی
سایہ/ متحرک رنگ کی موجیں مچلتی دور آوازیں
لفظ مرحوم منقش مہ و انجم دیوار/ کہکشاں سبز سمندر کوئی سیڑھی (مرے اندر) کوئی سیڑھی مانگے/ لفظ نوزائیدہ سیڑھی مرحوم
تخت طاؤس تمنا سے برہنہ تنہا/ ہونٹ پر چیونٹیاں جامد حیراں/ آنکھ سے بہتی ہوئی ریت معظم صحرا گاؤں، تالاب
رہٹ راشن کارڈ، لمبے بے چہرہ، عدم خواب شکستہ لمحے موسلا دھار برستے لمحے/ خار گندم میں سرکتے لمحے/ خوف کی بیٹھ جھکتے
لمحے، لہو سبز سیلاب آوا گون، ظلمت جامن تیرگی تالیاں/ کمر چھپے ہیں خوابوں کو ناخن نظر/ مگر مفلسی رائیگاں رت جگوں میں رقت
رواں/ برہنہ مصوبت سکے پیچھے بھاگتے عدد/ اشتہاروں میں لپٹی ہوئی صبح/ الجھے ہوئے لفظ میزان گھر/ معتدل موت کی
دھڑکنیں زیر و بم بند راقم رقم بد گماں خواہشوں کی رگوں میں سرکتا دھواں/ آتے جاتے پرندوں کی آنکھوں میں بکھرا ہوا
آسماں

مختلف نظموں سے ماخوذ مندرجہ بالا سطور شاعر کے پیچیدہ اسلوب کی آئینہ دار ہیں۔ ان نظموں کی زبان نہ صرف نئے جمالیاتی سیاق و سباق کا نمونہ ہے (اس قسم کی لفظی در و بست قاعدۂ زبان کے مطابق مبہم یا لغو جملوں کی تشکیل کرتی ہے) بلکہ نئے تقلیبی قواعد کی رو سے ان کی زیریں ساخت سے جو معنی اخذ کئے جا سکتے ہیں ان کی تہیں بے شمار، متنوع اور متبدل ہوتی ہیں۔ جدید نظم میں اس خاص طرز بیان کے آثار اگرچہ کمیاب ہیں لیکن عموماً ہر شاعر کی نظموں میں اس کی اکا دکا مثالیں فقرۂ شعری ترکیبوں یا مصرعوں میں ضرور موجود ملتی ہیں۔

قوافی اور ردیفوں کی تکرار، وہ روایتی غزل ہو یا جدید غزل، بہر حال لفظیات کی تکرار کا باعث بنتی ہے مگر نظم میں (پابند نظم میں بھی) یہ کمزور لسانی منظر لفظیات کی حاوی خصوصیت بن کر سامنے نہیں آتا کیوں کہ غزل کی محدود ہئیت کے برعکس نئی اور پرانی نظم اپنے ہئیتی تنوع کے باعث ہر بار مختلف لفظیات کی متقاضی ہوتی ہے۔ اگر پابند نظم میں مسدس یا مثنوی کے موضوعات کی تخصیص کے سبب کہیں تکرار لفظی نظر بھی آتی ہے تو یہ اس کی ہئیت کا قصور ہے لیکن جدید نظم میں جو ہئیت کی تمام ظاہری و باطنی پابندیوں سے آزاد ہے تکرار لفظی کی مثالیں بمشکل ہی تلاش کی جا سکتی ہیں۔ با اسلوب شعراء کی لفظیات سے قطع نظر بھی عام جدید نظم گو شعراء کے یہاں لفظیات کا نیا پن، زبان کا وسیلۂ اظہار کی حیثیت سے غیر روایتی استعمال اور معنوی پرتوں کی فراوانی نمایاں
[illegible]



سلیمان آصف

جنوں کی بزمِ تجلّی

وہ سجدہ ہے نگہ دینِ مصطفٰے میں حرام
عطا کرے نہ جو مومن کو ذوقِ حسنِ قیام
خرد ہے اب بھی گرفتارِ گیسوئے ایام
جنوں کی بزمِ تجلّی میں کوئی صبح نہ شام
سمجھ رہے ہیں یہی اب بھی مسجدوں کے امام
رکوع و سجدہ سے آگے نہیں ہے کچھ اسلام
عجب نہیں کہ بدل جائے رنگِ بزمِ حیات
تمہارے رندوں نے ٹھکرا دیئے ہیں جام سے جام
درونِ بزمِ تصوّف یہ کیا تماشہ ہے
بڑھی بنامِ یقیں اور شدّتِ اوہام
کہاں وہ تیغ دو سر ہے ذرا دکھا تو مجھے
بجا کہ لعل و گہر سے جڑی ہے تیری نیام
اُدھر تو شیخ یہ میری قلندری ہے گراں
اِدھر خموش ہیں مستِ مئے سلام و قیام
مری بس ایک دُعا تیری بارگاہ میں ہے
حرم کے سست روؤں کو بتا دے حشر خرام
مری نگاہ میں اصف نہیں ہے وہ آزاد
کھلی فضا میں بھی جس شخص کا ہو ذہن غلام

● کے ۱۴۳ تھاسس وارانسی (یوپی)



احمد وصی

فیصلے کی گھڑی

اے خدائے جہاں مالکِ جان و تن
جانے کب سے کھڑا ہوں ترے سامنے
میں پشیمان سر کو جھکائے ہوئے
نہ تو لب پہ دعا ہے نہ کوئی گلا
نہ ہی دل کو اب امید سے کام ہے
اب تو بس میرے سر صرف الزام ہے
ایسا الزام جس کی خبر بھی نہیں
لکھ دے کوئی سزا میری تقدیر میں
تاکہ میں اپنا انجام تو جان لوں
یا پھر اتنا بتا دے ترے سامنے
یونہی کب تک میں سر کو جھکائے رہوں
اے خدائے جہاں مالکِ جان و تن

● دودھ بھارتی، ہو ٹنس روڈ، بمبئی



علیم اللہ حالی

ہوا سے ایک گفتگو

ہوا! مجھے خوشبوؤں کے تازہ
مشامِ جاں منظروں میں لے جا
ہوا مجھے رنگ و نور و نکہت
کے جلوہ جاوداں دکھا دے
ہوا! مجھے اِن فضاؤں میں
اک گھٹن سی محسوس ہو رہی ہے
لہو لہو واردات ساری
رکی رکی سی نفس کی راہیں
سڑی گلی بدبوؤں میں کب تک
میں اپنی سانسوں کو روک رکھوں
کھلی فضا کا
ایک ایسا لمحہ مجھے عطا کر
جہاں رکوں۔ اور ایک بھرپور سانس لے کر
یہ کہہ سکوں کہ
ابھی فضا میں
ہمارے جینے کے ساز و ساماں بھی ہیں میسّر
ابھی مجالِ نفس ہے باقی
ہماری گردن کی سرحدوں سے
ہے دستِ قاتل ابھی بھی باہر
ابھی تلک زندگی ہے شاداں
ابھی تلک ہے چمن معطّر

● وائٹ ہاؤس کمپاؤنڈ، گیا (بہار)



ندا فاضلی

۱۰۳- امر اپارٹمینٹ، ڈانڈپاڑہ - ۱، کھار (ویسٹ) بمبئی ۵۲ ۰۰۰ ۴۰۰

دیواروں کے بیچ

قسط نمبر ۱۸

بمبئی بڑی گھمنڈی بستی ہے۔ یہ آسانی سے نئے آنے والوں سے گھلتی ملتی نہیں ہے۔ پہلے اپنے طور پر آزماتی ہے۔ راستوں پر کئی چکلیں گھماتی ہے۔ بار بار دیواروں سے چھتیں ہٹاتی ہے۔ نماز ہب کے کئی روزے رکھواتی ہے۔ وعدہ کرتی ہے اور طول طویل فاصلے طے کراتی ہے۔ تھکن جب توڑ پھوڑ دیتی ہے تو تازہ دم کرنے کے لئے ایک اور وعدہ تھما دیتی ہے۔ ایک وعدہ سے دوسرے وعدہ تک ضرورتیں مسلسل مصروف رہتی ہیں۔ نہ وعدے ختم ہوتے ہیں نہ مصروفیتیں مایوس ہوتی ہیں۔ ان آزمائشوں سے گھبرا کر جب کوئی یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے، تو بمبئی حسب روایت اپنے چاروں دروازے بند کر دیتی ہے۔ یہاں آنے والے اکثر یہاں رہنے کی مجبوری نباہنے یہاں رہنے کا فن سیکھتے ہیں۔ جو کچھ دن یہاں رہ لیتا ہے وہ ہر دوسری بستی کے لئے اجنبی ہو جاتا ہے۔ بمبئی میں بسنے والا ہر شخص بمبئی کا گلا بند ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں سے نکل کر جب بھی کوئی کہیں جاتا ہے، تو سمندر اسے آواز دے کر واپس بلا لیتا ہے۔ پھر تھک ہار کر سب اپنے اپنے حیدر آباد، لکھنؤ، بھوپال، گوالیار، پٹنہ، گیا وغیرہ کو اپنے چھوٹے بڑے گھروں میں سجا کر ہمیشہ کے لئے بمبئی کے ہو جاتے ہیں۔ آبائی بستیوں کی لغت یہاں کی بول چال کا ساتھ نہیں دیتی۔ دوسروں سے بات چیت کرنے کے لئے اپنی زبان کو بھولنا ضروری ہے۔ ساتھ لائے ہوئے الفاظ یہاں کی دھوپ چھاؤں میں ڈھل کر اپنے روپ رنگ بدل کر ہی مکالمہ کو ممکن بناتے ہیں۔ جو جتنا اپنی زبان سے دور ہونے کا احساس دلاتا ہے وہ اتنا ہی یہاں کے ادب و آداب سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ بمبئی آہستہ آہستہ بے تکلف ہوتی ہے۔ اور جب بے تکلف ہوتی ہے تو وہ اپنے سارے روپ بہروپ سے متعارف کرا دیتی ہے۔ لیکن اتنی قربتوں کے بعد بھی آپ نے اس کے ساتھ اجنبیوں کا سا بیوہار کیا تو بمبئی ناراض ہو کر شیو سینا بن جاتی ہے۔ اس کے پوسٹر کا کاغذی شہر دہاڑ دہاڑ کر جینا حرام کر دے گا۔ شیو سینا نام سے بھلے ہی ہندو جماعت ہو، اپنی تقریروں میں وہ اسلام دشمنی سے اپنی شناخت کراتی ہو لیکن حقیقت میں یہ ہر بھید بھاؤ سے دور ایک ایسا گروہ ہے جو طے شدہ اجرت پر عوامی خدمت کے لئے مشہور ہے۔ پنجاب کی خبروں سے بگڑتے ہوئے مقامی ماحول میں غیر محفوظ سکھوں کو تحفظ بخشتی ہے۔ ڈوبی ہوئی رقم ساہوکاروں سے نکلواتی ہے۔ زمین جائداد کے قضیوں کو اپنے احکامات سے نپٹاتی ہے۔ جھگی جھونپڑیوں میں ہندو مسلمان میں فساد کراتی ہے۔ دولتمند ہندو مسلمانوں میں سیکولر بن جاتی ہے۔ نفع اور امن، دونوں کے لئے، حکومت بھی اپنے سیاسی مقاصد کے خاطر اس کی خدمات سے فائدہ اٹھاتی رہتی ہے۔ بمبئی میں بہ یک وقت سیاسی، سماجی اور خفیہ تین حکومتیں راج کرتی ہیں۔ یہ تینوں ایک دوسرے کی ضرورت بھی ہیں اور طاقت بھی ہیں۔ انڈر ورلڈ کی نامور ہستیاں زیادہ تر مسلمان ہیں۔ یہ خفیہ طور پر شیو سینا ہی کی طرح سماجی خدمات کے نیک کاموں میں مشغول رہتی ہیں۔ حکومت کی یہ خفیہ طاقت، عدالت سے جلدی اپنا فیصلہ سناتی ہے اور پولس سے زیادہ ذمہ داری نبھاتی ہے۔ اس کے اثرات کا دائرہ ادب، آرٹ، اور مذہب تک پھیلا ہوا ہے۔ شہر کی کئی مسجدوں کی تعمیر کا سہرا اسی کے سر ہے۔ یہ بیماری پر بندوق اٹھاتی ہے اور فرصتوں میں ادب و آرٹ کی سرپرستی فرماتی ہے۔ پاکستان سے آئے ہوئے جوش ملیح آبادی کی میزبانی کی ذمہ داری اسی کی رہی ہے۔

ندا بمبئی کے ایک دوردراز کے علاقہ جیمبور میں راجکپور اسٹیڈیو کے پیچھے پنجراپول میں رہتا ہے۔ اردگرد چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں بیچ میں کھلا ہوا ایک بڑا سا میدان ہے۔ اس میدان کا ایک بڑا حصہ دہلی کے بیوپاریوں نے گھیر لیا ہے۔ یہ بیوپاری سستے داموں کے ڈالڈا سے جنگی قیمت کا اصلی گھی بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ دن بھر جگہ جگہ بھٹیاں سلگتی ہیں جن میں نقلی اصلی میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اس سارے بیوپار کا مالک دہلی کا ایک کھدر

دھاری بنتا ہے۔ وہ سال میں دو تین بار حساب کتاب کے لئے بمبئی آتا ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کی نمائندگی ایک منشی کرتا ہے جو روز صبح پوجا کرکے، سارے بیوپاریوں، کو ساتھ بٹھا کر لین دین صاف کرتا ہے۔ مالک اپنی بول چال اور تن و توش سے بنتا سے زیادہ دادا لگتا ہے۔ وہ جب تک رہتا ہے اس کا رعب ہر چہرہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ نئی نئی گالیوں کے ساتھ بات کرنا اور بھول چوک پر کسی پر بھی ہاتھ چھوڑ دینا اور غصہ میں کسی کا بھی سامان اندر سے باہر پھینک دینا اس کا روز کا معمول ہے۔ لیکن اس سختی کے ساتھ وہ پھیری لگانے والوں کا خیال بھی بہت رکھتا ہے۔ اس غیر قانونی دھندے میں اگر کوئی قانون کی گرفت میں پھنس جاتا ہے تو متعلقہ افسران کو کھلا پلا کر وہ ان کی عزت بھی بچاتا ہے۔

جب گلی کے یہ چھلی کنستر فروخت کے لئے باہر جاتے ہیں، تو پھیری والے اپنے عقیدوں کے مطابق پرماتما یا اللہ کا نام لے کر ہی قدم آگے بڑھاتے ہیں، اور جب شام کو کامیاب لوٹتے ہیں، تو ایمانداری سے ایک دو فیصد رقم پوجا پاٹ کے لئے نکال کر اس آدمی کے حوالے کر دیتے ہیں جو عزت اپنی کے نام سے مشہور ہے۔ روز کی جمع ہونے والی اس رقم سے کارخانے کے اندر ہی ایک چھوٹا سا مندر اور مسجد کا علامتی چبوترا بھی بنا دیا گیا ہے۔ اسی سرمائے میں سے قریب کے تھانے میں پولس کو ہفتہ بھی دیا جاتا ہے۔ ندا کی رہائش اسی کارخانے سے جڑی ہوئی لکڑی اور ٹین سے بنی ہوئی ایک کھولی میں ہے۔ اس کھولی کے ارد گرد تھوڑی تھوڑی دوری پر کئی اور اسی قسم کی کھولیاں ہیں۔ ان میں زیادہ نچلی ذات کے مراٹھے جنہیں گھاٹی کہا جاتا ہے بسے ہوئے ہیں۔ ایک دو میں حیدر آباد سے اکھڑے ہوئے چھوٹے موٹے دستکاروں کی فیملی ہے۔

دن بھر سورج کی کرنوں سے لوٹتے پھوٹتے بدن، شام ہوتے ہی تیز بو والے ٹھرے کو نمک کے ساتھ اپنے اندر انڈیل کر، گھر کی عورتوں کو مارنے پیٹنے کے قابل ہوتے ہیں۔ ہر طرف گالم گلوچ کی آوازیں، اور لڑنے جھگڑنے کا شور، دن میں سائیں سائیں کرتے ویرانے میں زندگی کا احساس دلاتے ہیں۔ شام کی چیخ پکار یہاں کا روز کا معمول ہے۔ شروع میں ندا کو یہ عجیب لگتا ہے۔ ذرا سے شور سے گھبرا کر وہ کتاب چھوڑ کر اٹھ جاتا ہے۔ سامنے کی جھونپڑپٹی میں گٹھے ہوئے ہاتھ پاؤں کی ایک لڑکی اور اس کے دبلے پتلے شوہر کے جھگڑے میں ایک بار پڑ کر وہ ایسا پچھتاتا ہے کہ آئندہ دور کا تماشائی بن کر ان مناظر کا عادی ہو جاتا ہے۔ ہوتا یوں ہے۔ میلے کچیلے روزن داری مزدوروں کے محلے میں کوئی صاف استری شدہ کپڑے پہن کر نکلتا ہے، تو اجنبی نظریں بھی اٹھ جاتی ہیں۔ راستے کے ایک گڑھے میں برسات کے ٹھہرے ہوئے پانی سے گیلی ساڑی میں نکلتی ہوئی سامنے کی جھونپڑی کی اس لڑکی نے کئی بار آتے جاتے اپنی مسکراہٹ سے ندا کی صبحیں سجائی تھیں۔ ہونٹوں کی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ، اس کے بھیگے ہوئے بدن کے زاویے بھی تھوڑی دیر کے لئے، اندھیرے میں اچانک روشنی ہو جانے کی طرح، اس مسکراہٹ سے چمک اٹھتے تھے۔ صبح کی اس ہلکی سی روشنی کے بعد وہ دن بھر کہیں نظر نہیں آتی ہے۔ وہ روز، کہیں دور اپنے شوہر کے ساتھ مزدوری پر جاتی ہے۔ اور دیپ جلے اس کے ساتھ لوٹتی ہے۔۔۔ اس رات اس کے سڈول اعضا پر مرد کے کھردرے ہاتھوں کی مار سے وہ غصہ میں بھر جاتا ہے۔ وہ اس غصہ میں آگے بڑھ کر نہ صرف بیچ بچاؤ کرتا ہے بلکہ شراب کے نشے میں دھت اس کے مرد کو دھکا دے کر ایک دو ہاتھ بھی جڑ دیتا ہے۔ لڑکی اپنے شوہر کو گرتا دیکھ کر آنکھیں نکال کر ندا کی طرف لپکتی ہے۔ پہلے وہ اپنے شوہر کو زمین سے اٹھاتی ہے۔ اور پھر مراٹھی میں دیر تک ندا کو گالیاں دیتی ہے۔ میاں بیوی کے ایسی معاملات میں کسی دوسرے کی دخل اندازی اسے نہیں بھاتی۔ ندا اپنا سا منہ لے کر اپنی کھولی میں واپس آ جاتا ہے۔ اور دیر تک ان دونوں کی ہنستی کھنکتی آوازوں کو سنتا رہتا ہے وہ ان دونوں کے پیار کے ساتھ جب بھی صبح کی مسکراہٹ کو جوڑ کر کوئی سوال بناتا ہے تو بنے بنائے فارمولوں کے علاوہ، اسے کوئی تسلی بخش جواب نہیں سوجھتا۔ ندا اس بات کو نہیں بھولتا۔ لیکن وہ لڑکی اب بھی جب کبھی نظر آ جاتی ہے تو پہلے کی طرح ہی مسکراتی ہے۔

ہر راستہ انجان سا، ہر فلسفہ نادان سا صدیوں پرانی ہے مگر ہر پل نئی ہے زندگی

بمبئی میں ندا دو تین مہینے اپنے بھائی جیسا فاضل کا بن کر ایک فلمی ہندی اخبار "رس بت راج" میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے نوکری کر لیتا ہے اس اخبار کے مالک و مدیر بدری کانچ والا ہیں۔ ہندی کے ساتھ اس دفتر سے گجراتی اور مراٹھی کے ایڈیشن بھی نکلتے ہیں۔ اسکرین سائز کے آٹھ صفحوں کے اس ہفتہ وار کو شروع سے آخر تک ندا ہی لکھتا ہے۔ لیکن اس کا نام کہیں نہیں ہوتا۔ اس ہفتہ وار کی کوئی پالیسی نہیں ہے۔ فلمی حلقوں میں جس ہفتہ جہاں سے پیشگی پیسہ ملتا ہے، اس ہفتہ پرچہ کی پالیسی اسی طرف جھکی ہوتی ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ پرچے کے باہر آنے کی تاریخ سے ایک دو دن پہلے اچانک دن کے کسی وقت نئی تبدیلی کا اعلان ہوتا ہے اور سارا مواد پریس سے واپس منگوا کر نئے سرے سے تعریف و تنقید کے دائرے ترتیب دئے جاتے ہیں۔

ایک دفتر رات کے دو بجے ندا کو مجبور سے بلا کر ہندی کو ی پنرج کی فلمی گیت کاری کی چھپی ہوئی تعریف کو رد کر کے اس کی برائی میں مضمون لکھا جاتا ہو رات ہی کو پریس میں چھاپ کر اس شمارے میں جوڑ دیا جاتا ہے۔

مقامی اخباروں میں کارخانے میں بننے والے جعلی گھی کے خلاف خبریں شائع ہونے کی وجہ سے پولس چھاپہ مارتی ہے۔ کئی کنستر گھی، کبھی کھاتے اور کچھ آدمیوں کو حراست میں لے لیا جاتا ہے۔ لکڑی اور ٹین کی غیر قانونی کھولیوں کو ہموار کر دیا جاتا ہے۔ ندا بھی مجبوراً وہاں سے سامان اٹھا کر جیبھ سے آگے گوونڈی کے علاقہ میں منتقل ہو جاتا ہے۔ بار بار رہائش بدلنے سے آسمان، اور زمین گونگے نہیں ہوتے۔ ان سے بات چیت جاری رہتی ہے۔ روز صبح گوونڈی اسٹیشن سے وی ٹی تک کے سفر میں کئی خاموش شناسائیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ بار بار دیکھنے سے کئی چہرے آنکھوں کی عادت بن گئے ہیں۔ کئی دنوں کے بعد اسٹیشن کے احاطے میں ایک چھوٹا سا نیم کا پیڑ بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس کا روپ رنگ گوالیار کے پر لیے گھر کے سامنے کھڑے ہوئے بوڑھے نیم سے ملتا جلتا ہے۔ مگر کہتے ہیں چاروں طرف سے سمندروں سے گھری ہوئی یہاں کی زمین میں نیم کی جڑیں نہیں پھیلتیں۔ یہ بھی کچھ دن کے بعد مرجھا جائیگا۔ ندا کو گئے ہوئے اب کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ لیکن وہ اب تک بس اور ریل کی کھڑکیوں سے یا پیدل چلتے راستوں میں نیم اور املی کے درخت ہی تلاش کرتا رہتا ہے۔ جگہ جگہ لگے ہوئے ناریل کے اونچے پیڑوں سے ابھی اس کی دوری برقرار ہے . . . دوریوں کا علامتی اظہار 'لفظوں کا پل' کے آخری صفحوں اور ملاقاتیں، میں کئی جگہ ہوا ہے۔ وہ بمبئی کی مرطوب آب و ہوا میں خشک علاقوں کے نیم اور املی کی چھاؤں تلاش کرنے کی بجائے کرتا ہے اور نت نئی پریشانیاں مول لیتا ہے۔ 'ملاقاتیں' کا ہر مضمون اس کے ملنے جلنے والوں کا حلقہ محدود کرتا جا رہا ہے۔ سردار جعفری اور کیفی اعظمی کی بی لغیق خاموش رہتی ہیں، ان کی طرف سے دوسرے اس پر لعنت ملامت بھیجتے ہیں۔ کہیں وہ رجعت پسند بتایا جاتا ہے کہیں اسے سی۔ آئی اے کا ایجنٹ ثابت کیا جاتا ہے۔ مگر ساحر لدھیانوی ایک محفل میں ہنگامہ برپا کر دیتے ہیں۔ وہ نہ صرف ندا کو برا بھلا کہتے ہیں بلکہ کرشن چندر اور مہندر ناتھ کو بھی اسے مدعو کرنے کے جرم میں اپنی ٹھیٹھ پنجابی گالیوں سے نوازتے ہیں۔ املی اور نیم کی طرح وہ عشرت کی شباہت بھی ہر چہرہ میں تلاش کرتا ہے۔ روز کیپار ٹمنٹ میں کھڑکی کے پاس بیٹھنے والی گجراتی لڑکی کو بھی اس نے عشرت کی آنکھیں دے دی ہیں۔ وہ راستے بھر انگلش ناول میں کھوئی رہتی ہے۔ کبھی کبھی اچٹتی ہوئی نظروں سے ندا کی طرف بھی دیکھ لیتی ہے۔ شہر میں اور بھی کئی عورتوں کو وہ ایسے ہی عطیات سے نوازتا رہتا ہے۔ بمبور کی لڑکی کی مسکراہٹ بھی شاید اس کی اسی سخاوت کا کرشمہ ہے . . . . . . !

اس بستی سے چھٹ کر یوں تو ہر چہرہ کو یاد کیا　　　جس سے تھوڑی سی ان بن تھی وہ اکثر یاد آیا ہے

[باقی آئندہ]

بقیہ صفحہ ۳۶ جدید نظم کی لفظیات

خصوصیات ہیں یہ تعلیمات اس طویل جائزے کا خلاصہ ہیں :

(۱) ہر صنف سخن اپنے موضوعات سے مطابقت رکھنے والی لفظیات کا انتخاب کرتی ہے یا شعری ہیئتوں کی تبدیلی لفظیات کی تبدیلی کی غماز ہے۔

(۲) محدود ہیئت میں مستقل لفظیات تحدید اور تکرار کا شکار ہوتی ہے۔

(۳) چند با اسلوب شعرا کے لسانی برتاؤ کو شاعری کے وسیع تر تناظر پر منطبق کیا جا سکتا ہے۔

(۴) جدید نظم کی لفظیات کے اثرات با اسلوب شعرا کی لفظیات سے قطع نظر تمام جدید نظم گو شعرا کی نظموں میں بھی نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

(۵) لفظیات کی سادگی یا پیچیدگی مخصوص ہونے کے باوجود تمام شعرا کے یہاں پائی ہوئی ملتی ہے۔

☐ آپ کا زر سالانہ　　　میں ختم ہوا ہے محترم۔ اس سے قبل بھی یاددہانی کی گئی تھی، ایک بار پھر توجہ درخواست ہے۔ آپ کے خط اور منی آرڈر کا انتظار رہے گا۔ اگر آپ منی آرڈر سے رقم ارسال نہ کر سکیں تو پوسٹ کارڈ کے ذریعہ دفتر وی پی بھیجنے کی ہدایت کریں۔

اگر آپ کسی وجہ سے شمارے کی ترسیل بند کرنا چاہتے ہوں تو آپ کی طرف شمارے کے جو بقایا جات ہیں ان کی تکمیل کر دینا آپ کا اخلاقی فرض ہے۔

ظفر ہاشمی

سنجھوں کی پرورش دیکھوں
زرد پتوں کو مرتعش دیکھوں

یہ نہ موسم بھی قربتوں کا ہو
سرد جھونکوں میں بھی تپش دیکھوں

اس کے دریا کی موج بھی پیاس
اپنے اندر بھی اک خلش دیکھوں

تپتی راہوں کا سامنا بھی ہے
ہم سفر کی بھی سرزنش دیکھوں

فوج اتری ہے آج سرحد پہ
اپنے آنگن میں چپقلش دیکھوں

● ۲/۱۱ دھتکی وی ورکرس فلیٹس، بستوپور، جمشید پور



سحر سعیدی

میں سطحِ آب کا اک بلبلہ ہوں
سمندر کی تہوں میں جاگتا ہوں

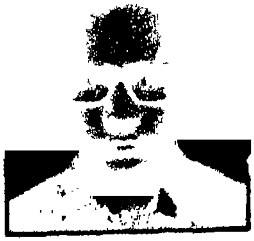
میں چنچل موج ہوں یا راستا ہوں
بہر صورت گذرتا جا رہا ہوں

حوادث، خوف، شعلے، تیغِ نفرت
نواحِ جاں میں کیا کیا دیکھتا ہوں

اجالا لمحۂ موجود کا وہ
میں گذری ساعتوں کا آئینہ ہوں

میرے بس میں نہیں اس کے سوا کچھ
ترے حق میں دعائیں مانگتا ہوں

● ۱-۱۸-۱۷، ٹوٹی مسجد، چیلی پورہ اورنگ آباد



ایم۔ کے اشر

ہنسنا چاہوں، چہرہ ٹوٹے
عکس سجے جوں، آئینہ ٹوٹے

بات بناؤں گا میں کس سے
بات کروں تو رشتہ ٹوٹے

خواہش در پر ٹانک چکا ہوں
گھر سے نکلوں سپنا ٹوٹے

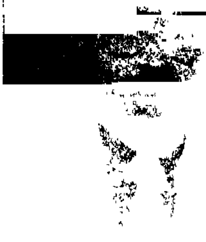
صدیوں پر الزام لگاؤں
طیش میں آکر لمحہ ٹوٹے

پربت پربت سرگردانی
پستی پستی ذرّہ ٹوٹے

پھیل گئی ہے آنکھ میں زردی
دور کا سارا نقشہ ٹوٹے

ٹوٹ رہا ہوں لمحہ لمحہ
شاخ سے جیسے پتا ٹوٹے

● بی ۱۰۱ گارڈن ریچ روڈ کلکتہ ۔ ۴۴



مسرور آروی

مہادیوا روڈ، آرہ، بھوجپور (بہار)

جنگ

اگر اس سرزمین پر جنگ کا وجود نہ ہوتا تو تاریخ کے صفحات کورے ہی رہ جاتے۔ دنیا کے ادب عالیہ کی تخلیق نہ ہوتی۔ در اصل وجودِ جنگ سے ہے تصویر کائنات میں رنگ۔ جنگ کے بغیر کائنات اس قدر خوبصورت اور رنگین نہ ہوتی بلکہ پھیکی، بدنما اور ویران نظر آتی۔

تواریخ خونی غسل BATH OF BLOOD ہے۔ اور جنگ ایک منضبط زندگی۔ جنگ کے بطن سے تاریخ کی پیدائش ہوئی۔ اور آج تک اس احسانِ عظیم کا صلہ تواریخ اپنے صفحاتی دامن پر لڑے گئے دن کی جنگوں کو پناہ دے کر چکا رہی ہے۔

جنگ کے خوبصورت ہاتھوں نے عالمی نقشے پر قینچی چلائی ہے اس طرح دنیا کا ——— PIN DROP SILENCE پن ڈراپ سائلنس ایک انوکھی گہما گہمی، ایک خوبصورت شور اور ذریں ہنگامی رونقوں میں تبدیل ہو گیا۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو بڑا عجیب سا لگتا ——— ساری دنیا دشتِ افریقہ معلوم ہوتی جہاں ایک ہیبت ناک تنہائی اور لرزہ اندام سناٹے کے جنگل میں انسان بادیہ پیمائی کرتا رہ جاتا۔ مگر جنگ نے دنیا کو حسن عطا کیا ہے۔

علوم و فنون کی انتہا جنگ ہے۔ تہذیب، جنگ کے بغیر ناممکن ہے آہنی دور یا زمانۂ قدیم میں وحشیوں کے لڑائی جھگڑوں کو میں جنگ قطعی نہیں مانتا کیوں کہ وہ ان کی فطرت میں شامل تھا۔ مگر علوم و فنون کے ارتقا نے ہی ہمیں مہذب بنایا ہم جنگجو ہو گئے غیر مہذب قومیں جنگ کی ذریں خصوصیات اور نادر اثرات سے ناآشنا تھیں۔ جیوں جیوں علوم و فنون ترقی کرتا گیا جنگ ناگزیر ہوتی گئی۔ شمشیر و سناں کی دھم موسیقی رفتہ رفتہ توپ اور ٹینک کے ڈسکو میں تبدیل ہوتی گئی۔

دنیا میں جتنے بھی دانشور، قاموس اور فلسفی آئے، جنگ کا حسین پیغام لائے۔ خوابیدہ اقوام کے درمیان انہوں نے جنگ کا قصیدہ اپنے پُر سوز لحن میں پڑھا۔ جس کا ذریں نتیجہ ہوا کہ دنیا کی مختلف جنگوں سے لے کر عالمی پیمانے پر دو عظیم جنگوں کی صائقہ رفیع الشان سے ساری دنیا منور ہو گئی۔ مگر افسوس صد افسوس چند ارباب سیاست اور جنگ دشمنوں کو جنگ کی یہ تابناکی پسند نہ آئی۔ انہوں نے عجب سا منہ بنالیا۔ پہلی جنگ عظیم کی شاندار کامیابی سے وہ جل بھن سے گئے۔ اور لیگ آف نیشنز ——— LEAGUE OF NATIONS اور ورسائی سمجھوتے کا فتویٰ دے دیا۔

مگر ایسے مایوس کن دور میں بھی ہٹلر، مسولینی، فرانکو، توجو جیسے دیدہ ور دانشوروں نے اپنے کارنامۂ گراں مایہ سے ان کے فتوے کو طاق پر رکھ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان کی بے مثال کوششوں اور کاوشوں سے دوسری جنگ عظیم سے ساری دنیا پھر منور ہو اٹھی۔ مگر جنگ دشمنوں کو قرار کہاں۔ انہوں نے لیگ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی پھر تیار کر لی۔ صرف سرخی بدل ڈالی۔ اور یو ان او ——— UNO نام رکھ دیا۔ باحوصلہ اور باہمت جنگ پسند اپنے مقاصد کے لئے آج بھی کوشاں ہیں۔

جنگ مترنم ہتھیار ہے۔ تخیل اور جذبات کا اسلحے کی زبان میں ادا کرنا جنگ ہے۔ انسان کے اندر حقیقتِ حسن اور قوت کی طلب کا وہ پُر خروش جذبہ جب بے اختیار ہو جاتا ہے تو دو طریقے سے اسے سکون ملتا ہے شاعری سے یا جنگ سے۔

دنیا کی عظیم شاہکار تصنیف جنگ کی ہی مرہونِ منت ہے۔ ہومر کی ایلیڈ، ورجل کی AENEID، طاسو کی YERUSULEM LIBERATE ایرسٹو کی ORLENDO _ TURIOSO اسپنسر کی FAERIE - QUEEN، فردوسی کا شاہنامہ، بالمیکی کی رامائن، ویاس کی مہابھارت اور میر انیس کے مرثیوں کو جنگوں ہی

نے تخلیق کیا۔ جو جذبات ہتھیار کے ذریعہ ادا ہوں جنگ ہے۔ مصور کی رنگوں کی مدد
سے جو کام کرتا ہے اس کو ہتھیاروں کے ذریعے سرانجام دینے کی صنعت
کا نام جنگ ہے۔

امن پسندوں کی فلاسفی مجھے کبھی سمجھ میں نہیں آئی۔ خوامخواہ وہ
نگ کے نام پر سراغ پا ہیں۔ حالاں کہ انہیں اس حقیقت سے انکار
نہیں کرنا چاہیئے کہ بغیر جنگ کے امن کا تصور ناممکن ہے۔ دنیا میں امن قائم
رنے میں سب سے بڑا ہاتھ جنگ ہی کا ہوتا ہے۔ اور اس حقیقت سے
بھلا کون انکار کرسکتا ہے جنگ کے باعث ہی یورپ کا ذریں نشاۃ ثانیہ
نگ کے بعد ہی ہوا۔ آج کے عہد تک انسانی تہذیب کی عظیم الشان عمارت
راصل جنگ کی بنیاد ہی پر کھڑی ہوئی ہے قدیم یونان کی سیر کیجیے۔ آپ
یکھیں گے کہ ایتھنس اور اسپارٹا نامی دو مشہور شہروں نے بے مثال قربانیا
ش کی تھیں۔ پرکلیز کے دور میں ایتھنس کی ثقافتی اہمیت آسمان پر
ھی۔ اسپارٹا کو اس سے حسد ہونے لگا۔ جنگ نے ایسے موقع پر اپنا
ھرپور تعاون دیا اور اس طرح دونوں قدیم شہر کھنڈر بن گئے۔ اور اسی
ھنڈر پر میسوڈونیا کا عروج ہوا جس نے دنیا کو سکندر اعظم دیا۔

دیوار چین بھی جنگ ہی کی دین ہے کہ شی ہوانگ تی نے ھنوں سے
حفاظت کے لئے باؤنڈری بنوائی تھی۔ روم اور کارتھیج کی وہ عظیم الشان
ینگ۔ جنگ نہ ہوتی تو عظیم روم کی بنیاد بھی نہ پڑتی۔

نقل کیا جارہا ہے فرانسیسی قاموس والٹیر کی کتاب "فلاسفیکل ڈکشنری" سے کہ
"طاعون اور جنگ ہماری دنیا کے دو بین عناصر ہیں" قحط اور پلیگ کے تحفے تو ہمیں اللہ کی
طرف سے ملتے ہیں مگر جنگ کے تحفے اپنی طاقت کو قوتِ الٰہی ثابت کر
نے والے بہادروں کے ذریعہ ہمیں ملتے ہیں۔ جنگ زمانے کے اسٹیج پر خیر و
شر کا ایک حسین ڈرامہ ہے جو ازل ہی سے کھیلا جارہا ہے۔

حالی جناب ولیم جیمس نے بجا فرمایا ہے کہ "جنگ تاریخ کا حسین
رومان ہے"۔ جنگ کا دفاع کرتے ہوئے آنجہانی نطشے نے کیا خوب
کہا تھا۔ "رزمِ حیات میں نیکی کی نہیں بلکہ قوت کی ضرورت۔ اخلاقی
بیان انسان کو کمزور بنا دیتی ہیں۔"

"ٹامس پین جنگ کا بڑا مداح تھا۔" کامن سنس" اور "رائٹ
آف مین" کے ذریعے اس نے جنگ کی قصیدہ خوانی کی۔ اور بہت حد تک
وہ امریکنوں کی پریشانی کی۔ بعد میں بوسٹن کی چائے پارٹی [جو جنگ کے
ذریعہ دی گئی تاریخی ضیافت تھی] نے برطانیہ کا قصہ تمام کردیا۔
یورپ کے نشاۃ ثانیہ RENAISSANCE نے جنگ کی بڑی
ہمت افزائی کی۔ میکاولی نے جنگ کے ماتھے پر اپنا دستِ شفقت رکھا
اور شہنشاہیت، جمہوریت اور پاپائیت ایک دوسرے کے گریباں چاک
کرنے لگے۔ جدید انسان کا جنگ سے بہت ہی قریبی تعلق رہا ہے۔

اسٹیل، تیل اور یورینیم آج جہادِ زندگانی میں مردوں کی شمشیریں
ہیں۔ اسی جنگ نے نپولین کی قسمت کو بلند کیا۔ اور اسی جنگ کے باعث
ہسپانوی چھوٹے نے نپولین کو برباد کیا۔

اسلحاتِ جنگ کے اختراع ہی کے باعث انسان حیوانی زندگی
کی سطح سے اونچا اٹھ سکا۔ ابتدا میں اس نے پتھروں سے کلہاڑیاں
گنڈاسے بنائے، تیر کمان اور بھالے بنائے۔ اوائلِ عہدِ حجری کے آخری
دور میں سنگریزی ہتھیار MICROLETH بھی بننے لگے۔ آہنی دور
میں لوہے کے استعمال نے زراعت اور جنگ کو بے حد متاثر کیا۔ آریوں
نے جنگ میں گھوڑے کا استعمال کیا تھا۔ بابل کے قدیم باشندے گھوڑے
کو "یورپ کا گدھا" کہتے تھے۔"

جنگ کے باعث ہی اشوک نے عدم تشدد کو گلے سے لگایا۔ اور مرتے
دم تک ایک قطرہ خون تک نہ بہایا۔ یونان اگر میدانِ جنگ نہ بنتا تو شاید آج
ہم بہت سے علوم و فنون سے بے خبر ہوتے۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو
جیسے سیاسی مفکرین پیدا نہیں ہوتے۔ پائتھاگورس، ہپوکریٹس، اور
آرکی میڈیز کی ایجادات اور خیالات سے ہم محروم رہ جاتے۔ اگر ایران
اور یونان ایک دوسرے سے دست و گریباں نہ ہوتے تو شاید آج ہماری ملاقات
تاریخ نگاری کے ابا حضور ہیروڈوٹس سے نہیں ہوتی۔ اگر اسپارٹا اور ایتھنس
میں گتھم گتھی نہ ہوتی تو تھوسی ڈائڈس کا قلم جیب میں ہی رکھا رہ جاتا۔

فرشتے جنگ کی لذت سے محروم ہی رہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ جیسے
ہی خالق کائنات نے فرشتوں کی محفل میں یہ اعلان کیا کہ میں زمین پر اپنا نائب
بنانے والا ہوں۔ تو فرشتوں کی یونین میں ایک ہنگامہ بپا ہوگیا۔ شبستانِ
ازل کا سکوت درہم برہم ہوگیا۔ ابلیس کی زیرِ قیادت ایک حزبِ مخالف
کا وجود ہوا۔ ابلیس کو آدم کی نسلوں سے جنگ برپا کرنے کا خوف تھا۔ کیوں
کہ وہ امن پسند تھا۔ اس کی دور اندیش نظروں نے زمین پر فسادات کا خطرہ
محسوس کرلیا تھا۔ اس طرح زمین وہ اسٹیج بنی جہاں انسانی خیر و شر کے معرکے
شروع ہوئے۔ اور پھر وہی ہوا جس کا ابلیس کو ڈر تھا۔

دھنک رنگ

اسحاق اثر

کب بچتی ہواں پر جس جگہ سے قافلے نکلے
ما حوصلہ رکھا تو کتنے راستے نکلے

پھولوں کی بشاشت یہ تبسم یہ جہاں گیری
ے ہی ہو سے ہو کے یہ سب سلسلے نکلے

یم کے سمندر سے اٹھا ہے جب کوئی طوفاں
تھیں جزیروں کی طرح شکوے گلے نکلے

یبت کے مراحل نے ہماری تربیت کی ہے
میں کھوٹا سمجھتے تھے وہی سکے کھرے نکلے

ری زنبیل میں تو زندگی نے مرثیہ رکھا
نکلے تو اشکوں میں نہا کر قہقہے نکلے

۴۷ - پیپلی بازار، اندور (ایم پی)

قاضی انصار

اس نتیجے پر کوئی پہنچا نہیں
میں اُسے اور وہ مجھے سمجھا نہیں
خواب غفلت میں رہے گا کب تلک
کیا سمجھتا ہے کہ دن نکلا نہیں؟
کر رہا ہے وہ زمانے سے گریز
جانے پھر کیوں رابطہ ٹوٹا نہیں
کچھ نہ کچھ تو غالباً ہوگی کسر
ہم کلامی پر کوئی چونکا نہیں
کس طرح نکلے گا قید و بند سے
کوئی کھڑکی کوئی دروازہ نہیں

● قاضی پورہ کھنڈوہ (ایم پی)

صفدر امام قادری

اتنے گہرے معاملے لکھ
شام کے بعد قہقہے لکھ
ایک منزل پہ رک گیا ہوں
اس سے آگے کے راستے لکھ

اپنی رفتار پر بھروسہ
اس سفر میں بھی آبلے لکھ
اک نئی بات سوچ لوں گا
تم روایت کے زاویے لکھ
وہ تھکا ہارا اک مسافر
اس کے بارے میں مرثیے لکھ

● امام منزل لہریا گھاٹ عالم گنج - پٹنہ ۴-(

ایوب صابر

م خدا کی سراسر یہ ہم پہ تہمت ہے
پسند ہماری کہاں طبیعت ہے
ہا کینوس پہ بناتا ہوں ایسی تصویریں
خال و خد نہ کوئی جنکی شکل و صورت ہے
یہ کون مجھکو صدا دے گیا ہے چپکے سے
ہیں وہی تو نہیں جس کا نام شہرت ہے
بھی ہوئی ہے نہ ہوگی زوال آمادہ
وہ چاندنی جو مرے بام و در کی زینت ہے
مجھ رہے ہو اسے تم بھی کوہکن صابر
وہ جس کے واسطے رائی بھی ایک پربت ہے

۹ مہاڈوا ڈہ، چوتھا نظام پور، بھیونڈی (مہاراشٹر)

سبھاش چندر شفق

ابھی تک دل اسے بھولا نہیں ہے
جسے میں نے کبھی دیکھا نہیں ہے
کڑی ہے دھوپ سناٹوں کی دل میں
کسی آواز کا سایہ نہیں ہے
یقیناً آپ اس کو پڑھ چکے ہیں
جو خط میں نے ابھی لکھا نہیں ہے
یہ مانا پیڑ اک پُرخار ہوں میں
مگر سایہ میرا چبھتا نہیں ہے
چراغِ زندگی گل ہو رہا ہے
جسے آنا تھا وہ آیا نہیں ہے

● نزد گاندھی چوک، گڑھی والا ۲۰۷ ۱۴۴ ضلع ہوشیارپور

زرار احمد مانی

خوف جب دل سے جدا ہو جائے
خود بخود اک راستہ ہو جائے
اس طرح آنکھیں چرا ؤ گے
اور زیادہ فاصلہ ہو جائے
اک قدم، منزل کی جانب تو
رفتہ رفتہ حوصلہ ہو جائے
کون رکھے گا یہاں پہلا ت
بعد میں تو قافلہ ہو جائے
بس محبت کی نظر سے دیکھ
سرخ رو ہر آبلہ ہو جائے

● سی گلس سیل اینڈ سروس ا- مہاتما گاندھی ر

مکتوبات

قارئینِ شاعر کی توجہ کیلئے

قارئین کرام! شاعر کے ہر شمارے پر بہت سارے خطوط موصول ہوتے ہیں، ہم ممنون و مشکور ہیں۔ جواباً عرض ہے کہ آپ کا شاعر اردو کا مقبول ترین معیاری ادبی جریدہ ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ مکتوبات کے کالم میں تمام ہی موصولہ خطوط کی سمائی نہیں ہو پاتی اس کی وجوہ میں صفحات کی کمی کے علاوہ بعض وہ دشواریاں بھی ہیں جن کی طرف آپ کو بطور خاص توجہ کرنی ہے کہ کئی اہم خط انھیں دشواریوں کے سبب شامل ہونے سے رہ جاتے ہیں۔

- مکتوبات کے لیے آپ کا خط علاحدہ کاغذ پر صاف اور خوشخط تحریر میں ہونا چاہیے۔
- تخلیقات یا دفتری امور کے ساتھ شاعر کے مندرجات کے متعلق رائے کا فائلوں میں گم ہو جانا ممکن ہے۔
- اپنی تحریر کے سرنامے پر اور لفافے پر نمایاں طور پر "مکتوبات" لکھ دیجیے۔
- مکتوبات کے کالم کو زیادہ سے زیادہ وقیع، مسائلی اور معلوماتی بنائیے۔

یقین ہے کہ ہمیں آپ کا تعاون حاصل رہے گا اور ہم آپ کا خط "مکتوبات" میں شامل کر سکیں گے۔ ادارہ

زبیداختر ۔ صدر شعبہ فلسفہ، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

شاعر کا تازہ شمارہ ملا۔ آپ نے اداریے میں اچھے جن حالات کا ذکر کیا ہے انھیں پڑھ کر افسوس بھی ہوا اور آپ سے ہمدردی بھی ہوئی۔ یہ آپ کی عنایت ہے کہ آپ شاعر مجھے مفت بھیجتے ہیں۔ میں نے یہ طے کیا ہے کہ میں "شاعر" کا زرِ سالانہ آپ کی خدمت میں منی آرڈر سے ارسال کر دوں گا اس لیے کہ مجھے اردو کے اچھے معیاری ادبی رسائل کے جاری رہنے سے قلبی تعلق ہے ان شاء اللہ آپ کو بہت جلد میرا منی آرڈر مل جائے گا۔ میں اردو کی کوئی کتاب یا رسالہ اس کساد بازاری میں مفت میں پڑھنا پسند نہیں کرتا۔

میر حسن پر جتنا کام آپ نے کیا وہ قابلِ قدر ہے۔ میرے دوست عزیز قیسی کے دستخط ہیں ان کی جو نظم آپ نے شائع کی ہے وہ ان کی طویل نظم کا ایک حصہ ہے اس لیے کہ میں اس کے بعض حصے دوسرے رسائل میں بھی پڑھ چکا ہوں۔ وہ میرے دوست ہیں اور میں ہمیشہ سے ان کی شاعری کا قائل ہوں۔ شکیب ایاز کا مضمون دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ خاص طور سے ذاکر حسین فاروقی صاحب، جو میرے بزرگ مشفق ہیں، ان کی متعدد غزلیں پڑھ کر خوشی ہوئی اور احساس ہوا کہ وہ اس پیرانہ سالی میں بھی وہ تخلیقی طور پر جوان اور زندہ ہیں۔

آپ جس محنت سے رسالہ نکال رہے ہیں اس کے حوصلے کی داد دینا ہی پڑتی ہے۔

شکیب ایاز ۔ پروفیسر کالونی، نواب پورہ، دوڑ، ۲۹۵۰۰ (بہار)

شاعر کا شمارہ نمبر ۳ تا ۱۲ میں میرے مقالہ: "نئے سرقے کی ایک مثال ۔ میر حسن" کے بارے میں چند تصحیحات ضروری ہیں۔

۱۔ ص۹ پر حاشیہ نمبر ۹ کے حوالے سے ہے لہٰذا تذکرۂ ہندی کا حوالہ ہونا چاہیے۔ غالب کے خط سے ماخوذ ہے اس کا تعلق تذکرۂ ہندی سے ممکن نہیں، اسے بے حوالہ تصور کیجیے۔ وادین ضروری ہے۔ ۲۔ ص۲ سطر گیارہ کے آخری جملے میں ہم ہونا چاہیے؛ لیکن وہ اس سلسلے میں خاموش ہو گئے "ہم" کا محل نہیں۔ ۳۔ ص۱۱ میر حسن کا یہ مصرع بھی قابلِ گرفت ہے: دل کا تنگ ہی کمی سے ہے تیری قید فرنگ۔ واقف کہتے ہیں کہ

دل کے تنگ جانے کو کہتے ہیں سب یاں قیدِ فرنگ۔

مکتوبات کی اشاعت میں آپ نے خاص اہتمام کیا ہے، ان میں اہم سوالات اور بعض بعض اہم نکات دیئے ہیں۔

مذکورہ اغلاط کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔

قارئین کی معلومات میں اضافے اور تصحیح کے طور پر تحریر ہے کہ: شاعر کے مذکورہ شمارے میں دو جگہ یہ لکھا گیا ہے کہ مثنوی سحرالبیان میر حسن کی زندگی میں متعدد بار طبع ہو چکی تھی یہ درست نہیں۔ یہ مثنوی مصنف کی زندگی میں کبھی نہیں چھپی۔ پہلی بار ۱۸۰۵ء میں فورٹ ولیم کالج کی طرف سے چھاپی گئی تھی میر شیر علی افسوس کے مقدمے کے ساتھ۔ یہ ایڈیشن نایاب کی حد تک کمیاب ہے۔ مشہور و معتبر محقق جناب رشید حسن خاں کے کتب خانے میں اس کا ایک نسخہ ضرور محفوظ ہے جو انھیں نجیب اشرف ندوی صاحب نے دیا تھا۔ ادارہ

اظہر افسر ۔ حیدر نیر ٹریس، پرنس مارکیٹ، لال باغ بازار، مہیتا ہے

شاعر کو جس معیار اور عمدگی سے چلا رہے ہیں آپ، وہ قابلِ داد ہے۔ بڑے دل گردے کا کام ہے آپ کے والد محترم جناب اعجاز صدیقی صاحب جن آفات و آلام میں بھی اپنی کاوشیں یکسر دور اور زندہ دل برقرار رکھے ہوئے تھے اس سے میں بخوبی واقف ہوں وہ ادب کے مردِ مومن و مردِ مجاہد تھے ان کا ذکر آتا ہے تو ایک ایک بات نگاہوں میں گھوم جاتی ہے۔

ویسے میں تو ہر بار "شاعر" کو شروع سے آخر تک ایک ایک لفظ پڑھتا ہوں اس بار "نیا فن" "نئے سرقے کی مثال، جادو گر اور اکیلا آدمی" خوب ہیں۔ اکیلا آدمی کا صفحہ ۵۱ کا باقی حصہ ۴۸ پر نہیں صفحہ ۱۱ پر ہی ہے۔

"دیواروں کے بیچ" کا یہ حصہ جو تازہ شمارے میں ہے بہت پسند آیا۔ سلام مچھلی شہری کی جو تصویر صبا نے کھینچی ہے خوب ہے بار بار پڑھنے کو جی چاہا، معیاری زبان کے سلسلے میں بھی جواد زیدی، عصمت جاوید، تسلیم شہزاد کی تحریریں خوب ہیں، گوپی چند نارنگ کا جواب پڑھنے کی چیز ہے۔

خالق مظفر نوری ۔ ۱۴۹ ۔ اللہ پور دلیا روڈ، جمشید پور (بہار)

شاعر کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ فرصت کے لمحات میسر نہیں پھر بھی جستہ جستہ دیکھنے سے خود کو نہیں روک سکا۔ رسالے کی کامیابی آپ کی سچی لگن، جذبۂ خلوص اور ادب نوازی کے متعلق سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔

شاید ہندوستان کا یہ واحد ادبی اور معیاری رسالہ ہے جسے نصف صدی سے بھی زائد یعنی ۶۲ سال پورے ہو چکے ہیں اور پابندی سے نکل رہا ہے۔ ورنہ ہندوستان جیسے بڑے ملک میں بہت سارے رسالے معیاری اور غیر معیاری دو چار شمارے نکلنے کے بعد بند ہو گئے۔

فخریہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر میں چھپنے والی تخلیقات معیاری ہوتی ہیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس رسالے میں ہر فن کار چھپنے کی خواہش رکھتا ہے اور اپنی تخلیقات کو اس کے معیار پر لانے کی کوشش کرتا ہے اور اس سے شاعر کی امید ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اس کے باوجود ہر شمارے میں کچھ نئے فن کاروں سے بھی روشناس کراتا ہے، جس سے اس کی سالمیت کو تقویت ملتی ہے اور نئے فن کاروں کو حوصلہ بھی۔

میری دعا ہے کہ جب تک اردو ادب زندہ ہے شاعر اسی طرح پابندی سے قارئین کو معیاری تخلیقات کے تحفے بانٹتا رہے۔ آمین ثم آمین!

ادب نواز حضرات سے اس رسالے کے متعلق خصوصی طور پر گزارش ہے جہاں تک ممکن ہو سکے اس کو تقویت پہنچانے کی سعی کریں۔

ارشد عبدالحمید ۔ اسٹنٹ لیکچرر، گورنمنٹ میرا گرلز کالج اودے پور

شاعر کا مئی تا دسمبر ۱۹۹۱ء کا شمارہ پیشِ نگاہ ہے۔ "قارئینِ شاعر کے نام" آپ کی تحریر توجہ طلب ہے۔ اس سلسلے میں تمام شاعر نواز بلکہ اردو نواز حضرات کو اپنا تعاون آگے پیش کرنا چاہیے۔ خدانخواستہ یہ شمع اگر آندھیوں میں گھر گئی تو حضرات سیماب و اعجاز صاحبان ہی کی نہیں، خود مکمل اردو کی ایک مستحکم اور تعمیری روایت معرضِ خطر میں پڑ جائے گی۔

اس شمارے کے اندرونی سرورق پر حضرت اعجاز صدیقی کے چار مصارع میر حسن کے متعلق شائع ہوئے ہیں ان میں یہ مصرع ..... بہت باعثِ تری تنگ سارگی ہے ..... سے مجھے الجھن ہوئی۔ کیوں کہ یہ غلطی اعجاز مرحوم سے نہیں ہو سکتی تھی ہو سکتا ہے میری کج فہمی ہے یا پھر کاتب صاحب سے سہو ہو گیا ہے۔ اس مصرع میں تیری کی جگہ تیرے "ملاحت" کا محل ہے کیوں کہ تیرے کی نسبت "سادگی" سے نہیں "رنگ" سے ہے اور لفظ "رنگ" مذکر ہے چنانچہ تیری کا استعمال غلط معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے متاخرین علمائے بلاغت نے شعر میں حروف کی تخفیف پر بات کی لے دے مچائی ہے۔ اس سلسلے میں حسبِ علت کو تو پھر بھی کچھ رعایت بخش دی گئی ہے لیکن دیگر حروف کا اگر نقطہ بھی دب جائے تو شاعر قابلِ گرفت قرار دے دیا جاتا تھا۔ میر حسن کے شعری انتخاب، (صفحہ ۳۰)

پیش نظر شعر شامل کر کے تلفظ و معنی کے سلسلے میں اپنے
نقطۂ نظر کی وضاحت کرتی ہے ؎

اب کوئی آئے یار دکھوے جسن کو کیا
بے چارہ ابن حسن صاحب ہی گزر گیا

آپ نے میر حسن کے کلام کا اچھا انتخاب شائع کیا ہے۔ مجھ کو
یاد ہے کہ اسکولوں کے اردو نصابات کا کورس میں میر حسن کی مثنوی سے
انتخاب کیا گیا تھا ہی نتھا۔ اب جو یہ غزلیں پڑھیں تو اپنی کم مائیگی
پہ افسوس کیا کہ اپنے دور کی مخصوص زبان سے قطع نظر، ان غزلوں
میں متنوعہ رنگ کی بھرپور صلاحیت ہے۔ اب اس شعر کو لیجیے ؎

جس ادا کا کشتہ ہوں میں، وہ دربے میرے ہی ساتھ
اس ادا کو مبتذل اے خوب رو مت کیجیو

اس شعر میں لفظ "مبتذل" نے سماں باندھ دیا ہے۔ اور مبتذل
تب ہوگی جب کسی دوسرے سے منسوب ہو جائے گی..... اس
کا نشہ میں بہت دیر تک لطف اندوز ہوتا رہا۔ شاعر میں
تلفظ کے اس سلسلے کو جاری رکھیے۔ میں اپنے اس خط کے ذریعہ
چیلنج طور پر جس امر کو بروئے کار لانا چاہتا ہوں وہ بقول ماجد الباقری
املا کا قاعدہ ہے۔ میں اپنے طور پر اسی کا بہت پہلے سے قائل ہوں
لیکن گذشتہ دنوں میری آرزو پوری کرنے کے بعد برادر محترم خلیل تنویر
نے "اظہار اردو" (اسلام آباد) میں شائع شدہ ماجد الباقری کے
مضمون "املا..... اردو کا ایک دو قاعدہ" کا عکس پڑھنے کو
دیا جس کے متعلق میرے شبہات دور ہوگئے اور اس امر کی
تصدیق ہوگئی کہ لفظ جس طرح بولا جاتا ہے اسے اسی طرح لکھنا
مستحسن ہے۔ ماجد الباقری کے مطابق:

ا۔ املا عربی زبان سے مشتق ہے، اس کا مطلب ہے
فرشتہ کو لکھا دینا۔

۲۔ اس قاعدے کے مطابق الف سے ما قبل کے
حرف کی حرکت کو اتنا جھکا دیا جاتا ہے کہ یہ
مجہول پیدا ہو جاتی ہے مثلاً... دکا بسے کہ پ
سے الف دیں بہار کا کل ایک دوسرا صورت ہے جسے
سمجھنے کو ملتا ہے۔ یہاں بعض حالات میں واحد کے
صیغے کے لیے بھی فاعل یا مفعول کو جمع بنانا پڑتا ہے
مثلاً:

(الف) میر اگھر بہت قریب ہے، پھر بھی تم میرے
گھر نہیں آتے۔

(ب) بڑا وقت کسی پر نہیں آتا لیکن اس بڑے
وقت میں ہی دوست کی پہچان ہوتی ہے

ان مثالوں سے واضح ہے کہ صرف ضروریات کے تحت واحد ہونے
کے باوجود میرا کو میرے اور بڑا کو بڑے بولا جاتا ہے۔
یہاں الف کی مثالیں پیش کی گئیں اور الف کے املا سے
متعلق الفاظ کو اردو والے بہت پہلے سے تقریباً اور تحریر دونوں
میں یکساں طور پر استعمال کرتے ہیں۔ مسئلہ یا اختلاف ان الفاظ
کا تقریر و تحریر کا ہے جو ہائے ہوز پر ختم ہوتے ہیں۔ مثلاً شاعر
کے زیر نظر شمارے میں مختلف صفحات پر مندرجہ ذیل جملے پڑھنے
کو ملتے ہیں

ا۔ نئے سرے کی ایک مثال۔ (سرخی.... صفحہ ۵)
۲۔ سرے کی مندرجہ ذیل تین صورتوں کو پیش نظر رکھیے۔
(چھٹی سطر.... صفحہ ۵)
۳۔ اس نے ماچس کی تیلی جلا کر شعلے کو غور سے دیکھا۔
(پہلا کالم پانچویں سطر.... صفحہ ۱۷)
۴۔ بچہ کر پڑھنے کے سلسلے میں اس ایک واقعے کو بھی شامل کیا
جاسکتا ہے۔ (پہلا کالم، بارہویں سطر، صفحہ ۳۲)

ان مثالوں میں پہلے اور چوتھے جملے کے الفاظ.... سرے کو سرے اور
سلسلہ کو سلسلے، واقعہ کو واقعے لکھا گیا ہے چوں کہ بولنے میں یہ الفاظ
اسی طرح مستعمل ہیں لہٰذا انھیں "یے" کے ساتھ لکھنا ہی درست
ہے۔ اس کے برعکس دوسری اور تیسری مثال کے جملوں میں سرے کو سرے
اور شعلہ کو شعلے پڑھا جائے گا۔ جب انھیں سرے اور شعلے پڑھا جائیگا
تو سرہ اور شعلہ لکھنے سے کیا فائدہ۔ انہیں بھی ہائے ہوز ہٹا کر "یے"
کے ساتھ لکھنا ہی درست ہے۔

ص ۱۹ پر حضرت شاد سیمابی کی غزل ہماری مستحکم روایات کا
پرتو ہے۔ ایسی غزلیں ٹونک کے استاد شعراء سے گزشتہ کو ملتی رہی
ہے۔ ان غزلوں کا بہرحال اپنا ایک رنگ ہوتا ہے اور یہ ہمیں ہماری
مربوط روایات کی یاد دلاتی ہے۔ شاد سیمابی صاحب کی غزل میں رچا
ہوا ذوق دیکھنے کو ملا۔ البتہ آخری شعر کا یہ مصرع.... متانت
کا اس شاعر کو ایک نمد عنایت ہو.... کاتب کی غلطی سے بے وزن
ہو گیا ہے، غالباً اس کی جگہ اسی ہو گا کیوں کہ غزل بحر ہزج مثمن
سالم (مفاعیلن چار بار) کے وزن میں ہے۔

رضا احمد ادیب کا افسانہ "جنگل کتھا" تمثیل نگاری کی اچھی
مثال ہے لیکن اس افسانے کا آخری جملہ اور آج میں یہ سوچ رہا
ہوں کہ یہ جنگل کتھا کہیں میری کہانی تو نہیں؟ سارا مزہ کرکرا کرتا
ہے۔ تمثیل کا لطف رمز میں ہے، وضاحت میں نہیں۔ یہ فیصلہ
قاری پر چھوڑ دیا جانا چاہیے کہ وہ جس واقعے یا صورت حال پر
چاہے، تمثیل کو منطبق کرے۔

ستیہ پال آنند کی نظمیں اختر الایمان کی یاد دلاتی ہیں ۔
ندا فاضلی کی خود نوشت سوانح دلچسپ ہے۔

محمد انوار عالم۔ بزم درگاہ روڈ، سبزی باغ، پٹنہ (بہار)
شاعر کا شمارہ نمبر ۳ تا ۱۲ ۱۹۹۰ء جلد ۶۱ ہاتھ میں آیا
تو مستقل اپنی پڑھ کر دکھ ہوا اور بہت دیر تک سوچتا رہا۔ آخر اردو
سے محبت رکھنے والے صرف نام کی محبت رکھتے ہیں یا اس میں کچھ
حقیقت بھی ہے؟ وقت پر سالانہ کی عدم وصولیابی اور ایسا
جات شاعر جو اردو زبان میں واحد مقبول ادبی رسالہ ہے
کو بہت زیادہ نقصان پہنچا رہے ہیں۔ مجھے اردو سے کوئی خاص
دلچسپی نہیں تھی انگریزی اخبارات میں کچھ آرٹیکل وغیرہ لکھ لیا کرتا
تھا۔ شاعر اتفاقاً تین سال پہلے اس طرف متوجہ ہوا۔ تب سے
شاعر کا کوئی شمارہ میرے ہاتھوں سے نہیں بچا ہے۔ گو میں
شاعر کا آپ کے دفتر سے براہ راست سالانہ خریدار نہیں بنا۔
لیکن اس کا ہر شمارہ بک اسٹال سے ضرور خریدتا ہوں۔

اظہار تشکر

شاعر کے حالیہ شماروں کے تبصرات کو قارئین شاعر نے
بہت سراہا اور بڑی تعداد میں خطوط ارسال کیے، بطور خاص
"تبصرات" کوئی آنکھ اشکوں سے خالی نہیں کے متعلق اظہار
کیا گیا ہے۔ ہم آپ سب کے بے حد شکر گزار ہیں۔ گزشتہ شمارے
کے مندرجات پر بھی مجموعی طور پر بڑی تعداد میں تنقیدی و تاثراتی
خطوط وصول ہوئے ہیں۔ تمام خطوں کی سمائی تو ممکن نہیں
دو خط شامل اشاعت کیے جارہے ہیں۔ ہم ان تمام مکتوب نگاروں
کے شکر گزار ہیں جنھوں نے ہمیں خط لکھے۔ ان سے گزارش
ہے کہ وہ اسی طرح اپنی محبتوں سے نوازتے رہیں۔ کوشش کی جا رہی ہے
کہ شاعر کے صفحات بڑھائے جائیں، مکتوبات کے صفحات میں
اضافہ ہو اور اس کالم کی کتابت قدرے جلی کردی جائے۔ آپ کی
تجاویز، مشورے اور گراں قدر آراء کا ہم خیر مقدم کریں گے

شمیم طارق۔ فلیٹ ۲۰، مرزبان مینشن بانکے فروٹ مارکیٹ
مظفر صدیقی مرحوم کی اصلاح ۔ "طرز نگارش"، تعلی جواز
کا "بنیادی زبان کا سوال" اور شان الحق حقی کا "زبان کے
مسئلے".... پڑھ کر دیدہ روشن ہو گیا۔ یہ وہ مضامین ہیں
اردو دان حضرات کی ہی نہیں دانشوروں، ادیبوں، صحافیوں
نقادوں اور مدیروں کی زبان کی سوچ درست کرنے کے
آئیں گے۔

نو مولود دانشوروں اور ساز فہمی مدیروں نے اگر ان
مضامین سے استفادہ کرنا کسر شان نہیں سمجھا تو یقیناً یہ ان کو
پلٹ کردیں گے۔

میرے لیے تو یہ صحیفۂ ہدایت ہیں ۔ الٰہی مکتشی
اصلاح کی کوشش کروں گا، یہ بہت ضروری بھی ہے۔
ان اہم اور مفید مضامین کی اشاعت پر مبارکباد قبول
اور اس مفید سلسلے کو جاری رکھیے ۔ میں نہیں سمجھتا کہ اردو املا
اصلاح کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے، کچھ نامعلوم
برسم استعمار آگئے ہیں متحرک ہے تک۔ آنکھیں کے رونے کا ہے
تاریکیاں چھٹنے لگی، ساتھ ہی ادب کی کچھ بھی...

تابش مہدی ۔۔۔۔ ادارہ الایمان دیوبند
شاعر کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا ۔ آپ کا اداریہ "کوئی
آنکھ اشکوں سے خالی نہیں" پڑھ کر میری آنکھیں بھی اشکبار
ہو گئیں۔ میرا خیال ہے سیکڑوں آنکھیں بھیگ گئی ہوں گی۔ دل کی
گہرائیوں سے دعائیں نکلیں۔ شمارہ ہی مضبوط اور خوش نما اداریہ۔
سلیم اختر کا تنقیدی آشیرباد اچھا ہے۔ ندا فاضلی کا
دار سلطنت دہلی اور دل کے بیچ "فاصلے کی چھ بیٹھیں" اسے کتابی صورت
میں دیکھنے کی خواہش ہے۔ رحمت امروہوی اور عبدالاحد ساز
نظمیں دل کو چھوتی ہیں۔ جمیل فاطمی کی غزل بھی تازگی کو متاثر
ہے۔ مرحلوی کی مختصر غزلیں اچھی ہیں۔ ان کا یہ شعر فرش
عنوان ہے۔ ۔ [باقی صفحہ ۶۹ پر دیکھیے]
[باقی صفحہ ۶۹ پر دیکھیے]

کتب و رسائل

ادب — داد طلب

مشہور و معتبر نقاد ابن فرید کی تازہ ترین تنقیدی کتاب جس
دل، تکلو، مسائل و معارف، مقالات، مصاحبات،
، دار اوستو کر دا ایں بھی ایک نئی تنقیدی فضا بجائی گئی ہے
ادبی مسائل کے نئے تاثرات۔
نشر و بعیت العالم، زینہ عنایت خان، رام پور [یوپی]

زرتاب

زیب غوری مرحوم کی غزلوں کا تیسرا مجموعہ شائع ہو گیا ہے
بے مثال شعری مجموعہ جو ان کی شاعری سے ممتوب ہے۔
سانس کا تخلیقی تنوع، زندگی کا بھرپور اظہار، حمت و لفظ
شعری افق، کتاب میں شمس الرحمٰن فاروقی کا تاثراتی مضمون
کی غزل اور زیب غوری کا پیش لفظ میں اپنی داخلی
...... شامل ہے۔ کتاب کے آخر میں کلیات زیب غوری
انتخاب مجموعہ ضمیر شامل کیا گیا ہے۔ ضخامت ۲۲۸ صفحات۔
روپئے۔ رابطہ ۹۰۔ آفریدی، کانپور [یوپی] ۲۰۸۰۰۱

پرچھائیاں

ابن نشاط کے مشہور کہانی کار رحمن کے ناول کا تر کا اعادہ
دو ترجمہ معروف شاعر و نقاد واثقی نے کیا ہے۔ گجرات اردو والا
سے شائع [مجلد ۱۹۹۰ء] ہونے والے اس ناول کی
۱۵۴ صفحات [چھوٹا سائز] اور قیمت ۱۵ روپئے ہے
رو واثقی، ۱۰۲۵ رسول آباد، شاہ عالم احمد آباد گجرات

ابر احسنی اور اصلاح سخن

اصلاح سخن کے ذریعے اساتذۂ فن نے صدیوں اپنی نسلوں
ن اور تنقیدی شعور کو پروان چڑھایا ہے۔ مرتبین: حنوان
عبد الرحمٰن رشوی نے ابر احسنی کے فنی کارناموں کے حوالے
سے ان کے گوشوں کو منور کیا ہے۔ اس لئے شاعری اور
رفانی قاری کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔
ادب کی تاریخ میں ایک اہم کارنامہ ہے۔ اصلاح سخن کی
نظریاتی اور عملی حیثیت نامہ۔

ظہیر دہلوی

نثر کا ایک تحقیقی مقالہ ظہیر دہلوی حیات و فن، شائع ہو
ذوق کے شاگرد تھے۔ اور انیسویں صدی کے
شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر قریشی شمیم کا یہ ایک
مقالہ ہے جسے نصرت پبلشرز، امین آباد لکھنؤ نے نہایت
کیا ہے۔ صفحات چار سو، کتابی سائز خوش نمائی
بصورت نفیس قیمت ... روپئے۔

ڈاکٹر — عقاب کی آنکھیں

ڈاکٹر مشرف عالم ذوقی کے مختلف ناول، مختصر ناول اور
اور ملک کے مختلف مجموعوں نے افسانوں کو اردو کے معیاری ناولوں
کے باب میں جگہ دی ہے۔ ایک اچھا اور معیاری ناول کیا ہوتا ہے یہ دو ناول
ناول اس کا جواب ہیں۔ ذوقی نے افسانے سے ناول تک اپنے عصر کو
تخلیقی روپ دیا ہے۔ رابطہ: ۵۰، ۲۱۴/۲ تھرڈ اسٹیٹ پٹنگ، الیاد
لوک، دہلی ۳۲

اجنبی ساعتوں کے درمیان

نفوس شوق کا اولین شعری مجموعہ لازوال کیفیات کی بے مثال
عکاسی۔ ۳۰ اپریل، تحقیقات سے سوا نیا معنوی شعری منظرنامہ، رابطہ
شاریب حسن کا ورز، مکان نمبر ۱۔ ۳۴، ۰۰، بہار

ڈاکٹر گیان چند کا اشاعتی ریکارڈ

۱۹۹۰ء میں ڈاکٹر گیان چند کی تخلیقی و تنقیدی کتابیں شائع ہوئی
جلد ۱۔ اردو کا اپنا عروض، انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۲۔ کھوج: ایجوکیشنل
پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ ۳۔ پرکھ اور پہچان: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس
دہلی۔ ۴۔ تحقیق کا فن: یوپی اردو اکادمی۔ ۵۔ ادبی اصناف:
گجرات اردو اکادمی۔ ۶۔ مقدمے اور تبصرے: انجمن ترقی اردو ہند
دہلی۔

اوراق [خاص نمبر]

اوراق [لاہور] خاص نمبر ۱۹۹۰ء اصناف و ہیئت کے
تنوع اور اعلیٰ معیار کے تخلیقی فن پاروں سے سجا ہوا ہے۔ پہلا ورق،
حمد و نعت، نئے آفاق، نظم کی دنیا، ماہیے، گیت، ہائیکو، انشائیے
نظمیں، غزلیات، افسانے، غزلیں، سفرنامے، مقالات، اداریہ
اس کتاب میں، آپس کی باتیں، نئی کتابیں، ان ابواب
میں ڈیڑھ سو سے زائد نئے پرانے قلم کاروں کی نگارشات کو وزیر
آغا، انور سدید اور سجاد نقوی نے ۱۹۹۰ء کی اہم ترین ادبی دستاویز
بنا دیا ہے۔ ۴۰۲ صفحات میں ایک مکمل ادبی منظرنامہ شعر و ادب کے
قارئین کے لئے تیار کیا ہے۔ قیمت صرف چالیس روپے۔
رابطہ: دفتر اوراق، چوک اردو بازار لاہور — ۲ [پاکستان]

کتب خانہ جامع مسجد بمبئی کے اردو مخطوطات

جامع مسجد بمبئی کا کتب خانہ بہت قدیم ہے۔ اس کے ایک سو
چودہ اردو مخطوطات سے متعلق بنیادی معلومات، اردو، عربی اور
فارسی کے اسکالر عامد اشرف انصاری نے نہایت ہی عرق ریزی کے ساتھ
برسوں کی محنت کے بعد ترتیب دی ہیں۔ اس میں وہ چار مخطوطے بھی
شامل ہیں جو اب کتب خانے میں موجود نہیں۔ کتاب کی فہرست ہی سے
کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یعنی نمبر شمار مخطوطہ، مصنف،
موضوع، مخطوطہ نمبر اور صفحہ نمبر یہ ترتیب کتب خانے کے اندراج کے
مطابق ہے۔ اندرونی صفحات میں مخطوطے کا نام، فوٹینٹس انگریزی
میں مخطوطہ نمبر درج ہے۔ مصنف، سنہ تصنیف، صفحات، سطریں
کس خط میں مخطوطہ موجود ہے [خط نسخ یا نستعلیق] اور مخطوطے کا
سائز پھر مخطوطے کا تفصیلی تعارف تمام تر تحقیقی ابعاد کے ساتھ مفید
حواشی و تعلیقات درج کی گئی ہیں۔ اس طرح یہ ایک اہم تحقیقی کتاب
ایک مثالی تحقیق کا نمونہ بن گئی ہے۔

جامع مسجد کے اردو مخطوطات میں وہ اہم مخطوطات کا ذکر
عامد اشرف انصاری نے بطور خاص ذکر کیا ہے جیسے سندر سنگار، شاہجہان کا
عہد سے تاحال سیاستداں اور شاعر شاہد صاحب کے ذریعہ لکھی گئی
جنگ کی اور رسم خط اردو ہے۔ ۲۔ سیاہ پوش۔ اور نگ آباد کے مشہور
بزرگ شاہ حسن کی ایک دکنی مثنوی ہے جو شاہ محمود کے خاندان کے
کے ایک واقعہ کو موضوع بنا کر لکھی گئی ہے۔ شاہ حسن، امیر الامرا
کے پیر و مرشد تھے۔
کوکن اسٹیٹ اسکول کے تعاون سے موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹، گولا مارکیٹ دریا گنج، نئی دہلی ۲ ... سے شائع کیا۔ ضخامت ۲۲۲
صفحات، قیمت سو روپئے۔ رابطہ: ڈاکٹر عامد اشرف انصاری ۲۰۰/۱۱ السید
بیت جمیل نو اوپر ڈی روڈ، ملاڈ [ویسٹ] بمبئی ۴۰۰۰۶۴

تلاشِ آزاد

[حیات، شخصیت، خدمات: چند جھلکیاں]

نامور ادیب، نقاد اور محقق پروفیسر عبد القوی دسنوی
نے مولانا ابو الکلام آزاد پر، گرانقدر کتابیں تحریر کیں۔ "تلاش آزاد"
اس موضوع پر ۸ ویں کتاب ہے جس میں مختلف موضوعات پر ۱۹ مقالات
شامل کئے گئے ہیں۔ یہ مضامین مختلف رسائل میں شائع ہو کر موضوع
بحث بن چکے ہیں۔ ان مضامین میں مولانا آزاد کی زندگی، سیاست، صحافت
اور شاعری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کی دو کتابیں اور زیر ترتیب ہیں
اور ان کے نامور ہم عصر، حیات آزاد، ایک عظیم شخصیت پر عظیم کام
پروفیسر عبد القوی ہی سے ممکن ہو سکتا ہے۔ یہ کتاب بہار اسٹیٹ اردو
اکاڈمی کے تعاون سے مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے شائع کی ہے۔ ضخامت ۱۷۶
صفحات۔ قیمت چالیس روپئے۔ یہ کتاب مکتبہ جامعہ دہلی، بمبئی اور علی گڑھ
سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ رابطہ: عبد القوی دسنوی، پروفیسر ریٹائرڈ
سیفیہ کالج، بھوپال [ایم پی]

دامِ تحریر

مدیر [گہوارہ] شاعر، افسانہ نگار اور ناول نویس ڈاکٹر جلیس
سہسوانی کا نیا ناول خلو دل کی تحریک پر ایک رومانی ناول ہے۔ ابتدا سے
آخر تک تجسس قاری کو ناول سے الگ نہیں کر پاتا۔ یہی اس ناول کی خصوصیت
ہے۔ ضخامت: ۱۱۲ صفحات۔ قیمت دس روپئے۔ مطبوعہ ۱۹۹۰ء جلیس
سہسوانی، رستم نگر سہسوان بدایوں [یوپی]

THE DISPUTED MOSQUE
A HISTORICAL INQUIRY

متنازعہ بابری مسجد اور رام جنم بھومی پر ایک تاریخی دستاویز جسے معروف
تاریخ داں سوشیل سریواستو نے تین سال سے زائد کی زبردست تحقیق
کے بعد مکمل کیا۔ کتاب میں ۸ ابواب شامل ہیں۔ تمہید، تنازعے کا
آغاز، برٹش پالیسی اور ایودھیا میں مذہبی انقلاب، ایودھیا ایک
تاریخی خاکہ، کیا بابر نے مسجد بنائی تھی، رام جنم بھومی کا اصل مقام
بدست اسٹیٹ، اختتامیہ ہر باب کے آخر میں مفید حواشی اور تعلیقات
دی گئی ہیں۔ بابری مسجد کی تصاویر متنازعہ دستاویزات دی گئی ہیں۔
ساتھ ہی دو مفید نقشے بھی دیئے گئے ہیں۔ جا ئزہ رپورٹ، تحقیقاتی اور
ایودھیا کی زمین کا سرکاری احوال، آخر میں مفید کتابیات کے تحت مستند
بالیورا کتی، عربی، فارسی، اردو اور انگلش زبانوں کی کتابیں، مطبوعہ
سرکاری کتابیں، جریدے اور اخبارات، مطبوعہ کتابیں اور غیر مطبوعہ
تحقیقی مقالات اور انٹرویوز کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ بابری مسجد اور

عہد نامہ جمہوریت کے تاریخی، سیاسی، سماجی پہلوؤں کو تمام تفصیلات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ بابری مسجد کی تعمیر کو اس کے ایک ایک نادر پہلو کو تحقیق و دلائل سے دیکھا گیا ہے۔ سوشلسٹ سربراہ استو کا یہ کہنا ہے کہ بابری مسجد کی عمارت کو حکومت اترپردیش کے سپرد کر دینا چاہئے کہ وہ آثار قدیمہ کے طور پر اس عمارت کی حفاظت کرے۔ مختلف عکس بھی ہے کے ساتھ اس کتاب کی ضخامت ۲۴۴ صفحات ہے اور قیمت

[پیپر ایڈیشن] ۵۰ روپئے۔

VISTAR PUBLICATION 32-M-BLOCK
MARKET, GREATER KAILASH-I
NEW DELHI-110048

ماہنامہ اقدار کراچی

ہندوپاک میں شائع ہونے والے ادبی رسائل میں "اقدار" کا ایک منفرد مقام بن گیا ہے۔ اعلیٰ درجے کے فن پاروں کی شمولیت، دیدہ زیب کتابت و طباعت اور رسالے کی خوب صورت ترتیب و تہذیب سے ادبی حلقوں میں بے پناہ پذیرائی ہو رہی ہے۔ تازہ شمارہ خصوصی اشاعت ہے۔ اداریہ، حمد و نعت، گوشہ، ترجمہ، افسانہ، رباعی، ماہیا، شخصیت، طنز و مزاح، ارمغان جیسا ایک شاعر کا تعارف اور انتخاب، نظم و غزل، تصوف، لسانیات، تنقید، موضوعاتی گفتگو، مطالعہ اور قارئین کے خطوط قلم کاروں کی تصاویر۔ ضخامت: ایک سو ساٹھ صفحات، قیمت: تیس روپئے، سائز ۲۰×۳۰، مابعد ۲۰۰، کمپال بلڈنگ، صدر: کراچی [پاکستان]

پیام صحرا [سہ ماہی]

ریاض [سعودی عرب] سے شائع ہونے والا اولین ادبی جریدہ [جنوری ۱۹۹۱] جسے اردو کی نئی بستی کے بسنے والے اردو قلم کاروں نے نہایت ہی سلیقے سے پیش کیا ہے۔ نظم، غزل، افسانہ، مقالہ، طنز و مزاح، شخصیت، نثر پارے، فولڈر، ڈپلومیسی، اسکیچ، قلم کاروں کے عکس۔ ایک قابل مطالعہ دلچسپ اور معلوماتی مکمل تحریری رسالہ ایک نئی ترتیب اور نرالے جمالیاتی حسن کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے لیکن بہت ساری تخلیقات دوسرے قلم کاروں کی بھی شامل ہیں ۱۱۲ صفحات کے اس جریدے کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ یہ ایک قابل قدر مستحسن کوشش ہے جس کا خیر مقدم ہونا چاہئے۔

رابطہ: پوسٹ بکس نمبر ۵۰۲۶۳، ریاض [سعودی عرب]

صحیفۂ حکمت: منظوم ترجمہ سورہ یٰسین

قرآن مجید کے منظوم تراجم کی روایت بسم اللہ سے اب تک مسلسل چلی آ رہی ہے۔ قرآن مجید کی مختلف آیتوں کے تراجم میں سورہ رحمٰن اور سورہ یٰسین کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ شرف کمال خان گوکل کے مشہور شاعر جناب احمد نے نہایت ہی سہل زبان میں سورہ یٰسین کا منظوم ترجمہ کیا ہے صفحہ پر عربی متن ایک شعر اور پھر اس کا اردو میں ترجمہ دیا گیا ہے۔ خوبصورت کتابت، طباعت اور عمدہ کاغذ نے کتاب کو دیدہ زیب بنا دیا ہے۔ صحیفۂ حکمت ایک بہترین منظوم قرآنی شکل میں بامحاورہ ترجمہ اور قرآن کے شیدائیوں کے لئے ایک عظیم تحفہ ہے۔ ضخامت ۱۰۰ صفحات، قیمت ۱۵ روپئے۔ ملنے کا پتہ: ناشر ادارہ الاول ۲-۳ ویسٹ لین، کلکتہ۔ مدرسہ عالیہ مرکزی، کلکتہ ۷۰۰۰۱۴

جام اقبال میں ایک

بیاد مشرق کے ایک شاعر و مبصر نے اقبال کا اور ان کے نقوش پر

۲۶ مئی ۱۹۹۱ء۔ م: ۱۴ نومبر ۱۹۹۰ [۱۹۹۱ء] کی یاد میں ڈاکٹر پانی پتی نے ایک سوونیر مرتب کیا ہے جو چار مختلف ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں منظومات، دوسرے حصے میں مقالات، تیسرے حصے میں، یہ تئی فوٹو کا عنوان سے جناب کنول کا منتخب کلام دیا گیا ہے۔ چوتھے حصے میں ادبی مرکز، پانی پت کی جانب سے جناب کنول کو خراج عقیدت پیش کئے گئے ہیں۔ کنول پانی پتی کے فن و شخصیت پر یہ ایک اہم اشاریہ ہے جو مرحوم پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے خام مواد فراہم کرے گا۔ ڈاکٹر پانی پتی نے اسے سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔ سال اشاعت ۱۹۹۰ء، ضخامت ۱۰۰ صفحات، قیمت درج نہیں کہ اسے سوونیر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ رابطہ: کمار پانی پتی۔ ادبی مرکز، ۱۲۰۵، ایم آئی جی، بی سیکٹر ۱۱-۱۲ نیو ہاؤسنگ بورڈ کالونی پانی پت۔ ۱۳۲۱۰۳ (ہریانہ)

جدید شعری منظرنامہ

مشہور مبصر، نقاد، شاعر اور ادیب پروفیسر حامدی کاشمیری کا تازہ ترین تنقیدی کارنامہ یہ کتاب گیارہ ایسے جدید شعرا کے مطالعات پر مشتمل ہے جنہوں نے معاصر ادبی دنیا میں نہ صرف اپنی شعری حیثیت منوائی ہے بلکہ جدید اردو شاعری میں نئے ابعاد کا اضافہ کر کے اس کی توسیع بھی کی ہے۔ حامدی کاشمیری نے موجودہ تنقیدی نظریات سے اختلاف کرتے ہوئے تخلیق کے انکشاف طلب اسرار کا مشاہدہ تنقید کے ایک معروضی اور تجرباتی طریق کار کے تحت کیا ہے جو ہر نوع کے تاثراتی اور موضوعی تنقید کی بہ نسبت کہیں زیادہ کارگر ہے۔ جن شعرا کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے ان میں بیشتر جیسے اختر الایمان، ناصر کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی، وزیر آغا، بانی، مظہر امام، کشور ناہید، فراغ کومل، شمس الرحمٰن فاروقی اور شہریار شامل ہیں یہ تنقیدی مطالعات قاری کو ایک نیا ذہن عطا کرتے ہیں۔ شعری پرکھ کے بالکل نئے زاویے ابھارتے ہیں۔ نئے تنقیدی نظریے کے ساتھ یہ کتاب اردو تنقید کے باب میں اضافہ ہے۔ ضخامت: ۲۳۲ صفحات، قیمت: ایک سو پچیس روپئے۔ مطبوعہ: ۱۹۹۰ء ناشر: ادارۂ ادب، شالیمار، سری نگر

بیلی رتوں کی کتھا

نئی فن کارہ شہناز نبی کا اولین شعری مجموعہ شائع ہو گیا ہے نسائی لہجے میں نرم نرم جذبے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ تازہ دم "خواب خواب لے" جو شعری کائنات ہے۔ اس میں عورت کی پہلی خواہشات جلوہ گر ہیں زندگی کے حقائق کو عشق کی راہ دکھانے والی شاعری میں امکانات ہیں۔ ضخامت ۹۶ صفحات [مطبوعہ ۱۹۹۰ء] قیمت: ۲۰ روپئے [۹۵ غزلیں ۴۴ نظمیں] پتہ: سید نبی، ۲۰/۱ اے رچرڈ لین، کلکتہ

سخن گستر انہ بات

سید عاشور کاظمی کے ادبی رنگ اور منفرد مضامین کا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔

مٹھی بھر تارے

تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح اردو کی منفرد آواز باقر نقوی کی شاعری کا نقش ثانی۔ ایک نفیس شعری مجموعہ، دیدہ زیب کتابت و طباعت کا مرقع۔

INSTITUTE OF THIRD WORLD ART & LITERATURE, 16-WINDERMERE ROAD LONDON W5 پتہ

فکرِ امروز

لسانی تقسیم و انتشار سے ذرا الگ ہٹ کر ہم دیکھتے ہیں تو شاعری کی حقیقت، شاعری کی کیفیت، شاعری کے تاثرات اور شاعری کی نفسیات حقیقتاً ہر دور اور ہر عالم میں یکساں نظر آتی ہیں۔ شاعری صرف ایک چیز کی ترجمان ہے اور وہ "صداقت" ہے۔ شاعری صرف ایک چیز کا آئینہ ہے اور وہ "حسن" ہے۔ سورج کی تابانی ہر شخص کے علم میں ہے۔ چاند، سورج کی روشنی سے کسبِ ضیا کرتا ہے، یہ بھی ہر شخص کو معلوم ہے۔ پھول کھلتے ہیں، ہوا چلتی ہے، شبنم گرتی ہے۔ ان تمام مظاہر سے ہر بالغ انسان واقف ہے لیکن یہ راز کہ پھول کچھ کہتے ہیں، ہوا ہنستی ہے اور شبنم روتی ہے، صرف ایک فطرت شناس شاعر ہی جانتا ہے۔

یہ تفوق جو شاعر کی قسمت ہے اور یہ قوت جو شاعر کی ودیعت ہے، تخیل کا کرشمہ ہے۔ افلاطون کہتا ہے "فلسفے کی بنیاد حیرت پر ہے" یعنی اگر کوئی بچہ کھلونے سے کھیلتے کھیلتے اپنی ماں سے یہ پوچھ بیٹھے کہ یہ کھلونا کیوں کر بنا ہوگا؟ تو یہیں سے فلسفے کے ایک مسئلے کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ اسی تخیل کی ترجمانی کا دوسرا نام شاعری ہے۔ اگر کوئی شخص پھول کی پتیاں دیکھتے دیکھتے پوچھ بیٹھے کہ یہ پتیاں کسی کا پردہ تو نہیں ہیں؟ تو بس یہیں سے ایک شاعر ذہن کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ — سیماب

عہدِ جدید کی تعمیر و تہذیب میں ادبِ اُردو کا اعلیٰ حصہ
مطبوعہ ماہنامہ "کنول" (آگرہ) ستمبر ۱۹۳۶ء

سیماب اکبر آبادی

شاعر

ماہنامہ

۶۲ واں سال

جلد — ۶۲
شمارہ — ۴

فون: ۳۵۹۹۰۳۰

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت: ۵ روپے

زرِ سالانہ ۵۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۴۰ روپے

تاحیات خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے ◆ ممالکِ غیر سے ۳۵۰ روپے

کلر بلائنڈ

انور قمر

[کا تیسرا افسانوی مجموعہ]

ہر ادیب کا ایک وژن ہوتا ہے، جس سے اُس کی کہانیوں کا مجموعی موڈ مرتب ہوتا ہے۔ نو کہانیوں کا یہ مجموعہ جو وژن قاری کے سامنے رکھتا ہے، وہ قاری کے لیے دل خوش کن نہیں۔ ایسے بھیانک سپنے اور خیالات جن کا سامنا وہ نہیں کرنا چاہتا، شعور کی سطح پر لانا نہیں چاہتا انور قمر انہیں الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش کرتے ہیں عالم اسفل HADES کا سفر بڑے جوکھم کا کام ہے۔ یہ جوکھم انہوں نے مول لیا ہے۔ مزاج، تشدد، انتشار، موت، تباہی۔ انسان کے باطن سے نکل کر اب پوری دنیا میں تانڈو ناچ رہے ہیں۔ انور قمر ان بھوتوں کو اپنے قابو میں کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے ان افسانوں میں قاری کو کشش بھی محسوس ہوتی ہے اور وہ ان سے دور بھی ہونا چاہتا ہے۔

ان کہانیوں میں کئی جگہ خواب بیان ہوتے ہیں۔ افسانہ "ذبیحہ" کا مزدور خواب دیکھتا ہے کہ "ایک بستی ہے جو ویران ہو چکی ہے۔ ایک شیر اس بستی کے گلی کوچوں میں گھوم رہا ہے کہیں دور سے کسی بچے کی ہچکیاں لے لے کر رونے کی آواز آ رہی ہے" افسانہ "پرندے کا سایہ" میں بیگم شریفی ایک پرندے کو خواب میں دیکھتی ہیں۔ پرندہ ان سے کہتا ہے کہ "اُسے آج ہی سفر پر روانہ ہونا ہے"

"اتنی تیز ہوائیں، ایسی گہری شام کو؟"

"ہوائیں تیز ہیں اور شام بہت گہری۔ مگر میری زندگی میں اس سے بھی کڑا وقت آ چکا ہے"

یہ پرندہ بار بار ان کے خوابوں میں آتا ہے۔ ایک شب وہ خواب دیکھتی ہیں کہ پرندہ کو بارود کے شعلوں نے چاٹ لیا ہے۔ "پوسٹ کارڈ" "گم شدہ باپ" "شمشکار" اور "سپہر کا تماشہ" بھی خواب جیسی کہانیاں ہیں۔ "اُن ہی کے سپرد" میں ایک خاندان سدوم سے شہر دنیا ہجرت کرتا ہے کہ سدوم فسادات، قتل، چوری اور زنا کی آماجگاہ بن گیا ہے۔ لیکن جب وہ دنیا پہنچتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ آج کوئی شہر محفوظ نہیں۔ عالم اسفل کے بھوت انسان کے باطن نکل کر کرۂ ارض پر دندنا رہے ہیں۔ بنی آدم کے لیے اب کوئی جگہ مامون محفوظ نہیں۔ تو پھر انسان کیا کرے؟ افسانہ "تہہ بند" میں وہ ہمیں ایک تہہ خانہ کا پتہ دیتے ہیں۔ "ہر انسان، ہر عمارت کے اندر ایک تہہ خانہ ہے۔ آپ کی عمارت میں بھی ہے۔ اس کی صفائی کرائیے اس میں روشنی کیجئے۔ پھر تہہ خانے میں اتریے۔ دیکھیے کہ تہہ خانے کے راستے آپ کو کہاں لے جاتے ہیں"

[انور خان]

۱۴۴ صفحات ❀ قیمت ۳۰ روپے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جے جے اسپتال ممبئی ۸ — اردو بازار دہلی۔ ۶ — شمشاد مارکیٹ علی گڑھ۔

سرورق
تنہائی
عمل
سلطان سبحانی

اظہار اثر ۔ خورشید سمیع ۔ مبین صدیقی
نذیر احمد یوسفی ۔ سید انیس شاہ جیلانی ۔ رفیق اظم
محمد مسلم صدیقی ۔ سلطان احمد ساحل ۔ شفیقہ فرحت
عشرت ظفر ۔ بہت رائے شرما ۔ شہپر رسول
نسیم بن آسی ۔ ملک نسیم ۔ اظہر نیئر
عمر شہید انصاری ۔ شہاب اختر شہاب
۴۶

شمارہ نمبر ۴ [۱۹۹۱ء] جلد ۲۴
اپریل ۹۱ء

آدمی ادھورا ہے

راجیو گاندھی کے نام

اور پھر یوں ہوا
بم کے دھماکے نے
ایک قدآور شخصیت کو
پل بھر میں سمیٹا،
بکھیر دیا

گذرتے ہوئے لمحوں نے
وقت کے تغیر میں
زمین کے دوسرے سرے تک،
حادثے کو پھیلا کر،
بے شمار ذہنوں کو،
جلتی بجھتی آنکھوں کو
سوچ کے بھنور دے کر
نت نئے سوالوں میں،
شدتیں سمودی ہیں۔

حادثہ نیا کب ہے!
یہ تو ہوتا رہتا ہے۔
سرحدوں کے اندر بھی،
سرحدوں کے باہر بھی،

یہ زمین کیسی ہے؟
ختم ہی نہیں ہوتی،
انتہا یہ جیتی ہے۔

آدمی ہے دانشور،
آدمی درندہ ہے،
بھوک سے بلکتا ہے،
حادثوں میں پلتا ہے۔
وہ غلام خود بھی ہے،
خود پہ راج کرتا ہے۔

گفتگو تلک جیبی،
کام بھی فلاحی سب،
سچ ہی سچ کے دعوے بس۔

حادثوں کا جنگل تو،
پھیلتا ہی جاتا ہے۔

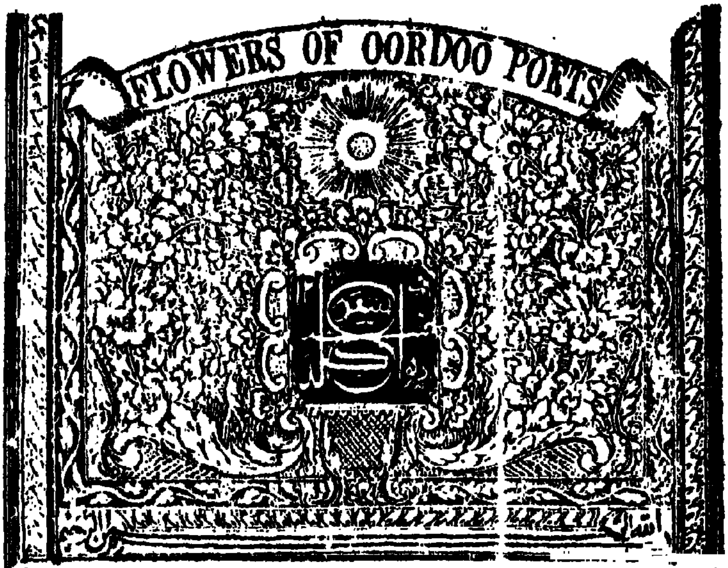
بے بسی کا عالم ہے،
اک عذاب پیہم ہے۔

شخص وہ کہیں کا ہو،
حادثہ کہیں پہ ہو،
زندگی تو روتی ہے۔
آدمی سے انساں تک
اک سفر کا حاصل تو
سرحدیں نہیں ہرگز

یہ الگ الگ فرقے
سیکڑوں زبانوں کے
مختلف مذاہب کے
چھوٹے چھوٹے ذہنوں کے
بونے بونے لوگوں کے
منقسم ہوئے جو بھی
وہ بھی منتشر ٹھہرے۔
مسئلہ سیاست ہے،
مسئلہ نہ مذہب ہے۔

اک صدی کے مرنے پر
اک صدی کی آمد پہ
اس زمیں پہ لکھنا ہے
اک نئے زمانے کو
اک نئے فسانے کو

یہ تو اک حقیقت ہے
ہر عمل کا رد بھی ہے
اک تضاد سے قائم،
روز و شب کا جادو ہے
ارتقاء مسلسل ہے۔
یہ جہاں مکمل ہے
آدمی ادھورا ہے۔



نمبر ۔ مصرعۂ طرح ای آسمان یہ بوجھ اٹھا نہیں سکتا زمین کب ۔ جلسۂ مشاعرہ تیسرا ۔ جلد

واقع غرۂ جنوری ۱۸۶۰ عیسوی مطابق ہفتم جمادی الثانی ۱۲۷۶ ہجری		
بعد دو ہفتہ کی ہاں پھر دوسرا جلسہ ٹھہرا	اشتہار	مژدہ ای شوق کہ پھر طرفہ تماشا ٹھہرا

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

گلدستۂ شعرا لکھنؤ جلد ۱ شمارہ ۳ کے سرورق کا عکس جو یکم جنوری ۱۸۶۰ء مطابق ۷ جمادی الآخر ۱۲۷۶ھ کے طرحی مشاعرے کی روداد پر مشتمل ہے۔ "گلدستۂ شعرائے لکھنؤ" سے شائع ہونے والا ایک پندرہ روزہ ادبی مجلہ تھا جس کی مجھے ایک مجلد جلد دستیاب ہوئی ہے۔ اس فائل میں دسمبر ۱۸۵۹ء سے ۲۴ فروری ۱۸۶۱ء تک کی دو درجن سے زائد اشاعتوں میں ڈیڑھ سو سے زائد معروف و غیر معروف شاعروں کا نمونۂ کلام شامل ہے۔ راقم الحروف اس گلدستے کے منتخبات کو کتابی شکل میں شائع کر رہا ہے۔ [کاظم علی خاں۔ لکھنؤ]

کشمیری محلہ۔ لکھنؤ
۱۱ جون ۵۵ء

حضرت محترم ۔ تسلیم

نامۂ گراں باعث انتخار ہوا ۔ جہاں تک مجھے علم ہے مانی صاحب حضرت عزیز مرحوم کے شاگرد نہیں ہیں جوش البتہ ہیں مگر یہ بیکر شمال جاتے ہیں کہ کچھ دن مشورۂ سخن کیا تھا" ۔ حالانکہ اُن کے والد بزرگوار بشیر محمد خاں بھی حضرت عزیز کے شاگرد تھے ۔ میرا عقیدہ ہے کہ یہ حضرت عزیز کی حضرت صفی کی شاگردی سے انکار کی پاداش ہے ۔ حضرت صفی مرحوم نے اپنی ایک غزل کے مقطع میں اس طرف اشارہ کیا ہے :

تھے اور بھی صفی مرے قبیلے تلامذہ ۔۔۔ نکلے وفا شعار سب اُن میں ، مگر عزیز

مانی صاحب نے اپنے تلمذ کی طرح اپنی عمر بھی نہیں بتائی لیکن اس کا پتہ اُن کے فرمودات سے چل جاتا ہے ۔ نوٹ کا صفحہ ملاحظہ فرمائے ۔ ۱۹۲۱ء میں رفیقۂ حیات نے تیس سال کا ساتھ چھوڑا ۔ شادی پندرہ برس کی عمر ہوئی تھی ۔ ۱۹۲۱ سے ۳۰+۱۵=۳۵ نکال دیجئے تو ۱۸۸۶ رہ جاتے ہیں سنہ ولادت ہوا ۔ عورت کی طرح شاعر بھی اپنی اصلی عمر نہیں بتاتا لہٰذا میری رائے ہیں ۱۸۸۶ سے پانچ چھ برس اور منہا کر دیجئے ۔ میں بھی شاید طرز عمل اختیار کرتا مگر مشکل یہ آپڑی کہ اسکول میں عمر کا اندراج ، کالج میں اندراج ، ملازمت سرکاری میں اس قدر جکڑا ہوا تھا کہ تغیر تبدل کی گنجائش نہیں نکلی ۔

جس غزل کا شعر آپ کو پسند آیا اُسکے بعض دیگر اشعار بھی سنانے کو دل چاہتا ہے :

آباد میکدے تری چشم سیاہ سے ۔۔۔ مستی خراب بادہ نشیل نگاہ سے
تھی رات اُن کے عارض تاباں کی گفتگو ۔۔۔ جیسے کسی نے کھینچ لیا نور ماہ سے
یہ شرم ناکسی ہے کہ رہتا ہے یہ ہراس ۔۔۔ مجکو نہ دیکھ لے کوئی میری نگاہ سے

الجمعیۃ میری نظر سے نہیں گزرتا ۔ خبر نہیں کہ شمار رسالہ کے مضامین کس نوعیت کے ہوتے ہیں خود اُنھوں نے کبھی مطلع نہیں کیا ۔

آپ کا خادم اثر

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی [پ : ۱۲ جولائی ۱۸۸۵ء ۔ م : ۶ جون ۱۹۶۷ء] بنام مولانا نسیم احمد فریدی [م : ۱۹۸۸ء] خط میں شامل ادھورے نام اپنی ترتیب میں مکمل اس طرح ہیں : مانی جائسی ، عزیز لکھنوی ، جوش ملیح آبادی ، صفی لکھنوی ، نثار احمد فاروقی [ادارہ]

[بشکریہ : نثار احمد فاروقی]



اختر سعید خان

◆

بہت طویل سفر تھا یہ طے ہوا کیسے
ترے بغیر یہاں تک میں آگیا کیسے

بلا تھی ساعتِ اول سے انتظار کی شام
قریبِ صبح مگر دل ٹھہر گیا کیسے

بس ایک لحظہ میں اس در پہ جاکے بیٹھا تھا
اٹھا تو بھول گیا گھر کا راستا کیسے

وہ ماہ تھا نہ ہوائے بہار کا جھونکا
نہ جانے پھر مجھے دیوانہ کر گیا کیسے

نہ سحرِ فن نہ کرشمہ طراز تھا وہ شخص
میں ایک عمر تماشا بنا رہا کیسے

ہزار ٹھوکریں اک ایک سنگِ راہ میں تھیں
سنبھالتی مجھے عمرِ گریز پا کیسے

معاملہ تو غمِ دل کا اب کھلا ہے کہیں
ہوا میں پہلے پہل درد آشنا کیسے

یہ مجھ سے پوچھ مرے نامراد دل سے نہ پوچھ
گزارتا ہے کوئی عمر بے خدا کیسے

◆

تم ہو یا چھڑتی ہے باجِ سحر کوئی تو ہے
کھٹ کھٹاتا ہے جو یہ خواب کا در کوئی تو ہے

دل پہ پڑتی ہوئی دزدیدہ نظر کوئی تو ہے
جس طرف دیکھ رہا ہوں میں ادھر کوئی تو ہے

خود بخود ہاتھ گریباں کی طرف اٹھتے ہیں
سرسراتی ہی ہواؤں میں خبر کوئی تو ہے

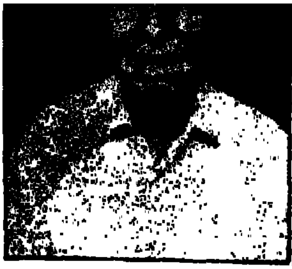
کس کا منہ دیکھ رہی ہے سفر آمادہ حیات
سوئے مقتل ہی سہی رہ گذر کوئی تو ہے

تو مجھے دیکھ مرے پاؤں کے چھالوں کو نہ دیکھ
زندگی تیرے لیے خاک بسر کوئی تو ہے

ایسے ناداں نہیں راتوں میں بھٹکنے والے
جاگتی آنکھوں میں خورشیدِ سحر کوئی تو ہے

دن کٹا سارا خرابوں میں بھٹکتے اختر
شام ہوتی ہے چلو میرے گھر کوئی تو ہے

● بیرون تیواڑا، الہ آباد بینک روڈ بھوپال ۔۱



ایشن کمار
۱۰۵۴ - سیکٹر ۲ اے - بوکارو اسٹیل سٹی ۸۲۷۰۰۱

شاعری کا مقصد

کبھی کبھی میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ انسان نے پہلا لفظ یا فقرہ کیا بولا تھا۔ یہ یقینی امر ہے کہ وہ کسی احساس کا اظہار ہوگا، خوشی یا غم، درد و راحت، حیرانی اطمینان، غصہ یا تسکین۔ عقل سے پہلے دل کا اظہار کرنا سیکھا ہوگا۔ خیال سے پہلے حس کا۔ خیال کے لیے کچھ سوچ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس کے اظہار کے لیے پختہ زبان۔ حس خود بخود نکلتی ہے۔ اس کے لیے زبان کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ رونا۔ مسکرانا یا آنکھوں سے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ بچہ پیدا ہوتے ہی اپنے احساسات کا اظہار کرنا شروع کر دیتا ہے۔ رونے یا مسکرانے کے لیے اُسے کسی قسم کی تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔

شاعری بھی احساسات کا اظہار ہوتی ہے۔ خود بخود نکلتی ہے۔ کیٹس KEATS نے کہا تھا کہ اگر شاعری پتوں اور پھولوں کی طرح خود بخود نہیں اُگتی تو وہ بے کار ہوتی ہے۔ بائرن BYRON نے اسے لاوے سے تشبیہ دی تھی کہ وہ خود بخود اُگلتا ہے تاکہ زلزلے سے بچاؤ ہو۔ غالب نے کہا کہ "آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں"۔ دنیا کی ہر زبان کی تاریخ میں دیکھا گیا ہے کہ نثر، نظم سے پیچھے ظاہر ہوتی ہے۔ نثر کے لیے گرامر اور بناوٹ وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ دنیا کی تمام معلوم شدہ کتابوں میں سب سے پہلی کتاب رگ وید مانی جاتی ہے جو شاعری میں ہے۔ یہاں تک کہ نثر کے ایجاد ہونے سے پہلے جیومیٹری۔ سائنس اور طب کی کتابیں بھی شاعری میں ملتی ہیں۔

اگر یہ ٹھیک ہے تو شاعری کا مقصد صاف ظاہر ہے اس کی کھوج کرنے کی ضرورت نہیں۔ پانی، ہوا کے پھول یا سورج کی طرح اس کا مقصد بھی صریحاً دکھائی دیتا ہے۔ صدیوں تک انسان شاعری کرتا رہا۔ بغیر سوچے کہ وہ کیوں ایسا کر رہا ہے؟ یا اس کا کیا فائدہ ہے؟ اس کے بغیر اس کا چارہ ہی نہیں تھا۔ لیکن جوں جوں انسان مہذب ہوتا گیا، نئی نئی ایجادات کرتا گیا اس کی ضروریات بڑھتی گئیں، تب اسے نثر کی ضرورت محسوس ہوئی اور وہ شاعری کے اٹوٹ رشتے سے الگ ہوتا گیا۔ شاعری بھی اظہار کے لیے رنگ بدلتی گئی تب اس نے سوچنا شروع کیا کہ شاعری کا مقصد کیا ہے

جہاں تک مجھے معلوم ہے، یہ مسئلہ پہلے پہل یونان میں اٹھایا گیا۔ جب افلاطون نے شاعری پر حملہ کیا۔ اور اسے اس نے اپنی تمثیلی کامن ویلتھ میں جگہ دینے سے انکار کر دیا۔ سوائے اس شاعری کے جو خدا کی شکر گذاری میں یا قوم کے رہنماؤں کی تعریف میں ہو۔ اس کے حملے کی دو وجوہ تھیں۔ ایک یہ کہ شاعر جھوٹ بولتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اصلیت صرف خیالوں IDEAS میں ہے چیزیں سب خیالات کی نقل ہیں۔ انسان مر جاتے ہیں۔ لیکن انسان ایک خیال کی صورت میں ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ جیومیٹری جو اس وقت نہایت مروجہ تھی، اس سے مثال دے کر اس نے کہا کہ نقطہ وہ ہے جس کا طول یا عرض نہ ہو۔ مجھے ایسا نقطہ بنا کر دکھاؤ جو تم بناتے ہو اس کا کچھ طول یا عرض ضرور ہوگا۔ چاہے کتنا ہی کم ہو۔ ایک لکیر وہ ہے جس کا طول ہو مگر عرض نہ ہو مگر تم ایسی لکیر کبھی نہیں کھینچ سکتے۔ جیومیٹری نقطے اور لکیر کی ان خیالی تعریفوں پر مبنی ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں ان چیزوں کی خیال کی نقل IMITATION ہیں۔ شاعر ان چیزوں کو دیکھ کر شاعری کرتا۔ اس لیے شاعری کی نقل کی نقل IMITATION OF AN IMITATION ہے۔ اصلیت سے دوگنا دور ہے اس لیے جھوٹی ہے۔

اس نے دوسری وجہ یہ دی کہ شاعری احساسات کی تبلیغ یا آبیاری کرتی ہے اور احساسات، انسان کی شخصیت کا کمزور ترین حصہ ہیں۔ انھیں عقل سے دبانا چاہیے۔ ٹریجیڈی TRAGEDY جو اس وقت کی عظیم ترین شاعری تھی اس پر اس نے شدید حملے کیے کہ وہ ڈر اور رحم PITY AND FEAR

کو بڑھاتی ہے۔ جو انسان کی شخصیت کو کمزور کرتے ہیں۔ وہ ایام یونان میں جنگ کے تھے۔ اور تمام فلسفہ یا ادب کا مقصد بہادر شہری بنانا ہوتا تھا۔ ہومر HOMER جو یونان کا سب سے بڑا شاعر ہو گذرا تھا۔ اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ کہ اس نے کون سا نیک کام کیا ہے۔ کس لحاظ سے قوم کی ترقی کی ہے؟ وغیرہ۔ اتنے بڑے فلاسفر کی شاعری پر اتنے شدید حملے سے کچھ کھلبلی سی مچ گئی۔ اس کا جواب اس کے اپنے قابل ترین شاگرد ارسطو ARISTOTLE نے دیا۔ کہ شاعری نقل نہیں کرتی، اصلیت کا خاکہ کھینچتی ہے۔ نقل IMITATION نہیں وہ نقشہ REPRESENTATION ہے۔

شاعر فوٹوگرافر کا کام نہیں کرتا، مصور کا کام کرتا ہے۔ نیز ٹریجیڈی ڈر اور رحم کو اکسا کر انہیں بڑھاتی نہیں۔ توازن پیدا کرتی ہے۔ اسے اس نے کیتھارسس CATHARSIS یعنی اسہال کہا۔ ارسطو کے اصول کی اب ہومیو پیتھی نے بھی تصدیق کر دی ہے۔ کہ جو چیز مرض پیدا کرتی ہے، وہی اس کا علاج بھی کرتی ہے۔ فرائیڈ FREUD نے بھی تو یہی کہا ہے۔ کہ احساسی صحت کا ذریعہ اظہار ہے۔ دباؤ نہیں۔ مثلاً اگر ایک بچہ اندھیرے سے ڈرتا ہے۔ تو اس کا یہ علاج نہیں کہ اسے اندھیرے سے دُور رکھا جائے۔ بلکہ اسے آہستہ آہستہ اندھیرے کا عادی بنایا جائے۔ افلاطون نے خود بھی تو اپنی دوسری کتاب لاز LAWS میں کہا تھا۔ کہ جب بچے بے چین ہو جاتے ہیں تو ان کو ہلایا جاتا ہے۔ آرام سے نہیں لٹایا جاتا۔ لیکن ارسطو کی مخالفت اسے پسند نہ آئی اور کہنے لگا کہ ارسطو اس بچھڑے کی مانند ہے جو ماں کا دودھ پی کر اسے دولتی مارتا ہے۔ اسی کیتھارسس کے اصول سے ہی ٹینی سن TENNYSON نے ایک نہایت دردبھری عورت کی بابت کہا۔ کہ اسے رونا چاہیئے نہیں تو وہ مر جائے گی۔ SHE MUST WEEP OR SHE WILL DIE

افلاطون کے وقت سے یہ بحث برابر چل رہی ہے۔ کہ شاعری کا اخلاق سے کیا تعلق ہے۔ کیا یہ اخلاق کو بناتی ہے یا بگاڑتی ہے۔ انگلینڈ میں سولہویں صدی کی نشاۃ ثانیہ RENAISSANCE کے زمانے میں گاسن GOSSON نے شاعری پر اعتراض کیے جن کا جواب سڈنی SIDNEY کو اپولوجی APOLOGY میں دینا پڑا۔ اٹھارویں صدی میں پی کاک PEACOCK نے حملہ کیا جس کا جواب شیلے SHELLEY نے دفاع DEFENCE میں دیا۔ انیسویں صدی میں یہ جنگ اخلاقیوں اور جمالیاتیوں کے درمیان چھڑی جو کافی دیر تک جاری رہی۔ ان کی تفصیل میں جانے کی یہاں نہ ضرورت ہے اور نہ ہی گنجائش ہے۔

یہ مسلّم امر ہے کہ شاعری مسرت بخشتی ہے۔ یہ تو افلاطون نے بھی کہا تھا گو تائید میں نہیں بلکہ تنقید میں ہم اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔ آپ نے مشاعروں یا کوی دربا روں میں دیکھا ہوگا کہ سامعین کس طرح سر جھومتے ہیں تحسین کے نعرے گونجتے ہیں کبھی کبھی تو سامعین آپے سے باہر بھی ہو جاتے ہیں۔ یہیں سے بحث چھڑتی ہے کہ شاعری کی مسرت، اخلاق کی ضد ہے یا تصدیق۔ اس کے حق میں یہ کہا جاتا ہے کہ شاعری مسرت آمیز نصیحت DELIGHTFUL INSTRUCTION یا نصیحت آمیز مسرت INSTRUCTIVE DELIGHT ہے۔

اس بحث میں پڑنے سے پہلے ہمیں دو ایک باتوں کو صاف کر دینا چاہیئے۔ شاعری میں شروع ہی سے کوئی مقصد نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ خود رو یا خود ساختہ چیز ہے۔ اس کے پیچھے کوئی ارادتاً مسئلہ یا اصلاح نہیں ہونی چاہیئے۔ کیٹس KEATS نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ہم ایسی شاعری سے نفرت کرتے ہیں جس کے پیچھے کوئی ٹھوس غرض ہو۔ شاعری کو فلسفہ، سیاست یا مذہب کا غلام نہیں ہونا چاہیئے، جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ پھر وہ شاعری نہیں رہتی۔ اب کم از کم ایک عظیم شاعر کو حکم نہیں دے سکتے کہ وہ فلاں مضمون پر نظم لکھے۔ عظیم شاعری ایک قسم کا ابال ہے جو خود بخود پیدا ہوتا ہے۔ غالب نے اسے فرشتے کا راگ (نوائے سروش) کہا ہے۔ وہ بار بار کہتا ہے کہ میں خود شاعر نہیں بنا بلکہ شاعری اپنے آپ میری ملازم بن کر آگئی کہ مجھے اپناؤ۔ جب بہادر شاہ ظفر نے اسے پچاس روپے ماہوار پر مغلیہ خاندان کی تاریخ کو نظم کرنے کے لیے کہا تو تنگدستی کی وجہ سے وہ مان گیا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ آدھی تاریخ مہر نیمروز لکھی۔ وہ بھی دو چار ماہ کا کام چار سال کے عرصے میں۔ اور پھر اسے چھوڑ دیا۔ اور رشید نرائن کو یہاں تک لکھ دیا کہ وہ شائع کرنے کے لائق نہیں ہے۔

یہی تو بحث ہے ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی میں۔ ادب دونوں کے لیے ہے۔ لیکن پہلے ادب کے لیے۔ اس کے بعد اگر عظیم ادب ہے تو وہ زندگی کے لیے بھی ہوگا۔ اگر اسے پہلے ہی زندگی کے لیے بنایا جائے تو وہ ادب نہیں رہتا۔ چاہے اس میں کتنے ہی اونچے اخلاق یا مذہب کی نصیحتیں درج ہوں۔ پراپیگنڈا بن جاتا ہے۔ شاعری خیالات سے نہیں بنتی۔ شاعری ایک قسم کی آگ ہے جو خیالات کو انگیز کر کے ان میں حرکت اور طاقت بخشتی ہے مثلاً ہمارے پاس تین نظمیں ہیں۔ کانٹے، پھول اور کربلا پہ۔ کربلا کا مضمون نہایت روحانی اور نصیحت آمیز ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس پر لکھی نظم دوسری دو نظموں سے اعلیٰ ہو۔ ممکن ہے کہ اگر وہ خود بخود شاعری ... مضمون نکالا تو وہ نظم ...

احساسات یا تصورات اس میں درج ہوں۔ اسی طرح کانٹے پر لکھی نظم پھل والی نظم سے بہتر ہو سکتی ہے لیکن اگر تینوں نظمیں نوائے سروش ہوں۔ یعنی شاعر کی مکمل شخصیت سے سفر کرتی ہوئی خلق ہوئی ہوں تو یقیناً کربلا پر تخلیق کی گئی نظم عظیم ترین ہوگی۔ اسی لیے تو کیٹس نے کہا تھا کہ اگر شاعری پتے یا پھول کی طرح خود بخود نہیں نکلتی تو وہ بے کار ہے۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ اس سے پہلے کہ ادب زندگی کے لیے ہو اس کا ادب کے لیے ہونا نہایت ضروری ہے

اب آئیے کہ ہم مسرت اور نصیحت کے مسئلے کو لیں۔ مسرت، شاعری کی تعریف DEFINATION ہے۔ اس کے بغیر وہ شاعری نہیں رہتی۔ ہر نظم کے لیے خوش کرنا ضروری ہے۔ چاہے اس میں کوئی نصیحت ہو نہ ہو۔ مسرت یہ طے کرتی ہے کہ وہ شاعری ہے یا نہیں اس کے بعد نصیحت یہ طے کرتی ہے کہ وہ اچھی یا معمولی نظم ہے۔ ڈرائیڈن DRYDEN نے کہا تھا کہ اگر مسرت شاعری کا اکیلا مقصد نہیں تو اس کا اعلیٰ ترین مقصد ضرور ہے۔ نصیحت کے لیے بھی یہی کہا جا سکتا ہے لیکن دوسرے درجے پر کیوں کہ شاعری مسرت کے ذریعے ہی سے نصیحت کر سکتی ہے۔ ہمیں عظیم شاعری کا تجزیہ کرتے وقت اس بات پر زور دینا چاہیئے کہ وہ مسرت کے ساتھ نصیحت کرے شاعری کئی طریقوں سے مسرت دیتی ہے۔ الفاظ سے، ان کی ترتیب RHYTHM سے، بحر و قافیہ سے، کنایہ و تشبیہ سے، ایک نامحسوس خیال کو ٹھوس بنا دینے سے۔ شکسپیئر نے کہا تھا کہ شاعری GIVES TO AIRY NOTHINGS A LOCAL HABITATION AND A NAME ہوائی لفظی چیزوں کو نام اور مقام بخشتی ہے۔

اگر شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ ایسی نظمیں لکھو جو کمزور قوم کو دلیر بنا دیں تو وہ اپنی تشبیہوں کے ذریعے ان لفظوں کو پُر زور بنا دیتا ہے

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

اب دیکھیے کہ شاعری میں خیال کہاں سے کہاں چلا گیا۔ نصیحت مسرت آمیز بن گئی۔ لیکن پہلے ہم فن پارہ سے محظوظ ہوتے اور پھر نصیحت کو سمجھتے ہیں۔ اگر شاعر کہنا چاہتا ہے کہ اگر قوموں میں نا اتفاقی ہوتی ہے تو دشمن اسے تباہ کر دیتے ہیں۔ تو وہ کہتا ہے

نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

خیال کیجیے کہ کتنا بلند اور محظوظ کن کنایہ اور تشبیہ ہے۔ اور دوسرے مصرعے میں کتنی روانی اور ترنم ہے۔ اگر ہم یہ کہہ دیں تری قسمت سے باغبانوں میں رزم آرائیاں ہیں یا اے بلبل نوا پیرا ہو۔ کہ تیرے ترنم سے کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا ہو تو کیا ہوگا؟ شعر آسمان سے زمین پر آگرا۔ الفاظ اور نصیحت وہی ہے۔ لیکن وہ مسرت نہیں اور جب تک مسرت نہ ہو شاعری کی نصیحت کارگر نہیں ہوتی۔ کبھی تو میں نے کہا ہے کہ ادب، زندگی کے لیے تب ہی ہو سکتا ہے جب وہ پہلے ادب کے لیے ہو۔ شعر پہلے شعر تو ہو پھر ہم دیکھیں گے کہ وہ نصیحت آمیز ہے کہ نہیں ایسی مثالوں پر تو ایک پورا مضمون لکھا جا سکتا ہے لیکن یہاں اتنی گنجائش نہیں۔

شاعری کے لیے مسرت آمیز ہونا نہایت ضروری ہے چاہے وہ غم زدہ ہی کیوں نہ ہو۔ علامہ اقبال کی "والدہ مرحومہ کی یاد میں" کو لیجیے کتنا غمگین مرثیہ ہے لیکن سچ مانیے کہ میرا اقبال سے قریب ترین ذہنی اور احساسی تعلق اسی نظم سے ہوا۔ اور یہ ذاتی تجربہ میں یہاں بیان کرنے سے دریغ نہیں کرتا کیوں کہ میں نے اسے پہلے ہی اپنی کتاب GHALIB AND IQBAL: A COMPARATIVE STUDY میں درج کر دیا ہے۔

نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہوا کہ میں گورنمنٹ کالج پسرور (ضلع سیالکوٹ) میں پروفیسر تھا۔ میرے بیوی بچے اپنے وطن گئے ہوئے تھے کہ مجھے ایک بچے کی موت کا دردناک خط ملا، یہ میری زندگی کا پہلا شدید غم تھا۔ محرم کے دن تھے۔ اس وقت اسکول اور کالجوں میں محرم کی چار رخصتیں ہوتی تھیں۔ پسرور میں میرا جی نہیں لگتا تھا اور میرے تمام دوست باہر گئے ہوئے تھے۔ سچ مانیے کہ میں چار دن گھر سے باہر نہ نکلا گو مجھے صبح و شام سیر کرنے کا شوق ہوا کرتا تھا۔ کوئی مجھ سے ملاقات کے لیے بھی نہیں آیا۔ مجھے ان چار دنوں میں اقبال کے اس مرثیے نے غم سے بچایا، ہر وقت یہی گنگنایا کرتا، یہاں تک کہ پوری نظم از بر ہو گئی۔ میں کیا اقبال کی اس نظم کا احسان بھول سکتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ چاہے آپ مانیں یا نہ مانیں کہ عظیم ترین شاعری عام طور پر غم ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور غم کا علاج بھی کرتی ہے۔ یہی تو ارسطو کا تھیس کا اصول تھا۔

علامہ اقبال ہی نے تو کہا تھا

مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ دردانگیز نالے ہیں

.پھر سے   خونِ جگر سے تربیت پاتی ہے سخنوری   جگر خوں ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ب مرزا غالب کو سنیئے سے

من از خویشتن با دلِ دردمند   نوائے غزل بر کشیدہ بلند

یں نے غزل کی بلند موسیقی اپنے درد بھرے دل سے کھینچی ہے) سے

اے کہ در نطقم روانی دیدۂ دانی کہ چیست   می خورم خون دل دمی ریزد از لبہائے من

جو تم میری زبان میں روانی دیکھتے ہو۔ جانتے ہو کہ یہ کیا ہے ؟ میں دل کا خون پیتا ہوں اور وہ میرے لبوں سے نکلتا ہے)
- غم خضرِ راہِ سخن بودہ است (غم نے میری شاعری کو راستہ دکھایا ہے)
- لی فزاید در سخن رنجے کہ بر دل می رسد (جو غم میرے دل کو لگتا ہے وہ میری شاعری کو ترقی دیتا ہے) سے

حسن فروغ شمع بہت دور ہے اسد   پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

میر تقی میر نے کہا سے

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے   درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

ں تک اقتباسات دیتا جاؤں۔ مارک انڈرے کہتا ہے کہ شاعری رنج و غم کی چھوٹی بہن ہے ہر شخص جو تکلیف اٹھاتا ہے شاعر ہے۔ ہر آنسو شعر ہے، اور ہر دل ایک نظم ہے۔ شیلے SHELLEY نے کہا کہ ہمارے خوش ترین نغمے وہ ہوتے ہیں جو غمگین ترین خیالوں کا اظہار کریں۔ ٹ گروم ROBERT GROM لکھتا ہے کہ شکستہ احساس ہی شاعری کو اکساتے ہیں۔ شوپن ہار SCHOPENHAURE نے کہا ہے کہ اگر یک PLUTARCH کے جذبات پورے ہو جاتے تو اس کی شاعری ختم ہو جاتی۔ کیٹس کہتا ہے کہ جب تک انسان کو دنیا کے غم بے آرام کرتے، وہ شاعری کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتا۔ اور ساتھ ہی وہ کہتا ہے کہ شاعری کا بلند مقصد یہ ہے کہ وہ انسان کی دوست بن کر اس ں میں تسکین دے اور اس کے خیالات کو بلند کرے۔ غالب بھی یہی کہتا ہے کہ شاعر خود غم میں مبتلا ہے لیکن اوروں کو تکلیف نہ دیے شاعر کہتے ہیں، پھول اس کے قارئین کے لیے۔ شاعر کو چاہیے کہ وہ غم سے خوبصورتی پیدا کرے۔ آگ سے باغ اور بدی سے نیکی۔
اصل پیچیدہ سوال یہ نہیں ہے کہ آیا شاعری مسرت بخشتی یا نہیں۔ کیوں کہ اس کے بغیر شاعری ہو ہی نہیں سکتی بلکہ یہ کیا نصیحت ہے۔ کیا یہ لوگوں کو نیک عقلمند اور خوش اعتقاد بھی بناتی ہے ؟ اگر بناتی ہے تو کیسے ؟ اور یہ کیسے مذہب یا اخلاقی قدروں سے ہے۔ میں نے ابھی ڈرائیڈن کا حوالہ دیا تھا کہ شاعری مسرت کے ذریعے نصیحت کرتی ہے۔ عام طور پر نصیحت کسی عمر میں بھی ہو بری ہے۔ چاہے وہ والدین یا اساتذہ یا واعظوں سے ہوئے۔ واعظ کا شاعری میں ہمیشہ خاکہ اڑایا جاتا ہے۔ سڈنی SIDNEY نے بڑے بات کہی تھی کہ نصیحت کرنے سے متحرک کرنا زیادہ بہتر ہے۔ شاعری ہمیں علم حاصل کرنے کے لیے متحرک کر کے خوشی دیتی ہے علم پر عمل کرنے کے لیے متحرک کر کے نیک بناتی ہے۔ پس متحرک کرنا ہی شاعری کا کام ہے۔ ہمارے دلوں اور احساسات کو اپیل کرتی تابوں میں درج مردہ نصیحتوں کو روح بخشتی ہے۔ اخلاق کے تمام اصول ہم دن رات گھر، اسکول، اور مذہبی مقامات وغیرہ پر سنتے ور کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ میں نے جب درجہ ششم سے اردو پڑھنا شروع کیا تو مجھے اب تک یاد ہے کہ قاعدہ میں لکھا تھا "سچ بولو، ت بولو۔ کسی کو دکھ مت دو" وغیرہ وغیرہ۔ کیا نیک بننے کے لیے یہ کافی تھا ؟ ایسی نصیحتیں مردہ سی ہوتی ہیں، ان میں جان نہیں یہ ہمارے علم میں اضافہ تو کرتی ہیں، ہمارے دلوں میں نہیں اترتیں۔ تبھی تو دل نے عقل سے کہا تھا سے

علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے   تو خدا جو خدا نما ہوں میں

ذریعہ حاصل کیے ہوئے سبق جب تک ہماری روح میں نہ اتریں اس نمک کی گٹھلی کی طرح ہوتے ہیں جس کو سبزی میں ویسے ہی ڈال دیا ب وہ سبق شاعری کے ذریعے ہمارے دلوں میں اترتے ہیں تو پسے ہوئے نمک کی مانند ہو جاتے ہیں جو سبزی میں گھل جاتا ہے۔ شاعری تے ہوئے بھی ہمیں یہ محسوس نہیں ہونے دیتی کہ وہ ہمیں کچھ سکھا رہی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ مذہب کی تقریباً تمام بڑی کتابیں شاعری میں

ہیں۔ شاعری اور مذہب کا اٹوٹ تعلق ہے۔ اقبال نے کہا تھا کہ شاعری جزویست از پیغمبری۔ سنٹاتنا SANTAYANA نے کہا ہے کہ اصلیت میں مذہب اور شاعری ایک ہیں۔ میتھیو آرنلڈ MATHEW ARNOLD ایک قدم اور آگے بڑھا اس نے کہا کہ آج ہم جسے مذہب کہتے ہیں اس کا اکثر حصہ شاعری میں بدل جائے گا۔ ڈاکٹر رچارڈز DR.RICHARDS کا عقیدہ ہے کہ شاعری اگر مذہب کی جگہ نہ بھی لے تب بھی اس کو زندہ کرے گی، اس میں جان ڈالے گی، وہ مذہب جو مندروں، مسجدوں اور گرجوں میں مردہ پڑا ہے۔

کیٹس نے کہا ہے کہ فلسفے کے اصول اصلی معنوں میں اصول نہیں بنتے جب تک وہ ہماری نبضوں کو نہ چھوئیں، اور ہمیں متحرک نہ کریں۔ ہم اپنے تمام فرائض جانتے ہیں لیکن ان پر عمل نہیں کرتے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہ فرائض ہمارے احساسات کا حصہ نہیں بن پاتے، صرف علم کا حصہ رہتے ہیں۔ شاعر ہمیں سکھانے کی کوشش نہیں کرتا، اگر وہ سکھانے کی کوشش کرے تو وہ شاعر ہی نہیں رہتا، واعظ یا پلیٹیشین بن جاتا ہے۔ وہ ہمارے علم میں اضافہ نہیں کرتا، وہ ہمارے اندر گھس جاتا ہے اور ہماری شخصیت کو بدل دیتا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ غصہ بری بلا ہے۔ واعظ تو اتنا ہی کہہ سکتا ہے کہ غصے سے بچو۔ لیکن شاعر AJAX کو پیش کرتا ہے جو غصے سے پاگل ہو کر بھیڑ بکریوں کو اپنا دشمن یونانی سمجھ کر مارتا جاتا ہے۔ جب حسد کا عبرت ناک نتیجہ دکھاتا ہوتا ہے تو شاعر اوتھیلو OTHELLO کو ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ جو حسد سے اندھا ہو کر اپنے سب سے قیمتی جوہر یعنی اپنی نہایت حسین اور پیاری بیوی ڈسڈی مونا DESDEMONA کو مار دیتا ہے۔ اور جب اسے اپنی غلطی کا علم ہوتا ہے۔ تو اپنے آپ کو۔ ایسے ڈرامے پڑھ یا دیکھ کر ہم اتنے متحرک ہوتے ہوتے ہیں کہ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ صرف ایک کہانی یا کھیل ہے اور منورما جو ڈسڈی مونا کا پارٹ ادا کر رہی ہے۔ ایک دو گھنٹے میں ہمارے سامنے ہنستی نظر آئے گی یا سریندر جو اوتھیلو بنا ہوا ہے، ہمارا دوست ہی ہے تبھی تو یہ ڈراما دیکھتے وقت ایک عورت اٹھ کر چلا اٹھی تھی اسے۔ بیوقوف تم اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ تمہاری بیوی بے قصور ہے تبھی تو ڈاکٹر جانسن جیسا ذہین اور روشن خیال شخص بھی کنگ لیئر KING LEAR میں کارڈیلیا CORDELIA کی موت برداشت نہ کر سکا اور باہر نکل آیا۔

کہاں تک مثالیں دیتا جاؤں۔ لب و لباب یہی ہے کہ شاعری ہمیں سکھاتی نہیں، متاثر کرتی ہے۔ بلیک BLAKE نے کہا تھا کہ جب انسان اور پہاڑ ملتے ہیں تو بہت کچھ واقع ہوتا ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ وقوع پذیر ہوتا ہے جب انسان اور شاعری ملتے ہیں بشرطیکہ شاعر عظیم ہو اور انسان شاعری میں دلچسپی رکھتا ہو کیا وجہ ہے کہ سکندر اعظم جیسا جرنیل اپنے معرکوں میں ہومر کی ایلیڈ ILIAD کو ہمیشہ اپنی جیب میں رکھتا تھا۔ اور اپنے استاد ارسطو جیسے فلسفی کو پیچھے چھوڑ جاتا تھا۔

اب تک میں اخلاق اور مذہب وغیرہ کا ذکر کرتا رہا ہوں لیکن موجودہ عہد میں یہ معلومات دقیانوسی ہو چکی ہیں۔ فرائیڈ FREUD کے بعد انسان کی اندرونی شخصیت کا کچھ گہرا مطالعہ ہو رہا ہے۔ آج کل ہم دلی یا ضمیری توازن یا تندرستی کی بات کرتے ہیں۔ دل ایک نہایت نازک ترازو سا ہے جو ہر ایک نظریے یا تجربے سے کم و بیش متاثر ہوتا رہتا ہے۔ دن بھر میں ہم درجنوں قسم کے واقعات کا سامنا کرتے ہیں غمی و خوشی، نفرت و محبت، خود غرضی و فراخدلی، غرضیکہ جب ہم رات کو بستر پر دراز ہوتے ہیں تو کچھ گھبراہٹ کا شکار ہوتے ہیں ہمارے دل میں کئی قسم کے جذبات ابھرتے ہیں اور کبھی کبھی ہم اس مجموعۂ اضداد کو سمجھتے ہوئے گم ہو جاتے ہیں، اور کچھ سوچ نہیں پاتے۔

شاعر اسی تجربے کو جو ہمارے لیے ایک معمہ ہوتے ہیں صاف دیکھتا ہے، اس کی آنکھیں تیز ہوتی ہیں، اور جو کچھ ہمیں دھندلا سا دکھائی دیتا ہے، اس کے لیے ایک مکمل تصویر بن جاتا ہے اور پھر وہ ہمیں مخاطب کرتا ہے:

؎ پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی — ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی
؎ تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ — جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی
؎ زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ — جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

اگر شاعر عظیم ہے اور ہم اس کی شاعری سے متحرک ہونے کی کیفیت سے گزرتے ہیں۔ تو شاعر ہمیں زندگی کا دلیری سے مقابلہ کرنا سکھاتا ہے۔ ہم بار بار زندگی کی کشمکش سے گھبراتے ہیں اور ہمارا دل قسم قسم کے جذبات کا شکار ہو جاتا ہے کہ یہ کیا زندگی ہے کہ پل بھر کا سکون اور مہلت نہیں۔ اسے

ت ہمیں واعظ یا اپدیشک سہارا نہیں دیتا۔ شاعری ہمیں زندگی کا راز بتاتی ہے۔ ؎

شکلیں جیون کو دیتی ہیں یاس بہارا اسے دوست — تیغ جب سان پہ آتی ہے رواں ہوتی ہے۔
تلخیِ گردشِ ایام سے ڈرنے والے — زندگی موت سے ٹکرا کے جواں ہوتی ہے

ر پھر ؎
ساحل کے سکوں سے کسے انکار ہے لیکن — طوفان سے لڑنے میں مزا اور ہی کچھ ہے

بال ہمیں بار بار کہتا ہے ؎ مصائب زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر۔

؎ تمنا آبرو کی ہو اگر گلزارِ ہستی میں — تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے
؎ پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی — ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

یہ اشعار نصیحت نہیں کرتے۔ الفاظ کی موزونیت، استعاروں کی برجستگی، اور سطروں کی روانی سے یہ ہمارے دل میں اتر جاتے ہیں اور ہمارے جانے بغیر ہمیں مؤثر کرتے ہیں۔ ہمارے جذبات کے مجموعۂ اضداد کو دھکیل کر باہر نکالتے ہیں، اور ہماری روح کو تواز نے دیتے ہیں۔ یہی تو ارسطو کا مشاء کیتھارسس تھا۔

ایک محبوب کی موت، زندگی کا سب سے زیادہ اہم المناک حادثہ ہے۔ جب ہمارے ہوش و حواس باختہ ہو جاتے ہیں، اور ہمیں نہیں سوجھتا کہ اگلا قدم کہاں اور کیسے رکھنا ہے، زندگی بے معنی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن شاعر کہتا ہے:

؎ موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی — ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی
؎ زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں — ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں
؎ ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں — جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں
؎ موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے — خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
؎ جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں — آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں
؎ یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح — مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

اور شاعر یہ سب اس وقت کہتا ہے جب اسے اپنی والدہ کی دردناک موت کا سامنا ہے اور والدہ بھی کون؟ شاعر کی اپنی [illegible] سنیے ؎

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا — گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا
دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات — تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

حمد

محمد علوی

(۱)

سُنو منہ اندھیرے کوئی بول اٹھا ہے
خدا تو بڑا ہے، خدا تو بڑا ہے
ہوائیں ترا نام لے کر چلی ہیں
ترا نام سُن کے اجالا ہوا ہے
کلی کھل اٹھی ہے تجھے دیکھنے کو
تجھے چومنے کو پرندہ اڑا ہے
شب و روز کب سے تجھے ڈھونڈتے ہیں
کبھی تو نظر آ کہاں چھپ گیا ہے
کہاں تک پکاروں، کہاں تک کہوں میں
خدا تو بڑا ہے، خدا تو بڑا ہے

(۲)

صبح کی سُرخی تری، شام کے منظر ترے
ساری زمینیں تری، سارے سمندر ترے
پانچ پہر چار سو گونج اذانوں کی ہے
تم ہی تری یاد میں مسجد و ممبر ترے
زندگی اور موت کا چلتا رہا سلسلہ
ہوتے رہے روز و شب کام برابر ترے
آج مگر خستگی کل سے زیادہ ہے کیوں
آج بھی یوں تو کرم کم نہیں مجھ پر ترے
کون سے در جاؤں میں تجھکو کہاں پاؤں میں
تیرے کئی نام ہیں اور کئی گھر ترے

● اے۔ آر۔ سی۔ ورنیا، تر د گجرات کالج ایلس برج احمد آباد

حمایت علی شاعر



دو نظمیں

(۱)

وہ کہہ رہے تھے کہ سرکار یہ نئی سوغات
خدا نے ہم کو عطا کی ہے ایک ایسی رات
کہ جب ہمارے لبوں پر تھی اپنے پیار کی بات
کہ جب ہماری محبت کو مل رہا تھا ثبات
ہمارے سامنے موجود تھی خدا کی ذات
وہ کہہ رہے تھے۔ مگر کوئی مانتا ہی نہ تھا
خدا کو جیسے کوئی شخص جانتا ہی نہ تھا

(۲)

اُن کا قصور صرف یہی تھا کہ اُن کے ساتھ
تا دُور راستے میں کوئی تیسرا نہ تھا
جب تیسرا ملا تو چھوٹا سا واقعہ
یارانِ شہر کے لیے افسانہ بن گیا
اور آج یہ خبر کسی اخبار میں پڑھی
اک نوجواں نے طیش میں اک قتل کر دیا

● سی۔ بی ۵۴ الفلاح سوسائٹی شاہ فیصل کالونی۔ کراچی ۲۵



الیاس احمد گدی

فتح پور لین، جھریا۔ ۸۲۸۱۱۱ (بہار)

چور

اندھیرے میں وہ سایہ اس کے بغل میں آکر بیٹھ گیا۔

"ماچس ہوگی یار تمہارے پاس۔؟"

اس کی بے تکلفی سے چڑنے کے باوجود اس نے جیب سے ماچس نکال کر بڑھا دی۔ دوسرے آدمی نے جیب سے ایک مڑا تڑا سگریٹ سلگایا۔ تیلی کی روشنی میں دونوں نے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھا۔ سگریٹ کا لمبا کش کھینچ کر وہ آدمی بولا۔

"آج کچھ ہاتھ نہیں لگا۔ لگتا ہے تمہارا بھی حساب خالی ہے"۔!

دوسرا آدمی چونک گیا۔ "کیا مطلب.....؟"

وہ ہنسا۔ "مطلب یار تم خوب سمجھتے ہو۔ بوہنی۔ کہیں ٹرائی بھی کیا تھا۔؟"

دوسرا چڑ گیا۔ "تم مجھے کیا سمجھتے ہو۔؟"

وہ پھر طنز سے ہنسا۔ "وہی جو تم ہو۔!"

"میں کیا ہوں۔؟" اس نے اونچی آواز میں ڈانٹ کر پوچھا۔

"وہی جو میں ہوں۔! مگر یار آج کل بہت مندا ہے۔ عجیب عجیب الٹے ایجاد ہوگئے ہیں۔ اب بجلا چوک کی دکانوں کو دیکھو۔ سب میں انٹرلوک لگا ہے سامنے تمہیں صرف ایک سوراخ ملے گا۔"

دوسرا آدمی اٹھنے لگا۔ "تم کیا مجھے اپنی طرح چور سمجھتے ہو۔؟"

پہلے نے اس کو پکڑ کر بٹھا لیا۔ "تم تو یار جھوٹ موٹ ناراض ہوگئے اگر چور نہیں ہوگے تو ڈاکو ہوگے!"

وہ جھنجھلایا ہوا بولا۔ "میں چور ڈاکو نہیں۔ ایک شریف آدمی ہوں"۔

وہ آدمی بڑے زور سے ہنسا۔ "شریف آدمی!..... ہا ہا شریف..... میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ جیسا شریف آدمی آدھی رات کو اس ویران سڑک پر کیا کر رہا ہے!"

"پریشانی کی وجہ۔؟"

"پریشان اس لئے ہوں کہ میری بیوی ایک تقریب میں گئی ہے۔ یعنی پارٹی میں، ابھی تک نہیں لوٹی۔"

"اکیلی گئی ہے۔؟"

"نہیں میں بھی ساتھ تھا مگر مجھے ایک ضروری کام پڑ گیا تو میں اس کو چھوڑ کر چلا آیا۔"

"تو اس میں پریشانی کی بات کیا ہے۔ ظاہر ہے وہ کسی گھوڑی میں ہوگی۔ جنگل میں تو ہوگی نہیں کہ اس کو شیر کھا جائے۔"

"مگر سوچو تو زمانہ خراب ہے۔ اگر آخری بس نکل گئی تو....... بڑی ضدی عورت ہے میں ڈرتا ہوں کہیں پیدل ہی نہ چل پڑے۔"

"ارے بھائی میزبان اب ایسے اتنی رات کو اکیلے آنے تو نہیں دیں گے"

"ہاں یہ ہو سکتا ہے؟"

کسی نے ٹارچ کی روشنی ان پر پھینکی۔

"کون ہو تم لوگ اور یہاں اندھیرے میں کیا کر رہے ہو۔؟"

وہ حوالدار تھا۔ نزدیک آیا۔ اور دوسرے آدمی کو دیکھ کر چونک گیا۔

"اچھا تو تم ہو۔؟ کب باہر آئے۔؟؟"

"باہر آئے تو حوالدار جی کوئی مہینہ بھر ہو گیا۔"

"یہاں کیا کر رہے ہو۔؟"

"جی یہاں!..... جی آرام کر رہا تھا۔"

"حرامزادے ٹھیک سے بات کرو۔ ورنہ یہ ڈنڈا دیکھتے ہو۔ تمہارے منہ میں گھسیڑ دوں گا۔" (خدا کا شکر ہے اس نے منہ ہی کہا)

"کہا تو سرکار کہ آرام کر رہا تھا۔"

"تم سالے....." حوالدار نے اس کو گریبان سے پکڑ کر اٹھا لیا

"یہ آرام کرنے کی جگہ ہے۔؟"

وہ آدمی اب بھی نہیں ڈرا — "اپنی قسمت میں تو دو ہی جگہیں آرام کرنے کے لئے ہیں۔ ایک تو ڈسپنسری کا برآمدہ اور دوسرے یہ باپ کی سڑک۔"

حوالدار اچانک دوسرے آدمی کی طرف متوجہ ہوا۔

"یہ کون ہے —؟ تمہارا ساتھی ہے؟؟"

"معاف کیجئے گا!" وہ آدمی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا، "معاف کیجئے گا میں اس کا ساتھی نہیں ہوں۔ میں تو اسے جانتا تک نہیں۔"

"ہوں!" — حوالدار بولا — "اور اس کے باوجود آدھی رات کو، اس اندھیرے پل پر بیٹھ کر اسے کیا اپنی ماں کا حال سنا رہے تھے —؟"

"حوالدار صاحب گالی مت دیجئے" — وہ اس ڈر سے سٹپٹا کر جلدی سے بول پڑا کہ کہیں گالیاں حد سے تجاوز نہ کرنے لگیں — "میں دراصل ایک مشکل میں پڑ گیا ہوں۔"

"وہ مشکل کیا ہے ذرا میں بھی سنوں —!"

چھدو بولا "اس کی بیوی ......"

"بھاگ گئی ہے!" حوالدار نے جملہ مکمل کر کے داد طلب نظروں سے اس آدمی کی طرف دیکھا پھر اپنی بات جاری رکھی — "اگر تمہاری بیوی بھاگ گئی ہے تو یہاں اندھیرے میں بیٹھ کر رونے سے کیا ہوگا۔ تمہیں تھانے میں رپورٹ لکھوانی چاہئے۔ اچھا مجھے بتاؤ۔ تمہارے گھر تمہارے کون کون دوست آتے ہیں۔ کس کس سے تمہاری بیوی کے سمبندھ بہت مدھر تھے۔ اور کیا گھر میں کوئی ایسا نوکر ......"

وہ آدمی گھبرا کر بولا "میری بیوی بھاگی نہیں ہے۔ پارٹی میں گئی تھی ابھی تک لوٹی نہیں ہے!"

"تب کیوں مرے جا رہے ہو —؟ پارٹی میں گئی ہے تو لوٹ آئے گی۔"

"جی وہ — جی اب دیکھئے نا رات گذر گئی ہے اب تک اس کو واپس آ جانا چاہئے تھا۔"

چھدو رہنا۔ بولا۔ "تم یار ناحق پریشان ہو رہے ہو۔ جاؤ جا کر آرام سے سو رہو۔ صبح اس کو میزبان خود ہی اپنی گاڑی سے چھوڑ جائے گا۔"

حوالدار نے اس کو ڈانٹا۔ "تم چپ رہو بے۔"

ٹھیک اسی وقت سڑک پر ایک اور سایہ نمودار ہوا۔ بہت دبلا پتلا آنکھوں پر موٹے شیشے کی عینک۔ بغل میں کاغذ کا یا شاید اخبار کا ایک پلندہ، ان کو دیکھ کر تیز تیز قدم رکھتے ہوئے اس نے نکل جانا چاہا۔ تبھی حوالدار کی کڑک دار آواز سنائی دی۔

"کون ہے —؟"

وہ آدمی رک گیا۔

"کیا بات ہے مسٹر! ذرا تمیز سے بات کیجئے"! اس آدمی نے اپنے تئیں کافی رعب دار آواز میں کہا۔

حوالدار تلملایا۔ مگر اس ڈر سے کہ پتہ نہیں یہ کسی کا چمچہ ہو۔ قدرے نرمی سے بولا۔

"کون ہو تم —؟ کہاں سے آ رہے ہو!؟"

"میں اخبار میں ملازم ہوں۔"!

"اتنی رات کو کہاں سے آ رہے ہو —؟"

"دفتر سے، ہمارا کام رات ہی کو ہوتا ہے —!"

چھدو خوش دلی سے بولا۔ "کام تو ہمارا بھی رات ہی کو ہوتا ہے۔"

حوالدار نے اس کو ڈانٹا۔ "تم حرامزادے اپنا منہ بند رکھو۔"

"ویسے!" — اخبار نویس بولا۔ "ویسے آج کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی ہے۔ دراصل مجھے بیرپور کوتوالی بھی جانا پڑ گیا تھا۔ ایک بہت ہی سنسنی خیز واردات ہو گئی ہے آج —!"

"کیا واردات ہو گئی ہے؟" حوالدار نے دلچسپی سے پوچھا۔ "مرڈر ......"

"نہیں ریپ کا کیس تھا۔" اخبار نویس لاپرواہی سے بولا۔ "آج کل ریپ کے کیس بہت عام ہو گئے ہیں۔"

"مگر یہ اپنی نوعیت کا ایک عجیب کیس تھا۔" رکشا پر جاتی ہوئی ایک اکیلی عورت کو تین غنڈوں نے چھرے کی نوک پر اتار لیا۔"

"وہ عورت اکیلی تھی"! —؟ اس آدمی نے گھبرا کر پوچھا۔

"جی ہاں اکیلی تھی!"

وہ آدمی اور بھی گھبرا کر جلدی جلدی پوچھنے لگا۔

"وہ عورت کیسی تھی —؟ کیا بہت خوبصورت تھی؟ کیا اس نے ہرے رنگ کی ساری اور اسی رنگ کا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ کیا اس کی پیشانی پر بائیں طرف چوٹ کا نشان تھا۔؟؟؟"

اخبار نویس متانت سے بولا۔ "میں نے اس عورت کو دیکھا نہیں کیونکہ میں جس وقت تھانے پہنچا اس وقت عورت کو ڈاکٹری جانچ کے لئے بھیجا جا چکا تھا۔"

وہ آدمی رک رک کر بولا۔ "نام —؟ نام تو معلوم ہوگا آپ کو......"

"ابھی نام کو پولیس نے صیغۂ راز میں رکھنے کو کہا ہے۔"

"اوہ — !" وہ آدمی بے چین سا ہوگیا۔ "دیکھئے اس کے بارے میں اور بتلایئے۔ اس کی عمر، اس کا حلیہ۔ آخر تھانے والوں سے آپ کی بات ہوئی ہوگی!"

"معاف کیجئے یہ سب باتیں میں آپ کو نہیں بتلا سکتا۔ پوری رپورٹ آپ کل کے جن جاگرن میں پڑھ لیجئے گا۔"

"مگر کم سے کم اس کا نام ...... ؟"

حوالدار نے اس کو ڈانٹا۔ "اتنے اتاولے کیوں ہو رہے ہو۔ آپ ہی تو ہوا ہے کوئی مرڈر تو نہیں ہوا"۔

"ریپ! ..... اوہ گوڈ ..... اس آدمی نے اپنا سر پکڑ لیا۔

"تو میں جاؤں — ؟" اخبار نویس نے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا۔

حوالدار بھی ایک ہی کائیاں تھا۔

"ہاں جایئے — مگر اپنے گھر نہیں تھانے — !"

"تھانے — ؟ آخر کیوں ..... میں نے کون سا جرم کیا ہے ؟"

حوالدار بے رخی سے بولا۔ "یہ سب وہیں پوچھنا"۔ پھر ان دونوں کی جانب مڑا۔ "اور تم لوگ بھی چلو"۔!

وہ آدمی گھبرا گیا۔ "آپ دیکھ رہے ہیں میں کتنی بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں اور آپ تھانے چلنے کو کہہ رہے ہیں"!

حوالدار ہنسا۔ "تمہاری مصیبت تھانے ہی میں دور ہوگی"۔

پولیس والے کو غصہ آگیا۔

"دیکھئے حوالدار! آپ کو کل پتہ چلے گا کہ کسی پریس والے سے الجھنا کیسا ہوتا ہے"

حوالدار نے ایک بھدی سی گالی دی اور اپنا ڈنڈا گھمایا۔ اس کو دیکھتے ہوئے اور تینوں بھیڑ بکریوں کی طرح چلنے لگے۔

تھانہ قریب ہی تھا۔ باہر کے گیٹ پر ایک سپاہی پہرے پر تھا۔ ایک بڑا سا ہال تھا جس میں غالباً تھانے کے منشی اور چھوٹا بابو وغیرہ بیٹھتے ہوں گے۔ کیونکہ ایک بڑے سے ٹیبل کے گرد چار پانچ کرسیاں تھیں۔ اور ٹیبل پر کھاتوں اور فائلوں کا انبار پڑا تھا۔ اس ہال سے لگا ایک کمرہ تھا۔ یہ بڑے بابو کا آفس تھا۔ جس میں بڑے بابو ٹیبل پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھے ہی بیٹھے سو رہے تھے۔ حوالدار نے باہر کے ہال میں ان کو روک کر بڑے بابو کو جگایا اور صورت حال سے آگاہ کیا۔ بڑے بابو جماہیاں لیتے باہر آئے۔ تینوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور پھر اندر گئے۔ حوالدار تھوڑی دیر میں باہر آکر چور سے بولا۔

"چل بے تجھے ہی ٹھکانے لگانے کو بلا رہے ہیں پہلے۔"

پولیس والا بولا۔ "ٹھہرو! پہلے مجھے بات کرنی ہے بڑے بابو سے"

"تم دونوں بیٹھے رہو یہاں چپ چاپ۔" حوالدار نے بے رخی سے انہیں ڈانٹ دیا۔

چور کو دیکھ کر بڑے بابو مسکرائے۔

"کہیے لوٹن بابو کب باہر آئے — ؟"

"باہر آئے تو حضور مہینہ بھر لگ گیا۔"

"یہاں کیا کرتے پھر رہے ہو ہمارے علاقے میں — ؟"

"جی میں! ..... جی کام کی تلاش میں ہوں۔"

"واہ بیٹا! آدھی رات کو کام ڈھونڈنے نکلے تھے — ؟"

چور ڈھٹائی سے بولا۔ "اب حضور آپ سے جھوٹ تو نہیں بول سکتے"

"اچھا تو اب سالے سچ سچ بتا جیب میں کتنا مال ہے ؟"

اس نے دو تین جیبوں کی تلاشی لی جس میں سو روپے کا ایک نوٹ نکالا اور ٹیبل پر رکھ دیا۔

"سالے اتنے میں تو چھوٹنے والے نہیں ہو۔"

چور نے پھر ادھر ادھر جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور دس کا ایک نوٹ نکال کر ٹیبل پر رکھ دیا۔

"اور نہیں ہے حضور —"

"اور نہیں ہے — ؟"

"نہیں!"

"حوالدار! ذرا اس سالے کو جھاڑو۔ کہتا ہے اور نہیں ہے۔"

حوالدار نے اس کی جیبیں دیکھیں۔ مگر نٹولی پھر بولا۔ کچھ نہیں ہے سرکار۔"

بڑے بابو نے نوٹوں کو فائل کے نیچے سرکایا اور بولے!

"تم سالے کوئی دوسرا دھندہ کیوں نہیں کرتے — ؟"

"ہاں حضور! میں بھی تنگ آگیا ہوں اس دھندے سے۔ رات رات بھر جاگو، گلی گلی گھومو۔ جس سڑک یا جس گلی کا کتا دیکھتا ہے وہی بھونکنے لگتا ہے۔ اس سے اچھی تو ڈکیتی ہے۔ سر شام کسی کے یہاں گھسے اصلی نقلی پستول دکھا کر کام کیا اور گھر جا کر مزے سے کھا پی کر سو رہے ——!

بڑے بابو مسکرائے۔ "اچھا بیٹا! اب کے دھر لئے گئے تو پانچ سال کے لئے اندر کر دوں گا۔ اب چل پھوٹ یہاں سے!"

وہ جیسے ہی باہر نکلا اخبار والا تیزی سے گھس گیا۔

"صاحب یہ بڑا ہی زیادتی ہے۔ آفٹر لا اینڈ آرڈر......"

"آپ لا اینڈ آرڈر کا مطلب جانتے ہیں؟ — یہ آدھی رات کو سڑکوں پر گھومنا!"

"دیکھئے۔ میں اخبار میں ملازم ہوں۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اخبار کا کام رات ہی کو ہوتا ہے۔"

بڑے بابو نے اس کو بڑی ٹھنڈی آنکھوں سے دیکھا۔

"اخبار والے تو — آپ سمجھئے کہ۔ ملک کے سب سے بڑے بلیک میلر ہوتے ہیں۔ کسی کی کمزوری پکڑائی یا کسی کا معاملہ پھنسا یا اور کام بن گیا۔"

اخبار والا اندر سے سہم گیا۔ ابھی ابھی پور تھانے کے ریپ کیس میں پکڑے گئے ایک لڑکے کا نام نہ چھاپنے کے لئے چار سو روپے دیئے تھے اس کے بوڑھے باپ نے۔ پچاس کے آٹھ نوٹ۔ وہ نوٹ ابھی بھی اس کی جیب میں پڑے تھے۔ وہ نرمی سے بولا۔

"دیکھئے! یہ بحث کرنے کا وقت نہیں ہے۔ مجھے جانے دیجئے۔ میری بیوی بچے پریشان ہوں گے۔"

بڑے بابو بھی اسی نرمی سے بولے۔ "دیکھئے نا آپ تو اخبار والے ہیں۔ آپ کو تو پتہ ہی ہوگا کہ آجکل اپرادھ انمولن ابھیان چل رہا ہے اور ہمیں اسپیشل قسم کے احکام ملے ہوئے ہیں۔ میں آپ کو رات بھر حوالات میں رکھوں گا۔ وہاں بھی خطرناک مجرم پہلے ہی سے موجود ہیں۔ صبح آپ لوگوں کو چالان کر دیا جائے گا۔ ظاہر ہے آپ بے قصور ہیں تو کورٹ سے فوراً چھوٹ جائیں گے۔"

اس جواب سے اخبار والے کا منہ سوکھ گیا۔ وہ اندر سے ٹوٹ چکا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولتے ہوئے پچاس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور ٹیبل پر رکھ دیا۔

"اب تو جانے دیجئے۔"

بڑا بابو اندر ہی اندر مسکرایا — "اتنے میں کیا ہوگا۔ ہم لوگ چار آدمی ہیں۔ آپ خود سوچ کر دیکھئے۔ آپ تو ہماری ہی لائن کے آدمی ہیں۔"

مجبوراً اس نے پھر ایک پچاس کا نوٹ نکال کر ٹیبل پر رکھ دیا۔

اور واپس مڑ گیا۔

اب اس پر کوئی روک نہیں تھی۔

جب وہ آدمی اکیلا بچ گیا تو ایک دم سے گھبرا گیا۔ گو چور نے جاتے جاتے اشارے سے نوٹ پکڑانے کی بات اس کو بتا دی تھی۔ اندر پہنچ کر وہ اتنا نروس ہو گیا کہ اس کے منہ سے آواز بھی نہیں نکلی۔ بڑے بابو نے اس کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر پوچھا۔

"تم اپنی بیوی سے پیشہ کرواتے ہو — ؟"

وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا — "کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"زیادہ بنو مت۔ تم اپنی بیوی کے ساتھ پارٹی میں گئے تھے — ؟"

"جی ..... جی ہاں!!"

"پھر اس کو اکیلے چھوڑ کر چلے آنے کا مطلب جانتے ہو؟"

"مجھے ایک بہت ضروری کام ......"

"کام کے بچے — تم ساری دنیا کو اُلّو سمجھتے ہو"

اب اس کی آواز نے ایک دم ساتھ چھوڑ دیا۔ اس نے گھبرا کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور پوری جیب الٹ دی۔ اس میں دو سو گیارہ روپے تھے

"دیکھئے حضور! میری مصیبت کو سمجھئے۔ میری بیوی کے ساتھ ریپ ہوا ہے۔ اب مجھے جانے دیجئے۔"

"بڑے بابو نے نہایت اطمینان سے روپے فائل کے نیچے سرکائے اور دلاسہ دینے کے سے انداز میں بولے۔"

وہ عورت جس کا ریپ ہوا ہے وہ تمہاری بیوی نہیں ہے۔ اس کا نام قمر النساء ہے۔ کچھ دیر پہلے فون آیا تھا۔

وہ کوئی جواب دینے کے بجائے لپک کر تھانے سے باہر نکل آیا پسینے سے شرابور۔ باہر نکل کر اس نے دیکھا چور اور اخبار نویس دونوں ایک بند دکان کے اوٹے پر بیٹھے تھے۔ وہ سب چلنے کو تیار ہوئے چور بولا "ذرا ٹھہرو میں صاحب کو سلام کر آؤں"۔ وہ بے دھڑک تھانے میں گھسا مگر فوراً ہی باہر نکل آیا۔ اور تیز لہجے میں بولا:

"سالے! ہم لوگوں سے لئے روپے آپس میں بانٹ رہے ہیں۔"

بہ خطِ شاعر



لطف الرحمٰن

بہت مزہ تھا اڑان میں بھی
یقین تھا دشتِ گمان میں بھی

جبینِ شب پر جو تھا منور
دیا جلا آسمان میں بھی

وہی اکیلا ہوا چمن میں
وہی ہے تنہا مکان میں بھی

چٹان میں بھی رواں ہے دریا
چھپا ہے دریا چٹان میں بھی

جو شہ تھے بازو بریدہ شل تھے
ہوا تھی بادبان میں بھی

وہی تھا آغاز انتہا بھی
وہی رہا درمیان میں بھی

جو جانتا تھا ہنر نظر کا
لچک نہ تھی کچھ کمان میں بھی

خود آگہی کو میری انا بہت ہے
کہ میرا حسن لاثانی بہت ہے

اسے دکھ کی فراوانی بہت ہے
کہ سناٹوں میں ویرانی بہت ہے

بہت مشکل نہیں ہے تیرا ملنا
مگر اس میں پریشانی بہت ہے

میں ہر منظر میں تجھ کو دیکھتا ہوں
مرے دل کی یہ من مانی بہت ہے

پیاسا ہے بہت یہ شامِ ہجراں
شبِ دریا میں طغیانی بہت ہے

گراں تر ہو گئی ہے جنسِ الفت
ابھی آدم کی ارزانی بہت ہے

جگر میں بھی لہو کم کم نہیں ہے
مری آنکھوں میں بھی پانی بہت ہے

بجا ہے آسماں کی خیر جاناں
مرے دل کو پریشانی بہت ہے

چلو تم بھی کسی کی جستجو میں
مگر یہ راہ انجانی بہت ہے

بچھڑ کے پھولوں پہ جیتے تھے
بچھڑ کے داغِ دل سوختہ تھے

دل تمہاری طرف چلے جب بھی
راستے ساتھ ساتھ چلتے تھے

تو جو اتنا قریب ہے تو ذرا
سمندروں میں چراغ جلتے تھے

ریت کا گھر بنا کے ساحل پر
موج کی دوستی سے ڈرتے تھے

کس کی خوشبو اڑا کے لائی صبا
ریت کی طرح ہم بکھرتے تھے

ناگہاں اداس راتوں کے
میری تنہائی کو ڈستے تھے

دھوپ دیوار سے اترتی تھی
ترے ساتھ ہم بھی ڈھلتے تھے

لمحۂ گل کو یاد کب رہا
جب خزاں آنکھ میں اترتے تھے

موت نزدیک ہے محبت کی
رائیگاں عمر کو ابھرتے تھے

آئی تو ہیں کوئی قیامت نہیں آئے
اس شہر میں اک سر بھی سلامت نہیں آئے
بس خیمۂ گل خاک ہوا فصلِ جنوں میں
پھولوں پہ کوئی رنگِ ملامت نہیں آئے

کیا جانے کس دشت کا پیوند ہوا ہے
اک شخص سرِ کوچۂ ملامت نہیں آئے

اب ٹوٹ کے صحرا میں برسنے کو ہوس ہے
اک گوشۂ دامن پہ ضمانت نہیں آئے

ہاں اب نہ رہی دار و رسن کو یہ پسند
الفاظ پیشِ نظر وہ قد و قامت نہیں آئے

وہ زخم ملے دل کو سرِ منزلِ قربت
اک لمحۂ جاں جیسے شکایت نہیں آئے

خود اپنی صدا بن کے نہیں ترکِ تعلق
خود ہم سے مرے دل کو ندامت نہیں آئے

میرے معاملے میں یہ قصہ عجیب رہا
ورنہ میں عمر بھر تو خود اپنا نصیب رہا

اس سے بچھڑ کے بات تو ہونی تھی مگر
کچھ دن مری نگاہ میں وہ بے سبب رہا

روٹھا تو ساتھ لے گیا خوابِ جہاں بھی
روٹھا تو عکسِ جاں کی طرح روز و شب رہا

کچھ بولنے کی رسم تو مشکل میں پڑ گئی
میں ناطقوں کے مسلک میں با ادب رہا

کس شہرِ بے ضمیر میں آیا ہوا ہے
اور درد کی طرح میں بیانِ جنبشِ لب رہا

الفاظ کی طرح مرا شہر حیا تھا
یہ دل بجھا بجھا بھی سو طلب رہا

اس سے خود اپنا چہرہ چھپانا پڑا مگر
یہ دل عجیب دل ہے بہت بے طلب رہا

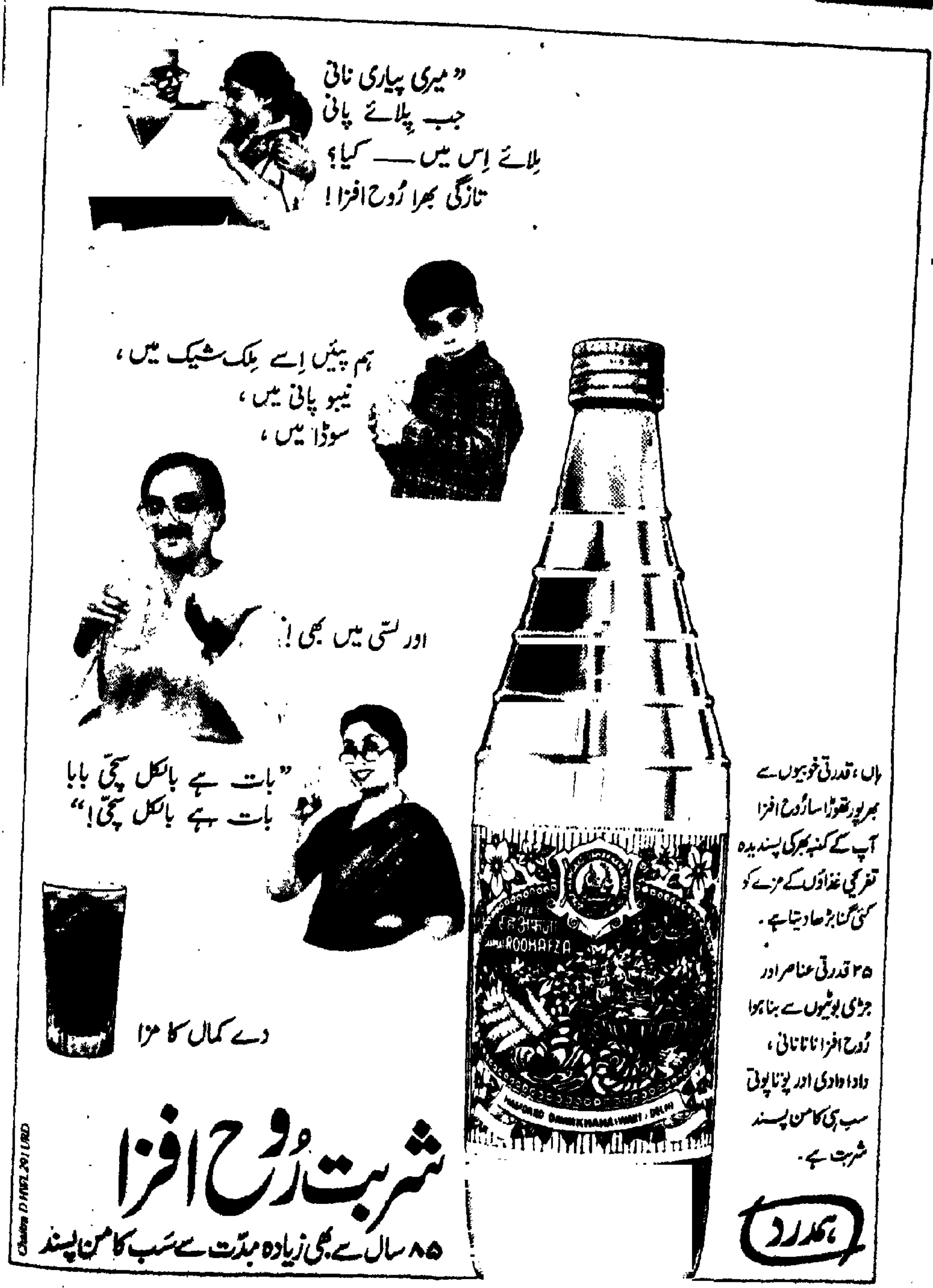
چہرہ روشن ہوا آنکھوں میں نقش پر ہے تری
ان منظروں کے جسم پہ تحریر ہے تری

تنہائیوں کی شام میں تنہا نہ رہ سکے
خاموشیوں کے ہونٹ پہ تصویر ہے تری

مجھ کو دل تباہ دو عالم میں ہے عزیز
بیٹھا ہوں خراب میں تعمیر ہے تری

خوابوں کو مل رہے ہیں حقیقت کے پیرہن
قصہ ہے میری ذات کا تفسیر ہے تری

دل کی لو لیں دعا در زنجیر آگہی
زخموں میں اب نغمہ ہے لمحہ پر ہے تری
کیسی شکست و فتح ہوا موج یقیں کی بات
زخم ہو رہا ہے دریدہ بکھیر ہے تری
قربت میں دور ہو کے ہم ہوا کس سے
ہر دم بچھڑ رہا ہے بہ صف ...


"میری پیاری نانی
جب پلائے پانی
پلائے اِس میں ــــ کیا؟
تازگی بھرا رُوح افزا!
ہم پیئیں اِسے مِلک شیک میں،
نیبو پانی میں،
سوڈا میں،
اور لسی میں بھی!
"بات ہے بالکل سچی بابا
بات ہے بالکل سچی!"
دے کمال کا مزا
ROOHAFZA
شربت رُوح افزا
۸۵ سال سے بھی زیادہ مدت سے سب کا من پسند
ہاں، قدرتی خوبیوں سے
بھرپور تھوڑا سا رُوح افزا
آپ کے کنبہ بھر کی پسندیدہ
تفریحی غذاؤں کے مزے کو
کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔
۲۵ قدرتی عناصر اور
جڑی بوٹیوں سے بنا ہوا
رُوح افزا نانا نانی،
دادا دادی اور پوتا پوتی
سب ہی کا من پسند
شربت ہے۔
ہمدرد



سریندر پرکاش
۴/۱۳، یوگی راج آشرم، ہنس بگرا مارگ، کالینہ، بمبئی ۹۸

قسط نمبر ۲

فسان

-یونین کے ساتھ بھی تمہاری وفاداری اور ایمانداری اپنی مثال آپ ہے۔ ہم تم سے بہت خوش ہیں۔"

"شکریہ"

"اس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ جو سچائی ہے وہ ہے۔ تم نے زندگی میں بڑی سٹرگل کی ہے۔ کامریڈ"۔

"اسٹرگل از پارٹ آف دا لائف۔"

"ہم نے بھی بہت دکھ جھیلے ہیں۔ پارٹی موومنٹ کے دنوں میں ہم انڈر گراؤنڈ ہو گیا تھا۔ جگہ جگہ بھٹکتا تھا۔ تب ہم کو معلوم ہوا آدمی زندگی بھر جس آئڈینٹٹی کے لئے بھاگ دوڑ کرتا ہے۔ وہی آئڈینٹٹی اس کے لئے ایک دن مصیبت بن جاتا ہے۔ اپنے آپ کو چھپانا مشکل ہو جاتا ہے۔ پولیس ہمارا پیچھے تھی اور ہم سب طرف اندھیرا مانگتا تھا۔ اسی بیچ ہم کو نیوز ملا کہ ہمارا وائف نے ہسپتال میں بچے کو جنم دیا اور خود مر گیا۔"

کامریڈ چکرورتی نے گلاس اٹھایا اور ساری شراب اپنے حلق میں انڈیل لی۔ "اوہ! آفتاب نے گہرے دکھ کا اظہار کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اپنا بھی گلاس خالی کر دیا۔ چکرورتی نے بوتل اٹھائی اور دونوں گلاسوں میں شراب انڈیلی۔ برف چھوڑی اور پھر سوڈا ملایا۔

"تم نے ٹھیک بولا۔ اسٹرگل از پارٹ، آف دا گیم۔"

"گیم نہیں کامریڈ چکرورتی۔ لائف۔"

"ایک ہی بات ہے۔ گیم از اے لائف اینڈ لائف از اے گیم"

"سرکاری ہسپتال میں تمہارا بچہ پیدا ہوا کامریڈ اور تمہاری وائف نے دم توڑ دیا۔ سوری رئیلی ویری سوری۔

پولیس نے سوچا ہم اپنی بیوی کا کریمیشن کے واسطے ضرور پہنچے گا۔ پرنتو نہیں۔ پارٹی کا طرف سے گرفتار ہونے کا حکم نہیں تھا۔ بہت سے کام ہمارا ذمہ تھا۔ ہم شمشان کا واسطے نہیں گیا۔ پولیس بہت ڈس اپوائنٹ ہوا۔

مائی پوئر وائف!!"

"ہاؤ سیڈ"

"ایک بات بولوں کامریڈ۔"

"بولو کامریڈ چکرورتی۔"

"موومنٹ اپنے زوروں پر تھا۔ کامریڈ بلگانن اور کامریڈ خروشچیف نے انڈیا وزٹ کیا۔ کچھ ہائی لیول کمپرومائیز ہو گیا۔ موومنٹ وِدڈرا ہو گیا۔ ہم سب کا مکس ری ایکشن تھا۔ کہ ہمارے کو ایک دن کامریڈ جوتیش بسن کا فون آیا۔ اس نے اپنے کو اپنے گھر پر بلایا۔ ہم گیا۔ اور اس نے ہم کو جھولے میں پڑا ہوا ایک بچہ دکھایا۔ بولا۔ یہ تمہارا بچہ ہے کامریڈ چکرورتی۔ پارٹی کی انسٹرکشن پر میں اس کو ہسپتال سے لے کر آئی تھی۔ تب سے یہ میرے پاس ہے۔ اب تم اپنے بچے کو لے کے جاؤ!"

میرا بچہ۔؟ ہم نے اپنے آپ سے پوچھا کیا یہ میرا بچہ ہے۔ مگر ہم اس کو لے کے آیا۔ پارٹی کا حکم۔"

"اب وہ بچہ کدھر ہے کامریڈ چکرورتی؟"

"وہ۔۔۔ راہل چکرورتی۔ مدھیہ پردیش میں ایک پروجیکٹ پر چیف انجینئر ہے۔ ہم نے اس کو ایجوکیشن کے لئے سوویت یونین بھیج دیا تھا۔"

"گڈ"

"گڈ کیا۔؟ وہ کیا میرا ہی بچہ تھا؟ یہ ہم آج تک سوچتا ہے۔"

"ہوں ہوں۔"

"یہ بورژوا اسٹیبلشمنٹ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ لیکن کیا کرتا۔ کامریڈ، ہم بہت تھک گیا تھا۔ بالکل ٹوٹ گیا تھا۔ وہ بچہ اس وقت ہمارے لئے بہت بڑا ایموشنل ری ہیبلی ٹیشن تھا۔ ان سب سیکری فائس کا وجہ سے پارٹی نے ہم کو ٹریڈ یونین ونگ میں بھیج دیا۔ اس کے بعد ہم کو روٹی کا مسئلہ نہیں رہا۔"

"ہوں ہوں۔ گڈ!"

"گذرگیا۔ وہ اب چیف انجینئر ہے۔ ڈی کلاس ہو گیا ہے۔ پرولتاری کلاس سے کٹ گیا ہے۔ وہ مڈل کلاس میں چلا گیا ہے۔ تم نے ٹھیک بولا کامریڈ۔ از اٹ آل پارٹ آف دا لائف' ارے! تم نہ پی رہے ہو۔ نہ کچھ کھا رہے ہو۔ یہ کباب کھاؤ۔ اٹ از رچ ان پروٹین۔ کیا سوچ رہے ہو۔؟"

"کچھ نہیں بس تمہاری زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا کامریڈ۔"

"اوہ۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ ہم نے تم کو وہ بات تو بتایا ہی نہیں۔ جب ہم کالج۔۔۔۔۔۔۔ پرنتو تم بھی تو۔ وہ پارٹیشن۔ او بابا۔ کتنا بلڈ! تم شمال مغرب کے لوگ۔۔۔۔"

"پارٹیشن تو آپ کے ادھر بھی ہوا تھا کامریڈ چکرورتی۔ ڈھاکہ بنگال سے کٹ گیا تھا۔" "لیکن ہم ادھر نہیں تھا۔ ہم نے کچھ نہیں دیکھا۔ ہم لوگ ادھر کلکتہ میں تھا۔ میرا گرینڈ فادر ڈھاکہ چھوڑ کر ادھر آ گیا تھا۔ بہت، بہت سال پہلے۔ مگر یہ مسلمان لوگ شالا بہت ڈرٹی ہے۔۔۔ اوہ آئی ایم سوری کامریڈ آفتاب۔۔ آئی مین تم۔ وہ انڈو مسلم پرابلم۔۔۔"

"نیور مائنڈ۔۔ سب چلتا ہے۔۔۔ میں۔۔۔"

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ اب ہم بہت تھک گیا ہوں۔ ہم سوچتا ہوں زندگی میں اپنے لئے۔ اپنا سیکنڈ وائف کے لئے۔ اس کا بچہ لوگوں کے لئے شالا کچھ بھی تو نہیں کیا۔ ایمانداری۔۔۔ وفاداری۔۔۔ اوہ بابا۔ یہ کباب کو تم نے ٹچ بھی نہیں کیا۔ اچھا لو، موہنہ کھولو، ایسے۔۔۔۔ یہ کچھ بات ہوا نا۔ کہو کیسا ہے؟ یہ فش ہے۔"

"ہم نے شام کا وقت ہی مسز چکرورتی کو بولا تھا۔ آج کامریڈ آفتاب آتا۔ اس نے مچھلی اور بھات بنایا۔ تم نے بنگالی مچھلی اور بنگالی بھات کبھی کھایا؟"

"کامریڈ چکرورتی۔"

"بولو کامریڈ آفتاب۔"

"تمہارے گرینڈ فادر نے ڈھاکہ چھوڑا۔ تم لوگ کلکتہ وا آ گیا۔ بنگال کا پارٹیشن ہوا۔ تمہارے لباس پر خون کا ایک چھینٹا بھی نہ پڑا۔ تمہاری آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہ ٹپکا۔ مگر تمہارا بھات اور تمہاری مچھلی ابھی تک بنگالی ہے۔ اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟"

"اس میں تکلف کا کیا بات ہے، کھانا تو کھانا ہی ہے۔ کھائے بغیر کیسے جیئے گا۔ تم کو معلوم وہ بورژوا، لنین پرولتاری ہر آدمی ایک وقت میں کھانے کے نام پر کیا کیا کھاتا۔ پرنتو کامریڈ آفتاب تم نے بھی اپنا کچھ نہیں بنایا۔ شادی بھی نہیں کیا۔ سر پر چھت بھی نہیں ہے۔ یا ایمان داری۔۔۔ یہ وفاداری۔۔۔۔ شمال مغرب کا لوگ انڈو مسلم پرابلم۔۔۔۔ توبہ رے بابا توبہ۔۔۔۔ یہ سب کیا ہوا۔ تم کو معلوم کامریڈ، فرانسس بین جنرل سیکریٹری کے پاس بلٹ پروف کار رہتا ہے اور معلوم ہے ہم نے ایک رات بموں سے بھرے ہوئے کمرے میں نکالی تھی اگر کوئی بم پھٹ جاتا تو۔۔۔۔۔ ان سب سیکری فائسز کے بدلے میں ہم کو کیا ملا! تم کو کیا ملا؟۔ لو گلاس خالی کرو وسکی بہت ہے۔ نو ورّی۔" "افسوس کرنے سے کیا فائدہ؟"

"پرنتو کامریڈ آفتاب۔ فائدہ کا ایک چانس ہے۔۔۔۔ اسے گلاس خالی بھی کرو نہ یار۔ یہ ہوئی نا بات۔۔۔۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہم نے تم کو ایک بات کرنے کے لئے بلایا تھا۔"

ایکا ایکی آفتاب کو ایک دھکا سا لگا تھا۔ وہ بہت پی گیا تھا۔ کامریڈ چکرورتی اس کے لئے ایک اور پیگ بنا رہا تھا۔

"بولو۔۔۔"

"بات یہ ہے شالا بات موہنہ سے نکل جاتا ہے۔ پھر کہاں سے کہاں پہنچتا ہے۔ کامریڈ آفتاب، تم نے کس سے اسٹرائیک کے بارے میں کچھ کہا تھا؟"

"کیا کہا تھا۔؟ کس سے کہا تھا۔؟"

"یہ تم یاد کرو تم نے کس سے کہا تھا۔ یہ سٹرائیک مزدور کا ن کے لئے نہیں ہے۔ کارخانہ دار کے کہنے پر پیسے دے کر کروائی گئی ہے۔ تاکہ ملیں کچھ مہینے بند رہیں اور سرمایہ داروں کے گوداموں میں پڑا اسٹر رہا مال پروڈکشن بند ہونے کی وجہ سے نکل جائے۔ ورنہ وہ تباہ ہو جائیں گے۔"

"کہا تھا۔ اور یہ سچ ہے۔ کامریڈ چکرورتی۔ ہم اور تم یہاں بیٹھے شراب پی رہے ہیں۔ کباب کھا رہے ہیں۔ تمہارے کچن میں تمہاری سیکنڈ وائف بنگالی مچھلی اور بنگالی بھات بنا رہی ہے اور مزدوروں کے گھر کے چولہے میں سے دھواں اٹھنا بند ہو گیا ہے۔ آج سٹرائیک کو چار مہینے ہو گئے ہیں۔ کوئی نتیجہ نہیں۔ مزدور گھر گھر جا کر بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔۔۔۔ تم سے یہ کس نے کہا؟"

"کامریڈ ماسٹر نے" "بات چیف تک پہنچ گئی ہے۔ اس نے مجھے کہا کہ میں تم کو سمجھاؤں۔ بات موہنہ سے نکالنے سے پہلے سوچ لیا کرو کہ کانسی کوینسز کیا ہو سکتے ہیں۔"

"چیف تم کو کب ملا تھا کامریڈ چکرورتی؟"

"کل رات۔۔۔۔ کل رات ہم انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اکٹھے تھے۔ کامریڈ ماسٹر کا سب سے چھوٹا بیٹا ہنی مون منانے کے لئے سوئٹزرلینڈ جا رہا تھا۔ اپنی دلہن کے ساتھ۔ ان کو سی آف بولا اور پھر ہم دونوں کامریڈ ماسٹر کی بلٹ پروف کار میں واپس آیا۔ جبھی ہم نے اس کو بولا۔"

جیسے دھماکہ سا ہوا۔ آفتاب اپنی کرسی پر سے اٹھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں

اب سے بھرا ہوا گلاس زمین پر دے مارا۔ چھناک کے ساتھ ہی شیشے سب
ے سوچا۔

آئی ایم ٹ، کامریڈ دتا ماسٹر۔ ہی از اے باسٹرڈ۔ بیس برس پہلے وہ سکول ماسٹر تھا۔ ایک سٹرائیک کے سلسلے میں پارٹی کے قریب آیا۔ پھر اپنی ہمارے ٹریڈ یونین کا لیڈر بن گیا۔ اتنا پاور فل لیڈر کہ پارٹی اس کا کچھ سکتی۔ اس کے سامنے بے بس ہے۔ آج اس کا بیٹا ہنی مون منانے سوئیزرلینڈ جاتا ہے۔ وہاں کیا اس کے باپ کا سوس اکاؤنٹ ہے؟ میں بھی بسے ہو کامریڈ چکرورتی۔ جہاں آدھی سے زیادہ آبادی کو صرف کا آدھا پیٹ کھانا کھا کر چوبیس گھنٹے گزارنے پڑتے ہیں۔ کھیتوں میں ہے۔ کانوں میں زمین کی کوکھ میں گھس کر کوئلہ نکالنا پڑتا ہے۔ جہاں سانس کل ہوتا ہے۔ اور اس ملک کی ایک ٹریڈ یونین کا لیڈر دتا ماسٹر اپنے بیٹے ن منانے کے لئے سوئیزرلینڈ بھیجتا ہے۔ بے ایمان۔۔۔ غنڈے۔۔

۔۔۔"

آفتاب ہانپنے لگا تھا۔ کامریڈ چکرورتی مارے خوف کے بالکل زرد پڑ گیا اب ایک بار پھر گیا۔

" اس کی ماں کی بلٹ پروف کار کی تو۔۔۔۔"

ہم کو۔۔۔ ہم کو ہارٹ اٹیک آجائے گا۔ کامریڈ آفتاب۔ تم شمال ۔۔۔۔ انڈو مسلم۔۔۔۔ بابا رے بابا۔۔۔۔"

ورتی نے اپنے دل پر دایاں ہاتھ رکھا اور سر جھکا لیا۔ پھر دھیرے سے بڑبڑانے لگا۔

"ہم کیا کرے گا رے بابا۔ چیف ہم کو بولا۔ ہم تم کو بولا۔ اپنا موہنہ بند اونچا بولتا تم۔ پارٹی آرڈر۔ چیف نے بولا۔ ہم نے کچھ نہیں بولا رے بابا یڈ ہمارا بیک گراؤنڈ جانتا۔ ہم تو اپنی وائف کا کریمیشن میں بھی نہیں آیا۔۔

؟۔۔۔ پارٹی آرڈر۔۔۔۔"

ورتی سبک سبک کر رونے لگا تھا۔

آئی ایم سوری کامریڈ۔۔۔ نہ جانے مجھ کو کیا ہو گیا تھا۔"

کچھ نہیں کامریڈ شراب۔۔۔ شراب بھی اور تمہارا ایریا کا اپنا ٹمپرامنٹ ے کا ساؤتھ یا کس ذرا بڑا ہوتا ہے۔"

میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔ ہمارا خون ذرا جلدی گرم ہو جاتا ہے لیکن کچھ نہیں رکھتے۔ بس تم کو بتاتا ہوں۔ میں نے دتا ماسٹر سے نمٹنے پکا فیصلہ کر رکھا ہے۔ میں اس سے ٹکرا جاؤں گا اس کے دن اب گنتی کہ وہ مزدور کے خون پر عیش نہیں کر سکتا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے ون فار وارڈ اور پھر کھانا کھائیں گے۔"

چکرورتی نے ایک نیا گلاس اٹھایا۔ دونے پیگ بنائے اور دونوں نے اپنا اپنا گلاس اٹھایا اور چکرورتی بولا۔

"مزدور اتحاد۔۔۔۔۔۔"

"زندہ باد"

"دونوں نے گلاس ٹکرائے"

"لال سلام"

دونوں نے بیک آواز کہا۔

"مسٹر آفتاب چند آپ اپنی سٹیٹ منٹ دیں گے۔؟"

اسنے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ اسنے دیکھا اس کے بیڈ کے قریب ایک پولس انسپکٹر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کلپ بورڈ تھا۔ جس میں سفید کاغذات لگے ہوئے تھے۔ مگر اس میں ہونٹ تک ہلانے کی سکت نہ تھی۔ اسنے آنکھوں کی پتلیوں کو حرکت دی۔ انسپکٹر کے پیچھے ایک باوردی کانسٹبل کھڑا تھا۔ اور قریب ہی ایک نرس کھڑی تھی۔

"یہ سب کیسے ہوا؟" انسپکٹر نے مکرر پوچھا۔

آفتاب تھوڑی دیر انسپکٹر کے چہرے پر دیکھتا رہا۔ پھر اسنے اٹھنے کی کوشش کی اور اس کا سارا جسم درد سے پھٹ پڑا۔ نرس نے اسے سہارا دینے کی کوشش کی مگر کوئی فائدہ نہیں وہ زور سے کراہا۔ "اوہ۔ یہ۔۔۔ یہ سب کیا ہو گیا۔؟" اسنے اپنے آپ سے سوال کیا۔

"کیا آپ کو کچھ یاد نہیں۔؟" انسپکٹر نے ہمدردی سے پوچھا۔ (باقی آئندہ)

تابش مہدی

خِرد کی بادشاہی سے بچانا
مرے مولا! تباہی سے بچانا

خداوندا! جوانوں کو ہمارے
مزاجِ خانقاہی سے بچانا

جو تجھ سے بے نیازی کا سبق دے
تو اس فرمانِ شاہی سے بچانا

ترے در کی گدائی چاہتا ہوں
مجھے تمناتِ شاہی سے بچانا

بہت محبوب ہے تابشؔ خدا کو
کسی کو قرض خواہی سے بچانا

● مکتبۃ الایمان، دیوبند (یوپی)



رؤف خیر

آسماں کے نہ ہوئے اور زمیں کے نہ رہے
آج ہم تجھ سے بچھڑ کر تو کہیں کے نہ رہے

کون کہتا ہے کہ اصحاب یمیں کے نہ رہے
ہم وہ مجرم ہیں جو کبھی شمر لعیں کے نہ رہے

لوگ کیا سادہ ہیں ہر بُت کو خدا کہتے ہیں
یہ تقاضے ہی کبھی اپنی جبیں کے نہ رہے

آسمانوں کی بلندی پہ نظر ہے اس کی
اب وہ انداز ترے خاک نشیں کے نہ رہے

نام لکھتے ہیں نقط پُر کھوں کی دیواروں پہ
خوش گماں ہیں وہ کچھ اتنے کہ یقیں کے نہ رہے

خیرؔ وہ چہرے نقابیں ہیں انا کی جن پر
آئینے کے نہ رہے آئینہ بیں کے نہ رہے

● دلاور شاہ نگر، رسالہ بازار، گولکنڈہ حیدرآباد



فاروق شفق

کہاں تک ایک سے چہروں کا سامنا کرتے
تو تھک کے بیٹھ گئے ہم بھی اور کیا کرتے

بھی حویلیاں ہنستی نہیں ہیں شہروں میں
یہاں تو عمر ہی گذری ہے تجربہ کرتے

سبھی مکان تھے کچے ہماری بستی میں
جب آئیں بارشیں مل جل کے سب دعا کرتے

میں خود بھی چھپ سا گیا ہوں بہت سے چہروں میں
یہ چہرے مجھکو کبھی مجھ سے آشنا کرتے

جو ہم سے جیسے ملا ہم بھی اس سے ویسے ملے
بھلے برے کا یہاں کیسے فیصلہ کرتے

● جی۔ ۸۵۱/۲۷، دھان کھیتی، گارڈن ریچ کلکتہ ۲۴

ندا فاضلی

حسن نعیم — ایک ادبی المیہ

سن نعیم ابھی کچھ دن پہلے تک بمبئی کی ادبی محفلوں میں ہر جگہ دکھائی دیتے تھے، بولتے ہوئے، شعر سناتے ہوئے۔ شاعری پر بحث کرتے ہوئے گورا میانہ قد، چھریرا شریر، پہنے دنوں اور زیادہ پرکشش رہے ہوں گے۔ وہ ہمیشہ گھٹی ہوئی دھیمی آواز میں بات کرتے تھے جس کو تیز چمکیلی آنکھوں ڈا اور دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی کے آتار چڑھاؤ سے پر بھاؤ شالی بناتے تھے۔ وہ اپنے انداز اور ڈھنگ سے دور سے پہچان میں آتے تھے۔ شاعری سے انہیں ا۔ شروع سے ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ وہ اسی کے لئے جیے اور اسی کے لئے مرے لکھنے کی رفتار پہلے ہی سے کم تھی، عمر کے ساتھ یہ اور بھی کم ہوتی گئی ت رفتاری کی وجہ سے شاعری کے تعلق سے ان کی شعوری سنجیدگی تھی۔ اب صرف پہلے کی کہی ہوئی غزلوں میں ہی زبان و بیان کی نوک پلک سنوارتے ے۔ جب بھی ملتے، پہلے کسی پرانے شعر میں کسی لفظ کی تبدیلی اور اس کی اہمیت پر بھاشن دیتے اور پھر بعد میں نئے شعر کی طرح اسے سناتے اور اتے۔

یس پچیس سال پہلے ان کا ایک مجموعۂ کلام اشعار کے نام سے شائع ہوا تھا اس کے بعد کوئی دوسری کتاب نہیں آئی۔ انتقال سے پہلے پرانی غزلوں غزلیں جوڑ کر ایک نیا مجموعہ ترتیب دے رہے تھے۔ لیکن اس کی اشاعت انہیں دیکھنا نصیب نہیں ہوئی۔ ان کے شعروں کی تازگی اور سوچ کو جذبہ بنانے مانے اپنے زمانے میں پڑھنے والوں کو متوجہ کیا تھا۔ آزادی کے بعد اردو غزل میں ہیئت و مواد کی جو تبدیلیاں ظاہر ہو رہی تھیں، ان کی پرچھائیاں ان کی غزلوں میں بھی دکھائی دیتی تھیں ان کا نام بھی نئی غزل کے معماروں کی فہرست میں نظر آتا تھا۔ لیکن اپنی شاعری کے بارے میں ی رائے تھی اس کے مطابق ان کی قدر و قیمت نہیں ہوئی۔ وہ اپنی رائے کو نہیں بدل سکے اور پڑھنے والے ان کی رائے میں نہیں ڈھل سکے۔ ان کی دشمنی کی بنیاد پر بھی ان کی رائے تھی۔ جو ان سے اتفاق کرتا تھا وہ دوست، جس کو ذرا بھی اختلاف ہوتا وہ ہمیشہ کے لئے دشمن بن جاتا۔

ن کی پہلی اور آخری کتاب کا ہندی ایڈیشن غزل نامہ، کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کی بھومیکا کیدار ناتھ سنگھ نے لکھی تھی۔ اس میں انہوں نے حسن عروں کی خوب تعریف کی تھی۔ کیدار ناتھ سنگھ نے ان کی غزلیں پڑھ کر اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ لیکن حسن نعیم اس رائے کی وجہ سے بنا پڑھے ان ن کو پسند کرتے تھے۔

حسن نعیم کا زندگی سے ہر رشتہ غزل کے ذریعے قائم تھا۔ چالیس پینتالیس سال تک انہوں نے اسی کو ہر رشتہ کی بنیاد بنایا۔ اور سانسوں کی ساری پونجی نلنے سنوارنے میں لٹا دیا۔ گھر چھوڑا، بڑی بڑی نوکریاں چھوڑیں، رشتے ناتے توڑے، دوستوں کو دشمن بنایا، غریبی کا دکھ اٹھایا۔ مگر یہ آرٹ بھی عجیب ہے ود چاہت سے زیادہ چمتکار کا طالب ہوتا ہے۔ کہتے ہیں غالب کی ساری اچھی غزلیں جن پر آج ان کی شہرت اور عظمت کا مدار ہے ان کے جوانی کے دنوں ریں ہیں تحریر میں تماشائیوں کے گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے والا دنیا کا مشہور ڈرامہ نویس بن جاتا ہے۔ اور اسی عہد کے عالم ادیب بین جونسن جو جاہل سمجھتے تھے آج تاریخ میں اپنے گیان کے بجائے شکسپیئر کے گیان کے حوالے سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ کبیر داس، جون کیٹس، ہیگل ہرمن ملویل ت ایسے ہی معجزات کی کچھ مثالیں ہیں۔ فن ملک نہیں ہر گھر چھوڑنے والا اچھا تمابدہ بن کر نہیں لوٹتے۔ حسن نعیم اس راز سے واقف تھے۔ انہوں نے خود کہا ہے سے جو فن کو دفا دیتا ہے۔ وہ درد بخش جو من کو شکار دیتا ہے۔ حسن نعیم کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ انہوں نے غزل کو چاہا پر غزل نے انہیں اتنا

نہیں سراہا۔ ہر دیے میں تیل کی مقدار کے حساب سے روشنی ہوتی ہے۔ حسن نعیم کو قدرت کی طرف سے جتنا تیل ملا تھا وہ اتنا ہی جل سکتے تھے۔ وہ بھی جلے روشنی کا ایک دائرہ بھی بنا۔ لیکن اس روشنی میں اپنے الفاظ تلاش کرنے کے بجائے، وہ دوسروں کی نفی میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے اپنے لئے کم لفظ ڈھونڈے۔ دوسروں کے لئے زیادہ جملے تراشے۔ وہ غالب اور فراق بننے کی تمنا دو دو میں پورے حسن نعیم بھی نہیں بن سکے۔ حالانکہ ان میں حسن نعیم بننے کے پورے امکانات تھے۔ آدمی ذہین تھے۔ پڑھے لکھے تھے۔ دنیا دیکھے ہوئے تھے۔ اچھی بری شاعری پر ان کی نظر بھی تھی۔ لیکن اپنے مزاج کے ہاتھوں مجبور تھے۔ اس مزاج نے دو صرف انہیں نت نئی الجھنوں کا شکار کیا۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بھی کمزور کرنا شروع کر دیا۔ یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ تھا۔ وہ پوری اردو کی شاعری کی تاریخ میں صرف دو شاعروں کو ہی مانتے تھے۔ ان دو میں پہلے غالب تھے اور دوسرے وہ خود تھے۔ وہ غالب کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے تاریخی اعتبار سے مجبوراً غالب کا نام پہلے لیتے تھے۔ اس کا انہیں افسوس بھی تھا اور اس کا اظہار بھی وہ اکثر کیا کرتے تھے۔ غالب کو کھلے طور پر تو برا نہیں کہتے تھے لیکن شراب کی نجی محفلوں میں اپنے شعروں میں جدید فلسفہ، سائنس اور نفسیات کے پوشیدہ پہلوؤں کو اس طرح اجاگر کرتے تھے کہ بے چارہ غالب شرمندہ ہو کر ان کے پیچھے کھڑا ہونے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

حسن نعیم عظیم آباد کے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اپنے دور کے دوسرے نوجوانوں کی طرح، انہیں ملازمت کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکنا نہیں پڑا۔ اچھی سے اچھی ملازمتیں ہمیشہ ان کے آگے پیچھے رہیں۔ وہ گنتی کے ان چند خوش قسمت ہندوستانیوں میں تھے جنہیں اپنی پسند اور مزاج کے ذریعہ معاش کے انتخاب کی آزادی حاصل تھی۔ اس آزادی کے استعمال میں انہوں نے دنیا کے ایک بڑے حصے کی سیر کر لی۔ لیکن وہ جہاں بھی گئے غزل سے ان کا عشق بدستور قائم رہا۔ وہ پہلے شاعر تھے اور بعد میں اور کچھ۔ اس دوران جب بھی ان کے سامنے غزل اور ملازمت میں کسی ایک کے چناؤ کا مسئلہ آیا انہوں نے ہمیشہ غزل کا ساتھ نبھایا۔ غزل ان کے یہاں صنفِ شاعری کے علاوہ اپنے طور سے زندگی کرنے کے اسلوب کی علامت بھی تھی۔ اس کے علاوہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کو ہر وقت تیار تھے۔ جب ستارے ساتھ دیتے ہیں تو ان دیکھے ان جانے راستے بھی روشن ہو جاتے ہیں۔ حسن نعیم راستے بدلتے رہے۔ اور وقت ہر نئے موڑ پر ان کا استقبال کرتا رہا۔ دہلی سے اچاٹ ہوئے تو امریکہ میں ہندوستانی سفارت خانے سے منسلک ہو گئے۔ دس بارہ سال وہاں رہے۔ جب ان دنوں وہ امریکہ سے ہندوستان چھٹیاں گزارنے آتے تھے۔ تو بمبئی، علی گڑھ، الہ آباد، پٹنہ ان کے سفر میں شامل ہو گئے تھے۔ ان علاقوں کے ادیب اور شاعر ان کے اردگرد ہوتے۔ ان کے لئے محفلیں منعقد ہوتی تھیں، شامیں سجائی جاتی تھیں۔ وہ ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے۔ امریکہ میں ان کی آزاد مزاجی نے سفارتی اصولوں کی سیادت میں محدود ہونا گوارہ نہیں کیا۔ وہ وہاں کی سماجی زندگی میں شامل ہونے لگے۔ کالے اور سفید کی نسلی سیاست میں ان کی دلچسپی انسانیت کی عالمی قدروں پر ان کے یقین کا ثبوت تھی۔ ان کی اس دلچسپی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ لیکن وہ اس کے باوجود مسلسل کالے ادیبوں اور شاعروں کے باہمی اجتماعات میں، ہندوستان کی نمائندگی کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ امریکہ سے سعودی عرب کے سفارت خانے میں منتقل کر دیئے گئے۔ امریکہ کے چہل پہل کے ماحول کے بعد عرب کے ریگستانوں میں اونٹوں کی رفتار سے گزرنے والے صبح و شام میں انہیں گھٹن ہونے لگی۔ اس گھٹن نے ان کے دل میں گھر کی یاد اور ذہن میں تہذیبی فاصلوں کو زیادہ گہرا کر دیا

وہ تمہیں ڈھونڈ رہا بازارِ دلی میں نعیم　　　تم نہ جانے کون سے جنگل میں جا کے کھو گئے

عرب میں تین حج کرنے کے بعد بھی جب ان کی بے چین طبیعت کو سکون نہیں ملا تو وہ بنا سوچے سمجھے ایک دن استعفیٰ دے کر دہلی واپس آ گئے۔ اتنے سالوں کی اتنی اہم سروس سے اچانک علیحدگی ان کے جاننے والوں کی نظر میں مناسب نہیں تھی لیکن حسن نعیم زندگی سے کھیلنے کے عادی ہو چکے تھے۔ اور زندگی ان کے ساتھ ساتھ چلنے پر مجبور تھی۔ زندگی کے اس سکون نے ان کے حوصلے ہی بلند نہیں کئے ان کی انا کو بھی نئے بال و پر عطا کئے۔ ان کی غزلوں کے مرکزی کردار میں یہ تیور، ان کے ہم عصروں سے ہی انہیں الگ نہیں کرتے، نئی غزل میں ایک نئے احساس اور رنگ کے اندر کی اطلاع بھی دیتے ہیں۔ ناصر کاظمی اور ابنِ انشاء کے تھکے ماندے اور ہجر زدہ عاشق کے مقابلے میں یہ کردار زیادہ توانا اور مردانہ محسوس ہوتا ہے۔ اس کی تہذیبی دنیا بھی زیادہ وسیع اور تہہ دار ہے۔ اس کا غیر ہم عصر زندگی کے تضادات سے ابھرا ہے جو غم کو جی کا روگ بنانے کے بجائے اسے شعور کی تابندگی میں ڈھالتا ہے۔

خواب کی راہ میں آئے نہ در و بام کبھی　　　اس مسافر نے اٹھایا نہیں آرام کبھی
سارے جہاں کی سیر کا امکان مل گیا　　　بیٹھے بٹھائے گھر میں طوفان مل گیا

کوئی سودا نہیں بازارِ جنوں میں سستا دل بڑا چاہیے غم مانگنے والوں کا یہاں

ن نعیم دہلی آکر زیادہ دن بے روزگار نہیں رہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ میں ڈائریکٹر کی کرسی ان کے انتظار میں پہلے سے خالی تھی۔ وہ کچھ دن دلی کو اپنی ستانے کے بعد، سیدھے وہاں آکر بیٹھ گئے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ میں ان دنوں، ان کی شاموں کی محفلوں کی بہت شہرت تھی۔ حسن نعیم کے یہاں آنے ادارہ غالب سے زیادہ خود ان کی شاعری کا مرکز بن گیا تھا۔ ہر شام مشہور موسیقار استاد ہلال احمد خاں اپنے سازو آواز کے ساتھ آتے، شراب کے ور حسن نعیم کی غزلیں نئے نئے راگوں کی فنکارانہ بندشوں کے ساتھ سناتے۔ شام کی ان محفلوں میں شریک ہونے والوں میں حسن نعیم کے دوست ادیب ہوتے تھے۔ حسن نعیم کی غزلوں کے ساتھ دیر دیر تک جاگنے والی یہ شراب و موسیقی کی محفلیں جب زیادہ پرشور ہونے لگیں تو ادارہ کے ٹرسٹیوں کے کان کھڑے یں غالب کے نام کے اس ایوان میں حسن نعیم کی غزلوں کی مسلسل گونج پر اعتراض تھا۔ لیکن حسن نعیم کے ذاتی تعلقات کا دائرہ ہندوستان کے راشٹرپتی سے لے کر م ہستیوں تک پھیلا ہوا تھا۔ ان اعتراضات کو وہ خاطر میں نہیں لائے وہ ساری مخالفتوں کے باوجود کاروبارِ غزل میں کھوئے رہے۔ وقت نے اب تک جس طرح ناز برداریاں کی تھیں، ان کے ہر اچھے برے عمل کا ساتھ دیا تھا، اس نے ان کا ذہنی توازن اس حد تک دوسروں سے مختلف کر دیا تھا کہ وہ نوع پر کسی قسم کے اختلاف کو برداشت نہیں کر پاتے تھے۔ وہ جس طرح سوچتے سمجھتے تھے اسی کو آخری سچائی مانتے تھے۔ اور اس کے لئے بڑی سی بڑی نے میں نہیں ہچکچاتے تھے۔ ان کے مزاج کی اس کیفیت نے ایوانِ غالب میں بھی انہیں دیر تک نہیں رہنے دیا۔ ایک معمولی سے کاروباری معاملے میں رشتہ عابدہ احمد سے الجھ کر اس نوکری کو بھی اپنی مرضی سے ٹھکرا کے آزاد ہوگئے۔ یہ ان کی آخری ملازمت تھی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے اور اپنی غزل کے درمیان کسی کام کو نہیں آنے دیا۔ ایوانِ غالب سے الگ ہونے کے بعد وہ کچھ عرصہ دہلی میں اپنی آزادیوں کا لطف لیتے رہے۔ اور پھر ایک دن بستر بوریا باندھ کر لئے بمبئی آکر بس گئے۔ بمبئی میں ان کی زندگی کسی بنجارے جیسی تھی، کہیں صبح، کہیں شام، کہیں رات، ایک پڑھی لکھی نیک سیرت بیوی، دو لڑکیوں ڑا ایک انگریزی کی جرنلسٹ اور ایک زیرِ تعلیم لڑکے کے بسے بسائے کھاتے پیتے گھر کو اچانک چھوڑ کر بمبئی میں ایسی پریشان زندگی کیوں گزارتے رہے۔ سب کچھ نے وہ کچھ نہ ہونے کے عذاب کو کیوں جھیلتے رہے؟ ساٹھ پینسٹھ سال کی پختہ عمر میں وہ بیس پچیس برسوں والی لاپرواہیوں کو کیوں اپناتے رہے؟ وہ کیا تھا یں جستجو تھی اور جس کے لئے وہ ایک بیراگی کی طرح بمبئی کے فاصلوں کو لگاتار جانوروں کی طرح بھرے ہوئے لوکل ٹرین کے سیکنڈ کلاس کے ڈبوں، دھکا پیل والی اور بھاگتی بسوں کی سیٹوں اور ادھر ادھر کے تھکے ماندے قدموں سے ناپ رہے تھے۔ بمبئی میں دوسری جگہوں کی طرح انہوں نے کوئی ذریعہ معاش کیوں یہ وہ سوال ہے جو نہ کسی نے ان سے پوچھے اور نہ انہوں نے ان کے جواب دینے کی کبھی ضرورت محسوس کی۔ اس سلسلے میں دوسرے شاعروں کے برعکس، ری بھی ہماری کوئی مدد نہیں کرتی۔ ان کی شخصیت کی طرح ان کی غزل بھی اپنا دکھ درد نہیں سناتی۔

موجۂ اشک سے بھیگی نہ کبھی نوکِ قلم وہ انا تھی کہ کبھی درد نہ جی کا لکھا

وہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر بمبئی آئے تھے۔ اس ناراضگی کا کارن بھی دو والوں کا مت بھید تھا۔ یہاں کچھ عرصہ اکیلے ٹہلنے کے بعد شہر بانو نام کی ایک گلو ساتھ، بمبئی کے ایک کافی دور کے علاقہ واہی سر میں رہنے لگے تھے۔ محفلوں میں وہ اکثر ان کے ساتھ ہوتی تھی۔ اور موقع بے موقع حسن نعیم کے اصرار ن غزلوں سے سننے والوں کو نوازتی تھیں۔ شہر بانو کے لئے وہ الگ سے بھی اسٹیج پروگرام کرتے رہتے تھے۔ بمبئی میں حسن نعیم کا کوئی ذریعۂ آمدنی جو کچھ کمایا تھا وہ سب دلی چھوڑ آئے تھے۔ یہاں ان کے پاس غزلوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا جنہیں وہ مشاعروں میں پڑھ کر یا شہر بانو کی آواز رنے کی ناکام کوشش میں لگے رہتے تھے۔ یار دوستوں کی مدد سے ہر بار نقاب پہ پروگرام منعقد کرتے تھے، اور اپنی غزلیں خود سن کر اور چند سامعین خوش ہو لیتے تھے۔ اس قسم کی بے ترتیب اور بوہیمین زندگی جسے وہ جان بوجھ کر یا مجبوراً اپنائے ہوئے تھے۔ ان کے ملنے جلنے والوں کو فکر و حیرت ہوئے تھی۔ لیکن انہیں خود اپنے شب و روز سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ اپنی زندگی کو ایک چلتی پھرتی تجربہ گاہ بنائے ہوئے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ی تھکن نے ان تجربوں کا ساتھ نہیں دیا۔ ہو سکتا ہے یہ صنفِ غزل کا بھی دوش ہو ان کے رہن سہن کے طور طریق بدلے، حالات بد سے بدتر ہوگئے، ان بے نام بیماریوں کا گھر بن گیا۔ لیکن اپنی شاعری کے تعلق سے ان کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ اپنے ہر شعر کو زمین پر خدائی معجزہ سمجھتے تھے دنیا سے بھی اس کی پرستش کا مطالبہ کرتے تھے۔ انہیں حالات اور سماج سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی وہ ہمیشہ صرف ان نقادوں کے گلہ مند رہے نظر میں ان سے کم تر ہم عصروں کو اپنی تحریروں کے ذریعے نمایاں کر کے اپنی عاقبت خراب کرتے تھے۔ اپنے ان کم تر معاصرین میں وہ ناصر کاظمی

ابن انشاء اور باقی کا شمار کرتے تھے۔ ناقدین سے ان کی یہ گلہ مندی شاید اپنی شاعری پر ان کے عدم اعتماد کی غمازی کرتی تھی اور اُن کی بظاہر صوفیانہ لاتعلقی اور بے نیازی دنیا داری سے پورے طور پر آزاد نہیں تھی وہ نیش کام کی منزل تک نہیں پہنچے تھے۔ ان کی دیوانگی اور اسی ہوش مندی نے ان کی غزل کے متوقع امکانات کو ہی نقصان نہیں پہنچایا۔ ان کے سماجی تعلقات کو ناہموار کیا۔ حسن نعیم کی موت ہمارے عہد کا ایک ادبی المیہ ہے۔ مرنے سے ایک ہفتہ پہلے انھوں نے مجھے فون کیا تھا۔ وہ اس وقت بھی بیمار تھے، چلنے پھرنے سے معذور تھے لیکن فون پر اس مختصر سی گفتگو میں ان کی بیماری کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ وہ اپنی شاعری پر مجھ سے مضمون لکھوانا چاہتے تھے۔ فون کی غرض بھی اسی کی یاددہانی تھی۔ ان کی آواز میں لرزہ تھا۔ اور سانس بھی ہر جملہ میں بار بار ٹوٹ رہی تھی۔ میں نے جب ان کی طبیعت کے بارے میں پوچھا تو صرف اتنا ہی کہا، تھوڑی سی کمزوری ہے، ٹھیک ہو جائے گی۔ ان کی حالت کا اندازہ فون پر ان کی آواز سے ہو رہا تھا۔ میں پہلی بار دہلی میں ان کا مکان تلاش کرتا ہوا ان تک پہنچا۔ وہ ایک نیم تاریک چھوٹے سے کمرہ میں، میلے کچیلے بستر پر آنکھیں بند کئے سمٹے سمٹائے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ آواز میں کمزوری اور چہرہ پر سوجن تھی۔ وہ اخلاقاً کچھ دیر بستر پر بیٹھے اور پھر معذرت کر کے تکیہ پر سر ٹکا کر لیٹ گئے۔ آثار کچھ اچھے نہیں تھے۔ انہیں فوری طبی مدد کی ضرورت تھی۔ لیکن ان کے مالی حالات اس بار کو اٹھانے کے قابل نہیں تھے۔ میں نے اردو اکادمی کے اراکین سے اس کا ذکر کیا۔ انہوں نے ہمدردی بھی ظاہر کی۔ دو تین دن اس پر غور کرنے میں ضائع کئے۔ اور آخر میں اکادمی کے قوانین نے اپنی مجبوری کا اظہار کر کے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اکادمی کے اس رویہ کا جب انہیں علم ہوا تو انہیں اکادمی کے بجائے مجھ سے شکایت تھی۔ اکادمی کے اراکین سے ان کے لئے اس طرح مدد کی درخواست کرنا انہیں پسند نہیں تھا۔ اکادمی کے انکار سے انہیں شدید تکلیف ہوئی تھی اسے انہوں نے اپنی ہتک تصور کیا۔ اور ذلت کی زندگی بیتنے کے بجائے عزت کی موت کے لئے تیز رفتار ہو گئے۔ میں ان دنوں چار پانچ دن دہلی سے باہر رہا۔ واپسی پر میں انہیں اپنے طور پر ہوسپٹل میں داخل کرانے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن وہ میرے لوٹنے سے پہلے ہی جسم کی سرحد کو پار کر چکے تھے۔

سانس لیتے ہیں ہزاروں، جینے والے چند ہیں ‖ سب دریچے آرزو کے، بزدلوں پر بند ہیں

میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ حسن نعیم کی بے وقت موت کی ذمہ دار اردو اکادمی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے میں یہ کہوں کہ تین لاکھ عراقیوں کی موت کی ذمہ داری صدام یا بش پر ہے۔ موت اور زندگی تو صدیوں سے، انسانوں نے خدا کے ہاتھوں میں سونپ رکھی ہے۔ لیکن ان کے مرنے کے بعد یہ احساس اکثر ستاتا ہے کہ جس دن میں ان سے ملنے دہلی سے گیا تھا، اگر اسی دن ان کے علاج کا بندوبست ہو جاتا تو شاید کچھ روز اور اس بے حس سنسار میں جی لیتے۔ نئے پرانے گلوکاروں کی آواز میں اپنی غزلیں کچھ روز اور سن لیتے۔ بمبئی کی ادبی محفلوں میں اپنی عظمت کچھ روز اور ثابت کر لیتے۔ ناقدین کی سخن ناشناسی کا ماتم کچھ روز اور کر لیتے

اہل دل کو یاد صدیوں آئے گا میرا جنوں ‖ شہرتیں ہوں گی فنا، رسوائیاں رہ جائیں گی۔

بقیہ صفحہ ۲۹ حسن نعیم کی شعری شناخت

غم کی قوت تھی کہ جس کے بل پہ زندہ رہ گیا

لفظوں کی پرکھ اور استعمال میں بھی انہیں کمال حاصل رہا ہے۔ جہاں جو لفظ استعمال کیا ہے اس کے تہذیبی معنوی پس منظر سے پردہ اٹھ گیا ہے۔

انتقال سے کچھ پہلے کی غزلوں میں اپنے ROOTS سے کٹ جانے اور اپنے بزرگوں کی روش سے ہٹ جانے کا احساس شدت اختیار کر گیا تھا۔ ان کی غزلوں میں ایسے کئی شعر ہیں جن میں صاف جھلکتا ہے کہ وہ ندامت کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں۔ اندر ہی اندر انہیں کوئی غم کھائے جا رہا ہے اور اگرچہ غم کی قوت سے وہ اعلیٰ تر مقاصد کی تکمیل کے قائل تھے لیکن اکثر ان کا ضبط ٹوٹ گیا ہے اور وہ عام انسانوں کی طرح ناقدری فن کی شکایت کر بیٹھے ہیں اور بعض اوقات یہ شکایت طعن و تشنیع کی صورت اختیار کر گئی ہے۔

حسن نعیم میر، سودا، غالب، بیدل اور آتش، یگانہ کے طرف دار ہیں اور ان کی شعری روایتوں کو عصری آگہی اور فنی کاریگری کے ساتھ آگے بڑھایا ہے۔ انہیں یقین ہے کہ شاعری میں ان کی اپنی شناخت اور مستقل حیثیت ہے جو دیر سویر تسلیم کی جائے گی۔

چلا تھا میر کے پیچھے سخن کی وادی میں ‖ اسی کی خاک نوازی مری امامت ہے
وقت ہی ناقد ہے ایسا جس کو سب معلوم ہے ‖ حرف کے پردے میں کس نے کیا کہا کیسا کہا

شمیم طارق
فلیٹ نمبر ۷-مرزبان مینشن ، بائیکلا۔ فروٹ مارکیٹ بمبئی۔ ۲۷

حسن نعیم کی شعری شناخت

حسن نعیم کی غزلوں میں تہہ داری اور دل داری کا بڑا حسین سنگم ہے۔ ایک چوتھائی صدی تک وہ دانشوروں سے منسوب ۔ موسیقی اور ندرت کی داد پاتے رہے لیکن برسوں میں ان کی غزلوں میں درد مندی کی ایک نئی جہت نمایاں ہوئی جس نے غزل کے عام پرستاروں کو بھی ان کے مداحوں میں شامل کر دیا ہے۔
ل گائیکی کے فنکارانہ احساس اور اس احساس کی اپنی غزلوں میں فنی رعایت سے انہوں نے ہر مصرعے بلکہ مصرعے کے ہر ٹکڑے کو مکمل MUSICAL
ے میں تبدیل کر دیا ہے۔ کسی یونٹ کو پورا کرنے کے لئے کوئی حرف ادھر ادھر نہیں کرنا پڑتا اور ہر یونٹ سے معنی و موسیقی کے کئی رنگ اور راگ پھوٹتے ہیں۔
یدل کا اسلوب اور مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری کی فکر، کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے ان کے لئے مرجع الہام رہی ہے۔ ان دونوں کا خوبصورت امتزاج
ول کی جاتی ہے۔ اسے مزید جاندار نئی حسیت نے بنایا جو بدلتی قدروں کے دانشورانہ احساس اور عصری ادبی تحریکوں کے فنکارانہ ادراک سے عبارت ہے
زندگی کے ساتھ زمان کے تسلسل کے بھی قائل ہیں۔ اس لئے عشق و وجدان کے ذریعہ زمان و زندگی کے مسائل سمجھانے کے ساتھ نئے تلازموں اور ترکیبوں سے
تے ہیں۔ دستِ تہی، موجۂ اشک، مکانِ جاں جیسی نادر و تازہ ترکیبوں سے ان کے شعروں کے لفظی و معنوی حسن میں اضافہ ہوا ہے۔
موضوع کے اعتبار سے بھی ان کی غزلوں میں بڑا تنوع ہے بیدل اور فرانسیسی فلسفی ہنری برگساں کے زمانِ خالص و غیر خالص کے مباحث بھی پہلو بدل بدل کر
کے شعروں کا موضوع بنے ہیں۔

بہی وقت سیلِ رواں لے سر کی کشتیوں کو ڈبو گیا ۔۔۔ کوئی لہر آبِ حیات کی ابھی گنگ میں نہ جمن میں ہے

کون مجھ سے پوچھتا ہے روز لتے پیار سے ۔۔۔ کام کتنا ہو چکا ہے وقت کتنا رہ گیا

غالب کے دور میں سائنس نے آج کے دور کی طرح ترقی نہیں کی تھی۔ اس کے باوجود غالب نے ابرو ہیئت سے متعلق اپنے تجسس کا اظہار کیا تھا۔

سبزۂ و گل کہاں سے آئے ہیں ۔۔۔ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

یا اپنی قوتِ مشاہدہ کو علم فلکیات کے نکتوں تک پہنچاتے ہوئے پوچھا تھا۔؟

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں ۔۔۔ شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

لیکن حسن نعیم تو عصری دانش گاہوں میں برسوں پڑھے اور نیویارک میں رہے تھے وہ یورپ و امریکہ کے شعری ادبی رجحانات سے بھی واقف تھے۔ جہاں سائنسی
فتوحات کی سطح پر لکھنے کا رواج زوروں پر ہے انہوں نے سائنس کو بھی اپنے شعری موضوعات کا حصہ بنایا۔
ن کا یہ شعر آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافت کا مظہر ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ کائنات میں ہر چیز اضافی ہے۔ وہی حق نہیں ہے جو نظر آتا ہے مثلاً سورج
مان پر چڑھتا اترتا اور زمین کے گرد گھومتا محسوس ہوتا ہے۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ زمین اپنے محور پر گھوم رہی ہے۔

مری کا رزہ پہ جو قطرہ دکھائی دیتا ہے ۔۔۔ تری پلک پہ ستارہ دکھائی دیتا ہے

حسن نعیم کے شعروں میں دل سے زیادہ دماغ کی کارفرمائی ہے۔ وہ کوئی ایسی بات نظم نہیں کرتے جو خلافِ واقعہ ہو اور اس کے باوجود کہ سائنسی تحقیقات و
نے کے احساس میں روحانیت ایک حد تک قربان ہو گئی ہے۔ ان کے لاشعور میں روحانیت کی جلوہ گری ملتی ہے جو کسی نہ کسی صورت میں
نے کا سلیقہ اور حوصلہ بخشتا ہے ۔۔۔

(باقی صفحہ ۲۸ پر دیکھئے)

قوں میں علم ہے، جرأت ہے، وقت ہے
میں کہ سپہ کا مقدر شکست ہے
یس کو ہم دکھائیں عزائم کے لالہ زار
شنا کے پاس مصائب کا دشت ہے
تمام چمن کے بیابانیں اڑی چلیں
بادلیوں کے بعد سہانا درخت ہے
جنوں کے دوست ہیں، سورج بھی چاند بھی
سن نعیم ابھی دھوپ سخت ہے

دوئے خواب میں کچھ ایسے گرفتار ہوئے
اسنگ بولی بھی تو نہ بیدار ہوئے
پ تھے خوشحال، بھلے لگتے تھے رشتے غم کے
وہی رشتے مری جان کا آزار ہوئے
پ تلک یاد نہیں وحشت تھی جنوں میں طاقت
ہی سائے میں بیٹھے، نہ کبھی خوار ہوئے

ق

انے جب گلف میں کچھ دولت و عزت پائی
فی بھی ہمارے حق میں رضا کار ہوئے
ب کھلے نقد کے اوصاف بہ فیضِ "نقدی"
ورسالوں کے "اڈیٹر" بھی طرفدار ہوئے
سے جن کے سبب مغرب میں قیامت سی بپا
ہی لونڈوں کے لئے میرؔ جی بیمار ہوئے
یاں چلنے کو تیار تھیں پہلے سے نعیم
توبس جھنڈا اٹھانے کے گنہگار ہوئے



حسن نعیم

زمانہ تیری ذہانت کا جب عدو ہوگا
مری نگاہ میں اس دم تو سرخرو ہوگا
یہ دکھ ہے کون بسائے گا درگہہ مخدومؒ
نہ میں چراغِ وراثت رہا، نہ تو ہوگا
اسی امید میں اس کربلا کی خدمت کی
کبھی تو اپنا لہو غنچۂ نمو ہوگا
کوئی تو علم کو دے گا عمل کی شہ زوری
کوئی تو لائقِ تکریم و گفتگو ہوگا
وہ انقلاب جو بخت جہاں بدلتا ہے
وہ انقلاب کسی لمحہ کو بہ کو ہوگا
کسی جنوں میں، کسی جستجو میں جی لینا
قلم بھی ورنہ یہاں سیف در گلو ہوگا
ہوئی قبول دعائے سحر کبھی تو نعیم
امامِ وقت کسی آن روبرو ہوگا

ؒ راجگیر میں درگاہ پیر امام الدین کی طرف اشارہ ہے جو
مخدوم الملک شرف الدین یحییٰ منیری کے نسبی سلسلے
کی درگاہ ہے اور تقسیمِ ملک کے بعد سے بیک ویران پڑی ہے۔

کس کو کیا دیتا یہاں حصہ مرا ہی کیا
آسمانوں سے تیشۂ سنگ گرا ہی کیا
غم نہیں مسکن احساس جو ٹھہرا ہے دما
دل کے ساغر میں سوا خوں کے بھرا ہی کیا
میں ہوں نایابِ اخلاص وفا ہیں نایا
یاد کیوں رکھتے مجھے، مجھ میں دھرا ہی کیا
کیا ٹھہرتا کوئی صحرائے تمنا میں حت
برگِ ماضی کے سوا اس میں دھرا ہی کیا

آرزو کی راکھ سے چنگاریاں لے کر
دور سے آئے تھے ملنے، دوریاں لیکر
ہر سفر ایسا کہ آنکھوں سے بہے چشمے
ہر نگر ایسا جلے کچھ اور دھواں لے کر
کچھ نہ تھا اپنی گرہ میں ان کی خوشبو کے
صحرا صحرا ہم گلوں کی بستیاں لیکر
جب سنا وہ چاند پھر اترا ہے اپنے شہر
ہم بھی ساری رات سر پہ کہکشاں لیکر
حسن کا دربار بھی بازار دنیا ہے نعیم
اپنے خوابوں کا خزانہ تم کہاں لیکر

امجد جاوید
۱-۲۹۱-۶ خونی الاادہ، مومن پورہ، گلبرگہ - ۵۸۵۱۰۴

شجر فنا کا گھنا ہے

اُسے لگا کہ سورج اچانک غروب ہو رہا ہے۔ پھر سوچا کہ یہ اُس کا وہم
۔ ریل کی کھڑکی سے باہر دیکھا تو محسوس ہوا کہ وقت تیزی سے اپنے اختتام
رف رواں ہے۔ ہر منظر اور کائنات کا ہر عمل تیزی سے اپنی تکمیلیت کی طرف
رہا ہے۔ پھر وہ یکایک سوچوں میں گم ہو گیا۔ ماں دونوں ہاتھ اُٹھائے
کے روشن مستقبل کی دعا کر رہی ہے۔ باپ مضمحل نظر آ رہا ہے دونوں کے
ے غمگین اور کسی نادرشئے کے کھونے کے مخمصے سے دوچار ہیں۔ ہر چند
س کا باپ داخلی طور پر اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے ایسا کر ہی نہیں سکتا
۔ اس کا باپ کیا۔۔۔ کوئی بھی باپ اپنی اکلوتی اولاد کو اپنے سے دُور
طور پر قطعی نہیں کر سکتا مگر معاش و مال ایسی چیزیں ہیں۔۔۔ جس کے
آدمی فطری رجحانات کو بھی بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔

آئے دن باپ کا ماں کے ساتھ جھگڑا اور نشہ کی حالت میں گھر آنا
گرچہ وہ قطعی ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ عمر بھی رفتہ رفتہ زوال آمادہ تھی
بابالوں سے جھانک رہا تھا۔ حالت بھی ایسی گر رہی تھی کہ بوجھ اُٹھایا نہیں
تھا مگر کیا کرتا سوچا تھا کہ بیٹا پڑھے گا تو بڑھاپے میں کچھ تو آسرا
۔ گا بیٹے کی تعلیم کے لیے اُس نے اپنی جوانی کو بے دریغ خرچ کیا تھا۔
امید تھی کہ کچھ حسین اور روشن لمحے بھی اس کی زندگی میں آئیں گے۔ مگر
تنے اس طرح پلٹا کھایا کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے دو چار سال بعد
اس کو نوکری میسر نہیں آ سکی۔ بوڑھا دن بدن پریشان ہوتا جا رہا تھا
ہی فکر کے لامتناہی سلسلے کو توڑ نہیں سکی تھی۔ بوڑھا جب دیر رات
بن تھوڑا سا بھی کھانس جاتا تو بوڑھی کراہتے ہوئے کہتی کیا پانی چاہیے
ی ان دونوں کی بڑھتی ہوئی فکر سے کچھ زیادہ ہی خوف زدہ ہو رہا
گھر کی مفلسی سے تنگ آ کر اپنے تحت الشعور میں پناہ لیے وہ ساری باتیں جو
تکلیف دہ اور اذیت ناک حالات سے دوچار کر رہی تھیں اُن کے علاوہ
یہ وہ اپنے سارے جوش کو بڑھاپے پر ختم کر دیتا نوجوان جانتا تھا کہ باپ

کا پورا روئے سخن اسی کی طرف ہے۔

نوجوان منتظر تھا کہ حالات کروٹ بدلیں گے۔ مگر شومیٔ قسمت
کہ ایسا ہو ہی نہیں رہا تھا۔ دن ناامیدی پر شروع ہوتا اور بدبختی پر ختم۔

اچانک ایک صبح ماں نے ڈرتے ڈرتے سہمے ہوئے انداز سے اپنے آپ
کو بے انتہا ضبط کر کے کھانے پر اُس سے کہا۔ ہر چند کہ یہی کہنے کے لیے
اُسے ہفتہ عشرہ لگا تھا مگر کیا کرتی بوڑھے کا ظلم روزافزوں تھا۔۔۔
اِن دنوں ذہنی بوجھ اور تفکرات کے ورطہ آب نے ایسے جکڑے رکھا کہ اس
نے تمام اخلاقی قدروں اور باتوں کو پامال کر کے پینا شروع کر دیا تھا۔

بیٹا! سُنا ہے اُدیوگ نگر میں پیٹ پالنے کا مسئلہ نہیں ہے وہاں صبح
تڑکے ہی سے روزی شروع ہوتی ہے، بے روزگاری دیکھنے تک کو نہیں ملتی
تو بھی وہاں جا کر کچھ دن کام کر لے تیرے لیے بھی اور ہمارے لیے بھی ٹھیک
رہے گا نوجوان نے چند نوالے لیے اور کہا ٹھیک ہے آج ہی چلا جاؤں گا
نوجوان کا جانا ماں کے لیے صدمہ ہی تھا۔

نوجوان جب گھر سے سوٹ کیس لیکر اپنی منزل کی طرف نکل رہا تھا
تو گھر کے دروازے کی چوکھٹ پر تالو میں اس زور سے لگی کہ گویا کوّے
نے اپنی پوری چونچ تالو میں اتار دی ہو۔ لگا کہ جان حلق میں آ کر اٹک گئی ہو
درخت پر بیٹھے کوّے نے کائیں کائیں شروع کر دی بڑھیا کو عجیب لگا

ماں وداع کرنے اسٹیشن تک آئی اور جب ٹرین چلنے لگی تو لگا
اُس کے پیروں تلے زمین کھسک رہی ہے اور پوری کائنات کا نظام جیسا
میں اچانک درہم برہم ہو گیا ہے تمام چیزیں ایک نقطۂ انجماد پر آ کر رُک
گئی ہیں ٹرین اپنی سمت رواں دواں تھی اور بڑھیا کو احساس ہو رہا
تھا مبہوت ٹھہری۔ وقت کے انجماد کو تحیر سے دیکھتی رہی ٹرین گزر
چکی تھی بیٹے کے لیے اٹھے ہوئے الوداعی ہاتھ ہلتے ہلتے جھک گئے تھے

نظروں سے اوجھل ہو گئی پھر بھی بڑھیا ساکت اپنے وجود سے بے خبر تھی ایسے لگا کر اُس کے اکلوتے کا پنگوڑا جھولتے جھولتے اچانک ساکت ہو گیا ہو۔

جب نوجوان ٹرین کے ڈبے میں داخل ہوا تو ٹرین میں انتہائی بھگدڑ تھی۔ اُس کے چہرے سے بے بسی عیاں تھی تھوڑی مسافت طے ہوئی ہو گی کسی نے ازراہ ہمدردی آواز دی بیٹھو بھائی اسی میں ایڈجسٹ کر لیں گے ۔ رہنا تو نہیں ہے، گھنٹوں کی مسافت ہے، دوستی باقی رہے گی انسانیت کے رشتے استوار رہیں اور بس ۔ اس نے شکریہ شکریہ کہا اور اپنے آپ کو سکیڑتے ہوئے بیٹھ گیا۔

پہلے سے بیٹھے لوگ اپنی بحثوں میں اس درجہ منہمک تھے کہ کون آ رہا ہے اور کون جا رہا ہے اس کا احساس ہی نہیں تھا ہر نیا مسافر دوسرے اسٹیشن تک اُن کا اپنا پُرانا ساتھی ہو جاتا تھا۔ اپنائیت فطری طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔

سامنے بیٹھے ادھیڑ عمر کے آدمی نے اپنا چشمہ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ بھئی یہ تمام قصہ تو بس معاشیات سیاسیات کا ہے اور ہر آدمی دوسرے کو SURPASS کرنا چاہتا ہے اور یہی چیز انہیں تخریبی عناصر ذہن میں جگہ پاتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے معیاری زندگی کا فلسفہ مسمار ہو جاتا ہے دوسرے نے بات کاٹتے ہوئے کہا جنس ہی ہر انسان کی شخصیت کا منبع ہے اور یہی تمام اچھائی اور بُرائی کا محور بھی۔ طبیعت میں الطیفان اور بحران یہیں سے پنپنا شروع ہوتے ہیں ۔ بوڑھے مسافر نے داڑھی میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ بھئی ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اُسی کی بات سچ ہے اور اُسی کا نظریہ پھیلے۔ اگر کہیں مزاحمت ہوتی ہے تو ناکامی کے خدشے کی وجہ سے فطری طور پر برانگیختہ ہو جاتا ہے اور ذہن وہیں سے تخریب کاری میں ملوث ہو جاتا ہے اِس لیے تعلیمات میں تزکیہ ضروری ہے ۔ ایک مسافر بڑھیا نے کہا بیٹا مجھے تو بات معلوم ہوتا ہے۔ ٹرین میں سوار دیگر مسافر بھی کبھی کبھی بحث کو غور سے سُنتے ۔ جہاں تک سمجھ میں آتی — پھر بے نیاز ہو جاتے ۔ بحث مختلف رُخ لیتی طویل ہوتی پھر ایک نکتہ پر رُک جاتی —

چہرے سے سنجیدہ پڑھے لکھے شخص نے کہا یہ سب جھگڑے سرمایہ داری کا ردعمل ہیں۔ نفسیات تو کہتی ہے پیٹی بورژوا ہمیشہ بے چین رہتا ہے وہی اِس طرح کے خلل پیدا کرتا ہے ۔ بہرکیف یہ تو ماننا پڑتا ہے کہ تخریبی جذبہ پیار کے جذبے سے طاقتور ہوتا ہے اِس لیے جلد غالب آ جاتا ہے ۔ لوگوں کے پیروں میں بیٹھا خرقہ پوش چلم سلگانے لگا — مسافروں نے کہا یہ کیا کر رہے ہو؟ خرقہ پوش نے کہا ایک دم میں سب بکھیڑے دور۔ جب تک ہم خود کو نہیں جانتے اور پہچانتے تب تک ایسا ہی ہوتا رہے گا جب خود کو پہچان پاؤ گے — تو سب جھگڑے ختم۔ ایک کش لگاؤ۔ پھر پتہ چلے گا کہ خود کیا ہے ۔ لوگوں نے اس کی باتیں احمقانہ سمجھ کر پینے سے منع کیا — خرقہ پوش نے زوردار قہقہہ لگایا اور سیٹوں کے درمیان والی خالی جگہ پر رومال بچھا کر دراز ہو گیا اور خراٹے لینے لگا۔

اسی گرم بحث میں چند ایک اسٹیشن گذر گئے لوگ برابر سوار ہو رہے تھے اور اپنے اپنے مقام کے آنے پر اُترتے بھی رہے تھے — نوجوان کے بازو میں کھڑے ہوئے ایک نئے مسافر نے بڑی معصومانہ نگاہوں سے اُس کو دیکھا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہنا چاہ رہا ہو — ہو سکے تو تھوڑی سی جگہ بیٹھنے کے لیے دے دی جائے۔ نوجوان نے نگاہوں کو پڑھا — اور کہا بیٹھو یار — ٹھہرے کیوں ہو۔ — نئے مسافر نے اپنا سوٹ کیس سیٹ کے نیچے نوجوان کے سوٹ کیس پر رکھا اور اس کے بازو میں تھوڑی سی جگہ پر قدرے اطمینان سے بیٹھ گیا جیسے پوری طرح بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا ہو —

بحث جاری تھی — ہر بیٹھا ٹھہرا مسافر بحث میں برابر کا حصہ لے رہا تھا مگر نوجوان کے بازو میں بیٹھا نیا مسافر چہرہ سے کچھ اُکتایا ہوا لیکن پُر سا الگ رہا تھا ڈبے کے تمام مسافروں سے بے نیاز، خیالوں میں گم کبھی آنکھیں بند کر لیتا کبھی آنکھیں کھولتا، پھر سوچوں میں گم ہو جاتا — کھڑکی کے سرے پر بیٹھے مسافر نے اپنا ٹرانسسٹر آن کیا خبریں آ رہی تھیں ۔ آج کے مُکھ سماچار اِس پر ہیں — شانتی پور میں آتنک وادیوں نے یاتری بس کو بم سے اڑا دیا پچاس یاتری کی گھٹنا استھل پر ہی مرتیو ہو گئی۔ ۔ نوجوان نے بازو بیٹھے اجنبی سے کہا بھئی دہشت گردی آئے دن کتنے ہی بے گناہ معصوموں کو موت کے گھاٹ اتار رہی ہے — مذہبی جنونی اور سیاست دان اپنی دکان چمکانے کے لیے یہ کھیل کھیل رہے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے دہشت گرد بھی بھولے بھالے بے روزگار نوجوان ہیں اور چند پیسوں اور روشن مستقبل کے لالچ میں یا پھر ڈر دھمکی کی وجہ سے ایسے کاموں میں ملوث رہے ہیں — نئے مسافر نے فوراً کہا ٹھیک کہتے ہو۔ ایسا ہی لگتا ہے ۔ نوجوان نے کہا آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں ؟ اس پر نئے مسافر نے چُپ سادھ لی ۔ نوجوان نے کہا مجھے تو لگتا ہے آدمی انفرادی طور پر نیک ہے — خباثت تو اجتماعیت کے آنے سے شروع ہو جاتی ہے ۔ اور مزید کہ ہر انسان انفرادی طور پر محبت پر یقین رکھتا ہے اور اس کا پورا جذبہ محبت کے محور پر گھومتا ہے ۔ اگر اندرونی طور پر محبت کے جذبہ کو کہیں تسکین نہیں ملتی تو غیر شعوری طور پر انتقامی جذبہ جگہ پانے لگتا ہے —

ٹرین اپنی منزل کی طرف رواں تھی مسافروں کے مختلف خیالات اور باتیں چل ہی رہی تھیں — کہ ایک چائے والا اپنی تیز اور طرار آواز لگا

ہوا بلکہ چیختا ہوا کہیں سے نمودار ہوا نوجوان نے شاعرانہ انداز سے نہ کہا۔ چائے والے نے کہا صاحب! آگے چائے ملے نہ ملے یہیں لے لو ———

یہ زندگی کے میلے — یہ زندگی کے میلے دنیا میں کم نہ ہوں گے افسوس ہم نہ ہوں گے — اندھا بھکاری اپنی کم سن بچی کے کندھے پر اپنا بایاں ہاتھ رکھے دایاں ہاتھ پھیلائے گائے جا رہا تھا نوجوان نے ایک چونی اُس کے ہاتھ میں تھما دی — بھکاری نے کہا بابا تمہاری عمر لمبی ہو۔

لوگ دیر رات کو محسوس کر رہے تھے اور کچھ زیادہ بحث کی وجہ سے تھک بھی گئے تھے — کوئی جماعیاں لے رہا تھا تو کوئی خراٹوں کے سہارے لمبی نیند کے مزے لُوٹ رہا تھا چند ایک رات گذارنے کے لیے بحث کو یوں ہی جاری رکھے ہوئے تھے۔

نوجوان نے اچانک اپنے خیالات کو توڑتے ہوئے ماحول پر نظریں ڈالیں نیند آنکھوں میں دُور دُور نہ تھی نیا مسافر سب کے چہروں کو گھورتا اور بڑی ہی اجنبیت سے دیکھتا رہا نئے مسافر کو نوجوان سے دوستی کا احساس بھی ہو رہا تھا نوجوان کبھی منتشر ذہن لیے ان لوگوں کی باتوں میں اُلجھتا کبھی اپنے ہی خیالوں میں ڈوب جاتا۔

نئے اسٹیشن آتے، مسافر سوار ہوتے، اپنے اپنے مقام کو پانے والے مسافر اتر جاتے — یہ سارا منظر نوجوان کو بار بار اس کائنات کے نظام کو سمجھنے کی ترغیب دیتا اور اپنے وجود کا احساس دلاتا — جوں جوں منزل قریب آ رہی تھی مسافر کم سے کم ہوتے جا رہے تھے — نوجوان پر بھی تھکان اور گہری فکر کی وجہ سے لاشعوری طور پر غنودگی چھا رہی تھی، آہستہ آہستہ وہ بھی نیند کے آغوش میں چلا گیا۔

پتہ ہی نہیں چلا کہ اِس سفر کا آخری حصہ کیسے بیت گیا۔ جب ٹرین اپنے آخری اسٹیشن پر جا لگی اور ٹرین کے رُکنے کا زبردست جھٹکا لگا — تو نوجوان کی آنکھ اچانک کھلی اور وہ ہڑبڑا کر اُٹھا — دائیں بائیں پورا ڈبہ خالی ہو چکا تھا بس وہ اکیلا ہی منزل مقصود تک پہنچا تھا — وہ حیرانی کے عالم میں سیٹ کے نیچے رکھے ہوئے اپنے سوٹ کیس کے لیے جُھکا اُس نے دیکھا کہ اُس کے سوٹ کیس پر ایک اور سوٹ کیس رکھا ہوا ہے اسے بہت تعجب ہوا کہ یہ سوٹ کیس کس نے چھوڑا — حیرت بڑھنے لگی — آخر یہ کس کا ہوگا — اُسے لگا کہیں مجھ جیسے کسی قسمت کے مارے کا تو نہیں ہے! جو پریشانی و فکر کے عالم میں بھول گیا ہو — مختلف خیالات اور وسوسے اُس کے دل میں آنے لگے — ممکن ہے اس کی قسمت نے یاوری کی ہو اور — اور — اور وہ حالات کے دونوں پہلوؤں پر سوچنے لگا — لینے نہ لینے کے مخمصے سے نکل کر اُس نے فیصلہ کر لیا کہ سوٹ کیس لیا جائے ورنہ کوئی دوسرا لے سکتا ہے اگر کسی غریب کا ہوگا اور اس کا پتہ سوٹ کیس میں ہوگا تو اُس تک پہنچانے کی کوشش کی جائے گی — اوپر والے کا شکر ادا کر کے تھوڑی خیر خیرات نکال کر اپنی پریشانی دور کریں گے — اُس نے دونوں سوٹ کیس دونوں ہاتھوں میں اُٹھا لیے اور ٹرین سے اُترنے کو ہی تھا کہ۔

ہر طرف اُس کی ہڈیاں اور گوشت کے چھوٹے چھوٹے لوتھڑے بکھرے پڑے تھے — اُس کے سوٹ کیس میں رکھے تمام سرٹیفکیٹس ہواؤں میں جھولتے ہوئے اِدھر اُدھر بکھر گیے اور ڈگری کا سرٹیفکیٹ اُس کے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی میں آ گرا — ہوا کے تیز جھونکے اس سرٹیفکیٹ کو اڑا لے جانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن اُس کے ہاتھ پر پھیلے خون کے لوتھڑے میں وہ کاغذ کا ٹکڑا چپک گیا تھا کہ ہوا اُسے اڑانے میں ناکام تھی —

بقیہ صفحہ ۳۴ دیواروں کے بیچ

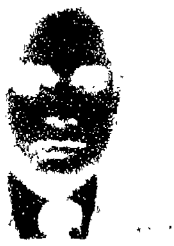
چیک کیش ہو جاتا ہے تو وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ شکریہ ادا کرنے کے لئے اس سے پھر اوبیرائے میں ملنے جاتا ہے لیکن ملاقات نہیں ہوتی۔ وہ واپس ہانگ کانگ جا چکا ہوتا ہے لیکن چیک ہر مہینے اس کے پتے پر آتے رہتے ہیں۔ چھ سات مہینے اسی طرح گذر جاتے ہیں۔ پھر ایک دن ندا کو اپنے کمرہ میں ایک کارڈ پڑا ہوا ملتا ہے۔ یہ ایک ساتھ چار فلموں کا مہورت کارڈ ہے۔ ان فلموں کے پروڈیوسر سگنو جیٹھوانی ہیں۔ اور ہر فلم میں گیت کار کی حیثیت سے ندا کا نام ہے ان چار میں تین "شاید کبھی، ہرجائی، بنتی ہیں، یہ تین کے ریلیز بھی ہوتی، لیکن تجارتی لحاظ سے کامیاب نہیں ہوتی۔ چوتھی فلم آدھی بن کر آپسی اختلافات کی نذر ہو جاتی ہے۔ ان فلموں کے ذریعے فلمی دنیا میں داخلہ تو ہو جاتا ہے۔ گانے بھی مقبول ہوتے ہیں فلم شاید میں وہ

خوشبو ہوں میں پھول نہیں ہوں جو مرجھاؤں گا — جب جب موسم لہرائے گا میں آ جاؤں گا

اور

دن بھر دھوپ کی پربت کا تماشا کو بیٹھے نکلے ہم — جن گلیوں میں موت چھپی تھی ان میں جینے نکلے ہم

اور فلم ہرجائی میں "تیرے لئے پلکوں کی جھالر بنوں" اور "کبھی آنکھوں میں آنسو ہیں کبھی لب پر شکایت ہے — مگر اے زندگی پھر بھی مجھے تجھ سے محبت ہے" وغیرہ گلی تعداد میں خاص طور سے سراہے جاتے ہیں۔ لیکن فلموں کی ناکامی کی وجہ سے بات زیادہ آگے نہیں بڑھتی۔ [illegible]

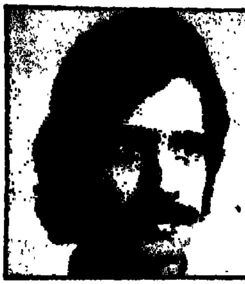


نقی بہاری

لہو

زمیں پہ بکھرے
اس لہو کو، یاد ہے
کہ وہ
کسی کی زندگی تھا
مانگ تھا
کسی کی کوکھ تھا
کسی کا پیار تھا
لہو کو یاد ہے
کہ پہلے وہ
زمین پر بکھرنے کے
محبتوں کا
اک گلاب تھا
سپنے کا
ایک باب تھا
مگر

زمیں پہ بکھرا
یہ لہو تو اب
غبار بن کے
اڑتی خاک ہے
جو آدمی کے سر پہ
جم کے بیٹھی ہے
نئی حیات اور فکر کو
نکارتی ہوئی !!



نظام الدین نظام

تعلقِ خاطر

بلا ناغہ ہم لوگ ملنے لگے ہیں
ملاقاتیں بڑھنے لگی ہیں بہت
بڑا لطف باتوں میں آنے لگا ہے
ہر اک شام اپنی ہے میخانے والی
کئی جام ہوتے ہیں ہر شام خالی
یقیں ہے کہ
یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا
مگر سابقہ تجربے بھی ڈراتے ہیں مجھکو
کہ میں یوں ہی کھلتا رہا تو یقیناً
اگر روز ملتا رہا تو کسی دن
میں سچ بول دوں اور دل ٹوٹ جائے
مگر یہ بھی مجھکو گوارہ نہیں ہے
کہ سچ بول دوں اور دل ٹوٹ جائے
تو بہتر یہی ہے
ملاقاتوں میں اپنی تخفیف کر لیں
ملیں ہم یقیناً
مگر اپنی فرقت کا عرصہ بڑھا دیں
تعلق کو باقی رکھیں عمر بھر
اسے بھول کر سزا دیں۔

پرویز اختر

مَعمُول

بیتی رات
آنگن کوئی "دھم" سے کودا تھا
اور میں نے ڈر کر
خود کو اک بوسیدہ چادر میں باندھ لیا
سانسیں اٹک گئیں تھیں
پلکیں الجھ گئیں تھیں

صبح ہوئی
سورج کی جگ مگ میں، میں نے
گھر کی ایک اک چیز تمہاری
گھسی ہوئی دو پینٹیں، بشرٹ
چار عدد برتن
کچھ سادہ کچھ لکھے ہوئے کاغذ
بے ترتیب کتابیں، لیمپ، قلم
سگریٹ کے ٹکڑے، ایش ٹرے
اور میز

سب کچھ اپنی جگہ پر تھا
کوئی تبدیلی یا نقصان نہیں تھا

بیتی رات
آنگن میں کوئی "دھم" سے کودا تھا
اور اب ہر رات آئی جاتی ہے
آنگن میں کوئی "دھم" سے کودے
اور میں ڈر کر
خود کو اک بوسیدہ چادر میں محفوظ کر
سانسیں اٹکیں گی
پلکیں الجھیں گی

سورج نکلے گا۔

● ملت منی سرائے چاند پور۔



نسترن احسن فتیحی
معرفت علی رضا فتیحی، اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر، سولن (ہماچل پردیش)

تشنگی

میں تھک کر چور ہو چکی تھی۔ آج صبح میں نے مشینی انداز میں سارے کام کئے تھے۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی، تو دن کے دو بج رہے تھے، پھر میری نظر اپنی میلی اور شکن آلود ساڑی پر گئی۔ بہت دیر تک کچن میں کام کرنے سے مجھے گرمی بھی لگ رہی تھی۔ اور بس کے آنے سے پہلے مجھے تیار ہو جانا تھا، اس لئے نہانے کے ارادے سے کپڑے نکالنے کے لئے الماری کی طرف گئی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے ٹھٹھک گئی۔ آج ڈریسنگ ٹیبل کا شیشہ بہت چمک رہا تھا۔ اور اس میں میرا سراپا بہت واضح ہو گیا تھا۔ مجھے لگا جیسے آج آئینہ کی ساری دھول مجھ پر آ گئی ہے۔ مجھے اپنا میلا سا سراپا اپنی ہی نظروں میں عجیب لگا۔ روز جب اسی آئینے پر دھول کی ہلکی سی پرت کے پیچھے میں اپنا چہرہ دیکھتی تو اس چہرہ پر چھائی تھکان۔ مجھ سے چھپی رہتی تھی۔ آج صاف و شفاف آئینے میں اپنا تھکا اور میلا سا سراپا، وقت سے پہلے بالوں میں ایک دو چاندی کے تار..... جیسے میری ہی محنت پر منہ چڑا رہے تھے۔ میں جلدی سے الماری کی طرف بڑھ گئی، وہاں بھی مجھے جھنجھلاہٹ ہوئی۔ کیا پہنوں جو اچھا بھی ہو اور یہ بھی نہ لگے کہ میں نے کوئی خاص تیاری کی ہے۔ دو چار اچھے جوڑے جو کہیں آنے جانے پر ہی نکلتے تھے۔ اور گھر میں پہننے کے سارے بے جوڑ بدرنگ سے۔ اچانک میری نظر ایک سوتی ساڑی پر رک گئی۔ جو قیمتی نہ سہی مگر مجھے بہت پسند تھی۔ آج کے لئے مجھے سب سے زیادہ وہی مناسب لگی اسے میں نے ڈیڑھ سو روپئے میں پریس کروا کر رکھا تھا اس لئے نکالنے کا دل بھی نہیں کر رہا تھا۔ مگر پھر یہ سوچ کر کہ ایسے موقع پر ڈیڑھ سو روپئے کے پریس کی قربانی دی جا سکتی ہے۔ میں نے وہ ساڑی نکال لی۔ نہا کر نکلی تو کسی حد تک تھکان اور گرمی سے نجات مل چکی تھی۔ میرا موڈ بھی خوشگوار ہو گیا تھا۔ نہانا بھی انسان کی شخصیت پر کتنا اثر ڈالتا ہے۔ میں نے بال سنوارتے ہوئے خود کو پھر سے آئینے میں دیکھا۔ زرد رنگ کی میرون بارڈر والی ساڑی میں، میں بڑی گریس فل لگ رہی تھی۔ بالوں میں ایک دو چاندی کے چمکتے ہوئے تار اس کپڑے سے بہت میچ کر رہے تھے۔ اب میں مطمئن تھی۔ عذرا کو آنے میں ابھی چند گھنٹوں کی دیر تھی۔ اور میں اپنا سارا کام ختم کر چکی تھی۔ میں باہر چھوٹے سے برآمدے میں نکل آئی۔ بستر پر لیٹنے کی خواہش تھی مگر ساڑی کی کریز خراب ہونے کا ڈر تھا۔ اس لئے برآمدے ہی میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ بادل گھر آئے تھے۔ اور خوشگوار ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بھلے لگ رہے تھے۔ میں نے کرسی کی پشت سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور کچھ دیر خالی الذہن سی بیٹھی رہی۔ دل پر کچھ عجیب سے احساسات کا غلبہ تھا۔ میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ میں بہت خوش ہوں یا اس خوشی میں اداسی کا رنگ بھی گھلا ہوا ہے..... آج صبح۔ جب سے ٹیلی گرام آیا تھا کہ عذرا شام کو یہاں آ رہی ہے، صرف چند گھنٹوں کے لئے ـــ تب ہی سے میں نے ایک پل بھی ضائع نہیں کیا تھا۔ خوشی اور بے چینی کا احساس مجھ پر غالب تھا۔ لیکن اس خبر کے ساتھ ہی میں گھر کے کام میں اس قدر مصروف ہو گئی کہ اپنی اس کیفیت پر زیادہ دھیان نہ دے سکی۔ گھر کو نئے سرے سے صاف کیا تھا۔ ایک ایک چیز کو صاف کر کے چمکایا تھا۔ بستر کی چادریں بدل ڈالی تھیں۔ احمد کو آفس جانے سے پہلے سو بار تاکید کی تھی کہ مجھے کچھ چیزیں بازار سے لا دیں تاکہ شام کی پر تکلف چائے کا انتظام کر سکوں احمد نے فہرست پر سرسری سی نظر ڈالی تھی۔ اور آفس جانے سے قبل سامان لا کر دے دیا تھا۔ ایک دو بار میری ساری تیاریوں کو مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔ مگر بولے کچھ نہیں تھے۔ مگر میں جانتی تھی کہ وہ دکھاوے کے بہت خلاف ہیں اور میری ان تیاریوں کی ان کی نظروں میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ اسے یقیناً فضول سمجھ رہے تھے۔ اسی لئے میں ان سے نظریں چراتے ہوئے کچن میں چلی گئی تھی۔ بہر حال آج اپنی سفید پوشی کا بھرم قائم رکھنے کے لئے میں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ کیوں کہ آج میری عزیز ترین سہیلی آنے والی تھی۔ ایک ایسی سہیلی جس کا میں ہمیشہ ہی مرعوب رہی تھی۔ خوشی، بے چینی اور کرب کا ملا جلا احساس جیسے مجھ میں گھل رہا تھا۔ آنکھیں بند کئے میں ڈوبنے لگی اپنے ماضی کے دھندلکے میں... ایک بہت خوبصورت دور..... دو لڑکیاں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے

ہر وقت مسکراتی اور کھلکھلاتی ہوئی، کبھی تتلیوں کے پیچھے بھاگتی ہوئی کبھی امرود اور جامن کے پیڑ پر چڑھتی ہوئی۔ پھر وقت کا گھوڑا تیزی سے دوڑا اور یہ خوبصورت دور اپنے ساتھ لے گیا۔ اور اس دور کی خوشگوار، بے فکر اور انمول گھڑیاں ماضی کے کسی حسین گوشے میں جا گریں۔

اب تھا ایک نیا دور۔۔ نئے عزم، نئی امنگوں کے ساتھ — لڑکپن کی حدود سے نکل کر جوانی میں قدم رکھتی ہوئی دو ننھی کلیاں — عذرا اور نسرین برسات کی پھوار سے دھلے اور نکھرے ہوئے اس تازہ کھلے پھول کی طرح جو ہر ایک کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ عذرا بے حد چنچل، سانولی صورت اور تیکھے نقوش والی پیاری سی لڑکی۔ ہر وقت مسکراہٹ بکھیرتی ہوئی، جیسے مسکراہٹ اس کی شخصیت کا ایک اہم حصہ ہو اور اس کے بغیر اس کا وجود نامکمل — دوسری طرف میں، دوسروں کی زبانی اپنی تعریف سن کر خوبصورتی کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ میرے سفید رنگ اور بڑی بڑی آنکھوں کے کئی متوالے تھے — یہ وہ دور تھا جو زندگی کا سب سے خوبصورت دور ہوتا ہے جہاں بہاریں ہوتی ہیں، خوشیاں ہوتی ہیں، سہانے خواب ہوتے ہیں۔ روشن مستقبل کے سہانے خواب۔ اپنی زندگی کے اس خوبصورت دور میں میں نے محسوس کیا کہ میں ہر پل ہر لمحہ سرشار رہتی ہوں۔ میرے وجود میں ایک بے نام سی خوشی ہر وقت گھلی ملی رہتی، ایک خواہ مخواہ کا غرور میری نس نس میں بس گیا تھا۔ میری ساری سہیلیاں کافی امیر و کبیر گھر کی لڑکیاں تھیں۔ میرے پاس میری ساری دولت میری خوبصورتی تھی۔ اچھی اچھی امیر لڑکیوں نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اور میں ان کی صحبت میں اپنی اصلیت پہچاننے سے انکار کرنے لگی۔ مجھے اپنی امیر سہیلیوں کی ہر بات اچھی لگتی۔ میں ہر بات میں آنکھ بند کر کے ان کی تائید کرتی۔ ان کی آزادی اور بے فکری کی نقل کرتی۔ خود کو ان کے معیار کا بنانے کے لئے مجھے کیا کیا جتن کرنے پڑتے۔ وہ کالج میں روزانہ کھانے پینے پر دس بیس روپے خرچ کر دیتیں اور ایسے موقع پر میری مٹھی میں دبا ہوا دو روپے کا نوٹ پسینے پسینے ہو جاتا۔ ہر بناوٹ کے باوجود میں اس وقت اپنا احساسِ کمتری نہیں چھپا پاتی۔ ویسے وقتی طور پر میں یہ بھول کر کہ میں نے ایک متوسط طبقے میں جنم لیا ہے، بہت اونچے اونچے خواب دیکھنے لگی تھی میرے کچے ذہن پر آزاد اور امیر سہیلیوں کی ثقافتی زندگی کا رنگ بھاتی چلی گئی۔

اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا، اپنے پیروں پر کھڑا ہونا اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ جس کے میں خواب دیکھتی پھر بھی میرے اندر کچھ ایسا بھی تھا جو اس کے بالکل برعکس تھا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا کہ میری ساری خوشیاں بڑی سطحی ہیں بلکہ ان ساری خوشیوں کے پیچھے ایک بے چینی، ایک اضطراب کی کیفیت بھی ہے۔ جسے میں شعوری طور پر خود سے دور رکھتی اور اسے اپنے آپ پر حاوی نہیں ہونے دینا چاہتی تھی — لیکن پھر مجھ میں بڑی تبدیلی آنے لگی۔ میں سنجیدگی سے اپنے حالات کا تجزیہ کرتی۔ آخر کار مجھے لگا کہ میں نے اپنے دکھ اور غم کی وجہ جان لی ہے۔ اپنے سے زیادہ اونچے طبقے کی سہیلیاں بنا کر ہمیشہ میں نے اپنی انا کو مجروح کیا ہے۔ گھر میں چھوٹی بڑی ضرورتوں کے لئے پاپا کو جدوجہد کرتے دیکھتی۔ آرام کرنے کی عمر میں بھی انہیں کام کرنا پڑتا تھا۔ ہماری تعلیم، ہماری ضرورتوں کے لئے — اور — پاپا کے متفکر چہرے کو دیکھ کر ہی میرے دل سے خوشی کے سارے احساسات پھسل پھسل جاتے۔ پھر میرا دل چاہتا کہ پاپا کے ضعیف وجود سے چمٹی ہوئی پریشانیاں، ممی کے نازک سراپے سے الجھی ہوئی پریشانیوں کو ایک پل میں دور کر دوں۔ کچھ تو کر سکوں سب کے لئے کہ ان کے پریشان چہروں پر خوشی، بے فکری اور ہنسی کی پھوار برسنے لگے۔ مگر کچھ بھی نہ کر سکی میرے سارے چھوٹے بڑے خواب زمیں بوس ہوتے چلے گئے۔ گریجویشن کے بعد میں گھر بیٹھ گئی۔ ان سہیلیوں کا ساتھ چھوٹا اور میں نے اپنے حالات کا جائزہ لیا تو احساس ہوا کہ حالات سے سمجھوتہ کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ عذرا مجھ سے اکثر ملتی رہتی۔ اس کی تعلیم جاری تھی۔ پھر میری زندگی میں ایک نیا موڑ آیا، جو کوئی نئی بات نہیں تھی — پھر شادی ہو گئی اور میں ایک نئے گھر اور نئے ماحول میں آ گئی اپنے شفیق والدین سے دور ان کے لئے کچھ کرنے کے عزم وہیں کہیں چھوڑ کر یوں تو زندگی بڑی مطمئن گذر رہی تھی۔ سب کچھ ہی تھا۔ سب سے بڑھ کر ایک اچھا چاہنے والا بلند کردار ساتھی — اور اس کے علاوہ زندگی کو سادگی سے گذارنے کے تمام ذرائع۔ پھر بھی میں کبھی کبھی بہت دکھی ہو جاتی۔ کیونکہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک روایتی بیوی بن کر زندگی گذاروں گی۔ کیا کچھ بننے کے خواب دیکھے تھے مگر کچھ نہیں بن سکی۔ اس طرح گذرتے وقت کے ساتھ میں نے اپنے سارے احساسات کو تھپکیاں دے دے کر سلا دیا۔ اور اس پر صبر کی سل رکھ دی — اب بہت کم ایسی باتیں سوچا کرتی اور اب میرے پاس ایسی باتیں سوچنے کا وقت ہی کہاں تھا — لیکن آج اتنے دنوں بعد —

عذرا کی آمد کی خبر نے پھر سے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ سارے سوئے ہوئے احساسات جاگ اٹھے تھے۔ اور میرے اندر وہی مصنوعی نسرین سر ابھار رہی تھی جسے اپنے گھر کی ہر چیز پھیکی، بدرنگ اور بے حیثیت لگ رہی تھی۔ عذرا کے سامنے خود کو پہلے سے اچھا پیش کرنے کے لئے میں نے کتنی محنت کی تھی آخر وہ ایک بڑے گھر کی بہو تھی۔ اور اب تو خود بھی وہ ایک بڑی پوسٹ پر تھی میرا اضطراب بڑھنے لگا، مجھے انتظار کرنا مشکل لگ رہا تھا اتنی دیر سے کلف لگی پیسے کی بھری ساڑھی میں خود کو اسٹیج بنائے جانے پہ بے حد تکلیف محسوس ہونے لگی

...نچے گھر کو بے ترتیب نہ کر دیں۔ اس لئے میں نے بڑی فراخ
...پاس والے پارک میں جا کر کھیلنے کی اجازت دے دی تھی۔
...خدا خدا کر کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور عذرا کے آنے پر اس
...کے لئے میں دوڑی۔ احمد بھی آفس سے آ چکے تھے۔ بچوں کو
...میں نے پڑھنے بٹھا دیا تھا۔ عذرا اور میں ایک دوسرے سے اتنے
...ملے تھے کہ ہم والہانہ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ ہماری
...سے نمناک تھیں۔ ہم دونوں بہت دیر تک ماضی کی سہانی یادوں
...ر خوش ہوتے رہے۔ عذرا بہت بدل گئی تھی اب وہ ایک شوخ
...نہیں رہی تھی۔ بلکہ اس کی شوخی کی جگہ سنجیدگی نے لے لی تھی۔
...بھر کم بھی ہو گئی تھی ہاں اس نے مجھے دیکھ کر کہا کہ۔ نسرین تم
...میں صرف بالوں میں ذرا سفیدی جھلکنے لگی ہے احمد بھی عذرا سے
...ی دلچسپ باتوں پر مسکراتے رہے۔ لیکن پھر جلد ہی انہوں نے ہم دونوں کو
اکیلا چھوڑ دیا عذرا نے میرے پیارے بچوں کی بہت تعریف کی۔
...ت سارے تحائف دئے۔ وہ مجھ سے اور میرے گھر سے کتنی
...ش تھی۔ اور اس خوشی کا اظہار بھی کر رہی تھی۔ لیکن ان سب کے
...رسا میں اور پہلی والی عذرا میں ایک نمایاں فرق نظر آ رہا تھا۔ اُ
...ں جو آنکھیں ہر وقت مسکراتی ہوئی سی نظر آتی تھیں اب ان آنکھوں میں ایک
...ی۔ آخر کار میں نے دل کی بات اس سے پوچھ ہی لی۔ عذرا پہلے تو
...ن کر مسکرائی پھر سنجیدہ ہو گئی۔ اور بڑی آہستگی سے میرا ہاتھ اپنے

ہاتھوں میں لے کر کہا۔ تم نے پوچھا ہے نسرین تو میں ضرور بتاؤں گی۔ میں بہت تنہا ہوں۔ آج تم نے جس اپنے پن سے پوچھا ہے شاید اس خلوص کی گرمی میں میں پگھلنے لگی ہوں۔ تمہیں نہیں معلوم کہ ہم نے شادی کے دو سال بعد ہی میں نے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ میرے گلشن حیات میں کبھی کوئی پھول نہیں کھلا۔ ازدواجی زندگی میں ناکامی کے بعد میں نے پھر شادی نہیں کی۔ میری زندگی بڑی ویران ہے۔ تم جانتی ہو نسرین۔ اعلیٰ سوسائٹی بڑی کھوکھلی ہوتی ہے۔ وہاں صرف پیسوں کی کھنک ہے خلوص اور محبت کی گرمی نہیں اور میں نے اب جانا ہے۔ زندگی میں روپیہ ہی سب کچھ نہیں۔ میں نے ایک غلط ساتھی کا انتخاب کیا تھا جو عیش پسند تھا۔ جو ہر رات اپنے لئے ایک بیوی خرید سکتا تھا۔ ایسے آدمی کے ساتھ میں ساری زندگی کیسے گذارتی۔ پھر مجھے شادی کے نام سے چڑ ہو گئی۔ مگر آج تم سے مل کر لگا کہ میں غلط تھی۔ ہر آدمی میرے شوہر کی طرح تو نہیں ہوتا۔ تم اس معاملے میں بہت خوش قسمت ہو۔۔۔

عذرا اور بھی نہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی۔ مگر میں حیرت سے عذرا کو دیکھ رہی تھی۔ یہ عورت جس کو میں نے ہمیشہ رشک کی نگاہ سے دیکھا۔ وہ کتنی دکھی ہے اور میں سوچ رہی تھی کہ ہر طرح سے کامیاب اور مکمل زندگی جی رہی ہو گی۔

عذرا کو رخصت کر کے میں نڈھال سی بستر پر گر گئی۔ کیسی ہے یہ زندگی۔ کیا یہاں ہر انسان پیاسا ہے۔ ایک تشنگی کے احساس سے چھپتا ہوا۔ اپنے آپ میں ادھورے پن کا احساس لئے ہوئے۔ اس تشنگی، اس پیاس کا نام ہی شاید زندگی ہے۔

٭

...کتب و رسائل

POETRY TIME
A HUMANIST REVIEW

...مشہور و معتبر شاعر و ادیب کرشن نارائن مہاپاترا
...نے ۱۹۷۱ء سے انگریزی زبان کا معیاری ادبی جریدہ
...انگریزی شاعری کے علاوہ دیگر ملکی زبانوں
...شائع کرتا ہے۔ نئے شمارے میں ۵۲ ہندوستانی
...شاعروں کے تراجم بھی ہیں ان میں براج کومل
...عبدالستار ... شامل ہیں۔ ۶ غیر ملکی شعرا بھی
...شامل ہیں۔ کرشن نرائن مہاپاترا کی ۲۰ منتخب
...عنوان THE SHADOWED SU...
...معروف شاعر پی۔ کے۔ ... کی شاعری پر
...شائع شدہ ۱۲ ادبی کتابوں ...
...کئے گئے ہیں۔ ایک مضمون ... ادبی رسالہ ...
...زبانوں کی عصری شاعری کا ...
...صفحات، قیمت دس امریکی ڈالر۔

POETRY TIME PUBLICA...
ROAD BERHAMPUR-76...

جواز [خصوصی اشاعت]

اردو کے معتبر ادبی رسالے جواز کا شمارہ نمبر ۲۰ [جون ۱۹۹۰ء تا مئی ۱۹۹۱ء] اپنے دامن میں عصری شعر و ادب کا معیاری انتخاب لئے ہوئے ہے۔ ۶ فکر انگیز تنقیدی مضامین۔ ۸۱ شعرا کی تازہ کار نظمیں۔ ۶۰ شعرا کی تخلیقی غزلیں۔ ۵ افسانہ نگاروں کی عمدہ کہانیاں۔ محاسبے کے تحت ۸ نئی مطبوعات پر سلیم شہزاد کے غیر روایتی تبصرے۔ مستقل عنوانات: مدیر: سید عارف، نشاط انور۔ ضخامت: ۲۲۴ صفحات قیمت: ۲۰ روپے۔ رابطہ: ماہنامہ جواز، مولانا آزاد روڈ، مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳ ناسک مہاراشٹر

دامنِ فطرت

اردو کے ایک فراموش کار ادیب، شاعر، نقاد اور صحافی قمر نعمانی [پ: ۳ر صفر ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء؛ م: ۲۰ر صفر ۱۳۹۶ھ مطابق ۳ر مئی ۱۹۷۶ء] علامہ سیماب اکبرآبادی کے عزیز شاگرد تھے اولین شعری مجموعہ جو ان کے انتقال کے ۱۴ سال بعد ڈاکٹر مظفر حسن عالی نے ترتیب و انتخاب کے ساتھ شائع کیا۔ کتاب میں ۶۰ غزلیں، ۲ نظمیں - ۲۱ اشعار — ... جن — علامہ سیماب اکبرآبادی اور اصغر گونڈوی کی غزلوں پر تضمین ۲۲ پابند، ۸ نظمیں، ۲ گیت، دو قصیدے، ۴۲ رباعیاں۔ ۸ قطعات — کتاب کی ابتدا میں: عرض مرتب اور قمر نعمانی کا ذہنی سفر از مظفر حسن عالی اور قمر نعمانی: ایک تعارف از مولانا ارتضیٰ الدین عارف نعمانی ... کے مضامین شامل ہیں۔ ضخامت ۱۵۲ صفحات قیمت: ۲۵ روپے۔ ... کے زیر اہتمام ... پبلشنگ، ۲ گولا مارکیٹ، دریا گنج۔ نئی دہلی ۲ نے شائع کیا۔

پرواز ادب [آزاد گلاٹی نمبر]

محکمہ السنہ پنجاب کی جانب سے شائع ہونے والے رسالے پرواز ادب نے نومبر دسمبر ۱۹۹۰ء کا ایک خصوصی شمارہ اردو کے معروف شاعر آزاد گلاٹی پر شائع کیا ہے۔ اس سے قبل مذکورہ رسالے نے ... اور ... خاص نمبر شائع کئے ہیں۔ آزاد گلاٹی کے فکر و فن پر یہ ایک قابل قدر کوشش ہے۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے۔ رابطہ: ڈائرکٹر اردو، محکمہ السنہ پنجاب، پٹیالہ ۱۴۷۰۰۱

تجربہ

شہناز نبی

یہ سچ ہے کہ میں
اننت اندھیروں
اتھاہ رستوں کی ہم سفر تھی
میں خندقوں، کھائیوں میں گری تھی
پہاڑوں میں کھو گئی تھی
جنگلوں میں گھر گئی تھی
مگر یہ سوچو!
اندھیروں ہی نے تو بتایا ہے مجھکو
کہ اپنے سائے سے لپٹے رہنے میں کیا نشہ ہے
خود اپنی دھڑکن کو گنتے رہنے میں کیا مزہ ہے
میں فاصلوں کو نپٹ رہی تھی
مرے تعاقب میں فاصلے تھے
(اندھیرے منزل نہیں بتاتے)
میں جنگلوں سے گزر رہی تھی
میں سن رہی تھی
توانا پیڑوں پہ پھیلا پتہ نہیں ہے کوئی
وہ سارے پتے جو جھڑ چکے ہیں
زمیں سے لگ کر
جڑوں میں کھو کر
نئے جنم کی تلاش میں ہیں
کہا اندھیروں نے یہ بھی مجھ سے
یہ خندقوں، کھائیوں کی پھسلن
ہمیں زمیں ہی سے جوڑتی ہے
انھیں سخت جابر پہاڑوں کے اندر
کہیں کوئی چلبلی ندی بولتی ہے
انہیں پتھروں میں
کہیں ایک پیارسی رہگزر سو رہی ہے
خطا لگے تو خطا ہی کہہ لو
مگر یہ سوچو
اتھاہ رستوں نے کیا دیا ہے،
کہ تاریکیوں ہی سے کچھ ملا ہے

● ۲۷-اے-۱، پیرو علی لین، کلکتہ ۷۰۰۰۱۴

ہائے مرگِ ابابیل

عذرا پروین

کون کہتا ہے بزدل ہے وہ؟
کون کہتا ہے وہ حق شکن ہو گئی؟
کیسے ان سب کو بتلاؤں میں!
ننھی منی ابابیل کی چونچ سے کنکری چھیننا ہرگز آساں نہ تھا
ہاں مگر روز ہی امتحاں کے لیے
زندگی،
صرف دوراہے تعمیر کرتی رہی
کتنے حصوں میں بٹتی رہی،
خود سے لڑتے ہوئے جیتی مرتی رہی
اور پھر ایک دن ـــــ
ایسے اک آخری
جلتے دوراہے پہ لاکے پٹکی گئی
جبکہ تھا ایک طرف لشکرِ ابرہہ
اور ادھر ـ آگ اگلتا ہوا گھونسلہ اس کی امیدوں کا مسکنِ آخری
المدد الاماں کی وہ پیہم صدا
ہر کلیجے کے اس پار جاتی ہوئی ـــ
بین کرتے ہوئے اپنے ننھوں کی چیخیں، سینے میں گھاؤ کرنے لگیں۔
آسماں سے اترتے ہوئے ـ قافلے بھوکے پیاسے گدھوں کے
اس کے اندر کی مغضوب اور مشتعل ماں کو اشتباہ کرنے لگے ـ
اور تنہا دوراہے پہ بے بس کھڑی
ایک ماں ـــ
بھول بیٹھی کہ میں ایک ابابیل ہوں،
جس کا کعبہ شکن ابرہہ سے مروت کا کوئی بھی رشتہ نہیں!
اپنے بچوں کو درندگی سے آخر بچانے کی خاطر،
اک ابابیل ایماں سے پھر گئی
چونچ سے آخری کنکری گر گئی
اور بے بس ابابیل روتی ہوئی
گھونسلے کی طرف اڑ گئی
گھونسلے میں لگی آگ تو بجھ گئی
ہاں مگر،
ایک زندہ ابابیل ـ زخمی جھلسی ابابیل ـ
راکھ میں اس طرح دفن کر دی گئی
کہ ابابیل تو بے نشاں رہ گئی
گھونسلے میں محض ایک ماں رہ گئی

● ۱۴/۲۰۱، عبدالعزیز روڈ، چوک، لکھنؤ-۳

گاؤں کا المیہ

آفتاب جواد

جب تم لوٹو گے
تو دیکھنا
شہر کی ویرانیاں ابابیل کی طرح
یہاں بھی اپنا ڈیرہ ڈال چکی ہیں
اب کسی بھی آنکھ میں
پہچان کی خوشبو نہیں ہے
چوپالوں کے دیئے
کب کے بجھ چکے ہیں
بہت ہی جان لیوا سناٹا
وہاں لیٹا رہتا ہے
جب تم لوٹو گے
تب امرائیوں میں
کھڑے پیڑوں کی
بے صدا اداسی میں
ہواؤں کے ساتھ
گمسم سرگوشی سنو گے
بچے گھاٹوں والی ندی کا تٹ
مولسری کا پیڑ
نیتر جل دھارا
اور چوباروں میں
بجھے ہوئے گھوروں کی راکھ
تمھیں لمحہ بھر
ٹھہرنے کو مدعو نہیں کریں گی
جب تم لوٹو گے
تو دیکھنا۔

● کوٹ بازار، وارڈ نمبر ۱۶ سیتامڑھی

عزیز حامد مدنی مشاہیر کی نظر میں

(حا)مد مدنی ایک نابغۂ روزگار

(...)الدین عالی

...کہ کوئی دوستی نہ تھی صرف پرانی ملاقات تھی اور ...پر اختلاف ہی رہتا تھا مگر بلا تکلف عزیز حامد ...مجموعے " نخلِ گماں " کے بعد میری عمر ...کے زندہ اردو شعراء میں سب سے ...ز ہو چکے تھے۔ میں انہیں ایک بڑا شاعر مانتا ...پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہ الگ بات ہے کہ ان کا ...پ اعلیٰ مداحاں نہیں تھا نہ وہ ایسے ساجی ...جن کا لحاظ یا اخلاقی دباؤ اخبارات یا جرائد ...تبصرے جاری رکھتا لیکن ان کا ادبی مقام پاک ...مسلّم ہے ان کی غزل اور نظم منفرد مانی جاتی تھی ...یعنی ان کے بعد کی نسل ہی نہیں ان کے ...معاصر کر رہی تھی۔ ان کی تنقیدی نظر ان کی ...شاعری" سے ثابت ہے۔ یہ ہمارے اردو ...ادب کی ایک جامع تاریخ ہے جسے انجمن ترقی ...شائع کرنا شروع کیا ہے جلد اول جو چار سو ...شائع ہو کر ایک تاریخی حیثیت اختیار کر چکی ...جلد جو ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل ہے زیر طبع ...ہے کہ یہ دونوں جدید اردو شاعری پر ایک بہتر ...تنقید کی کمی پوری کر دیں گی اور یہ کتاب حوالہ ...شمار ہو گی۔ شیکسپیئر کے ترجمے بھی ...اہل ذکر اضافی کارنامے ہیں، انہوں نے کئی ...بھی بے مثال ترجمے کئے تھے اور چند ہفتے قبل ...اور انیسویں صدی کے اہم فرانسیسی شعراء کا ...نے کا منصوبہ شروع کیا تھا ...... تاریخ ادب ...نابغۂ روزگار کے طور پر یاد کرے گی۔

(اقبال) کے بعد راشد، فیض اور مدنی

(ڈاکٹر) ابوالخیر کشفی

...فراموش ہو چکا ہے کہ کیسی پوری قوت کے ساتھ ...وہ اس فکر کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لئے ...زندگی کے ریگ زاروں سے گزار کر موت کی ...گھاٹی کے اس سفر نے ہم سب کو اپنے اندر ...دیا ہے۔

...مجھے ہے کہ اقبال کے بعد کے دور شاعری ...شاعر کے بارے میں اس کی زندگی میں کوئی ...ذکر سکا حالانکہ جدید ادب کے بارے میں ...مدنی کے حوالے کے بغیر نہیں لکھا۔ جوش ...کے بعد مدنی ہمارے سب سے بڑے شاعر تھے ...فیض بھی نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ فیض کی شاعری [illegible] حسن کاری کا امتزاج مدنی کی ...توں میں موجود تھا مگر مدنی کی ذات مشرق ...کے مطالعے [illegible] ان کی شاعری [illegible] جنہیں ...راشد کہاں ہیں اور فیض کہاں۔

مدنی کی شاعری میں صنعتی دور، جنگ، دور [illegible] صنعت (پوسٹ انڈسٹریل ایرا) کی پیچیدگیاں، بے مسائل، بے حسیت اور فکر شاعری بن گئی ہیں۔ ان میں مدنی کا کوئی ہمسر اور شریک نہیں۔ مدنی کو اس دور پر آشوب میں شاعری کی اہمیت اور کردار کا اندازہ تھا وہ شاید ہم میں سے کسی کو نہیں۔

عزیز حامد مدنی نے جدید اردو شاعری کے بارے میں اردو لیکچر تحریر کیا اور اس لیکچر کا ایک حصہ انجمن ترقی اردو نے نہایت بھدے انداز میں شائع کیا ہے ایسے ٹائپ میں کہ کتاب کا پڑھنا مشکل ہے حالانکہ انجمن عام کتابیں سلیقے سے شائع کرتی ہے۔

مدنی کی یہ کتاب جدید اردو شاعری (جس کے ایک حصہ کی اشاعت باقی ہے) میری دانست میں مقدمۂ شعر و شاعری کے بعد ہماری شاعری کے بارے میں سب سے اہم تنقیدی بیان ہے اور اس کتاب سے میری اس مستقل رائے کو تقویت ملی ہے کہ فنکار کے لئے بڑا یا کسی بھی درجے کا اہم فنکار ہونا لازم ہے فنکار اپنے فن سے جس طرح آگاہ ہوتا ہے دوسرا نہیں ہوتا۔ حالی، شبلی، عبدالرحمٰن بجنوری، فراق، مجنوں، رشید احمد صدیقی سے عسکری، خورشید الاسلام اور عزیز حامد مدنی تک سارے ہی اہم نقاد ہمارے تخلیقی فنکاروں کی صف میں بھی شامل ہیں عزیز حامد مدنی نے جدید اردو شاعری کا مطالعہ بیک وقت مشرقی ادب، برعظیم کے ثقافتی پس منظر اور عالمی ادب کے تناظر میں کیا ہے۔ اقبال سے متعلق کوئی کتاب نہیں مگر اس میں اقبال کی شاعری کا مطالعہ جس وسیع پس منظر اور نئے فکری امکانات کے حوالے سے کیا گیا ہے وہ ہمیں بیک وقت مطمئن اور حیران کر دیتا ہے۔ مدنی کے بعض خیالات سے مجھے اختلاف ہے آپ کو بھی ہو گا مگر اس سے کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ جو مصنف ہمیں سوچنے پر اکساتے وہی اہم ہوتا ہے۔

عزیز حامد مدنی کی وفات پر ملال

پروفیسر ممتاز حسین

شاید پندرہ روز گزرے ہوں گے جبکہ ان کی عیادت کے لئے میں ان کے گھر گیا تھا میں نے انہیں ہشاش بشاش اور روبہ صحت پایا لیکن پرسوں جبکہ میں بیرون ملک سیاحت سے واپس آیا تو یہ خبر سنی کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مدنی سے میرے تعلقات گزشتہ چالیس برس سے تھے اور جن دنوں میں وہ اسی [illegible] کالونی میں رہا کرتا تھا ان کے ساتھ روز کا اٹھنا بیٹھنا اور شام کے وقت کسی کیفے یا ریستوران میں ان کے ساتھ چند دوسرے احباب کے وقت گزارنا ہوتا تھا۔ کبھی ادب پہ گفتگو ہوتی تو کبھی سیاست زمانہ اور کبھی ملک کی سیاست حاضرہ [illegible] اور جب میں کالونی سے منتقل ہو کر [illegible] تو اس زمانے میں بھی چند عرصے [illegible] ملتے رہا کرتے ہم لوگوں کے ایک مشترک دوست [illegible] آتے کبھی ساتھ اور کبھی الگ الگ [illegible] پہنچتے کن کن موضوعات پر بحثیں ہوا کرتیں۔ مدنی [illegible] میں گفتگو کرنے کے عادی نہ تھے وہ مسکراتے [illegible] نکلتے یا پھر چھوٹے سے کوئی جملے یا فقرے [illegible] طرح ادا کرتے کہ جتنی تحسین سے اس کا [illegible] وہ بڑے مزاج شناس تھے وہ جانتے تھے کہ کس [illegible] حساس اور زود رنج آدمی ہیں اس لئے وہ کبھی کبھی [illegible] خاموش ہو جایا کرتے لیکن مجھ میں نہ تو اس قسم کی [illegible] شناسی تھی اور نہ اس قدر مزاج دانی، میں اکثر ان سے اختلاف بھی کرتا لیکن وہ اس سے نہ تو خفا ہوتے اور نہ [illegible] تحمل سے کام لیتے۔ مدنی کی اور بھی دلربائیاں [illegible] چلتے تو اس طرح کہ وہ ہم لوگوں سے دو قدم آگے [illegible] گنگناتے یہ [illegible] کرتے کہ پیچھے کیا باتیں ہو رہی ہیں کسی [illegible] کی دکان پر پان کھاتے اور پھر ہم سب آگے بڑھ جاتے [illegible] اگر موسم کچھ ٹھنڈا ہوتا یا سرد ہوتا تو ان کا [illegible] کوٹ ان کے کندھے پر لٹکا رہتا مگر وہ کوٹ تمام راستے اسی طرح لٹکا رہتا۔ کتنی پیاری شخصیت، مسکراتے تو اس میں دلربائی، چلتے تو اس میں دلربائی، روٹھتے، جھگڑتے، نفرت [illegible] کرتے انہیں کبھی دیکھا نہیں، چالیس برس تک ایک وضعداری کے ساتھ انہوں نے زندگی کم لوگوں کے ساتھ صرف کی، ایسے دوست کہاں ملتے ہیں۔

ایک محترم اور اہم شخصیت

ادا جعفری

عزیز حامد مدنی علم و ادب کی دنیا میں ایک نہایت محترم اور اہم شخصیت تھے۔ وہ اپنے عہد کے نامور صاحب طرز شاعر بھی تھے اور ایک باکمال اور غیر متنازع تنقید نگار بھی تھے۔ وہ [illegible] علم اور فن کی [illegible] ایک نہایت خوبصورت اور قابل قدر زندگی بسر کر گئے ہیں۔ ان کی وفات ایک بڑا سانحہ ہے لیکن [illegible] میں لکھے ہوئے لفظ کبھی نہیں مرتے ان کی تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتوں اور بصارت کا اعتراف کرنے والے [illegible] میں بھی ہوتا رہے گا۔

عزیز حامد مدنی کی شخصیت اور شاعری

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

عزیز حامد مدنی میرے ہم وطن بھی تھے اور [illegible] بھی تھے۔ البتہ میں تو پرانے نام رائے پوری ہوں۔ میری تعلیم [illegible] مدنی سے میری ملاقات [illegible] ڈاکٹر سید عابد کے ساتھ پاکستان آئے تھے۔ عزیز حامد مدنی نے انگریزی میں [illegible] کیونکہ میرا تعلق وزارت تعلیم سے [illegible] ریڈیو پاکستان [illegible]

ایک توازن تھا ان میں خودستائی والی کوئی بات نہیں تھی۔
وہ ایک عالمانہ شان رکھتے تھے۔

شعر و ادب اور تنقید میں انہوں نے جو مقام بنایا ہے میں اس کے اظہار میں کوئی مبالغہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ میں عرض کروں گا کہ عزیز حامد کو اس شعبہ شاعری سے بھی خاصا شغف تھا، شاعری کا بھی اور دوسری زبانوں کی شاعری کا بھی وہ گہرا مطالعہ رکھتے تھے۔ انہوں نے کراچی کے قیام کے دوران تحقیق کی طرف توجہ دی، جو کچھ بھی انہوں نے تنقید لکھی ہے اس کا تعلق شاعری سے ہے۔ ان کی تخلیقی صلاحیت، شاعری اور تنقیدی شاعری پر ہی صرف ہوئی ہے۔ فلسفے پر ان کی اچھی نظر تھی ان کی تنقید روایتی نہیں ہے۔ میں نے سنا ہے کہ اردو شاعری کے بارے میں کچھ اور غیر مطبوعہ مضامین ہیں جن کی اشاعت کے بعد ان کا ادبی مرتبہ پوری طرح سامنے آئے گا۔ انہوں نے اردو شاعری کی روایت کو قائم رکھا۔ ان کا ادبی مزاج جدیدیت پسند تھا۔ انہوں نے اور نقادوں سے ہٹ کر [illegible] کے نظریات میں فرانسیسی اور جرمن زبان کی تنقید کا بڑا حصہ ہے۔ انہوں نے فرانسیسی نظموں کے ترجمے بھی کئے ہیں۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ ان کی پابند نظم میں بھی جدید خیالات ملتے ہیں۔ وہ عقل پسند نظر آتے تھے کہ انہیں کوئی معمولی چیز پسند نہیں آتی تھی ان کی شاعری عام ڈگر سے ہٹ کر ہے۔

نمائندہ اور پائندہ شخصیت

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

عزیز حامد مدنی ہمارے عہد کے نہایت ممتاز، منفرد اور نمائندہ اور پائندہ شاعروں میں تھے۔ اپنی شخصیت کے اعتبار سے بھی اور اپنے فن کے لحاظ سے بھی ان کی شخصیت بڑی توانا تنقیدی شعور سے آراستہ ایک نہایت سنجیدہ، متین، وسیع النظر اور پر وقار شخصیت تھی۔ وہ ہر چیز کو اور ہر بات کو انتہائی توجہ اور علمی دیانت کے ساتھ ماضی و حال کے پس منظر و پیش منظر اور مستقبل کے امکانات کی روشنی میں دیکھنے کے عادی تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع، ان کا مشاہدہ گہرا اور انداز فکر نہایت عمیق و آفاقی تھا۔ اسی لئے وہ کسی علمی و ادبی مسئلے پر عجلت میں رائے دینے کے عادی نہ تھے، کسی کو طنز و تضحیک کا نشانہ بنانا بھی ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ وہ دوسروں کی تعظیم و تکریم کے لئے بھی بہ صد وقت آمادہ رہتے تھے اور اپنے لئے بھی یہ اخلاق گوارا کرنا پسند کرتے تھے چنانچہ بعض قریبی دوستوں کے سوا نہ تو وہ کسی کے ساتھ آسانی سے بے تکلف ہوتے تھے اور نہ دوسرے کو خواہ مخواہ بے تکلف ہو جانے کا موقع دیتے تھے۔ غرض یہ کہ ان کی شخصیت ایک سمت بڑے نپے تلے اور سنجیدہ و شائستہ ذہن رکھنے والے ادیب و شاعر کی ایک منفرد شخصیت تھی اور یہی شخصیت ان کے فن میں ہر جگہ جاری و ساری ہے۔

جدید اردو شاعری، خصوصاً جدید اردو غزل کی تاریخ میں مدنی کی آواز بالکل نئی اور منفرد آواز ہے۔ یہ آواز الہامی و وجدانی ہونے کے باوجود بھی آسمان سے نہیں اتری۔ مدنی نے اس آواز کو سامنے کی گوشت پوست والی پُر ہجوم دنیا کی آواز سے ملا کے رکھا ہے۔ اس کے تہذیبی و سماجی عناصر کو تخلیقی تجربہ کی بھٹی سے گزارا ہے اور گرد و پیش کی فضائے شاعرانہ سے تخلیقی بھرپور اثر قبول کیا ہے۔ یہی تو ان کی شاعری، طرز احساس کے نئے پن اور انداز و آہنگ کی جدت کے باوصف کلاسیکی رنگ و آہنگ سے کسی جگہ الگ نہیں ہوتی۔ چراغ سے چراغ روشن کرنے اور قدیم کی کوکھ سے نئی بات جنم دینے کا سلیقہ ان کی شاعری میں شروع سے آخر تک ملتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے شاعرانہ لہجے کی انفرادیت کو کسی نام سے موسوم کرنے کی کوشش کیجئے تو کوئی نام ہاتھ نہیں آتا اور اب تو خود مدنی کے لفظوں میں صورت یہ ہے کہ۔

ختم ہوئی شب وفا، خواب کے سلسلے گئے
جس دیار نیم باز کے پیش تھے مرحلے گئے

چراغ بزم ابھی جان انجمن نہ بجھا

پروفیسر شمیم احمد

جہاں تک عزیز حامد مدنی جیسی شخصیت اور ان سے تعلق کا سوال ہے تو میں اعتبار سے گزشتہ 43 سال میں ان کی ذات اور شاعری دونوں کو موجودہ عہد کی اعلیٰ ترین قدر اور سب سے بڑی تخلیقی قدر کی صورت میں محسوس کرتا رہا ہوں۔ میری نظر میں وہ بحیثیت شاعر برصغیر کے جدید عہد کے شعراء میں ان گنتی کے بڑے ناموں میں شمار ہوتے ہیں کہ جنہوں نے بین الاقوامی شعور و فکر کو اپنی شاعری میں سمو کر اردو شاعری کو عالمی فکر اور شعور کا حصہ بنا دیا ہے اس میں اقبال جیسا عظیم شاعر بھی شامل ہے اور پھر فیض و راشد کے بعد مدنی صاحب بلاشبہ ایک عالمگیر اپیل رکھنے والے شاعر تھے اس کے باوجود کہ وہ فیض اور راشد کے بعد اردو شاعری کے افق پر تقریباً 42، 43 کے درمیان نمودار ہوئے لیکن انہوں نے اپنے عصر کے اثرات قبول کرتے ہوئے اپنا ایک مخصوص اسلوب آہنگ بنایا تھا اور ان کی آواز کی شناخت بن گیا تھا یہ اسلوب اپنے ایک خاص مزاج کے اعتبار سے اور فضا کے اعتبار سے اگر ایک طرف غالب تک جاتا تھا تو دوسری طرف اپنے عہد کے تمام شعراء کی تخلیقی اہمیت کو محسوس کرنے کے باوجود اپنا ایک منفرد اور نیا لب و لہجہ گراں کی ابتداء سے ان کی پہچان بن گیا تھا بحیثیت غزل گو تو میں ان کو 42 اور 43 کے بعد آنے والوں میں سب سے زیادہ اہم اور بنیادی غزل گو کہتا ہوں فراق کے بعد وہ پہلے غزل گو ہیں جنہوں نے اپنے زمانے کی جدید فضا کو شامل کرنے کے ساتھ ساتھ ایک ایسے تہذیب کا شعور زیادہ [illegible] تیسری دہائی میں ہمارے سامنے آتا ہے اس سلسلے میں میں نے ان پر ایک تفصیلی تحریر لکھی ہے جس کی اشاعت جلد ہو جائے گی لیکن ذاتی طور پر میں نے مدنی صاحب کی شخصیت کو اپنے پورے عہد کے تناظر میں ایک معصوم ایک انتہائی اخلاقی زندگی بسر کرنے والا ایک حساس باخبر اور محبت کرنے والا بزرگ پایا اور محسوس یہ کرتا ہوں کہ مدنی صاحب جیسی سلیم [illegible] وہ میری زندگی کا ایک مستقل حصہ رہے ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ جس افتخار کے ساتھ وہ رہے ان کا کلام میرے لئے ایک قدر کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ مجھے اب بھی ان کا یہ شعر یاد آتا ہے تو دل و دماغ دونوں اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

ساکنانِ شہر میں اک میکدے کی جان ہوں
کچھ مرے حق میں دعائے خیر فرمایا کرو

شعور اور دانش کا بھرپور اظہار

پروفیسر جمیل اختر

جوش، فراق، راشد اور فیض کے بعد عزیز حامد مدنی بھی رخصت ہو گئے تہذیب و ثقافت کے حوالے سے غور کیجئے تو اپنی تہی دامنی کا احساس شدید سے شدید تر ہو جاتا ہے بیسویں صدی کی اردو شاعری کے مزاج اور رنگ و آہنگ کی تشکیل و تعمیر میں ان شعراء نے اپنے انفرادی مزاج اور اسلوبی امتیازات کے ساتھ گراں قدر خدمات سرانجام دیکر اسے معیار و اعتبار عطا کیا۔

مدنی شعراء کی اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جو جنگ عظیم دوم کے سیاق و سباق میں اپنی تاریخ، تہذیب اور ادبی شعور کے زیر اثر وجود میں آئی۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کی ہمہ گیریت میں انسانی شرف کے معیارات اور امتیازات، ادبی اور ثقافتی رویے، فکر و شعور، سماجی اور معاشی جبر میں گھرے ہوئے آدمی کی نیم جاں آواز، علم و دانش کی برتری، اقدار کی پامالی یہ ہیں وہ مسائل جن سے مدنی کی شاعری عبارت ہے۔

مدنی اپنے مزاج میں کم آمیز آدمی تھے وہ ہر کس و ناکس سے زیادہ نہیں کھلتے تھے مگر حلقۂ یاراں میں اپنی موجودگی کا احساس چشم و ابرو اور جنبش سر کے ساتھ ساتھ گفتگو کے ذریعہ بھی دلاتے رہتے تھے۔ وہ مشرق و مغرب کے فکر و فلسفہ ادبی اور شعری روایت تاریخ اور تہذیب پر گہری نظر رکھتے تھے ان کے علم و شعور میں بڑی گہرائی تھی اس شعور اور دانش کا بھرپور اظہار ان کی شاعری میں بھی ہوا ہے اور ان کی نثر میں بھی۔ ان کا شعری اسلوب بھی سب سے جدا تھا اور ان کا آہنگ بھی انفرادیت لئے ہوئے تھا وہ مقلد نہیں اسلوب طراز اور راہ ساز تھے شاعری میں بھی اور نثر میں بھی۔

مدنی کی اسلوبیات ایک ایسا موضوع ہے جس پر قدیم و جدید، مغربی شاعری، فارسی اور اردو کی کلاسیکی شاعری کے حوالے سے بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ حافظ، عرفی، نظیری اور سب سے بڑھ کر غالب کی تخلیقی ذہانت اور شعری [illegible] نے عہد جدید کے پیچیدہ طرز احساس کے پس منظر میں آمیزش کے بعد مدنی کے انتہائی تخلیقی اسلوب کی تشکیل کی ہے جس میں مجھے کوئی ان کا ہمسر نظر نہیں آتا۔

مدنی کی وفات سے ہمارا ادب اور ہماری تہذیبی و ثقافتی دنیا ایک حقیقی ممتاز شاعر سے محروم ہو گئی۔ جس کا سرمایہ صرف اور صرف اس کی شاعری اور تنقید ہے جس کو کبھی زوال نہیں آئے گا کیونکہ اس کا تعلق نہ تعلقات عامہ سے ہے نہ مقبولیت اور شہرت سے۔ شاید اکیسویں صدی کا ادبی شعور اس کی تحقیق اور مناسب تفہیم کا فریضہ سرانجام دے سکے گا۔

انتخابِ کلام ۔ عزیز حامد مدنی

خود کلامی

لوں کے ہیں ویرانہ اثر
کچھ اور ہے آبادی کا
جاں بھی ہوا خاک بسر
وں میں سند ہے یہ خیال
مجبوری و ناکامی سے
سے محبت کا مآل
مجھ سے لیا ہے میں نے
پرستی کی رصدگاہوں میں
نصب کیا ہے میں نے

ن خاطر موجِ دریا ہے کبھی شبنم
غنیمت جان کر چپ ہو گئے ہیں ہم
ب ہے اس نوخیز کا آئینِ آرائش
سے بڑھ کر اور سرِ ناخن' حنا کم کم
ذکرے دیوارِ زنداں سے بھی ہوتے ہیں
، ہیں بتا اے فصلِ گل آخر ترے محرم

ت کے پرتو نظر میں ہوتے ہیں
حلقۂ وحشت اثر میں ہوتے ہیں
دل پہ کہ تعمیرِ بام و در ہے فریب
قالبِ دیوار و در میں ہوتے ہیں
ل ہی میں پنہاں ہیں سارے نقش و نگار
تو کفِ کوزہ گر میں ہوتے ہیں

! بہار کی دل کا ملال لے گئی
نوں سے حلقۂ گردشِ حال لے گئی
، و نیک و بد گردشِ صد ہزار و صد
کہاں کہاں مرے سرو کمال لے گئی

بر جو تمہاری حکایت حیا سے تھی
ی در پہ ایک برابر ہوا سے تھی
میں جا کے رمزِ محبت نہ بھولتی
امید اک مجھ آشنا سے تھی
مجھے جنوں بھی نہیں ہمرہانِ خام
ابتدا سے جو جو شکایت خدا سے تھی

وہ دن کہاں گئے کہ محبت کے نام سے
پیدا ہزار رنج کی اشارت ہوا سے تھی
فریاد کے سوا نہ رہی گل صورتِ عندلیب
ہر یہ سا اک قبیلۂ خونیں نوا سے تھی

کچھ تو کہئے یہ درد سا کیا ہے جگر کے پاس
مجھ کو بھی لے چلو کسی صاحب نظر کے پاس
اے روحِ دشت قرب کا اتنا بھی پاس کیا
پہنچے ہمارے ساتھ بگولے بھی گھر کے پاس
غمِ چارہ گر سے لرزاں تر ہے درد آج
اب دو قدم اجل ہے دھواں ہے نظر کے پاس
ملی وصالِ دوست کی قیمت نہ ہو سکی
باقی لہو کی بوند جو تھی چشمِ تر کے پاس

ایک ہی شہر میں رہتے بستے کالے کوسوں دور رہا
اس غم سے ہم اور بھی ہارے وہ بھی تو مجبور رہا
وہ اور اتنا پریشاں خاطر رہا غیر کی بات نہیں
لیکن اس کے چپ رہنے سے دل کو وہم ضرور رہا

صورتِ زنجیر موجِ خوں میں اک آہنگ ہے
آگہی کی حد پہ اک خوابِ جنوں سے جنگ ہے
جانے کن چہروں کی تو تھی جانے کس منظر کی آگ
نیند کا ریشم دھواں ہے خواب شعلہ رنگ ہے
ایک جنوں خانے میں خود کو ڈھونڈتا ہے آدمی
خود طرازی میں بھی خود سے سیکڑوں فرسنگ ہے
طوق آہن ہے گلوئے عشق میں تارِ حریر
شاخِ گل دستِ شقی میں ہو تو چوب و سنگ ہے
آب جوئے صرف دلداراں سے جو سیراب تھی
موجِ معنی گم ہوئی ریگِ رواں فرہنگ ہے
ساکنانِ دیر ملتی ہے کوئی ایسی مثال
دیکھنا اس کافرِ عالم پہ کیا کیا رنگ ہے
ایک مرکز پہ ضدیں یکجا ہیں اور گردش میں ہیں
یہ زمانے کا تغیر عالمِ نیرنگ ہے
بوئے گل رخصت ہوئی شاید یہ ہو ختمِ بہار
لوٹتی لے میں کھری صوت شب آہنگ ہے

آگ کو گلزار کر دے اس دعا کا وقت ہے
ورنہ عرصۂ آدمیت' آدمی پہ تنگ ہے

کیا ہوئے بار بیاباں کے پکارے ہوئے لوگ
چاک در چاک گریباں کو سنوارے ہوئے لوگ
اے حریفانِ غمِ گردشِ ایام ۔۔ آؤ
ایک ہی غول کے ہم لوگ ہیں ہارے ہوئے لوگ

تارہ غم ہے محبت کی ہے رتی آکر
کسی کے کام تو آئی یہ دیری آکر
میں اپنی بات کا اپنے خیال کا ہوں حریف
گیا نہ سر سے مرے خطرِ سرکشی آکر

غمِ حیات و غمِ دوست کی کشاکش میں
ہم ایسے لوگ تو رنج و ملال سے بھی گئے
وہ لوگ جن سے تری بزم میں تھے ہنگامے
گئے تو کیا تری بزمِ خیال سے بھی گئے

دشنۂ تیز میں جس زخم کی گہرائی ہے
میرے سینے میں وہ پہلے سے اتر آئی ہے

خدا گواہ کہ تیرے سوا مجھے بھی نہیں
کسی سے رنجشِ بے جا کا اس قدر بھی گماں

یہ فضائے ساز و مطرب یہ ہجومِ ناچاراں
چلو آؤ ہم بھی قلمیں ۔۔ یہ لبانِ سوگواراں
وہ شکستِ خوابِ محفل وہ ہوا کے چار جھونکے
گئی طل پہ ٹھہر بن کر دمِ صبح داغ یاراں

نالہ ہوا بہار کی دل کا ملال لے گئی
پاسِ جنوں سے حلقۂ گردشِ حال لے گئی
تیز ہوا کی تاب سے خوشبو ملی تھی کو ابھی
سعیِ تعمیرِ جہاں ۔۔ آگ سے بال لے گئی



ندا فاضلی

۱۰۳ - امر اپارٹمینٹ، ڈانڈ پاڑہ - ۱، کھار (ویسٹ)، بمبئی ۴۰۰۰۵۲

دیواروں کے بیچ

قسط نمبر ۱۹

بھنڈی بازار میں مکتبہ جامعہ ایک ایسا مرکز ہے جہاں بمبئی کے اکثر ادیبوں، شاعروں سے ملاقات ہوجاتی ہے۔ اس کے منیجر شاہد علی خاں ہیں ان کی سفارش سے ندا کا ایک اور ذریعہ آمدنی پیدا ہوگیا ہے۔ اس نئے کام سے اس کی محدود آمدنی میں اکیاون روپے روز کا اضافہ ہونے لگا ہے۔ اس میں صبح صرف ایک گھنٹہ صرف ہوتا ہے۔ جو ساڑھے آٹھ بجے شروع ہوکر ٹھیک ساڑھے نو بجے ختم ہوجاتا ہے۔ یحیٰی بھائی جبدن والا بمبئی کے مشہور رئیس ہیں۔ ان کی مادری زبان گجراتی ہے۔ لیکن شاعری کی انہی دلچسپی نے ندا کی طرح اور نہ جانے کتنوں کو مختلف وظیفوں سے باندھا ہوا ہے۔ ان میں ایک ساحر بھوپالی بھی ہیں جنہیں ان کے استاد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ساحر، داغ و امیر کی روایت کے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ سماعت سے معذور ہیں آواز بھی لفظوں کی مکمل ادائیگی کا مشکل سے ساتھ دے پاتی ہے کسی کی بات سنتے ہیں نہ اپنی بات دوسروں کو سنا سکتے ہیں۔ یحیٰی بھائی نے اچھی ماہانہ آمدنی کے ساتھ ان کی رہائش کے لئے بھی ایک مکان کا انتظام کر دیا ہے۔ روز وہ کلف دار وائل کے کڑھے ہوئے کرتے اور ڈھیلے سفید پاجامہ ملبوس ہاتھ میں چاندی کی پان کی ڈبیا اور اس کے ساتھ ساٹن کا ڈوری دار بھوپالی بٹوہ لئے یحیٰی بھائی کی آمد سے کچھ ہی دیر پہلے مکتبہ میں آکر اپنی نشست پر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہی وقت ندا کا بھی وہاں آنے کا ہوتا ہے۔ جبدن والا اپنی طلائی جیب گھڑی کے مطابق ٹھیک ساڑھے آٹھ اپنی کار سے اترتے ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی روزانہ کے فقیر جو پہلے سے ان کے منتظر ہوتے ہیں، کھڑے ہوجاتے ہیں۔ وہ ایک رومال میں روپے کھول کر ان میں بانٹتے ہیں۔ اور پھر مکتبہ میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کی آمد کے ساتھ ہی حسب معمول انہیں کی طرف سے اس وقت مکتبہ میں بیٹھے ہوئے سارے لوگوں کو چائے پیش کی جاتی ہے۔ چائے کے بعد وہ مسکراتے ہوئے اپنی اچکن کی اوپری جیب سے کاغذ کا ایک پرزہ نکال کر سامنے بیٹھے ہوئے شاہد علی خاں کی طرف بڑھاتے ہیں جسے وہ جوابی مسکراہٹ کے ساتھ خود پڑھتے ہیں اور پھر اس مسکراہٹ کو تھوڑا مدھم کرکے وہ پرچہ ندا کی طرف کر دیتے ہیں۔ اس کاغذ پر ہر روز ایک شعر لکھا ہوتا ہے۔ یہ شعر یحیٰی بھائی کا ہوتا ہے۔ پرچہ ہاتھ میں لیتے ہی کسی مشاق کی طرح ندا کا کام شروع ہوتا ہے۔ پہلے وہ اس شعر کے محاسن بیان کرتا ہے۔ پھر اساتذہ کے کئی اشعار کے ساتھ اس کا تقابلی جائزہ پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد شعر کے معنوی ابعاد پر روشنی ڈالتا ہے۔ سیدھے سادے روایتی شعر میں نفسیاتی، تاریخی، عمرانی پہلوؤں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ گفتگو میں ندا کے علاوہ سب خاموش سامعین ہوتے ہیں۔ اگر درمیان میں کوئی بھولے سے بولنے کی کوشش بھی کرتا ہے تو صاحب شعر کی نظر کی ہلکی سی جنبش اسے پھر سے سامع بننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ صرف ساحر بھوپالی کی خاموشی ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ اور آنکھوں کے اشاروں سے بولتی رہتی ہے۔ لیکن اس کی طرف دھیان دینے کا کسی کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ تیس پینتیس منٹ تک اس ایک شعر کی مسلسل تعریف سے محظوظ ہونے کے بعد سونے کی جیب گھڑی پھر باہر نکلتی ہے۔ اس گھڑی کے باہر آتے ہی، جو نشست کے اختتام کا علامتی اعلان ہوتا ہے۔ ندا سمیت سارے احتراماً کھڑے ہوجاتے ہیں۔ یحیٰی بھائی دوکان سے نیچے اترتے ہیں۔ اور جاتے ہوئے جیب سے اکیاون روپے کا لفافہ نکال کر ندا کے حوالے کردیتے ہیں۔ یحیٰی بھائی صاحب دیوان شاعر ہیں۔ اس دیوان میں بمبئی کے مشہور فنکاروں کے پینٹنگز کے ساتھ نیاز فتح پوری کا ایک توصیفی دیباچہ بھی شامل شاید اسے بھی انہوں نے اسی قلم سے لکھا ہے۔ جس سے اب سے پہلے وہ جگر اور جوش کو اپنی تنقید کا نشانہ بنا چکے تھے۔ ندا بھی استادی شاگردی اسی قسم کے رشتہ پر آب حیات کے مصنف کی طرح شک کرنے کی بھول نہیں کرتا اور اس بھول کے انعام میں کئی مہینوں تک روز کے لفافوں کو ا

...نا رہتا ہے۔

بمبئی کے ایک پوش علاقہ والکیشور میں ایک کوی گوشٹھی شعری نشست ہوتی ہے۔ ندا کو بھی اس میں مدعو کیا جاتا ہے۔ آبادی کے لحاظ سے بمبئی ... زمین کم بھی ہے۔ اور مقابلتاً مہنگی بھی ہے۔ یہاں تو قبرستان کے مردے بھی مشکل سے چھ سات مہینے قبر میں آرام کرکے دوسرے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ سنا ہے حشر کے روز ایک ایک قبر سے ستر ستر مردے نکلیں گے۔ ممکن ہے اس روایت کے راوی کے ذہن میں بمبئی کا علاقہ ہو ... رنہ وہ ستر کو ہزار سے ضرب دے کر بھی ایسی پیش گوئی کی جرأت نہیں کرتا۔ بچوں کو وقت سے پہلے بالغ بنانے والی تنگ کھولیوں اور ڈبے ... ے فلیٹوں کی اس بستی میں سمندر کے کنارے بنی یہ لمبی چوڑی عالیشان کوٹھی آزادی سے پہلے کے راجے مہاراجوں کی یاد دلاتی ہے۔ اس ... اکیلی مالکن وٹھل بھائی پٹیل کی بہن ہیں۔ دولت کی فراوانی نے ان کے بتی کو وقت سے پہلے سنت بنا دیا ہے۔ ان کے ویراگ دولت کو غریبوں ... تقسیم کرنے کے بجائے خود ان کو غریبوں جیسا بنا دیا ہے۔ اس شاندار قیمتی سامان سے سجے بنے گھر میں وہ ہر وقت بنا آستین کے کھادی کے پرانے ... ڈکے اور میلی سی دھوتی میں گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ نوکر یا مہمان جب بھی کوئی انہیں دیکھ کر نمستے کرتا ہے۔ تو وہ آنکھوں میں آنسو لاکر فوراً ... ک کر اس کے پاؤں چھو لیتے ہیں۔ ان کا ۲۷ نمبر بیڑی کا بہت بڑا کاروبار ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی اور بزنس ہیں۔ گیارہ مہینے نہایت ہوشمندی ... ے کاروبار چلاتے ہیں ایک مہینہ بمبئی آکر بھگوان سے لو لگاتے ہیں۔ اس شعری نشست میں شہر کے بڑے لوگوں کا اجتماع ہے۔ ہر ہاتھ میں اسکاچ ... جام ہے۔ اس ضرورت سے زیادہ خوشحال محفل میں ندا کئی نظمیں سنا کر دوسروں کی تفریح کرتا ہے۔ آخر میں وٹھل بھائی کے اصرار پر ایک نئی نظم پاسپورٹ آفیسر کے نام سناتا ہے۔ یہ نظم ماں کی بیماری کے دوران پاسپورٹ نہ ملنے پر کہی گئی ہے۔

کراچی ایک ماں ہے
بمبئی بچھڑا ہوا بیٹا
یہ رشتہ پیار کا پاکیزہ رشتہ ہے
جسے اب تک
نہ کوئی توڑ پایا ہے
نہ کوئی توڑ پائے گا
غلط ہے ریڈیو
جھوٹی ہیں سب اخبار کی خبریں
نہ میری ماں کبھی تلوار تانے رن میں آئی ہے
نہ میں نے اپنی ماں کے سامنے بندوق اٹھائی ہے
یہ کیسا شور و ہنگامہ ہے
یہ کس کی لڑائی ہے۔

اس نظم کا اثر ہانگ کانگ سے آئے ہوئے ایک بزنس مین سگنو میٹھوانی پر عجیب ہوتا ہے۔ نشست کے اختتام پر وہ بھیگی ہوئی آنکھوں سے ندا کے پاس آکر کہتا ہے۔ میری ماں بھی جنگ کے دوران کراچی میں تھی۔ وہ بیمار تھی لیکن جنگ نے مجھے میری ماں سے ملنے نہیں دیا۔ اور وہ مجھ سے ملے بغیر گذر گئی۔ وہ دیر تک یونہی ندا کا ہاتھ پکڑے کھڑا رہتا ہے۔ اور پھر اچانک چونکتے ہوئے بولتا ہے میں چاہتا ہوں تم میرے لئے کام کرو۔ کیا کام کرنا ہوگا ہے۔ ندا پوچھتا ہے۔ یہی کام جو تم کرتے ہو۔ شاعری کرتے رہو۔ ندا اس کی بات کو نشہ کا جھونک سمجھ کر سن کر ٹال دیتا ہے۔ اور مذاقاً اس پر طنز بھی کس دیتا ہے۔ وہ جاتے وقت اپنا کارڈ دے جاتا ہے۔ دوسرے دن، ندا شام کے وقت اس سے ملنے جاتا ہے۔ وہ کئی مہینوں سے تاڑ دیو کے شیرٹن میں ایک سوئٹ لئے ہوئے ہے۔ اندر رہائش ہے۔ باہر کا حصہ آفس کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اس وقت وہ نشے میں نہیں ہوش میں ہوتا ہے اسے دیکھتے ہی پہلے سے لکھا ہوا چار ہزار کا چیک لفافہ میں رکھ کر تھما دیتا ہے۔ ندا کو یہ سب غیر یقینی سا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن جب دو چار دن کے بعد

(باقی صفحہ ۴۳ پر دیکھئے)

ضمیر درویش

پڑھ لکھ کر گویا پڑھا نہیں
من کا سندیسہ پڑھا نہیں
آثارِ قدیمہ کیا دیکھے
جب وقت کا بہتا پڑھا نہیں
دروازے کی رونق پڑھ لی
گھر کا سناٹا پڑھا نہیں
ماں کا چہرہ پڑھ لیتا ہوں
وَلی اور صحیفہ پڑھا نہیں
حالات پڑھے شاہوں کے فقط
کچھ حال رعایا پڑھا نہیں

● ای-۱۵-بی، ریلوے کالونی (نارتھ)، مرادآباد (یوپی)

سلام فیضی

فرازِ گردوں سے جب روشنی اترتی ہے
کہیں پہ موت کہیں زندگی اترتی ہے
تو اپنے جسم کا سورج اتار دے مجھ میں
دیارِ شب میں سُنا ہے پری اترتی ہے
یہ پودے خواب کے پتھریلی آنکھ سے لے جا
زمیں وہ ڈھونڈ جہاں پر نمی اترتی ہے
اتارنا ہے تو اس کو اتار صحرا میں
سمندروں میں تو اکثر ندی اترتی ہے
گمان ہوتا ہے ترے وجود کا مجھ کو
گیاہِ زرد پہ جب چاندنی اترتی ہے

● خوشی پور، پوسٹ آفس، بلاقی پور، گورکھپور

جاوید اکرم

بزرگوں کی نشانی لکھ رہا ہوں
لہو رشتوں کو پانی لکھ رہا ہوں
سجا کر دھوپ میں کچھ موم کے گھر
محبت کے معانی لکھ رہا ہوں
ہوائیں قید کر کے مٹھیوں میں
دیوں کی حکمرانی لکھ رہا ہوں
بہت مغرور ہے آئینہ میرا
میں خود کو اپنا ثانی لکھ رہا ہوں
زمینیں تنگ ہوتی جا رہی ہیں
قصیدے آسمانی لکھ رہا ہوں

● ۱۴۰/اصول لائنز، فتح گڑھ

راشد انور

دل کی دنیا اور سپنوں کی رانی میں
فرق سمجھ نہ پایا کچھ نادانی میں
اک دن کی ہے بات کہ میں حیرانی میں
آتش بن کر کود گیا تھا پانی میں
سجدے ہزاروں کرتے جاتے ہیں لیکن
نور کہاں ہے لوگوں کی پیشانی میں
ریشمی خوابوں کی ناؤ پہ بیٹھ کے ہم
دیکھ رہے ہیں صورت اپنی پانی میں
تیری حفاظت کا ذمہ کیسے لے لوں
میں تعینات ہوں خود اپنی نگرانی میں

● حمد منزل، اولڈ ایچ-بی-روڈ بالمقابل چونا بھٹہ، رانچی

سرفراز شاکر

زمیں پڑھتا ہوں لکھتا آسماں ہوں
مجھے اب دیکھنا رکتا کہاں ہوں
کہیں دکھتا نہیں ہے میرا سایہ
زمین و آسماں کے درمیاں ہوں
مرے اندر ہے خاموشی کا جمگھٹ
نظر میں سب کی میں سونا مکاں ہوں
مٹانے سے نہیں مٹتا ہوں میں بھی
پہاڑوں کی لکیروں کا نشاں ہوں
مرا گھر پوچھنے والوں سے کہہ دو
یہاں ہوں آج تو کل میں وہاں ہوں

● اندر سوا پچی گیٹ سنگلیوں کی گلی، جودھپور (راجستھان)

سرور ساجد

اس سے ملنا جلنا یونہی تو شمار رہ پائے
اگلے وقتوں میں بھی کیا یہ سلسلہ رہ پائے
ہے عذابِ جان لیکن تو ہی تو ہے ہر طرف
بھول جاؤں تجھکو تو پھر کیا بچارہ پائے
سرد موسم میں کسی کا منتظر، دھن میں مگن
جنگلوں میں مور تنہا ناچتا رہ پائے
رفتہ رفتہ وہ بچھڑ جائے تو پھر اس کے بعد
دل کے اس کھنڈر میں کوئی دوسرا رہ پائے
دشمنوں کی صف میں ہے ہر دوست چہرا لوا
ہاتھ میں ساجد کے کب تک آئینہ رہ پائے

● ۱۳۵۷، بلی ماران، دھلی ۶-۰۰۰

سربِ الھوالیہ
بی-۱۶۳، سیکٹر ۱۴، نوئیڈا۔ ۲۰۱۳۰۱

جسارت

میں ایک سنسان سے راستے پر چل رہا ہوں۔ راستہ ایک چھوٹی سی پہاڑی دامن سے ہوکر گزرتا ہے۔ جب پہاڑی کے نزدیک پہنچتا ہوں تو اس کی چوٹی پر خوبصورت پھول لہلہاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا ہے۔ اور ان پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو میرے بدن میں ایک عجیب سی کپکپی اکر دیتی ہے۔ میرے دل میں ایک آرزو مچلتی ہے۔ کیوں نہ ان پھولوں پاس بیٹھ کر ان کی خوبصورتی اور خوشبو کا لطف اٹھایا جائے۔ میں پہاڑی پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ لیکن دیکھتا کیا ہوں کہ وہ چھوٹی سی پہاڑی ایک پہاڑ بنتی جا رہی ہے۔ اور وہ پھول اور دور ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن میں ھتا جاتا ہوں۔ چڑھتا ہی جاتا ہوں۔ اچانک آندھی آجاتی ہے۔ اور پھر بارش نے لگتی ہے مگر میں نہیں رکتا۔ میرے ہاتھ پاؤں شل ہو جاتے ہیں کہنیاں ہو جاتی ہیں۔ گھٹنے چھل جاتے ہیں مگر میری نظریں ان پھولوں پر ہیں۔ ان کی مہک میری سانسوں میں۔ تمام مشکلات کے باوجود میں رینگتا آگے بڑھتا جاتا ہوں۔ اور آخر وہ حسین پھول ایک ہاتھ کی دوری پر رہ تے ہیں۔ لیکن........

تب پھولوں میں اچانک عجیب و غریب حرکت ہوتی ہے اور ایک دہلا دینے والی بجلی کوند جاتی ہے۔

میرے ہاتھ سے پہاڑ کا دامن چھوٹ جاتا ہے۔ اور میں نیچے کی طرف پھسلنے لگتا ہوں۔ لاکھ کوشش کے باوجود میں اپنے آپ کو روک نہیں پاتا نیچے گہری کھائیاں اپنا خوفناک منہ کھولے میرا انتظار کرتی نظر آتی ہیں۔ اور میں ان کی طرف گرتا جاتا ہوں۔ آس پاس کے درخت اور جھاڑیاں کھل کر ہنس پڑتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ پھول بھی اس ہنسی میں شامل ہو جاتے ہیں

پھر غیب سے ایک آواز گونج اٹھتی ہے۔

"ایک حقیر انسان کی جرأت تو دیکھو فلک کے نایاب پھولوں کی قربت حاصل کرنے کی گستاخی کر رہا تھا۔"

میں نڈھال ہوکر زمین پر گر جاتا ہوں۔ میرا بدن تھکن سے چور ہے اور زخموں سے لہولہان ہے۔ اٹھ کر ان پھولوں کی طرف حسرت بھری نظر سے دیکھتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ ایک بار پھر ہمت کروں مگر دکھتا ہوا بدن ساتھ نہیں دیتا۔

مایوس ہوکر اپنی راہ پر چل پڑتا ہوں۔ میری مایوس نگاہیں ان پھولوں پر ہیں اور میرے شکست خوردہ پاؤں مجھے دوسری طرف کھینچتے ہیں۔

غمناک آنکھوں سے آنسوؤں کا آبشار پھوٹ پڑتا ہے۔

ہر ایک اشک میں ان پھولوں کی تصویر جھلکتی ہے۔ میں ان آنسوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹ کر چلتا جاتا ہوں۔

اور میرے کانوں میں طنز سے بھرپور قہقہے گونج اٹھتے ہیں۔

آپ کا زرِ سالانہ میں ختم ہوا ہے / تھا۔ اس سے قبل بھی یاددہانی کی گئی تھی، ایک بار پھر توجہ کی ضرورت ہے۔ آپ کے خط اور منی آرڈر کا انتظار رہے گا۔ اگر آپ منی آرڈر سے رقم ارسال نہ کر سکیں تو پوسٹ کارڈ کے ذریعہ دفتر کو بھیجنے کی ہدایت کریں۔
اگر آپ کسی وجہ سے شاعر کی ترسیل بند کرنا چاہتے ہوں تو آپ کی طرف شاعر کے جو بقایا جات ہیں ان کی تکمیل کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہے۔

مکتوبات

پیارا اثر ـ ۵-۷، ڈی۔ ٹی۔ ڈی۔ اے کالونی، نیو رنجیت نگر، دہلی

ہندوستان میں اب شاعر ہی ایک ایسا ماہنامہ رہ گیا ہے جو ادبی روایات کو برقرار رکھے ہوئے اور معیار کے ساتھ پابندی وقت سے شائع ہونے کا امتیاز رکھتا ہے۔ آپ کی جرأت مندانہ کوششیں قابل ستائش ہیں۔

رشید مجیب ـ ایم۔ ۲۱۵۔ ڈی۔ [illegible] ۸۴۳۳۰۲ (بہار)

شاعر کے تمام شمارے پابندی سے پڑھ رہا ہوں۔ اور اپنے علم میں اضافہ کر رہا ہوں۔ آپ بہر حال کامیاب ہیں کہ غیر جانبدار ادبی تخلیقات پیش کر رہے ہیں اور اس کے معیار میں اضافہ کرتے جا رہے ہیں۔

یامین صدیقی ـ محمد تلہ گھاٹ کالونی، دربھنگہ (بہار)

ہندوستان میں شاعر واحد ادبی رسالہ ہے جسے نئی ادبی تحریکوں کی سرپرستی کا شرف حاصل ہے اور چونکہ شاعر ان تحریکوں کو چاہتا اور سراہتا ہے اس لیے ہر طرح کے تجربات کو پہلے اسی کی چوکھٹ پر حاضری دینی ہوتی ہے۔ شاعر کا ہر شمارہ اپنے آپ میں ایک تجربہ ہوتا ہے۔

مدیحہ احمد یوسفی ـ رحمت انیا اسکول اسٹریٹ، آسنسول

شاعر کے تمام شمارے اور اس کے مشمولات مجھے تو کچھ ایسے ہی لگتے ہیں جیسے کسی سفالی پیالے میں مختلف النوع، رنگا رنگ سی آب جو شوق قطروں میں کھپ رہی ہوں۔ ندا فاضلی اور جوگندر پال کا قلم اپنے شباب پر ہے۔ ان کی تحریر کی دلکشی تو شاعر کی جان بن گئی ہے۔ ورق گردانی کے ساتھ دل اس کے مطالعے کی طرف مائل بہ نشیب ہی ہو جاتا ہے۔

سید انیس شاہ جیلانی ـ محمد آباد، تحصیل صادق آباد (پاکستان)

شاعر کے چار شماروں کا پارسل ملا، آپ کا لطف آپ کا کرم۔ حیرت شملوی مرحوم کا انداز نگارش ہے۔ روش صدیقی کے بیان میں ڈاکٹر مرحوم سید مبارک شاہ جیلانی کا ذکر بھی آ گیا ہے۔ میں بچپن ہی میں سیماب صاحب کی زیارت کر چکا ہوں، یہ قصہ میں نے نوشتہ نامہ میں نقل کیا تھا۔ شاعر کے بہت بہت سے شمارے بھجوا دیجیے تاکہ میں پڑھ پڑھ کر بے حال ہو جاؤں۔

محمد علی صدیقی ـ اے۔ ۲۴۹، بلاک ۲، ناظم آباد، کراچی

شاعر کے پانچ شمارے موصول ہوئے۔ اگر ہمت ہوتی تو درخواست کرتا کہ آپ مجھے باقاعدہ خریدار بنا لیں اور پیسے پاکستان میں قبول کر لیا کریں۔ میں پیشگی بھیج دوں گا۔ شاعر جیسے جریدے کو ہر قیمت پر زندہ رہنا ضروری ہے۔ آپ کا جریدہ اردو ادب کی گراں مایہ خدمت انجام دے رہا ہے۔ یہ جریدہ تاریخ ساز بھی ہے اور خود تاریخ بھی۔

مشتاق اعظم ـ راجندر کالج، چھپرہ (بہار)

شاعر کا ہر شمارہ سوچ کو اکسانے والا ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ جذباتی تسکین بھی دیتا ہے۔ گزشتہ شاعر کے نام اپنے مکتوب (شمارہ ۱۲) میں آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے کسی کو اختلاف نہیں۔ ثروت قرۃ العین ایک تاریخی کارنامہ ہے اسی لیے اس کی بقا بھی اشد ضروری ہے۔ اس کی آب و تاب قائم رہے یہ دیکھنا ہمارا اخلاقی فرض ہے۔ آپ کی کاوشیں قابل تحسین ہیں۔

اسی شمارے میں شکیب ایاز کا مضمون "نئے سرقے کی ایک مثال میر حسن دہلوی" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جیسا کہ الزام لگایا گیا ہے کہ میر حسن نے واقف کا ایک شعر بجز اپنے نام سے اپنے تذکرے میں نقل کر لیا ہے اگر ایسا ہے تو واقعی یہ سرقہ ہے۔ لیکن اس کے علاوہ جو مثالیں پیش کی گئی ہیں وہ دائرۂ سرقہ سے باہر ہیں کیوں کہ سرقے کے حروف لفظی معنی پیش کیے گئے ہیں FIGURATIVE نہیں۔ یہ کہنا کہ غالب میر کا سرقہ کرتے ہیں، بہت بڑی LITERAL ہے۔ غالب یا کسی بھی ادیب کو جو چیز سرقے سے محفوظ رکھتی ہے وہ اس کا مخصوص اندازِ بیان ہے۔ سوال کیا گیا ہے کہ "اگر خبر گرم تھی تو پورا یا تماشا کیوں نہ ہوا!" وجہ نامعلوم نہ رکھنا غالب کا خاص انفرادی طرز ہے جیسا کہ غالب کے اس شعر سے ظاہر ہے۔

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی ؟

جس طرح غالب کا شعر میر کے شعر کا سرقہ نہیں اسی طرح میر حسن کی غزل بھی واقف کی غزل کا سرقہ نہیں۔ سرقہ کو کلی طور پر DEFINE کرنے کے لیے صرف DICTIONARY MEANING کافی نہیں اصل چیز مواد کا منفرد برتاؤ ہے۔

موضوع کے لحاظ سے اسرار فاروقی کو اپنی کہانی "اکیلا آدمی" کو اور زیادہ DEVELOP کر دینا چاہیے تھا کیوں کہ ترسیل کا مرحلہ بہت جلد طے ہو جاتا ہے اور اس لیے تاثر نامکمل ہو جاتا ہے۔

"دیواروں کے بیچ" میں اسلام پیلی شہری کا خاکہ جاندار ایک ECCENTRIC کے دلکش اور پرمزاح ہے۔ اس میں IRONY بھی ہے اور ہمدردی کا جذبہ بھی۔ حالاں کہ ندا فاضلی خاکہ کشی کے لیے PHYSICAL DETAILS میں نہیں جاتے پھر بھی ان کے قلم میں اتنی طاقت ہے کہ خاکہ میں جان آ گئی ہے۔ خاکہ بولتا ہوا ہے۔

سلطان احمد ساحل ـ [illegible]

ماہنامہ شاعر کا ہر شمارہ ایک تاریخ ساز تخلیقی پیشکش کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ آج کل کی زندگی میں ادبی شوق اور لگن پالینا یقیناً زندگی کے ہی میدان میں ایک مجاہدانہ جنگ ہے۔

اسی تناظر میں شاعر کا شمارہ نمبر ۵ تا ۱۲ نظر نواز ہوا۔ پرچے کی پرواز حسب دستور یا حسب روایت سنجیدہ ادب کے نئے افق کو چھوتی نظر آتی ہے۔ صفحہ صفحہ کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ احساس ہوا کہ ماہنامہ شاعر کا طویل سال کچھ اتنے صاحب "فراموش" ثابت ہوئے کہ شاعر کو اپنی جیب رفو کرنے کے لیے "جشن خساراں" بھی منانا پڑا۔ مگر رسالہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ بحمد اللہ آپ کا حوصلہ اور ہمت جواں ہے اور واقعی اب تو شاعر کا ہر شمارہ اپنے اندر ایک جدت، تنوع اور ایک نیا پن لے کر آتا ہے۔!

زیر نظر شمارے کے مضامین کی ترتیب میں انفرادیت اور جدت ہے خاص کر شکیب ایاز کا مقالہ بعنوان "نئے سرقے کی ایک مثال، میر حسن" کافی دلچسپ، پرمغز اور معلوماتی مقالہ ہے۔ اسی شمارے میں اچھی نظمیں بھی دیکھنے کو ملیں۔ آپ کے حسن انتخاب کا ثبوت ہیں۔ ستیہ پال آنند کی مختصر نظم موجودہ صورت حال کی زندہ مثال ہیں۔ مترجم فیروز کی "بنگلہ زبان" "حفاظتی دستہ" پڑھ کر ایک مرتبہ پھر کمار شی یکے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔!

کہانیوں میں رضا احمد ادیب نمایاں طور پر نظر آتے ہیں ان کی "جنگل کتھا" سیاسی بازی گری کی ایک واضح مثال ہے۔ موجودہ صورت حال اور سماج کی آئینہ داری ہی نہیں بلکہ ایک پیچ و پیچیل کی بہترین عکاسی بھی ہے۔ اسی طرح قسط وار ناول (جوگندر پال)، اور خود نوشت (ندا فاضلی)، قاری کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہیں۔ غزلیں معیاری اور اچھی ہیں!!!

جنوری فروری ۱۹۹۱ء کے شماروں سے متعلق

شفیقہ فرحت ـ ای۔ ۶/۱۸۶، دو تیا دیار ـ بھوپال

شمارے ساتھ ملے، حسب روایت اچھے ہیں خصوصاً "مکتوبات" قابل تعریف ہیں۔ جوش کے غیر مطبوعہ خطوط نایاب تحفہ ہیں، ہم سب کے لیے جوش کی سالگرہ کا۔ اس شمارے کے تینوں افسانے زوردار ہیں، ایسے خوبصورت اتفاقات کم ہی ہوتے ہیں۔ شروں کا ڈرامہ لکھنے والے ہیں ان سے کسی کم تر درجے کی چیز کی توقع ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن یہ عبد العزیز خان کے "تجربے" نے چونکا دیا، انھیں مبارکباد۔

عشرت ظفر ـ ۸۸/۲۸۸، نسیم آباد، کانپور (یوپی)

شاعر کے دو تازہ شمارے موصول ہوئے، لاجواب، شاندار، بے مثال، مشمولات آپ کی ژرف نگاہی اور وسیع النظر کا آئینہ۔ مبارک ہو کہ دیرینہ روایات نہ صرف قائم ہیں بلکہ توسیع عمل سے گزر رہی ہیں۔

ہمت رائے شرما ـ ۹۔ اوریکش، سات بنگلہ، اندھیری ویسٹ، بمبئی

شاعر کے دونوں شمارے پڑھ لیے ہیں۔ مجھے شاعر بے حد پسند آیا۔ مضامین نظم و نثر کے معیار کے ساتھ ساتھ اس پرچے کی ترتیب و تزئین بھی خوب ہے۔ گزشتہ ۶۲ سال سے پابندی سے شائع ہونے والا یہ مجلہ فروغ اردو کی تابندہ مثال ہے۔ شاعر اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔ خدا کرے اس کی مقبولیت میں دن دونا اضافہ ہو کر یہ جریدہ قابل تحسین ہی نہیں قابل فخر بھی ہے۔

شبیر رسول ـ ۵۵ ـ اے، اچھپرہ روڈ، علی گڑھ۔

شاعر کے تازہ شمارے پڑھنے کو ملے۔ دیرینہ آب و رنگ اور معیار و مزاج کی یکساں بلندی کے ساتھ آپ شائع کر رہے ہیں! مبارکباد۔ زیر نظر شمارے میں بشر نواز کی نظم "بھیڑ" غزلیں لطف دے گئیں۔ ندا فاضلی کی خودنوشت بھی بڑے دلچسپ انداز میں لکھی ہے۔ ان کے اسلوب نگارش اور ان کی اچھوتی طبیعت داری نے یکجا ہو کر انفرادیت "قائم کر دی ہے۔ شروں کا ڈرامہ

پسند آیا۔ وہ ماہی خوب لکھتے ہیں۔

آسی ۔ قسلہ چھتا اعظم سرائے ۔۔۔ (یوپی)

شاعر کے دو شمارے ایک ساتھ ملے۔ جوش ملیح آبادی کی

ادوان کے غیر مطبوعہ خطوط ان لوگوں کے لیے خاص چیز ہے

اہلِ ذوق ہیں۔ غلام ربانی تاباں کی غزل حاصل رسالہ رہی۔

سیم ۔ ۱۲/ایف، نوریسٹ کالونی، چار امل، بھوپال ۴۶۰

شمارہ نمبر ۲ ۱۹۹۱ء "شاعر" کا اداریہ پڑھ کر ایسا محسوس

ہوا کہ آپ روایت کے حامی ہو گئے ہیں۔

آپ کا یہ کہنا کہ "محض غزل میں عصری حسیت کی استثنائی

ہے" کسی حد تک درست ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم

ہے نظم کی ابتدا حالی سے ہوئی یا زیادہ سے زیادہ آپ

ظم کا بانی کہہ سکتے ہیں لیکن کیا غالب نے یا میر نے نظمیں

؟ کیا عالمی ادب میں شمار ہونے والا شاعر غالب آج

مقام پر اپنی غزلوں کی وجہ سے نہیں پہنچا ۔۔۔ ؟

آپ کا یہ کہنا ہے کہ "ہزاروں شعر تخلیق کرنے والے ماضی

ادوں کا سلسلہ آج کی نسل سے صرف چار سو، پانچ سو

تک پہنچا ہے۔" براہِ کرم اس بات کی وضاحت کریں کہ

چار سو، پانچ سو شعر کا سلسلہ جدت سے روایت تک

ہے۔ یا روایت سے جدت تک؟۔

آپ کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ شاعری کی روح ختم ہو گئی ہے۔

اس کی کھوکھلی اور بے روح شاعری کا مقابلہ اگر ہم اساتذہ

ام سے کر کے دیکھیں تو غزل کی توانا روایت کی اہمیت سامنے

آتی ہیں۔ تحریک کا وہ زمانہ جب نظم کے مقابلے میں غزل کو

بے کی صنف قرار دیا جاتا تھا تب بھی غزل جاری رہی اور

ملک نمائندہ نظموں پر بھاری رہی۔ مجھے ایسا نہیں لگتا

کی شاعری (آزاد نظمیں، آزاد غزلیں، نثری نظمیں) ہماری

روایت کا حصہ بن سکیں گی۔؟

ویسے مجھے جدیدیت سے قطعی اختلاف نہیں ہے اس لیے کہ

جدیدیت نے نئے استعارے، نئی لفظیات و تراکیب، نئے اسالیب

اور دنیا بخش دیا ہے۔ غزل کو ہمارے مسائل سے قریب تر کر دیا ہے

غزلوں میں جمالیاتی حسن کی کمی مضمون کی بندش کو پورا کر دیتی ہے

اس لیے مجموعی طور پر ہماری نسل بُری شاعری نہیں کر رہی ہے۔

آپ کے لکھے ہوئے اس جملے "ہزاروں شعر ۔۔۔ تک پہنچا ہے"

کے وضاحت طلب اور نوک بھی ہیں۔

اظہر نیّر ۔ ۱۵۹ اے سی، مارکیٹ سیکٹر ۔ ۶، بھلائی نگر ۔ ۰۰۱ ۴۹۰

شاعر اپنی سابقہ رعنائیوں کے ساتھ اس بار بھی کافی معیاری

رہا۔ تازہ شمارہ نمبر ۲ میں کہنہ مشق ادبا اور شعرا کے ساتھ نئے

قلم کاروں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ادب کی صحت مند قدروں کو

برقرار رکھنے اور آنے والی نسلوں کی حوصلہ افزائی کے لیے یہ اقدامات

ضروری ہیں۔ شاعر نے ہمیشہ ہی نئے قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کی

ہے، دیگر ادبی رسائل ایسا کم ہی کرتے ہیں۔ نئے قلم کاروں کو ان

کی معیاری تخلیقات کے ساتھ پیش کیا جانا چاہیئے۔ شاعر کا

یہ قابلِ فخر کارنامہ ہے۔

تازہ شمارے میں بلراج کومل، رفیق انجم، گلشن تلوانی کی

نظموں نے متاثر کیا۔ بشر نواز [معتبر غزلیں] اور ڈاکٹر

نریش [بحیثیت شاعر] کی غزلیں پسند آئیں۔ خورشید طلب، ملک

زادہ جاوید اور اشوک کمار اشرف کی غزلیں بھی اچھی ہیں۔ افسانوں

میں تسکین زیدی، شرون کمار ورما اور محمد عظیم اشرف کے فن پارے

دل کو لگتے ہیں۔

آپ کا اداریہ "عظیم شعری روایات اور جدید اردو شاعری"،

مختصر مگر فکر انگیز ہے، بہت سے سوال ابھارتا ہے اور آج کی اردو

شاعری کا تعین تجزیہ بھی ہے۔

عمر شہید انصاری ۔ مالکیرا کولیری، مالکیرا ضلع دھنباد (بہار)

شمارہ نمبر ۲ کے سرورق پر جوش ملیح آبادی کی تصویر دیکھ

کر بہت خوشی ہوئی۔ خطوطِ جوش بنام مرزا جعفر حسین کی

اشاعت کا شکریہ۔ جوش کے تمام ہی غیر مطبوعہ خطوط کی

اشاعت ضروری ہے تاکہ ان کی شخصیت اور فن پر مزید روشنی

پڑ سکے۔ جوش پر ویسے بھی بہت کم کام ہوا ہے چاہے اس کی

جو بھی وجوہ رہی ہوں۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جوش

عہد ساز شاعر تھے ۔۔۔ ۱۹۹۶ء جوش صدی کا سال ہوگا۔ امید

ہے شاعر اپنی سابقہ روایات کا پاس رکھتے ہوئے شاندار جوش نمبر

شائع کرے گا۔ ادھر شاعر میں آزاد نظمیں ہی شائع ہو رہی ہیں۔ لگتا

ہے پابند نظم کہنے والے شعرا ناپید ہو گئے ہیں۔ شاعر کی صحت کا خیال

رکھیے، بے چارہ بہت دبلا ہو گیا ہے۔

شہاب اختر شہاب ۔ کلکتہ کولیا تھا سٹین، جھریا ۔ (بہار)

اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا خالص ادبی رسالہ شاعر ۶۲ ویں سال

میں داخل ہو گیا ہے، لیکن اب ہمیں اپنے رسالے کو ابھی اور لمبی

زندگی عطا کرنی ہے، اللہ ہمارے اس نیک خیال کو ترقی کی سیڑھی

دے۔ سلطان سبحانی کا سرورق "لمحہ" اچھا لگا۔ تنکیا مرودزمی

فکر کی لو روشن کرتی ہے۔ افتخار امام صدیقی کا شکریہ ادا کرتا

ہوں کہ انھوں نے مجھے "عالمِ آشوب" کو ایک طالب علم کی حیثیت

سے پڑھنے کا موقع دیا۔ میں علامہ سیماب اکبر آبادی کی تخلیقات

پسند کرتا ہوں، ان کی شاعری کا مداح ہوں۔ اسری ارشد کی

جانکی ۔ ایک جائزہ "نے معلومات میں اضافہ کیا۔ جوگندر پال اور

ندا فاضلی نے لذت برقرار رکھی۔ نظمیں غزلیں بھی اچھی لگیں۔ دوسرے

شمارے میں جوش ملیح آبادی کی سرورق تصویر دیکھ کر جی خوش

ہوا۔ غیر مطبوعہ خطوط مزا دے گئے۔ بلراج کومل کی نظمیں بہت

ہی اچھی لگیں۔ کہانی "منو ڈینر" نے متاثر کیا ویسے کہانیاں بھی اچھی

لگیں۔ جوگندر پال کا خوبصورت ناولٹ تو ختم ہوا مگر ذہن پر

ایک تاثر قائم کر گیا ہے۔ ندا فاضلی اپنی دیواروں کے بیچ حسبِ

معمول رہے۔ مجموعی طور پر مذکورہ دونوں شمارے مطالعے کے

لیے خاصہ مواد پیش کرتے ہیں۔

کتب و رسائل

تند ہوا کے جشن میں

کن و رکن مسلکیت نئے ابعاد سے آراستہ حرف و لفظ سے بہت

بھلا شاعری کے روشن امکانات سے بہت قریب، اندر ہی اندر

بے ملے ڈالا ہے۔ واردات کی تازہ کاری تخلیقیت سے مملو۔ اردو

زبان و ادب کے مشہور شاعر پیر زادہ قاسم کا اولین شعری مجموعہ جس کا انتظار

منظرِ عام پر آگیا ہے عمدہ کتابت طباعت، گٹ اپ، سرورق، ہر

سے ایک خوبصورت شعری مجموعہ۔ گوپی چند نارنگ۔ جوج حامد

رالبراہیم، کشفی، سہیل انصاری، اختر الایمان اور بروح سلطان

آلانا حسین کے ساتھ ۔ اقبال مہدی کے باطنی سرورق وغیرہ کی

ضخامت ۱۹۲ صفحات [۸۰ غزلیں ۲۹ + نظمیں]

بلک ۱۹۹۰ء قیمت نوے روپے۔ رابطہ: راشد قاسم؛

مکتبہ خالد عظیم [کراچی]

نخلستان میں کھلنے والی کھڑکی

معروف افسانہ نگار، صحافی، مصور، کارٹونسٹ اور سیاسی سماجی

کارکن ساجد رشید کے ۱۱ افسانوں پر مشتمل دوسرا مجموعہ شائع ہو گیا ۔

[ریت گھڑی ۔ ۱۹۸۸ء] [زرد آسمان ۔ ۱۹۸۷]

مجھے ساجد رشید کے تخلیق کار کے یہاں زندگی کا شعور اپنی پوری سچائی

کے ساتھ تخلیقی سطح پر ابھرتا ہے اور فنکاری کو اسیر کرتا ہے۔ یہ افسانے

کہانیاں، آگ سے بنے والی تصویریں ہیں۔

ابھی اور کچھ کہانیوں کی معراج کیسے ہو، بجائے کوئی تخلیقی بازیافت

کہاں حرف و لفظ کی تخلیقی صورت گری کیا ہے؟ نئی عصری کہانی کا

ہے؟ ساجد رشید کے افسانے ان سارے سوالوں کا جواب دینے

کی کوشش ہیں۔

ضخامت: ۲۰۰ صفحات

قیمت چالیس۔ مطبوعہ ۱۹۹۰ء پتہ: ۲/۲۰، بی۔ جے مارگ،

بائیکلہ [ممبئی] ممبئی ۰۰۰۲۷

جذبِ رواں

ہے۔ ڈی سیٹھی جذب کا اولین شعری مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔

صاف و سادہ زبان میں حرف و لفظ سے شعر بنانے کا ہنر جذب کو آتا

ہے۔ عصری غزل کی روایت میں ایک اور شعری مجموعے کی شرکت۔

ضخامت: ایک سو بیس صفحات: قیمت، پچاس روپے۔ مطبوعہ ۱۹۹۰ء

ناشر ٹوئنٹی فرسٹ سنچری انڈیا سوسائٹی، چنڈی گڑھ

سبز موسم کی صدا

معروف شاعر ظہیر غازی پوری کا چوتھا شعری مجموعہ [الفاظ کا

سفر ۱۹۷۶ء، آشوبِ نوا ۱۹۸۱ء کے بعد] منظرِ عام پر ۱۹۹۰ء شائع

ہو گیا ہے۔ [۱۹۹۰ء] جدید آفاقی غزلیں اور صداقتوں کے تخلیقی

اظہار سے ظہیر غازی پوری کی شاعری عبارت ہے۔ حالاتوں

اور نظموں میں فکر و احساس کی دھنک رنگ، خوش خیال فضا پیدا کر

فکر اور فن پر دسترس رکھنے شعری شخصیت کا جوہر کھلا ہے۔

ضخامت ۱۴۴ صفحات، قیمت ۴۵ روپے، پتہ ہی۔ ایم۔ اے

کارپوریشن، ہزاری باغ [بہار] دیاتی صفحہ ۳۲ پر دیکھیے

شاعر

بانیٔ ملت سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۶۲واں سال

علمیہ ادبیہ تہذیبیہ ماہنامہ

جلد ——— ۶۲
شمارہ ——— ۵

فون: ۳۵۹۹۰۳۰

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت:- ۶ روپے

زرِ سالانہ ۵۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۶۰ روپے

تاعمر خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے ◆ ممالک غیر سے ۳۵۰ روپے

مکتبہ قصر الادب، بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ بمبئی ۸....

فکر امروز

تخئیل کا واسطہ صرف زندگی کے ان غیر متعلق شعبوں ہی سے نہیں بلکہ تخیل، زندگی کے ذرّوں سے لے کر زندگی کے لامحدود بیابانوں تک طاری و ساری ہے۔ دنیاوی زندگی پر تخئیل کو پھیلاکر ہمارا کام یہ ہو سکتا ہے کہ ہم ماضی کی تابندگیوں کو جگائیں، حال کے نقوش پہ مبصرانہ اور ناقدانہ نظر ڈالیں اور ایک امید افزا مستقبل کی تخلیق میں زندگی کے تسلسل کو دراز سے دراز تر بنادیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ زندگی پہ جس قدر بہتر تنقید اور روشن تبصرہ ایک شاعر کی تخئیل کر سکتی ہے اور کوئی نہیں کر سکتا۔

تہذیب، معاشرت، ثقافت یا کلچر سے شاعری کا کیا تعلق ہے؟ جو روایات وخصوصیات، افراد، قوم یا جماعت کے باہمی ارتباط سے پیدا ہوکر استقلال کی حد تک پہنچ جاتی ہیں وہ اس قوم یا جماعت کی تہذیب کہلاتی ہیں تہذیب، عملی صورت اختیار کرنے سے پہلے تخیلی شکل میں ڈھلتی ہے پھر اس تخئیل کی عملی صورت ایک تہذیب بن جاتی ہے اور دوسری شاعری

[ماہنامہ کنول آگرہ مطبوعہ ۱۹۳۶ء]

گوشۂ ستیہ پال آنند

مقالات

نظمیں

مکالمہ

عصری عالمی شاعری اور اردو شاعری

شرکاء

ڈاکٹر طامس گرے (۱۳) ستیہ پال آنند

ترجمہ

بجوپندر پری ہار

بساطِ سخن جدید

کہانیاں

غزلیں

ناول

خود نوشت

طرحی غزلیں

آغاز لفظ

[illegible]

سرورق

عشق

عمل

سلطان سبحانی

مکتوبات

شمارہ نمبر ۵ [۱۹۹۱ء] جلد ۲۳
مئی ۱۹۹۱ء

ایک نئی گفتگو کا آغاز کریں

زیرِ نظر شمارہ گوشۂ ستیہ پال آنند ہے۔ آنند کے کار و افکار سے اُردو دنیا واقف ہے۔ یہ گوشہ ان کے فکر و فن کو اجاگر کرنے سے کہیں زیادہ ان کے حوالے سے عصری اُردو شاعری کے بعض اہم مسائل کو اجاگر کرتا ہے اور اُردو کے تمام فن کاروں، ناقدین اور قارئین ادب کو اُردو دنیا کے تنقیدی مفروضوں اور نظریات کے متعلق از سرِ نو فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اُردو کی نئی بستیوں میں بسنے والے فن کار عالمی عصری شاعری کے مطالعے اور تقابلی جائزے کے دوران جو کچھ سوچ رہے ہیں، محسوس کر رہے ہیں، سوال بنا رہے ہیں، اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ عالمی سطح پر ابھر رہی عصری ذہنی گونج سے ہم آہنگی اور اپنے شعر و ادب کی سمت و رفتار کے لیے یہ ضروری ہے کہ تنقیدی نظریات اور مفروضوں سے بندھے رہنے کے بجائے، ان کی مسلسل گردان سے پرے نئے نئے سوالوں کو دیکھیں، شاعری کے متن پر غور کریں، اپنی نئی پرانی اصناف اور ہیئتوں کے امکانات کو سوچیں۔ ان مفروضات کو رد کریں جو یا تو عارضی تھے یا پھر وقتی سنسنی خیزی سے زیادہ کچھ اور نہیں تھے۔ دوسرے اور تیسرے درجے کے نقاد اب بھی انھیں مفروضوں کے زیرِ اثر تنقید لکھ رہے ہیں اور صفِ اوّل کے نقادوں نے بھی اس طرف کم کم توجہ دی ہے۔

اردو شاعری کو عالمی شاعری اور اس کی تنقیدی تحریروں کے تناظر میں دیکھنے کی سعی تو کی گئی تاہم درمیان ہی میں سے، بغیر سیاق و سباق کے، فیصلہ صادر کرنے والی تنقید۔ فیصلہ کن یا انتہا پسندانہ تنقیدی تحریریں اور جامد مفروضے، شعر و ادب کی ابہام و تفہیم میں معاونت نہیں کرتے صرف انتشار پیدا کرتے ہیں۔ یہ بیشتر گمراہ کرنے والی تحریریں ہیں۔

عالمی زبانوں کی تمام زندہ شعری اصناف اور ہیئتیں اپنے آپ میں مختلف شعری اور لسانی مزاج رکھتی ہیں۔ اردو غزل کا معاملہ بھی یہی ہے لیکن غزل کی انفرادیت اس کی خصوصیات، اور ایک جاندار صنفِ سخن کے طور پر اسے عالمی زبانوں کی شاعری کے ساتھ نہیں رکھا گیا، اردو شاعری کی اس غالب اور راسخ صنف پہ فخر کرنے کے بجائے نظم کو ترجیح دی گئی، اس کی وکالت کی گئی، غزل کی انفرادیت کو کم کیا گیا۔ اس کے علاوہ بھی اور بہت سارے سوال ہیں جن پر ایک نیا تنقیدی مکالمہ ضروری ہے۔

گوشۂ ستیہ پال آنند کا تمام لوازمہ اگر آپ سے مکالمہ کرتا ہے تو آئیے اپنے اپنے دماغوں سے باہر آئیں اور ایک نئی گفتگو کا آغاز کریں۔

Rajindar Singh Bedi

۳ دسمبر

راجندر سنگھ بیدی بنام اعجاز صدیقی

[illegible] آداب و تسلیمات

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]



کالیداس گپتا رضاؔ

◆

نئے یُگ کی تھی بشارت کہ کہانی؟ کیا تھا
شاہدِ صبح کا پیغامِ زبانی کیا تھا

وہ جو لاوا سا بہا اور مجھے پھونک گیا
آگ تھی اشکوں کی یا شعلوں کا پانی؟ کیا تھا

لڑکھڑاتے سے قدم، پیاسی نظر، جھومتا جسم
یہ سب اک وہم تھا یا رقصِ جوانی؟ کیا تھا

مجھ سے ٹکراتی تھی کہ تھا جہل کا اپنے اقرار
ہم نشینوں کا وہ شورِ ہمہ دانی کیا تھا

میرا سایہ جو میرے ساتھ جیا ساتھ مرا
ازلی دوست تھا یا دشمنِ جانی؟ کیا تھا

جب تو یادوں میں نکل بھاگا تو افتاد پڑی
قرب میں ورنہ ترے بُعدِ زمانی؟ کیا تھا

کیوں ہو گم گوشتیِ تصویر رضاؔ کون تھا وہ
ہادیِ وقت تھا؟ یا حاتمِ ثانی؟ کیا تھا

◆

جہاں کو کیسی ڈگر پہ لگا گیا کوئی
چلا گیا کوئی منزل سے، آ گیا کوئی

پیامِ فکر و نظر دے کے میرے گیتوں کو
اکھڑتی سانسوں میں سانسیں ملا گیا کوئی

کہاں کا ہاتھ، کہاں کا نجوم، کیا نصیب
لکیریں کھینچ کے بے بس بنا گیا کوئی

نہ راستے سے پکارا نہ دی کہیں دستک
خیال و خواب کے در وا تھے، آ گیا کوئی

میں اک چراغِ سرِ راہ، میری ہستی کیا
جلا گیا مجھے کوئی، بجھا گیا کوئی

لٹائی سانس کی پونجی، گنوائے کون و مکاں
مرے بنانے میں خود کو مٹا گیا کوئی

میں خشک آنکھ کی دوات ہوں، کل کا آنسو ہوں
ڈھلے مکاں میں مجھکو سجا گیا کوئی

رضاؔ بدلتے تقاضوں کا ساتھ کیوں چھوڑے
ہنسا گیا اُسے کوئی، رُلا گیا کوئی

◆

شگفتگیِ زیست کو شراب میں نہ ڈھونڈ
مشامِ جاں میں ڈھونڈنا، گلاب میں نہ ڈھونڈ

یہ آگہی کے سربرہ! فقط حسین خول ہیں
بھنور کی کارکردگی حباب میں نہ ڈھونڈ

بھلا برا بچارنا! نئے خدا بھی ہوں تو کیا
بلندیاں نصیب کی خطاب میں نہ ڈھونڈ

بجھے بجھے حروف کو ملے کہاں سے روشنی
معلمی کے نور کو نصاب میں نہ ڈھونڈ

شبانہ روز کام ہی ہنر کا ورثہ دار ہے
کمال کو عذاب یا ثواب میں نہ ڈھونڈ

مقام اور بھی تو ہیں ترانہ ہائے زیست کے
سرود و نغمہ کو فقط رباب میں نہ ڈھونڈ

کمالِ فن ہوں میں کہاں حجاب میں پڑا ہوں
بکھر چکا ہوں اب مجھے نقاب میں نہ ڈھونڈ

یہ پھیلتی سیاہیاں، لغت کہاں بتائے
ظہورِ شب کو علم کی کتاب میں نہ ڈھونڈ

رضاؔ جو حاصل ہے سو ہے خیال و خواب کچھ نہیں
چمن کی لہلہاہٹیں، سراب میں نہ ڈھونڈ

● ۲-۱-اے، جل درشن، ۴۳-اے، چوتھا منزلہ، نیپنسی روڈ، بمبئی ۶

ستیہ پال آنند

1387, NORTHGATE SQUARE RESTON.
VA. 22090 U.S.A

ابتدائیہ

ایسٹرن اسٹڈیز سینٹر، ریاستہائے متحدہ امریکہ کے عصری عالمی شاعری کے پراجیکٹ کے جنوبی ایشیائی زبانوں کے پروگرام کے تحت میں نے یہ
ں ۱۹۸۴ء اور ۱۹۹۰ء کے دوران لکھیں۔ پروگرام کے شرکا میں ہندوستانی، پاکستانی اور امریکی نژاد پوسٹ گریجویٹ طلباء کے علاوہ کمپریٹو لٹریچر کے شعبہ سے
ندو اساتذہ بھی تھے۔ پراجیکٹ کے اغراض و مقاصد تو متعین تھے ہی، لیکن ان کے علاوہ جن نکات کی نشاندہی کی گئی ان میں اس حقیقت کا شدید احساس
اصل تھا کہ گذشتہ چالیس برسوں میں اردو شاعری ایک ایسے پڑاؤ پر آ کر رک گئی ہے، جہاں صنفِ غزل کی غیر صحت مند بہتات اور اس کے نفسِ مضمون میں
نگی اور اسلوبِ بیان میں یک آہنگی نے اسے لاکھڑا کیا ہے۔ پراجیکٹ کی ابتدائی رپورٹ کے مطابق، سروے کے ذیلی پروگراموں میں سے ایک میں جس
ارشرکا نے کام کیا، یہ نتائج اخذ کئے کہ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۷ء تک پاکستان اور ہندوستان کے اٹھارہ منتخب ادبی رسائل کے صفحات میں شعری ادب
فیصد [اڑسٹھ فیصد] حصہ صنفِ غزل سے مختص کیا۔ ان غزلوں میں سے جب ریسرچ کے RANDOM SELECTION کے طریقۂ کار کی رو سے پانچ
شعار اخذ کئے گئے جو ایک سو بارہ ممتاز و مشہور شعرا کی تخلیق تھے، تو نفسِ مضمون کے اعتبار سے یہ بھی اشعار بائیس بنے تلے موضوعات کے تحت آ سانی رکھے
ے تھے۔ اسی طرح پابند اور آزاد دونوں اقسام کی نظموں کے موضوعات [صرف چند ایک شعرا مثلاً اختر الایمان، منیر نیازی، قیوم نظر، صفدر میر، بلراج
اور وزیر آغا وغیرہ کو چھوڑ کر] بھی اکثر و بیشتر غزلوں کی طرح یک رنگ و یک آہنگ تھے۔ تحقیق کرنے والوں نے سیاق و سباق کے کئی سو حوالوں سے
اس امر کی بھی تصدیق کی کہ نظموں کے زمرہ میں آنے والے شعری ادب کے جمود اور انحطاط کی وجہ جہاں ایک طرف ن۔م۔ راشد اور میرا جی کے مدرسۂ اسلوب
الی ہے۔ وہاں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر شعرا کی ایک بڑی جماعت کے یہاں نظموں کی نظریاتی یک رنگی بھی ہے۔ نظریاتی وابستگی کی بلند آہنگ اور خطیبانہ
جوان نظموں کا خاصہ رہی ہے، ادب میں قدرِ جارحانہ اصطلاح میں، نعرہ بازی، بھی کہا گیا ہے۔ فیض احمد فیض کے تتبع میں کہیں کہیں مدھم پڑتی تو ہے، لیکن
الصول سیاسی نقطۂ نظر کی بیڑیاں نہیں کاٹ سکتی اور گوناگوں خارجی حقیقت کے صرف ایک پہلو، یعنی اقتصادیات اور اس سے متعلقہ سیاسی امور کو، شاعر
ت و کائنات پر ترجیح دیتے ہوئے یک آہنگی کا شکار ہو جاتی ہے۔

پراجیکٹ کے تحت تین پینل رپورٹوں PANEL REPORTS پر مباحثوں کے دوران اس بات کی نشاندہی بھی کی گئی کہ یورپ، کینیڈا،
استہائے متحدہ امریکہ کی بیشتر یونی ورسٹیوں کے کمپریٹو لٹریچر کے نصابوں میں جنوبی ایشیائی زبانوں کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ کچھ یونی ورسٹیوں میں جہاں ادبیا
ت پڑھائے بھی جاتے ہیں۔ وہاں صرف نثری ادب ہی پر اکتفا کی جاتی ہے۔ اور زبانوں کا حصہ بنگالی [صرف ٹیگور] اور عصری انڈو اینگلین ادب [آنند کے
ن، راجا راؤ وغیرہ] ہی تک محدود ہے۔ اردو کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بتائی گئی کہ یوروپ کی زبانوں میں اردو کے شعری ادب کے تراجم
بہ نہیں ہیں۔ انگریزی میں جن شعرا کا ترجمہ ہوا ہے ان میں غالب اور فیض پیش پیش ہیں۔ لیکن غالب صرف غزل گو شاعر ہونے کی وجہ سے اور فیض اپنی
ں کے مصنوعی PSEUDO ROMANTICISM کی قبیل سے تعلق رکھنے کی بنا پر عصری عالمی شعری ادب میں کوئی مقام نہیں
عصری اردو شاعری میں سے تحقیق کرنے والوں نے [سیاق و سباق کے سیکڑوں تاریخی حوالوں سے] جس حقیقت کی نشاندہی کی، وہ یہ تھی کہ ن
شد اور میرا جی کی قیادت میں اردو نظم کا قافلہ جو مروجہ ترقی پسند فارمولوں کی نفی کا علم بلند کر کے روانہ ہوا تھا اسے "ترقی پسند قزاقوں" نے لوٹ لیا۔
ن معنوں کو

چیلنج بن کر کھڑی ہے۔"

اس سلسلے میں یہ بھی کہا گیا کہ اردو شاعری اپنے جاگیردارانہ دور کی وراثت کو جلو میں لیے، مشاعروں میں "کلام" اور "سخن" کی اصطلاح کے طور پر "سنی اور سنائی جانے والی" وہ شے ہے جسے SPOKEN WORD کا نام دیا جا سکتا ہے اور عصری زندگی کے برق رفتار تقاضوں کو "تحریری لفظ" WRITTEN WORD نہ بن جانے کی وجہ سے پورا نہیں کر پاتی ۔۔۔ خصوصاً جب نئی شعری تخلیقات کا ۹۸٪ حصہ غزلوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ رپورٹ کے ابتدائی مسودے میں یہ بھی کہا گیا کہ ترقی پسند تحریک کے مدھم اور ماند پڑ جانے کے بعد بھی آج تک اردو نظم گنے چنے شعرا کو چھوڑ کر، اس نقطۂ ارتکاز کو گرفت میں نہیں لے سکی، جس پر قائم رہ کر عصری عالمی شاعری، وجود اور ذات کی ماہیت اور لاحاصلی، دونوں کا کرب اور دونوں کی خوشی محسوس کرتی ہے۔ اور انکشاف نسل سے چل کر "جماعت" اور "فرد" سے ہوتے ہوئے انکشافِ ذات تک کا سفر طے کرتی ہے۔

پراجیکٹ کے کوآرڈینیٹر کے طور پر اور اس کے تخلیقی پہلو کے تحت آنے والے مقاصد کی تکمیل کے لیے میں نے یہ فرض اپنے ذمہ لیا کہ ایک سو سے زائد ایسی نظمیں پیش کروں، جو نفسِ مضمون، ہیئت اور اسلوبِ بیان کے نقطۂ نظر سے اپنی ترجمہ شدہ صورت میں اپنی منفرد اور مستند اردو پہچان کھوئے بغیر یورپی زبانوں کی عصری شاعری کے مقابلے میں رکھی جا سکیں۔ اور مغربی قارئین کی نظروں اور سامعین کے کانوں کو اجنبی بھی محسوس نہ ہوں اور انہیں صرف یہ کہہ کر نظرانداز نہ کر دیا جائے کہ یہ اورینٹل ہیں، اور اس لحاظ سے عصری سیاق میں قابلِ توجہ نہیں ہیں۔ عجائب گھر کے نوادرات کی اپنی اہمیت تسلیم، لیکن MUSEUM PIECES روزمرہ کی زندگی کے تعلق سے اہم نہیں ہوتے۔

یہ مجموعہ ان ایک سو نظموں کا ہے، جسے پراجیکٹ کے شرکا کے تعاون سے ترتیب دیا گیا ہے۔ یہ سبھی نظمیں ایک ہی بحر میں کہی گئی ہیں۔ یہ بحر خفیف مسدس مشکل مقصور "اپنے لہجے کے اتار چڑھاؤ اور STRESS کے علاوہ INTONATION میں IAMBIC PENTAMETER کے قریب بھی ہے۔ میں نے یہ سعی بھی کی ہے کہ مصرعوں [سطروں؟] کی طوالت کو کم و بیش کے بغیر قافیے اور ردیف سے عاری ان نظموں میں، نفسِ مضمون کا جزر و مد EBB & FLOW پہلی سے دوسری یا تیسری یا چوتھی سطر کے شروع، وسط یا آخر تک جاری رہے اور وقفوں PAUSES کے استعمال کی مدد سے ڈرامائی خود کلامی کے محاسن اور مکالماتی ضروریات کی تکمیل بھی ہو سکے۔

پراجیکٹ کے شرکا میرے احتجاج کے باوجود اس بات پر مصر تھے کہ ان سب دیو مالیائی، تاریخی یا لوک کہانیوں پر مبنی کرداروں یا واقعات کی باقاعدہ نشاندہی اور تشریح کر دی جائے جن کا اشارہ ان نظموں میں ملتا ہے۔ تاکہ یونانی اور ہندی دیو مالا یا یورپی کلاسیکی ادب سے ناواقف قارئین محسوسات سے فوری اور براہِ راست فکر کی سطح پر ان سے محظوظ ہو سکیں۔ چنانچہ یہ تعمیل کر دی گئی ہے۔

پراجیکٹ کا دوسرا حصہ ان نظموں کی کتابی شکل میں اشاعت کے بعد انگریزی میں ان کے ترجمے سے متعلق ہے۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ کام کب شروع ہوگا اور اس کے لیے شرکا کا تعین کب ہوگا اور اپنی آخری منزل تک پہنچتے پہنچتے کیا شکل اختیار کرے گا۔ بہر حال مجھے پراجیکٹ کے پہلے حصے سے متعلق امریکہ میں مقیم شرکا، ڈاکٹر بشیر الطاف حسین، مسٹر جوناتھن میک ڈاناہو، مس شائستہ سرفراز قابلی، ڈاکٹر فردوس ہمراز اور ہندوستان میں مقیم احباب ڈاکٹر ہارون ایوب، جناب ہیرانند سوز اور پروفیسر بھوپندر پریہار عزیز کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ جنہوں نے اس مجموعے کی ترتیب میں تعاون فرمایا۔ امریکہ میں مقیم میری بیگم پرمیلا آنند اور میری بیٹی ڈیزی آنند ان نظموں کے ابتدائی سامعین کی جماعت کے فرد ہیں اور ان کی رائے اور بے لاگ تنقید ولے نے ان نظموں کو سنوارنے میں بہت مدد کی ہے۔

رِیسٹن، ورجینیا، یو ایس اے
یکم نومبر ۱۹۹۰ء

بقیہ صفحہ ۱۴ اختتامیہ

بہر لازم سیریز کی نظمیں، یا کبیر کی چادر، یا دشمن کینا یا ہرنِ شکوہ، یا جزیرہ، یا بہی کھاتہ، یا، دامن، یا، گرو کی کہانی، بلاشبہ سب کی نگاہوں کا مرکز بنیں گی اور اس میں شاید ہی کسی کو کلام ہو کہ اردو میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے۔ اردو کے ہم عصر شعری منظر نامے اور عالمی تقابلی ادب کے جو مسائل اس کا محرک رہے ہیں اگر یہ مجموعہ اردو والوں کی توجہ ان مسائل کے تئیں مبذول کرا سکا تو ہر اعتبار سے یہ اقدام مستحسن قرار پائے گا۔

نئی دہلی ۱۲ فروری ۱۹۹۱ء

ے نادار ملک کا شاعر

احمد فیض سے ایک ملاقات کے تاثرات

یا سقراط؟ کون سا منصور؟
، تو ادنیٰ سا ایک شاعر ہوں
ل نادار ملک ہی کا سہی)
نہیں چاہت شہادت کا
اپینا، یا دار کی اونچی،
ل ٹہنی پہ وارا جانا! نہیں!
یسرو بننا کمال کرتے ہیں!
یسرو بننے کی غرض و غایت سے
لی ہی سے ہاتھ دھو لینا
کے دور میں؟ نہیں صاحب!
ان ناموں سے کدن تمام ہوئے
مجھے روشنی کے شہروں کی
ی کو سلاخوں کے پیچھے
نہیں دیکھنا! مجھے آرام
شمپین، کوئی اک حسینہ صاحب دست
پیالہ پیرے اچھے لگتے ہیں!
ستیہ پال آپ جیسا ہی شکریہ!
واپی دعا

ستیہ پال آنند

نرسنگھ

میں نے چادر کو دیکھ کر پاؤں
کچھ پسارے ہی تھے کہ چادر ہی
پھٹ گئی۔ اور میرا آدھا بدن
برہنہ ہو گیا۔ وہی حصہ
شیر کا تھا جو، آدمی کا نہیں!
کیا میں نرسنگھ تھا؟ نہیں شاید
میں نہیں تھا خدا کا وہ اوتار!
میرے دھڑ کا تو نچلا حصہ ہی
(وہی حصہ جو ساری حیوانی
حاجتوں کا عظیم مرکز ہے)
شیر کا سا تھا۔ ایک حیواں کا!

مرگِ وقت

چاہتا ہوں کہ ایک شب آئے
ایسی بھی، میں گھڑی کی سوئیوں کو
ایک انگلی سے روک کر یہ کہوں
مت بڑھو اور، نوّے ڈگری کے
زاویے پر رکی رہو، دیکھو
سامنے تو ڈھلان ہے، تم کو
پھر اترنا پڑے گا چوٹی سے!
یہ نشیب و فراز کا رشتہ
ایک لا اختتام چکر ہے
اور اس سے یہی نجات ہے، تم
نوّے ڈگری کی اپنی منزل پر
اب کے پہنچی ہو، تو رکی ہی رہو!

کرچ

شرط تھی واپسی کی، دونوں مڑے
آئے، چوکھٹ پہ ایک بار رکے
ٹھٹھکے، گھر کے کواڑوں کو دیکھا
گھر وہی تھا، کواڑ پہلے سے
کچھ زیادہ پرانے لگتے تھے
دونوں داخل ہوئے تو پاؤں میں
کانچ سا چبھ گیا، جھکے، دیکھا
پانچ برسوں کی جس رفاقت کو
بھول بیٹھے تھے، اس کے نادیدہ
عکس کا ایک پرانا ٹکڑا تھا!

بین کے سُر

سانپ سے خوف اب نہیں آتا
سانپ کا زہر تو میں جھیل چکا
اب مجھے بین کے سُروں سے بہت
خوف آتا ہے، ان کا کاٹا ہوا
شخص تریاق سے نہیں بچتا!

حسن اور حُسن

حسن اور حُسن میں فقط اتنا
فرق ہے جتنا دو لباسوں میں
کوئی عورت لباس زیبِ تن
کر کے خود کو حسین سمجھتی ہے
اور کوئی نار صرف اپنا بدن
جب پہنتی ہے، اس کو لگتا ہے
کون سی اب کمی ہے جس کے لئے
اس کو کچھ اور پہننا ہوگا!

نیند

شب کے سب خواب سونے سے پہلے
ٹوٹ کر جب بکھر گئے تو نیند
آئی لیکن تھکی ہوئی سی تھی!

نیم جاں، مضمحل سی مجھ پہ جھکی
میری آنکھوں کو چوم کر بولی،
خواب سب ٹوٹتے نہیں، مت سوچ!
کچھ ابھی تیرے ذہن کی تہہ میں
سیپیوں کی طرح ہیں خوابیدہ
تیرے سونے کے بعد میں سارے
موتیوں کو نکال لاؤں گی
غم نہ کر، آنکھیں موند لے، سو جا!

وقت اور مقام

اپنی آنکھوں پہ بارہا مجھ کو
شک ہوا ہے کہ جھوٹ کہتی ہیں

تم یہاں ہو ۔ یہی جگہ ہے، جہاں
تم ہو ۔ اور پھر، اگر یہاں ہو، تو
تم وہاں پر تو ہو نہیں سکتے!

تم ابھی ہو ۔ اگر ابھی ہو، تو
اب سے پہلے نہیں تھے، اور اب کے
بعد ہونا بھی غیر ممکن ہے!

اب، یہاں نہ طے شدہ حقیقت ہے
تب وہاں ۔ فہم کا توہم سا!

اپنی آنکھوں سے کیا سوال کروں؟
خود نگاہ ہی انھیں نہیں آتی!

سمبیاسز

عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ مجھے
ایسے لگتا ہے، وہ سبھی اشیاء
روزمرّہ کا جن سے رشتہ ہے
میں پہنتا ہوں جن کو، میرے بوٹ
ہیٹ، عینک، یا ٹائی دستانے
مجھ کو ایسے لگتے ہیں، میرے
ہم نفس ہیں، عزیز بھائی ہیں
دوست ہیں، اور ان کو میں پہنوں
یا وہی مجھ کو پہن لیں، دونوں
حالتوں میں کوئی تضاد نہیں

لفظ

میں فقط ایک لفظ ہوں آنند
اک اکیلا، کٹا ہوا دیگر
نفسِ مضمون سے، عبارت سے
معنویت سے کورا، خالی لفظ
بند مٹھی میں ذہن کی ہوں اسیر

جلتا بجھتا ہوا کوئی جگنو
کسمساتا سا، مائل بہ پرواز
پھڑپھڑاتا سا، اڑنے کو بیتاب

مجھ کو اڑنے کا اذن دو گے اگر
ذہن کی بند مٹھی سے باہر
میں فقط ایک لفظ سے آنند
شعر بن کر فضا میں گونجوں گا
معنویت سے پُر، مکمل شعر

SYMBIOSIS کا

گھر میں اجنبی

ایک مدت سے ہنس نہ پایا تھا
اس لئے جب ہنسا تو گھر کے لوگ
چونک اٹھے، ٹھٹھک گئے، دیکھا
غور سے میری سمت، یہ سوچا
روز و شب کے بکھیڑوں سے شاید
ذہن ماؤف ہو گیا ہے،
ہنسنا معمول کے منافی ہے

آہ بھرتا تو گھر کے لوگ کبھی
یوں ٹھٹھک کر نہ دیکھتے کہ انہیں
ایسے لگتا کہ میں وہی تھا، جو
دیکھتے آ رہے تھے برسوں سے

نئی آنکھیں

بھیڑ سے یہ کہا تتھاگت نے
سنگھ سے آنکھیں لینے آئے ہو
تو مری بات غور سے سن لو

ان تمہاری پرانی آنکھوں نے
جن کو تم اپنے ساتھ لائے ہو
لاکھ منظر ہیں دید کے تھامے
ماں کی آغوش، ماتھے پہ بوسہ
چھاتیوں میں بھری ہوئی شفقت
بچوں کا پیار، بیوی کا چہرہ
اور ان سب سے منسلک، وہ گھر
جس کی چوکھٹ پھلانگ آئے ہو

اس لئے جاؤ لوٹ کر ایک بار
اپنی آنکھوں کو گھر کی چوکھٹ پر
دفن کر آؤ، تاکہ دیکھ سکو
نئی آنکھوں سے سنگھ کی جانب

بہی کھاتہ

روز لکھتا ہوں آنے والے کل
اور پرسوں کی زندگی کا حساب،
بہی کھاتہ کہ جس میں "آج" کے نام
میرے فردا کے سارے قرض کی مد
لکھی جاتی ہے، اور روزانہ
اس کا میزان بڑھتا جاتا ہے

یہ زرپیشگی عجیب ہے، مرا
خال "فردا" کے واسطے اتنے
دکھ اٹھائے کہ آنے والے دن
جانے والے دنوں سے بہتر ہوں!

آج کی واجب الادا یہ رقم
سود در سود آنے والا "کل"
دے گا، یا میرا اصل سرمایہ
(آج کے دن کی زندگی کا سکھ)
یونہی بے کار ڈوب جائے گا،
غور کرنے کی بات ہے، لیکن
لکھتا رہتا ہوں، آنے والے کل
اور پرسوں کی زندگی کا حساب!

سایہ

بھیڑ سے یہ کہا تھا تتھاگت[1] نے
چڑھتا سورج ہو، ڈھلتا سورج ہو
پیٹھ کر کے چلوگے تو لوگو،
اپنا سایہ ہی خود سے کچھ آگے
چلتا پاؤ گے ۔ اور تم اس کے
پیچھے پیچھے چلوگے ساری عمر

[1] مہاتما بدھ کا لقب

جزیرہ

میں جزیرہ ہوں ایک لمحے کا
مجھ سے پہلے ہزار صدیوں کا
اک سمندر ہے ۔ اور میرے بعد
لاکھ برسوں کا بحرِ بے پایاں

گم شدہ وقت کے تواتر میں
ایک لمحے کا دھند میں غرقاب
میں جزیرہ ضرور ہوں، لیکن
ایک نقطے پہ جامد و ساکن،
اور لا اختتام صدیوں کے
اس سمندر سے آگے اور پیچھے
میرا رشتہ ہے قائم و دائم

انجان

یاد ہے تم نے کیا کہا تھا مجھے
"ہم سے آشفتہ سر ہمارا کیا
بہتے پانی ہیں، جو رک گئے تو جھیل.
لاابالی سے رمتے جوگی ہیں
اپنی دھونی رما کے بیٹھے تو،
صدیاں گذریں گی، تیرے پہلو سے
اٹھ کے جانے میں عار ہوگا ہمیں!"

آج میں سوچتی ہوں، جوگی کا
ڈیرہ اجڑا ہوا ہے، وہ پانی
جھیل بننا تھا جس کو تیزی سے
بہہ گیا ہے نہ جانے کتنی دور!
واقعی سچ کہا تھا تم نے، مگر
میں ہی انجان تھی، نہ جان سکی!

عدلیہ انصاف

اندھا راجہ ہے، بہرے درباری
شہر کا کوتوال قاضی ہے
اور مرے قاتلوں میں سرکردہ
لوگ ہیں، جن کو شہر کے شرفا
سمجھا جاتا ہے، میرے گھر والے
اس حقیقت کو جانتے ہی نہیں
خوں بہا مانگتے ہیں، روتے ہیں،
کھینچے جاتے ہیں عدل کی زنجیر!



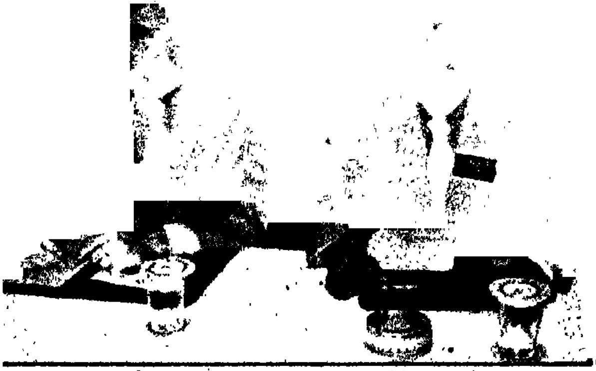
گوپی چند نارنگ
ڈی ۲۵۲ - سرودیہ انکلیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

اختتامیہ

ایک سو نظموں کا یہ مجموعہ بقامت کہتر بقیمت بہتر کے مصداق اس لئے بھی ہے کہ آزادی کے بعد کی اردو شاعری کے تجزیاتی مطالعے کے جس احساس لاحاصل پہ مبنی ہے، اس سے بعض ایسے سنگین سوال سامنے آتے ہیں، جن سے اردو کا کوئی سنجیدہ بہی خواہ صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ مثلاً غزل ہماری شاعری کی آبرو اور ہماری مرکزی صنفِ سخن سہی، لیکن اردو میں روایتی شاعری کی یلغار کیوں ہے۔ یعنی مشاعروں کی بات تو الگ رہی ہمارے ادبی رسائل کا زیادہ تر حصہ رسمی و روایتی غزلیہ شاعری کی نذر کیوں ہو جاتا ہے۔ یا یہ کہ اردو میں نظم کی روایت، ہیئتی و صنفی اعتبار سے اگرچہ راسخ ہے، لیکن آزادی کے بعد نظم کی ترقی رکی رکی دبی دبی سی کیوں ہے۔ یا قطع نظر گنتی کے چند شعراء کے ہماری نظمیہ شاعری میں وہ معنیاتی اور موضوعیاتی تنوع یا ہمہ گیری کیوں نہیں جو دوسری ترقی یافتہ زبانوں کا طرۂ امتیاز ہے؟ یہ نتائج معروضی طور پر ہندوستان سے باہر ایک غیر ملکی یونیورسٹی کے تحقیقی پروجیکٹ میں اخذ کئے گئے۔ قطع نظر طریق کار کے فرق کے یا ان ضرورتوں کے جن کے تحت اس نوع کا پروجیکٹ قائم کیا گیا، میرا خیال ہے کہ یہ مسائل اس قدر شدید ہیں کہ اگر یہ پروجیکٹ بجائے کسی غیر ملکی یونیورسٹی کے دہلی یونیورسٹی یا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں قائم کیا گیا ہوتا تب بھی نتائج کم و بیش یہی برآمد ہوتے، اور احساس یہی مرتب ہوتا کہ تخلیقی صورت حال اس سنگینی پر اردو والوں کو ضرور غور کرنا چاہئے، اور اس کے تدارک کی ہر ممکن سعی بھی کرنا چاہئے۔ اس پروجیکٹ کے کوارڈی نیٹر پروفیسر ستیہ پال آنند انگریزی اور تقابلی ادب کے پروفیسر ہیں، اور پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ کے علاوہ واشنگٹن ڈی سی کی ساؤتھ ایسٹرن یونی ورسٹی سے بھی ان کا برسوں سے تعلق ہے۔ انگریزی اور ہندی میں ان کے متعدد شعری مجموعے، ناول اور افسانوی مجموعے شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ جو شخص آج سے بیس پچیس برس پہلے راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، ملک راج آنند، خواجہ احمد عباس، اور کنہیا لال کپور جیسی جید ہستیوں سے اپنی تخلیقی قوت کا لوہا منوا چکا ہو، اردو میں اس کی واپسی لائق مبارک ہے۔ حال ہی میں اردو میں ان کا ناول "شہر کا ایک دن" اور افسانوں کا مجموعہ "اپنی اپنی زنجیر" شائع ہوئے ہیں، اور اب یہ شعری مجموعہ "دستِ برگ" پروجیکٹ کے تحت منظر عام پر آ رہا ہے۔

زیر نظر مجموعہ در حقیقت اس وسیع تر احساسِ محرومی کا آئینہ بھی ہے کہ غیر ملکی یونی ورسٹیوں میں تقابلی ادب کے سلسلے میں جنوبی ایشیا کے ادبیات کی نمائندگی بالعموم ٹیگور، آر۔ کے نارائن، راجا راؤ وغیرہ تک محدود ہے، اور اردو کا کوئی عمل دخل نہیں۔ اس پروجیکٹ میں اس صورتِ حال سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ اردو غزلیہ شاعری کا ترجمے کی زد میں نہ آسکنا اور اردو شاعری کا بالعموم رومانیت زدہ ہونا اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس سے نمٹنے کی ایک صورت یہی ہو سکتی ہے کہ اردو نظم کی ایسی روایت پر توجہ کی جائے جس میں اردو کی اپنی ثقافتی پہچان بھی ہو، اور معنیاتی اعتبار سے وہ ایسی پیچ و پوچ نہ ہو کہ مغربی قارئین اسے "اورینٹل" کہہ کر حقارتاً رد کر دیں۔ قطع نظر ان مباحث کے کہ تقابلی ادب کے تمام ایشیائی نصابات میں فکشن زیادہ اور شاعری کم جگہ کیوں پاتی ہے یعنی کیا ترجمے میں فکشن کی ترسیل آسان اور شاعری کی نسبتاً کم آسان نہیں، یا کیا شعری عنصر جمالیاتی عنصر نہیں جس کو ترجمے میں زیر دام لانا تقریباً ممکن ہے۔ یا ترجمے کی ضرورتوں کے تحت جو شاعری کی جائے گی، وہ شعری عمل کا حق کس حد تک ادا کر سکے گی، یہ حقیقت اپنی جگہ غور طلب ہے کہ یہ نظمیں آٹھ سال کی مدت پر پھیلی ہوئی ہیں، اور مختلف مقامات پر مختلف کیفیتوں میں کہی گئی ہیں، ان میں جو معنیاتی قوسِ قزح ہے، مشرقی اور مغربی شعری روایت کے درمیان جو جمالیاتی پل بنانے کی کوشش کی ہے، انگریزی سوچ، ہندوستانی مزاج اور اردو اظہار کا جو جزو رہا ہے، ہندی اور پنجابی تناظر کی جو پرچھائیں ہے، جو انوکھا اور نیا ذائقہ ہے، وہ اپنی الگ نوعیت رکھتا ہے۔ اگرچہ خالص لسانی نقطۂ نظر سے کچھ باتیں اختلافی بھی ہو سکتی ہیں۔ لیکن بعض نظمیں بالخصوص "زین

[باقی صفحہ ... پر دیکھئے]



عصری عالمی شاعری اور اردو شاعری

شرکاء ○ ڈاکٹر تھامس گرے
○ ڈاکٹر ستیہ پال آنند
مترجم ○ پروفیسر عزیز پری ہار

عصری عالمی شاعری کے پراجیکٹ کے تحت جنوبی ایشیا کی زبانوں کے پروگرام کی افتتاحی تقریب کے موقع پر لیا گیا ایک اہم انٹرویو ۔ تقریب ۸ ر جولائی سنہ ۱۹۹۰ء کو واشنگٹن، ڈی سی، میں منعقد ہوئی تھی۔

گرے: ستیہ! اس نشست میں آپ کا خیر مقدم ہے۔ سب سے پہلے میں آپ کو زحمت دوں گا۔

آنند: ٹام! میں تیار ہوں۔

گرے: پراجیکٹ مکمل ہونے میں تین برس لگے۔ چار حضرات نے اس میں حصہ لیا۔ لیکن اس کی کامیابی کا سہرا آپ کے سر ہے۔ جس کے لئے ہم سب آپ کے ممنون ہیں۔ آپ نے اس عرصے میں کم و بیش یک صد نظمیں لکھیں۔ کل تیس ۳۰ نشستوں کا انعقاد کیا گیا۔ چند ایک کے قطع نظر میں سب نشستوں میں حاضر تھا۔ آپ نے اپنی نظمیں پڑھیں۔ اور حاضرین نے انہیں بڑے انہماک اور اشتیاق سے سنا۔ اور ان نظموں پر اظہار رائے کیا۔

آنند: آپ نے درست فرمایا۔

گرے: اس پراجیکٹ کا مقصد اس بات کا پتہ لگانا تھا کہ آپ جیسا وسیع النظر شاعر اور تقابلی ادب کا استاد اردو شاعری کو صنفِ غزل کی زنجیروں سے آزاد کرانے میں کس حد کامیاب ہو سکتا ہے۔ غزل جو ادب کی دیگر اصناف کا احاطہ کئے ہوئے ہے... دوسری اہم بات یہ کہ کیا اس نوع کی سعی کو ایک تحریک کی شکل دینا ممکن ہوگا۔ ایک ایسی تحریک جو عصری اردو شاعری کو دنیا کی دیگر زبانوں میں تخلیق ہونے والے ادب کے قریب لے جانے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ ہم مثالوں کی اہمیت سے خوب واقف ہیں۔ مثالیں اس وقت کام آتی ہیں جب تمام مفروضے ناکام ہو جاتے ہیں۔ گذشتہ چار دہائیوں کے ادب پر نظر ڈالیں تو ہمیں ن۔ م۔ راشد اور میراجی کے مقلدین کہیں نظر نہیں آتے۔ ہوا یہ کہ فیض احمد فیض اور دوسرے ترقی پسند ادبا اور شعرا جنہیں PSEUDEO رومانی انقلاب کے علمبردار کہا جا سکتا ہے، سبقت لے گئے۔ اس کا نتیجہ بڑا مایوس کن رہا۔ آج دیگر یورپی زبانوں سے قطع نظر، کسی اردو شاعر کو یہ اعزاز حاصل نہیں کہ وہ انگریزی کے ذریعہ سے متعارف ہوا ہو۔

آنند: آپ فیض کو بھول رہے ہیں ٹام! ان کی شاعری کا انگریزی میں ترجمہ ہوا ہے۔

گرے: ستیہ! آپ کو تنقید کا حق حاصل ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ فیض کی شاعری کے ترجمے منظر عام پر آئے ہیں۔ لیکن کیا آپ نے TIMES LITERARY SUPPLEMENT میں تین سطری تبصرہ دیکھا؟ SATURDAY EVENING POST سے تو یہ بھی نہ ہو سکا۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایک ایسا شاعر جس کی ایک پوری نسل نے پرستش کی ہے جس کی شاعری کے مشرقی یورپی زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں۔ اسے محض سیاسی تناظر میں دیکھا گیا۔ بر اعظم کے دیگر یورپی زبانوں نے اسے شاعر تسلیم نہیں کیا... شاید میں نفس مضمون سے تجاوز کر گیا ہوں۔ اس پراجیکٹ کا ایک دوسرا مقصد اس بات کی تحقیق کرنا تھا کہ کیا عصری اردو شاعری کو غزل کے زبردست بوجھ سے نجات دلائی جا سکتی ہے کہ اس ہیئت کو تین طویل صدیاں ہو گئیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پراجیکٹ کے اسکالر زعیم الرحمٰن نے ۱۹۸۵ء میں اپنے تحقیقی جائزے سے اس بات کی نشاندہی کی کہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۸۵ء تک شائع ہونے والے پاکستانی رسائل و جرائد میں ۸۰ فیصد صفحات شعری ادب کے کل حصے سے صنفِ غزل نے غصب کئے۔ ۲۲ فیصد شعری تخلیقات دیگر اصناف پر مشتمل تھیں۔ جن میں نظم معرا اور قطعات شامل تھے۔ رباعیات ایک فیصد سے کم تھیں۔ آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ مذکورہ اسکالر نے یہ نشاندہی بھی کی تھی کہ تمام غزلوں میں ۷۰ موضوعات SUBJECTS میں کثرت ان اشعار کی تھی جو گھسے پٹے اور جانے ہوئے خیالوں کے سے تھے۔

سوائے چند ایک اشعار کے ان کی درجہ بندی کی جا سکتی ہے۔ ان ۸۰ کی مزید درجہ بندی کی جائے تو ۹ ایسے موضوعات کی درجہ بندی کی جا سکتی ہے جن میں بیشتر اشعار میں ذاتی غم و یاسیت کا رویہ ملتا ہے۔

آئند:۔ جی ہاں! پراجیکٹ کے اسکالرز نے جن موضوعات کی نشاندہی کی ہے۔ ان میں خود مرکزیت، خودی کی نفی، SELF-ABNEGATION انفعالیت شکستِ ذات، خود زنی،۔۔۔۔ اور سب سے زیادہ مکروہ جذبہ خود ترحمی کا پایا گیا۔

گ س:۔ غزل نے اردو شاعری کے ساتھ بہلک سلوک کیا ہے۔ غزل نے اردو شاعری کو عالمی ادب سے محروم رکھا۔ ایسا اس لئے بھی ہوا کہ راشد اور میرا جی اپنے مقلدوں سے محروم رہے۔ اس پراجیکٹ کی تشکیل کی تہہ میں بہ حیثیت شاعر آپ کی تخلیقی صلاحیتوں سے استفادہ مقصود تھا۔— ہم نے آپ سے درخواست کی اور آپ نے اسے قبول کیا اور نظموں کی تخلیق کا سلسلہ شروع کیا۔ کسی MODELS کے لئے نہیں کہ ماڈل سے شاعری نہیں ہوتی۔ لیکن ان نظموں کے لئے یہی کافی ہے کہ یہ اپنے آپ میں شاعری ہیں اس امید سے کہ ان نظموں کا تتبع کیا جائے گا۔۔۔ خیر یہ سب باتیں تو پراجیکٹ رپورٹ میں شامل ہوں گی۔۔۔ اگر آپ اجازت دیں۔ ستیہ۔ تو میں آپ سے کچھ سوال پوچھوں؟

آئند:۔ ضرور پوچھئے۔ شام۔

گ س:۔ ستیہ، آپ نے اپنے مضامین میں اور دوستوں کے ساتھ گفتگو کے دوران یہ بات بہت واضح طور پر کہی ہے کہ فیض کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اور راشد اور میرا جی کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ اردو کے تنقید نگاروں نے اردو شاعری سے ناانصافی کی ہے۔ کیا آپ اپنی اس بات کو مفصل طور پر بتائیں گے؟

آئند:۔ آپ میرے نظریات سے پہلے ہی واقف ہیں۔ میں اتنا ضرور عرض کرنا چاہوں گا کہ راشد کافی حد تک اور میرا جی کسی حد تک اردو شاعری کو اس دور میں مغرب میں لکھی جانے والی نظموں سے قریب لے جانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ IMAGISTS اور IMPRESSIONISTS اور سپ جارجائی شعراء کی قبیل سے راشد اور میرا جی نے فیض حاصل کیا تھا۔ ۱۹۳۵ء کے بعد راشد نے موضوع، ہیئت اور اسٹائل کے تجربے کئے۔۔۔۔ بحروں کے انضمام سے نظم معرا کی گونا گوں اور متنوع سطحوں پر تبدیلیاں کیں۔ جو یورپی زبانوں میں کئے گئے تجربوں سے کسی صورت بھی کم نہیں۔ راشد کی شاعری میں بعض نقادوں اور قارئین کو ابہام کی پرچھائیاں دکھائی دیں۔ نقادوں کا ایک دوسرا اعتراض یہ تھا کہ راشد کی شاعری میں جنسی اور متعلقہ ہیجانی موضوعات کا اظہار زیادہ بے باک نوعیت کا ہے۔ کچھ نقاد ایسے بھی تھے کہ جنہوں نے راشد کو یکسر نظر انداز کر دیا۔— اسے اردو زبان اور دیگر ہندوستانی زبانوں کی بدقسمتی کہیے کہ ۱۹۳۶ء ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا آغاز ہوا۔ بہت سے اردو شعرا ترقی پسندوں کی ردیف بننے لگے۔ ۱۹۵۲ء تک۔ اس برس جب میرے افسانوں کا مجموعہ "بھینٹ کے لئے" شائع ہوا۔ تو میں نے بھی یہی بے وقوفی کی۔ اور سیاسی عقائد کا اعلان کیا۔ راشد کی نسبت فیض شاعر سے زیادہ سیاسی حالات کی پیداوار تھے۔

گ س:۔ قطع کلامی معاف، ستیہ! ہماری اس بحث میں راشد اور فیض کا موازنہ کس طرح مفید ثابت ہو سکتا ہے؟

آئند:۔ شام! یہ موازنہ سرسری نہیں۔۔۔۔ اس کا ایک خاص مقصد ہے۔ فیض منظر عام پر ذرا بعد میں آئے۔ لیکن ادبی تاریخ میں راشد اور فیض قریب قریب ہیں۔۔۔ نقادوں کی نظر میں فیض جتنا قد آور ٹھہرے۔ راشد کو وہ مقام اور مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی۔ میں نے یہ سوال خود سے کئی بار کیا ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟.. کیا فیض ایک بہتر شاعر تھے؟ نہیں "یقیناً" نہیں ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے معرض وجود میں آنے سے قبل برصغیر کی زندگی اور اس کے مسائل کے تئیں کیا فیض سچے اور ایماندار تھے؟ اس بات کا جواب بھی نفی میں ملے گا کیا یہ اس لئے ہوا کہ فیض راشد کے بہت بعد تک ادبی سفر میں گامزن رہے؟ یہ بات کسی حد تک سچ ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ کلی صداقت نہیں ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد برصغیر میں فیض کا طوطی بولنے لگا۔ اور ادھر راشد کو تقریباً نظر انداز ہی کر دیا گیا۔ PSEUDEO-MARXISTS رجحان کی جانب میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں۔ نظریہ ساز حضرات اسکیپ وسکی پی کر عوام اور دیہات کے کسانوں کے مسائل پر بھرپور تبصرے کرتے ہیں۔۔۔ فیض تو کمیونسٹ تھے ہی۔ راشد نہیں تھے۔

گ س:۔ ستیہ! آپ کو یاد ہو گا پی ڈبلیو اے نے سعادت حسن منٹو کو ذات باہر کر دیا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان میں اس انجمن کی ادارت میں یا اس کے ڈھنگ کے والے مدیروں کی زیر ادارت ادبی رسائل شائع ہوا کرتے تھے۔

آئند:۔ مگر راشد کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ اس نے اپنی شاعری کے ذریعے سے کبھی حصولِ زر کی خواہش نہیں رکھی۔ منٹو نے اپنی نثری تخلیقات سے واز

رویہ کمایا لیکن آپ نے جو ذہلیا وہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور PROGRESSIVES کے لئے یہ بات آج بھی باعث ندامت ہے ... فیض ایک دانشور تھے۔ سودوزیاں سے آشنا اور ان سب سے زیادہ ایک اچھے شاعر۔ ادبی نظریے کی رو سے ایک اچھا شاعر ہونے سے بھی بڑا اسپ ایلیٹ کے روایت اور تجربے سے متعلق افکار میں مضمر ہے۔ راشد ایک ہی جست میں روایت سے تجاوز کرنا چاہتے تھے۔ وہ روایت شکن تھے۔ فیض کی بات مختلف ہے۔ فیض نے ہیئت کے تجربے ضرور کیے ہیں لیکن وہ روایت کے دائرے میں رہے۔ ان کے ہاں روایت کا احترام ہے۔ مجھے اس بات کا علم نہیں ہے کہ راشد نے اچھی غزلیں کہی ہیں۔ لیکن فیض نے سو سے زائد غزلیں لکھیں جنہیں ہندوپاک کے گلوکاروں نے گایا ہے۔ یہ راشد کی کوتاہی تھی۔ راشد سے غلطی یہ ہوئی کہ وہ بہت کم وقت میں ایک بہت بڑی تبدیلی لانا چاہتے تھے۔ انہوں نے حشر آفرینی سے کام لیا۔ قادرِ مطلق کی مانند وہ خلا سے ایک جہانِ نو کی تعمیر میں جٹ گئے۔ ایسا کرتے وقت راشد نے ایک پوری نسل کی اخلاقی اور اجتماعی نفسیات کو ضرب پہنچائی اور اسے مجروح کیا۔ نظامِ کہنہ کے پرستاروں کو اس سے دکھ پہنچا۔ راشد نے دراصل اپنے ذاتی تجربے کے اظہار کے اسالیب کو از سرِ نو ترتیب دینے کی سعی کی۔ ایلیٹ کے لفظوں میں یہ لاتعلق زدہ شخصی اظہار OBJECTIVE PERSONAL EXPRESSION ہے۔ اس سے وہ لوگ خفا ہوئے جن کے نزدیک راشد کی شاعری ابہام سے عبارت تھی۔ موضوعات کا انتخاب کرتے وقت راشد نے اپنے عہد کی اخلاقی اور ادبی روایت کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھا۔ عشق کا تصور ایک الوہی تصور ہے جس کا ماورائی رنگ نسوانی پیکر کے جنس زدہ عشق کی ضد ہے۔ اردو شاعری میں جو روایت کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ ہمیشہ "اہلِ دل" کی تعریف میں قصیدے لکھے گئے ہیں۔ اور اہلِ ہوس سے منافرت کا اظہار ملتا ہے۔

۔ آپ نے جن اخلاقی قدروں کا اظہار کیا، ان کا تعلق تخلیق کاروں سے ہے یا کہ تمام پا ذیوں سے؟ کیا یہ شاعر اور تخلیق کار راشد سے پہلے کے ہیں یا ان کے معاصرین ہیں؟ یہ لوگ راشد کے متاخرین بھی ہیں اور ان کے معاصرین بھی۔ اب ایک نظر فیض پر ڈالیں۔ کیا فیض نے کبھی نسوانی پیکر کے حسن و جمال کو موضوعِ سخن نہیں بنایا؟ فیض کی نظم ایک ایسے تخلیقی عمل کی آئینہ دار ہے جو کچھ کہنے پر تو آمادہ ہے لیکن تشبیہات کی قوتِ گویائی CONCEPTUALIZED IMAGERY جیسے ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے جواب دے جاتی ہے۔ اور نسوانی پیکر ایک ہیولہ سا بن کر رہ جاتا ہے [اس کے خال و خد واضح نہیں ہوتے ..] اس صدی کی تیسری دہائی میں میں برٹش انڈیا کے شمالی مشرقی سرحدی صوبے کی نوشہرہ چھاؤنی میں ایک اسکول میں طالب علم تھا۔ اردو جو ایک لشکری زبان کے طور پر پیدا ہوئی۔ اور روزمرہ کی زبان تھی، اب مکتبوں میں پڑھائی جانے لگی تھی۔ ان جگہوں پر جہاں پرائمری اسکول نہیں تھے۔ راشد کے مخالفین کی قبیل کے لوگوں کے لئے اس کا رسم الخط فارسی، پہلوی یا نستعلیق عربی رسم الخط سے ملتا جلتا تھا۔ اور یہ مشابہت ایک مقدس جذبے کی تشکیل کرتی تھی، بات میرے مشاہدے میں آئی ہے: میں نے اردو میں طباعت شدہ کاغذوں کے گرے پڑے دریدہ ٹکڑوں کو بھی لوگوں کو عقیدت سے چومتے اور انہیں بحفاظت اندرونی جیب میں رکھتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس سے ٹیننگ کی اجتماعی لاشعوری سطحوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جو ایک پوری نسل کو وراثت میں ملی تھیں۔ کسی بھی مسلمان کو یہ بات قطعاً گوارہ نہیں تھی کہ عربی رسم الخط سے ملتا جلتا کاغذ کا کوئی ٹکڑا جو قرآن پاک کا ایک دریدہ ورق بھی ہو سکتا ہے۔ ادھر ادھر بکھرا پڑا ہو۔ وہ اس کو بچانے کے لئے اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار ہو جاتا...... اب ذرا غور سے دیکھئے کہ اخلاقیات جسے مذہب کا ایک دائمی جزو مانا گیا ہے کے محافظ راشد کو کیسے اجازت دیتے کہ وہ اندھے سیمسن کی طرح اس محل ہی کو گرا دے۔ جس کا وجود ان کے دم سے قائم تھا..... فیض نے نہ ہی راشد کی سی جرأت دکھائی۔ نہ ہی دیانت داری سے کام لیا۔ وہ چالاک تھے اور اپنے فن کے تئیں ایمان دار بھی نہیں تھے۔ وہ وقت کے دھارے کے ساتھ بہہ جانے کا ہنر جانتے تھے۔ انہوں نے کبھی مخالف رخ اختیار نہیں کیا۔ انہیں بھی اس لئے نہیں سمجھا گیا کہ وہ شاعر تھے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ کمیونسٹ تھے۔

۔ فیض کا جہاں تک تعلق ہے آپ کا کافی ہوگا۔ سنیئے۔ میں نے وہ خطوط دیکھے ہیں۔ جو فیض نے وقتاً فوقتاً آپ کو لکھے۔ فیض نے آپ کی ایک پنجابی کتاب کا حرفِ اول بھی لکھا ہے۔ آپ کا اور فیض کا رشتہ تو گویا LOVE-HATE تعلق کی ایک مثال ہے ... کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر راشد اور میرا جی کو ان کا صحیح مقام مل پاتا۔ نیز ان کی عظمت کو تسلیم کیا گیا ہوتا تو آج اردو شاعری مختلف ہوتی؟

۔ بے شک میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔

۔ اب ہم ایک دوسرے مسئلے پر غور کریں۔ ہمارے پاس تیس منٹ باقی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ راشد کا شعری آہنگ جو یہ ذاتی کا اظہار تھا۔ یہ وصف فیض کی آخری دور کی شاعری میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ آپ اس نکتے کی وضاحت فرمائیں گے؟

تند: جب ن۔م۔ راشد نے " لا=انسان" میں شامل DIALOGUE [مصاحبہ] میں یہ بات کہی کہ " ماورا" میں شامل نظموں کا کردار سوانحی نہیں۔ بلکہ یہ شعوری ڈھانچے میں ڈھالی ہوئی مختلف النوع کرداروں کی تلاش اور ان کے تجزیے کی سعی تھی تو ان کے معاصرین کو شاید یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ شاعری ایک دلفریب آہنگ SOUND تو ہے ہی لیکن دلفریب آہنگ سے لے کر تحریک تخش۔ گستاخ اور جذبے داری اور معنی آفرینی MEANING تک شاعری کا سفر بے حد طویل ہے۔ ایک نقطے سے دوسرے نقطے تک پہنچنے کے لئے یعنی "ماورا" سے "لا=انسان" تک کا سفر راشد کیلئے یقیناً ایک صبر آزما سفر رہا ہوگا۔ دیکھا جائے تو ہر تخلیقی شاعر کو پرخار اور پرخطر راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ راشد سے پہلے بھی یہ سفر جاری تھا اور راشد کے بعد بھی۔۔۔۔

گ س: ستیہ! یہ بات ہماری گفتگو کے دوران بارہا ہماری توجہ کا مرکز بنی ہے کہ راشد سے قبل کے شعرا کا سفر اقبال کے شخصی اور سوانحی اور فوری ذاتی تجربوں کی سطح سے شروع ہوتا ہے۔ اور آخر کار معروضی اور تجزیاتی طرز اور پیرائے میں ڈھل جاتا ہے۔ ابھی آپ نے فیض کی آخری دور کی شاعری کا بھی اسی تناظر میں ذکر کیا۔ جب آپ نے اس جانب اشارہ کیا تو کیا آپ کے ذہن میں اردو شعرا تھے؟

آنند: نہیں تو! میں دراصل ایلیٹ اور ایذرا پاؤنڈ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ایلیٹ کی یہ بات کہ ایک شاعر تین متوازی سطحوں سے بات کرتا ہے جو بہ ظاہر مختلف آوازیں نہیں ہیں۔ یہ بات راشد کی اس بات کا ہی روپ ہے۔ جس کی جانب انہوں نے " لا=انسان" میں شامل مصاحبہ میں اشارہ کیا ہے۔ ایلیٹ کے مطابق پہلی آواز وہ ہے۔ جب شاعر خود سے مخاطب ہوتا ہے۔ دوسری آواز میں وہ اوروں سے خطاب کرتا ہے۔ اور تیسری آواز وہ ہے جو اس کی اپنی نہیں ہے۔۔۔۔۔ یہ دوسرا پن OTHERLINESS درحقیقت معروضی تجزیے کا آخری درجہ ہے۔ لیکن پہلی دو آوازوں میں لاتعلقی اور "دوسرا پن" کا کچھ عنصر کارفرما رہتا ہے

گ س: آپ نے راشد کی ان نظموں کا حوالہ نہیں دیا۔ جن میں تیسری آواز واضح ہو۔ غیر ارادی طور پر آپ کی نظموں کی طرف آتے ہیں۔ آپ کی نظمیں جن میں عربی عنوان "العاتبۃ الجا" والی نظم شامل ہے۔ جس میں عمان میں ایک حبشی عورت کے ساتھ "BLACK ETHIOPIAN WOMAN" ہم بستری کا ذکر ہے۔ یا وہ نظم جس میں مونٹیال میں ایک فرانسیسی بولنے والی خاتون کے ساتھ ناگہانی حادثے کا ذکر ہے۔۔۔۔ آپ جسم کی زبان کے علاوہ ایک دوسرے کے الفاظ سمجھنے سے قاصر تھے۔۔۔ یا نظم " مونا لیزا"۔ مجھے اس عنوان پر شدید اعتراض ہے لیکن میرا اصل اعتراض یہ ہے کہ اگر ان نظموں کو ہندوستانی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ نظمیں ممنوعہ آسودگی جنس سے تعلق رکھتی ہیں۔ کیونکہ جس عورت کے ساتھ جنسی اور جسمانی تعلق قائم کیا گیا ہے، اس سے نہ ہی تو آپ رشتۂ ازدواج میں بندھے ہوئے ہیں اور نہ ہی اس سے آپ کو محبت ہے۔ راشد کی نظمیں "اجنبی عورت"، "رقص"، "ایک رات" اور "داشتہ" محض اقبالی CONFESSIONAL بلکہ ایک شخصی تجربے کا معروضی OBJECTIVE اظہار ہیں۔۔۔۔۔

آنند: عین ممکن ہے کہ اس شخصی تجربے کا اظہار اپنی تمام تر کلیت میں یا متعلق جزئیات کے ساتھ ابھر کر آیا ہو یا نہ آیا ہو۔۔۔۔۔

گ س: ستیہ! میرے اس سوال سے شاید آپ پریشان ہوں۔۔۔۔۔ آپ نے شعوری طور پر راشد کا اثر قبول کیا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ خاص طور پر وہ نظمیں جن کا تعلق جنسی تجربے اور اس کے فلسفیانہ تجزئیے سے ہے۔ راشد کی نظموں کا جز ہیں۔ آپ غیر ضروری اور مبہم لاتعلقی سے اپنا دامن آلودہ ہونے سے بچا لیتے ہیں۔ جبکہ راشد زیادہ ایماندار ہیں اور دامن کی آلودگی بھی گوارا کر لیتے ہیں۔ اس لحاظ سے آپ کی نظمیں فلسفیانہ سطح پر براہ راست اپیل کی حامل ہیں لیکن ایماندار نہیں۔۔۔۔

آنند: آپ کے ذہن میں کوئی خاص نظم ہے؟

گ س: ہاں تحفظات کے سلسلے کے تحت آپ کی نظم۔۔۔۔۔ جو اس طرح شروع ہوتی ہے۔ "جنس تو جسم کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔" یا کچھ اسی طرح۔ اور راشد کی نظم جس پر یہ ناقابل فراموش سطر ہے۔ "جسم ہے روح کی عظمت کے لئے زینۂ نور" فرق صرف اس قدر ہے کہ راشد کے ہاں ایلیٹ کی پہلی آواز کارفرما ہے۔ اور آپ کے ہاں تیسری آواز سنائی دیتی ہے۔ اس ساری کیفیت میں ZEN BUDHISM سے آپ کے لگاؤ کا اظہار ہوتا ہے۔۔۔۔۔

آنند: میرے ذہن میں تو کبھی یہ بات نہیں آئی۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے اس نظم کی تخلیق کے وقت میرے ذہن میں راشد کی نظم بالکل نہیں تھی۔ اب چونکہ اعتراف ہی ہو گیا ہے تو میں بڑے انکسار سے اس بات کو قبول کرتا ہوں۔ حلم اور انکساری جیسا کہ آپ پہلے بھی کئی بار کہہ چکے ہیں۔ میری فطرت کا ناگزیر وصف نہیں ہے۔

گ س: نہیں ستیہ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں۔ میرا مقصد صرف آپ کی کاوش کو سراہنا تھا۔ راشد کی سعی محض ایک آغاز تھا۔ جب شاعر اپنی آواز میں کلام کرتا ہے۔ یہ سفر کی ادھوری منزل ہے۔ جو جنسی اظہار کے پہلے پڑاؤ سے آگے نہیں بڑھتی۔۔۔۔۔ جب شاعر نسوانی پیکر کے خدوخال ابھارنے کے مد و جزر اور تذبذب و ہم سے گزرتا

ہم کنار کر رہا ہوتا ہے، شاعر، یعنی راشد کی پہلی آواز' دوشیزہ کو یہ باور کرانے کی سعی میں ہے کہ جسم جب جنس کی لذت سے آشنا ہوتا ہے تو روح پر اخلاقیات کی ضرب نہیں لگتی۔ روح اپنی بالیدگی قائم رکھتی ہے۔ آپ کی نظم میں اس سچائی کا اظہار بالغ نظری سے شاعر کی تیسری آواز میں ملتا ہے۔ یہاں یہ ایک پیامبر کا درجہ ہے۔ جو وہ اپنے پیروکاروں کے لئے جن میں مرد و زن دونوں شامل ہیں۔ ایک خطبے کی شکل میں دیتا ہے۔ اس کا تعلق بالواسطہ کسی دوشیزہ یا اس کے جسم سے نہیں ہے اور پھر یہ پیامبر کم مرتبہ بھی نہیں ہے۔ ژین بودھی طرز فکر، سینہ، آپ کے نزدیک ایک شعری سہولت ہے نہ کہ ایک حقیقی مذہبی عقیدہ ......

آنند: ہاں میں نے ایسا کیا ہے لیکن یہ عقیدہ کسی مجرد صورت میں اظہار نہیں پاتا۔ بلکہ خود کو ایک ایمائی انداز سے ظاہر کرتا ہے۔ آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس فکر کا بدل ایک امیج ... یا A CLUSTER OF IMAGES بن جاتا ہے۔

ز: آپ کا یہ دعویٰ ہے کہ آپ ایک IMAGIST پیکر تراش ہیں۔ کیا آپ اپنے منصب اور نظریے کی وضاحت کریں گے؟

آنند: یقیناً میرا تعلق اس مکتب سے ہرگز نہیں ہے۔ جو بیسویں صدی کے آغاز میں انگلستان میں پروان چڑھا تھا۔ تاہم میری شاعری کو ان شعرا سے بالکل علیحدہ کرکے بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔ انگریزی میں تین شعری مجموعوں کی اشاعت کے بعد میرے ناقدین اور قارئین نے بھی یہ بات محسوس کی ہے۔ جہاں تک پیکر تراش IMAGIST شعرا کا تعلق ہے۔ جیسا کہ انگریز اور فرانسیسی نقادوں کا خیال ہے۔ دو نظریات خاص طور پر اہم ہیں۔ شروع کے ناقدین جنھیں IMAGISM سے واسطہ پڑا، سمجھتے تھے کہ یہ شاعری تشنہ، نامکمل، مضمون در بطن شاعر کی قبیل سے ہے۔ تاثراتی نوعیت کی ہے اور الگ الگ پیکر اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ اور نظم کے مجموعی تانے بانے میں بھی الگ الگ رہتے ہیں۔ انہوں نے اس پل صراط کو نہیں پہچانا۔ جو ان پیکروں کو ایک دوسرے سے ملاتا ہے۔ پیکر ایک دوسرے سے ہم آہنگ کیسے ہوتے ہیں۔ اس عمل کی طرف بھی انہوں نے توجہ نہیں دی۔ دوسرے لفظوں میں ان کی ساخت کس طرح سے ایک قوی عضوی وحدت کو جنم دیتی ہے۔ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔ ان نقادوں کے نزدیک امیج ایک آرائشی وسیلہ تھا جس کا مرکزی خیال یا تجربے سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ گذشتہ چالیس برسوں میں جو دوسرا نظریہ ابھر کر سامنے آیا وہ تھوڑا الجھا ہوا ہے۔ بیلے BAYLAY [۱۹۵۵ء میں لندن سے شائع شدہ عہد ساز تصنیف THE ROMANTIC SURVIVAL کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔] اور فرینک کرموڈ FRANK KERMODE [مذکورہ سال کے دوران لندن سے شائع ہونے والی تصنیف ROMANTIC IMAGE کو لے لیجئے] ان دونوں نقادوں نے امیجسٹ اسکول کے شاعروں کو کیٹس اور دوسرے رومانی شعراء کے ساتھ جوڑنے کی سعی کی۔ اور اس بات کو تسلیم کیا کہ شاعری میں لفظوں کے مفردات CONNOTATIONS(ASSOCIATIONS) اور DENOTATIONS لغوی معنوں کی دونوں کی اہمیت ہوتی ہے اور یہ آگے جا کے امیجری میں ہم آغوش ہو جاتی ہیں۔ اب دیکھئے میری پیکر تراشی میں امیج کس سطح پر استعارے کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ یعنی نظم لفظوں کا جمگھٹ ہوتے ہوئے بھی سیال صورت کب اختیار کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں استعارے کی غیر مرئی تشکیل کا عمل مکمل ہونے کے بعد الفاظ اور ان سے وابستہ امیج کی کڑیاں کب ثانوی صورت اختیار کرکے میدان استعارے کے لئے چھوڑ دیتی ہیں۔ میں یوں کہوں گا یہ تب ہوتا ہے جب دونوں CONNOTATIONS اور DENOTATIONS عناصر ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ فوکس FOAKS ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔ اپنی کتاب TEE ROMANTIC ASSERTION میں ایک امتیاز یہ بھی روا رکھا کہ ایک جانب تو مواد SUBJECT-MATTER کی ابتدائی خام شکل ہے جو کم و بیش شاعر کے لاشعور کی پیداوار ہے۔ دوسری جانب ظاہری عناصر OBJECT-MATTER OR REFERENCE کی ظاہری چادر ہے جو اس کا احاطہ کرتی ہے۔ لیکن امیجسٹ شاعر اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ تخلیقی عمل کا یہ ایک اضافی یا نثری جز ہے......

گ: آپ کے آخر الذکر بیان سے خطرناک نوعیت کے بلکہ مخالف شبہات پیدا ہو سکتے ہیں۔ سینہ، تخلیقی عمل کی GESTALT THEORY جو پیکر تراشی کے یکسر منافی ہے۔

آنند: ہو سکتا ہے۔ لیکن میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ میرے یہاں شاعری کسی تخلیقی گلینڈ کے یکدم بیدار ہو جانے سے پھوٹنے والی کیمیائی رو نہیں ہے۔ جو میرے دماغ کی نسوں کو کرشمہ سازی پر مجبور کر دیتی ہے۔ تخلیق کار ایک بیدار مغز، بیدار ذہن، بیدار شخصیت کا مالک انسان....

گ: تخلیق کیا ہے؟ پہلے سے طے شدہ ڈیزائن، پلان، منصوبے کے مطابق کوئی بنی تلی، بنی بنائی چیز، جیسے کہ ایک دستکار فن کارانہ طور پر کرتا ہے۔

آنند: نہیں! قطعی نہیں!! ایک بیدار مغز انسان سے میری مراد ایک ایسے انسان سے ہے جو یہ جانتا ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے اور یہ کہ وہ ایک خاص قسم کا عمل انجام دے رہا ہے۔ وہ بیدار ذہن کا مالک ہے۔ لیکن جہاں تک کرافٹ CRAFT کا تعلق ہے وہ اس کے محاسن اور خوبیوں کو جانتا ہے۔ تربیت یافتہ ہے۔ وہ ایک ایسے مصوّر کی طرح ہے، جو سائز، رنگ، برش کے بالوں کے معیار اور دسترس سے بخوبی واقف ہے۔ جسے رنگوں کے امتزاج PIGMENTATION کی تہوں سے واقفیت ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ جزو اور کل کے تعلق کو جانتا ہے۔ اور اپنے موضوع کے پلاسٹک میڈیم میں تمام اجزائے ترکیبی کو پیش نظر رکھتا ہے۔

گ ب: آپ نے اس نکتے کی وضاحت بخوبی کی ہے۔ اب ہم آپ کی نظموں کے پیکروں کا ذکر کریں گے۔ نظم کے کلی یا مجموعی تاثر میں ان کا کیا حصہ ہے؟

آنند: کلی یا مجموعی! SUM-TOTAL OR WHOLE! ایک خطرناک اصطلاح ہے سام! کیا کل اجزائے انضمام سے بڑا ہوتا ہے؟ کیا دو اور دو ہمیشہ چار ہوتے

گ ب: نہیں، ایسا تو نہیں ہے کہ کم سے کم شاعری میں تو یہ نہیں۔ ہم اس نکتے پر اتفاق رکھتے ہیں۔۔۔۔ آپ ہمیشہ اس امیج کو ترجیح دیتے ہیں جس کا تعلق دیکھنے کی قوت سے ہے۔ یعنی بصری پیکر VISUAL IMAGE جو قوت باصرہ سے تعلق رکھتا ہے۔۔۔۔۔

آنند: ہم سب کے تجربے سے یہ بات گذری ہے۔ سام! قوت باصرہ سے تعلق رکھنے والا امیج ہماری دیگر حسوں کو متحرک کرتا ہے۔ منھ سے رال ٹپکانے تک ایک پاولووین PAVLOVIAN تاویل ہے۔ لیکن یہ سچ کے بہت قریب ہے۔ جیسا کہ میرے دوست سام ہاکر کی اصطلاح میں ایک عریاں تصویر ہماری ایک سے زائد حسوں کو بیدار کرتے ہوئے اسے جنسی ہیجان پر ابھارتی ہے۔۔۔۔

گ ب: سام ہاکر کو اردو نہیں آتی لیکن آپ کی تین نظمیں، جو جنسی تجربے پر مبنی ہیں۔ اور جن میں پیکر تراشی قوت باصرہ کے علاوہ دیگر چار یا اس سے زائد حسوں کو بھی بیدار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ سام کے لئے ایک مکمل جنسی تجربہ ثابت ہو سکتی ہے۔ سام کو ان نظموں کے انگریزی تراجم ضرور سنوائیے گا۔۔۔ سام، کیا آپ ستیہ پال آنند کی ان نظموں سے محظوظ ہونا پسند کریں گے؟

[کافی کا وقفہ]

آنند: آئیے، اب جنسی موضوعات سے ہٹ کر آرٹ کی بات کریں۔ میری نظم جس کا عنوان "لفظ" ہے۔ آپ کو پسند ہے۔ نظم کی پہلی سطر ایک بیان STATEMENT ہے۔ اس میں کوئی پیکر نہیں تراشا گیا۔ سطر ہے "میں فقط ایک لفظ ہوں۔ آنند" اس میں لفظ "فقط" بڑا اہم ہے۔ آنند یعنی شاعر خود کو "لفظ" کہنے کے بعد خود نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اب "لفظ" اپنی سوانحی اور اقبالی روداد کہتا ہے۔ دوسری، تیسری اور چوتھی سطر میں "لفظ" اپنی علاحدگی کے احساس کو شدت سے ابھارتا ہے۔

- ایک اکیلا کٹا ہوا دیگر / نفس مضمون سے عبارت سے / معنویت سے کورا، خالی لفظ"۔ پانچویں سطر ایک امیج ہے، ایک دھندلا سا خاکہ، لیکن بہر حال ایک پیکر میں تبدیل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہوا۔ "بند مٹھی میں ذہن کی ہوں اسیر" میں، یعنی کہ لفظ، یعنی کہ تخلیقی عمل کا پہلا قدم، تخلیق کار خود، ذہن کی بند مٹھی میں قید ہے۔ تخلیقی ذہن ایک بند مٹھی ہے۔ لفظ اس میں اسیر ہے۔ لیکن کسی مرئی شے کے روپ میں نہیں۔ اس نقطے پر پہنچنے کے بعد امیج ایک متحرک صورت اختیار کر لیتا ہے اس کی وسعت میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ سہ جہتی ایکائی THREE-DIMENSIONALLY روپ میں امیج کی تشکیل کو فوکس FOAKS نے امیج کے استعارے میں منتقل ہونے والے SYNAESTHETIC MOMENT OF AN IMAGE TURNING INTO A METAPHOR سے تعبیر کیا ہے۔ مٹھی میں اسیر شے اب لفظ نہیں ہے ایک جگنو ہے۔ ایک جگنو محض ایک شے نہیں، ایک عام کیڑا نہیں۔ اس کے معنی کی بے شمار ایمائی اور استعاراتی سطحیں اور پرتیں ہیں جن کا ماخذ لوک ساہتیہ، پرانوں کی کتھائیں، دیومالا اور شخصی تجربات ہیں۔ ہندوستان میں بچے جگنوؤں کو مٹھی میں بند کرنے کا کھیل کھیلتے ہیں۔ اب یہ امیج [لفظ جو ایک جگنو ہے] اپنے معنی کی دوسری سطح پر امیج سے استعارے میں ڈھلنے ہی کو ہے۔ یہ عضوی عمل اب اس لمحے تک پہنچنے ہی والا ہے کہ جہاں امیج استعارہ بن جائے گا۔ جگنو خود کو آزاد کرانے کے لئے بے چین ہے۔ جگمگانا، جلتا، بجھتا ہوا، کسمساتا، پھڑپھڑاتا، اڑنے کو بے تاب وغیرہ متحرک الفاظ اس کو استعارہ بننے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ جگنو، ایک لفظ، ایک امیج، جس کا علاحدہ کوئی وجود نہیں لیکن ARCHETYPAL IMAGE کی سطح پر یہ معنی کی کتنی جہتیں اوڑھ لیتا ہے۔ اسے آزاد کیجئے۔ لفظ کو تخلیق ذہن کی بند مٹھی سے نکلنے، دیگر الفاظ کے ساتھ جڑنے دیجئے۔ اور پھر دیکھئے۔ "مجھ کو اڑنے کا اذن دو جو گے اگر مرد ذہن

بند کمرے سے باہر، میں فقط ایک لفظ سے آشنا، شور بن کر فضا میں گونجوں گا، معنویت سے پُر، مکمل شعر!" اب استعارہ مکمل ہے۔ کیوں کہ جگنو اب ایک بار پھر لفظ کا ہے۔ اور آشنا [یعنی کہ شاعر] بھی!

س: آپ کی نظم " لفظ " میں لفظ ازلی اور ابدی ہے۔ ایک مختلف تناظر اور مختلف سیاق میں مجھے ایلیٹ کا ایک قول یاد آتا ہے کہ " لفظوں کو ان کے تناظر اور سیاق و سباق سے جدا کر کے دیکھنا مہلک اور گمراہ کن ہے اور میں انہیں چھونے سے بھی خوف کھاتا ہوں۔ "I'M MORTALLY AFRAID OF TOUCHING WORDS IN ISOLATION; THEY MISLEAD ME" ستیہ، آپ کی نظم میں لفظ کی یہ تفسیر "اک اکیلا، کٹا ہوا" یعنی ISOLATED گمراہ کن ہو سکتی ہے۔ شاعر کے ذہن میں شاعری "میں" چھپی ہوئی ہے۔ اگر یہ "لفظ" ہے، تو ایسے دیگر لفظوں کے ساتھ ایک فطری عمل کے طور پر ملنا ہی چاہیے۔ دیگر الفاظ کے ساتھ مل کر ایک لفظ ایک نظم بن جاتا ہے۔ ثابت یہ ہوا کہ لفظ نے 'کہنہ کہ تھا' اور امیج کے تناظر میں اس کا وجود معنویت سے پُر ہے۔ یہ بتائیے، ستیہ، کہ لفظ 'WORD' کے اختراع کے عمل میں لفظ کو آپ کس طرح بصری امیج کے ساتھ جوڑیں گے۔ اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو 'امیج' لفظ سے پہلے جنم لیتا ہے؟

ت: بے شک، تام! آپ نے صحیح فرمایا۔ امیج تمام چیزوں سے مقدم ہے۔ امیج تخلیق کا اولین عنصر، لمس ہے۔ لفظ کی حیثیت لیکن میڈیم کی ہے۔ جو خود میں ناکافی ہے۔ لفظ دوسرے الفاظ کی صحبت میں ایک نظم کو جنم دیتا ہے۔ لیکن لفظ تخلیقی عمل کی کثیر الجہات نوعیت کے اظہار کے لئے ناکافی ثابت ہوتا ہے۔ کثیر الجہات تخلیقی عمل نے اصل امیج سے لفظ کے میڈیم کی وساطت سے کس طرح رابطہ پیدا کیا۔ تام، ایک فقرہ الفاظ کی منطقی ترتیب ہے جو ایک معنی کو ظاہر کرتا ہے۔ الفاظ کا رشتہ اکہرا، نوعیت کا ہے۔ یہ فقرہ جو میں زبان سے ادا کر رہا ہوں۔ اسے بولنے کے لئے مجھے چند سیکنڈ درکار ہیں۔ آپ تصور کیجئے کہ عام گفتگو میں اگر یہ حالت ہے تو ان چند سیکنڈوں میں، میرے کثیر الجہاتی تخلیقی عمل میں کتنی سطحیں، کتنے ڈائمنشن اور جہات معرض وجود میں آتے ہیں۔ یا آتے آتے رہ جاتے ہیں۔ کیا ان سب کو ایک فقرے کے ذریعے ظاہر کرنا CONVEYED ممکن ہے؟ الفاظ تو دراصل ننھے ننھے جگنوؤں کا وہ سلسلہ ہے جو تاریکی کو تخلیقی ذہن کے لئے تاریک تر بنا دیتا ہے۔ کئی بار یہ الفاظ شاعر کو گمراہ بھی کر دیتے ہیں۔ وہ راستہ بھول جاتا ہے۔ لڑکھڑاتے ہوئے شرابی کی طرح تخلیقی شاعر کو دفنہ ہے؟ اس طرح کی تشبیہ کے لئے معافی چاہتا ہوں دراصل میرے ذہن میں ورجینیا ولف کی وہ بات کار فرما تھی جہاں وہ حقیقت اور ایک ناول نگار کے METHOD کو واضح کرتی ہیں۔ انہوں نے GIG-LAMPS لفظ کا استعمال کیا ہے۔

س: آپ نے درست کہا، ستیہ! وقت کوتاہ، قصہ طولانی والی بات ہے۔ اب ہم پراجیکٹ کے دوسرے مقصد کی جانب توجہ دیں۔ جس پر اس پروجیکٹ کا انحصار ہے۔ بے چارے اردو شاعر کو غزل کا مردہ گدھ اپنے وزن سے دبائے ہوئے ہے۔ غزل کا تسلط ہمیشہ رہا ہے۔ آج کی اس محفل میں غزل کے پرستار اور سر دھننے والے سامعین موجود نہیں ہیں۔ آپ اپنے خیالات کا اظہار برملا کر سکتے ہیں۔

ت: میرے ایرانی طلبا اور یہاں جو فلسطینی طلبا، موجود ہیں مجھ سے اتفاق کریں گے کہ غزل بحیثیت ایک صنف کے ایران میں لگ بھگ معدوم ہو چکی ہے۔ ان ممالک میں جہاں عربی بولی جاتی ہے غزل محض ایک تاریخی واقعہ تصور کی جاتی ہے۔ اردو میں یہ صنف زندہ ہے۔ یہ اچھی بات ہے اسے زندہ رہنا چاہئے۔ لیکن اسے اردو شاعری کی دیگر اصناف کو کچلنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ ایک بنیادی حقیقت ہے جسے تسلیم کرنا لازمی ہے۔ غزل ان کے دھنک رنگ تجربوں کے بہت قلیل حصے کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ روایت اور عہدِ رفتہ کے شعرا سے حاصل شدہ داخلی متینیت کے استعارے کی معنویت کی رینج محدود ہے۔ بات یہ ہے کہ امیج استعارے کی صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ اس تناظر میں غزل کی چند پرمعنی تشبیہوں کو لیجئے اور دیکھئے کہ کیا یہ میری بات کو واضح کرتی ہیں یا نہیں۔

طرزِ فغاں، طرزِ بیاں، شامِ فراقِ یاراں، صبحِ وصالِ ہمدم، مطلعِ ماہِ تمام، قاتل سے رسم و راہ، تیغِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ، تقاضائے دردِ دل، خونِ تیغِ ادا، عتابِ جرمِ سخن سر دیکھنا، نہ سنگ نہ دیوار دیکھنا، عشق کا کاسہ، عشق کو آزما کے دیکھ لیا، دل کی خانہ ویرانی وغیرہ، اس نوع کی بہت سی ترکیبیں اور اختراعات آپ کو مل جائیں گی۔ پروجیکٹ کے تحت لئے گئے اشعار... ۵۰۰۰ اشعار میں لفظ دل ۲۹۲۴ بار استعمال ہوا ہے کہیں کہیں اس کا استعمال تازہ کار ہے، کہیں کہیں بے حد نفیس۔ یہ ایک کہنہ اور بار بار استعمال شدہ امیج ہے جو ہم تک ایک تسلیم شدہ شعری محاورے کی صورت میں آیا ہے ACCEPTED POETIC PARLANCE قباحت یہ ہے کہ اس نے اپنا اوریجنل تصویری مفہوم کھو دیا ہے۔ اردو کے غزل گو شعرا کا مسئلہ یہ ہے کہ عموماً وہ اپنی نظموں میں بھی غزل کی تسلیم شدہ لفظیات کا استعمال کرتے ہیں۔

گرے: کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ غزل میں نئے اور تازہ فکری اسالیب اور طرزِ اظہار اور نئے نئے امیج اور معنی خیز علامات کو سمو لینے کی صلاحیت نہیں ہے۔ ایک گزشتہ میٹنگ کے دوران بھی آپ نے کچھ ایسی ہی بات کہی تھی۔

آنند: نہیں، ٹام! میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ غزل کی ہیئت میں اس کا ایک شعر دو مصرعوں پر محدود رہتا ہے۔ دو سطریں یا جنہیں آپ دو مصرعے کہتے ہیں..... صرف دو جن پر قافیے اور ردیف کی پابندی عائد ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اس بات کا امکان نہیں رہتا کہ پیکر استعارے کی صورت اختیار کر سکیں۔ علامتوں کے لیے غزل میں سانس لینے کی گنجائش نہیں ہے۔ دو مصرعے، قافیے اور ردیف کی بیڑیوں اور ہتھکڑیوں میں بندھے ہوئے! کوئی شاعر [اور میں یہ کہوں گا کہ ایک ذہین شاعر بھی ان حد بندیوں میں گھٹن محسوس کرتا ہے] کوئی بہت ہی غیر معمولی شاعر ہی ان حد بندیوں پر قابو پا سکتا ہے۔ کلینتھ بروکس نے MODERN POETRY AND THE TRADITION میں لکھا ہے "ایک علامت نگار اپنی حقیقت کے کلّی ویژن کی رمزیت اور اس کی تہہ داری کو کبھی زائل نہیں ہونے دیتا..... THE SYMBOLIST POET REFUSES TO SACRIFICE THE SUBTLETY AND COMPLEXITY OF THE TOTAL VISION OF HIS REALITY.... یہ ایک علامتی شاعر کا موقف ہے۔ اس کا عقیدہ ہے۔ ایسے شاعر کو ایک ایسے طرزِ اظہار کی تلاش رہتی ہے جس کے ذریعے قاری کو بے معنی الفاظ کا شیرازہ بامعنی دکھائی دے۔ —— AMORPHOUSNESS FOR THE SAKE OF AMORPHOUSNESS ایسی صورت میں کیا کرے گا بے چارہ غزل گو کس بیساکھی کو اپنائے گا؟ بار بار آزمودہ فارمولوں کی علامتیں، گھر، وحشت، دریا، سمندر، شہر، دوست، محبوب، بے وفائی، بے چارگی، تنہائی، دھوپ، گرمی، شجر، سایہ..... آپ ہنستے ہیں، سامعین، تو مجھے بھی ہنسی آتی ہے...... غزل دراصل بولی جانے والی شاعری SPOKEN POETRY ہے۔ یہ RECITED POETRY ہے۔ جسے عہدِ حاضر کی برق رفتار زندگی کے ساتھ نہ چل سکنے کی وجہ سے راستے کے کسی میل پتھر سے باندھ کر پیچھے چھوڑ آنا چاہیے تھا۔ بروکس کے قول کے مطابق ایک علامت نگار کے لیے ترسیل کا مسئلہ قابلِ قدر مسئلہ نہیں ہے۔ غزل اور اس کی دو پابند سطریں! اس کے برعکس آزاد نظم اور نظمِ معرّا کو لیجیے۔ ان میں علامتی اظہار کی گنجائش اور امکان زیادہ ہے؟.... آپ دیکھیے ٹام! جب میں نے اپنی نظموں کے لیے ایک چھوٹی بحر کا انتخاب کیا۔ بحرِ خفیف، مسدس، مثلث مقصور [یعنی فاعلاتن مفاعلن فعلن] تو میں اس بحر میں لکھی گئی اردو تخلیقات کی نوعیت اور معیار سے واقف تھا۔ یہ تمام شعری کاوشیں غزلیں ہیں۔ ظاہر ہے یہ میرے لیے ایک چیلنج تھا اس بحر کے انتخاب کی وجوہ بھی واضح تھیں.....

گرے: ایکسلے کا نوٹ لیجیے۔ آپ نے کہا کہ اس بحر کے انتخاب کی کچھ وجوہ تھیں، تو وہ وجوہ کیا ہیں؟

آنند: مجھے تین بنیادی چیزیں درکار تھیں۔ پہلی یہ کہ بول چال کے صوتی آہنگ SPOKEN RHYTHM کے قریب ہو۔ اس میں اختصار اور تخفیف کا ترکیبی عمل ہو۔ بہ الفاظِ دیگر، مختصر ہونے کی وجہ سے اور معرّا استعمال ہو سکنے کی وجہ سے اس میں ترکیبوں کے والہانہ بہاؤ اور ان کے معنی کی رسائی دوسری، تیسری یا چوتھی سطر تک ممکن ہو۔ اور غزل کے مصرع کی طرح ہر سطر کے آخر پر رکنا نہ پڑے۔ میرے سامنے ہندی اور اردو کی کچھ مستعمل بحور تھیں۔ مثلاً بحرِ رمل، جس کا ہندی روپ ہے، ہری گیتی چھند۔ یا پھر بحرِ متدارک جسے ترجیحاً کہا جاتا ہے۔ یا بحرِ متقارب، جسے بھجنگ پریاگ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یا بحرِ سریع، جو سادہ چوپائی ہے۔ لیکن میں نے فاعلاتن مفاعلن فعلن کا انتخاب اس لیے کیا کہ مختصر ہونے کے باوجود تکنیکی اعتبار سے یہ مکمل اور بول چال کی زبان سے قریب ہے۔ اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں موضوع اور معنی کا بہاؤ بول چال کی طرح لگاتار بھی اور رک رک کر جاری رہتا ہے۔ "آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟" ایک مصرع ہے ایک لفظ آگے یا پیچھے کیے بغیر، لفظوں کا ایک منطقی سلسلہ ہے جو بالترتیب مصرعوں میں ڈھلتا چلا جاتا ہے، یہ ایک فطری وصف ہے۔ جو دیگر بحور میں بہت کم پایا جاتا ہے۔ صوتیات کا زیروبم، روانی، ٹھہراؤ۔ ان سب کا مجموعہ ہے یہ بحر۔ مثال کے طور پر فاعلا، مفاعلا، فع۔ ... را، تا یا کی متحرک آواز کے بعد۔ یعنی الف یا عین [جو برصغیر میں الف کی طرح ہی بولی جاتی ہے۔ عربی اور فارسی میں نہیں] کے بعد ہی آنا چاہیے۔ یہ ضروری بھی ہے۔ کیونکہ ASPIRATION OF BREATH سخت صوتیاتی معروض پر نہیں ہو سکتی۔ میں نے غزل کے مصرع کی صوتیات سے مفر بھی کیا ہے۔ اور اسے اپنایا بھی ہے۔ لیکن ہر بار STRESS اور INTONATION کے اصول و ضوابط کو بروئے کار لا کر، کہیں کہیں موقوف اور ساکن صوتیات کے بعد بھی بہاؤ FLOW جاری رہتا ہے۔ اور مجھے اس بات کا علم ہے کہ عروض دان نقاد اسے گرفت میں لے سکتے ہیں۔ لیکن اگر عصری عربی اور فارسی شاعری میں یہ تبدیلی قابلِ گرفت نہیں سمجھا

جاتا۔ تو اردو میں کیوں سمجھا جائے۔ جزر و مد خود میں کار آمد نہیں ہیں۔ لیکن جب ایک ہی جگہ دوسرا آئے تو ایک نہایت نادر قسم کا صوتیاتی آ
: آپ نے ابھی جزر و مد کا ذکر کیا۔ یا ایک دوسرے میں منتقل ہونے والا تو اس کی کوئی مثال؟

جی ہاں، شام! بہت ساری! لیکن پہلے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ دونوں EBB AND FLOW، بہاؤ کی صورتیں ہیں۔ EBB ساکن نہیں ہے۔ پیچھے کی طرف بہاؤ ہے۔ فارم کی اسلوبیات میں دونوں صرف ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ موضوع، مواد، موڈ اور فضا ان کے آگے یا پیچھے کی طرف بہاؤ کو تناؤ، تیزی یا گری بخشتے ہیں۔ یہاں میں اپنی دو نظموں "تحفہ" اور "کرچ" کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہوں گا۔ جہاں تک غیر یقینی فضا یعنی HAMLET کے ہونے یا نہ ہونے، کرنے یا نہ کرنے، کر سکنے یا نہ کر سکنے کی بے یقینی سے عبارت ذہنی فضا کا تعلق ہے۔ دونوں نظمیں ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں۔ نظم کے کرداروں میں خود یقینی کی کمی کا اظہار اسلوبیاتی پیرائے، تراکیب، لہجے، صوتیاتی آہنگ اور DENTAL SOUNDS صوتیات کے ASPIRATIONS کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ پہلے نظم "کرچ" کو لیں۔ پہلی سطر "تنی واپسی کی"، یہاں ایک سکتہ - PAUSE ہے۔ دوسری اور تیسری آئے، چوکھٹ پر ایک بار رکے، ٹھٹھکے، گھر کے کواڑوں کو دیکھا، ہر ایک سطر میں PAUSE سطر کے بیچ میں بھی ہے۔ اور آخر میں بھی، جو دونوں کرداروں کی ہچکچاہٹ کو اور عدم اعتمادی کو ظاہر کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ اور نظم کی فضا کی تخلیق میں تہہ داری کا اضافہ کرتا ہے۔ نظم کی ساتویں سطر: کانپ سا پیچ گیا، جھجکے، دیکھا، ساتویں سطر میں آپ دیکھیں گے کہ تین PAUSES ہیں۔ روانی اس کے بعد بھی جاری رہتی ہے۔ اور ارسطو کی اصطلاح RECOGNITION تک پہنچ کر یک دم ختم ہو جاتی ہے۔

لیکن میں نے ایک اصولی پیٹرن کو اپنایا ہے۔ پہلی چار سطروں میں ایک ایک VOWEL SOUND جو PAUSE آتا ہے۔ جو کے بعد "کی"، "سرخے"، "لئے"، "رکے"، "ٹھٹھکے" اور "دیکھا"، "تھا" کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایک غیر یقینی عالم کی تخلیق، ہچکچاہٹ کا ماحول ہیملٹ کی نفسیات کو نقش کیا ہے۔ آرٹسٹ کے برش کی کینوس پر لوٹتی، بکھرتی اپنے در پے، رنگوں کی جیسا کہ وہ ہیں۔ واضح غیر واضح بالترتیب، دھوئوں کی طرح پہلی سے ساتویں سطر تک SOUND - SOUND - PAUSE - SOUND - SOUND - SOUND - PAUSE کی گردان نظم کے آخر تک مدھم پڑتی ہوئی گم ہو جاتی ہے۔ نظم "تحفہ" ایک INTERIOR MONOLOGUE ہے اسی داخلی خود کلامی میں پہلی دو سطریں نظم کی فضا اور اس کے ماحول کو واضح کرتے ہوئے نظم کی خود کلامی کو آگے بڑھاتی ہیں: میں بھلا اس کو / جس کے پاس سبھی / کچھ ہے / کیا دوں / کہ میں خود نادار! پہلی سطر میں ایک PAUSE ہے۔ اور دوسری سطر میں دو۔ ان سے اور دوسری سطر میں سوالیہ نشان کے PAUSE سے نظم کے کردار کی داخلی خود کلامی کی فضا کی تخلیق ایسے ہی ہوتی ہے۔ جیسے ایلیٹ کی شہرہ آفاق نظم LOVE SONG OF ALFRED PRUFROCK کے مرکزی کردار کی داخلی خود کلامی میں غیر یقینی کی فضا کی تخلیق نظم کے ٹکڑوں میں PAUSE کی ترتیب سے ہوتی ہے۔

میری کسی نظم کا ارتقا بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ اور یہ ارتقا تب تک جاری رہتا ہے جب تک ڈرامے کی اصطلاح میں تسلیم RECOGNITION اور RESOLUTION کی کلاسیکی جدلیاتی طرز سے تصادم کی کیفیت اکائی میں معدوم نہیں ہو جاتی۔ اس نوع کی دیگر مثالیں ہیں۔ "سمپاسز"..... اس نظم کی ایک سطر میں چار PAUSES ہیں۔ "غلط فہمی" اور "دلہن" بھی اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔ اسی سلسلے میں سات نظمیں ایسی ہیں۔ جو ایک ہی سطر سے شروع ہوتی ہیں۔ "یاد ہے تم نے کیا کہا تھا مجھے"، ان نظموں میں جہاں تک مکالمے کے فارم کا تعلق ہے براؤننگ کا اثر اور عکس واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اور میری ان نظموں سے میرے اس دعوے کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ شاعری کی زبان کو بول چال کی زبان کے قریب بھی لایا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے کلاسیکی شعری ضوابط کو ترک کرنے کی ضرورت نہیں۔ خاص طور پر اردو میں تاریخی اور تہذیبی تبدیلیوں اور ہند و پاکستان میں دیگر لسانی ضرورتوں کے تحت اردو کی ادبی زبان عام آدمی سے دور ہو گئی ہے۔ یہ عام آدمی MAN IN THE STREET نہیں ہے۔ روزمرہ اردو بولنے والا آدمی فارسی کے الفاظ استعمال نہیں کرتا۔ وہ بہت کم ایسے لفظ استعمال کرتا ہے جیسے رات کے لیے 'شب'، یا درخت کے لیے 'شجر'، یا آدمی کے لیے 'بشر'۔ میں نے مانا کہ ایک خاص اسلوب کے لیے یہ الفاظ درکار ہوتے ہیں۔ لیکن اس بات کا کیا علاج ہے کہ ایک طرف تو اردو شاعری مشاعروں کی زبان ہے اور SPOKEN LANGUAGE کے کردار سے آگے بڑھ کر PRINTED یا WRITTEN WORD بھی بننے سے کترا رہی ہے۔ اور دوسری طرف 'رات' کے لئے 'شب'، 'درخت یا پیڑ' کے لئے 'شجر'، اور 'آدمی' کے لئے 'بشر' کا استعمال

خلوی مدنگ مجروت کرتی ہے .....

گ ے: تو کیا آپ نے یہ الفاظ استعمال نہیں کئے؟

آنند: کئے ہیں لیکن موقع اور محل دیکھ کر۔ مثال کے طور پر اس سطر میں 'شب' استعمال ہوا ہے۔ "شب کے سب خواب سونے سے پہلے" لیکن ایک دوسری نظم کی پہلی سطر کے دوسرے مصرعے میں بہاؤ کے وقت لفظ "رات" کا استعمال کیا گیا ہے۔ "جب پیادہ ممات کا پہلی / رات میری رہائی کے احکام" پہلی مثال میں خوابوں کے لوٹنے کا ذکر ہے۔ "ٹوٹ کر جب بکھر گئے تو نیند" چونکہ مختصر یک صوتی MONASYLLABIC لفظ میں معنی کو بنانے کی صلاحیت ہے۔ اس لئے لفظ 'شب' کا استعمال ناگزیر تھا۔ لیکن دوسری نظم کی مندرجہ بالا سطر کو بغور دیکھئے۔ یہ ایک عام منظر ہے۔ "گذشتہ" نسبت 'پہلی' نے 'رات' کے استعمال کو ناگزیر بنا دیا۔ میں یوں بھی کہہ سکتا تھا۔ "جب پیادہ ممات کا پہلی / شب کو میری رہائی کے احکام" لیکن زبان کے ساتھ زیادتی تو تھی ہی نظم کی فضا کو بھی مکدر کرنے میں بھی معاون ثابت ہوتی۔ میں پورے وثوق سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ ان الفاظ کا استعمال پہلے سے طے شدہ یا شعوری کاوش کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہ استعمال 'آورد' کے تحت نہیں کیا گیا۔ اس حقیقت کو جان لینا ضروری ہے۔

گ ے: شکریہ! ستیہ! اس اطلاع کے لئے۔ اس سے پیشتر کہ ہم انٹرویو کے اختتام تک پہنچیں اور بحث کا آغاز کریں میرے پاس دو سوال اور ہیں۔ کیا میں دو سوال ایک ساتھ پوچھ لوں کیوں کہ دونوں کا تعلق فیض سے ہے۔ یا آپ دونوں کے باہمی تعلقات سے ہے۔

آنند: ضرور پوچھئے! تام! مجھے آپ نشانۂ مشق بنا سکتے ہیں، لیکن للہ! فیض کے بارے میں سخت الفاظ استعمال مت کیجئے کہ اب وہ ہم میں نہیں ہیں۔

گ ے: ٹھیک فرمایا۔ میں احتیاط برتوں گا ..... پہلا سوال یہ ہے ... کیا ہم آپ کی نظم "ایک نادار ملک کا شاعر" میں کچھ علامتی معانی تلاش کرنے کی جسارت کریں۔ جیسا کہ آپ نے نظم کے ساتھ نوٹ میں کہا ہے یہ فیض کے ساتھ آپ کی ملاقات کا ایک دستاویزی ریکارڈ ہے۔ فیض ایک ایسا انقلاب پسند جو عمر کے آخری دور میں ٹوٹ کر بکھر گیا ..... دوسرا سوال تالیف پر مبنی ہے۔ آپ نے اپنی کتاب کے سرورق کا نام "دست برگ" کیوں تجویز کیا ہے۔ جیسا کہ سامعین جانتے ہیں۔ اس کتاب کو سینٹ کے فنڈ سے ہندوستان اور پاکستان میں شائع کیا جائیگا۔ کیا یہ ٹائٹل فیض کے 'دست صبا' کی تضمین کے طور پر چنا گیا ہے۔؟

آنند: پہلے میں آپکے اس سوال کو لوں گا۔ جو میری نظم کے بارے میں ہے۔ یہ نظم لندن میں اسی شام نہیں لکھی گئی جس شام فیض کے ساتھ میری طویل ملاقات ملٹن کینز میں برٹش اوپن یونیورسٹی میں اقامت پذیر تھا۔ اور فیض لندن میں تھے۔ جو بہت دور نہیں ہے۔ جب ان سے ٹیلیفون پر بات ہوئی تو انہوں نے تجویز کیا کہ میں آجاؤں اور شام ان کے ساتھ گذاروں۔ میں اپنی گاڑی سے گیا۔ ہم لگ بھگ تین گھنٹے بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ مجھے کہنے کی اجازت دیجئے کہ میں ان سے مل کر مایوس ہوا ...... وہ اپنی ذات میں گم تھے۔ اور جسمانی اور ذہنی طور پر شدید تھکان محسوس کر رہے تھے۔ میری نظموں کے بارے میں ان کی رائے اب بھی وہی تھی۔ جو پہلے تھی اور جس کا اظہار انہوں نے میری پنجابی غزلوں کی کتاب 'غزل غزل دریا' کے دیباچے میں کیا تھا۔ لیکن روس اور مشرقی یورپ کی اشتراکیت اور عالمی اشتراکیت کے بکھرے ہوئے خواب، پاکستان اور پاکستانی حکومت اور عوام کے تئیں ان کے غم و غصہ کا اظہار، ایک شکست خوردہ، ہزیمت زدہ ذہن کی عکاسی کرتا تھا۔ کچھ مصرعے بجنسہ ان کی زبان سے ایسے ادا ہوئے کہ مجھے انہیں شعری قالب میں ڈھالنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی مثلاً:

زندہ ناموں کے دن تمام ہوئے
کیسا سقراط؟ کون سا منصور؟
میں تو ادنیٰ سا ایک شاعر ہوں
ایک نادار ملک کا ہی سہی!

ہیرو بننے کی غرض و غایت سے
زندگی سے ہی ہاتھ دھو لینا
آج کے دور میں؟ نہیں، صاحب

اب رہا آپ کا دوسرا سوال۔ آپ نے تالیف LOVE - HATE RELATION-SHIP کا ذکر پہلے کیا ہے۔ اس لئے آپ خود ہی کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ میں نے "دست برگ" کیوں چنا۔ لیکن میں آپ کا دھیان اس طرف مبذول کرانا چاہوں گا کہ اس عنوان سے ایک نظم میرے مجموعے میں شامل ہے۔

گ ے: شکریہ، ستیہ!

آنند: شکریہ، تام!

افتخار امام صدیقی

غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ

ستیہ پال آنند کے نام اور کام سے میری واقفیت بہت سرسری تھی انہوں نے شاعر کے لئے اپنی چند منظومات ارسال کرتے ہوئے خط میں شاعر سے اپنی دیرینہ بستگی کا اظہار کیا۔ اس طرح تعلق کی تجدید ہوئی۔ یمنونگر (ڈن ہریانہ) کے ایک انڈو پاک مشاعرے میں ان سے ملاقات ہوئی اور ڈھیر سارے ادبی موضوعات پر خاصی گفتگو رہی۔ دوران ملاقات انہوں نے اپنے ایک انٹرویو کا ذکر کیا ساتھ ہی اردو غزل پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا۔ غزل سے ان کی بیزاری اور مغربی زبانوں کی شعری ادب میں اردو شاعری کی عدم شمولیت، غزل بطور فرسودہ صنف، اردو شاعری میں غزل کا غلبہ، مشاعرے، 'کلام' اور 'سخن' کا حصار سننے اور سنانے والی غزل، لکھی جانے والی غزل۔ اردو کی جدید نظمیہ شاعری کا غیر معیاری ہونا۔ ہندو پاک کے ادبی رسائل میں شائع ہونے والی غزلوں کا جائزہ اور مایوس کن نتائج وغیرہ نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور خیال گذرا کہ ان تمام امور کو شاعر کے ذریعے از سر نو بحث کا موضوع بنانا چاہیے کہ آزادی کے بعد ہماری اردو شاعری میں تجربے بھی ہوئے ہیں نئی برانے نام' سامنے آئے ہیں۔ ضخیم تنقیدی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ بڑے بڑے دعوے کئے گئے ہیں اور تخلیق و تنقید کا ایک بازار گرم رہا ہے۔ شاعری کی تنقید 'پسند' نا پسند کے زیر اثر فیصلے بھی صادر کئے ہیں۔ خیالی معیاری مفروضے بھی قائم کئے گئے۔ اور انتہا پسندانہ تحریریں بھی کتب و رسائل کا حصہ بنیں۔ میں اردو تنقید اور تنقید نگاروں کے بارے میں غور کرتا رہا ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ بیشتر تنقیدی تحریروں اور تنقید نگاروں کو 'رد' کئے جانے کے متعلق بھی سوچتا رہا ہوں۔ ستیہ پال آنند کی گفتگو اور ان کے انٹرویو' ان کی نظموں کے مجموعے 'دست برگ' کے افتتاحیہ اور گوپی چند نارنگ کے اختتامیہ نے تحریک دی کہ اس تمام لوازمے کو پوری اردو دنیا کے سامنے رکھا جائے اور دیکھا جائے کہ ہم کہاں ہیں۔

ستیہ پال آنند نے اپنے انٹرویو اور شعری مجموعے کے 'افتتاحیہ' میں جو سوال اٹھائے ہیں اور جو تجزیے پیش کئے ہیں، وہ سب اور نارنگ صاحب نے کتاب کے اختتامیہ میں غزل و نظم کی تخلیقی صورت حال کی سنگینی کا ذکر کیا ہے۔ اور جو سوال بنائے ہیں اپنی جگہ اہم ہیں اور ہمارے لئے لمحۂ فکریہ بھی تاہم آزادی کے بعد اردو شاعری کا جو 'چالیس سالہ منظرنامہ' بناہے اور اس کے جو مجموعی بنیادی مسائل ابھرتے ہیں اس کے ذمے دار ہمارے 'بڑے نقاد' بھی ہیں اس کی تمام وجوہ کو جاننے کے لئے میں نے اپنے طور پر سوچا اور دیکھا ہے اور اس کا اظہار ضروری سمجھا ہے۔ میرے مخاطب ستیہ پال آنند اور گوپی چند نارنگ ہی نہیں۔ اردو کے تمام ناقدین اور تخلیق کار بھی ہیں۔ غزل کے بارے میں یا آزادی کے بعد اردو شاعری کے بارے میں کوئی بھی انتہا پسندی مجھے قبول نہیں۔ جزوی اور فروعی مسائل زیر بحث آسکتے ہیں لیکن ان کے الجھاوے ذہنی اور گروہی تعصبات اور ان کے زائیدہ تنقیدی افکار سے مجھے سخت نفرت ہے۔ اور میں ان سب کا سدِّباب کرتا ہوں۔

جب آپ اردو شاعری پر تنقید کرتے ہوئے چند ناموں کی گردان ہی کو معیار مان کر گفتگو کریں گے تو سطے ہے آپ جو کچھ سوچ رہے ہیں اسے جو ثابت کرنا چاہتے ہیں اس میں نہ صرف یہ کہ آپ کو مایوسی ہوگی بلکہ آپ کامیاب بھی رہیں گے۔ غزل کی پوری روایت سے اچھی اور بڑی شاعری کا انتخاب کیا ہی نہیں گیا۔ صرف ناموں کے حصار میں سوال و جواب مکالمہ کرتے رہے۔ پھر یہ کہ اردو شاعری صرف صدیوں پر محیط غزل ہی نہیں۔ بلکہ مثنوی، مرثیہ، رباعی، قصیدہ، شہر آشوب اور عالم آشوب یعنی نظم کی پیرا اصناف بہ لحاظ موضوع اور بہ لحاظ ہیئت میں بھی بڑی شاعری موجود ہے۔

اردو شاعری عالمی عصری شاعری کے ساتھ رکھی جا سکتی ہے یا نہیں اس سوال سے پہلے کچھ سوال اور بھی ہیں۔ ایک بنیادی سوال یہ بھی ہے کہ شاعری کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ سوال اپنے تمام تر اظہارات کے باوجود سوال بنا ہوا ہے۔ کیا اردو غزل کو دنیا کی بڑی زبانوں کی شاعری کے مقابل اپنے کسی نمایاں

انتخاب کے ساتھ رکھا گیا؟ کیا تخلیقی شاعری کا ترجمہ ممکن ہے؟ وہ چاہے دنیا کی کسی بھی زبان کی شاعری ہو۔ کیا طویل و مختصر نظموں کے مقابلے میں غزل
کا ایک شعر اپنے آپ میں پوری کائنات کو سمو لینے کی صلاحیت نہیں رکھتا؟ کوئی بھی صنف یا ہیئت ناکام نہیں ہوتی یہ تو اس کے برتنے والوں کا عجز،
کہ وہ اس پر قابو نہیں پا سکے یا پا سکتے ——— شاعری میں فکر ہی سب کچھ نہیں ورنہ تو عظیم انسانوں کے عظیم مقولے بھی شاعری ہیں۔ پیغمبروں کے ربانی
کلمات بھی شاعری ہیں آسمانی صحیفے بھی شاعری ہیں۔ شاعری جذبے اور واردات کی شدت کا اظہار ممکن نہیں اور یہ شدت دنیا کے کسی بھی زبان کے حرف و لفظ میں تخلیقیہ
سطح پر ابھرے گی وہ دوسری زبانوں میں تو کیا خود اسی کی اپنی زبان کے رسم خط میں بھی منتقل نہیں ہو سکے گی؟ میں یہ بات تخلیقی شاعری کے بارے میں
کہہ رہا ہوں۔ اکہری فکر کو تو آپ دنیا کی جس زبان میں چاہیں منتقل کر دیں۔ لیکن ہر زبان کے اپنے استعاروں اور علامتوں کی روح کو آپ کس طرح
منتقل کریں گے۔ انسانی جسم کی نقل تو روبوٹ وغیرہ سے کر لی گئی لیکن انسان کے اندر کی جو روح ہے ناقابلِ تبدیل و ناقابلِ تسخیر اس کو آپ کیا
کریں گے؟

شاعری کا تصور ہیئتوں ہی سے ممکن ہے۔ تخلیقی ترتیب کسی فارم ہی میں ابھرتی ہے۔ ہر فارم کی اپنی مخصوص موسیقی ہوتی ہے۔
غزل، جن لوگوں کے مزاج کا حصہ نہیں بن سکی ان کی تائید میں غزل کو مردود قرار دینا تو عقل مندی نہیں۔ جن لوگوں تک غزل نہیں پہنچی یا غز
لی جتنی بھی شاعری ان تک پہنچی ہے تو غزل صرف اتنی ہی نہیں کچھ اور بھی ہے۔ مغرب میں غزل کی شاعری سرایت کر جائے تو شاید اس نوع کے سوال
ہی نہ ابھریں۔ پھر یہ کہ جدید سائنس اور ٹکنالوجی کے اس عہد میں جب کہ پوری کائنات کو تسخیر کیا جا رہا ہے۔ اور ایک لمحہ اب لمحہ نہیں رہا بلکہ اپنی پوری تعریف کے ساتھ لمحوں میں تبدیل
ہو کر اور بھی سکڑ گیا ہے۔ اس میں طویل نظموں کا گزر نہیں۔ غزل کا ایک شعر بیسوی صدی ہی میں نہیں بلکہ اکیسویں صدی کی بھی ضرورت بن سکتا ہے۔
میں جن اصناف کی موت ہو چکی ہے وہ اپنے قبیلے کی دیگر اصناف ہی کی طرح تھکیں۔ اور بے ضرورت چیزیں تو اپنی فطری موت مر ہی جاتی ہیں۔ سوال یہ
ہے کہ آپ کتابی باتیں کر رہے ہیں یا کہ عمل؟ شاعری بصری ہی نہیں بلکہ سماعی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ شاعری کا مقصد کیا ہے؟
مخالفین اردو غزل نے اردو کی پوری غزلیہ شاعری کا مطالعہ کیا ہے کہ نہیں؟ رسائل میں:
غزلیں شائع ہو رہی ہیں اس کے معیاری، کم معیاری عام معیاری ہونے سے صنفِ غزل کب معتوب ٹھہرتی ہے؟ نئے شعرا کی تربیت ہی کب اس طرح
ہوتی ہے کہ وہ اچھی غزلیں تخلیق کر سکیں۔ شاعری اب بطور فیشن کی جا رہی ہے اور موزونیت عمومی اور میکانیکی ہو گئی ہے۔ پھر یہ کہ وسائل کی فراوانی ہے
; رمشہ: ——— علوم، سرکاری و نیم سرکاری اداروں کے ذریعے تیزی کے ساتھ کتابوں میں منتقل ہو رہا ہے۔ اس میں لیکن غزل کا کیا قصور؟ ———
——— جو شعرا معتبر ٹھہرتے ہیں ان کے یہاں فارسی، عربی، انگریزی اور علاقائی شاعری کا غیر معمولی مطالعہ شامل رہا ہے۔ مگر یہ
یہ بھی ہے کہ رسائل میں شائع ہونے والی شاعری میں محض رومانی شاعری تو نہیں؟ پاکستانی رسائل اور ہندوستانی ادبی رسائل میں شائع ہونے والی شاعری میں
واضح فرق ہے۔ پاکستانی رسائل کا شعری ادب علاقوں میں بٹا ہوا ہے کہ کراچی اور لاہور کے ادبی رسائل سے مثالیں لی جا سکتی ہیں۔
شاعری کی کوئی متعین تعریف ہو ہی نہیں سکتی۔ تو پھر انتہا پسندی کیوں اور جب کسی بھی زبان کی شاعری کا ترجمہ ہو نہیں سکتا۔ تو پھر اپنے مزاج سے میل
رکھنے والی اصناف کو برا بھلا کیوں کہا جائے؟
سوال یہ بھی ہے کہ خود اردو ناقدین نے اردو غزل کو عالمی عصری شاعری کے مقابلے میں کیوں نہیں رکھا۔ صرف نظموں کے تراجم ہی کیوں پیش کیے جا
رہے ہیں؟ مغرب میں جو مروجہ اصناف ہیں وہ مشرق میں کیا اتنی مقبول ہیں؟ اگر نہیں تو اس دور میں مغربی اصناف بہت زیادہ مقبول کیوں نہیں ہوئیں؟
اردو غزل کو تو دوسرے رخ سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ غزل کا یا کسی شعر کا ترجمہ کرنے سے اگر صرف خیال ہی کو گرفت میں لے کر اس شعر یا پھر
اردو غزل کی گردن زدنی کر دی جائے تو اسے عقل تسلیم نہیں کرتی۔ لفظوں کی تخلیقی ترتیب ہی سے شاعری بنتی ہے، خیال ابھرتا ہے۔ غزل کا ایک شعر ایجاز
کا شاہکار ہوتا ہے جو شاعری کی ضرورت ہے۔ محسوسات کو سمو دینے کا عمل شاعری ہے۔ شاعری کا نام اور شاعری کا عنوان دو الگ چیزیں ہیں۔ اکتسابی اور
آزاد اور آزاد یا نثری نظمیں شاعری تو ہو سکتی ہیں کہ اچھی نثر لکھنا کسی اچھے شعر کی تخلیق سے کم نہیں۔ شاعری کی طرح نثر بھی حشو و زوائد سے پاک ہونی چاہیے
غزل کے ایک شعر کی طرح۔ یہاں آزادی میں بھی پابندیاں ہیں۔ غزل میں پابندیوں سے آزادی ابھرتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ جذبات کا بہاؤ اپنی پوری
کو لفظوں میں سمو دینے کے لیے ایک لمحے کا بھی انتظار گوارا نہیں کرتا کہ خیال سے اس کی روح نکل جانے کے بعد صرف خیال اور لفظ بچ جاتے ہیں۔ غز

، ردیف اور قافیہ وصد بندیاں ہیں جو کسی بھی شدت کو فوری طور پر سمو لینے میں حارج ہو سکتی ہیں لیکن اگر مسلسل ریاضت میسر آجائے اور شاعری کا علم مل جائے تو کچھ بھی مشکل نہیں۔ تخلیقی عمل ۲ + ۲ یا ۲+۵ کا عمل نہیں ہے یہ نامعلوم سے معلوم کی طرف ایسا سفر ہے جو قطعی ذاتی اور انفرادی نوعیت کا ہوتا ہے۔ ب کچھ جانتے ہوئے بھی، معلوم ہوتے ہوئے بھی مختلف اور نیا۔ غزل تو ہر پل نیا چاہتی ہے۔ نئے خیال، نئے الفاظ، نئی تراکیب، نئی علامتیں، نئے ںارے۔ اگر کسی غزل کار کے یہاں یہ سب کچھ نہیں تو صنفِ غزل اپنی تمام تر تحریفوں کے باوجود فرسودہ معلوم ہوگی۔ غزل فرسودگی کی قائل نہیں۔ آج اردو ں میں زبان اردو ہی کی طرح ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں کے نئے الفاظ، نئے محاورے، نئی تراکیب وغیرہ شامل ہو گئے ہیں۔ گجراتی، مراٹھی، ھی، ہندی، بنگالی، پنجابی، کشمیری، کنڑ، تیلگو وغیرہ زبانوں میں غزل تخلیق کی جا رہی ہے۔ ایران میں صنفِ غزل کا خاتم غزل کے اسی مزاج کے سبب ہوا کہ ںفِ کلاسیکی یا جدید فارسی کے ذریعے غزل زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ فارسی میں تصرّف کا عمل ہوا ہے۔ اور عربی سے اس کا خزانہ مملو مخلوط اور غیر مخلوط زبانوں ، بھی یہ عمل ہوا ہے تاہم اردو تصرّفات کا عمل دنیا کی تمام زبانوں سے کہیں زیادہ، تیز اور مسلسل رہا ہے کہ اس عاریت مزاج زبان میں حیرت انگیز تصرفی قوت بنی ہے۔ اور غزل بھی یہی چاہتی ہے۔

شاعری تو معجزہ چاہتی ہے اور غزل بالخصوص۔ کلیدی الفاظ، محاورے۔ استعارے اور علامتیں جب فرسودہ ہونے لگتی ہیں تو غزل اکہری ہو جاتی ہے۔ انکے بے پناہ ذخیرۂ الفاظ اور رچی بسی موزونیت میں اگر تخلیقی جوہر نہ ہو تب بھی شاعری نہیں بنتی۔ غزل تو ہر طرح سے اپنے غزل کار کا امتحان لیتی ہے۔

مجھے تسلیم ہے کہ گذشتہ چالیس برسوں میں اردو شاعری ایک ایسے پڑاؤ پر آکر رک گئی ہے جہاں صنفِ غزل کی فرصت مند بہتات اور یکنفسی مضمون میں رنگی اور اسلوب بیان میں یک آہنگی نے اسے لاکھڑا کیا ہے۔"

ایک سو بارہ ممتاز و مشہور شعرا کے پانچ ہزار منتخب اشعار پر بھی بحث ہو سکتی ہے کہ ممکن ہے یہ پورا انتخاب ہی ناقص ہو یا انہیں ممتاز و مشہور شعرا کہا گیا ہے ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۷ء تک اپنی شاعری میں اتنے تازہ کار رہے ہوں۔ میرے خیال میں رسائل سے زیادہ شعری مجموعوں پر انحصار کرنا چاہیے تھا کہ چند ایک ں یا اشعار کسی شاعر کی نمائندگی نہیں کر سکتے۔ یا کوئی معیاری انتخاب نہیں بن سکتے۔

ن م راشد اور میراجی کو جدید شاعری کا امام تسلیم کرنا ان کے مدرسۂ اسلوب کی تقلید یا تتبع پر زور دینا یا انہیں کو عصری عالمی شاعری کے معیار مطابق تصور کرنا مگر ہی کے سوا کچھ اور نہیں کہ ان شعرا نے غزل کے خلاف ایک طرح سے تمام پابندیوں کو رد کیا تھا۔ آزاد و معرّا نظموں میں جس طرح کے ۔ کو شاعری بنانے کی کوشش کی تھی۔ وہ شاعری تھی یا نہیں۔ یہ بھی ایک سوال ہے۔ اردو نظم میں ہیئت کے بہت سے تجربے کئے گئے ہیں موضوع ادکے بھی بہت سارے تجربے کئے گئے ہیں۔ بیسویں صدی کے نصف اوّل کے ادبی رسائل و جرائد میں متعدد نام ایسے مل جائیں گے جنہوں نے شاعری میں ہر سطح پر تجربے کئے۔ پابند نظمیہ شاعری میں بڑی شاعری بھی ہوئی ہے۔ ن۔ م راشد کی نظمیں گاڑھی بلکہ بیشتر بوجھل فکر سے مملو دماغ ہی دماغ ۔ یہ نظمیں بہت کم 'دل' بن پائی ہیں۔ ہماری 'جمالیات' کا حصہ نہیں بن پائیں۔ پھر یہ شاعری عوام تو دور کی بات ہے خواص کا حصہ بھی نہیں بنتی۔ یہ ری QUATEABLE بھی نہیں جس طرح میر، غالب، اقبال اور سیماب وغیرہ کی غزلوں اور نظموں کے بعض اشعار، مصرعے یا نظموں بند اور مصرعے عوام و خواص میں گردش کرتے ہوئے ضرب المثل بن گئے ہیں۔ یا بعض کم معروف اور گمنام شعرا کے اشعار اور مصرعے ضرب المثل بن گئے

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر کی جانے والی شاعری اور شعرا نے مجموعی طور پر اردو شاعری کو نقصان تو پہنچایا ہی مگر کچھ دیا بھی تاہم آج وہ شعرا اور ان کی ری کہاں ہے صرف ن م راشد یا میراجی کیوں، کتنے ہی نام لے جا سکتے ہیں۔ جنہوں نے ترقی پسند تحریک سے ہٹ کر شاعری کی، شاعری میں تجربے کئے۔ ل یہ بھی ہے کہ انہیں دو شعرا کی شاعری کو معیار کیوں بنایا جائے؟ ممکن ہے کہ ان کی شاعری اپنے ابتدائی دور میں بھی غیر دلچسپ اور نا شاعری رہی ہو؟ کیا اعری اس لئے قابلِ قبول تھی یا ہو سکتی تھی کہ اس کا ترجمہ ممکن تھا؟ کیا اس شاعری میں استعاروں اور علامتوں سے زیادہ پیکروں کی تجسیم کاری ہوئی ہے؟ ںد اور میراجی کے معتقدین کے لکھنے بولنے یا ماننے سے یہ شاعری، شاعری نہیں کہلائے گی۔ کتب و رسائل میں محفوظ شاعری کتابوں کتابوں کا سفر تو کر لیتی ہے اور یا نا بھی بناتی ہے لیکن عوام کا حصہ نہیں بن پاتی تو کیا شاعری پڑھنے سے زیادہ سننے کی چیز ہے؟ کہتے ہیں فن پارہ کاغذ ہی پر بولتا ہے کہ وہ کیا ہے مگر اب رنا سے درمیان سے ہٹ رہا ہے پہلے آڈیو نے اور اب ویڈیو نے اس کی جگہ لے لی ہے۔

اردو شاعری کو سب سے زیادہ نقصان اردو کے نقادوں ہی نے پہنچایا ہے۔ اور تخلیق کاروں کو بلکہ ادب کے قارئین کو بھی گمراہ کیا ہے۔ شروع ہی سے حاوی ہونے والے نقادوں نے اپنے معیارات تھوپنے کی مسلسل کوششوں میں ہمیشہ یہ باور کرانے کی سعی کی کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہی درست ہے باقی سب غلط" اپنی پسند" اور "حلقہ بند" ناقدین نے سچ لکھنے اور بولنے کی کم سے کم کوششیں کی ہیں۔ ہر تنقیدی تحریر یا کتاب کے پس پشت کوئی نہ کوئی کہانی موجود ہے۔ یا غزل کی تنقید حسن و عشق کی سطح ہی پر اپنے گراف بناتی رہی ہے۔ تو پھر عالمی عصری شاعری کے معیار پر غزل کہاں ٹھہرے گی!

ہماری شعری روایت غزل کی روایت ہے اور ہمیں اس پر فخر ہے مگر ناقدین نے اس روایت کی کسی اعلیٰ تنقید کو تحریر نہیں کیا کہ اسے عالمی عصری شاعری کی تنقیدی تحریروں کے ساتھ رکھا جائے۔ مغربی نقادوں سے استفادہ تو بہت اچھی بات ہے لیکن ان تنقیدی تحریروں کے تناظر میں اپنی شاعری کو پرکھنا اور معیارات بنانا اور اسی پر اکتفا کرنا دانش مندی نہیں اور وہ بھی اردو غزل کے لئے۔ غزل کی شاعری سے یا ہماری شعری روایت سے عالمی سطح کی تنقید کیوں نہیں ابھر سکتی ہندوستانی زبانوں کی شاعری اور اس کی تنقیدوں میں ہمارا ذکر کہاں ہے۔؟ اردو نظم کو بھی مغربی شاعری کی تنقیدوں کے زیر اثر دیکھا گیا۔ اور نظم کے اندر صرف خیال کو اہمیت دی گئی۔ شاعری کی بات کرنے والوں نے نظم کے خارجی اسٹرکچر کی طرف کم سے کم توجہ کی۔ پابند نظمیہ شاعری سے آزاد و معریٰ شاعری تک صرف چند نام شاید تین، چار ناموں ہی کو مقام سمجھا گیا۔ اور تنقیدی تحریروں میں ان کی شاعری کی زیادہ تر شرح لکھی گئی۔ اور پوری اردو شاعری کو نظم گو شعرا کے ذکر اور حوالے ہی سے پیش کیا گیا، مضامین لکھے گئے عوامی سطح پر غزل نے اردو شاعری کی روایت کو مستحکم کیا اور کتب و رسائل میں اردو نظم کی وکالت کی گئی۔ غالب کی شاعری کو اردو غزل کی معراج سمجھا گیا۔ اور غزل کو غالب کے نام کے ساتھ تنقیدی طاقوں میں سجائے جانے کا عمل جاری رہا۔ ایک صنفِ سخن جو عالمی شعری اصناف میں شامل ہوتے ہوتے رہ گئی۔ مجھے تسلیم نہیں کہ غزل غیر ملکی زبانوں میں نہیں کہی گئی غزل کی جو بھی تعریف ہے اس کے مطابق نہیں کہ ردیف اور قوافی کا التزام نہ رکھا گیا ہو تاہم صوتی آہنگ کے تحت غزل کو دریافت کیا جا سکتا ہے کیا اردو میں غیر مردف غزلیں موجود نہیں۔ انگریزی، فرانسیسی، یا لاطینی زبانوں کی شاعری میں صوتی آہنگ کے ساتھ قوافی لائے جا سکتے ہیں۔ دو موزوں و مقفیٰ مصرعوں کا مجموعہ COUPLET موجود ہے یا TRIPLET بھی موجود ہے۔ جیسے ہمارے یہاں مثلث، تثلیث یا ثلاثی ہے یا STANZA بمعنی ABODE جو عربی شعری ہیئت "بیت" کے مترادف ہے۔ اور دونوں ہم معنی ہیں۔ اسٹینزا کی دوسری شکل تو ہے ہی [غزل کا ایک مطلع یا ایک شعر] بلکہ معقول شکل ہے۔ QUATRAIN کے بارے میں آپ کیا کہیں گے کہ یہ رباعی کی تقلید کے طور پر ہے۔ اس طرح اردو فارسی شاعری اور انگریزی شاعری کا صنفی موازنہ انگریزی اور دنیا کی دیگر بڑی زبانوں میں غزل کے امکانات کو زیادہ روشن کر سکتا ہے۔ غزل کا ایک شعر یا پوری غزل ایک مسلسل موڈ کے طور پر کسی مسلسل نظم کے ساتھ رکھی جا سکتی ہے۔ اور ایک اچھی غزل باوجود اختلافِ مضمون کے ایک پوری فضا بھی بناتی ہے ایک وحدتِ تاثر کے طور پر۔ اردو میں مسلسل غزلیں بھی تخلیق کی گئی ہیں جن میں خیال اور احساس کی جمالیاتی تدوین ممکن ہو سکی ہے۔ بلکہ وحدتِ تاثر والی غزلوں میں یہ جمالیاتی حسن موجود ہے۔ اور ایسی ہی غزلوں کا انتخاب ہونا چاہیئے۔ ایک معیاری انتخاب ناقدین نے کیا کیا؟ صرف چند شعرا، غالب، اقبال، ن م راشد اور فیض وغیرہ کے شعری انتخاب ہی کو عالمی شعری منظر ناموں میں رکھا مگر پوری اردو غزل کا تعارف پیش نہیں کیا۔ غزل سے قریب ترین اصناف کے ساتھ صنفِ غزل کو پیش نہیں کیا۔

ہندوستانی زبانوں میں جو غزل تخلیق کی جا رہی ہے تو اس کی وجہ ہمارے نقاد ہرگز نہیں ہیں یہ تو غزل کا جادو ہے۔ غزل کا ایجاز و اختصار ہے۔ اس کی خوب صورتی اور خوب سیرتی دونوں ہی نے دیگر زبانوں کے شعرا کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے، تو ایسا کیوں ہے ؟ —

- ○ اردو غزل کے ناقدین کو اپنی تنقیدی تحریروں کا احتساب کرنا پڑے گا۔
- ○ اردو غزل کاروں کو اپنی شاعری کا محاسبہ کرنا ہو گا۔
- ○ اب اردو غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ ناگزیر ہے۔

ستیہ پال آنند کی نظموں کو میں نے "ردِ غزل" کے طور پر نہیں دیکھا کہ غزل کا رد تو خود غزل ہی ہو سکتی ہے۔ آزاد نظمیں یا نظم کی کوئی اور صنف یا ہیئت نہیں ہو سکتی۔ آنند کی نظموں کو میں نے انفرادی فن پاروں کے بطور دیکھا ہے۔ اور کئی سطحوں پر یہ نظمیں اپنی طرف متوجہ

آنند نے لفظوں سے تصویر سازی کی ہے۔ وہ فوٹوگرافر بھی ہیں اور مصور بھی۔ ان کے پیکر متحرک اور غیر متحرک دونوں صورتوں میں قاری اور سامع کو اس کی شخصیت میں اترنے اور دور بہت دور نکال لے جانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ جن حساس منظروں کو شاعر نے اپنی نظموں میں خلق کیا ہے اس کی بازآفرینی کا عمل سامع اور قاری پر اس کے اپنے تجربات و مشاہدات نہ ہوتے ہوئے بھی اس کے اپنے معلوم ہوتے ہیں۔ منظروں کی تجسیم ادھوری نہیں۔ یہ نظمیں نہیں منظوم تخلیقی کہانیاں ہیں، خوب صورت منظر نامے ہیں۔

مذکورہ نظمیں جس شعری لسانی ڈھانچے کو پیش کرتی ہیں۔ ان سے اختلاف ممکن ہے کیوں کہ وہ الفاظ جو لغوی معنوں میں اپنی سطح بدلتے ہیں اور پیکروں کی تشکیل میں معاون ہوتے ہیں، وہ کئی جگہ عادتِ ذہنی کو رد کرتے ہیں یا اس سے الجھتے بھی ہیں یا یہ کہ مذکورہ نظمیں ایک ہی بحر میں تخلیق نہ ہوتے ہوئے ہر نظم ایک آزادانہ شعری آہنگ کو خلق کرتی یا یہ نظمیں ارکان کی پابند ہوتے ہوئے بھی سطر بہ سطر لکھی جا سکتی تھیں۔ ان سے نہ تو منظر نامے متاثر ہوتے اور نہ ہی جمال۔

کوئی بھی فن پارہ، جو اپنے آپ میں تخلیقی جسامت رکھتا ہے، وہ متوجہ بھی کرتا ہے کہ ہیئت، اسلوب اور موضوعات کا تنوع بطور اکائی پرکشش ہوتا ہی ہے۔ آنند کی نظمیں اس لحاظ سے پرکشش ہیں کہ وہ اپنی تخلیقی جسامت رکھتی ہیں۔ ان میں نیا پن ہے۔ یہ نظمیں مکالمہ کرنے کی کوشش بھی کرتی ہیں۔ قاری اور سامع کو ہر سمت سے گھیرنے کی ان میں حرارت ہے۔

آنند کی نظمیں زیادہ تر تخلیقی بیانیہ ہیں تو کیا یہ مختلف بیانیہ ہے؟۔ کسی فلسفے سے گریز زندگی کو اس کی سچائیوں کے ساتھ پیش کرنے کا تخلیقی شعور ہے؟ پرانے لفظوں کو نئے زاویے عطا کرنا، لفظوں میں ایک نئی نحوی ترتیب۔ ایک دنیا کا ادراک اور اپنی ذات کا اظہار ہے۔ ان تمام نظموں کے لوادے میں دیومالائی، تاریخی اور لوک کہانیوں پر مبنی کرداروں یا واقعات کی نشاندہی اور تشریح سے ان کی معنویت میں مزید اضافہ ہوتا ہے اور آنند نے شعوری طور پر اپنی نظموں میں جو التزامات رکھے ہیں ان سے بحث کی بہرحال گنجائش ہے تاہم یہ تمام نظمیں اردو کی جدید نظمیہ شاعری کو ایک نیا شعری وجدان دے سکتی ہیں۔ ❋



خلش بڑودوی

لوگوں کو سیدھی راہ دکھانے لگے تھے ہم
بنجر زمیں پہ پیڑ اگانے لگے تھے ہم

ہر آن اپنی شان دکھانے لگے تھے ہم
اپنے پڑوسیوں کو ستانے لگے تھے ہم

کیا جانے کس نے پاؤں ہمارے پکڑ لیے
اس زندگی سے بھاگ کے جانے لگے تھے ہم

اچھا ہوا کہ فرض ہوا خواہشوں کا قتل
سر کس لیے کسی کے قدم پہ جھکانے لگے تھے ہم

پھر اک نئی ہوا نے جنوں سر میں بھر دیا
قابو کچھ اپنے آپ پہ پانے لگے تھے ہم

اک دن ہماری پیٹھ میں خنجر اتر گیا
ہر شخص کو گلے سے لگانے لگے تھے ہم

یہ جانتے ہوئے بھی کہ اک بے وفا ہے یہ
دنیا سے رسم و راہ بڑھانے لگے تھے ہم

کانٹا تو انگلیوں میں چبھا ہوش آ گیا
پھولوں کی سمت ہاتھ بڑھانے لگے تھے ہم

بیٹھے ہیں اپنے گھر میں خلش پاؤں توڑ کر
ہر اک کا بوجھ سر پہ اٹھانے لگے تھے ہم

خوابوں کے سب محل گرانے والا تھا
میں ان کی بنیاد ہلانے والا تھا

پھول وہ سب جو اس موسم میں کھل نہ سکے
ان کی اک تصویر بنانے والا تھا

سارے لوگ سفر کے نام سے ڈرتے تھے
کوئی میرے ساتھ نہ آنے والا تھا

کس کو تھا معلوم محبت کا اک پل
ساری ساری رات رلانے والا تھا

میں بھی تھا کردار کسی افسانے کا
اس کا بھی انداز زمانے والا تھا

پھیل رہی تھی تاریکی ہر اک گھر میں
کون کسی کا دیا جلانے والا تھا

ہر ساعت تھی عمر گھٹانے والی تھی
جو لمحہ تھا ہاتھ سے جانے والا تھا

جو بھی ہو سکتا تھا ہم سے کر بیٹھے
وقت کہاں پھر لوٹ کے آنے والا تھا

بچ گئے تم دنیا سے خلش جانے کیلئے
اس کا تو ہر رنگ لبھانے والا تھا

حوصلہ دے دے کے اونچا میرا سر اس نے
ظلم کے آگے مجھے سینہ سپر اس نے کر
پیارے سب دشمنوں کے دل میں گھر اس نے
دوستی کا معرکہ اس طرح سر اس نے
جن کو جینے کا سلیقہ تھا نہ جینے کا شعور
بند ان لوگوں پہ میخانے کا در اس نے
پہلے تو دیوار اٹھائی شہر کے چاروں طرف
پھر اسی دیوار میں اک روزن در اس نے
پہلے اپنا غم تھا پھر اس کا تھا اب دنیا
دھیرے دھیرے ایک پودے کو شجر اس نے
میں محبت کی حقیقت سے کبھی واقف نہ
مجھ سے اک پتھر کے ٹکڑے کو گہر اس نے
کون سی شے تھی جو اس دھرتی کے دامن میں
پھر نہ جانے کیوں خلاؤں کا سفر اس نے
جو خلش واقف نہ تھے شعر و سخن کے نام
عام ان لوگوں پہ غالب کا ہنر اس نے

اب اپنی نظر میں ست کوئی رہ گذر رکھ
لوٹے ہوئے پیروں سے نہ امید سفر رکھ
ہر لحظہ بدلتی ہوئی دنیا کی خبر رکھ
جینا ہے تو حالات کے محور پہ نظر رکھ

بیتے ہوئے دن ہو گئے یادوں کے حوالے
اب اپنی نگاہوں میں نئے شام و سحر رکھ

شاید تجھے پڑ جائے کبھی میری ضرورت
دل کے کسی گوشے میں مری یاد مگر رکھ

قاتل ہے تو آ شہر کی سنت کو ادا کر
نیزے کی انی پر کسی مظلوم کا سر رکھ

لوگوں کے لئے پیار کے دو بول بہت ہیں
پہلو میں نہ تلوار نہ شانے پہ سپر رکھ

ہر گام پہ اک تازہ مصیبت ہے خلش اب
پہلے ہی کہا تھا تجھے دنیا کا نہ ڈر رکھ

بانے دربار کا کس طرح یہ منظر دیکھوں!
اپنے غالب کو میں اک شاہ کا نوکر دیکھوں
اس طلسمات کے منظر کو پلٹ کر دیکھوں
کیسے بنتا ہوں میں انسان سے پتھر دیکھوں

دل میں دنیا کی ہوس پاؤں میں چکر دیکھوں
آج کے دور کے انسان کا مقدر دیکھوں

ایسے عالم میں بھلا کیا کوئی منظر دیکھوں
کوئی تلوار لٹکتی ہوئی سر پر دیکھوں

جو مرے ساتھ ہیں وہ کون ہیں دشمن ہیں کہ دوست
ان کے چہروں سے نقابیں تو الٹ کر دیکھوں

تیری آواز کے پیکر سے لپٹ جاؤں کبھی
تیری خوشبو کو کبھی ہاتھ لگا کر دیکھوں

جو کبھی پیش کیا کرتا تھا چاہت کے گلاب
کونسی آنکھ سے اس ہاتھ میں پتھر دیکھوں

عیب بھی دیکھے خلش سب کے ہنر بھی دیکھے
اپنی جانب بھی کبھی آنکھ اٹھا کر دیکھوں

نہ خط لکھے نہ دئے ان کو تار اب کے برس
گذر گئی یونہی ساری بہار اب کے برس
نہ سوئے رات کو جا کر کھلی ہوئی چھت پر
گنے نہ ہم نے ستارے شمار اب کے برس
گذشتہ سال بھی دل بے قرار تھا لیکن
عجیب طرح کی الجھن ہے یار اب کے برس

کبھی بھی لب پہ تبسم کے گل نہیں چمکے
کسی بھی آنکھ سے چھلکا نہ پیار اب کے برس

یہ رنگ کیوں نہیں جچتے مری نگاہوں میں
یہ پھول کیوں مجھے لگتے ہیں خار اب کے برس

نہ جانے کس طرح لوگوں کے دن گذرتے ہیں
کسی کے رخ پہ نہیں ہے نکھار اب کے برس

بہا ہے خون مرا جا بجا فسادوں میں
ہوا ہے قتل مرا بار بار اب کے برس

کرو گے کیسے خلش اپنی بے کلی کا علاج
شراب میں بھی نہیں ہے خمار اب کے برس

سوچوں کے ہاتھوں کا گہنا ٹوٹے
لفظوں سے لفظوں کا رشتہ ٹوٹے
وقت نے نیندیں چھین لیں میری
تو تھا جس کی جان وہ سپنا ٹوٹے
اس نے بس اک پھول چمن میں توڑ
میرے اندر جانے کیا کیا ٹوٹ گیا
اب کے گاؤں میں جانا چاہا تھا
ایسی ہوئی برسات کہ رستہ ٹوٹے
وقت سے ہو بالیں آسماں کا ٹوٹے
اس کوشش میں ہاتھ ہمارا ٹوٹے
میں جس میں دریا کو سموئے رکھتا
میری فکروں کا وہ کوزہ ٹوٹے
پھر اک بچے کی محنت بیکار
پھر ساحل پہ ایک گھروندہ ٹوٹے
ہم خود اس سے ترک تعلق کرتے
مجھ سے چاہا ہر اک وعدہ ٹوٹے
کیا بتلاؤں کون سا تھا بازار خلش
جس میں میرے دل کا جھمکا ٹوٹے

یعقوت پورہ بڑودہ ۔ ۶ (گجرات)



جتیندر بلو
1, ALFRED ROAD ACTON, LONDON - W3-6LH
(ENGLAND)

تنہا تنہا

سخت سرد دن تھے۔ سنیچر کی شام تھی۔ جب میرے ساتھ ایک عجیب حادثہ پیش آیا تھا۔ آرچ کورٹ کی ایک وکٹورین پب میں بیٹھا دن بھر کی تھکاوٹ ہی دور نہیں کر رہا تھا، بلکہ "وقت" کو بھی قتل کرنے کی کوشش میں تھا۔ اس نے میرے ساتھ کئی انوکھے کھیل کھیلے تھے۔ چاہتے ہوئے بھی کبھی میرا ساتھ نہ دیا تھا بلکہ زندگی کے ہر موڑ، ہر قدم پہ مجھے یوں پریشان کیا تھا جیسے پورے سنسار میں لے دے کے میں ہی اس کا دشمن تھا۔ اور ہوں۔ میرے سینے میں اس کے لئے اتنی نفرت بھری ہوئی تھی کہ اگر وہ خود کو کسی پیکر میں سمو کر میرے روبرو آجاتا تو میں دنیا بھر کا بارود اس پر نچھاور کر کے تالیاں پیٹتا۔ اور یہ آواز علیحدہ کہتا کہ تمہارے نظام میں توازن نہ ہونے کے کارن تمہارا یہ انجام ہوا ہے۔ لیکن "وقت" لارڈ کرشنا کی طرح ہر سمت پھیلا ہوا مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تمہارے آباؤ اجداد، تم اور تمہاری آنے والی نسلیں یکجا ہو کر بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں کہ تم میرے نزدیک ایک بے معنی سا ذرہ ہو ——— مایوس ہو کر میں نے ایک گہرا سانس بھرا اور بیئر کا مگ اٹھا کر گرد و پیش نگاہ دوڑائی۔ ماحول خاصا گرم ہو چکا تھا ہر شخص کسی نہ کسی کے ساتھ دکھائی دے رہا تھا۔ کوئی اپنی بیوی کے ساتھ سر جوڑے بیٹھا تھا تو کوئی اپنی گرل فرینڈ کی کمر میں ہاتھ ڈالے۔ کوئی یار دوستوں کے ساتھ بے فکری سے قہقہے لگا رہا تھا۔ لیکن میں واحد شخص تھا جو سارے پب میں تن تنہا تھا۔ بالکل اس شخص کی طرح جس کے جاننے والے بے شمار موجود ہوں۔ لیکن پھر بھی وہ بھری دنیا میں تنہا ہو ——— میرا دوست احباب کا دائرہ کافی وسیع پھیل گیا۔ ان میں بعض تو ایسے تھے جو میرے بچپن کے ساتھی تھے۔ اور بعض نے جوانی کی رنگینیاں میرے ساتھ دیکھی تھیں۔ پھر ان سب نے دیار غیر میں آکر دولت کو اتنی تیزی سے سمیٹا کہ ان کی کایا پلٹ گئی تھی۔ اس دوڑ میں دیوانہ وار بھاگ نکلے تھے لیکن میری کمزور ٹانگیں اس دوڑ کے قابل نہ تھیں۔ میں تو ایک ریستوران میں ادنیٰ سا ویٹر تھا۔ یار احباب کے قریب سانس لینے پر میں نے یہی محسوس کیا تھا کہ وہ، وہ نہیں رہے جو کبھی ہوا کرتے تھے۔

ان کی ہر بات، ہر خیال پھیل کر مایا جال میں ابھر جایا کرتا تھا۔ ضرورت پڑنے ہی پر وہ مجھ سے ملنا پسند کرتے تھے۔ ورنہ میں ان کے سامنے کھڑے کھڑے دم توڑ دیتا، انہیں ذرا بھی ملال نہ ہوتا۔ ایک روز غصے کے عالم میں، میں نے تمام دوستوں کو موت کے گھاٹ اتار ڈالا اور کھلی فضا میں کھل کر سانس لینے لگا۔ لیکن "وقت" تو میری گھات میں لگا ہوا تھا۔ وہ تنہائی کا چولا پہن کر میرے تن من سے چمٹا ہوا میری آتما تک اتر گیا۔ روز بروز میری حالت اس پرندے کی طرح ہوتی چلی گئی، جو اپنی ڈار سے بچھڑ کر اکیلا ہی خلاؤں میں بھٹکتا پھرتا ہو۔

پب کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ کاؤنٹر تک پہنچنا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک کونے سے دوسرے کونے تک لوگ کھڑے پینے پلانے اور بات چیت میں کھوئے ہوئے تھے۔ لال، پیلے، ہرے لباس بڑھ چڑھ کر اپنی اہمیت کا احساس دلا رہے تھے۔ ادھر وہ نوجوان پنچھی ادھر ادھر بکھرے ہوئے لمبی اڑان کے لئے پر تول رہے تھے مگر وہ بھی تنہا نہیں تھے۔ ہر کوئی اپنے شب کے ساتھی کے ساتھ تھا۔ کوئی کسی کے بدن سے چپکا ہوا دنیا کو فراموش کئے بیٹھا تھا۔ اور کوئی اپنے ہونٹوں سے دوسرے کی روح تک پہنچنے میں کوشاں تھا۔ ان لوگوں کو بے خوف و خطر لپٹا دیکھ کر مجھے ایک ہی خیال آیا کرتا تھا کہ آدمی یورپ میں ہو، جوان ہو اور اس کے پاس پنچھی بھی ہو تو یورپ ہر لحاظ سے اس کے لئے جنت ہے، ورنہ یہی جنت اس کے لئے جہنم ہے۔ حالاں کہ دونوں لفظ "ج" سے شروع ہوتے ہیں۔ لیکن دونوں کے درمیان اتنا طویل فاصلہ ہے کہ آدمی کا وجود گردش کر رہ جاتا ہے۔

میں نے سگریٹ سلگا کر جاندار کش لیا ہی تھا کہ لگا، کوئی میرے دائیں ہاتھ کچھ فاصلے پر بیٹھا مجھے گھور رہا ہے۔ واقعی ایک سفید چمڑی والی لڑکی بانہیں ٹیکے تک رہا تھا۔ نظریں ٹکراتے ہی اس کے ہونٹوں کے کونے یوں پھیل گئے کہ وہ اپنی عمر سے بڑی دکھائی دینے لگی۔ وہ پچیس چھبیس کے قریب تھی۔ تراشے ہوئے بے ترتیب گھنے بال، جو اس کی گردن اور کانوں کے ارد گرد پھیلے ہوئے تھے۔ دودھیا چہرہ، بڑی بڑی بلوری آنکھیں اور ہلکی سی اٹھی ہوئی ناک،

جس نے اس کی اچھی بھلی صورت میں کمی پیدا کر دی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے وہ بالکل تنہا تھی — اس کی میز کے ایک طرف تین جوان لڑکے بیٹھے کامن مارکیٹ کے مسائل پر گفتگو کر رہے تھے۔ وہ بات چیت میں اس قدر کھوئے ہوئے تھے کہ کوئی بھی لڑکی کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ لڑکی بھی ان کی باتوں سے بے نیاز سگریٹ کا دھواں لاپرواہی سے ادھر ادھر بکھیر رہی تھی۔ جانے کیوں میرے اندر کسی نے سرگوشی کی کہ وہ بھی میری طرح تنہا ہے اور یقیناً اسے بھی کسی کی تلاش ہے۔ میں نے گلاس اٹھا کر اشارتاً cheers کہا۔ اس کے ہونٹوں کے کھلنے سے پہلے ہی اس نے وائن کا گلاس اٹھا کر ہوا میں لہرایا۔ اور میری CHEERS کو قبول کر لیا۔ مجھے اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا دیکھ کر وہ ایک طرف کو سرک گئی اس کے قریب بیٹھے ہوئے آرٹسٹ نے جب مجھے لڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی اپنی جگہ سے تھوڑا سا سرک گیا۔ میز پر گلاس رکھ کر میں دونوں کے درمیان قدرے پھنس کر بیٹھ گیا۔ پھر آرٹسٹ کا شکریہ ادا کر کے لڑکی کی طرف زیرلب متوجہ ہوا۔ "کیا تم اکیلی ہو — ؟"

"فی الحال تو اکیلی ہوں اور تم — ؟"

"فی الحال تو میں بھی اکیلا ہوں"

اس مرتبہ اس کے ہونٹ ہی نہیں، دانت بھی پھیل گئے تھے جو کم و بیش ہر مقامی لڑکی کی طرح قابلِ علاج تھے۔ لیکن وہ مجھے ذرا بھی برے نہ لگے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ پپ پلا کر میں انہیں دانتوں سے کچھ چرانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ جب کہ اگلے روز دن بھر منہ کا ذائقہ کڑوا کسیلا رہا کرتا تھا۔ میں نے اسے سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔

"کیا تم کسی کا انتظار کر رہی تھیں — ؟"

"میں کبھی کسی کا انتظار نہیں کیا کرتی —"

اس کی بے باکی نے مجھ پر اتنا گہرا تاثر چھوڑا کہ میں اس کی سنجیدہ آنکھوں میں جھانکنے پر مجبور ہو گیا۔ وہاں مجھے ایک جزیرہ دکھائی دیا۔ جہاں ایک الگ سی دنیا آباد تھی۔ جس کی وہ خود ہی مخلوق تھی اور خود ہی حاکم۔ اس جزیرے کو کھنگالنا سمجھنا اور ہضم کرنا میرے لیے ضروری ہو گیا۔

"لیکن کبھی نہ کبھی تو انتظار کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو — ؟"

میں نے پہلو بدل کر دونوں کے درمیان مزید جگہ بنائی اور بولا۔

"فرض کرو تم نے کسی سے ملنے کا وعدہ کر رکھا ہے اور تم وقت مقررہ سے پانچ دس منٹ پہلے وہاں پہنچ جاتی ہو — ظاہر ہے کہ اس صورت میں تم انتظار کرو گی۔"

"میں ایسا موقع کبھی آنے نہیں دیتی۔ میں ہمیشہ پانچ دس منٹ دیر سے پہنچتی ہوں کہ ملنے والا وہاں موجود ہو تو ٹھیک، ورنہ سیدھے آگے بڑھ جاتی ہوں"

میری آنکھیں پھیل کر خود بخود سکڑ گئیں، جیسے جاننے کی خواہش مند ہوں کہ یہ خیال، یہ سوچ عالم کی تھی یا مخلوق کی، لیکن اس کے سخت لہجے سے نمایاں تھا کہ عالم انتہائی سخت جان ہے اور وہ اپنی مخلوق پر انتہائی حاوی ہے۔

ایک بڑا گھونٹ حلق سے اتار کر میں اس سے مخاطب ہوا، "لیکن تم لوگ تو وقت کے بڑے پابند ہو — وقت پر نہ پہنچنے یا دیر سے پہنچنے کو برا سمجھتے ہو؟"

"ہاں یہ ہمارا کلچر ہے — لیکن میں ہر چیز کو اپنے ڈھنگ سے دیکھتی ہوں۔"

میں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا بلکہ دانستہ اسے یوں دیکھا، جیسے اس کی بات مجھ تک پہنچنے کی بجائے اسی تک رہ گئی ہو — وہ میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے میری ذہنی کیفیت بھانپ گئی۔ فوراً بولی "میری نظر میں انتظار کا مطلب کچھ اور ہے۔"

"اگر برا نہ مانو تو بتا سکتی ہو کہ وہ کیا ہے — ؟"

غیر مطمئن نظروں سے مجھے دیکھ کر وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ شاید وہ اس خیال میں تھی کہ جس ذہنی سطح پر وہ سانس لے رہی ہے، وہاں تک میری رسائی ہے یا نہیں — آخر ہچکچا کر بولی۔ "جب کوئی کسی کا انتظار کرتا ہے تو وہ درحقیقت انتظار نہیں کر رہا ہوتا۔ بلکہ اپنے پاؤں کاٹ رہا ہوتا ہے۔" وہ ایک پل کو رک گئی، پھر کہیں دور دیکھ کر گویا ہوئی، "میں نے ایک بار کسی کا انتظار کیا تھا لیکن اتنی بری طرح سے زخمی ہوئی تھی کہ بیان کرنا مشکل ہے۔"

"بیان کرنے سے فائدہ بھی کیا۔ کوئی کسی کے درد میں شریک تو ہو نہیں سکتا۔"

عجیب سا ردعمل اس پر ہوا۔ اسے یقین سا ہو گیا کہ ادراک کی جس سطح پر وہ سفر کر رہی ہے، وہیں کہیں میں بھی چہل قدمی کر رہا ہوں۔ گہری نظروں سے وہ مجھے بدستور دیکھتی رہی لیکن میں فضا کو خوشگوار بنانے کے لیے فوراً بول اٹھا۔ "ہمارے یہاں کہا جاتا ہے کہ جو مزہ انتظار میں ہے دنیا کی کسی چیز میں نہیں۔" وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اور یک بارگی اس کی عمر میں بیس سال کا اضافہ ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے ان لڑکوں نے ہماری طرف دیکھا پھر خود میں کھو گئے۔ ابہام کا فسوں پر قابو پا کر وہ گویا ہوئی۔ "تم لوگ بڑے رومانی ہو اور جذباتی بھی۔ اور کسی حد تک اذیت پسند — میں ایک بار ایسٹ ہو کر آئی ہوں۔ ہماری طرز زندگی، ہماری اقدار تم سے بالکل مختلف ہیں۔ رومانیت ہر پل سوچنے پر مجبور کرتی ہیں"

"اس لیے تم ہر چیز کو اپنے ڈھنگ سے دیکھتی ہو — ؟"

"بالکل"

ہم دونوں خاموش ہوکر ہلکے ہلکے گھونٹ بھرتے رہے۔ اس نے جو کچھ بھی (کہا) تھا سر بسر میرے لئے نیا نہیں تھا لیکن اتنا ضرور واضح ہوگیا تھا کہ وہ تیز فہم ہے۔ اور سر سے پاؤں تک انفرادیت سے بھری ہوئی ہے۔ دنیا میں رہ کر بھی دنیا کو الگ نظر سے دیکھتی ہے۔ اور عام روش سے ہٹ کر سوچتی ہے۔

گلاس قریب قریب خالی ہوچکے تھے میں نے آخری گھونٹ بھر کر اس کے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اور پوچھا: "تم کون سی وائن لے رہی ہو۔ ڈرائی یا سویٹ؟"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"نہیں، مجھے اور نہیں چاہیئے۔"

"کیا ڈائٹ کر رہی ہو؟ ابھی تو رات بھی جوان نہیں ہوئی ——؟"

اس نے ایک بار پھر مجھے گہری نظروں سے دیکھا اور اپنی نرم نرم انگلیاں میرے ہاتھ کی پشت پر پھیر کر بولی "یہاں CROWD بہت زیادہ ہوگیا ہے۔ مجھے گھٹن سی ہو رہی ہے۔" میں نے CROWD پر بھرپور نظر ڈالی، پھر اس کی آنکھوں میں اتر کر کہا: "لیکن مجھے تو CROWD میں رہ کر بڑا آنند ملتا ہے۔ میں کرو میں اس کا اٹوٹ حصہ بننا چاہتا ہوں ورنہ جب تنہا ہوتا ہوں تو عجیب محسوس کرتا ہوں۔"

"لیکن ابھی تم تنہا نہیں ہو۔"

وہ پلک جھپکائے بنا مجھے دیکھتی جا رہی تھی۔ ساری دنیا سمٹ کر ایک مرکز پر اکٹھی ہوگئی تھی۔ لگا کہ وقت ٹھہر گیا ہے۔ اور اس لمحے کے بعد شاید کوئی دوسرا لمحہ جنم لے۔ میرا بازو خود بخود اس کی کمر کے گرد پھیل گیا اس نے ابھی مزاحمت نہ کی۔ بلکہ آہستہ سے اپنا ہاتھ میری ران پر رکھ دیا۔ مجھے یقین سا ہونے لگا کہ زندگی کی ہر پیچ پیچ راہوں اور دشوار گزار راستوں میں اس کے ساتھ دور تک قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔ میں نے جھک کر اس کے کان کی گرم لو محسوس کی اور دھیرے سے کہا۔ "آؤ کہیں اور چلتے ہیں۔"

چند لمحات کے بعد ہم پب کے باہر کھڑے تھے۔ تخ بستہ ہوا نے راہگیر مقدم اس طرح کیا کہ ان کی آن میں ہمارا انگ انگ برگ کی طرح لرز اٹھا۔ مایوسی کی شدت اس قدر زیادہ تھی کہ ہم کچھ دیر وہاں اور کھڑے رہتے تو ہمارا وجود سے الگ ہو جاتا۔ اس نے جھٹ سے چھوٹے دستانے نکالے اور دوسری جیب سے اسکارف شیٹ ٹوپی نکال کر پہن لی۔ سڑک کے اس پار شیشے کی بنی عمارت میں ایک خوبصورت پب تھا۔ جہاں کی گونا گوں روشنیاں ہر راہگیر کو اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ اس نے زور سے میرا بازو تھام کر وہاں چلنے کے لئے قدم اٹھایا۔ ہری بتی لال میں تبدیل ہوتے ہی ٹریفک رک گیا۔ اور ہم

سڑک کو تیزی سے پھلانگ کر پب میں داخل ہوگئے لیکن وہاں بھی کم و بیش وہی حالت تھی جس سے فرار ہوکر ہم یہاں آئے تھے۔ پورا پب ہر گوشہ جوان طبقے سے بھرا ہوا تھا۔ ان میں بعض تو قالین ہی پر پھیلے بیٹھے تھے موسیقی، شور شرابہ، قہقہے اور سگریٹ کا گاڑھا دھواں، ان سب نے مل ملا کر ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس کے چہرے پر آگ سی لگ گئی۔ لیکن میں نے کندھے اچک کر لاچارگی ظاہر کر دی۔ وہ پل بھر کے لئے میری ادا سے محظوظ ہوئی، پھر حقارت سے بولی۔

"I AM SICK OF SUCH CROWD,
WHICH HAS NO CHRACTER"

وہ کونسل کی عمارت شیفرڈ کورٹ کی اٹھارویں منزل پر مقیم تھی۔ لفٹ منزل بہ منزل چڑھتی ہوئی آخری منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میرے ایک ہاتھ میں وائن کی بوتل تھی۔ اور دوسرے میں بیئر کے چند ڈبے۔ ماریلن نے FISH & CHIPS کے پیکٹ پکڑ رکھے تھے۔ اور وہ پھیلی ہوئی ٹٹولتی نظروں سے مجھے جانچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن میں تو اسے کب کا جان چکا تھا۔ ایک ہی ملاقات میں لاتعداد ملاقاتیں چھپی ہوئی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں ہم نے کئی فاصلے طے کر لئے تھے۔ اور کچھ ہی دیر میں آخری فاصلہ طے کرکے ایک دوسرے کی روح تک اترنے والے تھے۔ اچانک میرے ذہن کے کسی گوشے سے "وقت" نمودار ہو کر احساس دلانے لگا کہ مجھے جھک کر اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ کہ اس کے کرم سے میں ایک مشتاق پنچھی کی صحبت سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ لیکن میری گردن جھکنے کی بجائے یہ سوچ کر مزید تن گئی کہ ذاتی کامیابی میں "وقت" کا دخل کہاں اور اگر ہے بھی تو وہ اپنے غیر متوازن نظام میں توازن پیدا کرنا چاہتا ہے۔ باقی سب بکواس ہے۔

لاؤنج میں داخل ہوکر اس نے فائر گیس جلایا، پردے کھینچے اور گلاس لانے کے لئے کچن کی طرف بڑھ گئی سامان رکھ کر میں نے اس کے فلیٹ پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ دو کمروں کا فلیٹ تھا۔ اور ہر طرف سامان بے ترتیبی سے بکھرا ہوا تھا۔ فلیٹ کی آرائش، وال پیپر، فرنیچر کی ترتیب اور دیواروں پر آویزاں تصویروں سے نمایاں تھا کہ فلیٹ کی اپنی کوئی شخصیت نہیں ہے۔ کارنس پر سجی تصویر کو دیکھ کر میرے حواس ساتھ چھوڑنے لگے۔ ماریا شادی کا لباس پہنے اپنے شوہر کے دوش بدوش کھڑی مسکرا رہی تھی، چند مزید اندیشے سر اٹھا کر مجھے خود میں گھیرنے لگے۔ اور میں دم بخود کھڑا کبھی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ اور کبھی صدر دروازے کو۔ عین اسی وقت وہ گلاس تھامے گنگناتی ہوئی داخل ہوئی اور مجھے حیران سا دیکھ کر گویا ہوئی: "ڈرو مت —— مجھے اپنے شوہر سے علاحدہ ہوئے ایک سال سے اوپر ہو چکا ہے۔" "پھر —— پھر تم نے

یہ تصویر کیوں رکھی ہے یہاں ۔۔۔۔ ؟ "
" تاکہ ہر کسی کو پتہ چل جائے کہ میں ایک بار آگ سے لپٹ چکی ہوں "
" تم شادی کو آگ کہتی ہو ۔۔۔ "
" اور کیا کہوں اسے ۔۔۔۔ میری شخصیت کو جلا کر رکھ دیا تھا اس نے "

میں نے کیانتی کی بوتل کھول کر وائن گلاسوں میں ڈالی اور کوٹ اتار کر اس کے شوہر پر بھرپور نظر ڈالی وہ دراز قد چھریرے بدن کا خوب صورت جوان تھا۔ اس کی شوخ شریر آنکھوں میں بیک وقت کئی سوال چھپے ہوئے تھے۔
" تمہیں یہ تصویر پریشان نہیں کرتی ۔۔ ؟ "
" مجھے یہ کیوں پریشان کرنے لگی ۔۔ میرا اس سے سمبندھ ہی کیا ہے "
" نہیں میرا مطلب ہے ۔۔ " تمہیں شادی کے وہ حسین دن ، راتیں ، باتیں ، ہنسی مذاق ، واقعات اور سبھی کچھ یاد بھی رہ رہ کر یاد نہیں آتیں ۔۔۔ ؟ "
" وہ سب کچھ ختم ہو چکا ہے ۔ میرے لئے ہر چیز مر چکی ہے " اس کے لہجے میں بلا کی تندی ابھر آئی تھی ۔ گلاس اٹھا کر اس نے اپنی بات کو آگے بڑھایا ، " میں بڑی مشکل سے اس آگ سے نکل پائی ہوں ۔۔۔۔ میں اب وہ ہوں جو شادی سے پہلے تھی "

میں نے لیکے بعد دیگرے جان دار گھونٹ بھر کر گلاس ختم کر ڈالا پھر اس کی آنکھوں سے ہو کر جو منظر سے میں داخل ہو گیا دو درازوں مخلوق کے کرب ناک چہرے پر زخموں کے ان گنت نشان تھے قریب ہی حاکم کھڑا اسے بیزاری سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن وہ حملہ آور شیطان دونوں پر ہنس رہا تھا۔ حاکم نے حملہ آور کا جان توڑ کر مقابلہ کیا۔ لیکن شاید حملہ آور جابر تھا۔ حاکم سخت جان اور مخلوق ہمیشہ کی طرح کمزور اور بے بس۔
" یوں لگتا ہے کہ شادی کے بعد تم اپنی آزادی کسی حد تک کھو بیٹھی تھیں ؟ "
" تم آزادی کی بات کرتے ہو ۔ میری شخصیت ہی ختم ہو کر رہ گئی تھی "
اس نے بے مدتح ہو کر کہا ۔ پھر قدرے توقف کے بعد تاسف بھرے لہجے میں بولی : کسی کو اتنا پیار بھی نہیں کرنا چاہئے کہ آدمی کی اپنی شخصیت غائب ہو جائے اور کسی دوسرے کی شخصیت اس پر اتنی حاوی ہو جائے کہ وہ ہر قدم پر فائدہ اٹھانے لگے ۔ یقین کرو میں وہ نہیں رہی تھی جو شادی سے پہلے تھی "
سوچتی ہوئی نظروں سے جذبے کے کچھ پہلو سمجھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا WOMEN'S LIB کی جیتی جاگتی تصویر میرے سامنے بیٹھی ہوئی ہے ۔ اور یا بھی عمر کی یورپین لڑکی کی طرح آزاد ، خود مختار اور سر پھری ۔ اس پر تحریک کا اتنا شدید اثر ہے کہ وہ مکمل اختیار ، شخصی آزادی اور مساوی حقوق میں یقین رکھتی ہے ۔ مرد کی برتری اور غلبہ کسی بھی اعتبار سے برداشت نہیں کر سکتی ۔ خواہ وہ معاشرتی زندگی میں ہو یا ازدواجی زندگی میں ۔۔۔۔ مزید وائن اس نے گلاس میں انڈیل کر پوچھا ۔
" تم تو اس آگ سے لپٹ چکے ہو نا ؟ " " نہیں ۔ ابھی تک تو بچا ہوا ہوں "
" بہت خوب ، کتنے خوش قسمت ہو تم ۔ میں تو کہوں گی کہ بھول کر بھی اس آگ کے قریب مت جانا ورنہ راکھ ہو جاؤ گے ۔ "
مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی ۔ لیکن میں نے گفتگو کا ربط ٹوٹنے نہ دیا ۔
" کوشش کروں گا کہ اس آگ سے دور رہوں "
" اس میں تمہاری بہتری ہے ۔ ورنہ خود کو زخمی کر لو گے "
" لیکن ۔ جانے لوگ کیوں کہتے ہیں کہ شادی کے بعد ہی آدمی مکمل ہوتا ہے ۔ "
" ممکن ہے ۔ مرد مکمل ہو جاتا ہو ۔ لیکن عورت ادھوری رہ جاتی ہے ۔ "
اس کی باتوں سے زیادہ اسکی شراب مجھ پر اثر چھوڑ رہی تھی میں نے یہی مناسب سمجھا کہ موضوع کو بدل کر شراب سے لطف اٹھایا جائے ۔ لیکن موضوع کا ایک اہم پہلو مجھے اندر ہی اندر تنگ کیے جا رہا تھا ۔
" میں تم سے ایک ذاتی سوال پوچھنا چاہوں گا ۔ برا تو نہیں مانو گی "
" تم سے بات کرنے میں مزہ آتا ہے ۔ پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو ۔ "
" شوہر سے علیحدہ ہو کر تم خود میں کمی نہیں محسوس کرتیں ؟ "
" تم سمجھدار ہو ۔ ہو سکے تو ذرا کھل کر بات کرو ۔ "
" میرا مطلب ہے تمہیں ایسا نہیں لگتا کہ تم اتنی بڑی دنیا میں بالکل اکیلی ہو گئی ہو ؟ ۔۔۔ "
" اکیلی تو میں پہلے بھی تھی ۔ پھر کیوں بھولتے ہو کہ آدمی اکیلا ہی پیدا ہوتا ہے ۔ اکیلا ہی زندگی سے لڑتا ہے ۔ اور اکیلا ہی مر جاتا ہے ۔ "
لیکن زندگی کے سفر میں آدمی کہاں تک اکیلا رہ سکتا ہے ۔ کبھی نہ کبھی تو اسے ہم سفر کی ضرورت پڑتی ہی ہے ورنہ قدم قدم پہ اکیلا پن اسے ڈسنے لگتا ہے ۔ "
" صرف ان لوگوں کو جو اکیلے پن سے ڈرتے ہیں ۔۔ مجھے تو اکیلے پن سے محبت ہے ۔۔۔ میں اکیلا رہنا پسند کرتی ہوں ۔ "
مجھے اس کے رویے پر تعجب ہوتے ہوئے بھی تعجب نہیں ہو رہا تھا کہ عموماً یہاں کی عورت ماضی میں کم اور حال میں زیادہ زندہ رہتی ہے ۔ وہ زندگی کو جس طرح سے وہ ہے قبول کرتی ہے ۔ گو شروع شروع میں میں بھی یہی سمجھا تھا کہ وہ بھی مینی فلسفی کی طرح ایک آنکھ بند کر کے سوچتی ہے

لیکن اس کے خیالات کی گہرائی اور سوچ کے تسلسل سے یہ واضح ہونے لگا تھا کہ وہ جو کچھ بھی کہہ رہی ہے، ذاتی تجربات کی بناء پر کہہ رہی ہے۔ لیکن ایک معمہ تھا کہ بال کی کھال ادھیڑنے سے باز نہیں آ رہا تھا۔

"ہاں کہ تمہاری دوستی خود سے بہت گہری ہے۔ اور ہر پل تم خود کے ساتھ گزارنا پسند کرتی ہو۔ لیکن کبھی نہ کبھی تو تمہیں خود سے بھی اکتاہٹ ہوتی ہوگی۔"

"میں تمہارا مطلب سمجھ گئی ـــــ یقین کرو میں کئی کئی ہفتوں تک اپنے دوستو سے بھی نہیں ملتی ـــــ پھر لوگوں بھی کس لئے۔ شخصیت کے ٹکراؤ کے لئے؟ انا کو ٹھیس پہنچانے کے لئے؟ خود میں ناآسودگی پیدا کرنے کے لیے؟" یہ کہہ کر اس نے ایک طویل فلک شگاف قہقہہ بلند کیا، جس میں جہاں بھر کا طنز چھپا ہوا تھا۔ لگا کہ وہ سارا زہر جو اس کے سینے میں دفن ہے، اگل ڈالے گی۔ میرا ہاتھ اپنے آپ بوتل کی طرف بڑھ گیا۔ ایک نظر اس پر ڈال کر خیال آیا کہ ہم ان کشتیوں کے مسافر ہیں جن کی منزل تو ایک ہے۔ لیکن وہ دھند میں کھوئی ہوئی الگ الگ دھاروں پر بہہ رہی ہیں ـــــ ماریا تنہا ہوتے ہوئے بھی تنہا نہیں ہے۔ اور میں تنہا نہ ہوتے ہوئے بھی تنہا ہوں ـــ آہستہ آہستہ ہنسی کا طوفان تھم گیا۔ اور وہ بولی، "شاید تم سوچ رہے ہو کہ میں ہوں"

"نہیں میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔"

"کیا ـــ ؟"

"یہی کہ ہمارے سوچنے کا ڈھنگ کتنا الگ الگ ہے۔"

"سو تو ہے۔"

"لیکن پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ ہم ایک دوسرے کے لئے ایک اچھے دوست ثابت ہو سکتے ہیں۔"

"یہ کہنا تو کافی مشکل ہے ـــ لیکن تمہاری پرابلم ـ کچھ اور ہے جس نے تمہیں تنگ کر رکھا ہے۔"

اس نے ایک مرتبہ پھر زوردار قہقہہ لگایا۔ جیسے میرے اندر جھانک کر اس نے جان لیا ہو کہ میں زندگی کے دوراہے پر بے یار و مددگار کھڑا ہر راہگیر ساتھ قدم اٹھانے کے لئے تیار ہوں۔ یک بارگی مجھے ایسا لگا کہ میرے جسم سے کپڑے غائب ہو گئے ہیں اور میں مادر زاد ننگا اس کے سامنے بیٹھا رحم کی بھیک مانگ رہا ہوں۔ ایک مرتبہ پھر مجھے بوتل کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور میں ایک ہی گھونٹ میں تین چوتھائی گلاس صاف کر گیا۔ اس کا چہرہ ہمدردی سے بھر گیا۔ لیکن لبوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ، جو اپنے ساتھ ہزار معنی لئے ہوئی تھی، پھانس بن کر میرے اندر اتر گئی۔ اس لمحے ہمارے درمیان از سر نو کئی فاصلے پیدا ہو گئے۔ اور ہم پھر سے مکمل اجنبی بن گئے۔

جس کا احساس اسے بھی فوری طور پر ہوا۔ اور وہ برجستہ بول اٹھی۔

"اس دنیا میں کوئی ایسا نہیں جس کے یہاں پرابلم نہ ہو۔ میرے یہاں بھی وقت بے وقت ایک پرابلم پیدا ہوتی ہے۔ جو مجھے پریشان کر ڈالتی ہے۔ لیکن یہ مت بھولو کہ اس دنیا میں ہر چیز کا حل موجود ہے۔"

اس مرتبہ میں نے بھرپور قہقہہ لگانا چاہا۔ لیکن میری آواز نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ البتہ سمجھ بوجھ کی گہری لکیر میرے لبوں پر ضرور ابھر آئی کہ وہ اس خشک ندی کی طرح ہے۔ جو اپنی خشکی سے تنگ آ کر اپنی پیاس بجھانے کے لئے ہر سمت سے رواں دواں پانی کو خود میں سمو لینا چاہتی ہے۔

میں اسے ذہن نشین کرانا چاہتا تھا کہ آدمی کتنا بھی تنہا پسند کیوں نہ ہو، اس نے کتنی ہی دیواریں اپنے ارد گرد کیوں نہ کھڑی کر رکھی ہوں، اسے دوسروں کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔ "وقت" نے نظام بنیاد کچھ اس طرح سے رکھی ہے کہ ہم سب نہ چاہتے ہوئے بھی مجبوراً ایک دوسرے پر موقوف ہیں۔ لیکن اس نے مجھے لب کشائی کا ذرا بھی موقع نہ دیا۔ اٹھ کر بڑی بتی بجھا دی۔ صرف اسپاٹ لائٹ جلتی رہ گئی۔ کمرے کی شخصیت بدلتے ہی مدھم روشنی میں ہر شئے مدھم پڑ گئی۔ لیکن ماحول نکھر گیا اور آہستہ آہستہ جذبات میں گرمائی پیدا کرنے لگا۔ اس نے ہائی فائی یونٹ کا بٹن دبایا۔ تو الگ الگ جگہ پر دھرے ہوئے اسپیکروں سے موسیقی کی آواز ابھری۔ گانے کے بول فضا میں جادو جگانے لگے
ALL YOU NEED IS LOVE......LOVE

موسیقی کی لے پر اس کا انگ انگ جھوم اٹھا اور وہ مستی میں ڈوبی میرے ارد گرد چکر کاٹنے لگی میں نے اس کے بدن کو بہت ہی قریب سے محسوس کیا۔ وہ بدن مجھے اپنی طرف یوں کھینچ رہا تھا جیسے اس میں مقناطیس جڑا ہوا ہو۔ وہ اٹھ کر مونڈھے بدن کے بعض حصوں پر ہولے ہولے ہاتھ پھیرتی جا رہی تھی۔ اس کے وہ لمحہ میرے لئے ناقابل برداشت تھا میں تیزی سے اٹھا اور اس سے لپٹ کر ناچنے لگا۔ ہزار ہا گرم لہریں ہمارے اندر دوڑ گئیں۔ پھر ہمارے ہاتھ ہونٹ اور لیکن پیار کرنے کا ڈھنگ بالکل ایک جیسا تھا مجھے ذرا بھی احساس نہ ہوا کہ وہ دنیا کے کسی الگ علاقے، الگ نسل اور الگ ذات سے تعلق رکھتی ہے، وہ دیوانہ وار میرے چہرے پر لیکن پیار کرنے کا ڈھنگ بالکل ایک جیسا تھا۔ وہ دیوانہ وار میرے چہرے پر اپنے ہونٹوں کے نشان چھوڑ رہی تھی اور میرے ہاتھ اس کے جسم کی پیمائش میں مصروف تھے۔ میں نے جھنجلا دے کر اسے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ اور اس کے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں میں مقید کر کے بیڈ روم کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن ایک ہی جملہ رہ رہ کر میرے ذہن میں گونج رہا تھا کہ میں ماریا کی زندگی میں صرف ایک رات کا مہمان ہوں۔

صبح آنکھ کھلی تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ کھڑکی پر بیٹھے پرندے چہچہانے لگے۔

کے نیچے دن کا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ جس نے پردے کی رنگت ہی بدل ڈالی تھی۔ ماریا ابھی تک بے خبر سو رہی تھی وہ مجھ سے لپٹی ہوئی تھی۔ اور اس نے مجھے اپنی بانہوں میں یوں جکڑ رکھا تھا جیسے اسے خدشہ ہو کہ میں کچھ ہی دیر میں اس سے جدا ہونے والا ہوں۔ پھر کبھی لوٹ کر آؤں گا یا نہیں؛ لیکن اس کے چہرے پر سکون تھا، طمانیت تھی قرار تھا۔ میں بھی خود کو بے حد ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ اور میرے ساتھ میری آتما بھی خوش تھی۔ میں نے ماریا کو خود سے الگ کر کے اٹھنا چاہا تو اس کی گرفت پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ اگلے ہی پل ہمارے ہاتھ، ہونٹ اور بدن پیار کی زبان میں بات کرنے لگے۔ کبھی ہولے کبھی تیز اور کبھی وحشیانہ انداز میں۔ کمرے میں پھیلا ہوا نیم اندھیرا، نیم اجالا بھی ہمیں پیار سے دیکھنے لگا۔

گھنٹہ بھر کے بعد جب میں اس کے فلیٹ سے رخصت ہو رہا تھا تو وہ شب خوابی کا لباس پہنے میرے قریب آئی۔ گہری سرد نظروں سے مجھے کچھ یوں دیکھا جیسے میں اس کے لئے کوئی غیر ہوں، میری کوئی وقعت نہیں ہے اور ہمارے درمیان کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ لیکن وہ دھیمے سے بول اٹھی۔ "کل رات تم نے کہا تھا کہ ہم اچھے دوست ثابت ہو سکتے ہیں نا۔"

"ہاں کہا تو تھا"

"میں بھی کچھ ویسا ہی محسوس کر رہی ہوں"

"میری آنکھوں کی روشنی تیز ہو گئی۔"

"لیکن ایک شرط ہے"؟

"کیا ـــــ؟"

"میں تم سے تب ہی ملنا پسند کروں گی، جب میں چاہوں گی..... ورنہ نہیں۔" میں چکرا گیا۔ لیکن میرے ہونٹوں پر بامعنی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ صوفے سے کوٹ اٹھا کر پلک جھپکائے بنا میں اس کی آنکھوں میں اتر گیا۔ پھر طنزاً بول اٹھا۔ "ماریا تمہاری ٹریجڈی بڑی عجیب ہے۔ جس نے تمہیں تنگ کر رکھا ہے۔" وہ خاصی محتاط ہو گئی تھی میں نے اپنی بات کو آگے بڑھایا۔

"تمہیں مرد ذات سے سخت نفرت ہے تمہارا بس چلے تو تم اس سے بات بھی نہ کرو۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ تمہیں وقت بہ وقت اس کی ضرورت شدت سے پڑتی ہے۔ میں تمہارا ضرور ہوں لیکن اخلاقاً ابھی اتنا گرا نہیں۔"

یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف بڑھ گیا اور مڑ کر دیکھنا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ ✱

بہ خطِ شاعر



شمیم فاروقی

آگ جلتی رہے دھواں ہوں میں
کچھ پتہ تو چلے کہاں ہوں میں

آج تک بولتا رہا ہے کون
لوگ کہتے ہیں بے زباں ہوں میں

تھا کبھی حرفِ معتبر کی طرح
آج اک وہم ہوں گماں ہوں میں

تیرا میرے بغیر مصرف کیا
تو اگر تیر ہے کماں ہوں میں

تھی زمیں بس میں آسماں بھی تھا
آج دونوں کے درمیاں ہوں میں

ایک تم ہی نہیں جنابِ شمیم
جانے کتنوں کا رازداں ہوں میں

— ہ —

انعام غضب کا ہے غضب کی یہ سزا ہو
شامل ہو کہیں مجھ میں پہ اور مجھ سے جدا ہو

کیا تم کو بتاؤں میں خموشی کا وہ عالم
گم ہو کے جہاں رہ گئی خود اپنی صدا بھی

دیکھا ہی نہیں غور سے تم نے اسے ورنہ
اک دردِ حقیقت ہے حقیقت کے سوا بھی

کیوں مجھ کو سزاوار سمجھتی ہے یہ دنیا
اب تک کسی سے میں نے کوئی حرف کہا بھی

فرعونِ زمانہ کو یہ شاید نہیں معلوم
یا سسر ترے ہاتھوں میں یہ مٹی کا عصا بھی

— ہ —

اب کے سودا تو مرے سر سے بہت آگے تھا
کیا ارادہ کسی پتھر سے بہت آگے تھا

آپ کو کیسے خبر ہوگی جلنے کی مرے
آپ کا گھر تو مرے گھر سے بہت آگے تھا

آپ نے پیاس کی شدت نہیں دیکھی ورنہ
ایک اک قطرہ سمندر سے بہت آگے تھا

ناز تھا اس کو کہ سر کر لیا گردن اس نے
سرِ مقتول تو خنجر سے بہت آگے تھا

اک عجب ڈر سا مری رگ میں سمایا تھا شمیم
ایک احساس کہ ڈر سے بہت آگے تھا

— ہ —

کوئی رہ رہ کے مرے جسم کے اندر بولے
رات بھر جیسے کہیں دور سمندر بولے

شہر میں اپنے پرائے سبھی خاموش ملے
اور صحرا میں مجھے دیکھ کے پتھر بولے

دل کی شئی ہے اگر سمت خطا کس کی ہے
میں تو قطرہ ہوں مرے ساتھ سمندر بولے

جاگتے سوتے سبھی لوگ گزر جائیں گے
بات تو جب ہے کبھی میل کا پتھر بولے

— ہ —

پروگرام ایگزیکیٹو آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ (بہار)



سریندر پرکاش

۴۳/۳، یوگی راج آشرم، ہنس یوگ مارگ، کالینہ، بمبئی ۔ ۹۸

فسان

قسط نمبر ۳

.... اسے یاد آرہا تھا۔ وہ ایک کشادہ گلی تھی۔ جو ایک بازار سے شروع ہوکر دوسرے بازار میں جا نکلتی تھی۔ سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمکنے لگا تھا۔ لگتا تھا رات ابھی ابھی رخصت ہوئی ہے کیوں کہ رات کے پاؤں کے نشان گھروں کی دیواروں اور منڈیروں پر ابھی تک موجود تھے۔ آنگن میں بنے ایک گڑھے میں پانی جمع تھا۔ اس پانی میں ایک برہمنی چڑیا نہا کر اپنے پنکھ پھڑپھڑا رہی تھی۔ اور کوٹھے کے جنگلے پر بیٹھا ایک شودر کوا کائیں کائیں کر رہا تھا۔

دیواروں، چھتوں، کمروں۔ آنگن، منڈیروں، کوٹھوں، جنگلوں، جالیوں اور جھروکوں سے بنا وہ ایک گھر تھا۔ ایک کمرے میں بچھے پلنگ پر وہ لیٹا ہوا ٹر ٹر چھت کو دیکھ رہا تھا۔ کھڑکی سے دھوپ اندر رینگ رہی تھی۔ چھت کی کڑیاں ایک کے بعد ایک.....

"جودھیا وسے اپل پاوسے"...

"آواز کھڑکی میں سے آئی تھی وہ آواز کی طرف پلٹا....

سامنے ایک دو منزلہ عمارت تھی۔ دیواریں سنگ مرمر کی سفید....

دوسری منزل پر ایک کے بعد ایک کھڑکی ایک دوسری سے لگی ہوئی تھی۔ دیواریں ذرا ہٹ کر فاصلے پر تھیں۔۔ بہت سی عورتیں مرد تالیاں بجا بجا کر گا رہے تھے۔

" دکھ دِن شے من کا..... پس منظر میں گھنٹیاں بج رہی تھیں، گھڑیال گونج رہے تھے۔ بہت سی باہیں ایک خاص انداز سے حرکت کر رہی تھیں۔ تم ہو ایک گوپی، سب کے پران پتی......"

کامریڈ آفتاب چند، کیا آپ اپنی سٹیٹ منٹ ریکارڈ کروا سکتے ہیں؟" انسپکٹر کی آواز پھر اس کے ذہن میں گونجی۔ اس نے آنکھیں پھر ایک بار کھول دیں۔ اسے بے ساختہ ہلکا سا مسکرایا۔ اسے لگا اچانک اس کے سارے زخموں کے منہ کھل گئے ہیں۔

" میں ایک خاص میٹنگ کے سلسلے میں، اپنے یونین لیڈر کامریڈ چکرورتی کے گھر گیا تھا۔" آفتاب نے کہنا شروع کیا۔ "ہماری بات چیت کافی دیر تک چلتی رہی کھانا بھی وہیں کھایا تھا۔ اس کے بعد کامریڈ چکرورتی نے فون کرکے میرے لئے ٹیکسی منگوائی تھی۔

" اٹھو کامریڈ آفتاب، ٹیکسی آگئی ہے۔" کامریڈ چکرورتی کی آواز اس کے ذہن میں گونجی۔ آفتاب نے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ اوپر دیکھا، اور پھر اٹھنے کی کوشش کی، کامریڈ چکرورتی نے اسے سہارا دیا۔ وہ اٹھا اور دونوں چلتے ہوئے دروازے تک پہنچے۔ اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ اچانک وہ رکا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

" او کے کامریڈ چکرورتی۔ تو پھر طے ہے۔"

" بالکل طے ہے۔" کہ ہم جھکیں گے نہیں۔"

" بالکل نہیں۔"

" کسی ڈر کے سامنے، کسی لالچ کے سامنے۔"

" بالکل نہیں، بس طے ہو گیا نا"

" ہم شمال مغرب کے لوگ بڑے دل دار۔ بڑے وفادار، بڑے ایمان دار....

" یس آئی نو۔ اینڈ مسلم کلچر......"

" تو پھر لال سلام"

" ہاں، لال سلام۔"

آفتاب نے باہر نکلنے سے پہلے آخری نظر کمرے پر ڈالی۔ اسے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ کامریڈ چکرورتی کے ٹیلی فون انسٹرومنٹ کا رنگ لال ہے۔ اور اسی ٹیلیفون سے اس کے لئے ٹیکسی منگوائی گئی تھی۔ وہ بہت خوش ہوا، مسکرایا"

" تھینک یو ویری مچ کامریڈ۔" آفتاب نے اپنا گھونسہ اوپر اٹھا کر کہا

" یو آر ویل کم" چکرورتی نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

" تو پھر طے....."

"وہ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ سب طرف اندھیرا تھا۔
اپنے ساتھ پیدا ہونے والی زندگی کو بانہوں میں سمیٹ کر سمندر میں دبک گیا تھا
شی تھی اور ہر چیز اونگھتی ہوئی لگ رہی تھی۔ ٹیکسی کی رفتار بڑی متوازن تھی
لگا جیسے وہ چل نہیں رہی ہے ایک جگہ رکی ہوئی ہے۔ جیسے ہوا میں معلق ہو۔
بلی کے کھمبے خوف زدگی کے عالم میں سروں پر ہاتھ رکھے پیچھے بھاگے جا رہے
اچانک سڑک، عمارتیں اور کھمبے بہت پیچھے رہ گئے۔ نشہ کی وجہ سے اسے
آ گئی......"

"ماٹ پتا میرے، شرن گھوں کس کی۔ "گنے گھڑیال تالیاں"....
ٹیکسی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ آفتاب نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں
سے پہلے کہ اس ویرانے میں ٹیکسی روکنے کی وجہ ڈرائیور سے دریافت کرتا۔
کو کچھ سایوں نے گھیر لیا۔ چاروں دروازے ایک ساتھ کھلے۔ کسی نے ڈرائیور
ہٹ کر باہر نکالا اور دور اچھال دیا۔
پھر کچھ بانہیں پچھلی سیٹ کی طرف لپکیں۔ کچھ ہاتھوں نے اسے دبوچ کر باہر کھینچ
بالکل سنبھل نہیں پایا تھا۔ کرکے بعد دیگرے چاقو کا چمکتا ہوا بلیڈ کئی بار اس
میں گھسا اور فضا میں چمکا۔ پھر اسے لگا کہ وہ کسی سیال سے تر بتر ہوتا جا رہا ہے
مدی اس کے جسم میں اچانک رواں دواں محسوس ہونے لگی۔ ایک عجیب لذت
س کا سارا وجود بھر گیا تھا۔ پھر ایک تیز قسم کا درد یہاں سے وہاں تک اس کے سارے
یا تڑپ بن کر دوڑ گیا
وہ کانپا۔ لڑکھڑایا اور پھر نڈھال ہو کر زمین پر گر گیا۔
"کیا خیال ہے؟" اندھیرے میں ایک گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔ کیا مر گیا ہے؟"
نہیں مرا، تو مر جائے گا۔" دوسری آواز سنائی دی۔
"کیا بس اتنا ہی؟"
"آؤ چلیں۔"
"کیا اتنا کافی ہوگا؟"
"ہاں کافی ہے۔"
"اور اب...؟
کچھ نہیں یہ تو معمولی مار پیٹ ہے اگر مرے گا تو اپنی کمزوری کی وجہ سے۔"
سب نے قہقہہ لگایا۔ پھر ان آوازوں اور قہقہوں کے ساتھ ہی بہت سے
ں کی آواز ابھری اور آہستہ آہستہ دور ہوتے ہوتے گم ہو گئی۔
فر... فر... فر... فر...
"ٹھیک یہی بیان ٹیکسی ڈرائیور کا بھی ہے۔" سب انسپکٹر نے آفتاب کو بتایا۔

"کیا آپ کامریڈ ملکر ورتی سے مل چکے ہیں۔؟"
"کامریڈ ملکر ورتی اور بہت سے دوسرے ٹریڈ یونین لیڈرز گرفتار کر لئے
گئے ہیں۔"
"کیوں؟"
"آپ پر قاتلانہ حملے کے بعد تناؤ بہت بڑھ گیا تھا۔ ویسے آپ کے خیال میں
حملہ آور کون ہو سکتے ہیں۔ کوئی رقیب یونین کے لوگ۔؟"
یہ میں کیسے کہہ سکتا ہوں۔ اندھیرے۔ نشے اور اس اچانک حملہ کی وجہ سے میں
کسی کو ٹھیک سے دیکھ ہی نہیں سکا تھا۔"
اوہ! بہت بہت شکریہ کامریڈ آفتاب۔ میرے لائق کوئی خدمت؟"
"شکریہ"
"نرس۔ ڈاکٹر سے کہو۔ ان کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔"
"اوکے سر۔" نرس نے کہا اور پھر سامنے آ کر بولی۔ "گرم دودھ لاؤں؟"
اس نے کرتے کا پلو کھینچ کر اوپر اٹھایا۔ ——————
—————— اور گرم گرم سڈول چھاتی نکال کر اس کے منہ میں دے دی۔
وہ اپنی زبان اور تالو میں چھاتی کی گھنڈی لے کر آہستہ آہستہ چوسنے لگا۔ اس نے
اپنی پوری آنکھیں کھول کر دیکھا۔ گورا چٹا چہرہ نذری مائل آنکھیں جیسے کوئی شفاف جھیل
دو حصوں میں بٹ گئی ہو۔ ستواں ناک، پتلے پتلے گلابی ہونٹ، لمبے بھورے بال ماتھے
پر بکھرے ہوئے اور چہرے پر فرشتوں جیسی مسکراہٹ پھیلی ہوئی۔
"بہت بھوک لگی تھی میرے لال کو؟" پیار سے اسے اپنے سینے کے ساتھ
بھینچ کر اس نے پوچھا۔ اس نے اپنی آنکھیں اس چہرے پر جما دیں۔ وہ سارا جسم آ
اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔ اسے راحت کا عجیب احساس ہوا۔ اپنے ننھے ننھے ہاتھ
پاؤں مارنے لگا۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے اس کا ننھا منا، گول مٹول چہرہ
اپنے گداز ہاتھ سے پونچھا۔ اس کی پیٹھ کو ذرا سا ٹھونکا اور پھر اپنی مترنم آواز
سے کہا۔ اچھا اب میں نماز پڑھ لوں۔
اس نے جواب میں ویسے ہی ہاتھ پاؤں مارے۔ ذرا مسکرایا۔ اور پھر
کھلکھلا کر ہنس دیا۔ اس نے جھک کر اس کا منہ چوم لیا۔ وہ اسے جاتے ہوئے
دیکھتا رہا۔ وہ اسے ازل سے دیکھ رہا تھا۔ ازل کب تھا؟ وہ کیا جانے؟ ایک ننھا
سا بچہ کیا جان سکتا ہے ازل اور ابد...... پھر اس نے دل ہی دل میں سوچا
آخر اس کا کیا ہے؟ اسے کوئی جواب نہ ملا۔ تو وہ بے ساختہ پکار اٹھا۔ ماں....
ماں....! "وہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اور بے ساختہ ہاتھ پاؤں مارنے لگا
اس نے دیکھا اس کی ماں آنگن میں بیٹھی وضو کر رہی ہے۔ وہیں جہاں گڑھے
میں جمع پانی میں روہنی چڑیا نہا رہی تھی۔ پھر اس نے اپنے سر کو اچھی طرح ڈھانپ

لیا ہے۔ اور پھر اندازاً کر قبلہ رو مقام بچھایا ہے۔ اور اس پر نیت باندھ کر نماز پڑھنے لگے ہے..........

..... آفتاب نے نرس کے ہاتھ سے گرم گرم دودھ کا گلاس لیا اور ایک ایک گھونٹ پینے لگا۔ سارا دن اس کی یونین کے ممبر اس کی عیادت کے لئے آتے رہے۔ وہ خوش تھے۔ کامریڈ آفتاب صحیح سلامت ہے۔ وہ مسکرا کر ان کی باتوں کا جواب دیتا رہا۔ مگر خود حیران تھا۔ کہ اس پر حملہ کیوں ہوا۔؟ کس نے کیا؟ اور اس کے پیچھے مقصد کیا تھا۔؟

پھر رات ہوگئی۔ سب کچھ اونگھنے لگا۔ نرس نے اسے ایک انجکشن لگایا۔ اور وہ آہستہ آہستہ نیند کی آغوش میں ڈوبنے لگا۔

رات خواب میں اس نے کارل مارکس اور کامریڈ لینن کو دیکھا۔ وہ لوگ ایک پارک میں نیچے بنچ پر بیٹھے کسی بہت ہی سنجیدہ بات چیت میں الجھے ہوئے تھے۔ اور بار بار ایک طرف نظریں اٹھا کر دیکھتے تھے۔ شاید انہیں کسی کے آنے کی توقع تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کے قریب گیا تھا۔ مگر انہوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ وہ گفتگو میں بری طرح الجھے ہوئے تھے۔ مسئلہ شاید کوئی بہت اہم تھا۔ اقتصادی، سیاسی یا سماجی! اس نے ایک دو بار جرأت کر کے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی کوشش بھی کی مگر اسے ناکامی ہوئی۔ وہ ان سے صرف اتنا پوچھنا چاہتا تھا۔ "کیا سوشلزم انسان کا آخری ماحصل اور ذریعہ نجات ہے؟"

"ہری ہر ہری ہر ہری ہر ہری" میری بار کیوں دیر اتنی کری۔" کوئی بہت ہی دل گداز لے میں گا رہا تھا۔ یہ آواز اس کی سماعت کے لئے مانوس تھی۔ یہ آواز وہ کئی بار سن چکا تھا۔ یہ آواز نکالنے والا چہرہ بڑا مہربان اور مشفق تھا۔ گھنی سیاہ مونچھوں میں سے قدرے گداز ہونٹ ہلتے لگتے تھے۔ بیضوی سرخ و سفید چہرہ تھا جس پر بڑی چمکدار چھوٹی چھوٹی آنکھیں تھیں۔ صاف شفاف لگتا تھا ان میں سے جھانک کر اندر دیکھا جا سکتا ہے۔ پیشانی پر تین سلوٹیں تھیں۔ سر پر چھوٹے چھوٹے بال، بائیں جانب کو سیدھی مانگ نکلی ہوئی۔ ہلکے سندوری رنگ کی ریشمیں لانگ والی دھوتی سے سارا بدن لپٹا ہوا تھا۔ چندن کے رنگ کا جسم لیٹے ہوئے ہونے کے باوجود دمکتا ہوا لگتا تھا۔ فضا میں اگر اور لوبان کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ باہر ابھی اندھیرا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں چھوٹا سا مندر تھا۔ جس میں گھی کی جوت جل رہی تھی۔ دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں گلے میں پھول مالائیں پہنے ہوئی تھیں۔ جوت کی ناچتی ہوئی روشنی کمرے کے محدود دائرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا والد اس کی طرف پیٹھ کئے بیٹھا پوجا کر رہا تھا۔ اور بڑی دلگداز لے میں آرتی گا رہا تھا۔

ہری، ہر، ہری، ہر، ہری، ہر، ہری۔ میری بار کیوں دیر اتنی کری۔!!

اسے یہ سب بہت پر اسرار لگ رہا تھا۔ وہ اپنی ماں کے پہلو میں لیٹا ہوا تھا۔ وہ گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا ننھا ہاتھ بڑھا کر اس کی چھاتیاں ٹٹولنا شروع کیا۔

آرتی ختم کرنے کے بعد اس کا باپ اٹھا۔ کمرے میں کھڑاویں پہن کر چلنے کی آواز سنائی دی۔ اور پھر اس کا باپ ان دونوں پر آ کر جھکا۔ اس کے ہاتھوں میں پوجا کے جل کا تانبے کا چمکتا ہوا برتن تھا۔ اس نے اس برتن میں انگلیاں ڈبو کر ان دونوں پر امرت کے چھینٹے دیئے۔ دونوں ہڑبڑا سے گئے۔ اس کی ماں نے آنکھیں کھول کر اس کے باپ کو دیکھا۔

"پوجا ختم ہوگئی؟"

"ہاں۔ اٹھو نہا لو۔ بس اذان ہونے ہی والی ہوگی۔"

اذان کی آواز کہیں بہت دور سے آ رہی تھی۔ "اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر" وہ اپنے پلنگ سے اٹھا۔ آج چار دن کے بعد وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ مریضوں کے پلنگوں کے بیچ میں سے گزر کر کھڑکی تک پہنچا۔ اس نے کھڑکی کے فریم پر اپنی دونوں ہتھیلیاں ٹکا دیں اور باہر دیکھنے لگا۔ وسیع و عریض ہسپتال کی عمارت کے ارد گرد لوگوں کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ مشرق کی جانب جدھر سورج آسمان پر چمک رہا تھا۔ اسی سمت بہت دور کسی مسجد کے مینار نظر آ رہے تھے۔

بقیہ صفحہ ۱۵ دیواروں کے بیچ۔

بہن کو سامان باندھتے دیکھتے ہیں تو اداس ہو کر خاموشی سے باہر نکل جاتے ہیں۔ لیکن آخر کار وہ مجبور ہو جاتے ہیں۔ انہیں واپس جانا پڑتا ہے۔ دیار جا کر ان کی تندرستی پھر سے خراب ہونے لگتی ہے۔ اور پھر خبر آتی ہے۔ وہ گڈو کو اسکول کی ایک سڑک کراس کرتے ہوئے دیکھ کر اس کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ اور گر کر ذیل ٹرک کے ساتھ، کچھ دن زندگی کا عذاب جھیل کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتے ہیں۔ مرتضیٰ حسن کی موت کے بعد، مدا کی گھر کی وہ خواہش ختم ہو جاتی ہے جو کئی برسوں سے اسے بھٹکا رہی ہے۔

گھر کو کھوجیں رات دن گھر سے نکلے پاؤں وہ رستہ ہی کھو گیا جس رستے تھا گاؤں

(جاری)



غوث محمد غوثی

خود سے بھی کچھ ایسا ہے بشر کا رشتہ
ہے پرواز سے ٹوٹے ہوئے پر کا رشتہ

کھڑکی بھی نہیں اب تو، جو باقی رکھتی
ے گھر سے مرے ہمسائے کے گھر کا رشتہ

رشتے ہی سہی نظریں نہ بدلو یارو
فرشتوں سے نہیں کوئی بشر کا رشتہ

آنے دو، ابھی سامنے آجائے گا
بلے آپس میں شریکانِ سفر کا رشتہ

رے چاکِ گریباں کو نیا سورج دے
ؤں میں دھندلکوں سے سحر کا رشتہ

رے ہاتھوں کی لکیریں یہ بتاتی ہیں مجھے
قدموں ہی سے رہیگا مرے سر کا رشتہ

سب کے چہرے بھی خراشیں ہیں نظر میں غوثی
گوں سے ہے دلِ آئینہ گر کا رشتہ

سرائے رحمن علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ - یوپی



طلحہ رضوی برق

نو گرفتاروں کو سرگرم فغاں ہونے تو دو
ٹوٹ جائیں گی قفس کی تیلیاں ہونے تو دو

دردِ دل کو داستاں در داستاں ہونے تو دو
شہرِ قاتل میں ذرا امن و اماں ہونے تو دو

میری آہ نیم شب منزل نمائے شوق ہے
نالۂ دل کو رحیلِ کارواں ہونے تو دو

اور بھی ناقدردانی ہنر یاد آئے گی
ہمنشینوں کو ملالِ رفتگاں ہونے تو دو

دل ادھر مائل ہوا ہی تھا کہ وحشت بڑھ گئی
اس کی چاہت کو ذرا آتش بجاں ہونے تو دو

خانۂ بے رنگ بھی ہے شیشۂ صد رنگ بھی
دل کو پہلے بے نیازِ این و آں ہونے تو دو

اندمالِ زخمہائے معصیت مقسوم ہے
مدحتِ محبوب ﷺ میں رطب اللساں ہونے تو دو

سرخیٔ خونِ تمنا آبروئے عشق ہے
آرزوؤں کا لہو رنگ بیاں ہونے تو دو

آنکھ کھل جائیگی طوطے ہاتھ کے اُڑ جائینگے
تیل کی دولت بدستِ دیگراں ہونے تو دو

ہے نہاں مشقِ سخن میں فکر و فن اوجِ سخن
ہاں زمینِ شعر کو برق آسماں ہونے تو دو

● دانا پور کینٹ پٹنہ (بہار)



نور تقی نور

شہر ہے اپنا شہرِ نگاراں پھول سے پیکر چلتے ہیں
شہر کو جب غصہ آتا ہے چھُرا خنجر چلتے ہیں

لوگ سمجھتے ہیں بیچارا مارا مارا پھرتا ہے
ساتھ ہمارے صف باندھے یادوں کے لشکر چلتے ہیں

جس کو ملنا ہو آجائے رکنا اپنا کام نہیں
ہم تو یوں چلتے ہیں میاں جیسے فلم کے منظر چلتے ہیں

انساں کو بے ادب نہ سمجھیں یہ تو ان کی فطرت ہے
غیرتمند انساں ہیں اکثر سر کو اٹھا کر چلتے ہیں

سانسوں کی اے نور ہمیں تو پوری کرنی ہے منزل
جاگتے جائیں یا سو جائیں ہم تو برابر چلتے ہیں

● اردو بھون، صابن گراں، میرٹھ (یوپی)



اختر واصف
ای۔ ایس۔ آئی۔ کارپوریشن، بیلی روڈ، پٹنہ۔ ۱

ھاتھ

وہ حادثہ مشتاق صاحب کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔

مشتاق صاحب دفتر آنے کے بعد پہلے راؤنڈ کی چائے پینے نکلے تھے۔ ان کے ساتھ اور بھی کئی لوگ تھے وہ سب دفتر کے سامنے والے چائے خانے میں بیٹھے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ آج کا اخبار ٹیبل پر رکھا تھا۔ تازہ خبروں اور حالات حاضرہ پر تبصرہ جاری تھا....

مسافروں سے لدی بس ندی میں گر گئی

پنجاب میں دو اور مرے

بینک میں ڈاکا۔ تین زخمی

مشتاق صاحب اپنی چائے ختم کرنے کے بعد عینک اتار کر اسے صاف کرنے میں مشغول تھے۔ یہ انکی پرانی عادت تھی۔ وہ جب بھی خالی ہوتے اپنی عینک اتار کر صاف کرنے لگ جاتے۔ بار بار عینک پر منہ سے بھاپ دیتے، صاف کرتے، اوپر اٹھا کر روشنی میں غور سے دیکھتے اور دوبارہ کرنے میں لگ جاتے۔

وہ کوئی غیر معمولی حادثہ نہیں تھا۔ ایسے حادثے آئے دن شہر میں ہوتے ہی رہتے ہیں اور اخبار والے خالی جگہوں کو پُر کرنے کے لیے انکی خبریں چھاپ بھی دیتے ہیں لیکن کس کو اتنی فرصت ہے انہیں پڑھے بھی۔ مشتاق صاحب نے اپنی چالیس سالہ زندگی میں سینکڑوں حادثات کے بارے میں سنا تھا، پچیسیوں حادثات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے لیکن بیشتر اپنے دفتر کی کھڑکی سے۔ پتہ نہیں کتنی بار ایسا ہوا تھا کہ سڑک سے لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آئیں، ایک بے ہنگم شور سنائی پڑتا تو وہ کام کرتے کرتے اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑے ہوتے اور سامنے والی کھڑکی کا پٹ کھول دیتے تو دیکھتے کہ ایک گاڑی ترچھی ہو کر پول سے ٹکرا گئی ہے یا بیچ سڑک پر کوئی رکشہ الٹا ہوا ہے یا کسی ٹمپو والے نے کسی سائیکل سوار کو دھکا مار دیا ہے یا کوئی تانگہ..... اس وقت مشتاق صاحب کے نزدیک کوئی اور موجود ہوتا تو وہ فاسٹ ڈرائیونگ کرنے والوں پر سخت تنقید کرتے اور اپنے شہر کے اَن پلانڈ ہونے پر افسوس کرتے ہوئے اپنی سیٹ پر جا بیٹھتے۔ تھوڑی دیر تک کمرے کی چھت پر نگاہیں جمائے عینک صاف کرتے رہتے پھر اسے پہن کر اپنے کام میں لگ جاتے اور شام تک انھیں یاد بھی نہیں رہتا کہ آج کوئی حادثہ بھی ہوا تھا۔

لیکن آج کا حادثہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا، بالکل ان کے قریب۔ ایک تیز رفتار جیپ نے سامنے سے آتی ہوئی گاڑی سے بچنے کے لیے اسٹیرنگ گھمایا تو اس کا پچھلا حصہ بغل سے گزرتے ہوئے اسکوٹر سے ٹکرایا اور اس کا توازن بگڑ گیا۔ اسکوٹر ترچھا ہو کر وہیں سڑک پر الٹ گیا اور اس پر بیٹھا شخص قلابازیاں کھاتا ہوا بالکل چائے خانے کے پاس آگرا۔ اس کا ہلمٹ دور جا پڑا اور اس کا سر سڑک کے کنارے پڑے ہوئے ایک پتھر سے ٹکرایا۔ جیپ کے بریک چرچرائے۔ وہ ایک لمحہ کو رکی لیکن ڈرائیو کرنے والے نے جیسے ہی لوگوں کا شور سنا ایکسیلیٹر پر پوری قوت صرف کر دی اور جیپ لہراتی ہوئی تیز رفتاری سے غائب ہو گئی۔

وہاں ایک ہنگامہ مچ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے لوگ زخمی اسکوٹر والے کے گرد جمع ہو گئے۔ اسکوٹر والا چت پڑا تھا اور اس کے منہ سے تیزی سے خون آرہا تھا۔ تبھی کسی نے چیخ کر کہا

کسی گاڑی والے کو روکو....... اسے اسپتال بھیجو۔

کئی لوگ سڑک کی طرف دوڑے اور سامنے سے آتی ہوئی ایک گاڑی کو رکنے کا اشارہ کرنے لگے۔ گاڑی رکی لیکن گاڑی والے نے جیسے ہی زمین پر پڑے ہوئے خون آلود شخص کو دیکھا، گاڑی تیزی سے آگے بڑھا دی اور نکلتا چلا گیا۔ کئی لوگ اس کے پیچھے دوڑے اور زور زور سے گالیاں بھی بکیں۔ لیکن گاڑی جا چکی تھی۔ تبھی ایک خالی رکشے والا کسی طرف آ نکلا اور لوگوں نے اسے روک لیا۔ اس بیچ لیڈر نما حضرت بھی کہیں سے آ پہنچے تھے۔ رکشے والا تھوڑا سا ہچکچا رہا تھا لیکن انہوں نے اتنی زور سے ڈانٹ پلائی کہ بیچارہ سٹ پٹا کر رہ گیا۔

مشتاق صاحب کا دل بھی اسکوٹر والے شخص کی حالت دیکھ کر بھر آیا تھا
ں بھی وہ بیچارے شریف آدمی تھے۔ دوسروں کو مصیبت میں دیکھ کر گھبرا
بانے والے اور خون دیکھ کر تو بیچارے کے حواس گم ہونے لگتے تھے۔ انھوں
نے خود کو کسی طرح سنبھالا اور اسکوٹر والے کی مدد کرنے میں جٹ گئے۔ پہلا
سئلہ زخمی شخص کو رکشے پر سوار کرنے کا تھا۔ ان تین اشخاص میں، جو اسے
ٹھا کر رکشے تک لے گئے مشتاق صاحب بھی شامل تھے۔ کسی طرح اسے رکشے
ڈالا گیا۔ ان تمام معاملات میں لیڈر نما حضرت پیش پیش تھے اور مسلسل
وسروں کو ہدایتیں دیتے جا رہے تھے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اس کے ساتھ
سپتال کون جائے تبھی لیڈر نما حضرت نے بھیڑ میں کھڑے ایک شخص کی جانب
شارہ کیا۔۔۔ "آپ چلے جائیے بھائی" "نہیں بھائی، نہیں" وہ شخص
ھبرا کر بولا "مجھے بہت ضروری کام ہے" اور گھوم کر بھیڑ سے باہر نکل گیا۔ لیڈر نما
حضرت نے ایک دوسرے شخص کو تاکا۔۔۔ "بھائی جان" آپ چلے جائیے نا
" لیکن وہ شخص دوسرے مزاج کا نکلا اور انہیں پر الٹ پڑا۔۔۔ "آپ
خود کیوں نہیں چلے جاتے؟" لیڈر نما حضرت بُرا سا منہ بنا کر دوسری طرف
یکھنے لگے پھر زور سے بڑبڑائے۔۔۔ "بھلائی کا زمانہ ہی نہیں رہا"

مشتاق صاحب وہیں بھیڑ میں کھڑے یہ ماجرا دیکھ رہے تھے۔ انہیں
لگا کہ یہ معاملہ ایسے ہی چلتا رہا تو شاید ہاسپٹل پہنچنے سے قبل ہی اس بیچارے
کی روح پرواز کر جائے گی اور وہ لپک کر رکشے پر سوار ہونے ہی جا
رہے تھے کہ کسی نے پیچھے سے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔۔۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ وہ راستے میں ہی ختم ہو گیا تو۔۔۔ پولس
تھانہ، کچہری۔۔۔ کیا آپ کے پاس فاضل پیسے ہیں؟؟"

مشتاق صاحب اپنی عرق آلود پیشانی پونچھتے ہوئے بھیڑ سے باہر
نکل آئے۔ تبھی انہیں یاد آیا کہ وہ اپنا چشمہ چائے کی دوکان ہی میں چھوڑ
آئے ہیں۔ وہ لپکتے ہوئے وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ان کا چشمہ وہیں ٹیبل پر
پڑا ہے۔ انہوں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس جھگڑے سے بچ گئے
ورنہ چشمہ بھی ہاتھ سے جاتا اور جو پریشانی اٹھانی پڑتی سو الگ۔ انہوں نے
جلدی سے اسے میز پر سے اٹھایا اور بے ساختہ اس کا شیشہ صاف کرنے لگے۔

مشتاق صاحب کے ساتھ پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا تھا۔ ایک بار
ابال بال بچے تھے سردی کا زمانہ تھا وہ دفتر سے واپس آ رہے تھے۔ ایک
سڑک پر چھوٹی سی بھیڑ اکٹھا تھی اور اس بھیڑ سے کچھ دور دو تین
غنڈے ایک شخص کو بری طرح زدوکوب کر رہے تھے۔ پاس میں ایک جیپ
کھڑی تھی۔ شاید وہ لوگ اسے جیپ میں بٹھانا چاہ رہے تھے لیکن اکیلا
شخص بری طرح زخمی ہونے کے باوجود جیپ میں بیٹھنے کو تیار نہیں تھا۔
تبھی مشتاق صاحب کی بغل میں کھڑے ایک شخص نے پھسپھسا کر اپنے
ساتھی سے کہا تھا۔۔۔ "گیا بے چارہ کام سے۔۔۔"

"ہاں! کہیں دور لے جا کر مار ڈالیں گے اور۔۔۔" دوسرا شخص
بھی دھیرے سے بولا تھا۔

"کتنا آسان ہو گیا ہے یہ سب کچھ۔۔۔" ایک اور شخص بڑبڑایا
تھا۔

مشتاق صاحب کا خون اچانک کھولنے لگا تھا۔ شاید جوش
میں ایک دو قدم وہ آگے بھی بڑھے تھے۔ تبھی کسی نے پیچھے سے ان کا
ہاتھ پکڑ لیا تھا۔۔۔ "مشتاق صاحب، یہ کیا کر رہے ہیں۔۔۔ کیا آپ
بھی اس شخص کی طرح۔۔۔"

اور تب مشتاق صاحب کو ہوش آیا تھا اور وہ اپنا پسینے سے
تر چہرہ پونچھتے ہوئے بغیر یہ دیکھے کہ اس اکیلے شخص کا کیا ہوا اپنے گھر
کی طرف چل پڑے تھے۔ اس دن اپنی بے بسی پر ان کا دل تڑپ اٹھا تھا
لیکن وہ کر بھی کیا سکتے تھے ان کے بدن میں تو اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ
کسی بچے ہی سے لڑ جاتے، پھر وہ تین تھے اور ان کی پشت پر نہ جانے
کتنے ہوں گے۔ تین سو بھی ہو سکتے ہیں اور تین ہزار بھی۔ وہ اکیلے کیا
کر لیتے؟

بھیڑ دھیرے دھیرے چھٹ رہی تھی۔ اس بیچ لیڈر نما حضرت
نے میلے کچیلے کپڑے پہنے ایک شخص کو رکشے پر بٹھا دیا تھا جو زخمی شخص کو
سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ صورت سے ہی کچھ بیوقوف سا لگ رہا تھا۔
مشتاق صاحب نے ایک بار پھر خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ بچ گئے ورنہ اس
چکر میں پڑ گئے ہوتے تو خدا جانے چھوٹی بڑی کتنی مصیبتیں جھیلنی پڑتیں
روپے پیسے کا جو زیاں ہوتا وہ الگ۔

مشتاق صاحب کے دفتر کے ساتھی جو اب تک بھیڑ میں گھسے
تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اب آپس میں گفتگو کرتے ہوئے ان ہی کی طرف آ رہے تھے
۔۔۔ مشتاق صاحب انہیں دیکھ کر کچھ کہنے ہی والے
تھے کہ ان میں سے ایک نے ان کے کرتے کے دامن کی طرف اشارہ کرتے
ہوئے کہا۔۔۔ "مشتاق بھائی، یہ کیا؟"

انہوں نے جھک کر دیکھا تو ان کے کرتے کے دامن پر خون کا ایک
بڑا سا دھبہ لگا ہوا تھا۔۔۔ "اس پر جلدی پانی ڈالیے نہیں تو داغ
رہ جائے گا۔"

انہوں نے چائے والے سے ایک جگ پانی لیا اور اپنے ایک ساتھی کی مدد سے کرتے کے دامن کو خوب رگڑ رگڑ کر دھویا پھر بھی جہاں خون لگا تھا ایک بدنما سا داغ رہ ہی گیا۔

مشتاق صاحب دفتر لوٹ آئے اور کافی دیر تک وہاں اس حادثے پر تبصرہ ہوتا رہا۔ مشتاق صاحب بھی اس گفتگو میں شامل رہے اور انہیں کئی بار اس واقعے کو دہرانا پڑا کیونکہ وہ اس کے عینی شاہد تھے۔ آخر کافی دیر کی بحث و تمحیث کے بعد یہ سلسلہ ٹوٹا تو انہوں نے اپنے کام کی طرف توجہ دی۔ لیکن معلوم نہیں کیوں ان کا دل کام کی طرف بالکل مائل نہیں ہوا۔ انہیں لگا کہ ان کے اندر، بہت اندر کوئی معاملہ چل رہا ہے اور ایک خلش سی ان کے اندر جنم لے رہی ہے لیکن وہ ٹھیک سے طے نہیں کر پائے کہ ایسا کیوں ہے۔ انہوں نے دوبارہ خود کو کام میں مشغول کرنے کی کوشش کی اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ پھر بھی کام کرتے کرتے کئی بار ایسا ہوا کہ اس حادثے کا کوئی نہ کوئی ٹکڑا فائل کے اوراق سے نکل پڑا اور انہیں تھوڑی دیر کے لیے بے چین کر گیا۔ اس بیچ ان کے دفتر کے دو آدمی اور آ پہنچے۔ ان دونوں نے بھی اس حادثے کے بارے میں سنا تھا اور مفصل حالات جاننے کی غرض سے ان کے پاس آئے تھے۔ مشتاق صاحب نے ایک بار پھر انہیں حادثے کی روداد سنائی اپنے کرتے کا دامن دکھایا جس پر خون کا دھبہ لگ گیا تھا اور اخیر میں انہوں نے کہا—— "بھائی میرا تو دل چاہا کہ اس کے ساتھ ہاسپٹل چلا جاؤں لیکن بعد میں ارادہ بدل دیا کہ کون اس بکھیڑے میں پڑے...!!"

"آپ نے بالکل ٹھیک کیا" دونوں بیک وقت بولے "آج کل ان جھگڑوں میں تو پڑنا ہی نہیں چاہیے اسے کچھ ہو جاتا تو آپ بیکار کی پریشانی میں پڑ جاتے"

وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے اور مشتاق صاحب کافی دیر تک اپنا چشمہ صاف کرتے اور چھت کو گھورتے رہے۔ وہ حادثہ بار بار ان کی آنکھوں کے سامنے ایک بے ترتیب صورت میں رونما ہوتا رہا...... کبھی وہ دیکھتے کہ ایک بیوقوف سا شخص اسکوٹر والے کو تھامے ہوئے ہے اور رکشا ہاسپٹل کی طرف جا رہا ہے، کبھی جیپ کے بریک زور سے چیختے...... کبھی دیکھتے کہ اسکوٹر والا زمین پر پڑا ہے اور اس کے منہ سے خون آ رہا ہے... اور تبھی ان کے اندر سے کوئی اچانک بول پڑا—— "مشتاق صاحب، یہ آپ نے اچھا نہیں کیا"

"نہیں نہیں، میں نے بہت صحیح قدم اٹھایا" مشتاق صاحب نے خود کو سمجھایا لیکن ان کے دل میں جانے کب کی سوئی ہوئی ایک چبھن جو تھی اور انہیں پریشان کر رہی تھی۔ وہ بار بار خود سے کہتے—— "میرا فیصلہ نہایت دانشمندانہ تھا...... میں نے بالکل ٹھیک کیا" لیکن پتہ نہیں کیا چبھن انہیں مسلسل اضطراب میں مبتلا کیے ہوئی تھی......

اور شام کے وقت جب وہ گھر جانے کے لیے اٹھ رہے تھے ان کی نگاہ کرتے کے دامن پر جا پڑی تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں تاز ایک بڑا سا دھبہ لگا ہوا ہے۔ وہ گھبرا کر اٹھے اور ہاتھ روم میں کا دامن دھونے لگے۔ پھر وہاں سے باہر آئے تو ان کے ایک ساتھی ہوئے کرتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ ایسے نہیں جائے اسے لانڈری میں دے دیجیے!"

مشتاق صاحب گھر پہنچے تو ان کی بیگم کی نگاہ سب سے پہلا کی طرف گئی لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں مشتاق صاحب جلدی حادثے کی روداد سنانے لگے اور ابھی وہ اسی مقام تک پہنچے تھے کہ کر رکشے پر سوار ہونے جا رہے تھے کہ ان کی بیوی چیخ پڑیں—— ہسپتال چلے گئے؟"

"نہیں بھئی، نہیں۔ تم سنو تو سہی" مشتاق صاحب بولے "ہم یہ حماقت ہونے ہی والی تھی لیکن کسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بھیڑ آیا۔"

"خدا بھلا کرے اس نیک شخص کا، یعنی تو بھی کہ...... و رکشے تک بھی اسے اٹھا کر لے جانے کی کیا ضرورت تھی، کیا دوسرا تھے...... اب یہ کرتا اتار دیجیے، میں کل دھو دوں گی۔" "نہیں نہیں یہ داغ ایسے نہیں جائے گا۔ میں اسے لانڈری میں دے دوں گا"

مشتاق صاحب نے کرتا اتارا اور اخبار میں لپیٹ کر ر منہ ہاتھ دھو کر شام کی چائے پینے بیٹھے۔ بیگم کو حادثے کی روداد ان کا تبصرہ سننے کے بعد انہیں قدرے اطمینان ہو گیا تھا لیکن تھو بعد وہ چبھن دوبارہ جاگ اٹھی اور وہ بے چینی محسوس کرنے لگے ان کے اندر سے پھر بول پڑا—— "مشتاق صاحب، آپ نے......؟"

"نہیں نہیں، میں نے بالکل ٹھیک کیا" مشتاق صاحب نے اور دل ہی دل میں دیر تک اس جملے کو دہراتے رہے۔ خود کو قائل کر لیکن وہ خلش جوں کی توں موجود تھی۔

مشتاق صاحب رات میں بھی پریشان رہے۔ بار بار خواہ حادثے کو رونما ہوتے دیکھتے اور چونک کر جاگ جاتے۔ دو سر

انھوں نے دُھلا ہوا کرتا پاجامہ پہنا اور دفتر کی طرف روانہ ہوئے۔ لیکن ابھی وہ بیچ راستے ہی میں تھے کہ اچانک ان کی نگاہ کرتے کے دامن کی طرف چلی گئی اور وہ بدحواس ہو اٹھے۔ وہاں پر تازہ تازہ خون کا ایک بڑا سا دھبّہ نمایاں تھا۔ انھوں نے جلدی سے اپنا چشمہ اتارا، صاف کیا اور پہن کر غور سے کرتے کے دامن کی طرف دیکھا تو وہاں سے خون کا دھبّہ غائب ہو چکا تھا۔ "لاحول ولا قوۃ ..... شاید یہ رات کی بے خوابی کا اثر ہے....." وہ دھیرے سے بڑبڑائے لیکن وہ اس چبھن کا کیا کرتے جو پھر سے ان کے اندر جاگ اٹھی تھی۔

تب جانے کیسے ان کے قدم دفتر کی طرف جاتے جاتے ہاسپٹل کی طرف مڑ گئے — "ایک بار اسے دیکھ لینا چاہئے..... ایک بار دیکھ لینے میں حرج ہی کیا ہے" وہ خود کو سمجھاتے ہوئے ایمرجنسی وارڈ میں داخل ہوئے۔ وہاں برآمدے میں ایک نوجوان شخص بیٹھا ہوا تھا جس کی آستین خون سے تر تھی اور ایک نرس انجکشن لگا رہی تھی۔ دوسری طرف ایک اسٹریچر پر ایک لاش رکھی تھی، سر سے پیر تک سفید چادر سے ڈھکی ہوئی۔ مشتاق صاحب نے اسے دیکھا تو ایک لمحے کے لیے ان کی سانس رک سی گئی۔ اور ان کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا — "نہیں نہیں، کوئی ضروری نہیں کہ یہ وہی ہو..... وہ مرا نہیں ہوگا....."

وہ خود کو تسلّی دیتے ہوئے ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہاں ایک میز اور کرسی لگی تھی جس پر ایک ڈاکٹر گلے میں استھسکوپ لٹکائے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایک رجسٹر رکھا تھا جس میں وہ کچھ اندراج کر رہا تھا۔ دوسری طرف رکھی کرسیوں پر تین ڈاکٹر بیٹھے شاید آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ مشتاق صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو وہ لوگ اچانک چپ ہو گئے۔ مشتاق صاحب میز کے پیچھے بیٹھے ڈاکٹر کے سامنے رک گئے۔ ڈاکٹر نے نظر اٹھائی اور ناگواری سے سا تھ ان کی طرف دیکھا پھر نہایت سپاٹ اور کرخت لہجے میں بولا — "کیا ہے.....؟"

مشتاق صاحب کو شاید ایسے لہجے کی امید نہیں تھی اس لیے وہ تھوڑا سا گھبرا گئے۔

"دیکھئے..... وہ..... وہ..... کل بیلی روڈ پر ایک حادثہ..."

"مریض کا نام.....؟" ڈاکٹر نے ویسے ہی سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"نام..... نام تو مجھے معلوم نہیں....."

"کمال ہے..... آپ کو مریض کا نام نہیں معلوم!"

"وہ..... ایسا ہے کہ....."

"ساری..... میں بغیر نام کے کچھ نہیں بتا سکتا" ڈاکٹر نے ویسے ہی کرخت لہجے میں کہا اور جھک کر رجسٹر کے ورق الٹنے لگا۔ مشتاق صاحب ایک لمحے تک کچھ سوچتے رہے پھر واپسی کیلئے مڑے۔ برآمدے میں وہ لاش اب تک رکھی تھی لیکن انھوں نے جان بوجھ کر اس طرف نہیں دیکھا اور سر جھکائے ہاسپٹل سے باہر آگئے۔ وہ بلاوجہ ہی خود کو تسلّی دے رہے تھے — نہیں نہیں وہ مرا نہیں ہوگا..... وہ ضرور بچ جائے گا، اور پھر میں کیا کر سکتا تھا میرے بس میں ہے ہی کیا؟ زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے..... اور اگر اس کی موت ہی لکھی ہوگی تو..... نہیں نہیں، وہ بچ گیا ہوگا..... ضرور بچ گیا، ا....."

وہ دیر تک خود کو سمجھاتے بجھاتے رہے لیکن بار بار ایمرجنسی وارڈ کے برآمدے میں رکھی لاش ان کی نگاہوں کے سامنے آجاتی اور وہ دوبارہ خود کو مطمئن کرنے کی کوشش میں لگ جاتے۔

اس واقعہ کو آہستہ آہستہ کئی ماہ گزر گئے۔ مشتاق صاحب اب تقریباً ٹھیک ہیں حالانکہ اب بھی کبھی کبھی نیند میں وہ کسی گاڑی کے بریک کی چیخ سنتے ہیں یا دفتر میں کام کرتے کرتے اچانک ان کی نگاہ کرتے کے دامن کی طرف چلی جاتی ہے تو انہیں لگتا ہے کہ وہاں خون کا بڑا سا دھبّہ لگا ہوا ہے لیکن لاحول پڑھ کر اپنے کام میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ وہ خلش اور چبھن وقت کے ساتھ مدھم پڑ چکی ہے۔

آج بھی وہ تیز تیز قدموں سے دفتر کی طرف جا رہے تھے کیونکہ گھر سے نکلتے نکلتے کافی دیر ہو چکی تھی کہ اچانک ان کے ارد گرد بھیڑ بڑھ گئی اور ٹرافک جام ہو گیا۔ مشتاق صاحب بچتے بچاتے دھیرے دھیرے آگے بڑھتے رہے کیونکہ ٹرافک کا جام ہونا شہر کے معمولات میں سے ہے۔ کچھ دور آگے آنے کے بعد انھوں نے دیکھا کہ ایک مکان گر پڑا ہے اور ملبے نے آدھی سے زیادہ سڑک کو گھیر لیا ہے اس پر سے سواریوں اور لوگوں کی بھیڑ۔ مشتاق صاحب نے دفتر آتے جاتے اس مکان کو کئی بار دیکھا تھا وہ پرانا اور خستہ حال تھا۔ مشتاق صاحب بھی چیخ و پکار سے بھری ہوئی بھیڑ میں گھس گئے تو انہوں نے دیکھا کہ مکان کا نصف سے زیادہ حصّہ ڈھہ چکا ہے اور تین چار مزدور نما اشخاص ملبہ ہٹانے میں مصروف ہیں۔ تبھی ان کے قریب کھڑے ایک شخص نے کہا — "ایک آدمی دبا ہوا ہے..... پتہ نہیں زندہ ہے کہ مر گیا....."

مشتاق صاحب اضطرابی طور پر آگے بڑھے اور کسی نے پیچھے



کرشن ادیب

تشنگی ہی تشنگی ہے اور صحرا کا عذاب
رقص کرتے ہیں بگولے، سامنے میرے سراب

درد کا احساس کافی، اہلِ دانش کیلئے
آسمانوں سے نہ اُترے گی کوئی تازہ کتاب

شہرِ دل ہے آج سونا، میکدہ بھی بند ہے
کس طرف جائیں کہاں نکلیں ترے خانہ خراب

دل ہمارا آج تک محرومِ شبنم ہی رہا
گو اُمنڈتے ہم نے دیکھے تیری زلفوں کے سحاب

حادثہ بن کر خزاں آنگن میں اُتری تھی مگر
شاخِ دل پر تو مہکتے ہیں وہی کالے گلاب

ہم سے بوڑھے راہیوں کو اچھے لگتے ہیں ادیب
تیری آنکھوں کے صحیفے، تیرے چہرے کی کتاب

ای۔ ۸۹، کچلو نگر، لدھیانہ ۱۴۱۰۰۱



یوسف عثمانی

دل میں تھا پہلے یہ اپنے وہ ملے تو ہم کہیں
مل کے لیکن سوچتے ہیں وہ کہے تو ہم کہیں

خندہ پیشانی پہ الفت کی دھنک تو سج گئی
ابرِ نفرت بھی نگاہوں سے چھٹے تو ہم کہیں

رقص بے ہنگم ہے جاری زندگی کے ساز پر
اک قدم بھی تال پر اس کی پڑے تو ہم کہیں

جلتے رہنا اور جینا بھی بڑی تہذیب ہے
دل ہی کے مانند پروانہ جلے تو ہم کہیں

بے صدا لفظوں سے بھی ہوتی ہے اکثر گفتگو
چشم و دل کے درمیاں ہوں سلسلے تو ہم کہیں

ہر طرف دشتِ محبت میں ہیں تنہائی کے پیڑ
کوئی غنچہ بھی کبھی ان میں کھلے تو ہم کہیں

جادوئی گنبد ہے یوسف یہ حصارِ ذات بھی
خود سے ہٹ کر بھی کوئی صورت دکھے تو ہم کہیں

اجنتا کلینک جے سنگھ پورہ اورنگ آباد مہاراشٹر



قاضی حسن رضا

شکاری نے رکھا ٹھکانہ بلند
ہدف پست قامت نشانہ بلند

یہاں ظلم کی ہیں کمندیں دراز
کہاں تک کریں آشیانہ بلند

ترے سامنے سر بسجدہ ہیں لوگ
مرا نام ہے غائبانہ بلند

سمجھ لیجئے تلخ گذرا ہے دن
اگر ہے نوائے شبانہ بلند

بڑی تیز رفتار ہے عمر کی
خدارا نہ کر، تازیانہ بلند

مجھے بولنے کی اجازت نہیں
مری ذات نیچی زمانہ بلند

مری چیخ بھی کھو گئی ہے رضا
ہوا ہر طرف سے ترانہ بلند

قاضی پورہ، کھنڈوہ ۴۵۰۰۰۱



شام بارک پوری
پکچر پیلس، کھلنا (بنگلہ دیش)

کاسہ میں کھلایا ہوا شاپلا

"حکومت بیرون ملک جھینگے برآمد کرنے کے لئے کاشتکاروں اور ایکسپوٹروں کو قرض دے گی۔" اخبار میں خبر چھپی تھی۔

میں ناشتہ سے فارغ ہو کر اخبار پڑھ رہا تھا۔ میز پر گلدان میں شاپلا پھول قرینے سے سجا ہوا تھا۔ چائے کی پیالی سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی جمعہ ہونے کی وجہ سے چھٹی کا دن تھا۔ بچے اب تک سو رہے تھے۔ بیگم باورچی خانے میں گھسی ہوئی تھی۔ اسی لئے میں بڑے اطمینان سے اخبار کے مطالعہ میں مصروف تھا۔ عام دنوں میں بستر سے اٹھتے ہی آفس جانے کی تیاری شروع کر دیتا ہوں۔ غسل اور ناشتہ سے فارغ ہو کر وقت پر آفس پہنچنے کے لئے بھاگتا ہوا بس اسٹینڈ کی طرف لپکتا ہوں۔

"سنتے ہیں!" اچانک بیگم کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ نہ جانے وہ کب میرے قریب آن کھڑی ہوئی تھی۔

"فرمائیے جان جاناں! ہمارے لئے کیا حکم ہے؟" میں نے اخبار سے نظریں ہٹا کر متبسم لہجے میں پوچھا۔

"سوچتی ہوں۔ آج کوئی خاص قسم آئیٹم پکاؤں۔"

"خیریت! آج عید کا دن ہے یا تمہارے میکے والے آ رہے ہیں؟" میں نے اسے چھیڑا۔ میں نے میز سے چائے کی پیالی اٹھائی اور چسکی لے کر پینے لگا۔ "چھوڑیئے۔ آپ کو ہمیشہ مذاق سوجھتا ہے۔ میں بچوں کی دلی خواہش کی بات کرنا چاہتی ہوں۔" وہ بولی۔ "بچے کئی مہینوں سے جھینگا کھانے کی فرمائش کر رہے ہیں۔ اب تک تو میں انہیں دلاسا ہی دیتی آ رہی ہوں۔ کل آپ کو بونس ملا ہے۔ کیوں نہ اس رقم میں سے جھینگا خرید لایا جائے۔" وہ جواب طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"بچوں کا صرف بہانا ہے۔ دراصل ان کی خواہشوں کے پیچھے تمہاری اپنی بھی تو خواہش ہے۔" میں نے اس کے دل کا چور پکڑ لیا تھا۔ شادی سے پہلے جھینگے اس کی مرغوب غذا تھی۔ پھر شادی کے بعد ہفتہ میں ایک دن جھینگا ضرور پکاتی تھی۔ میں بھی عرصے سے جھینگا کھانے کو ترس گیا تھا۔ ان دنوں جھینگے کی قیمت آسمان سے باتیں کر رہی تھی جب سے جھینگا بیرون ملک برآمد کیا جانے لگا۔ اس کی قیمت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ چونکہ اس سے ملک کو زرمبادلہ کا فائدہ ہوتا ہے۔ اسی لئے اس کی کاشتکاری اور ایکسپورٹ کے لئے خاص رعایت دی جاتی رہی تھی۔ مختلف اشیاء کے زرمبادلہ سے جو منافع ہوتا حکومت اس سے درآمد اور بیرونی قرضوں کی ادائگی کرتی۔ کھانے پینے کی چیزوں کی برآمد سے لوگوں کے منہ سے نوالہ چھن گیا تھا۔ اس طرح اپنا پیٹ کاٹ کر دوسروں کا دسترخوان سجایا جا رہا تھا۔

بہرحال اپنی اور دوسروں کی آرزوؤں کا خیال رکھنا ہی پڑتا ہے۔ طوعاً کرہاً تھیلی لے کر جھینگا خریدنے بازار گیا۔ سبزی فروش گاہکوں کو مخاطب کرنے کے لئے آوازیں لگا رہے تھے۔ بازار میں لوگ چیونٹیوں کی طرح رینگ رہے تھے۔ بھانت بھانت کی بولیاں سننے کو مل رہی تھیں۔ میں سیدھا مچھلی بازار میں داخل ہوا۔ مچھلی فروش زمین پر مختلف اقسام کی مچھلیاں سجا کے فروخت کر رہے تھے۔ لوگوں کا اژدہام تھا جو مچھلیاں خریدنے کے لئے ٹوٹ پڑا تھا۔ مچھلی فروشوں کے گرد بھیڑ تھی۔ ایک تھوک فروش سے میری شناسائی تھی۔ میں نے اس کی طرف کا رخ کیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی باچھیں کھل گئیں۔

"آئیے آئیے صاحب۔ بہت دنوں بعد آپ نظر آئے۔"

"ہاں! اب تو ہماری جیب اتنی ہلکی ہو گئی ہے کہ مچھلی کا وزن نہیں اٹھا سکتی۔" "مہنگائی نے سبھوں کی کمر توڑ دی ہے۔ ہمیں بھی مہنگے دام سے مچھلی خریدنی پڑتی ہے۔" "حکومت قیمتوں پر کنٹرول نہ رکھے تو یہی حال ہوگا عوام مہنگائی کی چکی میں اسی طرح پستے رہیں گے۔" "فرمائیے آپ کی خدمت میں کون سی مچھلی پیش کروں، روہو، ہلسا، قتلا، چندا مچھلی، بیکتی، کوئی،

مالگور، سپیشل.......“

”مجھے جھینگا خریدنا ہے۔ کیا بھاؤ ہے؟“

”میرے پاس مختلف اقسام کے جھینگے ہیں، بڑے بھی، چھوٹے بھی۔“

”باگدا کتنے کیلو ہے؟“

”تین سوٹکا۔ بالکل تازہ ہے“ اس کی قیمت سن کر جیسے بچھو نے مجھے ڈنک مار دیا ہو۔

”دام بہت زیادہ ہیں!“

”صاحب چند ہفتوں سے بیرون ملک جھینگے کی برآمد کم ہوگئی ہے۔ عالمی مارکٹ میں کمپٹیشن ہونے کی وجہ سے دام کچھ کم ہے۔ ورنہ یہ چار سوٹکے میں فروخت ہوتا تھا۔“

”اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کی بجائے، دوسروں کے چولہے جلائے جارہے ہیں۔“ میں نے اپنے بٹوے کو ٹٹولا کہ یہ بار اٹھا سکوں گا یا نہیں؟ میری نظروں کے سامنے بیوی اور بچوں کے چہرے لہرائے۔

”ایک کیلو باگدا وزن کردو“

اس نے ترازو سنبھالا۔ ایک پلڑے میں باٹ، دوسرے میں جھینگے اٹھا اٹھا کر رکھنے لگا۔ جھینگا پلڑے سے بھر بھر کر نیچے گرنے لگا۔ کبھی وہ چند جھینگے پلڑے میں رکھ دیتا، کبھی کم کر دیتا، مگر دونوں پلڑے برابر نہیں ہو رہے تھے۔

”عجیب ہے۔ دونوں پلڑے برابر نہیں ہوتے۔ وزن صحیح نہیں ہے“ میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑے ترازو کے وزن کو بھانپتے ہوئے پوچھا۔

”صاحب! ملک میں کس چیز کا وزن صحیح ہے؟ سیاست دانوں کی تقریروں میں وزن نہیں ہوتا۔ ملک کی معاشیات کا وزن بگڑا ہوا ہے۔ خود حکومت کا پلڑا اوپر نیچے ہوتا رہتا ہے۔ آپ کو صرف جھینگے کے وزن میں کمی بیشی نظر آرہی ہے۔ میں آپ سے بے ایمانی نہیں کرونگا۔“

میں اس گھڑی کو کوس رہا تھا جب جھینگا خریدنے گھر سے نکلا تھا۔ پورے ملک میں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا۔ حساب کتاب اور ایمانداری کے لئے کس کس سے الجھتا۔ ڈانڈی مارنے کا رواج عام ہو چکا تھا۔ میں فرصت کی تھیلی لئے گھوم رہا تھا۔ منافع خور جونکوں کی طرح عوام کا خون چوس رہے تھے، مگر احتجاج کی کوئی آواز نہیں تھی۔ گویا سبھوں نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا ہو

اس نے جھینگا میری تھیلی میں ڈال دیا میں نے بٹوے سے تین سوٹکے ادا کئے۔ اور بے دلی سے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ جھینگا میرے لئے ایک نعمت ثابت ہوا تھا۔ بونس ملنے پر میں نے کیا کیا سپنے سجائے تھے۔ مکان کی سفیدی کرواؤں گا۔ مگر ضروریات زندگی کی چند چیزیں خریدنے کا خواب ریت کی دیوار کی طرح بیٹھ گیا تھا۔

گھر پہونچا تو دروازے کے سامنے اپنے پرانے ملازم غفور علی کو رو صورت بنائے کھڑے دیکھا۔ وہ پہلے میرے گھر میں ملازمت کرتا تھا، پھر کہیں دوسری جگہ اچھی ملازمت ملنے پر کام چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

”کیا بات ہے غفور میاں؟ خیریت تو ہے؟“

”صاحب! خیریت کہاں؟ ہر طرف ہاہاکار مچی ہوئی ہے۔ حالات کے جنگل میں پھنس کر زندگی کتنی دشوار ہوگئی ہے۔“

”تمہیں تو اچھی نوکری مل گئی تھی، آج ہمارے گھر کی طرف کیسے آنا ہوا؟“

”نوکریاں تو کئی جگہوں پر کیں۔ مگر آج آخری نوکری سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔“

”کیوں؟“

”غلطی انسان سے ہوتی ہے۔ میرے باس نے میرے غیر ذمہ دارانہ رویوں اور کام میں سست روی کے سبب برہم ہوکر مجھے تھپڑ مارا، اس لئے میں نے نوکری چھوڑ دی۔“ وہ بے بسی سے بولا۔

”بڑی زیادتی کی انہوں نے۔ ہاتھ اٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟ تم کو نوکری سے برطرف کر دیتے۔“ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ ”نہیں! میرے باس بہت ہی اچھے آدمی ہیں۔ تھپڑ مارا تو کیا ہوا، میرا بہت خیال رکھتے تھے۔“

”ایں کیا بات کرتے ہو۔ مار بھی کھاتے ہو اور تعریف بھی کرتے ہو؟“

”انہوں نے مجھے پچاس ٹکے بھی دئے۔“

”بہت خوب۔ گویا یہ تمہارے تھپڑ کھانے کا انعام تھا۔ یہ تو ایک کا اکرام ہوا۔ مگر ہمارا غریب ملک ضرورت کا کاسہ لئے امیر ممالک کی در پر قرض کا خواہاں ہوتا ہے تو ضمیر کے رخساروں پر ذلت کا طمانچہ کھاکر رہ جاتا ہے۔“ میں اپنے اندر کرب کی چبھن محسوس کر رہا تھا۔

”صاحب۔ بیکار ہوں، اگر کہیں کوئی ملازمت مل جاتی تو...“

”تین چار دن کے بعد آؤ۔ جان پہچان والوں کے یہاں کوئی ہوگی تو لگا دوں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے گھر کی کال بیل بجائی، بیگم نے دروازہ کھولا، سب سے پہلے اس کی نظر تھیلی پر پڑی۔ دونوں بچے کمرے میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ میں نے تھیلی بیگم کو پکڑا دی۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آئی۔

”کتنے ٹاکا کیلو ملا؟“ وہ تھیلی میں جھانک کر جھینگے کا جائزہ لے رہی تھی۔

”تین سوٹکے کلو ہے!!“

”باپ رے باپ، جھینگے کی قیمت اتنی بڑھ گئی!؟“

"ہر چیز کا دام بڑھ گیا ہے صرف انسان کی قیمت گھٹ گئی ہے۔ ہم لوگوں نے اپنا معیارِ زندگی اتنا بڑھا لیا ہے کہ دوسروں کے قرض پر ملک کا بجٹ بنتا ہے۔ اس لئے مہنگائی مہنگائی کی رٹ لگا رکھی ہے۔ لیکن دوسروں کی بیساکھی سے زیادہ دور نہیں چلا جا سکتا۔"

"اگر پس ماندہ ملک قرض نہ لیں تو دیش کی ترقی کیسے ہوگی۔" میری بیگم تعلیم یافتہ بھی تھی اور گھر کا ماہانہ بجٹ بھی وہی بناتی تھی۔ اور سنسار کی ذمہ داری بھی اسی کی تھی۔

"ہمیں قناعت کی عادت ڈالنی چاہئے۔ کیک، پیسٹری اور روسٹ کی عادت کے بجائے دال بھات کھا کر زندگی گزارنی چاہئے۔ جب تک کوئی قوم اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہوتی اس کا بال بال قرض میں بندھ جاتا ہے اور آنے والی نسل بھی اس قرض سے چھٹکارہ حاصل نہیں کر سکتی۔"

"یہ قرض ترقیاتی کاموں پر خرچ کیا جاتا ہے۔" "اس سے ملک میں آسودگی خوش حالی آئے گی۔"

"ترقی کے نام پر جو قرض دیا جاتا ہے۔ وہ اصل کے ساتھ سود بھی وصول کرتے ہیں۔ پھر سود در سود کا چکر چلتا ہے۔ جھینگے اور دوسری اشیا برآمد کی جاتی ہیں۔ اس کے زرِ مبادلے سے تو سود بھی نہیں ادا ہو سکتا۔ معاہدہ ایسی سیاہی سے لکھا جاتا ہے جس سے عزت نیچ دی جاتی ہے۔ اور معاہدہ کی منہ دکھائی میں جو تحفہ ملتا ہے۔ سرکاری افسروں اور سیاست دانوں کی تجوریوں میں چلا جاتا ہے۔" "ملک کے حاکم قرض کا لنگڑا گھوڑا لیتے ہی کیوں ہیں۔ جس میں سونے کے گھونگرو پاؤں میں باندھ کر دوسروں کے اشاروں پر رقص کرنا رہتا ہے؟" طالب علمی کے زمانے میں بیگم کے نصاب میں معاشیات اور سیاست شامل تھی۔

دراصل بڑے ممالک شرائط شدہ قرض پھولوں کے تھال میں سجا کر دیتے ہیں۔ جس میں سینکڑوں کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ ڈالروں اور پونڈوں کا یہ تبسم پھولوں کے بجائے کانٹے کی ثابت ہوتا ہے جس پر قوم سالہا سال سے چبھنے سے کروٹیں بدلتی رہتی ہے۔ اور سود در سود قرض اتارتے کرتے نہ صرف جسم چھلنی ہو جاتا ہے بلکہ قومیت اور ضمیر کا سودا کرنے پر مجبور بھی ہوتی رہتی ہے۔

"ملک کے وقار اور عزت کو مجروح کر کے بین الاقوامی بینکوں کی دہلیز پر ناک رگڑ رگڑ کر اور سر جھکا کر قرض وصول کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"دراصل ہمارے پھٹے ہوئے کپڑوں کے رفو کرنے کو سوئی دھاگے کے لئے بھی دوسروں کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔" میرے سینے میں دکھوں کے بادل سے جذبات کا سیلاب آ گیا تھا۔ "چھوڑو ان باتوں کو۔ اس میں سر کھپانے سے کوئی فائدہ نہیں ہر بڑا ملک پہاڑ جیسا ہوتا ہے۔ جو کسی چھوٹے ملک کے پاس چل کر نہیں جاتا۔ بلکہ ترقی پذیر ملکوں کو ان تک جانا ہوتا ہے۔"

بیگم تھیلی لے کر باورچی خانے جاتے جاتے ٹھٹک گئی، پھر میری طرف پلٹ کر واپس آئی۔ وہ تھیلی کو ہاتھ میں لے کر تول رہی تھی۔

"مجھے یہ جھینگے ایک کیلو سے کم لگتے ہیں۔ مچھلی فروش نے ضرور ڈنڈی ماری ہے۔"

"اسے کیوں دوش دیتی ہو۔ جس کنٹراکٹر کو باٹ بنانے کا ٹھیکہ دیا گیا تھا۔ اسے رشوت دے کر باٹوں کا وزن کم کر دیا گیا ہے۔ جس بالٹی میں سو سوراخ ہوں تو ہر سوراخ سے پانی تیزی سے رستا ہے۔ جب تک اس کا پیندا تبدیل نہ کیا جائے، یہی ہوگا، میری زبان میں پھر تلخی آ گئی تھی۔

میز پر رکھے گلدان میں ہمارا قومی پھول "شاپلا" کمہلایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ بیگم روزانہ گلدان میں پانی ڈالتی رہتی ہے تاکہ پھول مرجھا نہ جائے۔ مگر یہ گلدان بھی درآمد کیا ہوا تھا۔ ❋

بقیہ صفحہ ۴۳ ہے آگے

ان کا ہاتھ تھام لیا "مشتاق صاحب، یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

مشتاق صاحب تھوڑا سا ٹھٹکے پھر اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے آگے بڑھے تو ایک بار پھر کسی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے کی طرف کھینچا "مشتاق صاحب، مکان کا بقیہ حصہ آپ پر آ پڑا تو ..... کیا ہوگا آپ کا ..... آپ کی بیوی بچوں کا ....." لیکن مشتاق صاحب نے سنی ان سنی کر دی اور بھیڑ کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے تو کسی نے چیخ کر ان سے کہا "مشتاق صاحب رک جائیے، آپ کو کچھ ہو گیا تو کوئی کام آنے والا نہیں .....؟"

لیکن مشتاق صاحب کے اندر ایک غصہ، ایک عجیب سا غصہ تیزی سے سر ابھار رہا تھا اور وہ سرعت سے آگے بڑھے تھے تبھی کسی نے بڑی سختی سے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور چیخ کر بولا "مشتاق صاحب! آپ پاگل ہو گئے ہیں کیا؟" لیکن مشتاق صاحب کسی اور عالم میں پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے غصے سے بپھرے ہوئے آدمی کی طرح پوری قوت سے اس ہاتھ کو جھٹک دیا اور آگے بڑھتے چلے گئے۔ کوئی ان کے پیچھے سے چیخ رہا تھا "مشتاق صاحب، رک جائیے ..... رک جائیے" لیکن وہ نہیں رکے اور ملبہ ہٹانے والوں میں شامل ہو گئے۔ تبھی ان میں سے ایک شخص چیخا

"وہ زندہ ہے ..... زندہ ہے ..... اس کی سانس چل رہی ہے" ❋



شہپر رسول

دن رقصِ ستم کی نذر ہوا شب نوحہ خوانی میں گذری
یوں عمر کی کشتی جسم اور آنکھ کے کھارے پانی میں گذری

سب ہجر کی لمبی راتوں میں اک رات گمانِ وصل کی تھی
وہ بار بھی مرہم زخموں کا، وہ رات کہانی میں گذری

کچھ سچ بولا، کچھ جبر ہوا، کچھ شعر کہے، کچھ زخم سہے
کچھ بیتی ہنسنے رونے میں، کچھ سحر بیانی میں گذری

اب موجِ درد کو مت پوچھو تلوار کی زناٹے جیسے
شعلے کی جوانی سے لپکی، دریا کی روانی میں گذری

میں جھوٹا ہوں تو سچا ہے، پر اس میں کس کا حصہ ہے
وہ ساعت خود آگاہی کی جو لغو بیانی میں گذری

ہم غرق رہے خودداری میں، وہ شہر خوش تھے خواری میں
یوں لطف اڑانے میں بیتی یوں تن آسانی میں گذری

٥٧۔ اے کچہری روڈ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ (یوپی)



نجم عثمانی

کوئی سچا اور نہ جھوٹا واقعہ میں نے لکھا
میرے دل پر جو بھی گذرا سانحہ میں نے لکھا

خوف و دہشت، رنج و غم ظلم و ستم سب جھیل کر
زندگی تیرا انوکھا ذائقہ میں نے لکھا

مصلحت کی قید سے میرا قلم آزاد تھا
جو بھی لکھنا تھا، بہت بیساختہ میں نے لکھا

آج کے انسان کو شعر و ادب سے کام کیا
سوچتا ہوں اب کہ سب بے فائدہ میں نے لکھا

عمر بھر شہرِ ستمگر میں رہا اپنا قیام
نجم حالِ داد دل بالواسطہ میں نے لکھا

سی۔ ایم۔ پی۔ ایف پوسٹ بکس نمبر ٥٨ دھنباد (بہار)

شمیم قاسمی

کسی منڈیر پہ بیٹھا نہ گھونسلوں میں
مرے جنوں کا پرندہ مہاجروں میں

یہ جھیل اور شکارہ، یہ پھول اور خوشبو
وہ خوش نصیب تھا جو تیری قسمتوں میں

کہاں کی بوئے وفا اور کہاں کا یارانہ
رہا میں شہر میں جب تک منافقوں میں

تمام عمر مقدر تھی دشت پیمائی
جو ریگ زار سے نکلا تو جنگلوں میں

کہ میرے سینے میں دروازۂ شہر بھی
الگ یہ بات کہ میں قید معبدوں میں

علی ہاؤس نور گنج، سہسرام (بہار)



ندا فاضلی

۱۰۳- امر اپارٹمینٹ، ڈانڈپاڑہ - ۱، کھار (ویسٹ)، بمبئی ۴۰۰۰۵۲

دیواروں کے بیچ

قسط نمبر ۲۰

فلم کی تجارتی کامیابی

سے فلم سے متعلق لوگوں کی قیمت اور ضرورت میں پھیلاؤ آتا ہے۔ اس دنیا میں بتوں سے زیادہ اتفاقات کا عمل دخل ہوتا ہے۔ اُن دیکھے
اتفاقات کے اس خوف نے سب کو محنت کی جگہ مشیت کا پجاری بنا دیا ہے۔ وشنو ماتا' اجمیر کے خواجہ اور شرڈی کے سائیں بابا کی مارکیٹ دوسرے
ی دیوتاؤں سے زیادہ ہے۔ بڑے بڑے فلم ساز، عوامی نمائش سے پہلے اپنی فلموں کو انہیں درگاہوں اور مورتیوں کو دکھاتے ہیں۔ ان میں کچھ فلمیں ایسی
ہوتی ہیں جنہیں صرف درگاہیں اور مورتیاں ہی دیکھتی ہیں۔ انسانوں کی آنکھیں انہیں دیکھنے سے ہمیشہ محروم رہتی ہیں۔ یہ عقیدتیں عموماً سیکولر ہوتی ہیں
ن دھرم اور ذات سے زیادہ کام کی اہمیت ہوتی ہے۔ جو جس کے کام آتا ہے وہ ہی اس کا دیوتا بن جاتا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود دیوی دیوتاؤں
پسند اور عوام کی پسند میں اکثر ٹکراؤ جاری رہتا ہے۔ ان دونوں کی رائیں بہت کم ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ خدا کے نام اور عوام کے اس تصادم میں
ہارے فلم ساز کو لاکھوں کا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ فلم کامیاب ہوتی ہے تو فلم سے متعلق ہر آدمی ایک دوسرے کے لئے خوش قسمت تصور کیا جاتا ہے
بار بار ایک دوسرے کے ساتھ کام کرنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ دوسری صورت میں گہری کلے سے گہری دوستیاں اور رشتہ داریاں بھی دور کی علیک سلیک بن
رہ جاتی ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی اپنے ہدایت کار بیٹے نریندر بیدی کے لئے کبھی کارآمد ثابت نہیں ہوئے۔ اس کی فلمیں ہمیشہ دوسرے رائٹر ہی لکھتے رہے۔

ندا نے اس نٹ راج کی نوکری چھوڑ دی ہے یعنی بھائی دو تین مہینے تک' ایکاون روپے روزانہ کے لفافے دینے کے بعد اچانک ایک دن خود لفافہ
اکرحام آباد کے پتے پر پوسٹ ہو جاتے ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد مکتبہ کے سامنے بیٹھنے والے فقیر درانی تو نئے ٹھکانے تلاش کر لیتے ہیں لیکن ندا ابھی
ان کے انتظار میں نت نئی الجھنوں سے گذر رہا ہے۔ گوونڈی کا کمرہ، کمرہ کے مالک کو اپنے رہنے کے لئے چاہیے۔ دوسری رہائش کے لئے ڈپازٹ کی رقم
ضرورت ہے۔ ذریعۂ آمدنی بظاہر غیر یقینی۔ یونیورسٹی پبلیکیشنز کا اشاعتی ادارہ، جو ایک دوست ابراہیم نذیر کے ساتھ قائم ہوتا ہے وہ لفظوں کا پل اور
اآنائیں کی اشاعت کے بعد ضرورت کے مطابق سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے بند ہو جاتا ہے۔ ندا بینک سے بچی کھچی رقم نکال کر باندرہ ایسٹ میں کرائے
لے مکانوں کے ایجنٹ کو دیتا ہے لیکن جب وہ سامان لے کر وہاں پہنچتا ہے تو معلوم ہوتا ہے وہ رقم مالک مکان تک پہنچنے کے بجائے ایجنٹ کے ساتھ
رار ہو چکی ہے۔ ندا باندرہ میں پالی ناکہ کے ایک ہوسٹل میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ایک کمرہ میں چار بستروں میں ایک اس کا بھی ہے۔

ن
پاکستان سے خط آتے رہتے ہیں۔ جمیل فاطمہ کے بعد مرتضیٰ حسن بہت اکیلے ہو گئے ہیں۔ لڑکیاں اپنے اپنے گھر بس جاتی ہیں۔ لڑکوں نے اوپر نیچے اور دائیں
بن ایک ہی گھر کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ گھر میں نئی عورتوں کی آمد نے اپنی سرحدیں کھینچ لی ہیں۔ بچے اکثر ایک دوسرے کی سرحد پار کرتے رہتے ہیں۔ اور
ہی خواتین کے مابین نئے نئے جھگڑوں کی بنیاد بنتی ہے۔ لڑکے بھی ان روز روز کے شکوے شکایتوں سے نہ چاہتے ہوئے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اور دنوں
آپس میں بول چال بند رہتی ہے۔ ایک دھورے کے ٹوٹ جانے سے تسبیح کے سارے دانے بکھر جاتے ہیں۔ مصطفیٰ احسن سب سے بڑے لڑکے ہیں
وہ پاکستان شپنگ میں بڑی پوسٹ پر ہیں۔ ان کی آمدنی کے لحاظ سے ان کے بچوں کا رہن سہن ہے جو دوسروں کی بیویوں کے حسد کا کارن بنتا ہے۔
بات بات پر دیکھو ۔۔۔ اور ۔۔۔ جو ۔۔۔ لفظوں کی ان قینچیوں نے کبھی کبھی جمیل فاطمہ کو بھی قبر سے نکال کر ان کے کفن کے بخیے

پھیر ملے جاتے ہیں۔ مرتضیٰ حسن سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے ایک کمرہ میں تنہا روز روز کے ان ڈراموں کے مکالمے سنتے رہتے ہیں۔ اور اپنی پہلے لکھی ہوئی غزلوں میں زبان و بیان کی نوک پلک سنوارتے رہتے ہیں۔

ان کی لمبی عمر نے ان کے بیشتر ہم عمروں کو اللہ کا پیارا کر دیا ہے۔ اب صرف ان کے ماضی کی گواہ ان کی بڑی بہن ہی ہے۔ جن سے ملنے وہ ہر شام پابندی سے جاتے ہیں۔ وقت نے اس بہن سے بھی یادوں کی وہ کڑیاں چھین لی ہیں جنہیں جوڑنے کی للک میں وہ روز پہاڑ جیسا دن گزارتے ہیں۔ ان کی بہن کی یادداشت اور ہاتھ پاؤں جواب دے چکے ہیں۔ صرف آنکھوں اور آواز میں زندگی سمٹ کر رہ گئی ہے۔ وہ ان کے بے ربط جملوں میں، اپنے طور پر معنوی ربط پیدا کرتے رہتے ہیں۔ ایک ہی گھر کے تین حصوں کی طرح گھر کے افراد نے، مرتضیٰ حسن کو بھی تین ٹکڑوں میں بانٹ لیا ہے۔ ایک جگہ سے صبح کا ناشتہ آتا ہے۔ دوسرے حصے سے دوپہر کا کھانا آتا ہے۔ رات کی ذمہ داری تیسرے گھر کی ہے۔ اپنی اپنی چہل پہل میں مصروف اس گھر میں ان کی حیثیت ایسے سامان جیسی ہے جو اپنی مدتِ استعمال پوری کرکے بے مصرف ہو چکا ہے۔ ان کی مصروفیات میں اب اپنی بہن کے گھر جانے کے ساتھ جمیل فاطمہ کے مزار پر جاکر فاتحہ پڑھنے کا بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ پورے دن کو مختلف نمازوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ ایک نماز سے دوسری نماز تک کا وقت وہ لڑکیوں سے باری باری فون پر دیر دیر تک باتیں کرتے ہیں خرچ کرتے ہیں یا ہندوستان میں اپنے دوست ڈاکٹر کولیکر اور ندا کو خط لکھتے ہیں۔ ان تمام مصروفیات کے باوجود اتنا وقت باقی بچ جاتا ہے، جس کو گزارنا مشکل ہوتا ہے۔ وہ شروع سے محفل بازیوں کے عادی رہے ہیں۔ جمیل فاطمہ کی حیات تک گھر کے ہر گوشے سے ان کی آہٹیں سنائی دیتی تھیں۔ لیکن اب ان کے اور وقت کے درمیان صرف اتھاہ خالی پن ہے جسے بھرنے کے لئے وہ طرح طرح سے کوشش کرتے رہتے ہیں۔ مصطفیٰ احسن کے بڑے لڑکے گڈو سے ان کی دوستی انہیں کوششوں کا نتیجہ ہے۔ پانچ سال کے چنچل بچپن اور اسّی سال کے سنجیدہ بڑھاپے کا یہ لگاؤ ضرورت سے زیادہ شدت اختیار کر لیتا ہے۔ وہ ایک لمحہ بھی ان سے دور ہوتا ہے تو وہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ دوسرے بچے ہی ان کے اس یک طرفہ لاڈ پیار سے نہیں کڑھتے، گڈو کی ماں بھی اکثر اپنی خفگی کا اظہار کرتی ہے۔ وہ جی کھول کر اس پر پیسہ لٹاتے ہیں، اس کی ہر اچھی بری ڈیمانڈ کو پورا کرتے ہیں۔ دادا کی شیفتگی نے پوتے کو ضدی اور گستاخ بنا دیا ہے۔ پڑھائی لکھائی سے لڑکے کی بے توجہی پر جب ماں اسے ڈانٹتی ہے تو وہ مرتضیٰ حسن کے پاس آکر پھر سے پہلے جیسا ہو جاتا ہے۔ وہ جب چاہتا ہے اسکول جاتا ہے۔ جب چاہتا ہے غوطہ مار دیتا ہے۔ دوسرے بچے اسکول کی بس میں آتے جاتے ہیں۔ اور اسے مرتضیٰ حسن خود کار سے چھوڑنے اور لینے جاتے ہیں۔ کئی بار وہ اس کے کہنے پر اسکول کے استادوں کو بلاوجہ برا بھلا کہہ چکے ہیں۔ مرتضیٰ حسن کا یہ رویہ گڈو کی ماں کو، اپنے لڑکے کیلئے اچھا نہیں لگتا۔ وہ احتجاجاً ان دونوں کے بیچ دوریاں پیدا کر دیتی ہے۔ مار پیٹ کر بچے پر پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ مرتضیٰ حسن بہو کی گرم مزاجی سے اپنے بیٹے سے عرض کرنے کے بجائے روٹھ کر اپنی مرحوم بہن کے گھر جاکر بیٹھ جاتے ہیں۔ بڑی لڑکی کو جب معلوم ہوتا ہے تو وہ اپنی سسرال سے آکر گھر میں باپ کی ناقدری پر آنسو بہاتی ہے۔ بھائی کو بڑھاپے کے اکیلے پن کا احساس دلاتی ہے۔ اور پھر گڈو کو ساتھ لے کر انہیں منا کر واپس لے آتی ہے۔ بڑی لڑکی دور رہ کر بھی ان کی ہر بات کا خیال رکھتی ہے۔ ڈھکے چھپے کی طرح ذرا ذرا سی بات پر اسے فون کرتے رہتے ہیں۔

ندا کی بڑی بہن نے پاکستان سے لکھا ہے۔ بابوجی مرتضیٰ حسن کافی ضعیف ہو گئے ہیں۔ خدا کا شکر ہے۔ ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق انہیں عمر کے علاوہ کوئی بیماری نہیں ہے۔ لیکن وہ دن بہ دن کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ آدمی جہاں پلا بڑھا ہو، جہاں عمر کا کافی حصہ گزر چکا ہو، سال میں ایک دو بار وہاں کی آب و ہوا میں ضرور جانا چاہئے۔ بڑھتی عمر میں یہ تندرستی کے لئے لازمی ہے۔ میں سوچتی ہوں انہیں کچھ دن کے لئے گوالیار لے آؤں۔ وہاں ان کے ماں باپ کے قبروں کے علاوہ خواجہ خانون کی درگاہ ہے۔ ان کے ساتھ کے ڈاکٹر کولیکر ہیں، رام نارائن جی ہیں، اور پھر تم ہو۔ تم سے بھی وہ مل لیں گے۔ لیکن اڑچن یہ ہے کہ وہ گڈو کے بغیر کراچی سے نکلنا نہیں چاہتے۔ اور گڈو کی ماں اپنے پہلوٹی کے بیٹے کو ہندوستان بھیجنے سے خوف کھاتی ہے۔ اللہ مالک ہے مصطفیٰ کے بیچ میں پڑنے سے معاملہ سلجھ جائے گا۔ تم بھی بابوجی کے لئے دعا کرو جمیل فاطمہ کے بعد ہمارے سروں پر ان کا سایہ غنیمت ہے خدا اس کو برقرار رکھے...!

گوالیار میں دسمبر کی سردی اپنے پورے شباب پر ہے۔ بمبئی میں رہنے کے بعد یہ سردی اور تیز محسوس ہوتی ہے۔ مرتضیٰ حسن قمر طلعت اور گڈو کے ساتھ آچکے ہیں۔ ان کی آمد کی خبر چاروں طرف پھیل چکی ہے۔ صبح سے شام تک گھر میں نئے پرانے لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ ایک آتا ہے ایک جاتا ہے۔ ڈاکٹر کولیکر تو صبح شام پابندی سے آتے ہیں۔ اور دیر تک پرانی یادوں میں کھوئے رہتے ہیں۔

رام نارائن کے گذر جانے کی اطلاع انہیں یہیں آکر ملتی ہے۔ موت کے بارے میں آدمی کے تاثرات ایک ہی زندگی کے مختلف ادوار میں الگ الگ ہوتے ہیں۔ کبھی وہ اس کے وجود سے انکار کرتا ہے، کبھی اس سے دہشت کھاتا ہے اور کبھی اسے ایک حقیقت کے روپ میں قبول کر لیتا ہے۔ مرتضیٰ حسن عمر کی اس منزل سے گذر رہے ہیں جہاں موت دور سے ڈرانے کے بجائے قریب آکر ہم سفر بن جاتی ہے۔ رام نارائن کی موت کی خبر کو بھی وہ ڈاکٹر گولیک سے بنا کسی ردعمل کے سن کر صرف اس کی برتھ ڈیٹ کاغذ پر لکھتے ہیں۔ پھر گولیک اور اپنی تاریخ پیدائش لکھتے ہیں۔ خاموشی سے وہ جمع باقی کر کے تینوں کی موجودہ عمروں کو ہندسوں میں نکال کر صرف اتنا ہی کہتے ہیں۔ وہ سالا تو ہم دونوں سے چھوٹا ہے۔ تم دو سال بڑے ہو میں ایک سال بڑا ہوں۔ بہت جلدی ڈاکٹر گولیک جملہ پورا کرتے ہیں، ہاں بعد میں آیا اور جلدی چلا گیا۔ اس بات پر دونوں زور سے ہنستے ہیں۔ مرتضیٰ حسن جملے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ جلدی یا دیر جانا تو ہے ہی اس پر پھر دونوں مل کر ہنستے ہیں۔ اور پھر کچھ دیر چپ رہ کر ایک اخبار اٹھا لیتا ہے۔ دوسرا جیب سے سگریٹ نکال کر سلگاتا ہے۔ اور ہر کش کے بعد سلگتی ہوئی تمباکو کو دیکھتا رہتا ہے۔

مرتضیٰ حسن اور گڈو کے درمیان روز کھینچا تانی رہتی ہے۔ وہ اپنی عمر کے بچوں میں کھیلنا چاہتا ہے۔ یہ اس کی ایک پل کی جدائی بھی برداشت نہیں کر پاتے۔ گڈو ان کی اس کمزوری سے خوب فائدہ اٹھاتا ہے۔ صبح سے شام تک وہ نئی نئی خواہشات پیش کرتا ہے جسے یہ خاموشی سے پوری کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی من مانی سے باز نہیں آتا۔ وہ محلے کے سارے ہم عمر بچوں کے ساتھ گلیاں اور چھتیں ناپتا رہتا ہے۔ اور مرتضیٰ حسن بیچ صحن میں کھڑے اس کی جان کی امان کے لئے دوسرے بچوں پر چیخ پکار کرتے رہتے ہیں۔

جس مکان میں قیام ہے وہ پہلی منزل پر ہے۔ اس میں آمنے سامنے دو کمرے ہیں۔ ایک میں بڑی بہن کے ساتھ ندا سوتا ہے۔ دوسرے میں مرتضیٰ حسن اور گڈو سوتے ہیں۔ ایک رات کو سوتے سوتے اچانک اندھیرے میں ندا کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ وہ نیچے فرش پر ہلتا جلتا کوئی ہیولا سا دیکھتا ہے اس ہیولے سے جب کھانسنے کی آواز آتی ہے تو وہ گھبرا کر بجلی جلا دیتا ہے۔ روشنی ہوتے ہی بہن کی آنکھ بھی کھل جاتی ہے۔ مرتضیٰ حسن لحاف لپیٹے ٹھنڈے فرش پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ کیا بات ہے یہاں کیوں بیٹھے ہیں آپ؟ ندا پوچھتا ہے۔ وہ بڑی بہن کے بستر پر بچپن کی گہری نیند میں خراٹے لیتے ہوئے گڈو کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ گڈو رات کو نہ جانے کس وقت سوتا سوتا اٹھ کر یہاں چلا آتا ہے۔ وہ اسے اپنے پاس نہ پاکر ایک ڈراؤنا سا خواب دیکھتے ہیں۔ ہاتھوں میں خونی ہتھیار لئے ایک ساتھ کئی ڈاکو، ان کے کمرے میں آتے ہیں اور ان کی آنکھوں کے سامنے گڈو کو اٹھا کر اپنے گھوڑوں پر چمبل گھاٹی کی طرف فرار ہو جاتے ہیں۔ وہ بچے کی طرح اپنا خواب دہرا کر کھانسنا شروع کر دیتے ہیں۔ ندا گڈو کو کچی نیند سے جگا کر اسے دوبارہ مرتضیٰ حسن کے ساتھ سونے کے لئے دیر تک مناتا ہے مگر وہ آدھا سویا آدھا جاگا کسی طرح بستر چھوڑ کر جانے کو تیار نہیں ہوتا۔ ندا جب زبردستی کرتا ہے تو وہ آنکھوں میں نیند بھرے رات کے ڈھائی بجے چائے پینے کی شرط رکھتا ہے۔ ہوٹل کے سارے لوگ گہری نیند میں سوئے ہوئے ہیں۔ سردی ایسی ہے کہ بدن سے ذرا سا لحاف بھی ہٹتا ہے تو سردی سوئیوں کی طرح چبھنے لگتی ہے۔ بہن اس کی ضد پر ہاتھ اٹھا دیتی ہے۔ وہ روتا ہے چلاتا ہے مگر کسی طرح مرتضیٰ حسن کے کمرے میں جانے کو راضی نہیں ہوتا۔ اور اس کے بغیر مرتضیٰ حسن فرش چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں۔ ندا معاملے کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے فوراً گڈو کی شرط پوری کرنے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ گڈو کو ساتھ لے کر کافی دیر ادھر ادھر بھٹکتا ہے۔ پورا شہر سردی میں ٹھٹھرا ہوا ہے۔ گھروں کے دروازے بند ہیں، ہوٹلوں کے چولہے ٹھنڈے ہیں۔ گڈو تانگے میں بیٹھا ہوا، فٹ پاتھ پر سمٹے سکڑے جانوروں کو دیکھ دیکھ کر خوشی میں تالیاں بجاتا ہے اور بار بار اچھل اچھل کر بیٹھتا ہے۔ لیکن ندا سردی کے مارے پریشان ہے۔ جب کہیں چائے نہیں ملتی تو وہ اسٹیشن جا کر اسے چائے پلاتا ہے۔ لوٹنے میں مرغ اذان دینا شروع کر دیتے ہیں۔ مرتضیٰ حسن اس کے انتظار میں ٹھنڈے فرش پر بیٹھے کھانستے رہتے ہیں۔ اور وہیں اٹھ کر وضو کر کے نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

گوالیار میں چند دن کا قیام مرتضیٰ حسن کی تندرستی میں نمایاں فرق پیدا کر دیتا ہے۔ ان کے سوکھے ہاتھ پاؤں اور چہرے پر گوشت نظر آنے لگتا ہے۔ وہ گڈو کو ساتھ لے کر اکثر ادھر ادھر گھومتے ہیں، پرانے راستوں سے گذرتے ہیں، جانے پہچانے مکانوں کو تکتے ہیں۔ پرانے شناساؤں سے ملتے ہیں درگاہوں میں عقیدت سے فاتحہ پڑھتے ہیں۔ گوالیار میں ان کا جی لگتا دیکھ کر بہن کو خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ ویزا کی مدت ختم ہوتی جاتی ہے۔ لیکن مرتضیٰ حسن کسی نہ کسی بہانے یہاں سے روانگی کو مسلسل ٹالے جاتے ہیں۔ وہ واپس جانا نہیں چاہتے۔ لیکن گڈو کے بغیر رہ بھی نہیں سکتے۔ وہ اس الجھن کا کوئی نہ کوئی حل ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ناکام رہتے ہیں۔ بہن کے شوہر اور گڈو کے ماں باپ کے ہر خط میں جلدی آنے کی تاکید ہوتی ہے۔ وہ جیب

[باقی صفحہ پر دیکھیے]



اختر امان

مجھکو یوں لگتا ہے کوئی بام و در میرا نہیں
اور میں جس گھر میں رہتا ہوں وہ گھر میرا نہیں

کس طرف کو جا رہا ہوں اور جانا ہے کہاں
میں مسلسل چل رہا ہوں اور سفر میرا نہیں

میں ہتھیلی پر سدا رکھ کر لئے پھرتا رہا
وہ جو کاندھوں پر نظر آتا ہے سر میرا نہیں

جان جائیں گے اسے میرے حوالے سے سبھی
وہ کسی کا بھی نہیں ہوگا اگر میرا نہیں

جانے کیوں گزرا ہوں میں پھر اس جگہ سے بارہا
جانتا ہوں جس جگہ وہ منتظر میرا نہیں

اپنے حصے کی بھی خوشیاں بانٹ دیتا ہوں امان
جو ضرورت سے ہے بڑھکر بیشتر میرا نہیں

ہاؤس نمبر ۳، سیکٹر جی ۔ ۴/۱۰، اسلام آباد (پاکستان)
اسلام آباد



بشیر سیفی

کب تک رہے گا مجھ پہ گئے وقت کا اثر
آخر کو چھوٹ جائیگی یادوں کی رہ گذر

ترک تعلقات بھی کرنا ضرور تھا
ہر بار جو نہ کرسکا بھی مگر اس کے نام پر

وہ یوں مرے خیال میں مہکا رہا سدا
خوشبو کی ایک موج تھا گویا میں عمر بھر

آفاق سے پرے بھی مری داستان تھی
میں چشم کائنات میں جب ٹھہرا معتبر

سایا بچھا کے جسم جلاتا ہوں دھوپ میں
پھر بھی زمین کو ہے وہی شکوۂ ثمر

ہر شخص اب سکوت کی گہری ندی میں ہے
پرچم صدا کا لے کے نہ سیفی یہاں اتر

گلی ۵، مسلم ٹاؤن، چراہ روڈ راولپنڈی (پاکستان)



حیدر قریشی

اب تو جذبے زبان مانگتے ہیں
پر بریدہ اڑان مانگتے ہیں

عشق کی پڑھنا چاہتے ہیں نماز
اور اذنِ اذان مانگتے ہیں

رات دن صرف دیکھتے ہی رہیں
کب یہ ہفت آسماں مانگتے ہیں

ہم تہی دست، آبروئے فقر
سود دے کر، زیاں مانگتے ہیں

دل کی اک بات کہنا چاہتے ہیں
پہلے جاں کی امان مانگتے ہیں

یا تو کچھ بھی نہیں ہیں مانگتے، یا
تیرے سارے جہان مانگتے ہیں

ایسی عمروں کے پیار تو حیدر
جسم و جاں سے لگان مانگتے ہیں

۱۸۴/ الف محلہ کھوکھراں، خانپور



شمیمہ رضوی
لکچرار شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

نمک پارے

کون ہے وہ

رات کے بھیانک سناٹے کو چیرتے ہوئے یہ کس کی سسکیاں سنائی دے رہی ہیں۔ کیا یہ اس مظلوم بوڑھی عورت کی آہیں ہیں جو منہ مانگا جہیز نہ ملنے کی بنا پر کنواری بیٹھی رہ گئی۔ یا اس معصوم بچے کی سسکیاں ہیں جو کسی ہوس کی نشانی میں اپنا نشان کھو بیٹھا ہے۔ یا اس مظلوم مرد کی راہیں ہیں جو جی توڑ محنت کے باوجود اپنے بچوں کے لئے دو وقت کی روٹی نہ جٹا سکنے میں ناکام رہا ہو؟ یا اس ڈگری یافتہ نوجوان کا کرب ہے جو منہ مانگی رقم نہ دے سکنے کی بنا پر بیکاری کا تمغہ لٹکائے دربدر مارا مارا پھر رہا ہے۔ یا اس غریب لڑکی کی سسکیاں ہیں جس کی عصمت و عزت دولت کا مکھوٹا لگانے والوں کی بھینٹ چڑھ چکی ہے۔ یا پھر یہ کسی کینسر زدہ دولت مند مریض کی کسمپرسی کی سسکیاں ہیں جو لاعلاج بن چکی ہیں؟ نہیں یہ سسکیاں ان میں سے کسی کی بھی نہیں ہیں۔ یہ سسکیاں ہیں "مذہب" کی جو اپنے ہی محافظین کے ہاتھوں نہ معلوم کتنی بار لوٹا گیا ہے۔

ایک سوال

تم! تم کون ہو؟ میں نے تم کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ آخر تم ہو کون کیا چاہتی ہو؟ دیکھو مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ گہری سیاہ، مائل بہ زرد رنگت، الجھے ہوئے خاک آلود، بے ترتیب گندے بال، گڈھے میں دھنسی پیلی پیلی ڈگر ڈگر کرتی ہوئی آنکھیں۔ پچکے گال، چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی۔ گندے کالے پیلے بدبودار باہر نکلے ہوئے ٹیڑھے میڑھے نکیلے دانت، بڑھے ہوئے میل زدہ ناخون۔ بدبودار پسینے میں نہایا ہوا پسلیوں کا پھولتا پچکتا خون آلود بلغم تھوکتا ہوا ایک بے ہنگم سا پنجر۔ آخر تم اس طرح مجھے کیوں گھور رہی ہو۔ تم! تم کچھ بولتی کیوں نہیں۔ کون ہو تم۔ جواب دو۔ جواب دو!! ایک نحیف اور مردہ سی آواز ابھری۔ میں! میں! مفلسی ہوں۔

ظلم

میں گلاب کی ایک ادھ کھلی کلی ہوں۔ نرم و نازک ملائم و شگفتہ۔ شگوفے سرگوشیاں کر رہے ہیں کہ میں سب سے زیادہ دلکش ہوں ان کا کہنا ہے کہ میری تر و تازگی۔ میری سرشت۔ میری مہک۔ میری بناوٹ۔ میری سجاوٹ۔ میرا رنگ۔ میرا ڈھنگ غرض میری ایک ایک پنکھڑی میں ایک عجیب سی ندرت ہے۔ ایک جداگانہ سی کیفیت ہے۔ میں ان کی یہ باتیں سن کر کھلکھلا پڑی۔ اور کلی سے پھول بن گئی۔ میں نے ایک عجیب سرشاری سی کیفیت محسوس کی۔ لیکن میں پوری طرح اپنے کو سمجھ بھی نہ پائی تھی کہ اچانک ایک ظالم کا ہاتھ بڑھا اور بڑی بے دردی سے مجھے شاخ سے توڑ کر اپنے قیمتی کوٹ کے کالر پہ لاپروائی سے لگا کر لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ باغ سے باہر نکل گیا۔ ❋

آپ کا زرِ سالانہ . میں ختم ہوا ہے/ تھا۔ اس سے قبل بھی یاددہانی کی گئی تھی، ایک بار پھر توجہ کی درخواست ہے۔ آپ کے خط اور منی آرڈر کا انتظار رہے گا۔ اگر آپ منی آرڈر سے رقم ارسال نہ کر سکیں تو پوسٹ کارڈ کے ذریعہ دفتر کو وی پی بھیجنے کی ہدایت کریں۔

اگر آپ کسی وجہ سے شاعر کی ترسیل بند کرنا چاہتے ہوں تو آپ کی طرف شاعر کے جو بقایا جات ہیں ان کی تکمیل کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہے۔

دھنک رنگ

خورشید اکبر

پرندہ بے ٹھکانا ہو تو دیکھوں
فلک پر آب و دانہ ہو تو دیکھوں
ہو تیور بدلتا ہے کہاں تک
مرا بیٹا سیانا ہو تو دیکھوں
بغاوت بن بیاہی رہ نہ جائے
بہادر کا گھرانا ہو تو دیکھوں
تھکی ہاری ہوئی خواہش کے لب پر
تبسم فاتحانہ ہو تو دیکھوں
گناہوں میں دھنسے قدموں کے نیچے
کوئی غیبی خزانہ ہو تو دیکھوں

پی ایچ ای ڈی، ٹیکنکل سکریٹریٹ، پٹنہ۔ ۱۵ (بہار)

حشمت فاتحہ خوانی

خوابوں کا سلسلہ نہ خیال غبار اب
یعنی ہمارے لب، کہاں انتظار اب
ہے یا کہ کوئی آزمودہ خواب
تنہا لگے ہے بھیڑ میں اپنا شمار اب
تعبیر کیا بتائے گی نیندوں کی تشنگی
آموختہ پھر سے یاد کرو بار بار اب
ایسی ہی کوئی بات تھی دونوں کے درمیاں
گھٹا تھا جیسے دور ہی رہے ہوشیار اب
حشمت پڑی ہے کس کو ضرورت کہ جانئے
کرتا ہے کون شہر میں اپنا شمار اب

پوسٹ بکس نمبر ۳، بیدر ۱، ۵۸۵۴۰۱۔ (کرناٹک)

عبد الربّ فاخر

آ گئے ہیں مری اڑان کے دن
اب تو بدلیں گے آسمان کے دن
گاؤں "دوپہر" پانی مٹکوں کا
کیسے بھولوں وہ سائبان کے دن
تم نے زحمت تو کی سماعت کی
کھل گئے میری داستان کے دن
بے یقینی مٹے گی ذہنوں سے
جانے کب آئیں گے گمان کے دن
اس طرح ہیں بٹے ہوئے کردار
راتیں آنکھوں کی، اور زبان کے دن

لوہانی سرا، سہارنپور۔ (یو پی)

محسن رضا رضوی

قریب رکھ کے بھی نظروں سے دور رکھ چھوڑا
خرد بہ پردۂ تحت الشعور رکھ چھوڑا
سفر کے سخت مراحل سے ہم گذر تو لئے
بلا سے جسم تھکاوٹ سے چور رکھ چھوڑا
لکھا اگرچہ مفصّل نوشتۂ قسمت
معاملہ کئی بین السطور رکھ چھوڑا
مرے عروج سے جل کر فلک کے لوگوں نے
زمیں کا نام دیار قصور رکھ چھوڑا
وہ جس نے مجھ کو دیا علم و آگہی رضوی
اسی نے ذہن میں تھوڑا غرور رکھ چھوڑا

محلہ رحم خان دربھنگہ ۸۴۶۰۰۴

فیروز مرزا

بتا رہی ہے پھٹی آستین بچوں کی
نگل گیا ہے تعصب زمین بچوں کی
کسی نے مڑ کے نہ دیکھا، سسکتے لمحوں میں
ہوا میں اڑ گئی رکیسی مشین بچوں کی
بہار ٹی وی کی گھر گھر میں جب سے آئی
نظر بھٹکنے لگی ہے ذہین بچوں کی
یہ کون اترا ڈھلانوں میں آفتاب سے
اتر گئی ہے جو صورت حسین بچوں کی
سروں پہ سب کے کڑی دھوپ ہے مگر اے دوست
ردا ہے ماں کی دعا بہترین بچوں کی

۱-۵ نور محمد منشی لین ٹکیہ پاڑہ۔ ہوڑہ

خواب اکبر آبادی

حدیں بٹ گئیں ہیں زمیں آسماں کی
الگ چاند تارے لگانے ہیں باغ
الجھتا ہے کیوں تو طلسم فلک سے
ابھی مشکلیں ہیں زمیں پہ یہیں کا
غبار دل و ذہن تڑپا رہا
مگر بوتے ہی قصہ ہے یقیں
نیا انقلاب آ گیا ہے جہاں میں
پرندوں کو اب ڈر نہیں باز کا
ہوا جا رہا ہے یہ دل خشک کیوں خواب
سنا تو رہا ہے وہ باتیں رسیلی

اے-۳ کملا نگر۔ آگرہ۔ ۲۰۰۵

مکتوبات

رشید سمیع ـــــــ ایم آئی جی، مظفر پور (بہار)

شاعر کا تازہ شمارہ دیکھا۔ دیکھئے محترم! یہ شمارہ بہت اچھا لگا۔ سبب؟ مقالات اچھے ہیں۔ ن۔ م۔ راشد کی نظمیں (جو کسی مجموعے میں شامل نہیں)۔ بشیر بدر اور ظفر ... اور ان سب کے علاوہ سریندر پرکاش کے سلسلے سے جڑی باتیں ہیں۔ تفصیلات اور فسانہ کی پہلی قسط ایسا ہے کہ جب سلسلہ وار سلسلے چل رہے ہیں تو کسی تیسرے قسط وار سلسلے کو شروع کریں۔ اس لیے کہ رسالے کی ضخامت اس کی متقاضی ہے بھی کہ دو قسط وار چیزوں سے زیادہ ممکن بھی نہیں اور مناسب بھی۔ اب ذرا دیواروں کے بیچ کے سلسلے سے کچھ ضروری ... سوانح نگاری کی ہر چند کہ بہت سی مثالیں دیکھی ہیں کچھ مذہبی کچھ ادبی۔ مذہبی سوانح نگاری کی مثالیں تو بہت ہیں۔ صحابہ کرام کی زندگی کے واقعات سے اولیائے کرام کے واقعات تک، بہت لکھے گئے ہیں۔ اور اکتساب فیض بھی کیا ہے۔ ان کے علاوہ "یادوں کی بارات" اور بھی بہت کچھ ہے مگر ندا کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کے یہاں ایسا نہیں لگتا کہ کسی گلی یا محلے یا کسی شہر کا بیان ہے بلکہ لگتا ہے کہ خود گلی یا محلہ یا شہر اپنی بے زبانی کے باوجود بول رہا ہے اور تمام تر شور و شغب، بکھراؤ، بے ترتیبی، مایوسی، بے رونقی وغیرہ کو ادبی مقام حاصل ہے۔ اس کی نظریں اتنی گہری ہیں کہ فسادات کے پس پردہ فاشسٹ قوتیں اس کے یہاں بے نقاب ہو جاتی ہیں۔ اس قسط میں "بمبئی ناراض ہو کر شیو سینا کی جانب" سے آگے تک بہت ہی عجیب انداز سے اور گہری نظر سے تمام حالات کا تجزیہ ہے۔ اس سے اختلاف بھی کیا جائے تو بھی مخالف داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ زندگی اصل میں حرکات سے عبارت ہے۔ اور کوئی بھی زندگی رائیگاں نہیں ہوتی

THAT NOTHING WALKS WITH AIMLESS FEET
THAT NOT ONE LIFE SHALL BE DESTROYED
OR CAST AS RUBISH TO THE VOID
WHEN GOD HAS MADE THE PILE COMPLETE
(IN MEMORIAM: TENNYSON)

جب گم شدہ گھر کی تلاش کرتا ہے وہ اسے بمبئی میں اسٹیشن کے احاطے میں ایک چھوٹے سے نیم کے پیڑ میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ تلاش کی یہ نوعیت DUALISM آئینہ دار ہے۔ اس کے دل کے اندر سمندر کی بے قرار موجیں ہیں۔ فضائیں مارتی ہوئی آتی ہیں اور سر پٹک پٹک کر ساحل سے لوٹ رہی ہیں۔ یہ موجیں جو بمبئی کے ساحل تک آتی ہیں گوالیار، کراچی اور بمبئی کے درمیان متلاطم تھیں اس کے ایک ایک سرا بندھا ہے۔ دوسرے سرے پر اس کے جذباتی ... ہیں ان کو نہیں کر دیتے ہیں۔ پیش کرنا بہت مشکل ہے۔ منٹو کی نصیحت یاد ہے کہ "میں ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں اس سماج اور تہذیب پر جہاں یہ دستور ہو کر مرنے کے بعد کسی کا کردار اور تنقیص لانڈری میں دھل کر آئے اور رحمت اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکا دیا جائے"۔ ندا کے یہاں کوئی تصنع، تکلف، بناؤ سنگار، کریم، پاؤڈر وغیرہ مہیا نہیں۔ وہ جیسے ہیں ویسے ہی ...

کی نثر اور شاعری ہے۔ اور نثر بھی حیرت انگیز ہے۔ ایسی نثر جس سے شاعری اکتساب فیض کرے۔ اضطراب مانگے۔ سادگی اور سلاست کا لفظ بھی کافی نہ ہو کہ یہ نثر تو کسی کامیاب شاعر کی نہیں۔ یہ وہ زبان نہیں جو فلسفی لکھتا ہے، اردو کا محقق لکھتا ہے، ناقد لکھتا ہے، افسانہ نگار لکھتا ہے، تبصرہ نگار لکھتا ہے، صحافی لکھتا ہے۔ یہ وہ نثر ہے جو طرز اظہاری نہیں طرز احساس بھی ہے، طرز فکر بھی ہے اور عام فہم بھی اور اس کی ادبی حیثیت سے انکار ممکن نہیں۔ یہاں واقعات کردار بن گئے ہیں اور ندا وہ مرکزی کردار ہے جو انھیں جوڑتا ہے اور غیر متعلق اشیاء کے مابین اپنے زور تخیل سے رشتہ نکال لیتا ہے۔ ندا نے مجھے اس کی اشاعت کے بعد پہلی کاپی بھیجنے کی بات لکھی ہے۔ میں اس پر انشاء اللہ لکھوں گا۔ بہت محنت سے، بہت صرف وقت سے۔ یہ آپ کی مرضی کہ شاعر میں اسے جگہ دیں؟ ورنہ کہیں اور سہی۔ مگر یہ سلسلہ خوب سے خوب تر کی جستجو کی ہے۔

مجتبیٰ حسین ۔ ۷/۷ این سی ای آر ٹی کیمپس، اروبندو مارگ، نئی دہلی

شاعر کا تازہ شمارہ ملا، شکریہ۔ شرمندہ ہوں کہ ایک طویل عرصے سے شاعر کے لیے کچھ نہیں لکھ سکا۔ سچ پوچھئے تو اپنے اطراف جس طرح کا معاشرہ پروان چڑھ رہا ہے وہ کچھ ایسا بے علم اور بے معنی ہے کہ ادب، آرٹ اور کلچر کی بات کرنے کو جی نہیں چاہتا، یوں لگتا ہے جیسے ادب اور آرٹ بے معنی سے ہو گئے ہوں IRRELEVENT سے ہو گئے ہیں۔ اردو دنیا یوں بھی سکڑتی جا رہی ہے اور اس سکڑتے ہوئے معاشرے میں بھی اتنی سازشیں اتنی مصلحتیں ہیں کہ کوفت ہوتی ہے۔ یہ موضوع ایسا ہے جس پر کبھی کھل کر اظہار خیال کروں گا۔

ندا فاضلی کی خود نوشت بہت اچھی ہے۔ ندا کی شاعری کے تو ہم پہلے ہی سے قائل ہیں، اب ان کی نثر کے قتیل ہو گئے۔ پہلے بھی تھے مگر اب اور زیادہ ہو گئے۔ میں نے ندا سے کہا تھا کہ اسے کتابی صورت میں جلد شائع ہونا چاہیے۔

علی ظہیر ۔ ساز اپارٹمنٹس، روڈ نمبر ۱، بنجارہ ہلز۔ حیدر آباد

شاعر پابندی سے مل رہا ہے اور میں اسے اسی انہماک سے پڑھتا ہوں۔ جیسا کہ پہلے پڑھا کرتا تھا۔ ندا فاضلی کی تحریر نے شروع میں بہت متاثر کیا تھا لیکن جوں جوں باتیں آگے بڑھ رہی ہیں بعض گوشے اس خود نوشت کے کمزور پڑتے جا رہے ہیں۔ شاید ایک ساتھ اگر اسے پڑھا جائے تو ایسا محسوس نہ ہو۔

خورشید ملک ۔ ۲/ین محلہ، شاہ جہاں پور (یوپی)

شاعر کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ سریندر پرکاش کے ناول کی پہلی قسط پڑھی، ابھی اس کے بارے میں کچھ کہنا بہت قبل از وقت ہوگا۔ ندا فاضلی کی خود نوشت اب بور کرنے لگی ہے اب تو یہ احساس ہونے لگا ہے کہ ندا کی سوانح نہیں بلکہ ان کا کشکول ناتہ بھرا جا رہا ہے۔

فاروق شفق ۔ پی۔ ۱۸۵، دھان کھیتی، محمد ڈن ریچ، کلکتہ

تازہ شمارہ ن۔ م۔ راشد اور سریندر پرکاش کی موجودگی سے خاصا وقیع ہو گیا ہے۔ بالکل خاص نمبر کا حکم رکھتا ہے۔ راشد صاحب کی تمام نظمیں نہایت دلچسپی اور محویت کے ساتھ پڑھیں اور بہت کچھ سیکھا۔ یہ آپ نے بہت اچھا کیا کہ سریندر پرکاش کے ایک اہم ناول کو اس ماہ سے قسط وار شائع کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ وہ نئے ادیب و شاعر جنھوں نے چھٹی، ساتویں دہائی میں لکھنا شروع کیا تھا، اب ان کی خدمات کا اعتراف سرکاری سطح سے لے کر عوامی سطح تک ہونے لگا ہے۔ سرکاری سطح پر بلراج کومل، شمس الرحمن فاروقی، شہریار اور سریندر پرکاش کو ساہتیہ اکاڈمی کے انعام و اعزاز کی شکل میں نوازا جا چکا ہے۔ اس سال ایک نوجوان لیکن نسبتاً کم معروف افسانہ نگار اور ناول نگار عبدالصمد کو بھی ساہتیہ اکاڈمی کا انعام دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ برسوں میں بھی یہ نئے ادیبوں کے نوازے جانے کا یہ خوش آئند سلسلہ جاری رہے گا۔ سریندر پرکاش کو ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ کے علاوہ مہاراشٹر کا بھی بہت بڑا ادبی انعام ملا ہے۔ اس کے لیے حکومت مہاراشٹر اور جناب سریندر پرکاش دونوں ہم اردو والوں کی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اس مرتبہ بھی تازہ اور عمدہ نظمیں اور غزلیں کافی تعداد میں آپ نے چھاپی ہیں۔ راشد کے علاوہ مجھے حمید الماس کی نظمیں اور جناب محمود ایاز کی غزل بطور خاص پسند آئی۔ بشیر بدر کی یوں تو آپ نے نو غزلیں شائع کی ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے ایک بھی متاثر نہ کر سکی۔ نو غزلوں میں بمشکل دو چار شعر ایسے ہیں جن پر نظر بار بار رکتی ہے اور جو معنی کی نئی جہتیں سامنے لاتے ہیں۔ ان غزلوں کو پڑھ کر میں نے ذاتی طور پر اندازہ لگایا کہ اب بشیر بدر کا خود کو دہرانا بلکہ اپنے آپ کا مکمل سایہ صاف دکھائی دے رہا ہے۔ لفظوں کی یہ بازیگری وہ بہت پہلے اپنی غزلوں میں دھوم دھڑاکے سے دکھا کر قارئین کو مسرور اور حیرت زدہ کر چکے ہیں۔ اب یہ طلسم ٹوٹ گیا ہے اور سحر فسوں ہوا ہو گیا ہے۔ ویسے میں ذاتی طور پر بشیر بدر کو پسند کرتا ہوں۔ وہ واقعی بڑے شاعر ہیں۔ کاش! وہ اپنا قدم برقرار رکھتے اور جدید غزل کو نئی جہتوں سے روشناس کراتے۔

اس شمارے میں آپ نے دو مضامین شامل کیے ہیں۔ برادرم سلیم شہزاد کا مضمون تو خیر اچھا ہے اور محنت سے لکھا گیا ہے ادھر وہ جدید غزل اور جدید نظم کی لفظیات پر اچھا کام کر رہے ہیں۔ عقیل صاحب کا مضمون مجھے بالکل پسند نہیں آیا۔ خدا جانے آپ کیوں ایسے از کار رفتہ اور فرسودہ موضوعات کے لیے شاعر کے قیمتی صفحات وقف کرتے ہیں۔

یہ ایسے مضامین ہیں جو دل کو بجھا دیتے ہیں ان کو پڑھ کر ذہن میں کوئی ہلچل نہیں ہوتی نہیں ہے کوئی وزن کمنٹ دکھائی دیتا ہے۔ صاحب! پتہ ہی نہیں چلتا کہ کچھ واقعی پڑھ کر اٹھا ہوں۔ بہتر تھا اس کی جگہ کوئی اچھا سا افسانہ یا چند چار غزلیں چھاپ دیتے۔ ندا فاضلی کی سوانحی قسطیں حسب معمول پسند آ رہی ہیں۔

خالد عبادی ۔ پورہ ٹانک، نہ کنارے، دربھنگہ (بہار)

آپ ہمیشہ کچھ نہ کچھ کر دکھانے کی کوشش میں اکثر و بیشتر واقعی کچھ کر بھی دکھاتے ہیں۔ شمارہ نمبر ۳ (۱۹۹۱) میں ن۔ م۔ راشد کی دس نظمیں اس بات کی شاہد ہیں لیکن "مکان" کو اس نظم ...

دیکھنے کے لیے آپ مجبور نہیں کر سکتے۔ کچھ صفحات دیکھیے جو ہاں!
ہاشم علی کی تقسیم اور محمود ایاز کی غزل کے بارے میں آپ ضرور دیکھنا
ہوں گا کہ اگر مجھے موقع ملا تو انھیں تعریفی خطوط لکھنے میں جلدی سے
کام لوں گا۔ آپ کے اداریے کا کون ہے جو قائل نہ ہوگا۔ آپ ہمیشہ
بہت بات صحیح وقت پر کہتے ہیں۔

مدثر القمر ۔ جیلانی پریس، پرنس مارکیٹ، لاڈ بازار، حیدرآباد۔
تازہ شمارہ ملا۔ خوبصورت ہے۔ سُرمیندر پرکاش کا ناول
ناقابلِ فہم ہے۔ بشیر بدر، حمید الماس اور راشد وحی کا کلام
اچھا ہے۔ مومن کا بڑا قدیم نسخہ آپ نے نکالا ہے۔ خوشی کی بات
ہے کہ شاعر روز بروز نکھرتا جا رہا ہے۔

عبدالعظیم فیروز آبادی ۔ نادر بخش اینڈ کمپنی۔ فیروز آباد (یوپی)
میاں افتخار! یہ کیا بکواس ہے۔ افسانہ کسے کہتے ہیں؟
افسانے یا فسانہ کی ماں ہے یا اس کے باپ کا نام ہے؟ کیا ستیہ پال
نے اس لفظ کے اور یہ کس زبان کا لفظ ہے؟ لفظ ناول تو ہے ہی اس
سے بھی زیادہ مہمل تر اس کا پلاٹ ہے۔ آپ کہیں گے پلاٹ ہے کہاں!
ہاں! نہیں ہے۔ لیکن اس بغیر پلاٹ کے یا مہمل پلاٹ کے ناول کیسے
لکھے جاتے ہیں تو ہم ایسے کم سواد یا بے علم طالب علم اسے کیوں کر پڑھیں
میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کی کون سی خوبی نے آپ کو اس کی
اشاعت پر آمادہ کیا۔ شاید آپ میرے استادِ محترم رشید احمد صدیقی
کے مقولے کی صداقت کے قائل ہیں۔ فرماتے تھے: بے معنی ہونا
بڑی بامعنی بات ہے۔ شاعر کے صفحات اتنے ارزاں نہیں
ہیں کہ انھیں ایسی بے معنی تحریروں سے سیاہ کیا جائے۔

نعیم بن آرسی ۔ محلہ نچھارا، مغل سرائے (یوپی)
شاعر شمارہ نمبر ۴، جلد ۶۲ میں سریندر پرکاش کی تصویر بہت
خوب ہے اور اس سے بھی زیادہ خوبصورت ان کی تحریر ہے۔ لیکن مجھ جیسے
کم فہم کے تو کچھ نہیں پڑا۔ دوسروں کا حال نہیں معلوم۔

سلیم شہزاد ۔ ۲۲۳، سیکٹر ۶، واشی، نئی ممبئی ۴۰۰۷۰۳
عظیم شعری روایات اور جدید اردو شاعری کے عنوان سے آپ نے
شاعر (۱۹۹۱ء) میں جو اداریہ سپردِ قلم فرمایا ہے اس کے
مطالعے سے واضح ہے کہ عصری فن کار اردو شاعری کی روایتی
اصناف سے احتراز برتتے اور غیر مستند، غیر روایتی اور ایجاد بندہ
قسم کی ہیئتوں کو اپنے شعری اظہار میں بروئے کار لاتے ہیں۔ موجودہ
ادبی یا شعری صورتِ حال میں یہ کہاں تک ناگزیر ہے کہ متروک رو
ایتی شعری ہیئتیں آج اختیار کی جائیں؟ کیا ماضی کی تمام شعری
روایات کو فن کار آج بھی لازمی تصور کرے؟ (محسوس ہوتا ہے کہ ہیئت
اور مواد کا پرانا سوال پھر اٹھا لیا ہے) دوسرے دور کی طرح یہ
سوال اور فنی منظر نمایاں ہے کہ ہر دور میں فن کے تقاضے یقیناً جدا ہوتے
ہیں۔ کیا آج قصیدے کی ضرورت ہے؟ واسوخت کی صنف سے
آج کی بڑی حد تک غیر رومانی شعری فضا میں کیا کام لیا جا سکتا ہے؟
رثیے جو ہمارے یہاں بعض روایات کی بنا پر کربلا کے بیان تک محدود کر دیا گیا
ہے۔ کیا پھر اس کا احیا کیا جانا چاہیے؟ وغیرہ۔
آپ فرمائیے، دیکھیے کہ اپنی تحریر میں آپ کیا کہتے ہیں:
غزل کو نظم یعنی شاعری سے الگ تصور کرتے ہوئے آپ
جتاتے ہیں کہ اردو کی عظیم شاعری کا تصور صرف غزل سے عبارت
نہیں بلکہ نظم کی دیگر اصناف نے اسے لازوال شعری سرمایہ
عطا کیا ہے۔ اگر نظم اپنی اصناف رکھتی ہے! اور شاعری کے مفہوم میں
یقیناً رکھتی ہے، تو غزل بھی انھیں میں سے ایک صنف ہے۔
"حرف ولفظ کی روحانی تہوں کی غواصی" کا فقرہ محض لفظی
ہے یا شاعری۔ شاید آپ کی مراد حرف و لفظ کی معنوی تہوں سے
ہے۔ آپ کی مذکورہ تہوں میں غواصی کے بعد تبصرہ شمار نامعلوم
جہانوں کی سیاحی اور دنیا کے ارتقائی رنگ و روپ کی صورت
گری۔ کو بھی میں تغافل ہی کہتا ہوں "رنگ و روپ" میں عاطفت
زائد ہے۔ آپ کی ترکیب "خیال و جذبہ" بھی اسی زیادتی کی مثال
ہے۔ بلکہ میں تو "حیرت و تحیر" کی بجائے "تحیر و حیرت" لکھنا زیادہ
فصیح خیال کرتا ہوں کیوں کہ اس میں آپ کی ترکیب کا "ت و ت"
کا ادغام موجود نہیں۔

فرماتے ہیں آپ کہ غیر معمولی فن پاروں نے خیال و جذبے
کی جو بھی کائنات خلق کی وہ حیرت و تحیر اور تلاش و جستجو کی ادبی
تاریخ ہی۔ تسلیم کہ فن پارے کائنات خلق کر سکتے ہیں لیکن یہ
کائنات تاریخ کس طرح بن سکتی ہے (کائنات بذاتِ خود تاریخ کو
کائنات کی تاریخ؟)

شعری اصناف یا ہیئتیں اضافی یعنی خارجی تصورات ہیں
جہاں تک میرے اپنے شعری تجربات کا تعلق ہے تو میں اپنے داخلی
آہنگ سے ان خارجی تصورات کو مرتب و مہذب اور اپنی مرضی سے
انھیں اخذ یا ان سے اجتناب کرتا ہوں یعنی میرا شعری وجدان اس
سلسلے میں میرا رہنما بنتا ہے نہ کہ اپنے شعری اظہار کے لیے میں بنی
بنائی ہیئتوں کا پابند ہوتا ہوں۔ آپ کی ایک بات سے پتا چلتا
ہے کہ موزونیت اور زبان پر قدرت سے عجزِ کلام کی گنجائشیں
کم ہوتی ہیں۔ درست فرمایا مگر جناب اس بات کے کہنے میں
آپ نے کتنے الفاظ ضائع کر دیے ذرا اسے بھی ملاحظہ فرمائیں:
"موزونیت پر مکمل گرفت، شاعری کا عرفان اور علوم متداولہ
کے ساتھ بے مثال ذخیرۂ الفاظ، حرف و لفظ سے دوستی، لغت
سے یاری، باضابطہ درس و تدریس اور بے پناہ ریاضت"
اللہ کی پناہ!

"دوستی" اور "یاری" کی زبان میں عظیم شعری روایات پر
اداریہ لکھنا آپ ہی کا حصہ نظر آتا ہے۔ ان تمام خصوصیات سے
ایک ہی مفہوم نکلتا ہے کہ شاعر کو زبان اور اس کے اظہار پر قدرت
حاصل ہونی چاہیے (جس سے وہ مختلف اصناف میں اپنا شعری
اظہار کر سکتا ہے یا جس کی بدولت پیشرو اکابر شعراء مختلف اصناف
میں کمال دکھا گئے) اگر مثنوی، مرثیہ، قصیدہ اور غزل وغیرہ ہماری
شاعری کی عظیم روایات ہیں اور آج غزل کے سوا ان میں سے کوئی
صنف رائج نہیں تو کیا آج کا شعری سرمایہ دوسرے درجے کا ہو گیا؟
آج پہلے درجے کی شاعری آپ کسے خیال کرتے ہیں؟ ساحر و فیض،
مجروح و تاباں، اعجاز، ناصر و شکیب اور عمیق و سلیم وغیرہ کی شاعری
آپ کس زمرے میں شامل کرتے ہیں؟
آپ کا دعویٰ ہے کہ آج غزل، آزاد نظم اور نثری نظموں میں شاعری
کا وہ عرفان نہیں ملتا جو ہمارے بزرگ شعراء نے نظم کی مختلف
اصناف میں کلاسیکی شاعری کے ذریعہ ہمیں عطا کیا۔ میں پوچھتا
ہوں کہ ایسی کون غیر کلاسیکی شاعری آپ چھاپتے کیوں ہیں؟ آزاد
اور نثری نظم پر شاعر کا خصوصی نمبر آپ نے کیوں شائع کیا
(جس کی اشاعت پر یقیناً آپ فخر محسوس کرتے ہوں گے)
کیوں آپ کل جیسے کلاسک کی امید لگائے بیٹھے ہیں؟ آج کے
یقیناً کل سے مختلف ہوں گے، ان میں مماثلت ڈھونڈنے
ضروری نہیں کہ ارسطو کے کلاسیکی اصول آج کے فنون پر بھی
کر دیے جائیں۔ میر نے ہزاروں اشعار کہے لیکن ایمان سے
کہ کیا صرف چار پانچ سو اشعار میر کے آپ کے کلاسیکی
پرفیکٹ نہیں آتے! (یا تمام آ جاتے ہیں؟ میر کے ہر دو
نشتر مشہور ہیں) تو میں کہتا ہوں کہ آج کے صرف چار پانچ
اشعار کہنے والے اچھے شاعر کے ساڑھے تین چار سو اشعار بہتر
ہیں پھر ہزاروں اشعار سے دفتر سیاہ کرنا کیا معنی اور جناب
کسے صرف شعر گوئی برائے شعر گوئی کی فرصت حاصل ہے میر
سودا کی طرح (اب مشاعروں میں شعر پڑھنا اس کی ضرورت
تو یقیناً وہ سیکڑوں اشعار کہتا ہے عجزِ کلام اور حشو و زوائد
مملو)، غزل اور نظم میں "صرف خیال رہ گیا ہے" کی شکایت سے
ہیئت پسندوں میں شامل ہو جاتے لیکن افسوس کہ آپ کی
ہیئتیں آج ازکار رفتہ ہو گئی ہیں یعنی عالم آشوب، مرثیہ، مثنوی
اور واسوخت وغیرہ۔ آج ان کی چنداں ضرورت نہیں۔ شہر
میں عالم آشوب لکھنا (جو ایک ادبی صنف ہے) کوئی
نہیں۔ آزاد نظم میں اس کے اچھے نمونے کئی فن کاروں کے یہ
موجود ہیں۔ مرثیہ اور مثنوی بھی اس ضمن میں آتے ہیں۔ قصیدہ
اس لیے غیر ضروری ہے کہ روایتی ممدوح ختم ہو گئے ہیں۔ اگر
سیاسی لیڈروں کی مداحی تو آپ کا مقصد نہیں اس ہیئت کے
سے)، واسوخت آپ کی کلاسیکی شاعری میں کس پائے کا تھا
کہ آج اس صنف کو پھر زندہ کیا جائے۔ آج تو آپ کی شاعری
سے عشق کا دل جلانے والا انداز بھی ہوا ہو گیا ہے جناب
میں یا آپ کیوں کہیں یہ واسوخت وغیرہ!

اداریے کے اختتام پر آپ نے ایک سوال کیا ہے لیکن آپ
کی جذباتیت آپ کے اظہار پر حاوی ہو گئی اور سوال کچھ کا کچھ ہو
رہ گیا ہے، دیکھیے: ہماری شعری روایت کی تابناکی صبحِ غزل
پیش، آج کی اردو شاعری اپنی روایت کو آئندہ نسلوں تک
کن اضافوں کے ساتھ لے جائے گی؟
یہ کیسا گنجلک سوال ہے سمجھ میں نہیں آتا اور جو سوال کچھ سمجھ
آتا ہے یعنی یہ کہ کیا آج کی غزلیں شاعری، نثری نظمیں، آزاد نظمیں ہماری شعری
روایات کا حصہ بن سکتی ہیں؟؟ (دو سوالیہ نشانات آپ ہی نے
لگائے ہیں) تو حیرت ہے آپ کی بے خبری پر کہ آزاد نظم کو ہماری
روایت کا حصہ بنے اب نصف صدی گزر چکی ہے اور اگر سجاد
ظہیر کی نثری نظموں کو اس صنف کا ابتدائی نمونہ تسلیم کریں تو نثری
نظم کو بھی اتنا ہی زمانہ گزر چکا ہے اردو شاعری میں اتنا زمانہ
اور یہ مدت کسی بھی شعری رجحان کو روایت میں تبدیل کرنے کا
کافی ہے۔ چند ہی ایک میں صرف لاعلم حضرات آزاد اور نثری نظم
کے نام سے بدکتے ہیں ورنہ ان اصناف یا ہیئتوں کا بول بالا ہے!
بول بالا ہے (بول بالا کی بجائے شاید بول نظر ہو)

فکر امروز



ابن خلدون خیالات کو پانی سے تشبیہ دیتا ہے اور الفاظ کو پیالے سے۔ وہ کہتا ہے کہ پانی سونے کے پیالے میں دیا جائے تو اس قدر بڑھ جاتی ہے، اور مٹی کے پیالے میں دیا جائے تو گھٹ جاتی ہے۔ میرے خیال میں پانی بھی خوش گوار ہونا چاہیے اور پیالہ بھی شستہ وصاف اس لیے کہ اصل چیز تو پانی ہی ہے مگر ظرف کی نفاست بھی ضروری ہے —
اس پر بھی اگر کوئی خیال آسان الفاظ میں موزوں ہو سکتا ہو تو مشکل الفاظ لانا ضروری نہیں لیکن میرا تجربہ ہے کہ اکثر ایسا نہیں ہوتا اور خیال جتنا بلند ہوتا ہے، الفاظ بھی اسی نسبت سے آتے ہیں مثلاً غالب کا یہ شعر: ~

بساطِ عجز میں ایک دل مِلا۔ ایک قطرۂ خوں میلا وہ بھی
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

[دستور الاصلاح]

شاعر

اشاعت کا ۶۲ واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

جلد — ۶۲
شمارہ — ۹

فون: ۳۵۹۹۰۳

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاونت
ناظر نعمان صدیقی

قیمت :- ۵ روپے

زرِ سالانہ ۵۰ روپے
لائبریریوں سے ۶۰ روپے

تاعمر خریداری ۱۰۰۰ روپے
معاونین سے ۱۰۰ روپے
ممالک غیر سے ۳۵۰ روپے

اُردو کی ایک یادگار کتاب

چند تصویرِ بُتاں

[ایک البم]

اُردو زبان و ادب کی تاریخ ——— تصویروں میں

سنہ ۱۲۵۳ء ✱ سنہ ۱۹۳۰ء

مرتب ✱ صابردت

قیمت ✱ ۵۰۰ روپے

یہ وہ کتاب ہے جس کو چھپنے سے پہلے ہی دانشوروں اور محققوں نے مستند قرار دیدیا ہے

"اب تک ان مشاہیر کی تصاویر صرف چند مخصوص درس گاہوں ——— یا ادبی دفاتر میں نظارہ کی جا سکتی تھیں۔ اب صابردت کی اس کاوش سے ہر کوئی اپنی محبوب شخصیت کے نظارہ خدوخال سے اپنی آنکھیں سیراب کر سکتا ہے۔"

[فیض احمد فیض]

"... یہ البم بھی اپنی دستاویزی اہمیت کی وجہ سے بہت پسند کیا جائے گا۔"

[قرۃ العین حیدر]

"... اس عہد کی ادبی تاریخ صابردت کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی ———"

[سردار جعفری]

"... اور اس بار صابردت نے حد ہی کر دی۔ ہر قابلِ ذکر ادیب اور شاعر کو ہو بہو سامنے لا کھڑا کر دیا کہ قاری دیکھ لے کہ وہ غالبؔ دیکھنے میں کیسے تھے جن کا آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جاتا تھا۔ اور وہ فیضؔ کیسے تھے جن کے لہجے میں ستار بجا رہتا تھا"

[راہی معصوم رضا]

"... صابردت نے اپنی محنتوں سے ایسے البم کی ترتیب دی ہے جو جبلی حصاروں سے آزاد ہے"

[باقر مہدی]

آپ بھی اپنی کاپی محفوظ کر لیجئے

ساحر پبلشنگ ہاؤس

"پرچھائیاں" اے، بی نائر روڈ۔ جوہو چرچ بمبئی ۴۹۔ فون ۶۲۰۲۸۳

Regd. Office : PARCHHAIYAN, A. B. NAIR ROAD, JUHU CHURCH, BOMBAY-400 049.

شمارہ نمبر ۶ [۱۹۹۱] جلد ۶۲

ذہنِ انسانی سے ویرانیاں اُبھر رہی ہیں

عصری ذہنی گونج کی شعوری رو

جاریہ صدی کا اختتام قریب تر ہے۔ اس پوری صدی میں ذہنِ انسانی نے گذشتہ صدیوں کی گونج کو حیرت انگیز تناظر عطا کئے ہیں اور تغیر و تبدل کے فلسفے کو یکسر نئے سوال دئے ہیں۔ انقلابات کی اپنی جو بھی تاریخ ہے وہ حیرت انگیز رہی ہے تاہم عصری انقلابات اپنی ایک الگ تاریخ بنا رہے ہیں۔ کل کے انسان کا ذہن آج روشن تر ہے اور افہام و تفہیم کے نئے منظرنامے اُبھر رہے ہیں اور تیز تر ہیں لیکن عصری ذہنی گونج میں، یہ دنیا اور کائنات نہ تو نتیجہ ہیں اور نہ ہی حاصل۔ گذشتہ کل سے آنے والے کل کا رابطہ ہمارے آج سے بنتا ہے اور یہ 'آج' ایک ایسا تاریخی مواد ہے جس کی شاید کوئی نظیر نہیں بنے گی۔ لیکن سرحدوں سے ٹکراتا، الجھتا، بے چین، بے قرار انسان اپنی پوری سائیکی کے بکھراؤ کی زد پر بھی ہے۔ اس کے احساسات پر ہونے والی مسلسل دھمک کی گونج، آواز بننا چاہتی ہے اور اس آواز کی شکلیں کیا ہوں گی، کہنا آسان نہیں۔ ہماری ٹھوس ریزہ، خار موٹے اور منشور اپنے آپ میں کچھ رہے ہیں۔ کائنات میں بہت تیزی کے ساتھ تغیر ہو رہا ہے جس کے اثرات اس زمین پر بھی مرتب ہو رہے ہیں اور انسان ان اثرات کی شدت کو بے طرح محسوس کر رہا ہے۔ انسانی ذہن اور پوری کائنات کے درمیان ایک کشاکش ہے اور کوئی پل اس سے خالی نہیں۔

بے شمار انسانی ذہنوں میں یہ زمین، یہ پوری کائنات اپنی تمام تر انتہاؤں کے ساتھ کہیں نامعلوم پڑی ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ آنے والی صدی میں یہ دنیا سمٹ جائے، اس پوری کائنات میں کہیں تحلیل ہو جائے۔ دیگر سیاروں سے کوئی نئی مخلوق ابھرے یا تمام سیارے پگھل جائیں کہ سورج کا سفر بھی ان کی طرف جاری ہے۔ کائنات کا اسرار، انسانی ذہن کے اسرار سے کم نہیں۔ زمین کے احوال و آثار، اختتامی رزمیہ پیش کر رہے ہیں اور اس نقطے کی طرف تیزی سے محوِ سفر ہیں جہاں سے زمین نے آغاز کیا تھا۔ گذشتہ کل کا آغاز آنے والے اختتام میں گم ہو جانے کے لئے بے چین ہے۔ تحفظ، طاقت اور حکومت، ایک زبردست انتشار ہے۔ انسانی ذہن میں اب ویرانیاں ابھرنے لگی ہیں۔ جس آزادی کے تصور کے لئے سرحدیں بنی ہیں اور بن رہی ہیں وہ تو غلامی ہی کا دوسرا روپ ہیں۔ اجتماعی طور پر آزادی کے خواہش مند دراصل انفرادی سطح پر اپنے آپ کو غلام ہی کر رہے ہیں۔ علاحدگی پسندوں نے سمٹنے کے عمل کو بہت تیز کر دیا ہے اور تمام مسائل کے حل ہو جانے کو ہی ایک راستہ سمجھ لیا ہے۔ تو کیا شب و روز کے بطن سے ابھرنے والے فطری تقاضے یہی ہیں یا کچھ اور ہیں؟ سب کچھ ہونے کے باوجود انسان بے بس ہی ہے کہ اختیارات کی روح پر قبضہ کسی اور کا ہے۔

اسی صدی کے اختتام تک یہ دنیا یہ پوری کائنات جن نئے انقلابات سے گذرے گی اس کے عکس انسانی ذہن میں ابھر رہے ہیں۔ سائنس، فلسفے، مذاہب، اقدار، تحریکیں اور ان سب کے درمیان تمام فنونِ لطیفہ کے جو وژن ہیں ان کے کلیشیز کو ٹوٹنا ہے، پگھلنا ہے اور حرف و لفظ میں نئے مفہوم بھرنے ہیں۔ ؎

لفظ وہی ہیں جو کل تھے
مگر تناظر بدل گئے ہیں

شہ زور کاشمیری

غزل

تیری یاد آج پھر خدا جانے — کیوں لبھاتی ہے دل کے ویرانے

ناتمامی سے جو تمام ہوئے — ہائے وہ درد و غم کے افسانے

جان کر آج بن گئے انجان — میکدے کے بھی جانے پہچانے

المدد اے تصورِ جاناں — تا بہ حدِ نظر ہیں ویرانے

میکدے پر سکوت چھایا تھا — میں نے ٹکرا دئے ہیں پیمانے

تیرا دامن اور اُن کے ہاتھوں میں — آج کچھ ہوش میں ہیں دیوانے

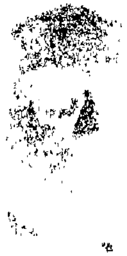
اس تبسم کا شکریہ، لیکن — شمع ایک اور سو ہیں غمخانے

بے تعلق بھی کیا قیامت ہے — تم نہ میرے ہو اور نہ بیگانے

خود سے شہ زور ابھی ہے بیگانہ
اور کسی کو چلا ہے اپنانے

غلام قادر شہ زور کاشمیری [پ: ۱۹۱۵ء سری نگر۔ م: جون ۱۹۹۰ء] تلامذۂ سیماب کا ایک اہم نام ہے۔ کشمیر اور اس کے ملحقہ علاقوں میں استاد کا درجہ حاصل تھا۔ وادی کے بیشتر شعرا کی شعری شخصیت کی تشکیل و تعمیر کی [حامدی کاشمیری ان میں سے ایک ہیں] عمر بھر گوشہ نشیں رہے اور چھپنے چھپانے کی طرف کم ہی توجہ دی۔ شہ زور اگرچہ پُرگو شاعر تھے تاہم ان کا سارا کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ پڑا ہے۔ کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔

[فرید پربتی۔ سری نگر]



خواجہ حسن نظامی بنام حسن الدین احمد

پ: ۱۸۷۸ ——— م: ۱۹۵۵ء

از آرام محل۔ سوماجی گوڑہ حیدرآباد۔

۲۸ رمضان المبارک ۱۳۶۷ھ دوشنبہ

مجموعہ محاسن دین جناب سید حسن الدین صاحب

السلام علیکم۔ آپکے دو مکتوب ملے۔ میری مطلوبہ معلومات آپ نے عنایت کیں شکریہ۔ میری کتاب خزانہ چھاپا جاتا ہے جلد شائع ہو جائیگی۔ کتابت ہو چکی ہے اور طباعت ہو رہی ہے۔ یہ دو جلدیں اور ادا ادوین ہیں جو کچھ ہوسکا قلم بند کر دیا۔ کیونکہ اب میری زندگی قریب الختم ہے۔ خواہش حیدرآباد کی خاک میں ہی راحت میسر آئیگی۔ اور جو کچھ لکھ سکونگا اس ملک کی یاد کو تمام اردو دنیا میں یادگار بنائیگا۔

آپ نے ترتیل قرآن شریف کی پانچ سو جلدیں خریدنے کی اطلاع دی ہے اس کا بہت شکریہ۔ مگر قرآن شریف کی ایک ہزار جلدیں دہلی میں ابھی میرے پاس صرف ایک یا دو جلدیں ہیں۔ اور دہلی سے آنا ممکن نہیں ہے۔ تاہم آپکی توجہ اور دین دوستی کا میرے دل پر بہت اثر ہوا۔

دعاگو حسن نظامی

پینٹس

زاویوں سے کچھ نظم



صلاح الدین پرویز

(۱)

جل رہی تھی آنکھ میں کھڑکی،
مقفل دونوں پٹ،
شعلہ دواں سی وہ، کہیں کھڑکی کے پیچھے،
اور میں نیچے کہیں،
ٹھنڈی ٹھنڈی جنوری کی کپکپاتی دھند میں ملبوس۔
آسماں خاموش، بے چاند اور بے نور،
لیکن اک حصے پہ اس کے،
(اگرم ماضی میں کبھی ہوتا تھا جب سرخاب چاند)
دھند کا کوچہ،
در و دیوار، جلتی مٹیاں،
کچی منڈیریں، سر بسر سرسبز خوابوں سے ڈھکی
فانتیں، موم سے معمور،
بادلوں سے چھت مرصع،
آنسوؤں کی چھوٹی موٹی چیزیوں کی الگنی۔
اک شجر آنگن میں
شاخوں سے الجھتا چاند،
نیچے سرخ سورج
سینہ بھرا ہے اس کی آنکھوں میں
نہیں یہ گھر نہیں اک جزیرہ ہے سمندر میں
سمندر میں نہیں پانی،
بہت سی گرد اور طوفانوں کی آمد،
اک سفر درپیش ہے
کہ سفر ہے کنیت سب کی
اشاث کو تبدیل ہونا ہے)

(۲)

یکایک شاث کے تبدیل ہونے سے،
مری آنکھوں میں ایسے معجزے کی ساعتیں آئیں
کہ سینہ سنسناتا ہے۔
کہ شب جو اس سے پہلے دکھ ملالوں سے بھری تھی
کہ شب جو اس سے پہلے، لمحۂ جاں پہ،
ہزاروں سال کی ہجرت کے ہجروں سے بندھی تھی
وہی شب اب ہواؤں کے دھڑکنے سے،
مہک مہکار اٹھی ہے
اسی شب میں ہوا نے یوں ہی بس یوں ہی،
کسی کے گیسوؤں کے قفل سارے توڑ ڈالے ہیں
کہ میں نے بے خیالی میں
کسی کے کپکپاتے ہونٹ کے کمرے پہ
اپنے ہونٹ کے انگارے سارے رکھ دئیے ہیں۔

(۳)

کھل گئی ہے آنکھ میں کھڑکی۔
ایسے بازوؤں سے وہ ہیں اس کے دونوں پر
سرو روداں سی وہ کھڑی ہے۔
غور سے دیکھو!
تو اس کے ساتھ میں بھی ہوں وہیں،
بالکل وہیں، بالکل وہیں۔
ہاں اس کی آنکھوں میں
وہیں بالکل وہیں، بالکل وہیں۔

● ۹ ربی سن۔ این۔ سی اپارٹمنٹس، پکنک کاٹیج، دد سوا روڈ، بمبئی۔ ۶۱



سید محمد حسنین
الامن، بھنور پوکر، پٹنہ ۴ (بہار)

پاکستان۔ عکس واثر

جون تا ستمبر ۱۹۹۰ء

یہ تاثرات علمی اور سمعی مشاہدات پر مبنی ہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ معروضانہ انداز قائم رہے۔ تاہم شوخیٔ تحریر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خیال غلط ہوگا کہ یہ تاثرات ملک گیر مشاہدے یا خاطر خواہ مطالعے پر مشتمل ہیں [حسنین]

*

اردو

- "پاکستان میں ایک سو چوبیس بولیاں ہیں جن میں اردو رابطے کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔" ــــ ڈاکٹر جمیل جالبی
- "جس ملک میں ایک فی صد آبادی بھی انگریزی نہیں بول سکتی وہاں انگریزی کا بدستور مسلط رہنا صریحاً زیادتی ہے۔" ــــ شان الحق حقی
- "نظامِ تعلیم کو قومی تقاضوں سے ہم آہنگ کیے بغیر مثبت نتائج کی توقع عبث ہے۔" ــــ ڈاکٹر جمیل جالبی
- "اردو پورے پاکستان میں رابطے کی زبان کا کردار ادا کر رہی ہے۔" ــــ میرزا ادیب
- "آج بھی سب سے زیادہ ضرورت قومی یکجہتی کی ہے اور اس کی کلید قومی زبان ہے" ــــ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار
- "اردو کے علاوہ دنیا کی کوئی زبان پاکستانیوں میں ہم خیالی اور یک جہتی پیدا نہیں کر سکتی" ــــ فرمان فتحپوری
- "ہمارا طالب علم چھٹی سے چودھویں تک مسلسل انگریزی میں فیل ہوتا نظر آتا ہے" ــــ سید کریم الحق جاوید

غیر تعلیمی اور غیر تدریسی سطح پر اردو زبان کی ترویج و اشاعت اور اس کے سنجیدہ علمی ادبی اور سائنسی ادب کی ترقی اور فروغ میں مندرجہ ذیل ادارے مفید اور اہم کام انجام دے رہے ہیں:-

۱۔ انجمن ترقی اردو۔ پاکستان ـ کراچی

ترجمان:۔ ماہنامہ قومی زبان [لیتھو طباعت] ادارۂ تحریر:۔ جمیل الدین عالی۔ ادا جعفری۔ ڈاکٹر اسلم فرخی۔ مدیر:۔ ادیب سہیل۔
سہ ماہی اردو [ٹائپ طباعت] مجلس ادارت:۔ نور الحسن جعفری، جمیل الدین عالی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ ڈاکٹر اسلم فرخی۔

مقتدرہ قومی زبان۔ اسلام آباد۔

ترجمان:۔ ماہنامہ اخبار اردو [لیتھو طباعت] نگران اعلیٰ۔ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ مجلس ادارت: ڈاکٹر انعام الحق جاوید، مدیر:۔ سید سردار پیرزادہ نائب مدیر۔

پاکستان نیشنل بک فاؤنڈیشن:۔

مقتدرہ نے مندرجہ ذیل موضوعات کے تحت ایک سو پچاس مطبوعات شائع کی ہیں:

الف دفتری اردو ب: عدالتی اردو ج: حوالہ جاتی اردو د: تعلیمی اردو س: تکنیکی و ترقیاتی اردو ص: ماہرو ترجمہ ش: لغات و اصطلاح سازی

علاوہ ازیں:۔

[redacted] (٩)

"قومی زندگی کے تمام شعبوں میں قومی زبان کے استعمال میں سہولت کے لیے... مقتدرہ قومی زبان نے ایک شعبۂ معلومات قائم کیا ہے جہاں سے عوام کو انگریزی الفاظ کے اردو مترادفات اور اصطلاحات ٹیلیفون اور ڈاک کے ذریعہ فراہم کی جاتی ہیں۔ ٹیلی فون پر مذکورہ معلومات جمعہ کے علاوہ صبح ۹ بجے سے ایک بجے تک حاصل کی جاسکتی ہیں۔"

اردو کو اس ملک کی سرکاری زبان کا مرتبہ و مقام حاصل ہے پر اس کی دل آرائی و دل ربائی اور بالانشینی پر علاقائی زبانوں کی حریفانہ نظر سے انکار نہیں کیا جاسکتا ـــــــ اردو کو معرّب و مفرّس بنانے کی ذہنیت بلادِ اسلامیہ سے اس کی قربت یا قرابت کا سبب تو ہو سکتی ہے، لیکن سندھ، بلوچستان، پنجاب اور علاقۂ سرحد کی جان بخش ہواؤں سے اس کی محرومی کا احتمال غلط نہ ہوگا۔

نئی تعلیم یافتہ پنجابی برادری میں ان کا یہ احساس شاق گذرا کہ ان کا کلچر اس کلچر کے ہم پایہ نہیں جسے بہار اور یوپی اپنے ساتھ یہاں لایا ـــــــ URDU SPEAKING اور NON-URDU SPEAKING کے احساسِ فرق سے ان کا یہ شعور مخفی نہیں۔

اس کی دستوری ضمانت کے پیشِ نظر اردو کے لیے علاقائی آبادیوں کے گھروں میں اردو گھر بنانا دشوار نہ ہوگا۔

" پاکستان کی قومی زبان اردو ہے۔ اسے سرکاری زبان اور دیگر مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے آئین کے نفاذ سے پندرہ سال کے اندر اندر انتظامات کر لیے جائیں گے۔ اردو زبان کو انگریزی زبان کی جگہ لینے کا انتظام کرنے تک انگریزی کو سرکاری زبان کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔ قومی زبان کے خلاف کسی قسم کے تعصب کے بغیر ایک صوبائی اسمبلی کو حق حاصل ہوگا کہ وہ قومی زبان کے ساتھ ساتھ صوبائی زبان کی ترقی استعمال اور تعلیم کے لیے مناسب قوانین بنا سکے۔"

دستور پاکستان ۱۹۷۳ دفعہ ۲۵۱

جنگ پاکستان کا سب سے کثیر الاشاعت اردو روزنامہ ہے۔ یہ ہر غیر اہم اور اہم بلکہ چھوٹے سے چھوٹی خبروں کو بھی منظرِ عام پر لانا اپنی صحافتی دیانت تصور کرتا ہے۔ اس کے سہ رنگی صفحات کا پہلا صفحہ انواع و اقسام اطلاعات کی موضوعی سرخیوں کی دھجیوں سے لت پت رہتا ہے جلی عبارت کی یہ دو کالمی یا سہ کالمی موٹی موٹی پٹیاں تفصیل واقعہ کی خاطر قاری کو ساعت بہ ساعت صفحہ الٹ الٹ کر سیمابی نظروں کا عادی بناتی ہیں۔

غالب کا شور و شغف ختم ہو چکا مگر کلامِ غالب ہو الاوّل اور ہو الآخر باقی ہے ـــ اہلِ سیاست یا اہلِ ادب کی قید نہیں، ہر تقریر اور تحریر کا لطف یا لذت غالب کے حوالہ اشعارِ دل کش کی دل نشینی ہے۔

ہفتہ وار تکبیر [اڈیٹر محمد صلاح الدین] اور ہفت روزہ حرمت [اڈیٹر زاہد ملک] جیسے رسائل کے حیرت انگیز اداریے اور سنسنی خیز انٹرویو حالات کی حقیقت جاننے کو بے چین کر دیتے ہیں۔

چند سرخیاں ملاحظہ ہوں:-

تکبیر، کراچی۔ جلد ۱۲ • شمارہ ۲۴

" آئی ایس آئی، پاکستان کو توڑ دینا چاہتی ہے "

" وفاقی حکومت دو صوبوں کو نچوڑ رہی ہے۔ "

" بے نظیر کے کالے کرتوت "

حرمت اسلام آباد۔ جلد ۹ • شمارہ ۳۲

" فنح کی کردار کشی کی مہم "
" منار کو ایٹمی پروگرام پر سودے بازی سے انکار اور اسلامی امّہ کو متحد کرنے کی سزا دی گئی "
" بے نیرنے مداخلت فی الدین کی "

عظمتِ اقبال کے رُخِ تاباں پر وہ اظہار انام یا عام ایک داغ ہے جو اردو کے اس بزرگ شاعر کو " شاعرِ پاکستان " میں محدود کر دیتا ہے۔
" اقبالیات " سے متعلق، ہر کتاب نہ صرف چشم زدن میں منظرِ عام پر آجاتی ہے، بلکہ یہ بلا تکلف چھاپ لی جاتی ہے، قطع نظر اس بات سے کہ اس میں خرافات کا حصہ کافی ہوتا ہے۔

ایک فیض شناس استادِ ادب نے یہ واقعہ سنایا:۔
" ایک شوخ اور ذہین طالبہ نے فیض احمد فیض سے والہانہ کہا " میں آپ کو اس زمانہ کا سب سے بڑا شاعر مانتی ہوں ۔ ۔ ۔ "
فیض مسکرائے اور انکسار سے کہا " شاعر تو دو ہی پیدا ہوئے۔ ماضی میں غالب اور حال میں اقبال ۔ ۔ ۔ میرا زمانہ کہاں؟ ۔ ۔ ۔ "

اردو کے واحد طنز نگار نقاد ۔ کلیم الدین احمد کے خلوص نیت کی خوشبو ہنوز غنچہ بند ہے۔ ان کی تنقید کے منفی پہلو کا ذکر عام ہے۔ لیکن، فن داستان گوئی اور عملی تنقید جیسی کتابوں کی ستائش میں اربابِ نقد و نظر کی زبانیں گنگ نہ تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ خیالات حرفِ زیرِ خامہ نہیں بنتے۔
پاکستان نیشنل بک فاؤنڈیشن نے مرحوم کی تمام مطبوعات کی پاکستانی اشاعت کی منظوری مصنف کی زندگی میں حاصل کر لی تھی۔ یہ کام، نہ معلوم کیوں، بحیثیت مجموعی منتظرِ فردا ہے۔

قاضی عبدالودود کی " قاموسی شخصیت " کی غیبت غالب اور ان کی سکندری مملکت ہنوز ناقابلِ تسخیر ہے ـــ اس راہِ دشوار کے چند اہم اور تازہ دم افراد مشفق خواجہ، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری ہیں۔

ڈاکٹر مشفق خواجہ کو پاکستان کے امیر الامرائے کتب ہیں، وحید العصر خادمِ اردو، جو ستائیس ہزار کتابوں کے مالک و مختار ہیں۔ قدرت نے انہیں اولاد سے محروم رکھا، مگر کوثرِ علم سے بہرہ ور کیا ہے۔
ان کے اس نادر ذخیرہ کا بیش بہا اثاثہ سو دو سو برس پرانے وہ دستاویز ہیں، جو مشاہیرِ اردو کے بقلم خود رقم کردہ ذاتی نوٹ اور یادداشتیں ہیں۔ یہ انمول اثاثہ محقق کے لئے داخلی اسناد اور قیمتی SOURCE- MATERIALS ہیں جن کی روشنی میں کلاسیکی ادب پر از سرِ نو کام کیا جا سکتا ہے۔ آبِ حیات اور مقدمہ شعر و شاعری ان میں سرِ فہرست ہوں گی۔
خواجہ کے اس گنجہائے بے نظیر کا درِ سخا یا عطا ہمہ وقت کھلا رہتا ہے اور ان کے انداز لطف و کرم کا یہ سلوک ثوابِ جاریہ کی مثال ہے۔
تحقیقاتِ ادبیہ میں ڈاکٹر مشفق خواجہ کا مزاج اور معیار اس مثل کا حامل ہے۔ خُذ ما صفا و دع ما کدر۔

پرانے بادہ کشوں میں پروفیسر آل احمد سرور کا نام دعائے خیر و رحمت کے ساتھ زبانوں پر آتا ہے ـــ اس جادو بیاں ادیب کی نگارشات کی تازہ کاریاں ہمو قلب و تعزد دونوں کو گرماتی ہیں۔ پاکستان کے نئے اور پرانے ہر درجہ انشا کے لئے روشنی یا روغن کا کام کرتی ہیں۔

دانش گاہ علی گڑھ کا " مرکز اسلوب و اسلوب " کو اچھی نظروں سے نہ دیکھا گیا۔ اہلِ نظر نے اس بات پر اظہارِ افسوس کیا کہ نام ور اساتذہ ہیں۔ اور ایک

: قومی دانش گاہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں اس بات سے سکون محسوس ہوا کہ یہ مجادلہ انتشار و معنی کا معرکہ نہ بن سکا۔

ادارۂ یادگار غالب اور غالب لائبریری، ناظم آباد ۷، کراچی۔ ترجمان: ششماہی رسالہ غالب مجلس ادارت: بیگم احمد مجید ملک [صدر]
رار حسین، شان الحق حقی، ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔ افتخار احمد علوی۔ آفتاب احمد خان۔
رتبین: مختار زمن، مشفق خواجہ۔
ادارہ جنوری ۱۹۶۸ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اور لائبریری ستمبر ۱۹۷۱ء کو معرض وجود میں آئی۔ فیض احمد فیض اور مرزا ظفر الحسن حیدر آبادی
اس کے صدر اور معتمد تھے۔ خدا بخشے ہر دو رخصت ہو گئے۔
راچی کا یہ ایک زندہ، متحرک اور فعال ادبی مرکز ہے۔ جس نے مختلف اہم بالشان جلسوں کے علاوہ متعدد ادبی کتابیں شائع کی ہیں۔

ردو لائبریری:
کراچی کے محلہ شرف آباد میں مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی کی قائم کردہ بیدل لائبریری [۱۹۷۴] ریاست سندھ کا دوسرا سب سے بڑا پرائیویٹ کتب خانہ
س لائبریری میں تحقیقات ادبیہ اردو کے فروغ کے لئے وسیع بنیادوں پر قدیم علمی و ادبی رسائل اور جریدے کی فراہمی اور ان کے تحفظ و ترتیب
نظم اور سلیقہ مندانہ اہتمام ہے۔ ہندوستان میں شائع شدہ تقریباً ہر اردو رسالہ بڑی تلاش و جستجو سے حاصل کیا گیا ہے۔ اور اس کی مکمل فائل تیار کی
عض بطور جائزہ، جب رسالہ نور الآفاق دیکھنے کی خواہش کی گئی تو اس کی مجلد کی فائل چشم زدن میں ہم دست تھی — نور الآفاق سر
کے دور حیات میں ان کی مخالفت میں مراد آباد سے شائع ہوا تھا اور یہ رسالہ ان کی علمی و عملی سرگرمیوں کے خلاف شمشیر برہنہ تھا۔
سائل و [illegible] رات کے علاوہ بیدل لائبریری میں کمیاب اردو مطبوعات کا بھی ذخیرہ ہے۔
——— ڈاکٹر سید ظفر الحق [متوطن چھلی قبرہ، پٹنہ] سابق ڈپٹی سکریٹری سپلائی ڈپارٹمنٹ فیڈرل حکومت پاکستان، اس اہم اور جاندار
دانش کے اعزازی سکریٹری ہیں۔ جن کے شب و روز میں بیدل لائبریری یا محبوب کی مثال ہے، جیسے:
جاگتا ہوں تو یاد ان کی، سویا ہوں تو خواب ان کا ‏ ‏ مرغوب دل و دیدہ ایسا ہے شباب ان کا

سیاسی اور ثقافتی

ارتجِ مملکتِ پاکستان میں طویل المدت فوجی حکومت کا دور، اس ملک کے روشن اور مضبوط مستقبل کی راہ میں رکاوٹ رہی ہے جس سے اس کے
زاج اور معیار کو فائدہ کم، نقصان زیادہ پہنچا ہے۔ [VALUE - BASED ڈیموکریسی، PERSONIFIED-DIMUCRACY
میں ہمیشہ کمزور اور کم تاثیر ہوتی ہے۔]

ہاجر قومی مورچہ، بمقابل دیگر سیاسی پارٹیاں، زیادہ منظم اور مقبول ہے، جس کی خوبی یا خرابی ان افراد کی محدود تعداد ہے جو ابھی تک مہاجرین سے
ا۔ ——— الطاف حسین کی قیادت میں یہ گاندھی وادی فراست کے ساتھ مفید کام کر رہی ہے ——— اس کا فعال وجود ہونے والے
میں اس پارٹی کی بامراد کامرانی کہی جائے گی۔

ستان کی جماعت اسلامی اس جماعت داری سے محروم نظر آئی جس کی مرکزی قوت نفوذ میں متبدل سرد گرم حالات کی اثر اندازی کے باوجود کشش
ناتوانی نہیں آتی۔

ذوالفقار علی بھٹو اور بے نظیر کے معاملات سلطنت گیری پر اظہار خیال کرتے ہوئے اکثر دانش وروں نے اکبر الہ آبادی کا یہ شعر بطور

ترمیم شدہ:

غیرت گذری کہ انگور کو بیٹا نہ ہوا　　　اس کی بیٹی نے اٹھا رکھی تھی دنیا ساری

اس تبصرے میں رنگ و نم یا مدح کی شناخت اس لئے دشوار تھی کہ جس پہ بیتی ہے بتلا جائے، ورالی حقیقت وا نہ ہو سکی۔

امریکی رابع دوت کو برٹش انڈیا وائسرائے جیسی قد آوری نصیب ہے ۔۔۔ ملک کے اہم وقتی مسائل ہوں یا مخصوص معاملات مستقبل، اس مرد فرنگ کی نگہ بیدار ہمہ وقت گہری اور دور رس ہوتی ہیں، لیکن عنایت غم خوار اور شفقت نواز۔

ایک پاکستانی ماہر سیاسیات امریکہ کی زبانی یہ علم حیرت فزا اور لطف خیز تھا کہ دنیا کی اس عظیم جمہوریت پسند مملکت میں ایسی گراں پایہ ایجنسیاں اور ادارے بکثرت ہیں جو ہر قسم کے خیر و شر کی عالم گیر سودہ بازی میں ماہر کامل ہیں۔ یہ دراز دست ادارے کسی بات کو پبلک میڈیا کے ذریعہ تل کا پہاڑ بنا سکتے ہیں۔ ان خوش بختوں کو افراد یا اداروں کی تنقیح طلبی یا علت و حرمت سے کوئی مطلب نہیں، بس پیش کردہ رقم ان کی غرض و غایت ہوتی ہے۔

پاکستان میں ٹی وی اور ریڈیو کے معلوماتی و ثقافتی اور علمی اور سائنسی پروگرام، قومی سطح پر صحت مندانہ رول ادا کر رہے ہیں۔ بالخصوص ٹی۔وی کے تفریحی پروگرام فواحش سے دور اور خاصے دل کش ہوتے ہیں۔ یہ ایسے عمدہ نفیس اور سبق آموز ہوتے ہیں کہ عمر رسیدہ والدین بھی اپنی بیٹی، بہو یا کم عمر والدین بھی اپنی سیانی بچیوں کے ساتھ بیٹھ کر ان سے خاطر خواہ طور سے لطف اندوزی حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ اسی ستھرے اور نتھرے تفریحی پروگرام کا نتیجہ ہے کہ پاکستانی اناث اور خواتین میں بے پردگی عام ہے مگر برہنگی یا بے حیائی کی نمائش نہیں جس کی جلوہ گری یہاں بکثرت ہے۔

شادیات کی مخلوط تقریباتی فضا میں بھی سجی سجائی لڑکیاں اور بنی سنوری خواتین، اپنے انداز و گفتار کے بموجب "شمع انجمن" نظر آئیں۔ بازاروں، سیر گاہوں اور تفریح گاہوں میں ان کے چہرے عموماً زیر نقاب نہیں ہوتے۔ لیکن جسم کا جغرافیہ دبیز چادر میں روپوش رہتا ہے اور ڈوپٹہ مفقود نہیں ہوتا۔

نئے فیشن کی تقلید اور تلاش میں نو عمرانِ ہند کا سراپا اور حلیہ جس تیزی سے بدلتا جا رہا ہے اس راہ و روش میں اناث اور ذکور کا امتیاز آسان نہیں کم از کم ان کے پسندیدہ ملبوسات سے ان کے جنس کی شناخت مشکل ہے۔

اس شر سے چار آزادروی سے پاکستان کا معاشرہ مبرا ہے ۔۔۔ یہاں کا قومی لباس شلوار اور قمیص / کرتا ہے۔ مرد و زن کا فرق ٹوپی / کلاہ اور کلی دار کرتا ڈوپٹہ اور / کلی دار کرتا سے، ظاہر ہوتا ہے۔

ہندوستانی اور پاکستانی شہریت۔ مردوں میں کرتا۔ پاجامہ اور عورتوں میں ساری سے آشکار ہو جاتی ہے۔ ساری میں ملبوس سیر گاہوں میں کبھی ایک دو سیندور اور بندیا والی عورتیں بھی موجود رہتی ہیں۔

سندھ کے اندرونی مشرقی اور پنجاب کے اندرونی مغربی علاقے میں ایسی کور ذہن مسلم آبادیاں اب بھی موجود بتائی گئیں، جہاں موروثی دولت کے تحفظ کی خاطر والدین بیٹی کی شادی انجام نہیں دیتے۔ یا ان کا عقد قرآن مجید سے کر دیتے ہیں۔ یہ معاشرتی زبوں حالی قدیم ہند کی ان تمام کنواریاں کی یاد دلاتی ہے جو دیو داسیاں بن کر زندگی گذار دیا کرتی۔

پر لطف بات یہ ہے کہ عالم گیر تبلیغی جماعت کا کثیر الاجتماع "اسلام آباد" میں ہر سال نہایت خشوع و خضوع سے انجام پاتا ہے۔ حیف، ان بولہوس کی ہدایت کے لئے مگر ان ایمان پسندوں کا ایمان سہو ہے۔

امیر جلیل [پیدائش ۱۹۳۵] اور زیبہ سندھی جیسی معروف کہانی کار کی تخلیقات، عصری سندھی کہانوی ادب CONTIMPORARY SINDHI FICTION کی ترجمانی میں احسن کام کر سکتی ہیں۔

سندھ کو "باب الاسلام" کہا جاتا تھا۔ اب یہ صداقت داغ فراق صحبت کی جلی ہوئی شمع ہے۔

سندھ کی علمی اور ثقافتی تاریخ سے جواں سال ادیب۔ ڈاکٹر وفا راشدی [عبدالستار خاں] کی اچھی دل چسپی ہے۔ **اردو کی ترقی میں لیا سندھ کا حصہ** راشدی کا مقالہ تحقیق ہے۔ جو مغربی پاکستان اردو اکادمی لاہور سے [۱۹۹۰] میں شائع ہوا **مہران نقش** [۱۹۸۹] اس سلسلے کی ایک اہم تصنیف ہے۔ جو وادی مہران کی علمی و ادبی حیثیت سے وسیع تر طبقے کو متعارف کرانے کی کامیاب سعی ہے۔

اس ضمن میں پروفیسر رحمت فرخ آبادی کا کتابچہ **سندھ میں اردو** شائع کردہ مقتدرہ قومی زبان [۱۹۸۹] کا ذکر غیر ضروری نہ ہوگا۔

اردو بہ قوت سرکار اور بہ حیثیت قومی زبان اس مملکت میں بتدریج ایک خوش نما اور بالیدہ کلچر کا وجود لے رہی ہے۔ کلچر گرچہ زائیدہ روایات قدیم ہے مگر وردۂ مطالبات عصری ہے، اور ہر خطۂ ریاست کی بوباس رکھتا ہے۔

اس نئے کلچر میں مرحوم حیدرآباد کی وہ وضع داریاں اور دل نوازیاں ملتی ہیں جو خم خانہ دانش گاہ علی گڈھ کے پرانے بادہ کشاں کے اطوار و اخلاق کی جھلکیاں ہیں۔

پاکستان کی خوبصورت اور نو دمنی مساجد نماز جمعہ میں بھری ہوتی ہیں ـــ نمازیوں میں وہ نودمیدہ چہرے ان نامیہ سا چہروں سے زیادہ بارونق نظر آئے جن کی عبادت میں جاں نثاری تھی، مگر وہ فانی العبادت نہ تھے۔

لاہور مضافات پنڈی اور تحصیل میں چند ویران مندر دیکھ کر سرزمین بہار کی وہ سنسان مسجدیں از خود سامنے آ گئیں جو عبادت گزار بندوں سے خالی ہیں۔ یہ کہنا دشوار ہے کہ ان غیر آباد معبدوں میں ویرانی یا منافقی کا تسلط کس جگہ زیادہ تھا۔

شہری اور ملکی

شہر کراچی کی غیر سندھی آبادیوں میں اہل جاہ و ثروت کے جاذب نظر عروس بنگلے اور خوبصورت مکانات کی کانٹے لگی فصیل نما بلند دیواریں اور دو دو انچ موٹی جلی آبادی والے کئی رخنوں کی محلابند دیواروں کے آہنی دروازے، اس صوبے کی حالیہ دہشت گردی سے تحفظات کے عینی شواہد نظر آئے۔

تقریباً بیسیوں برس سے بسے بسائے یہ پر امن علاقے اس قیامت سے گزر رہے تھے جب "وادی سندھ کو مقتل" بنانے کا پروگرام عملاً ظہور پذیر تھا اور "کراچی کے گلی کوچوں میں موت کا بھیانک رقص رہتا۔" [بحوالہ تکبیر شمارہ ۱۲۴]

اس ابتلائے الیم میں مہاجر اور غیر مہاجر، مفلس اور امیر، صحافی اور کاروباری، بلا امتیاز مناسب اور قابلیت ہمہ گیر بہیمیت کے شکار رہے اس متوحش ستم زدوں میں، جو اپنے وطن میں بھی بے وطنی محسوس کر رہے تھے، چند ایسے بھی تارک الوطن سے بھی ملاقات ہوئی جن کی بے زبانی پشیمانی کی زبان تھی۔

میں نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

مسوڑا کوہ مرگلہ کے آغوش میں پاکستان کا فیڈرل کیپیٹل "اسلام آباد" ملک کی راہ تعمیر و ترقی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

لاز نظر بنائی دل فروزیاں اور ان کی دائمی شادابی، نشیب و فراز میں بل پر بل کھاتی پختہ چکنی سڑکوں کی دور تک کشادگی، سڑکوں کے برامدے دلی ہوں پر سایہ فگن اشجار کی صف بندی، متوازی راستوں کے جلوؤں میں نوع بنوع موسمی پھولوں سے آراستہ چورا ہے، منصبی آبادیوں میں منقسم سبھی بنگلے اور پر سکون خیاباں، متناسب اندر قطار ایک ساخت کی یکساں عمارتیں، ہر عمارت کے سامنے پھولوں پودوں سے آراستہ صحن اور ہر احاطے سے

محنت خوش رنگ ترشی حجازی کی بچیاں، تمام سڑکیں راہیں شہر بہتر پیدل کھیل میدان اور تفریح گاہیں آوارہ گرد پالتو جانوروں سے خالی —— مملکت پاکستان کے اس نو تعمیر کردہ کیپٹل کی خواب آور خوبصورتیاں ہیں، چند جاذب قلب و نظر اور روشن خصوصیات۔

وہ دست بازو، وہ ذوق نظر، وہ عزم و عمل، وہ ذوق تحقیق، جو "اسلام آباد" جیسے شہر خواب آور کی قوت تعمیر رہے ہیں، کاش یہ کاش، توانیاں اقامت سر بلندی اسلام میں روح بحالی ہوتی۔۔۔!!

اس ملک خداداد کے کہسار و مرغ زار، جنگلات و وادیاں، ندیاں اور چشمے، مال فطرت نہیں۔ یہ زمیندار و جاگیردار کے مال و متاع ہیں —— ان اریضائے حسن و جمال کا مقدر دست قدرت کے تابع نہیں۔ اسباب اثر اور اقتدار کے تابع ہے۔

تمام مملکت پاک کے باوجود اس ارض پاک کے جمہور کا مزاج راحت اخوت کے کوائف شیریں سے ناآشنا ہے۔ فرشتوں نے روح آدم کو رخصت کرتے ہوئے کہا تھا،

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں   یہ گنبد افلاک، یہ خاموش فضائیں
کھول آنکھ زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ۔

احساسات ملی و مذہبی

"خدا کا پسندیدہ مذہب اسلام ہے اور "اسلام" کا نمائندہ "ملک" سرزمین پاک..... " عام سادہ لوح پاکستانی کی ذہنیت اسی ایمانی فراست سے متاثر و مسرور رہتی ہے ——

اس خطۂ ارضی کے ایک شاعر نے کہا تھا:
خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے   کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

قانوناً۔ ہر صاحب نصاب پر زکوٰۃ کی ادائیگی لازمی ہے۔ یہ رقم ہر فرد کے بینک میں S. B ACT کے بیلینس سے ہر سال کاٹ لی جاتی لیکن، کرنٹ اکاؤنٹ میں از خود DEDUCTION کی یہ شرط نہیں۔ اکثر خدا ترس بندے اسی لئے بارہ ماہ کی مدت پوری ہونے سے پہلے کھاتے بدل لیتے ہیں۔ خدائی معاملے میں بندگان خدا کی یہ "فراست" تا دیر باعث لطف رہی ——

پاکستان خوبصورت اور ذی قامت مساجد کا ملک ہے —— کراچی اور اسلام آباد میں نو تعمیر مسجدوں کی افراط و فراوانی ان کی نت نئی ساخت اور دل کش رنگ روغن کی نمود، ناظرے میں کھو جاتی ہے۔

مسجدیں ہر عمر کے عبادت گذاروں سے آباد اور تاباں نظر آئیں۔ ٹرین سے راول پنڈی لاہور اور کراچی یا بذریعہ کار ان شہروں کی گھنی آبادیوں سے گذرتے ہوئے، ان مقامات کی دیواروں پر جا بجا، غم عشق، غم روزگار، اور غم صحت کے مریضان کو ملک کے نام ور نجومی۔ عامل اور رمّال سے براہ راست رجوع کرنے کے لئے جلی خطوں میں اشتہارات ملے۔

پاکستانی ایمان پرستوں کی ضعیف الاعتقادی کے یہ عینی مشاہدے پر از انبساط تھے۔

ان اشتہارات کا دل کش پہلو یہ ہے کہ مخصوص نام اور آبادیاں ان جلی شاہ کاظمی اور قادری غیب دانوں کی اپنی اپنی مملکتیں تھیں۔

عام پاکستانی فکر و نظر میں بحیثیت مجموعی، بھارت کے مسلمانوں کا وجود بے نام و ننگ ہے —— یہ " علم " ان کے لئے استعجاب خیز تھا کہ مسلمانان ہندایہ

مخصوص مسائل کے حل و عمل میں خوابیدہ نہیں رہتے اور حکومت کا ان کے احساسِ نامحرومی سے غفلت برتنا ناقابلِ توجہ ہو نہیں۔

حالات یا معاملات ہند کی فہم اور تفہیم میں نئے اور پرانے پاکستانیوں میں فرق ہے ــــ یہ علم عم انگیں تھا کہ نئی پود غیر مسلموں کو حیلہ باز، مکار اور موذی کہنے میں جھجک نہیں محسوس کرتی ــــ پرانی نسل میں حبِ وطن، یادِ نہفتہ ہے، پسِ یادِ وطن، یادگارِ رفتہ نہیں۔

کویت میں صدام حسین کے اچانک اور غیر متوقع جارحانہ رویہ کا چرچا عام موضوعِ گفتگو ہوتا۔ اور نجی صحبتوں میں اس موضوع پر کھل کر بات چیت ہوتی۔ ہر صحبت میں یہ احساس واحد اور یکساں تھا کہ سیاسی بادہ اور بڑے دانش دراں بھی دلی کیفیت کے اظہار میں ذہنی تحفظات سے مصرف نہ لیتے، غالباً یہ شعور ان عہدِ چکیدہ دانش دروں کے اس دینی تصور کا نتیجہ تھا جس میں سیاست کو مذہب سے الگ جگہ نہ تھی۔

اس موقع پر اسلام اور بلادِ اسلامیہ کی صورتِ حال کے ذکر میں چند امید افزا پہلو از خود ابھر آبھر جاتے ــــ ان گفتگو اور ناگفتی سے یہ اندازہ ہوا کہ عام اذہان کا انداز فکر ان بشارتوں سے مملو اور منور ہے:

۱۔ احیائے اسلام میں اب زیادہ دیر نہیں۔۔ بس ایک "ہو" کی ضرورت ہے۔ کب اور کہاں۔ یہ خدا جانے۔

۲۔ امریکی مسلمانوں میں اسلام سے والہانہ شغف بڑھتا جا رہا ہے اور آفتابِ اسلام کا طلوع سرزمینِ امریکہ کا مقدر ہوگا۔

۳۔ روس کی جدید پالیسی میں مذہبی لچک دراصل اس کے وہ ملحدانہ رویہ کا ردِ عمل ہے جس نے انسان کی "جبلتِ الوہیت" کو زبردستی دبائے رکھا۔ تاریخ اسی جگہ اپنے آپ کو دہرائے گی۔

۴۔ ہندوستان دنیا کا واحد ملک ہے جہاں کروڑوں اہلِ اسلام سخت گیر حالات سے گزر رہے ہیں۔ ان کی اس ابتلا کا واحد علاج پیامِ اسلام اور اسکا عمل ہے ــــ مومنینِ ہند کو درگاہِ حق سے یہ سعادت جلد ملنے والی ہے۔ ❋



مغنی تبسم

بس اتنی ہے اپنی کہانی
آگ، ہوا، مٹی اور پانی
بھر آئے آنکھوں میں آنسو
یاد آئی اک بات پرانی
دیواروں سے سائے نکلے
سورج نے پھر بات نہ مانی
پھر دھرتی کے ہر ذرے میں
بکھرے جلوے کاہکشانی
پھر آئینہ سا بن جانا
پھر رہ تکنا پھر حیرانی
کیسی بستی، کیسا صحرا
کیا آبادی کیا ویرانی
لب پہ پھیکا سا تبسم
جانے والوں کی ہے نشانی
ہم کیا اور ہمارا کیا ہے
باقی اللہ، باقی فانی

اور ہوں گے وہ جنہیں تابِ سحر جانا ہے
مجھ کو تو رات کی چوکھٹ پہ ٹھہر جانا ہے

اس کی یادوں کو عطا ہے کبھی بے پیمانے کی
اور خوابوں کو دعاؤں کا اثر جانا ہے

راحتِ خواب سے آنکھیں تھیں شناسا پر اب
دیکھنا خواب کوئی، خواب میں ڈر جانا ہے

زندگی تجھ سے پشیماں ہیں یہی سوچ کے ہم
اپنے وعدوں سے کبھی روز مکر جانا ہے

دل میں کوئی بات ہے، اب کہہ جانے دے
آنسو آنکھ میں آئے ہیں بہہ جانے دے

اپنے حال پہ چھوڑ، دلاسا رہنے دے
غم ہی اچھا لگتا ہے سہہ جانے دے

میری سوچیں پریں پہرے تو نہ بٹھا
ایک خلش سی دل میں ہے رہ جانے دے

منظر کچھ تو بدلے گا ویرانی سے
اس خستہ تعمیر کو اب ڈھ جانے دے

پچھلی شب کو اٹھ کر کیوں تو روتا ہے
بات نہیں کہنے کی تو مت کہہ جانے دے

تپتے صحرا میں یہ خوشبو ساتھ کہاں سے آئی
ذکر زمانے کا تھا تیری بات کہاں سے آئی

دل مٹی تھا، آنکھوں میں سوغات کہاں سے آئی
ساون بیت چلا تھا یہ برسات کہاں سے آئی

جلتی دھوپ کے لشکر کے خیمے کس نے توڑ دیئے
جھلمل کرتے تاروں کی بارات کہاں سے آئی

بیتے لمحے لوٹے بھی تو یاد بنے یا خواب
پرچھائیں تھی پرچھائیں پھر ہاتھ کہاں سے آئی

چاند ابھی تو نکلا ہی تھا کیسے ڈوب گیا
میرے آنگن میں یہ کالی رات کہاں سے آئی

ترکِ سفر کیا ہے تو منزل نہ کہہ اسے
رنجِ گرانِ شوق کا حاصل نہ کہہ اسے

یہ ضبط، ضبطِ غم نہیں، اک بے دلی سی ہے
یہ دل حریفِ درد نہیں دل نہ کہہ اسے

طغیانیاں کچھ اور ہیں موجوں میں ریت کی
میں ڈوبتا ہوں عشرتِ ساحل نہ کہہ اسے

مرتا نہیں ہوں موت کی بے حاصلی پہ میں
جیتا اگر ہوں الفت حاصل نہ کہہ اسے

ملنا سفر کا اور بچھڑنا سفر کا ہے
دنیا تو رہگذار ہے محفل نہ کہہ اسے

۲/۷۵۹-۳-۶، کپاڈیا لین، سوماجی گوڑا، حیدرآباد - ۴



مرزا حامد بیگ
گورنمنٹ کالج، سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی (پاکستان)

پھیری والا

بازار جملہ کاروباری اخلاص سے پٹا پڑا تھا۔ سوداگر مول تول میں مصروف تھے۔ اور بھیڑ اتنی تھی کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ ایسے میں ہارون کی چہیتی بیوی زبیدہ اپنی کنیزوں کے ساتھ خریداری کرتی وہاں سے گذری تو دیکھتی ہے کہ: بہلول، بیچ بازار کے بیٹھا مٹی کے گھروندے بنا رہا ہے۔ زبیدہ یہ دیکھ کر سخت متعجب ہوئی اور سوال کیا: "دیوانے! کہو تم نے زندگی کو کیسا پایا۔؟ کچھ ہمیں بھی سمجھاؤ۔"

بہلول اپنے کام میں منہمک تھا اُس نے کوئی توجہ نہ دی۔

زبیدہ نے سوال دوہرایا: "زندگی کیا ہے؟"

بہلول نے اپنے سامنے دھری مٹی کی ڈھیری کی طرف انگلی سے اشارہ کر دیا اور خاموش رہا۔

زبیدہ مسکرائی: "اور موت؟"

بہلول نے پھر اسی طرح انگلی سے مٹی کی جانب اشارہ کیا اور بولا: "کیوں بے کار وقت ضائع کرتی ہو۔ جب موت آئے گی تو خود جان لوگی کہ وہ کیا ہے۔ اور زندگی کی کیا حقیقت ہے۔"

زبیدہ نے بڑے ناز سے کہا: "دیوانے تم سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ کہو، بھرے بازار میں اب یہ کیا کھیل کھیلتے ہو۔؟"

بہلول نے سر نیوڑھائے جواب دیا: "ملکہ! جنت کے گھر بیچ رہا ہوں۔ لینا ہے تو لے لو۔"

زبیدہ نے دریافت کیا: "کتنے کا بیچتے ہو؟"

دیوانہ اپنی سفید مونچھوں میں مسکرایا اور کہنے لگا: "تم پانچ لاکھ دینار ساتھ لائی ہو۔ ہم مول تول نہیں کرتے، اپنی چادر بچھاؤ۔"

زبیدہ نے چادر بچھا دی اور پانچ لاکھ دینار کے عوض مٹی کی مٹھی اٹھا لے گئی۔

اس روز رات گئے تک بہلول کو حاجت مندوں نے گھیرے رکھا اور جب دیوانہ اپنا دامن جھاڑ کر وہاں سے اٹھا تو فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔

داستان گو کا بیان ہے کہ ہارون الرشید نے اس رات خواب دیکھا کہ ایک بڑا محل ہے جس کے اطراف و جوانب میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں اور پائیں باغ میں خوش الحان پرندوں کے ساتھ زبیدہ چہکتی پھرتی ہے۔ لیکن جب ہارون نے محل کے اندر جانے کی خواہش ظاہر کی تو دربان نے اسے سختی سے روک دیا۔ وہ بہت گڑگڑایا کہ دیکھو! میں خلیفۃ المسلمین، فاتح تبرس، اور خاندانِ اغلبیہ کی مسلم سلطنت کا بانی ہوں۔ عظیم قیصر روم سے میں نے خراج وصول کیا، جملہ مسلم حکمرانوں میں ایسا کون ہے، جو میری ہمسری کرے؟ لیکن دربان نے اس کی ایک نہ سنی۔

آنکھ کھلی تو وہ سخت دل گرفتہ تھا۔ اور فجر کی نماز قضا ہو چکی تھی۔ اس نے اپنا خواب زبیدہ کو سنایا۔ تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور گذشتہ روز پیش آنے والا واقعہ من و عن بیان کیا۔

داستان گو کا کہنا ہے کہ ہارون تڑپ کر اٹھا، دس لاکھ دینار باندھے اور بھیس بدل کر بازار کی طرف نکل گیا۔ دیوانے نے ابھی کچھ ہی دیر پہلے اپنی دکان سجائی تھی۔ اور بیچ بازار کے بیٹھا، مٹی گوندھ رہا تھا۔ ہارون نے دو زانو ہو کر عرض کیا: "حضور، ایک گھر چاہیے کس بھاؤ بکتا ہے؟"

بہلول نے سر جھکائے رکھا اور کہا: "تیری ساری شاہی کے عوض دے سکتا ہوں۔ ایک گھر، بول لے گا؟"

ہارون نے کہا: "لیکن حضور، کل تو آپ نے بہت سستا بیچ دیا۔"

دیوانہ مسکرایا اور بولا: "ہاں یہ سچ ہے، لیکن زبیدہ خاتون نے تو میرے کہے پر اعتبار کیا اور مال خریدا۔ اسے کیا خبر کہ اور ملے گا کہ نہیں تم نے تو دیکھ لیا کہ اسے مل گیا۔ کہو! اس کے لیے میرے پاس دو دھے لائے

ہارون لاجواب ہو گیا اور وہاں سے اٹھ آیا۔

داستان گو کہتا ہے کہ وقت اپنے آپ کو دہراتا رہے گا۔ بہلول دیوانہ دوسری بار بھی ایک پھیری والے کے روپ میں ظاہر ہوا۔ لیکن ایک ایسے خطے میں، جس کی چراگاہوں میں بدیسی مویشی چرتے تھے۔ جس کی فضائیں چرخوں نے ہتھیا لی تھیں۔ اور جس کے پانیوں پر پرائی کشتیاں رواں تھیں۔ دیوانہ اس طرف جا نکلا۔ جہاں ململ بننے والی مخروطی انگلیاں ہاتھوں سے چھین لی گئی تھیں اور زندگی کا سارا نظام بھیک میں ملنے والے قرضوں پر کھڑا تھا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ نو وارد کون ہے۔ اور کہاں سے آیا ہے۔ بس قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ اور لوگوں نے سر جوڑ رکھے تھے۔

وہ جس گلی محلے سے گزرتا، زندگی کا مروّج نظام درہم برہم ہو جاتا۔ اس کے یوں اچانک ظاہر ہونے سے اس سرزمین کے مصروف بازاروں، صنعتی اداروں اور تجارتی مراکز پر ہمہ وقت مسلط اعصاب شکن تناؤ ماند پڑتا گیا۔ اور ایک ہی ڈھرے پر مصروف رہنے والے جدی پشتی کچلے ہوئے کارندوں نے جیسے ایک نیا جنم لیا۔ ایک زمانہ گزر جانے کے بعد انہوں نے خود کو ایک دوسرے کو محسوس کیا۔ اور یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے سنے ہوئے گراموفون ریکارڈ کو مدت بعد سنا جائے اور اس میں پوشیدہ معنویت کی پرتیں نئے سرے سے کھلیں۔

پھیری والا سر نیوڑھائے، اپنی خستہ ریڑھی پر بھربھری مٹی سجائے نکلتا اس کے پیچھے لوگوں کا ایک بڑا ہجوم ہوتا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے چاروں اطراف سے لوگ اس کی جانب کھنچتے چلے آتے۔ گلیاں اور بازار، دکانیں اور دفاتر خالی ہو جاتے، ٹریفک جام ہو جاتی۔ اور پھیری والا آگے بڑھنے کا راستہ نہ پا کر رک جاتا۔ اور پکارتا: ”مومنو جلدی کرو — جنت کے محل بکاؤ ہیں۔“

وہ کچھ دیر سر نیوڑھائے چپ چاپ کھڑا رہتا اور پھر اپنی چوڑی چکلی اور مشاق انگلیوں کے ساتھ ریڑھی پر دھری بھربھری مٹی سے گھروندے بنانا شروع کر دیتا۔ تب لوگوں کے بے طرح امڈتے ہوئے ہجوم میں مٹی کی قیمت لگنا شروع ہو جاتی۔ اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بولی لگانے والے اپنے نوٹوں سے بھرے بریف کیس ریڑھی پر الٹتے چلے جاتے۔ پھیری والا خالی بریف کیسوں میں مٹھی بھر مٹی ڈالتا جاتا اور ریڑھی پر مٹی کی جگہ نوٹوں کا ڈھیر لگ جاتا۔ پھیری والے کا سارا مال منٹوں میں ختم ہو جاتا اور وہ جب نوٹوں سے لدی پھندی ریڑھی کے ساتھ اس بڑے ہجوم میں سے راستہ بناتے ہوئے نکلتا تو اس کی مشاق انگلیوں کے ساتھ اٹھتے ہوئے نوٹ کاغذی ہوائی جہازوں کی طرح چاروں اطراف میں اڑنے لگتے، حتیٰ کہ ریڑھی خالی ہو جاتی اور لوگ جھولیاں بھر لیتے۔

سب کچھ وہیں لٹا کر پھیری والا اک ذرا سر اٹھا کر اپنی نحیف آواز میں معذرت چاہتا ”سارا مال ختم ہو گیا جی — زندگی رہی تو آپ کا خدمت گزار پھر حاضر خدمت ہو گا۔“

یہ سن کر ہجوم کے قدم وہیں تھم جاتے، جیسے پاؤں میں زنجیر پڑ گئی ہو، اور وہ بھیڑ میں سے راستہ بناتا، تیز تیز قدم اٹھاتا، سنسان گلیوں میں غائب ہو جاتا۔

پھیری والے کا یہی معمول تھا۔ وہ مٹی کا ڈھیر ساتھ لاتا۔ اسے سونا بناتا اور دونوں ہاتھ لٹانے کے بعد خالی ریڑھی کے ساتھ پلٹ جاتا —

وہ کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا۔ کوئی نہ جانتا تھا۔ بس قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ اور لوگوں نے سر جوڑ رکھے تھے۔

قومی اخبارات نے شہ سرخیاں جمائیں۔ خصوصی ضمیمے نکالے، غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ وہ کبھی ایک شہر میں ظاہر ہوتا تو کبھی دوسرے میں۔ اس کے ظہور کی تاریخ اور کوئی مقررہ پروگرام نہ تھا۔ بس وہ آتا اور پھر پسی آبادیوں میں زندگی کے مروّج دھرے کو پلٹ کر کے نکل جاتا۔

پھیری والے کے پھیرے کے بعد فنانس کمپنیوں کے خزانچیوں اور بینک منیجروں کی جواب طلبیاں ہوتیں، سرکاری، نیم سرکاری اور نجی اداروں کے اکاؤنٹس آفیسر معطل ہوتے پر جب وہ آتا تو سب کے سب بلا سوچے سمجھے بے اختیار ہو کر اسی کی جانب لپکتے اور جو کچھ ان کے پاس ہوتا نذر کر دیتے۔ سرمایہ دار اپنا سر پیٹ کر رہ گئے۔ ناجائز فروش کنگال ہو گئے، بھوکوں کو پیٹ بھر کھانا نصیب ہوا اور مفلس گھروں کی بیٹیوں کی ڈولیاں دھوم دھام سے اٹھنے لگیں۔

غرضیکہ کیا نہیں ہوا۔

بڑی بالکاری، پھیری والے کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے، اس کے سر کی قیمت رکھی گئی لیکن معاملہ جوں کا توں رہا۔ سخت ترین انتظامات کے باوجود وہ اچانک ظاہر ہوتا۔ مٹی کے مٹھیاں بھر بھر بانٹتا، نوٹوں سے بھرے بریف کیس خالی کرواتا اور اپنی سفید مونچھوں میں مسکراتا۔ ”سارا مال ختم ہو گیا جی“

جن اخبارات میں اس کی گرفتاری سے متعلق جہازی سائز کے اعلانات شائع ہوتے، انہیں میں ایک مختصر سا اشتہار نہ جانے کیسے شامل ہو جاتا:

” مومنو جلدی کرو — “

یہ اشتہار کیا شائع ہوتا، اخبارات کا انتظامی عملہ مشکل میں پھنس جاتا۔ ان کی نااہلی پر باز پرس ہوتی، آرٹ ایڈیٹر اور کاتب حضرات کھڑے کھڑے معطل کر دیئے جاتے لیکن وہ ایک سطری اشتہار نہ جانے کیسے چھپ ہی جاتا۔

[باقی صفحہ ۲۴ پر دیکھئے]

کرشن کمار طور

کیا بولوں کیسی ارزانی میری تھی
وہ سورج تھا اور پیشانی میری تھی

اک تصویر نہاں تھی وقت کے پردے میں
غور سے جو میں نے پہچانی میری تھی

جتنے بھی موجود تھے منظر اس کے تھے
ان آنکھوں کی سب حیرانی میری تھی

اب دیکھوں تو ناممکن سا لگتا ہے
یہ دنیا اک دن دیوانی میری تھی

رتی ہی کیا تھا سر جاتا یا رہ جاتا
اب پیچ کی فصل امکانی میری تھی

یہ ہی ہوائیں انگلیوں سے لکھتا تھا
اب جتنی بھی حیرانی میری تھی

ہے کیسی یہ زنجیر تعلق طور
اب دنیا بھر کی ویرانی میری تھی

ای/۱۳۲- کملا نہرو نگر، دھرم شالہ ۱۷۶۲۱۵ (ہماچل پردیش)



شاہد ماہلی

ہر در و دیوار پہ لرزاں کوئی پیکر لگے
کتنی شکلوں کا پری خانہ ہمارا گھر لگے

دوڑتی جائیں رگوں میں نیلگوں خاموشیاں
دور تک پھیلا ہوا یوں دھند کا منظر لگے

بند کمرے میں بلائے جاں ہے احساسِ سکوت
اور باہر ہر طرف آواز کا پتھر لگے

جیسے جیسے ٹوٹتا جائے نگاہوں کا بھرم
شخصیت اپنی بھی اپنے آپ کو کمتر لگے

کانپ جاتا ہے صدائے دل سے صحرائے سکوت
اور اپنے پاؤں کی آہٹ سے بھی اب ڈر لگے

ایک بے معنی تجسس ایک بے معنی خلش!
ایک شعلہ سا لپکتا جسم میں اکثر لگے

شکستہ حال تمناؤں کا عذاب نہ دے
متاعِ درد بہت ہے اب اضطراب نہ دے

سیاہ رات کی تنہائیاں گوارا ہیں
جو ہو سکے تو سحر دے، سنہرے خواب نہ دے

میں ٹوٹ ٹوٹ گیا انتظارِ فردا میں
شہابِ آخرِ شب دے جو آفتاب نہ دے

بتا دے صبح کی بیچارگی کا کوئی مآل
ہزاروں جاگتی راتوں کا گر حساب نہ دے

یہ کیسے شہرِ خموشاں میں آ گئے شاہد
سوال پوچھتے جاؤ، کوئی جواب نہ دے

اے - ۳۰ سی، شیخ سرائے، فیس II نئی دہلی ۱۷



بشیر بدر
وحید منزل ۱۳۴ - مالی پورہ ، پیر گیٹ ، بھوپال - ۱

پت جھڑ کے موسم کی ہریالی

مخمور سعیدی کی غزل

مخمور سعیدی کی غزل، تغزل کی انتہا وں کو چھوتی ہوئی غزل ہے۔ ہم جو زندگی جی رہے ہیں وہ عملی طور پر بہت محدود زندگی ہے۔ انسان کا ہزاروں سال کا شعور اور اس سے کئی گنا بڑا لاشعور حساس لوگوں کا مقدر ہے۔ زندگی سے ایک لمحہ مسرت، محبت اور عزت کا پالینا اتفاق امر ہے۔ خدا کی اتنی بڑی موجود کائنات کی لاکھوں سال کی تاریخ میں انسان تنہا کھڑا ہے۔ سوچنا، گم بدھ ہوجاتا ہے یعنی حقیقت کی تلاش اور اس تلاش کا حاصل یہی زندگی جو دوستی، محبت، مسرت، مشقت، تنہائی، خوشی، امید، اور خوابوں کا ایسا پیچیدہ پیکر ہے جو سوچتے ہوئے انسان کو تارک الدنیا بنا دیتا ہے۔ وہ ساری لمحاتی مسرتوں کو جھوٹی مسرتیں جان کر بے سمت سفر شروع کر دیتا ہے۔ لیکن اس کا بھی کوئی حاصل نہیں۔ مجھے صرف دو لفظوں کے مفہوم کبھی سمجھ میں نہیں آئے، ایک زندگی اور دوسرا تغزل لیکن میرے لئے (سب کے لئے قطعی نہیں) جینے کا یہی جواز بھی ہیں۔

خدا کی ساری کائنات کے نظام کو اپنے نظام کے لئے ایک دو لمحہ بدل دینا تغزل کی ایک خاص شناخت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے ایسے مثلاً فسادات، مڈل ایسٹ پر امریکہ کی بمباری، ان پر جب میں شعر لکھ جاتا ہوں تو اکثر مجھے پتہ چلتا ہے کہ مجھ میں اور اخباری نمائندے کی تحریر میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ انسان احساسات کی ایسی ترتیب ہے جس کو مشین بنا کر کمپیوٹر چلانے، سمجھنے اور سمجھانے میں سائنس ابھی تک ناکام ہے۔ یہ سب کچھ کہتے ہوئے میں مخمور سعیدی کی غزل پڑھ کر خدا کی دنیا سے سرک کر ان کے تغزل کی دنیا میں آگیا ہوں۔ جہاں زندگی کی بے رحم حقیقت بھی ہے۔ انسان کی ازلی اور ابدی بے بسی بھی ہے، امید کی بارشیں اور نو امیدیوں کی لو بھی ہے۔ موت کی زندگی پر فتح بھی بدستور قائم ہے۔ اس بے بسی کی تہہ دار زمین میں خوشیوں کے انکر اپنی شکست نہیں مان رہے ہیں۔ زندگی کی تمام ترمنفی قوتوں سے نبرد آزمائی کا جذبہ بھی ہے۔ شکست کی اداسی اور فتح کی پر امید مسرت بھی ہے۔ حالیہ لمحات کی بربریت اور جبر بھی اور یادوں میں خوش گوار لمحوں کے جگنو بھی جھلملا رہے ہیں۔

مخمور سعیدی رہ رہ کر انسان کی ازلی اور ابدی تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مگر جینے کا اور زندگی گزارنے کا جو حوصلہ ان کے یہاں ہے وہ ہماری شاعری میں اس طرح نایاب ہے۔ مخمور سعیدی کے ایسے اشعار بہت کم ہیں جو تہہ در تہہ احساسات کی داخلی نبرد آزمائی کی امیجری نہ ہوں۔ انہیں کسی ایک رویئے یا احساس کے خانے میں ڈالنا زندگی سے جھوٹ بولنا ہے۔ وہ خواب بھی دیکھتے ہیں، پر امید بھی ہوتے ہیں۔ سوچتے سوچتے ایسا تھک جاتے ہیں جیسے چاروں طرف دھند ہو۔ اور پھر صبح کے سورج کی طرح طلوع ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں ایسے اشعار کی کثرت ہے جہاں ناامیدی سے امید کی بلندی پر چڑھ رہے ہوں یا ساتویں آسمان کی روحانی سرمستیوں سے پھر ان مشینوں کی جابر اور بے رحم زندگی کی طرف اتر رہے ہوں۔

مخمور سعیدی کی سب سے بڑی فتح یہ ہے کہ وہ وضاحتوں کے ساتھ دھند کی بھی تصویریں بنا دیتے ہیں اسی لئے زندگی کی متضاد کیفیات کا اظہار ان کے شعروں میں اس طرح ہوتا ہے کہ غزل سے وابستہ مجھ جیسا طالب علم استعجاب کے عالم میں ڈوب جاتا ہے۔ مخمور سعیدی غزل کے بڑے شاعروں کی طرح غم اور خوشی کے ملے جلے یا ان سے شاخ در شاخ پھوٹتے زرد پتوں کی بہار کے شاعر ہیں۔

میں بھی سایہ ہوں سیہ رات میں کھو جاؤں گا — تم بھی اک خواب ہو پل بھر میں بکھر جاؤ گے
دور دور تک سلگتا ہوا اک صحرا ہوں — راہ کب سے تری اے ابر رواں تکتا ہوں
صبح کو نغمہ بہ لب ہے مگر اے ڈوبتی رات — میرے حصے میں تری مرثیہ خوانی آئی

خشک پتوں کو چمن سے یہ سمجھ کر چن لو ـــــ ہاتھ شادابیٔ رفتہ کی نشانی آئی
لفظوں کے سیہ پیراہن میں لپٹی ہوئی کچھ تحریریں ہیں ـــــ اے دیدہ ور، پہچانو تو کس ہاتھ کی یہ تحریریں ہیں
ہم اپنی ذات کے زنداں سے باہر جو نکل آئے بھی تو کیا ـــــ قدموں سے جو لپٹی پڑتی ہیں راہیں یہ نہیں، زنجیریں ہیں
ڈھونڈتا ہوں اک چمن ویرانہ در ویرانہ میں ـــــ جس کے پھولوں کی مہک اب تک مرے دامن میں ہے
مری اداسی کو لوٹ لیں گے حسیں نظارے یہ سوچ کر میں گزر رہا ہوں ـــــ مہکتی گل رنگ وادیوں سے نظر جھکائے گزر رہا ہوں
کل ایک بجھتا ہوا ستارہ تھا ظلمتِ شب میں کھو گیا تھا ـــــ اب ایک خورشیدِ صبحِ نو ہو کے افق پہ ابھر رہا ہوں

محمود سعیدی کی غزل میں ایسے سیکڑوں شعر ہیں جن میں جذبوں کے مرکب پیکروں کو ایسے حسن و فن کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جو ان کی غزل کو غزل کے عظیم سرمائے میں ایک اضافے کی حیثیت عطا کرتی ہے۔

ہمارے ناکام شاعروں کو مشاعروں سے بے وجہ بیر ہے۔ ہر دور میں دو تین شاعر پیدا ہوتے ہیں، ہندوستان میں ہر رات دو ہزار شاعر اپنا کلام سناتے ہیں۔ ان میں چار پانچ سو صرف سنانے کے گنہگار ہوتے ہیں۔ لیکن مشاعرے کے وسیلے سے بھی وہی شعر عالمگیر شہرت کا مالک ہوتا ہے جو بھرپور شعر ہو، تمام گلوکاری، تمام اداکاری وہیں شامیانے میں دفن ہو جاتی ہے۔ مثلاً محمود سعیدی کا شعر مشاعرہ لوٹنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اور اس کے باوجود مشاعرے کے شامیانے سے نکل کر دل کے دریچوں میں صدیوں محفوظ رہنے کی بھی اہلیت رکھتا ہے۔ ان مشاعروں کی محفل سے ولی سے لے کر محمود سعیدی تک سب گزرے ہیں:

تتلیاں ہیں یہ ملاقات کی نازک گھڑیاں ـــــ رنگ اڑ جائے گا پَر ان کے مسلا کیوں ہے

اسی شعر میں سہل ممتنع کا تمام اعجاز یکجا ہے۔ اسے عام آدمی بھی محسوس کر سکتا ہے اور اگر دل پتھر نہ ہو گیا ہو تو یونیورسٹی کا پروفیسر بھی۔ محمود سعیدی نے حسن کا سراپا جس ٹھہراؤ سے لکھا ہے اس میں تغزل کی اعلیٰ رفعت بھی ہے۔

شبنم آلود جبیں، برگِ گلِ تر کی طرح ـــــ رخ پہ ہے رنگِ حیا نور کی چادر کی طرح
داستاں گوئے تخیل کی جھلک آنکھوں میں ـــــ کھوئی کھوئی سی نظر طبعِ سخنور کی طرح
لذتِ لمس سے بیگانہ، ہراساں، حیراں ـــــ نرم و نازک سا بدن خواب کے پیکر کی طرح

سراپا کے ان شعروں کا مقابلہ شعوری اور لاشعوری امید و بیم کی بوالعجبیوں سے کرنا خود لذتِ زندگی سے محروم ہونا ہے۔ میں بھی مانتا ہوں کہ ان شعروں میں جو عجیب سا پر وقار سکوں ہے وہ زندگی میں بس کبھی کبھی میسر آ جاتا ہے۔ خود محمود سعیدی دوسرے لمحے ان مسرتوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اور انہیں خوف سا محسوس ہونے لگتا ہے۔

مری اداسی کو لوٹ لیں گے، حسیں نظارے یہ سوچ کر میں گزر رہا ہوں ـــــ مہکتی گل رنگ وادیوں سے نظر جھکائے گزر رہا ہوں

یہ ہماری تنقید کی قنوطیت اور رجائیت نہیں، بلکہ زندگی کے احساسات کی پر پیچ حقیقت ہے۔ ہر انسان کو یہ تو سوچنا ہی پڑتا ہے کہ مسرتیں لمحاتی ہوتی ہیں۔ اور انسان کا مقدر تفکر ہے۔ مگر کیا کیا جائے اسی بے رحم حقیقت سے سکوں کا ایک پل چرا لینا زندگی ہے۔ اور محمود جیسا شاعر ہو تو یہی تغزل ہے۔

بکھری خاک ہوں میں منتظر بلندی پر ـــــ زمیں سے دور اڑا لائی ہے ہوا مجھ کو

ان کا تفکر اور تعقل انہیں سمجھاتا ہے۔

نکل چلو کسی جانب دیارِ حرماں سے ـــــ رکے کھڑے ہو کس امید پر یہاں کیا ہے
بلندیوں کے سفر میں زمیں سے دور نہ جا ـــــ زمیں نہ زیرِ قدم ہو تو آسماں کیا ہے
جانِ مرگِ مسلسل سے گزرتا جاؤں ـــــ زندگی یہ ہے کہ ہر سانس میں مرتا جاؤں

عام بے بسی سے مختلف اسی بے بسی میں کس بلندی، وقار اور اعتبار کا انہیں ادراک ہوتا ہے۔

زیرِ قدم ہیں اب تک خورشید و ماہ و انجم ـــــ میں کن بلندیوں سے نیچے اتر رہا ہوں

محمود سعیدی کے اندر جو [illegible] اس کی زندگی کی عمر کے برابر محسوس ہونے لگتی ہے جب وہ اس وقار سے سوچتے ہیں۔

کس کی دعا میں آج بھی ہیں شجر بشجر ہرے محمود پت جھڑ کے موسم میں یہ کیسی ہریالی پھیلی ہے

میں زندگی کو پت جھڑ کے موسم کی ہریالی سمجھتا ہوں اور میں قول کو بھی پت جھڑ کے موسم کی ہریالی کہتا ہوں۔

ادھر چند برسوں سے کوی سمیلنوں اور مشاعروں میں رام جنم بھومی، بابری مسجد، صدام حسین اور بش آ گئے ہیں۔ اور ان میں شاعروں کا گالی بکنا اور نذرانہ وصول کرنا، پیسے کمانا ایک مجرمانہ پیشہ بن گیا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ آپ میرٹھ کو اس لئے شعری نقشے سے نکال دیں کہ وہ فسادوں کا شہر ہے میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ میرٹھ کے فسادات، کرفیو زدہ سناٹے کو محمود سعیدی کی طرح تغزل۔ نا کریوں جاوداں کر دیں۔

راستے شہر کے سب بند ہوئے ہیں تم پر گھر سے نکلو گے تو محمود کدھر جاؤ گے

تمام شعری مطالبات پر یہ شعر میرٹھ، علی گڑھ، بھاگل پور اور سینکڑوں شہروں پر صادق آ کر ادبی تاریخ کا حصہ بن جاتا ہے۔

دہلی نے محمود سعیدی کو عہدِ حاضر کے بڑے سنگین اور شدید تجربے دیئے ہیں۔ یہاں ان پر افسوس کرنے کی ضرورت نہیں کہ مرگِ انبوہ جشنے دارد۔ تنقید کی اصطلاح میں اسے عصری شہری اور جدید حسیت کہتے ہیں۔ اور ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن قدرت نے انہیں احساس کی ندرت اور غالباً ٹونک نے انہیں لفظ کی شناخت دی ہے۔

سرسیدؔ اور حالی کے دور، سردار جعفری اور مجروح کے عہد، محمود اور ہمارے زمانے کے مسائل سے بے نیاز کبھی تغزل نہیں رہا اور جہاں تغزل نہیں رہا وہ شعر وہیں اپنی موت مر گیا۔ محمود سعیدی کو احساس و فکر کی اعلیٰ سطحوں کے ساتھ اظہار کی ندرت خدا نے عطا کی ہے ——— اور معتزلہ اظہار کی قدرت انہوں نے خونِ جگر صرف کر کے حاصل کی ہے۔ آج کی غزل کی تاریخ محمود سعیدی کی غزل کے بغیر نامکمل ہے۔ ❋

اپنا زرِ سالانہ وقت پر ارسال کیجئے ❋ شاعر کی توسیع اشاعت میں تعاون دیجئے

بخطِ شاعر

غزل

اس سے ملنے کا احتمال سا کچھ
ہجر میں عالمِ وصال سا کچھ

ایک پرچھائیں ہر قدم پر تھی
بے خیالی میں بھی خیال سا کچھ

اک تصور میں کھوئے کھوئے سے ہم
حال، بیگانۂ حال سا کچھ

ہجر کی زندگی گزرتی ہوئی
سر پہ ٹلتا ہوا وبال سا کچھ

دنیا اک منظرِ زوال تھا
ہر دو میرے [illegible] زوال سا کچھ

تن میں بھی فاصلوں کی چبھن
ذہن میں بھی تھا ملال سا کچھ

بس میں طیورِ آوارہ
بلا دیا ہے جال سا کچھ!

کھل کے بادبان کھلے
دریا میں ہے اُبال سا کچھ

آنکھوں میں بھری ہوئی شبنم
تھا ہوا لال سا کچھ

عشق کیا کہیں کیا ہے!
یا ہے بے مثال سا کچھ

ہم گزرگاہِ وقت تھے مخمور
ہم پہ گزرا ہے ماہ و سال سا کچھ

غزل

سن لی صدائے کوہِ ندا اور چل پڑے
ہم نے کسی سے کچھ نہ کہا اور چل پڑے

سائے میں دو گھڑی بھی نہ ٹھہرے گزرتے لوگ
پیڑوں پہ اپنا نام لکھا اور چل پڑے

بکھری ہوئی فضا میں الجھنے لگا تھا دم
ہم نے ہوا کا گیت سنا اور چل پڑے

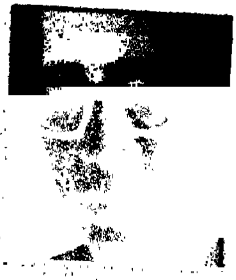
تاریک راستوں کا سفر سہل تھا ہمیں
روشن کیا لہو کا دیا اور چل پڑے

رختِ سفر جو پاس ہمارے نہ تھا تو کیا!
شوقِ سفر کو ساتھ لیا اور چل پڑے

گھر میں رہا تھا کون کہ رخصت کرے ہمیں
چوکھٹ کو الوداع کہا اور چل پڑے

مخمور! واپسی کا ارادہ نہ تھا مگر
در کو کھلا ہی چھوڑ دیا اور چل پڑے

مخمور سعیدی



کرشن موہن
۱۵۸- پشپانجلی، آئی۔ پی۔ ایکسٹینشن پارٹ II، دہلی ۹۲

فکر و احساس کا عکّاس

ٹی ایس ایلیٹ نے کہا تھا:

کیف و مستی میں شاعر زندگی　　　سونگھتا ہے خیال کی خوشبو

محمود سعیدی کی اکثر غزلیں خیال کی خوشبو میں بسی ہوئی ہیں۔ خوشبو یہاں احساس کا استعارہ ہے۔ یعنی ایک قابلِ قدر شاعر کی شاعری فکر و احساس کے امتزاجِ جمیل کی تشکیل ہوتی ہے۔ محض خیالات کا اظہار نری نثر اور عقلیت کی خاصیت ہے۔ اور محض احساسات کی ترسیل، خام اور غیر متوازن رومانیت اور جذباتیت کی نمائش۔ عمدہ شاعری میں خیال اور احساس دونوں کا توازن نظر نواز ہوتا ہے یہی توازن محمود سعیدی کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے اور ان کے اسلوب کا کلاسیکی رچاؤ اسی امتیاز کا غماز۔ مثلاً

اک تیرہ باطن ان بستیوں کا سردار ہوگا　　　پہچان یہ ہے اس کا لبادہ زرکار ہوگا
ترا میرا کہا مناسب بہت ہے　　　لفظ و معنی کی سنگت چل دو دل ہے
اجلے خوش پوشاک بدن اس بستی کے　　　میلی روحیں اپنے اندر رکھتے ہیں
فسانے گڑھ رہا ہے جھوٹ ان کا　　　مگر میری صداقت بے زباں ہے
دماغ و دل میں یہ سانپوں کی سرسراہٹ سی　　　ہوا چلی تو کھنڈر جاگ اٹھے خیالوں کے

ایک اور زاویے سے دیکھیں تو کلاسکیت، حسن اور آرائش یعنی حسنِ باطن اور حسنِ ظاہر کا اجتماع ہے۔ بہ الفاظ دیگر معنی کی لطافت کے ساتھ ساتھ کا رکھ رکھاؤ اور نفاست بھی لازم ہے۔ محمود کا کلام اس دل نواز کیفیت کی تابندہ مثال ہے۔ خوب سیرت افکار و محسوسات اور خوب صورت شگفتہ نگارش سے ان کی غزلوں کا لطف دو بالا ہو جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اس کے شاہد ہیں۔

نارسائی کی گھٹن پھیلتی جائے دل میں　　　بند کمرے میں لٹکتے ہوئے جالوں کی طرح
خاموش رہ کر پہنچاؤ، اس تک کچھ اپنی باتیں　　　لفظوں میں کیونکر اپنے دکھوں کا اظہار ہوگا
پلکوں کی شبنم، اس کی طرف کیا لے کر چلے ہو　　　اس کے لئے تو پھولوں کا تحفہ درکار ہوگا
سایہ سایہ درختوں کی یہ سڑک شہر سے چل کے آئی تھی گاؤں تک　　　واپسی کے سفر میں مگر ایک دن گاؤں کی رونقیں شہر لے جائے گی
مری بجھی ہوئی آنکھوں کو روشنی بخشے　　　وہ پھول جو ترے چہرے کا استعارہ ہو

شاعر نے واقعی درست کہا ہے۔

ہر ورق پر مرے احساس کی تصویریں ہیں　　　میرا دیوان ہے محمود اک البم کی طرح

محمود کو ہر صنفِ سخن پر قدرت حاصل ہے، ان کے قطعات، رباعیات اور نظمیں بھی ان کے کلاسیکی مزاج کی عکاس ہیں مثلاً یہ رباعی، اس کے بعد قطعہ:

یہ رات یہ تنہائی یہ سونا آنگن　　　میرے در و دیوار ہی میرے دشمن

آتی ہے کہیں دور سے آواز تمہاری ____ خاموش ہوئی جاتی ہے دل کی دھڑکن
لمحہ لمحہ کر رہا ہوں جمع اپنی عمر کا ____ خیر مقدم کو یہ کلیاں چن رہا ہوں دیکھئے
زندگی نغمہ سرا ہے۔ بر بربطِ انفاس پر ____ موت کے قدموں کی آہٹ سن رہا ہوں دیکھئے

ان کی غزلوں کی طرح ان کی نظمیں بھی اپنی تہ داری کے باوصف، ابہام اور بے راہ روی سے بری ہیں "ہمزاد"، "ایک گنہگار نظم"، "بہار کا آخری گیت"، "ایک گلابی دوپہر"، اور "عصری آگہی کا ایک لمحہ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

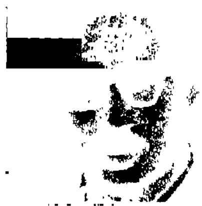
اس میں کوئی شک نہیں کہ مخمور نے عمدہ نظمیں لکھی ہیں۔ لیکن ان کا کمال بدرجہ اتم غزلوں میں اجاگر ہوا ہے۔ لیکن جیسا کہ ان کی متعدد نثری تصانیف سے ظاہر ہے، انہیں نثر پر بھی بھرپور عبور حاصل ہے اور نثری نظم پر بھی۔ ان کی ایک بے عنوان نثری نظم ہے جس کا عنوان "تعارف" ہو سکتا ہے۔

میرا نام سلطان محمد خاں ہے
میں بیٹا ہوں
مولانا احمد خاں کا
جو پنج وقتہ نمازی تھے
لیکن میں فجر کی نماز کے وقت

سویا ہوا پایا جاتا ہوں
ظہر اور عصر کی نمازوں میں
دفتر کی مصروفیت
میرا پیچھا نہیں چھوڑتی
مغرب اور عشا کی نمازیں

مجھ پر لعنت بھیجتی ہیں
کہ یہ وقت میری شراب نوشی کا ہے
اس کے باوجود مجھے
اپنے نام پر بھی اصرار ہے۔
اور اپنی ولدیت پر بھی

اس نظم میں ان کا بے لاگ اعتراف ان کے خلوصِ دل اور سوزِ مستقل کا اظہار شفاف ہے۔ کیا ان کا یہ احساسِ معصیت ان کی معصومیت نہیں؟ ❋



مخمور سعیدی

◆

دھوئیں میں در و بام کھونے کا منظر مرے سامنے ہے
مرے شہر کے خاک ہونے کا منظر مرے سامنے ہے

ہرے پیڑ جڑ سے اکھاڑے ہیں آندھیوں نے اچانک
پرندوں کے برباد ہونے کا منظر مرے سامنے ہے

عجب پیاس تھی وہ، جو دلوں میں درندوں کی بھڑکی ہوئی تھی
لبوں کو لہو سے بھگونے کا منظر مرے سامنے ہے

یہ ڈر ہے یہاں کھیتیوں میں بس اب موت ہی اُگ سکے گی
زمینوں میں لاشوں کو بونے کا منظر مرے سامنے ہے

وہ جلتا ہوا چہرۂ دوراں کو نگلے ہوئے گھور اندھیرے
خلاؤں میں تاروں کے کھونے کا منظر مرے سامنے ہے

ابھی ناخداؤں کے سفاک تیور میں بھولا نہیں ہوں
ابھی کشتیوں کو ڈبونے کا منظر مرے سامنے ہے

کہیں رات کی سسکیوں کی صدائیں میں سنتا رہا ہوں
کہیں صبح کے خون رونے کا منظر مرے سامنے ہے

برابر کے گھر سے امڈتے ہوئے شورِ شب خوں کو سن کر
پڑوسی کے چپ چاپ سونے کا منظر مرے سامنے ہے

کہا تھا جو مخمور دیکھا نہ جائے مجھے دیکھنا تھا
کہ ہو کر بھی اپنے نہ ہونے کا منظر مرے سامنے ہے

◆

کچھ اتنے پاس سے ہو کر گزر گیا ایک شخص
کہ مجھ سے جیسے مجھے دور کر گیا ایک شخص

جدا ہوا تو کئی لوگ اور یاد آئے
پرانے زخم سبھی تازہ کر گیا ایک شخص

خیال و خواب میں اب بھی بسا ہوا ہے مگر
نگاہ ڈھونڈ رہی ہے کدھر گیا اک شخص

گلی گلی وہی چہرہ مجھے دکھائی دے
اجاڑ شہر کو آباد کر گیا اک شخص

ہمیں نے اس کے لئے وار کھائے تھے سارے
ہمیں سے خود کو بچا کر گزر گیا اک شخص

دلیر تھا، کوئی آسیب اسے ڈرا نہ سکا
مگر خود اپنے ہی سائے سے ڈر گیا اک شخص

جگا سکیں نہ مرے گھر کو آہٹیں اس کی
گلی کے موڑ پہ آ کر ٹھہر گیا اک شخص

ٹپک پڑا جو مرے شعر سے لہو بن کر
وہ رنگ میرے تخیل میں بھر گیا اک شخص

قیامت اس پہ جو گزری، گزر گئی مخمور
کسی سے کچھ نہ کہا گھٹ کے مر گیا اک شخص ●

◆

۳ رشتوں کی اک بھیڑ ہے میرے ساتھ مگر تنہا
کہہ نہ سکا جو درد کسی سے آج وہ تجھ سے کہ

ایک جھلک میں پلکوں پر سو خواب پرانے چمک
روشنی آنکھوں کی بڑھ جائے تیری طرف جب دُ

کوئی تمنا بھی گنہ نہیں جو درد کو سرشا
وہ میرے ہاتھوں کی عبادت تیرا بدن جب چھو

بارش ہو نغمات کی مجھ پر جب اس کی آواز سُ
جی یہ چاہے اس بارش میں جنم جنم تک بھیگ

میری رسائی میری حدوں تک تیری فضائیں تو
تو مجھ تک آئے تو کیونکر تجھ تک کیسے پہنچوں

دوری کے یہ لمحے بڑھ کر کہیں نہ صدیاں ب
تجھ کو جب اپنے پاس نہ پاؤں جانے کیا کیا سو

میرے گھر کی چھت پر کب سے تیرا بسیرا ہوا نہ
آسماں پر اڑتے پنچھی آ تیرے پر کاٹوں

اک رستہ طے ہو جائے تو کتنے رستے دیں
ختم سفر کی حسرت لے کر منزل بیٹھ

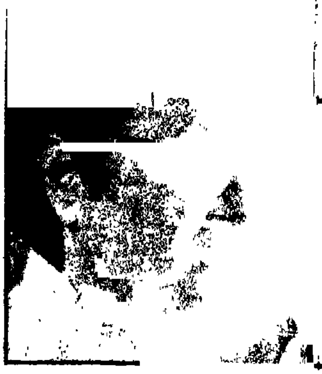
منتظر اے مخمور بہت دن سے میں اسی آواز کا
اس کا بلاوا آ پہنچا ہے خود سے رخصت ہو لو

سی-۱۰، ڈی ڈی اے فلیٹس، ماتا سندری روڈ،


میک اَپ سے چھپانے سے کیا فائدہ!
صافی سے علاج کیجیے!
آپ میک اپ سے اپنے چہرے کے کیل مہاسے، پھوڑے اور پھنسیاں زیادہ سے زیادہ چھپا سکتے ہیں، لیکن صافی ان تکلیفوں کو جڑ سے ہی دور کر دیتی ہے۔ یہ خون کی ان سب خرابیوں کا کامیاب علاج ہے، جن کی وجہ سے آپ کے منہ پر پھوڑے پھنسیاں نکل آتی ہیں اور آپ کی جلد پر بدنما داغ دھبے پڑ جاتے ہیں۔ صافی میں موجود ۲۳ مصفّی خون لازمی اجزا اور دوائیاں آپ کی جلد کو پھپھوندی اور جراثیم کے اثرات کو پھیلنے سے روکتی ہیں۔ طبی تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ صافی ہر طرح سے بے ضرر ہے۔
صافی — ۵۰ سال سے بھی زیادہ عرصے سے قابلِ اعتماد مصفّیِ خون!
صافی کا استعمال شروع کیجیے۔ آپ کو اپنی جلد کے داغ دھبے چھپانے کی ضرورت ہرگز محسوس نہیں ہوگی، کیونکہ صافی فسادِ خون کی شکایت دور کر کے آپ کی جلد کو صاف و شفاف اور ملائم بنا دے گی۔ صافی ان بیماریوں کا بھی مؤثر علاج ہے: • جلد پھٹنا • گرمی دانے اور خارش • نکسیر • دائمی اور عادتی قبض • خسرہ • پیشاب میں جلن • عام تھکاوٹ۔
صافی موسم کی تبدیلی کے دنوں میں پیدا ہونے والی بیماریوں کی روک تھام کے لیے بھی مفید ہے۔
خون اور جلد کی بیماریوں کی قدرتی دوا کا گھریلو نام
صافی
جِلد نکھارنے کا آسان طریقہ
ہمدرد
SAFI

سریندر پرکاش
۴۳/۴ ، یوگی راج آشرم ، ہنس بوگرا مارگ ، کالینہ ، بمبئی ۔ ۹۸

فسان



[قسط نمبر ۴]

دو

یا الٰہی مٹ نہ جائے دردِ دل
مٹنے والوں کو مٹائے دردِ دل

اقبال چند سبھروال یہ شعر نہ جانے کب سے گنگنا رہا تھا۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ تارکول کی سڑک میں سے نکلنے والے بخارات ونڈ اسکرین میں سے واضح طور پر دکھائی دیتے تھے۔ گہرے نیلے رنگ کی اسٹیشن ان بخارات میں سے راستہ بناتے ہوئے چلی جا رہی تھی۔ پچھلی سیٹ پر اقبال چند ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور اس کی نظر ونڈ اسکرین پر جمی ہوئی تھی۔ بوڑھا ڈرائیور یعقوب گاڑی چلاتا ہوا ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ یعقوب نہ ہو۔ کوئی خاموش بے حرکت کھلونا ہو۔ جو گاڑی چلانے کے علاوہ کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ سڑک کے دو رویہ ٹاہلی کے درخت اپنے پتوں سے اپنے وجود کو چھپائے کھڑے سورج کی تمازت سے پناہ مانگ رہے تھے۔ ہر چیز دہک رہی تھی۔ اور اقبال چند گنگنا رہا تھا۔ "یا الٰہی۔ ...."

اقبال چند کو اپنا شوکت بہت بری طرح یاد آ رہا تھا۔ شوکت اور اقبال گورنمنٹ کالج راولپنڈی میں ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔ شوکت ضلع مظفر آباد کشمیر کا رہنے والا تھا۔ ان کا موضع کوہ مری سے پدلی کی طرف پڑتا تھا۔ بہت دور نہیں تھا۔ خچروں یا گھوڑوں پر آٹھ دس گھنٹے کا راستہ تھا۔ راستے میں ایک ڈھکی پڑتی تھی۔ اور سرہالے کا منہ نود نالہ پار کر کے ان کے گاؤں کی مسجد کا برج نظر آنے لگتا تھا۔ سارا راستہ ہرا بھرا تھا۔ کہیں کہیں پتھریلی چٹانوں کی آغوش میں نامعلوم پانسے کے خود رو عنابی پھول اس طرح دکھائی دیتے تھے۔ جیسے ننھے ننھے بچے اپنی جھونپڑیوں کے جھروکوں سے راہ چلتے مسافروں کو دیکھ رہے ہوں اور پھر جیسے آسمان سے کوئی زمین کی اوک میں پانی انڈیل رہا ہو ــــ اسے ایک ایک چیز یاد آ رہی تھی۔ وہ وہاں ایک ہی بار گیا تھا۔ جب وہ راولپنڈی سے گرمیوں کی چھٹیوں میں چکوال اپنے گاؤں جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ شوکت اس کا روم میٹ بھی تھا۔ دونوں سامان باندھ رہے تھے اور دونوں ایک دوسرے سے بچھڑنے پر اداس تھے۔

"شوکت... !" اقبال کی آواز بڑی اداس تھی۔

"بول۔ !" شوکت نے اپنا ہولڈال کستے ہوئے جواب دیا۔

"اس بار تو۔ میرے ساتھ چکوال چل۔"

"اور ابا کی مار کون کھائے گا؟۔"

"اگلے سال ہم دونوں مل کر کھا لیں گے۔"

"تو ایسا کرتے ہیں۔ ہم دونوں تیرے پتا جی کی مار کھا لیں گے اگلے سال۔"

دونوں ہنسے، پھر یہ طے ہوا کہ ایک مہینہ چکوال میں اور ایک مہینہ گذر سبڈال میں گذاری جائے۔ اور دونوں چکوال کیلئے روانہ ہو گئے۔

پوم ۔ پوم ۔" تپتی ہوئی سڑک پر کھڑی جگالی کرتی بھینس کو ہٹانے کیلئے یعقوب نے ہارن بجایا۔ لیکن بھینس ٹس سے مس نہ ہوئی۔ مجبوراً گاڑی کو کچے میں ڈال کر آگے لے جانا پڑا۔ یعقوب اس معاملے میں بڑا تجربہ کار ڈرائیور تھا یعنی اقبال چند کے والد دیوان چند وقت سے، اور دیوان چند کے چکوال میں اینٹیں پکانے کے بھٹے تھے۔ اور سڑکیں بنانے کی ٹھیکیداری۔

یہ بیالیسواں میل تھا۔ چوالیسویں میل سے سڑک کی مرمت شروع کی گئی تھی۔ اور اقبال چند کا سارا عملہ وہیں خیمہ ڈالے بیٹھا تھا۔ اور تپتی سڑک پر بھاگتی ہوئی اسٹیشن پر ماضی کے بھوت کا سایہ منڈلا رہا تھا۔ ......

...... راولپنڈی سے دونوں منڈرہ پہنچے۔ یہیں سے چکوال کے لئے گاڑی ملتی تھی۔ لیکن ابھی گاڑی ملنے میں دو گھنٹے باقی تھے۔ سامان اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں رکھ کر وہ شہر نکل گئے۔ بازار پہنچ کر انہوں نے سادھو رام حلوائی کی جلیبیاں جو بہت مشہور تھیں۔ پیٹ بھر کر کھائیں۔ چیلا رام کی دکان سے لوہے کی کڑاہی میں کڑھا ہوا دودھ پیتے، بادام اور چھوارے پڑا دودھ پیا پان کے ساتھ شوکی ایک ایک سگریٹ سلگائی اور پھر اسٹیشن پہنچ گئے۔ گاڑی آگئی

وقت آئی تھی دونوں اس میں سوار ہو گئے۔ اور بھاپ سے چلنے والے انجن نے سیٹی بجائی۔

" کو۔ و۔ و۔!"

راستے میں انہوں نے جہلم کا پل پار کیا اور ٹھاٹھیں مارتے دریا کو دیکھا جو جہلم شہر کے ساتھ ساتھ ایسے چل رہا تھا جیسے شہر میں گشت کرنے آیا ہو۔ اقبال اچانک فکر مند ہو گیا تھا۔ گاڑی کے ڈبے میں بیٹھے بیٹھے وہ باہر دیکھ رہا تھا۔ ہر چیز پیچھے پیری ڈائن کی طرح الٹی بھاگی جا رہی تھی۔ اس کے دل میں ایک وسوسہ سا رہ رہ کے سر اٹھا رہا تھا۔ اس کو زندگی میں پہلی بار احساس ہوا کہ جذبے بڑے کمزور ہوتے ہیں۔ وہ حقیقت کی کمان پر تیر کی طرح نہیں چڑھ سکتے۔ اب کیا ہوگا؟ اب کیا ہوگا؟ اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔

"کیا بات ہے رے؟ تو اتنا چپ کیوں ہے؟" شوکت نے اچانک پوچھا۔ اقبال بوکھلا سا گیا۔ "نہیں تو، کچھ نہیں، یونہی کچھ سوچ رہا تھا" "کیا سوچ رہا تھا یار ——؟ کچھ ہمیں بھی تو بتا۔ چکوال میں کوئی تیری راہ تو نہیں دیکھ رہی ——؟"

"نہیں برادر ایسا کچھ نہیں، سچ پوچھو تو کچھ بھی نہیں۔ اور اگر کچھ ہوا تو تمہیں پتہ چل ہی جائے گا۔ اور پھر ہونا ہی کیا ہے! . . ."

شوکت بہت زور سے ہنسا تھا۔ اس کے ہنسنے پر ڈبے میں بیٹھے ہوئے دوسرے بہت سے لوگ بھی متوجہ ہوئے۔ اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر اپنی اپنی بات چیت میں مصروف ہو گئے۔ یہ انٹر کلاس کا ڈبہ تھا۔ ریل میں اس سے اوپر دو درجے اور تھے۔ اور ایک درجہ اس سے نیچے تھا۔

بوڑھا ملازم یعقوب جوان تھا۔ بڑا مستعد۔ اقبال کا بھیجا ہوا تیلی گرام مل چکا تھا۔ اور گھر والوں نے اقبال کو لینے کے لئے اسٹیشن بھیج دی تھی، سامان وغیرہ اٹھانے کے لئے ایک ملازم بھی تھا۔ یہ ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر شوکت کافی متاثر ہوا تھا۔

چکوال چھوٹی سی تحصیل تھی۔ بس ایک قصبہ جس کی زمین ناپنے کے لئے کسی "دامن اقتدار" کی ضرورت نہ تھی۔ آدمی ذرا گشت کرتا۔ ہوا سارے بازاروں (جو بہت زیادہ نہ تھے) اور گلیوں میں سے گذر جاتا تھا۔ پھر بھی وہ گاڑی میں بیٹھ کر گھر پہنچے۔

سردار اقبال چند سبھروال ولد سردار دیوان چند سبھروال ولد سردار پرتاب سنگھ سبھروال قوم ہندو جات کھتری [اونچی ذات کے کھتری بھی کھتریوں میں ان سب سے اونچے سات گھرانے گنے جاتے تھے۔ اور سردار صاحب کا خطاب انگریز حکومت کی کسی اہم خدمت کے صلے میں ملا تھا۔]

شہر کے بیچ میں بنے جوہڑ سے ہٹ کر قصبے کے باہر واقع خالصہ ہائی اسکول سے آگے ایک کوٹھی نما مکان میں رہتا تھا۔ جہاں نوکروں، چاکروں کی چہل پہل تھی۔ اور اقبال کی ماں کاسنی رنگ کے ڈوپٹہ کی بکل مارے۔ جاپانی ریشم کی شلوار قمیص پہنے اپنے برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑی اسٹیشن کو اندر آتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اور اسٹیشن اس طرح وہاں اس کے بالکل سامنے اس طرح رکی کہ جیسے اس سے آگے ایک انچ زمین بھی نہ رہ گئی ہو۔ اقبال چند کی ماں درگاوتی بڑی باوقار عورت نظر آتی تھی۔ اقبال بالکل اپنی ماں پر گیا تھا۔ شوکت کو پہچاننے میں دیر نہ لگی۔ دونوں موٹر سے اترے، اس سے پیشتر کہ شوکت سر جھکا کر اور ہاتھ اٹھا کر آداب کرے، اقبال نے کہا۔

"ماں جی یہ میرا ہم جماعت ہے، روشن لال" اور پھر جلدی سے اس کا ہاتھ کھینچا اور دونوں نے ماں جی کے چرن چھو لئے۔ ماں نے جی بھر کے دعائیں دیں۔ ان کی درازی عمر کے لئے، زندگی میں ان کی کامیابی کے لئے، ہر طرح سے محفوظ رہنے کے لئے، زندگی کے سرد و گرم سے سرخرو نکل جانے کے لئے۔

شوکت ہکا بکا سا کھڑا تھا۔ دعائیں جیسے کسی آسمانی اسم کی طرح ان پر نازل ہو رہی تھیں۔ اقبال نے ایک بار اس کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا دیں۔ وہ گھبرایا سا تھا۔ شوکت کا جی چاہا کہ اس سے پوچھے۔

"کیا بات ہے رے؟ تو اتنا چپ کیوں ہے؟"

مگر نہیں، اس نے کچھ نہ پوچھا، جیسے وہ سب سمجھ گیا تھا" ہاں ——! اس کے سوا اور چارہ بھی کیا ہے، اس نے اپنے آپ کو تسلی دی۔

سامان ایک بڑے ہی آرام دہ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اقبال کو کمرے میں جاتے ہوئے ڈر سا لگ رہا تھا۔ وہ شوکت کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"شوکت، شوکت شوکت" وہ اسٹیشن کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا بڑبڑایا۔

"کچھ کہا، چھوٹے شاہ جی؟" یعقوب نے پیچھے دیکھ کر گاڑی چلاتے ہوئے پوچھا۔

"یا الٰہی مٹ نہ جائے درد دل" اقبال کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اور گاڑی بدستور اپنی مقررہ رفتار سے چلتی رہی۔ چالیس میل تک پہنچ گئی۔ جہاں سڑک کوٹنے والا بڑا سا کالا بھجنگ انجن کھڑا تھا۔ جو لکڑی جلنے سے چلتا تھا۔ سری رام انجن ڈرائیور انجن کی سیٹ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اور انجن کی چمنی سے دھواں نکل رہا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک خیمہ لگا تھا۔ جس کے باہر درخت کے نیچے بڑا سا مٹی کا مٹکا پڑا تھا اور پاس ہی انجن کے گلاس

رہے تھے مزدور عورتیں اور مرد بجری کے تسلے سروں پر اٹھا کر انجن کے آگے بچھا رہے تھے تاکہ اسے چلنے میں آسانی ہو۔ اقبال نے گاڑی سے اترتے ہوئے [illegible] ہی عرصے سے ایسا ہو رہا ہے۔ ہم انجن کے آگے انجن کی آسانی کے لئے بجری بچھانے جا رہے ہیں۔ پھر اسے خیال آیا۔ یہ انجن اور اس کا ڈرائیور سری رام اور اس سڑک کو بنانے کا ٹھیکہ اور یہ مزدور مرد عورتیں اور یہ خیمہ اور خیمے میں بیٹھا کام کرتا ہوا عطر سنگھ منشی اور خیمے کے اندر رکھا مٹی کا مٹکا جو مالکوں اور منشی کے پانی پینے کے لئے ہے۔ اور خیمے کے باہر رکھا بڑا مٹکا اور ایلومینیم کے گلاس۔ جو مزدوروں کے پانی پینے کے لئے اور یہ سارا سیٹ اپ اسے ورثے میں ملا ہے۔

"میں تم سے معافی چاہتا ہوں شوکت بھائی" اقبال نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔ "مگر تم تو جانتے ہو اس کے بغیر چارہ بھی کیا ہے میری ایک مسلمان سے دوستی، ایک مسلمان کا اس گھر میں مہمان کی حیثیت سے رہنا۔ شاید ممکن نہیں ہے، لیکن میں بے قصور ہوں، مجھے تیری دوستی کی قسم میں بے قصور ہوں۔ ہمیں یہ سب ورثے میں ملا ہے۔" اور اقبال کی آنکھیں چھم چھم برسنے لگیں۔

شوکت نے پلنگ سے اٹھ کر اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا اور بھینچ کر بولا۔

"ہٹ پاگل روتا کیوں ہے؟ میں سمجھتا ہوں، میں بھی تو اسی کاز کا ایک حصہ ہوں، جیسے کہ تم۔"

اور اقبال کو لگا جیسے اس کے سینے پر رکھی برف کی وزنی سل ایکا ایکی پگھل کے بہہ گئی ہے۔

اقبال کے والد گھر پر نہ تھے۔ وہ بھونڈ گئے تھے، جہاں ڈپٹی کمشنر صاحب دورے پر آئے ہوئے تھے۔ ایک پرانے تنازعے کے سلسلے میں ملنا بہت ضروری تھا۔ اور اقبال کی والدہ نے بتایا تھا کہ شام تک ضرور آجائیں گے۔

"میرا مطلب ہے۔ یہ حلال ہے یا دوسرا...؟"

اقبال کا چہرہ بالکل سفید ہو گیا۔ اسے اس اچانک سوال کی بالکل توقع نہ تھی۔ اور وہ ٹھیک طرح سے اس کے جواب کے لئے تیار بھی نہ تھا۔ اس نے جلد سے اپنے آپ کو سنبھالا۔

"بھئی! بات یہ ہے کہ مرغ تو گھر پر ہی کٹے ہیں۔ ظاہر ہے جھٹکا سے آہستہ آہستہ، لیکن یہ گوشت قصاب سے آیا ہے۔ اور میرا خیال ہے یہ حلال نہیں ہوگا۔ کیوں کہ تم جانتے ہو ہمارے گھر میں...

"اوہ!۔ تو یہ ترکاری کون سی ہے۔؟"

"شاید کدو ہے۔"

"بس ٹھیک ہے۔ میں یہ کدو لے لیتا ہوں اور یہ دال...."

وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے خاموشی سے کھانا کھا رہے۔ اور کمرے کے بوجھل ماحول میں ان کے نوالے چبانے کی آواز گونج۔ ان دونوں کو لگا ان کے پاس کہنے سننے کو کچھ نہیں رہ گیا ہے۔ دونوں اندر کے جذبے، پیار اور نفاست اس کینڈل اسٹینڈ پر جلتی ہوئی موم کی طرح آہستہ آہستہ پگھل رہے تھے۔

عبدل بہشتی نے دروازے پر کھڑے ہوتے صدا لگائی۔

"مشک آئی ہے، راستے سے سامان ہٹا لو۔" دالان میں لیمپ میں کام کرتی ملازماؤں نے جلدی سے برتن سمیٹ کر ایک طرف کر دیئے کھڑی کر دی اور لمبی رسی پر پھیلے ہوئے کپڑے اکٹھے کر دیئے عبدل اپنا لئے دالان سے ہوتا ہوا سیڑھیاں چڑھ کر کوٹھے پر پہنچا۔ اور اس نے پلنگ فرش پر مشک سے پانی کا چھڑکاؤ کیا۔ گرم گرم بھاپ اٹھنے لگی۔ پھر اس نے دو چار پائیاں بچھا کر ان پر اجلے بستر بچھا دیئے تازہ تکیے لگائے اور رات کو اوڑھنے کے لئے سفید لٹھے کی دھلی ہوئی چادریں پائینتی جماد

شوکت اور اقبال کھانا کھا کر کوٹھے پر پہنچے اور چپ چاپ اپنے بستر پر دراز ہو گئے۔ سارے قصبے پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ آسمان پر ٹمٹما رہے تھے اور فضا میں جگنو ابھر کر چمک کر پھر ڈوب جاتے تھے۔ کو پیچھے پھیلے ہوئے اجاڑ میں جھینگروں کے بین کرنے کی آواز گونج رہ

اچانک ایک سایہ سیڑھیوں سے ان کی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دونوں نے اس طرف دیکھا۔ سایہ ان کے قریب آ کر رکا۔

"دودھ لائی ہوں چھوٹے شاہ جی!" ایک نسوانی آواز ابھا دی۔

"دیوار پر رکھ دے ڈھانپ کر"۔ اقبال نے لیٹے لیٹے ہی لیٹے سے جواب دیا۔

"تھک گئے ہوں تو ٹانگیں دبا دوں چھوٹے شاہ جی!"

"نہیں۔ جا اب!"

سایہ پھر سیڑھیوں کی طرف سرک گیا۔ شوکت نے اندھیرے میں دیکھا، سب سنا، لیکن ایک انتہائی پتھریلی خاموشی اس کے سینے پر ڈالے ہوئے تھی۔ اس نے کروٹ بدلی۔ اور بے اختیار اس کے منہ سے "یا اللہ!" پھر اندھیرا اور خاموشی ایک دوسرے کے گلے مل گئے۔

[جاری]



غالب عرفان

اگرچہ قہر کے موسم عذاب لکھتے رہے
ہم اپنے آپ کو اہلِ کتاب لکھتے رہے

ادا نہ کر سکے اک قرضِ جسم و جاں لیکن
حقیقتوں کے سفر میں سراب لکھتے رہے

جدید نسل کے شام و سحر کے درس میں ہم
قدیم لوگوں کے سارے نصاب لکھتے رہے

بھنور میں ڈوب گئے ہم مگر وہ سانس کے تار
جو ساحلوں پہ بھی اک نقشِ آب لکھتے رہے

نہ دیکھ پائے جو ہم رت جگوں کے پہروں میں
ہمارے ذہن وہ رنگین خواب لکھتے رہے

وہ جس کو لکھ نہ سکا بندشوں میں قیدِ قلم
ہم اپنے خون سے وہ انقلاب لکھتے رہے

ہنر کے ہاتھ بھی کیا ہیں کہ دستِ عرفاں میں
شعور و فکر کے چنگ و رباب لکھتے رہے

ایل - ۱۵، ۱۷ اسیکٹر ۴ سی ۵ نارتھ کراچی کراچی ۳۶ [پاکستان]



اندر موھن کیف

کل تک آسودہ دلی تھی آشیاں تھا اور میں
آج ہے بکھرا ہوا ایک ایک تنکا اور میں

میں کسے آواز دیتا اور سنتا بھی تو کون ؟
میرے گرد و پیش خوابوں کا نگر تھا اور میں

ہم سفر تو تھا مگر غم آشنا وہ بھی نہ تھا
فاصلہ رکھ کر چلے تھے میرا سایا اور میں

اس نے موتی چن لیے میں سیپیاں چنتا رہا
اپنے اپنے ظرف کے قیدی تھے دریا اور میں

اب اکیلے میں بھی میں تنہا کبھی ہوتا نہیں
اس قدر مانوس ہیں وہ ایک کمرہ اور میں

وقت بھی چلتا رہا عمرِ رواں کے ساتھ ساتھ
ہم سفر دونوں ہیں اک جھونکا ہوا کا اور میں

کیفؔ کتنی مختصر ہے زندگی کی داستاں
اک سرابوں کا سفر ہے ایک صحرا اور میں

ان کی اک اک بات کو دل نے یاد کیا ہے سارا دن
یارو ہم نے خوب منایا اب کے سال کا پہلا دن

میری بوڑھی آنکھیں ڈھلتی شام کا منظر تکتی تھیں
مڑ کر دیکھا تو بچوں کی پیشانی سے ابھرا دن

دل کیوں آنے والی کل کی آس لگائے بیٹھا ہے
آج بھی ہے کل اندیشے کل بھی ہوگا آج سا دن

کوئی گوتم ہی سمجھے گا یہ جذبوں کی دھوپ اور چھاؤں
ہم جب گھر کو چھوڑ کے نکلے آدھی رات تھی آدھا دن

تو نے سانسوں کی سولی پر کتنی لمبی رات گزاری
کاش ترے ارپن کر سکتا میں اپنے حصے کا دن

کیفؔ ابو میں کلیاں چٹکیں نظروں میں گلزار کھلے
اچھی صورت دیکھ کے نکلا اچھے موڈ میں گزرا دن

۸/۹۲ - سول لائنز، جھانسی - ۲۸۴۰۰۱

نریندر سنگھ بھاٹیا
[illegible] نگر، لدھیانہ ـ ۱۴۱۰۰۸

ہوا کا شاہکار

دوسری جنگ عظیم ختم ہی ہوئی تھی ـ اتفاق سے مجھے ملتان ریلوے اسٹیشن پر ماہنامہ "ادب لطیف" خریدنے کا موقع ملا ـ اور میں کرشن چندر ایم ـ اے کے نام سے ان کی کہانی بھوت پڑھ کر ان سے متعارف ہوا۔ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک چل رہی تھی ـ طوطا مینا کی کہانیوں کا دور اور بادہ و ساغر کی شاعری کی رو سے ہٹ کر ان ترقی پسند افسانہ نگاروں اور شاعروں نے اردو ادب کو نیا موڑ دینا شروع کیا تھا مگر وہ اکثر تلنگانہ اور کوریا کے سُرخ تارے بارے زیادہ لکھا کرتے تھے ملک کے بٹوارے کی سرگرمیاں بھی جاری تھیں لیکن میری ملاقات نے جو ان ترقی پسند شاعروں اور افسانہ نگاروں سے ہوئی اُس نے ثابت کر دیا کہ اُنھیں کوئی سیاسی یا مذہبی تنگ نظری قبول نہ تھی۔

ترقی پسند تحریک کی رو سے متاثر ہو کر میرے کچھ دوستوں نے بھی اس میں شرکت کی ـ ان میں سے کچھ کے نام اب ہند و پاک کے اردو ادب میں مشہور ہو چکے ہیں ـ میں ان کے جوش اور خلوص کا مقابلہ جہاد پہ جانے والے شہداء سے کر سکتا ہوں ـ وہ آپس میں ملتے، اپنی نئی کہانیاں سناتے اور اپنا کلام پڑھتے تھے ـ وہ سب معاشی طور پر کمزور تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ مزاج کے تند ہو چکے تھے جو اپنی تخلیقات ایک دوسرے کو سناتے تو آپس میں جھڑپیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ وہ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالا کرتے تھے ـ ان میں سے کچھ کو میں نے لدھیانہ میں پینٹر غنچہ کے یہاں دیکھا تھا ـ پینٹر غنچہ کا اصل نام پینٹر بالکرشن تھا لیکن جلد ہی اس نے نئے دوستوں کی صحبت میں رہ کر اپنا تخلص غنچہ رکھ لیا تھا اور شاعری شروع کر دی تھی، جس کا سب دوست مذاق اُڑاتے تھے، خاص کر دلیپ جو حال ہی میں بمبئی کے سر جے جے اسکول آف آرٹس سے ـــــــــــ فائن آرٹس کا کورس کر کے آیا تھا ـ اس کے طنزیہ جملے چبھنے والے ہوتے تھے ـ وہ اکثر کہا کرتا تھا، بالکرشن! تم ساری عمر بورڈ پینٹ کرتے کرتے مر جاؤ گے تم بابو راؤ پٹیل کے "فلم انڈیا" رسالے سے ایکٹریسوں کی تصاویر کی نقل کرتے ہو ـ ان تصاویر پر خانے بناتے ہو، پھر بورڈ پر وہی خانے، اور تصویر کو بورڈ کے خانوں میں بٹھا دیتے ہو ـ تم تو نقال ہو ـ تم خود کچھ تخلیق نہیں کر سکتے ـ یہی وجہ ہے کہ تمہاری بیوی تمھیں چھوڑ کے بھاگ گئی ـ تم اپنے لاشعور میں خُود جانتے ہو کہ تم چور ہو ـ مجھے دیکھو، جے جے اسکول کے پرنسپل نے میرے لئے کہا تھا کہ اگر آج وین گاف یا سیزان ہوتے تو میری قدم بوسی کرتے۔

بلدیو نے لقمہ دیا، اور اگر آج جارج برناڈ شاہ ہوتا تو میرا شاگرد ہوتا ـ محشر نے کہا، دنیا غالب کے کلام کو بھول جاتی اگر میرا کلام پڑھتی، اکبر خان بولا: اگر آج موپاساں ہوتا یا چیخوف تو میں ان کا گرو ہوتا، بالکرشن نے چلا کر کہا، "ہاں! میں چور ہوں' تصویروں کی نقل کرتا ہوں، لیکن جب تم سب بھوک سے بلکتے ہوئے میرے پاس آتے ہو تو پیٹ بھر کھانا میرے ہی گھر میں کھاتے ہو اور کھا کر نمک حرامی کرتے ہو ـ بولو سیزان کے بیٹے دلیپ تم اپنی کسی ایک پینٹنگ کی بھی کھچڑی بنا کر کھا سکتے ہو؟ بولو محشر کے بچے اور اکبر، تم دونوں اپنے کلام اور افسانوں کے بدلے ابھی دو روٹیاں خرید کر کھا سکتے ہو؟ اور اکبر تمہارا ایک افسانہ چھ مہینے پہلے شائع ہوا تھا اور اس کا معاوضہ ایک پیسہ بھی ابھی تک نہیں ملا ـ دلیپ کی پینٹنگ پانچ سال پہلے دو سو روپے میں بکی تھی اس حساب سے ایک ماہ کی اوسط کمائی ساڑھے تین روپے سے بھی کم ہوئی ـ تمھیں تو اپنے بل بوتے پہ دال روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی اور یہاں تم روغن جوش، پلاؤ اور بریانی کھاتے ہو ـ حرام خورو! مجھے پریشان نہ کرو۔ ایک دن میں تم سب کی تخلیقات سے بھی بڑا شاہکار بنا کر

دکھاؤں گا۔"

بالکرشن ویسے بہت حلیم اور مسکین انسان تھا۔ لیکن کبھی کبھی اسے ہُواؤں کے دورے پڑتے تھے۔ تب وہ بہت عجیب عجیب حرکتیں کیا کرتا تھا۔ یہ "ہوا" اس کے اندر دو سال پہلے گھس آئی تھی جب اس کی زندگی کا سُکھ چین اس کی بیوی نے برباد کر دیا تھا اور اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

اس روز کا جھگڑا رونق سنگھ نے نپٹایا تھا۔ وہ سب سے زیادہ سنجیدہ آدمی تھا۔ اس نے اس روز کیس اشنان کیا تھا۔ وہ اٹھ کر بال کرشن کو پچکارنے لگا۔ لیکن بالکرشن کے دورے اتنی جلدی نہیں ٹلتے تھے۔ اس نے دماغی علاج بہت کرائے تھے بہت سے کشتے، معجونیں اور جڑی بوٹیوں سے بنی دوائیں بھی کھائی تھیں، ڈاکٹروں نے اسے جذباتی ہیجان سے بچے رہنے کے لئے کہا تھا۔ لیکن صبر کی بھی حد ہوتی ہے۔ اس کے دوست تماشہ دیکھنے کے لئے اسے اکثر چڑاتے تھے۔ اسے ہمیشہ نیچا دکھانے کی فکر میں رہتے تھے وہ سادے دوست احساسِ برتری میں مبتلا تھے اور بال کرشن کی حقیقت پسندی اسے پاگل بنا دیتی تھی۔

رونق سنگھ نے بال کرشن کا موڈ بدلنے کی کوشش کی "دیکھو! میں سعادت حسن منٹو کے افسانوں کا نیا مجموعہ لایا ہوں، پڑھو "ٹھنڈا گوشت"، "بُو" ہائے اس گھاٹن عورت کی پھولی ہوئی پنڈلیاں۔ منٹو کی موتری، پڑھو ہندوستان اور پاکستان، دونوں کی ایسی کی تیسی پھیر دی ہے۔ عصمت چغتائی کا افسانہ ---- رضائی کا پہاڑ بنا ہوا، بلی دودھ پی رہی ہے، چپ بے حیا، ماں کی ڈانٹ۔ بھائی کمال کر دیا، ترقی پسند ادیبوں نے۔ میاساں کی کہانیوں میں کہاں یہ چسکا؟"

لیکن بال کرشن کا موڈ اب تک خراب تھا۔ وہ کہہ رہا تھا "دیکھو! تم سب لوگ شوق سے میرے پاس رہو۔ غالب غربت میں مرا، موپاساں اور سیزان بھی۔ وین گاف نے اپنا کان کاٹ کر اپنی محبوبہ کو دے دیا تھا کیوں کر اس کے پاس دینے کو اور کچھ بھی نہیں تھا۔ تم بھی کھاؤ، پیو اور مزے کرو، بس مجھے پریشان نہ کیا کرو۔"

"ارے سنو! رونق سنگھ بولا! ایک بات یاد آئی۔ تمہاری پڑوسن کا کیا حال ہے؟ تم سے روز وعدہ کرتی ہے ملنے کا لیکن کبھی نہیں آتی۔"

بال کرشن کا موڈ استوار ہوا۔ وہ مسکرایا اور بولا "وہ رات آئی تھی"۔ "ارے سچ"! سبھی چلائے۔ "تو کیا اکیلے اکیلے"۔ سب بالکرشن کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ دلیپ، محشر اور اکبر، سب کہنے لگے "یار! سناؤ رات اس کا شوہر کہاں تھا؟"۔

"اس کی نائٹ ڈیوٹی تھی، وہ ایک ہوزیری میں کام کرتا ہے۔ بھلا رات بھر میرے پاس رہی۔ وہ میری زندگی میں سب سے بڑی تسکین کا باعث ہے۔ کیوں کہ وہ تم لوگوں کی طرح میرے زخموں پہ نمک نہیں چھڑکتی۔ رات تم سب نیچے سوئے ہوئے تھے اور میں اور وہ اوپر میانی میں۔ وہ دیوار پھلانگ کر آئی تھی۔ جانتے ہو کیوں؟" "کیوں؟" سبھی چلائے۔

"کل میں نے اس سے کہا تھا۔ میں رات تمہارا انتظار کروں گا اور اگر تم نہ آئیں تو میں اپنے جسم کا کوئی خاص حصّہ کاٹ دوں گا۔"

"بھائی! کمال کر دیا۔" محشر نے کہا اس کی آنکھیں حشر برپا کرتی ہیں۔ "ہائے! دُم توڑ دوں میں اس کی آنکھوں پہ ہونٹ رکھ کر۔" اتنے میں دروازہ کھلا اور بلدیو آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک خط تھا وہ بولا "میرا ڈراما "بند دروازہ" آل انڈیا ریڈیو دلّی نے منتخب کر لیا ہے۔ یہ دیکھو چٹھی"۔ وہ تقریباً ناچ رہا تھا۔ "چلو ایک پارٹی ہو جائے"۔ وہ سب پھر چلائے۔

"نہیں پہلے روپے آنے دو۔ شاندار جشن ہو گا۔ میں انھیں لکھ دوں گا، مجھے چیک سے پیسے نہ بھیجیں۔ پچھلی بار مجھے بہت تکلیف ہوئی تھی تم تو جانتے ہو، بینک میں کوئی میرا اکاؤنٹ نہیں کھول سکتا" وہ قہقہے لگانے لگا۔

کچھ دور تک ہمارے تعلقات کا وہ سب سے حسین زمانہ گذرا تھا۔ ہر کوئی خوش تھا۔ اور کوئی کسی کی دکھتی رگ نہیں چھیڑتا تھا۔ ہر کوئی سکون سے اپنی تخلیقات کی طرف رجوع تھا۔ اس بیچ رونق سنگھ کا ایک افسانہ "ادبِ لطیف" نے اشاعت کے لئے قبول کیا تھا۔ اور محشر کی ایک غزل "آجکل" میں چھپی تھی۔

لیکن خوشی کا وہ مختصر سا زمانہ دلیپ کے بمبئی سے مایوس ہو کر لوٹ آنے سے ختم ہو گیا۔ اس کی ایگزیبیشن بمبئی کے جہانگیر آرٹ گیلری میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ اس کی ایک بھی پینٹنگ نہ فروخت ہوئی اور نہ ہی نقادوں نے اخبارات میں اس کے آرٹ کو سراہا تھا۔ ایک ناقد نے تو اسے مدتوق مصوّر کا خطاب دے دیا تھا۔ دلیپ،

بال کرشن کا پانچ [illegible] کا مقروض ہو چکا تھا۔

ایک رات دلیپ بہت خراب موڈ میں باہر سے لوٹا لیکن بالکرشن اس رات نہ جانے کیوں اور کس بات پر خوش تھا۔ دلیپ نے اسے اکسانے کی بہت کوشش کی لیکن بال کرشن مسکراتا ہی رہا۔ اس نے اس مہینے کافی کمائی کی تھی۔ ایک مہینے میں بیس بورڈ پینٹ کیے تھے اور آٹھ سو روپے کمائے تھے۔ اس وقت بھی وہ "فینسی کلاتھ شاپ" کا ایک بہت بڑا بورڈ بنا رہا تھا جس کے لیے اس نے سو روپے پیشگی بھی قبول کیے تھے۔ اس بورڈ پر انگڑائی لیتی ثریا کی ایک تصویر تھی اور دوسری طرف نگار سلطانہ کی جبیں پر اس نے خانے بنائے ہی تھے اور تصویر، نامکمل تھی۔

تب دلیپ نے اپنا پرانا شرارتی حربہ استعمال کیا۔ اور کہنے لگا۔ "تو پھر چوری پکڑا گیا، بالکرشن غنچہ صاحب، آپ چوری سے کب باز آئیں گے؟"

اسی وقت سامنے کے ڈھابے والے کا لڑکا پانچ آدمیوں کا کھانا لے کر آیا۔ اس روز بال کرشن نے دو بھنے ہوئے مرغوں کا آرڈر دیا تھا اور تندوری روٹیاں منگائی تھیں سبھی کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ بال کرشن نے شرکت نہ کی۔ دلیپ پھر بھی بال کرشن کو چھیڑتا رہا، ایک آرٹسٹ اور پینٹر میں بہت فرق ہے۔ ہم سب لوگ تخلیق کرتے ہیں اور تم تقلید یا پھر چوری، اس نے بال کرشن پر فقرہ کسا۔

رونق سنگھ نے دلیپ کو سمجھانے کی بڑی کوشش کی لیکن دلیپ تو بولتا ہی رہا۔ "یہ میرا کیا بگاڑے گا۔ اس کی بیوی اسے چھوڑ کر بھاگ گئی تو اس نے، اس کا کیا بگاڑ لیا۔ بگاڑا تو اپنے دماغ کا جس میں اس نے "ہوا" بھر لی۔ اب تو میں اسے اور بھی تنگ کر سکتا ہوں۔ کیا اس کو مجھ سے پانچ سو روپے واپس نہیں لینے؟

بال کرشن اٹھ کر اوپر چلا گیا۔ وہ انتہائی اداس اور مغموم ہو چکا تھا۔

گیا ہو گا اپنی بملا کے انتظار میں' دلیپ نے طنزاً کہا اور اپنی انگلیاں باری باری چاٹنے لگا۔

سب نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور اپنے اپنے بستروں پر دراز ہو گئے۔ رات بھر ان کے خراٹے گونجتے رہے۔ اوپر میانی میں بہت ٹھنڈ تھی۔ کسی نے بھی پرواہ نہ کی کہ بال کرشن کو نیچے بلا لیتے۔

کوئی چار بجے صبح ایک بڑے دھماکے کی آواز آئی جیسے چھت پر سے کوئی گرا ہو۔ سب اٹھے، رونق نے بتی جلائی، سب کی نظریں سامنے پڑے "فینسی کلاتھ شاپ" کے بورڈ پر پڑیں۔ کسی نے بورڈ پر بنے چہرے بگاڑ دیئے تھے۔ اور کالے رنگ سے سارا بورڈ لیپ دیا تھا۔ ثریا کی مونچھیں بنا دی تھیں اور "فلم انڈیا" رسالے کاٹی ہوئی نگار سلطانہ کی تصویر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے

دروازہ کھول کر سب باہر نکلے۔ سڑک پر بال کرشن کی [ ] توڑتی لاش پڑی تھی وہ الف ننگا تھا۔ اس نے اپنے پورے بدن پر مختلف رنگ پھیر رکھے تھے۔ چہرے پر لال، چھاتی پر نیلا پیٹ پر پیلا اور بالوں میں سنہری رنگ انڈیل لیا تھا۔ اس نے اپنے نروس بریک ڈاؤن کی حالت میں کوٹھے سے چھلانگ لگا دی تھی۔

اور اچانک سب نے دیکھا اس نے اپنا "عضو خاص" بھی کاٹ پھینکا تھا جو اس کے قریب ہی پڑا تھا۔ اس پر اس نے سفید رنگ کیا تھا۔ جو اس کے خون سے گھل مل چکا تھا۔

بال کرشن نے ایک ہچکی لی اور اس کی آخری سانس، اس کی "ہوا" سمیت اپنا لافانی شاہکار چھوڑ کر اڑ گئی۔ ❋

بقیہ صفحہ ۳۴ دادی ماں

پر لٹا کر ان پر ایک سرخ کفن ڈال دیا۔ چند گھنٹوں کی آہ و زاری کے بعد ہم لوگوں نے ان کی آخری رسومات کے انتظامات کے لئے انہیں چھوڑ دیا۔

شام میں ہم لوگ انہیں سپردِ آتش کرنے کے لئے ایک ارتھی ساتھ ان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور اس کی سنہری روشنی ان کے کمرہ اور برآمدہ کو منور کر رہی تھی۔ ہم لوگ آدھے راستے ہی میں رک گئے۔ ہمارے اور ان کے کمرے میں، جو تک وہ مردہ حالت میں سرخ کفن میں لپٹی پڑی تھیں، ہزاروں گوریّا فرش پر پھیلی ہوئی بیٹھی تھیں۔ کوئی چہچہاہٹ نہیں تھی۔ ہم لوگوں کو ان پرندوں پر ترس آنے لگا۔ اور میری ماں ان کے لئے کچھ روٹیاں لے آئیں۔ انہوں نے میری دادی کی طرح روٹیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کئے اور ان کو ان کی طرف پھینکا۔ گوریّوں نے روٹی کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ جب لوگ وہاں سے اپنی دادی کی لاش اٹھا لے گئے تو وہ سبھی پرندے خاموشی سے اڑ گئے۔ دوسری صبح خاکروب نے روٹی کے ٹکڑوں کو سمیٹ کر کوڑا دان میں ڈال دیا۔ ❋



اختر نظمی

سلسلۂ زخم زخم جاری ہے
یہ زمیں دور تک ہماری ہے

میں بہت کم کسی سے ملتا ہوں
جس سے یاری ہے اس سے یاری ہے

ریت کے گھر تو بہہ گئے لیکن
بارشوں کا خلوص جاری ہے

ہم جسے جی رہے ہیں وہ لمحہ
ہر گذشتہ صدی پہ بھاری ہے

ناؤ کاغذ کی چھوڑ دی میں نے
اب سمندر کی ذمہ داری ہے

کوئی نظمی گذار کر دیکھے
ہم نے جو زندگی گذاری ہے

● غلام خرچہ والان، دولت گنج، لشکر۔ گوالیار

علی ظہیر

ایک منظر
ساحل سے پرے

پرے شعلوں کے پیچھے
خواب کی نیلی فضا ہے
ساحل امید کی چادر
ساحل امید
جو آئینہ بن کر بولتا ہے
مجھ پہ حیرت کے دریچے کھولتا ہے

وہ سفینہ جو کھڑا ہے
بادبانوں کے بنا
وہ ہواؤں سے پرے کچھ بولتا ہے
ہوا اور آگ، پانی اور مٹی
یہاں سب ایک ہیں

ورڈس ورتھ کے مقام
لیک ڈسٹرکٹ میں

یہ کیسا سکوں ہے منظر میں
ہر آنکھ ہری ہو جاتی ہے
تالابوں کی اس وادی میں
ہر سانس نئی ہو جاتی ہے
بادل کے بدن یہ کہتے ہیں
کہساروں کے رخساروں سے
ہم عکس تمہارا بنتے ہیں
پکڑو نہ ہمیں تم ہاتھوں سے
بہتا ہوا دریا رکتا ہے
بادل کے سخن سننے کے لئے
پھولوں سے ہوا آجاتی ہے
دریا کو جھکولے دیتی ہے
پھر دریا رواں ہو جاتا ہے
ہر شاخ صنوبر سے اوپر
چڑیوں کے ترانے اٹھتے ہیں
میں محو یہاں ہو جاتا ہوں
اک روح ازل بن جاتا ہوں

● ساز اپارٹمنٹ، روڈ نمبر ا، بنجارہ ہلز، حیدرآباد

یوسف ناظم

۱۹۔نیوویپ، پلاٹ نمبر ۱۳۔ باندرہ ریکلیمیشن، بمبئی ۵۰



ایک جرعہ صہبا بنام صہبا

راہ و رسم کے لئے ملاقاتیں ضروری نہیں ہوتیں بلکہ ملاقاتوں سے تو راہ و رسم میں خلل واقع ہوتا ہے۔ صہبا صاحب سے میری ابھی طرح کی راہ و رسم تھی گذر رہے تھے کہ اچانک ۱۹۸۹ء میں کراچی میں ان سے ملاقات ہو گئی بس یہی برا ہوا۔ سرسری راہ و رسم محبت میں تبدیل ہو گئی۔ خط و کتابت ان سے پہلے بھی تھی اور اب لیکن افکار کے نمبروں کی طرح دو سال میں ایک یا دو خط معاشقے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ اب ۱۹۹۱ء میں پھر ان سے معانقہ ہوا۔ مقام حادثہ بمبئی۔ لکھنؤ میں کہ اب ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور پرانی آشنائیوں کی تجدید میں مبتلا ہیں۔ جون کے مہینے میں ایک مجاز سیمینار منعقد ہوا۔ [جون کا مہینہ گرمیوں کے لئے نہیں ... کے لئے بھی موزوں مانا گیا ہے۔] صہبا لکھنوی اسی سیمینار میں مدعو تھے۔ ادھر سے فارغ ہوئے تو بھوپال چلے گئے۔ ان کے متعلق کہاوت یہ مشہور ہے کہ یہ بھوپال ہی پر ہوتے تھے لیکن یہ بھوپالی نہیں ہیں۔ لکھنوی ہیں اس لئے کہ لکھنؤ میں نہیں پیدا ہوئے تھے۔ بھوپال ان کا وطن ثانی ہے۔ اسی وطن پر نظر ثانی کرنے گئے تھے۔ کتابت غلطیاں پڑھئیں۔ شہروں کی پروف ریڈنگ نہیں کرنی چاہئے۔ اب تو خطاطی اور خط نستعلیق ہی نہیں رسم الخط تک تکلیف میں ہے۔ یہ اپنے لوگوں کی ہی مشکل ہے۔ بھوپالی چیزوں کی توپ برقرار رہے۔ گویا کہ خود وہ ابھی تک وہی ہیں جو پہلے تھے۔ ۱۹۹۱ء میں ان سے ملاقات پر پرانا زخم جو مندمل ہو رہا تھا پھر ہرا ہو گیا۔ پتہ نہیں یہ جون کا مہینہ تھا یا دیدار کا مجھے تو بہرحال بھاگن لگا۔ صہبا لکھنوی اتنے ہی دبلے اور حسین نظر آئے جتنے کراچی میں پائے گئے تھے۔ کوشش تو انہوں نے مزید کی ضرورت ہو گی مگر اس کی گنجائش کہاں تھی۔ افکار نے انہیں اس حال پر پہنچایا ہوگا۔ افکار کا انہوں نے ابھی ابھی ایک فاؤنڈیشن بنا لیا ہے۔ یہ انگریزی خوب ہے۔ عروج پر پہنچنے پر فاؤنڈیشن۔ ہم غریب اردو والے پہلے بنیاد رکھتے ہیں۔ اور بعض وقت تو بنیاد ہی پر رک جاتے ہیں۔ صہبا لکھنوی نے اپنے بلکہ عنفوان شباب میں افکار کی ولدیت کا اعلان کیا تھا۔ افکار نے پہلی مرتبہ ۴۵ء میں سورج کی روشنی دیکھی۔ اس زمانے میں یوں بھی بھوپال میں روشنی بہت کو گودوں گود لیا گیا۔ بھوپال کی شہرت میں جتنا دخل شاعر مشرق اقبال کا ہے اتنا ہی دخل صہبا لکھنوی کے افکار کو بھی ہے۔

صہبا لکھنوی کی ابتدائی تعلیم بھوپال میں نہیں ہوئی۔ لکھنؤ میں ہوئی چونکہ یہ پیدا ہوتے ہی لکھنؤ چلے گئے تھے۔ وہیں یہ سید شرافت علی سے صہبا لکھنوی ان کی خوبی یہ ہے کہ سید شرافت علی کی حیثیت سے یہ گمنام ہیں لیکن صہبا لکھنوی کے طور پر بہت مشہور۔ تاریخ ایسا ہوا کرتا ہے۔ جھانسی کی رانی کا نام کتنے لوگوں کو معلوم صحافت کے میدان میں یہ لڑے بھی رانی جھانسی کی طرح۔ [بھوپال اور جھانسی میں فاصلہ ہی کتنا ہے۔] ویسے صہبا کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ اس نام سے فائدہ اٹھائیں گے ممکن ہے انہیں کوئی اچھا ساقی نہ ملا ہو۔ اقبال نے مشرق اور مغرب کا فرق بتایا تھا۔ یہاں ساقی نہیں پیدا، وہاں بے ذوق ہے صہبا۔ انہوں نے نام ترک کیا لیکن شرافت ان سے چھوٹی نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ کسی بھی خادم ادب کو سوائے "خدام ادب" ٹولی کا ایک فرد سمجھتے ہیں۔ یہ ساری غلط فہمی پھیلائی ہوئی ہے۔ یہ مصرع انہیں نہیں کہنا چاہئے تھا۔

صہبا لکھنوی جب تک بھوپال میں رہے بھوپال میں ان کی رہائش کی وجہ شاید یہ رہی ہوگی کہ اہل لکھنؤ ان کے بھوپال میں پیدا ہونے کی بات کا برا مانا ہوگا اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ لیکن دنیا میں یہ ہوتا چلا آیا ہے [کتا کوئی تھے پڑا کوئی اور جاتا ہے] پیشہ تدریس سے کہ اس زمانے میں موزوں پیشہ تھا۔ جڑے رہے لیکن ۰ سالہ تجربے نے انہیں بتا دیا کہ بھوپال کے طالب علموں کو پڑھانا آسان کام نہیں ہے۔ یہ اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ انہوں نے قلم برداشتہ استعفیٰ لکھ ڈالا اور بدلے ہوئے کہ بھوپال تو چھوڑا ہی چھوڑا، ہندوستان کو بھی خیرباد کہہ دیا۔ وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے۔

توڑ بیٹھے جب کہ ہم بھوپال کے جام و سبو   آسماں سے بادۂ گلفام اب برسا کرے

[پہلے مصرع میں تحریف ہے یہ کہنے کی ضرورت نہیں] ہم نے سنا ہے لکھنؤ سے بھی کسی نے یہی کہا تھا کہ شہر چھوڑا ہے تو مرا بھی چھوڑ دے۔ صہبا لکھنوی نے یہاں بہت کچھ چھوڑا ہوگا۔ لیکن افکار کو نہیں چھوڑا۔ کراچی پہنچے۔ کچھ دم لیا۔ کچھ دم کیا۔ اور ۱۹۵۰ء سے ان کا افکار بھوپال' افکار کراچی ہوگیا اور کراچی تو جیسا کہ جغرافیائی کتابوں میں بتایا گیا ہے ایک بندرگاہ ہے۔ افکار بھی تیرنے اور پرواز کرنے لگا۔ وہ تو اچھا ہے کہ محکمہ ڈاک ادبی رسائل کے معیار و قیمت کے حساب سے ڈاک خرچ وصول نہیں کرتا ورنہ افکار کی چھٹی ہوجاتی۔ اب بھی محکمہ ڈاک کو افکار سے اچھی خاصی آمدنی ہوجاتی ہے۔ اردو کے رسائل کی یہ روایت رہی ہے کہ ان کا جاری ہونا اور بند ہونا تقریباً جڑواں کام ہے۔ یا بند نہیں ہوتے ہیں تو ان کا معیار ایسا ہوجاتا ہے کہ قاری چاہنے لگتے ہیں کہ یہ بند ہوجائیں۔ صہبا لکھنوی کے پاس کوئی جادوئی بلب ہے۔ جس کا تعلق کراچی کے پاور ہاؤس سے نہیں خود ان کے دل کے پاور سے ہے۔ ان کے خزانۂ قلبی سے تعلق رکھنے والے اس بلب کو کسی سوئچ کی ضرورت نہیں۔ اس میں جو آنچ ہے اس نے افکار کو روشن ستارہ بنا دیا ہے۔ صہبا لکھنوی اسی ایک تارے کو گنتے اور اسے صد ہزار انجم میں تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ [آپ سمجھ گئے ہوں گے کا اشارہ ...ہرہ آفاق اور ماہتاب نمبروں کی طرف ہے۔ ویسے یہ نمبر چند ے آفتاب اور چندے ماہتاب ہیں انجم تو میں نے انہیں اس لئے کہا ہے کہ یہ تعداد میں بہت ہیں۔]

صہبا لکھنوی کو ادب و صحافت کا ذوق اور مخیف و کمزور رہنے کا شوق ہے۔ معلوم نہیں پیچھے بھاگنے کی کب کی عادت ہے۔ اسی عادت کی وجہ سے اب بیماریوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ اپنی عمر بھی بڑھاتے گھٹاتے رہتے ہیں۔ اس میں ان کا دل بہت لگتا ہے۔ ایک دن مجھ سے بولے میں تم سے سینئر ہوں۔ میں نے پوچھا اس کا خمیازہ کیا ہے۔ پھر انہیں خیال آیا کہ سینئر بننا ٹھیک نہیں ہے فوراً ہی اپنی خطابت کی غلطی کا صحت نامہ شائع کر دیا اور کہا کہ ان کی سرکاری تاریخ پیدائش ۱۹۱۹ء ہے لیکن یہ ہیں ۱۹۲۳ء کے۔ [چشم زدن میں ۴ سال چھوٹے ہوگئے!] میں نے عرض کیا مجھے آپ کی دونوں تواریخ پیدائش منظور ہیں۔ بہر حال یہ ان کا کرم ہے کہ انہوں نے بدوران قیام شہر مجھے اپنا خورد سمجھا لیکن سلوک دوستانہ کیا۔ [تصدیق ہوگئی کہ واقعی لکھنوی ہیں۔]

شکر کے رسیا ہیں۔ چائے کی پیالی میں اتنی شکر ڈالتے ہیں کہ پیالی چھلک جاتی ہے۔ چمچے سے پہلے چکھ لیتے ہیں۔ کہ میٹھی ہوئی یا نہیں۔ میٹھی معلوم ہوئی تو اسے مزید میٹھی کرنے کے لئے دو چمچے شکر اور ملاتے ہیں۔ چائے کو خوب ٹھنڈا کرتے ہیں اور اس کے بعد اسے منہ لگاتے ہیں۔ محفل میں دوسرے چائے پی چکتے ہیں تو یہ شروع کرتے ہیں یہ انتہائی چلائے ہوتی ہے۔

صرف ان میں یہ بات بہت اچھی ہے کہ پریشان بھی ہوتے ہیں تو امداد باہمی کے اصولوں کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ تنہا پریشان ہونا انہیں اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ خوش ہوتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں۔ خود کسی اور کو ہونے دیتے ہیں۔ بمبئی میں علی جواد زیدی سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ میں بیٹھا ٹکر ٹکر دیکھتا رہا ایسا معلوم ہوا دونوں چار باغ لکھنؤ میں ہیں۔ اور یہ طے نہیں کر پا رہے ہیں کہ امین آباد چوک جائیں یا نخاس۔ اس دن ان کی خوشی کا یہ عالم تھا کہ اس پر وہ عالم کا شبہ ہو رہا تھا۔ بتا رہے تھے کہ بھوپال میں بھی وہ بہت خوش رہے۔ جہاں قدر چغتائی کا ذکر کرتے اور خوش ہوتے، تھوڑی دیر بعد عبدالقوی دسنوی کا ذکر کرتے اور خوش ہو لیتے۔ پھر فوراً انہیں خیال آتا کہ بہت دیر خوش ہو لئے اب پریشان ہونا چاہئے۔ چینل بدل دیتے۔ یوں ان کی عنایتیں بہت ہیں۔ ان کا تخلص نظر آتا ہے۔ کلام کہیں نظر نہیں آتا۔

صہبا لکھنوی صرف مدیر نہیں۔ مصنف بھی ہیں۔ اقبال اور بھوپال سے متعلق صہبا صاحب کی کتاب کے اب تک ۴ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب فلک چہارم تک تو پہنچ ہی گئی۔ شاید اس کی معراج بھی ہو جائے۔ 'افکار' کے نمبر انہوں نے اتنے شائع کئے ہیں کہ ان کی زد سے شاید ہی کوئی ادیب اور شاعر بچا ہو۔ جو نمبر شائع کیا تو کم پڑ گیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنا پڑا۔ جوش نمبر شائع کیا تو کراچی یونیورسٹی نے اسے بی۔ اے (آنرز) اور ایم۔ اے کے نصاب میں شامل کیا۔ صہبا صاحب سے میں یہ کہنا بھول گیا کہ اب کسی کتاب یا کسی نمبر کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت اس لئے نہیں آئے گی کہ جس کا جی چاہتا ہے اپنی ضرورت کی کتاب کے زیراکس نسخے تیار کروا لیتا ہے۔ جتنا نقصان سینما ہال والوں کو وی سی آر سے پہنچا ہے اتنا ہی ناشران کتب کو زیراکس کے وار سے پہنچا ہے۔ صہبا صاحب کو چاہئے کہ وہ اپنے ملک میں زیراکس اداروں پر پابندی لگوا دیں کہ یہ ادارے صرف عدالت ناموں' اور قانونی دستاویزوں کاغذات کی نقل کریں گے۔

'افکار' کی خوبی یہ سمجھئے کہ اس میں ہندوستان بہت ہے۔ یہ اردو کا رسالہ ہے کراچی کا نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ صہبا صاحب آج بھی لکھنوی ہیں۔ اور اتنے لکھنوی ہیں کہ شیروانی پہن لیتے ہیں تو اور زیادہ مستعلیق دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں ایک وزن کرنے والی مشین پر کھڑے ہوتے تو مشین کی سوئی نے جنبش تک نہ کی۔ افکار کے دو نمبر ہاتھوں میں تھام کر وزن کرواتے تو مشین بھی داد دیتی۔ انہیں مدا ماقطہ کہنے کو جی نہیں چاہا لیکن راہ و رسم کو برقرار رکھنے کے لئے یہ ضروری تھا۔

راحی قریشی

دشت و صحرا ہیں دلوں میں، آبجو، آنکھوں میں ہے
جلتا بجھتا ایک منظر چار سو آنکھوں میں ہے

مدعا محروم ہے میری زباں تو کیا ہوا ؟
میری آنکھیں دیکھ، میری آرزو آنکھوں میں ہے

بلبلی بستی کیا کہوں، کس سے کہوں کیسے کہوں
زخم کتنے دل میں ہیں کتنا لہو آنکھوں میں ہے

سب کی آنکھوں پہ ہے آتے جاتے لمحوں کا عذاب
اور میں یہ سوچ کر خوش ہوں کہ تو آنکھوں میں ہے

ہاتھ میں خنجر تھا، آنکھوں میں پشیمانی بھی
مدتیں گذریں، ابھی تک وہ عدو آنکھوں میں ہے

اک مسلسل تشنگی کے کرب سے وابستہ ہوں
آج تک تصویر صحرا ہو بہو آنکھوں میں ہے

ذہن میں اک جنت اخلاص ہے راحی تو کیا
اک جہنم قتل و خوں کا کو بہ کو آنکھوں میں ہے

● شعبۂ اردو، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ (کرناٹک)

دوہا غزل

یعقوب یاور

سکھ کے پھول بکھیر یا دکھ کے ڈیرے ڈال
تجھ کو سب معلوم ہے میرے گھر کا حال

کیسر یا بنت گیا ہریالی کا کال
پھر بھی ہم سب ایک ہیں بھارت ماں کے لال

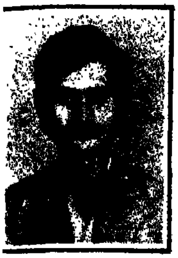
لوٹ تو آویں گے بھلا پردیسی من میت
گاؤں کی تپتی ریت پھر پھیلاتی ہے جال

اس کو آخر کیا ملا خدمت کا انعام
حاتم طائی سے کوئی کرتا ایک سوال

جھوٹے کا جھوٹا سکھا، سچ کا سکھا نہ کوئے
سچ سے رشتہ جوڑنا جیون کا جنجال

وکرم کی مردانگی ہاری سو سو بار
قصے کی جادو گری جیت گیا بیتال

● شعبۂ اردو، وسنتا کالج برائے خواتین
راج گھاٹ روڈ، وارانسی۔



انس معین

یہ قرض تو میرا ہے چکائے گا کوئی
دکھ مجھکو ہے اور نیر بہائے گا کوئی

کیا پھر یونہی دی جائے گی اجرت پہ
کیا تیری سزا اب کے بھی پائے گا کوئی

انجام کو پہنچوں گا میں انجام سے
خود میری کہانی بھی سنائے گا کوئی

تب ہوگی خبر، کتنی ہے رفتار
جب شام ڈھلے لوٹ کے آئے گا کو

امید سحر بھی تو وراثت میں ہے،
شاید کہ دیا اب کے جلائے گا

ک بار تبسم میرے ہونٹوں سے
یہ بوجھ بھی لگتا ہے، اٹھائے گا

اس بار ہوں دشمن کی رسائی سے بہ
اس بار مگر زخم لگائے گا کوئی

شامل پس پردہ بھی ہیں اس کھیل میں
بولے گا کوئی، ہونٹ ہلائے گا

پاکستان کا نوجوان شاعر، ۲۵ سال کی
انتقال ہوا۔ مشہور شاعر طفیل ہوشیارپوری
کے شکریہ کے ساتھ یہ غزل شائع کی جا

[ادارہ]

فاروق راہب
محلہ شانتی پوری، موتی ہاری (بہار)

شب کے ہمسفر

من کی آنکھیں جب کھلیں تو جسم پر کھلے گلابوں کی ساری پنکھڑیاں ہوا میں تھیں اور بہاروں کے قافلے گرد و غبار کے طوفانی رقص میں پھنسے ہوئے نظر آ رہے تھے ـــ تیز و شوخ لمحات کے ساتھ بھرپور جینا جینے کے بعد زندگی موت کے سامنے سہمی ہوئی پڑی تھی!

شیشے جیسا جسم لے کر حیات کے پھول نما پتھروں سے ٹکرانے پر چکنا چور ہو جانا لازمی تھا۔ اور وہ سراُنگ سے ٹوٹی بکھری ہوئی فرش پر چت پڑی، تیزی سے گردش کرتے سیلنگ فین کو یونہی تک رہی تھی کہ ذہن خالی تھا اور نبض ڈوبتی جا رہی تھی ـــ سامنے قیامت کا منظر تھا اور اسے فنا کا پیغام مل چکا تھا ـــ بس ایک دھماکہ اور اس کے بعد سوچنے کا کوئی لمحہ اس کے قریب نہ ہوتا!

شباب کی تمام شوخیوں کے ہمراہ سمندر جیسی گہری اور بے چین آنکھوں کو کسی پرسکون ساحل کی تلاش تھی، جسم میں بھرے شراروں کے اوپر سے گذرتے ہوئے سانسوں کے آبشار، اپنے قرار کے لئے چٹانی نشیب و فراز سے سر ٹکرا رہے تھے۔ صندلی دہکی فضا میں پروان چڑھا وجود، اپنے آس پاس کی تمام رنگینیاں اپنے اندر سمیٹ لینے کو مضطرب تھا ـــ مگر پیاسے کو ملا بھی تو پہلے خشک دریا، جسے عبور کرنے میں صدیاں بیت جائیں!

صحرا کے سراب کی طرح وہ اس کے سامنے تھا! مگر دور مسجد کے گنبدوں سے ٹکراتی اذان جیسی اس کی آواز کی رعونت اور پاکیزگی میں وہ کھوتی گئی تھی۔

"اعتماد پر مکمل قابض ہو جانے کے بعد ہی تم مجھ تک پہونچ سکتی ہو، کیوں کہ تم اپنی تمام ضرورتیں میرے پاس گروی رکھنا چاہتی ہو!"

گہری جھیل کی طرح بے ہلچل مگر بولتی آنکھوں کے آسمان کے دلکش تاروں کی چمک وہ اپنے بھیتر بہت دور تک محسوس کر رہی تھی۔

وہ امین تھا!

شکستہ آدرشوں کا نہیں!!

خونی روتی آنکھوں کا غم اپنے اندر سمو لینے کی شکتی وہ رکھتا تھا ـــ چلچلاتی دھوپ میں جھلستے بدن کو وہ اپنے بازوؤں کا سہارا دے سکتا تھا مگر ـــ!

"مگر، میں جانتا ہوں کہ تمہاری خواہشوں کا دریا میری رفاقت میں پیاسا ہی رہے گا۔ کیوں کہ پیاس کبھی نہیں بجھتی!"

نازک لچیلی شاخیں اس کا بسیرا نہیں بن سکتی تھیں۔ گلاب کے بجائے اس کے کانٹے اسے بے حد عزیز تھے کہ اس کی چبھن میں درد کا سارا ذائقہ پوشیدہ رہتا ہے!

اس لئے وہ اس کے بہت قریب جا کر بھی خود کو بہت دور محسوس کر رہی تھی!

بندھے ٹکے اصولوں میں خود کو پھنسا کر جینے والوں کو وہ احمق سمجھتی اور موقع پر چوک جانے والے اسے بے وقوف لگتے۔ تبھی تو وہ رہبر کی گود میں آ گری تھی! دونوں کے ملتے جلتے خیالات ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے۔ ہوا، پہاڑ، دریا اور جھرنے کی طرح وہ بھی آزاد زندگی گذارنے کا قائل تھا۔ اس لئے اس کے کھولتے بپھرے سمندر میں ہیجانی بارش ہوئی تھی۔ جذبات کے آکاش میں چھائے بادل ٹوٹ کر برسے تھے اور ہوش و حواس کی دنیا اس میں غرق ہوتی گئی تھی ـــ لیکن جب طوفان کا سارا زور ختم ہوا اور سمندر میں اٹھی طغیانی کو سکون نصیب ہوا تو چاروں اور حدِ نگاہ تک کچھ نہ تھا! اپنی بے بسی اور تنہائی پر وہ چکرا کر رہ گئی۔ اس کی کمزوریوں نے اسے کہاں سے کہاں لا پھینکا تھا!

تب اسے کیا معلوم تھا کہ تمام زخمی لمحے اس کے نصیب میں لکھ کر وہ

چلنا پڑے گا!
بتا وہ کون تھا؟"

اس کے پردۂ سماعت سے پھر وہی گرجدار آواز ٹکرائی تھی۔ مگر اس بار بھی اس کے پاس خاموشی کے سوا کوئی جواب نہیں تھا کیوں کہ وہ اب یہاں تھا کہاں!

"ڈیڈ! مارنے پیٹنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں اسے صرف ایک منٹ کا وقت دیتا ہوں۔ اگر یہ ایک منٹ کے اندر اس غدار کا نام نہیں بتاتی تو رسّی سے اس کا گلا گھونٹنے کے بعد میں اسے اس کے کمرے میں سیلنگ فین میں لٹکا دوں گا۔"

اور ٹھیک ایک منٹ کے بعد جیسے ہی وہ اس کی طرف بڑھا کہ ایک تیز اور گونجتی ہوئی آواز نے اس کے قدم جکڑ لئے۔

"ٹھہرو!"

لق و دق صحرا میں پھنسے مسافر کو کھجور کا ایک پیڑ دکھائی دیا تھا۔

"میں ہوں وہ گنہگار جسے تم ڈھونڈ رہے ہو۔"

"نہیں!" وہ بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔ "یہ جھوٹا ہے۔"

"میں اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں۔ اس کی باتوں پہ نہ جاؤ۔"

"میں پھر کہتی ہوں۔ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس میں گنہگار بننے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔"

"سن! میں تمہیں جنت کی بشارت دینے نہیں، صرف تمہاری نجات کے لئے آیا ہوں۔ زندگی کا سارا مزہ لوٹ لینے کے بعد، تمہارا اس کی تلخ حقیقتوں سے روشناس ہونا بھی ضروری ہے۔"

گھٹ کر رہ جانے والے ماحول میں تخیل کی بلند پروازی، احساس کے آتش فشاں کو رونق، گہری فکر میں ڈوبے ذہنوں میں نئی مشعلیں روشن کر رہی تھی۔

"لیکن میں اپنے گناہوں میں تمہیں شامل کر کے مزید گناہ اپنے سر نہیں لینا چاہتی۔"

"تم میرے دوست رہبر کی امانت ہو اور امانتوں کی حفاظت میرا فرض ہے!"

"نہیں! یہ تم پر ظلم ہوگا۔ میرا خودکشی کر لینا اس سے بہتر ہے۔"

"خودکشی بھی گناہ ہے، جرم ہے۔"

"کچھ بھی ہو۔"

"اپنی بکواس بند کر!" ڈیڈ چیخ پڑے۔ "میں جانتا ہوں کہ یہ طاہر ہے۔

مگر میری پوزیشن اور وقار کی خاطر جس کو تو نے نذر آتش کر دیا ہے، اس کے راکھ ہونے سے پہلے، تجھے اس کا ہاتھ پکڑنا ہے۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

ماحول پھر سناٹے میں تھا، مگر دل و دماغ میں ہلچل سی تھی۔

وہ مرجانا چاہتی تھی، لیکن لوگ اسے حیات بخش رہے تھے۔

"ایسے میں وہ کیسے جی سکے گی؟!"

عجیب سی کشمکش سے وہ دوچار تھی۔

"بے کار کی الجھنوں میں الجھ کر اپنے باقی بچے لمحوں کو برباد نہ کرو۔ چلو، آؤ۔ میں تمہیں دکھاؤں کہ تیز ہوا کے بے رحم جھونکوں میں اپنی ڈالی سے جدا ہو کر خشک پتے اپنا سفر کیسے تمام کرتے ہیں۔"

افکار کو ذہن سے جھٹکنے کے بعد وہ اس کی طرف بڑھ گئی۔

احساس کی پیاس جب بجھ جاتی ہے تو حلق کی پیاس باقی نہیں رہتی!

بقیہ صفحہ ۱۸ چھیری والا

اب رفتہ رفتہ ایک سریلی اور خاموش تبدیلی کا احساس جڑ پکڑنے لگا۔ عظیم الشان دو رویہ سڑکوں پر مرکری بلب بجھ کر رہ گئے۔ سینما گھر، تھیٹر اور شبینہ کلب اجڑ کر رہ گئے۔ اور سمندروں میں بدیسی مال سے لدے تجارتی بیڑے جہاں جہاں تھے وہیں رک گئے۔

یہ سب کچھ اتنی سرعت سے ہوا کہ کارپردازان حکومت بھونچکے رہ گئے۔ ایوانِ بالا اور ایوانِ زیریں کے ہنگامی اجلاسوں میں بدیسی کارندوں اور خوشہ چینیوں نے چیخ چیخ کر آسمان سر پہ اٹھالیا۔

یہ کیسے ممکن تھا ——

داستان گو کا بیان ہے کہ ایسے میں ملکی سیانوں کو بدیسی گماشتوں کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھنا پڑا۔ ان کا مل بیٹھنا تھا کہ چند دنوں بعد اچانک ایک روز علی السحر دارالحکومت کی ایک معروف سڑک پر چھیری والا مردہ پایا گیا۔ جب تک لوگ اکٹھے ہوتے اور شہر کا شہر اُمڈتا مستعد کارندوں نے چھیری والے کی لاش ٹھکانے لگادی اور اس کی حنہ ریڑھی میونسپل کارپوریشن کے احاطے میں کھڑی دیگر ریڑھیوں میں شامل کر دی۔

اخبار میں اشتہار نکلا۔

"مومنو، جلدی کرو ——"

لوگوں نے اشتہار دیکھا، اک ذرا جھرجھری لی، لیکن معمول کے کام دھندوں نے انہیں نئے سرے سے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔



مریم غزالہ

میری نظم

کہیں لفظ بکھرے
کہیں لکیریں کھینچیں
کہیں قلم نے سیاہی کا تالاب بنایا
پر نظم میرے پاس نہ آئی
پھر میں ڈھونڈنے نکلی
اس شرمیلی گڑیا کو
ہوش کے ہاتھوں کو تھام کر
پر وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی
تھک کر ہوش نے
نیند کی آغوش میں سر رکھا
کہ وہ دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی
ادھر جگے من سے
لکھ لیا میں نے
اس کا الٹا سیدھا لفظوں کا جال
بغیر تال میل کے الفاظ
خیالوں میں نہ کوئی لچک
جذبات میں نہ کوئی میل
پھر بھی
سب کچھ نوٹ کرلیا میں نے اپنی ڈائری میں۔
صبح دیکھا
خوبصورت سی ایک نظم
اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولے
مسکرا رہی تھی، مجھے تاک رہی تھی
میری نظم

● رادھن پور ۳۸۵۳۴۰ (گجرات)

ہوٹل

کانچ کی الماری میں
ترتیب سے سجے
من لبھاؤنے
کھٹے میٹھے ذائقے

آہٹ،
گن گناہٹ
بھن بھناہٹ کا
ملا جلا نغمہ
چائے کے پیالوں کی میٹھی کھنک
اٹھتے ہوئے دھوؤں کی لاچار گھٹن
کھانسی، گپ شپ،
بے کار چھوکروں کی الٹی بحث
چلتی پھرتی گالیاں
چوکنی نظریں،
تیز چلتے ہاتھ
صفائی کرتا تولیا
بیرے کی چیخ،
ٹپ کا لالچ،
یہ لاؤ! وہ لاؤ!
دو روپے، چار روپے!
صبح سے شام
یہی کہرام

پنہاں

...ں رنگ سا لہراتی ہوئی خواب دھنک
...پھول کھلاتی رہی زخموں کی مہک

...فر تھے بہت بے سر و ساماں یوں بھی
...نے مگر چھین لئے خواب تلک

...وٹا ہے کرشمے وقت کا موسم شاید
...ا اب نہ وہ پہلی سی نزاکت نہ لچک

...اب مری ہم رنگ دوپٹوں سے کہاں
...سب خواب تھے جیسے سونے کی سنک

...دل میں چھپا لاتی تھیں آنکھیں اسکی
...چہرے کو وہ دے جاتا تھا کچھ اور ومک

...لمحہ ہوئی جاتی ہے مدھم جیسے
...دھڑکن ہے کہ جاتے ہوئے قدموں کی دھمک

...کام بھی ہوتا نہیں مجھ سے پنہاں
...تی ہوں بس دل میں لئے دل کی کسک

...ی حمید، بھایانی ویڈ ایپارٹمنٹ، بلاک ایم، نارتھ ناظم آباد کراچی



ترجمہ: ریحان ثروت
کاغذی محلہ، بہار شریف (نالندہ) بہار

دادی ماں

انگریزی: خشونت سنگھ

ہر شخص کی دادی ماں کی طرح میری دادی بھی ایک بوڑھی عورت تھیں۔ میں انہیں بیس سال سے جانتا تھا۔ اور تب سے وہ بڑھاپے کے دور سے گذر رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر جھرّیاں نظر آ رہی تھیں۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ وہ کبھی جوان اور خوبصورت تھیں۔ اور ان کا ایک شوہر بھی تھا۔ لیکن ان کی باتوں پر یقین کرنا مشکل تھا۔ میرے دادا کی تصویر دیوان خانے میں کارنس کے اوپر ٹنگی تھی۔ وہ ایک بڑی سی پگڑی اور ڈھیلا ڈھالا سا کپڑا پہنے ہوئے تھے۔ ان کی لمبی سفید داڑھی ان کے سینے کے بیشتر حصّے کو ڈھکے ہوئے تھی۔ اور وہ کم از کم ایک سو سالہ ضعیف نظر آتے تھے۔ انہیں دیکھنے سے ایسا لگتا تھا کہ ان کے بیوی یا بچے ہوں گے۔ وہ ایسے دکھائی دیتے تھے گویا ان کے صرف بہت سارے پوتے اور پوتیاں ہی ہوں گی۔ ٹھیک اسی طرح میری دادی کے متعلق یہ کہا جانا کہ وہ کبھی جوان اور خوبصورت تھیں۔ یہ خیال بھی میرے لئے تقریباً بلغیانہ تھا۔ وہ اکثر ان کھیلوں کے متعلق بتایا کرتیں جو بچپن میں کھیلا کرتی تھیں۔ ان کی زبانی اپنے سلسلے میں ایسی باتیں بالکل مہمل اور ناقابلِ احترام معلوم ہوتیں۔ چنانچہ ہم لوگ ان کی باتوں کو پیغمبروں کی ان حکایتوں کی طرح سمجھا کرتے جو وہ ہمیں سنایا کرتی تھیں۔

وہ ہمیشہ کوتاہ قامت، فربہ اور قدرے خمیدہ تھیں۔ ان کا چہرہ جھرّیوں کے باعث آڑی ترچھی لکیروں سے بھرا ہوا تھا۔ نہیں، ہم لوگوں کو یقین تھا کہ جب سے ہم لوگ انہیں جاننے لگے تھے وہ بالکل یکساں نظر آتی تھیں۔ وہ اس قدر بوڑھی تھیں کہ اس سے زیادہ بوڑھی نہیں ہو سکتی تھیں۔ اور اسی عمر میں بیس برسوں سے ٹھہری ہوئی تھیں۔ وہ حسین تو نہیں رہی ہوں گی مگر ابتدا سے خوبصورت تھیں۔ وہ بے داغ سفید لباس میں اپنی خمیدگی کو متوازن رکھنے کے لئے ایک ہاتھ اپنی کمر پر رکھے ہوئے اور دوسرے سے مالا جپتی ہوئی ناہموار رفتار سے گھر کا چکر لگاتی رہتیں۔ ان کے چاندی جیسے بال۔ ان کے زرد جھرّیوں بھرے چہرے پر بے ترتیبی سے بکھرے رہتے۔ اور ان کے لب ناقابلِ سماعت قسم کی پرارتھنا میں مستقل جنبش کرتے رہتے۔ ہاں، وہ خوبصورت تھیں۔ وہ موسمِ سرما میں وسیع و عریض اور پرسکون و آسودہ برفیلے پہاڑوں کے منظر کے مانند تھیں۔

میری دادی اور میں ایک دوسرے کے اچھے دوست تھے۔ جب میرے والدین رہنے کے لئے شہر جانے لگے تھے تو انہوں نے مجھے ان کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ اور تب سے ہم دونوں ایک ساتھ رہ رہے تھے۔ وہ مجھے صبح میں بیدار کر کے اسکول کے لئے تیار کرتیں۔ مجھے نہلانے اور لباس پہنانے کے دوران وہ ایک صبح کی پرارتھنا یکساں اور بے لطف لہجے میں اس امید کے ساتھ گاتی رہتیں کہ میں سن رہا ہوں گا۔ اور اسے از بر کر لوں گا۔ میں ان کی پرارتھنا سنا کرتا کیوں کہ مجھے ان کی آواز پسند تھی۔ لیکن میں نے اسے کبھی سیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ تب وہ میری تختی، جسے وہ قبل سے دھو کر اور زرد کھلی کی لیپ چڑھا کر رکھے رہتی تھیں، مجھے دیتیں۔ ساتھ ہی مٹی کی ایک چھوٹی سی دوات اور ایک لال قلم بھی میرے حوالے کرتیں۔ تھوڑا سا مکھن اور اس پر چینی چھڑکی ہوئی ایک موٹی سی باسی روٹی کا ناشتہ کر کے ہم اسکول روانہ ہو جاتے۔ وہ اپنے ساتھ کئی باسی چپاتیاں گاؤں کے کتوں کو دینے کے لئے رکھ لیتیں۔

میری دادی ہمیشہ میرے ساتھ اسکول جایا کرتیں کیوں کہ اسکول مندر سے ملحق تھا۔ گروجی ہمیں حروفِ تہجی اور صبح کی پرارتھنا بتایا کرتے۔ جب بچے برآمدہ کے دونوں جانب قطار میں بیٹھے حروفِ تہجی یاد کرتے رہتے یا ہم آواز ہو کر پرارتھنا گاتے رہتے، میری دادی اندر بیٹھی ہوئی گرنتھ پڑھتی رہتیں۔ جب ہم دونوں فارغ ہو جاتے تو ایک ساتھ گھر واپس آتے۔ اس وقت گاؤں کے کتے مندر کے دروازے پر ہمیں ملتے۔ وہ ان چپاتیوں کے لئے جو ہم ان کی طرف پھینکا کرتے، غرّاتے اور ایک دوسرے سے جھگڑتے ہوئے گھر تک ہمارا تعاقب کرتے۔

جب میرے والدین شہر میں اچھی طرح بس گئے تو انہوں نے ہمیں بلا

ہ ہماری دوستی کا ایک اہم موڑ تھا۔ اگرچہ ہم دونوں ایک ہی
ں رہتے تھے۔ لیکن میری دادی اب میرے ساتھ اسکول نہیں آیا
ں بس سے ایک انگلش اسکول جایا کرتا تھا۔ یہاں گلیوں میں
ں تھے۔ لہٰذا وہ ہمارے شہر کے مکان کے آنگن میں گوریّوں
ی تھیں۔

سے جیسے سال گزرنے لگے ہم دونوں کا ایک دوسرے سے ملنا
نا۔ وہ مجھے کچھ دنوں تک حسب سابق صبح نیند سے بیدار کر کے
ے لیے تیار کرتی رہیں۔ جب میں واپس آتا تو وہ مجھ سے دریافت
رنے مجھے کیا پڑھایا۔ میں انہیں انگریزی کے الفاظ، مغربی سائ
ِن نقل، ارشمیدس کے اصول اور دنیا کے گول ہونے وغیرہ
یں بتاتا، جنہیں سن کر وہ خوش نہیں ہوتیں۔ میرے سبق میں
د نہیں کر سکتی تھیں۔ انگلش اسکول میں جو چیزیں بتائی جاتیں وہ
نہیں رکھتی تھیں۔ انہیں اس بات کا دکھ تھا کہ ہمارے اسکول
، اور بھگوان سے متعلق کوئی تعلیم نہیں تھی۔ ایک دن میں نے انہیں
کوں کو موسیقی کے سبق دیئے جا رہے ہیں۔ وہ یہ سن کر بہت گھبرا
نگاہ میں موسیقی غیر شریفانہ شئے تھی۔ وہ اسے کسبیوں اور
، مشغلہ سمجھتیں۔ اور شرفا کا اس سے کوئی تعلق انہیں گوارہ نہ
نے کچھ کہا تو نہیں مگر ان کی خاموشی ناپسندیدگی کی علامت
۔ بعد وہ مجھ سے شاذ و نادر ہی بات کیا کرتیں۔

میں یونیورسٹی جانے لگا تو مجھے ایک علیحدہ کمرہ دیا گیا۔ دوستی
قطع ہو گیا۔ میری دادی نے اپنی علیحدگی انتہائی تحمل سے گوارہ
ے بات کرنے کے لئے شاید ہی کبھی اپنے چرخے کو چھوڑتیں
طلوع ہونے کے وقت سے اس کے غروب ہونے تک وہ
ب بیٹھی پرارتھنا کرتی رہتیں۔ صرف سہ پہر میں گوریّوں کو کھلا
ستاتیں۔ جب وہ برآمدے میں روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرتی
ں ننھے ننھے پرندے چوں چوں کا شور مچاتے ہوئے ان کے
تے۔ کچھ ان کے پیروں اور شانوں پر آ بیٹھتے۔ اور کچھ تو
ھ جاتے۔ وہ مسکراتیں لیکن انہیں کبھی اڑاتی نہیں۔ دن بھر
ٹ کا یہ وقفہ ان کے لئے انتہائی پرمسرت ہوتا۔

نے مزید تعلیم کی غرض سے بیرونی ملک جانے کا فیصلہ کیا
تھا کہ میری دادی پریشان ہو جائیں گی۔ میں پانچ سال
ہا۔ اور ان کی عمر کے لوگ کبھی بھی اجازت نہیں دے سکتے

تھے۔ لیکن میری دادی نے ہامی بھر دی۔ وہ ذرا بھی جذباتی نہیں ہوئیں۔
وہ مجھے چھوڑنے کیلئے ریلوے اسٹیشن تک آئیں۔ مگر انہوں نے نہ تو کوئی
بات کی اور نہ ہی کسی طرح کی جذباتیت کا مظاہرہ کیا۔ ان کے لب پر پرارتھنا
تھی اور ان کا ذہن پرارتھنا میں گم تھا۔ ان کی انگلیاں مالا جپنے میں مصروف
تھیں۔ انہوں نے خاموشی سے میری پیشانی کا بوسہ لیا۔ اور جب میں اپنے سفر
پر روانہ ہوا تو میں نے اپنے چہرے پر ان کے ثبت کئے ہوئے نقشِ نم کو عزیز
جان کر محفوظ کر لیا کہ کہیں یہ ہمارے درمیان جسمانی تعلق کی آخری نشانی نہ
بن جائے۔

لیکن ایسا ہوا نہیں۔ پانچ سال بعد میں گھر واپس آیا۔ اور اسٹیشن پر
ان سے ملا۔ ان کے بوڑھاپے میں کچھ بھی اضافہ نظر نہیں آیا۔ ابھی بھی ان کے
پاس باتوں کیلئے وقت نہیں تھا۔ اور جب انہوں نے مجھے اپنی بانہوں میں جکڑ
لیا تو اس وقت بھی ان کی زبان بھگوان کا نام جپ رہی تھی۔ میری آمد کے پہلے
دن بھی ان کے سب سے خوشی کے لمحات وہی تھے جو گوریّوں کے ساتھ گذر رہے
تھے اور جنہیں وہ اب خفیف سی سرزنش کے ساتھ دیر تک کھلاتی رہتیں۔

شام کے وقت ان میں ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ انہوں نے پرارتھنا
نہیں کی بلکہ پڑوس کی عورتوں کو جمع کر کے ایک پرانا سا ڈھول لے کر گانے لگیں
وہ کئی گھنٹے تک خستہ حال ڈھول کے پچکے ہوئے چمڑے کو پیٹتی رہیں۔ اور
سپاہیوں کے گھر کی طرف واپسی کا گیت گاتی رہیں۔ بالآخر ہم لوگوں کو انہیں
اعصابی تناؤ سے گریز کرنے کے لئے منع کرنا پڑا۔ وہ پہلا موقع تھا جب میں نے
دیکھا کہ انہوں نے پرارتھنا نہیں کی۔

دوسری صبح وہ بیمار ہو گئیں۔ انہیں ہلکا سا بخار تھا اور ڈاکٹر نے کہا کہ
یہ شکایت دور ہو جائے گی۔ لیکن میری دادی کی سوچ مختلف تھی۔ انہوں نے ہم
لوگوں کو بتایا کہ ان کے خاتمے کا وقت قریب آ چکا ہے۔ وہ کہنے لگیں کہ اپنی
زندگی کا باب اوّل تمام ہونے سے صرف چند گھنٹے قبل انہوں نے پرارتھنا چھوڑ
دی تھی۔ اب وہ ہم سے گفتگو کر کے مزید وقت ضائع کرنا نہیں چاہتیں۔

ہم لوگوں نے اعتراض کیا۔ مگر انہوں نے ہمارے اعتراضات کو نظر
انداز کر دیا۔ وہ سکون کے ساتھ بستر پر لیٹی ہوئی پرارتھنا کر رہی تھیں۔ اور بھگوان
کا نام جپ رہی تھیں۔ اس سے قبل کہ ہم لوگوں کو ذرا بھی شک ہوتا ان کے لبوں
کی حرکت بند ہو گئی اور ان کی بے جان انگلیوں سے مالا گر پڑی۔ ایک پُر
سکون زردی ان کے چہرے پر پھیل گئی۔ اور تب ہم لوگوں نے یہ جانا کہ ان
کی موت ہو چکی ہے۔

ہم لوگوں نے انہیں بستر سے اٹھایا اور رواج کے مطابق زمین

دھنک رنگ

انور حسین انور

ٹھوں کا سبب یوں بھی کچھ زیادہ تھا
دشاہ تھے ہم اور نہ وہ پیادہ تھا
ندروں کی ضرورت بھی آنسوؤں کی نہیں
ارے ہجر کا دامن بہت کشادہ تھا
سچ بھی اب تو کہانی کی طرح لگتا ہے
رے جسم پہ تہذیب کا لبادہ تھا
ے ایسا شخص بھی رہتا تھا میرے خوابوں میں
باں کے رنگ کئی تھے لباس سادہ تھا
یں اپنے گھر سے سفر پہ نہیں گیا ورنہ
تمہارے شہر میں آنے کا بھی ارادہ تھا

● ۱۰۰۔ چھتہ علی رضا، میرٹھ (یوپی)

حنیف نجمی

میں شہر فن میں جب سے شہر یاری کر رہا ہوں
خود اپنی موت کے فرمان جاری کر رہا ہوں
مجھے وہ بے وفا کہتے ہیں حالاں کہ ابھی تک میں
وفا کی کیفیت کو خود پہ طاری کر رہا ہوں
پہن کر مثل سرمد اک لباس بے لباسی
جہاں میں عام رسم پردہ داری کر رہا ہوں
جو مطلق بانجھ ہیں مدت سے پھل دیتے نہیں ہیں
انھیں پیڑوں پہ اب میں سنگباری کر رہا ہوں
یہ دنیا مجھ سے کمتر ہے بہت پھر بھی میں نجمی
اسی کی نذر اپنی عمر ساری کر رہا ہوں

● مودھا۔ اَپرڈس پوسٹ راگول ضلع ہمیر پور (یوپی)

ارشد کمال

سمندر سے کسی لمحے بھی طغیانی نہیں جاتی
مگر ساحل کو غم ہے خشک دامانی نہیں جاتی
غنیمت ہے مری آنکھوں کی یہ سیّال آتش بھی
ابھی سے میرے ذہن و دل کی تابانی نہیں جاتی
سوا نیزے پہ سورج دیر تک رہنے نہیں پاتا
مگر کیا ہے کہ تیری شعلہ افشانی نہیں جاتی
تمدن کا نیا جامہ بہت شفاف ہے یارو!
کہ تن پوشی کرو کتنی ہی عریانی نہیں جاتی
رہا ہو کر بھی کچھ طائر قفس میں لوٹ آتے ہیں
فضائے قید کی عادت بہ آسانی نہیں جاتی

● سولین اسٹاف آفیسر کمرہ نمبر ۱۹۰۴، سینا بھون، نئی دہلی

عبد المتین جامی

کھردرے لفظوں کی یہ چنگیزیت
دے گئی مفہوم کو محرومیت
وقت کے دہشت زدہ ماحول سے
مل گئی ہے ذہن کو آفاقیت
اپنا چہرہ لے کے سب حیران ہیں
آئینہ کھونے لگا ہے عافیت
جب سلگ اٹھے تصور کے حدود
زندگی نے کھوئی اپنی شعریت
سر پہ ان کے خاموشی کا تاج ہے
راس آئی ہے انہیں محکومیت

● رحمت علی بلڈنگ، دیوان بازار کٹک ۷۵۳۰۰۲، اڑیسہ۔

ظہیر آتش

طوفاں تھے جہاں کل پانی کے
اب منظر ہیں حیرانی کے
دکھ جھیل رہے ہیں شام و سحر
جولائق تھے آسانی کے
اب سارے دریا لہو ہوئے
نایاب ہیں قطرے پانی کے
پھر قدم قدم دہرائے گئے
قصے اک بھولی کہانی کے
سیراب کریں گے صحرا کو
خوں دیں گے بجائے پانی کے

● قندھار واڑی، بانسواڑہ (راجستھ

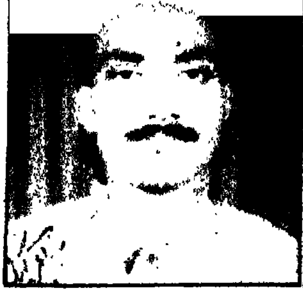
کیفی سنبھلی

نہ مصلحت نہ کبھی التجا کے لہجے میں
ستم سے بات کرو کربلا کے لہجے میں
بڑا کٹھن ہے جو باب قبول کو پہنچے
جو عاجزی نہ ہو شامل دعا کے لہجے میں
متاع صبر میں مجبوریوں کا دخل نہ ہو
غرور کی نہ جھلک ہو عطا کے لہجے میں
عجیب لفظ ہے اک لفظ لفظ دل
کہ جس سے بات کرے بے وفا کے لہجے
لرز رہے ہیں قدم کوہ پیکروں کے
نہ جانے رعب ہے کیسا قضا کے لہجے

● نودیون سرائے ترین سنبھل ۲۴۴۳۰۲

مبین صدیقی

قلعہ گھاٹ کالونی، دربھنگہ ۸۴۶۰۰۴ (بہار)



ہری کونپلیں

(۱)

پردہ اٹھتا ہے

اسٹیج پر ایک طرف لہلہاتے کھیت، پھل دار باغات اور خوشنما پھولوں کا چمن ہے۔ تو دوسری جانب بارود اگلنے والی توپوں کی قطار! ایک منظر جتنا حسین اور لبھاونا ہے تو دوسرا اتنا ہی بھیانک، خطرناک اور خوفناک ہے۔

دفعتاً ایک گونج سی ہوتی ہے جیسے کوئی سائرن بجا ہو اور اس سائرن کی آواز کے ساتھ ہی توپیں شعلہ فشاں ہو اٹھتی ہیں اور بلتے ہوئے بارود کی شعلے کھیت، باغات اور چمن پر برس پڑتے ہیں۔ پھولوں اور پھلوں کے پھٹنے اور جلنے کی بو، پودوں اور پتوں کی چرچراہٹ اور توپوں کی گھن گرج آپس میں متصادم ہیں۔ موسیقی ایک عجیب طرح کی کھلبلی اور المناکی سے پورے منظر کی شدت کو بڑھا رہی ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے لہلہاتے کھیت، پھل دار باغات اور خوشنما چمن خاکستر ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ توپوں کی گھن گرج اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک کہ ہریالی کا ہلکا سا احساس بھی فنا نہیں ہو جاتا۔ [اور پردہ گرتا ہے]

(۲)

اسٹیج پر ہر طرف ملبہ بکھرا ہوا ہے اور منظر دھواں دھواں نظر آتا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے دھواں چھٹتا ہے اور صرف بکھرا ہوا ملبہ رہ جاتا ہے۔ دفعتاً ایک گونج سی اٹھتی ہے جیسے آسمان غرّا رہا ہو۔ بجلیوں کی چمک اور طوفان کی سرسراہٹ سے ملبے کا غبار ادھر اُدھر بکھرنے لگتا ہے اور تھوڑی ہی دیر کے بعد بارش ٹوٹ ٹوٹ کر برسنے لگتی ہے۔ برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ملبوں پر موتیوں کی مانند ٹپکنے اور چمکنے لگتے ہیں۔ بارش تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ اور موسیقی لگاتار بارش کی دھن برسائے جا رہی ہے۔

[پردہ گرتا ہے]

(۳)

مدھم روشنی نیم تاریکی ـــ گیلے ملبوں کا ڈھیر کہیں اٹھا ہوا اور کہیں دھنسا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ موسیقی دعائیں الاپ رہی ہے۔ بڑا پُرسکون منظر ہے۔

دفعتاً موسیقی کی آواز کے ساتھ ہی روشنی تیز ہوتی ہے ـــ اور پورا اسٹیج روشن ہو اٹھتا ہے، اور لوگ دیکھتے ہیں کہ بکھرے ہوئے ملبوں کے ڈھیر سے پھوٹتی ـــ کونپلیں یہاں تک کہ توپوں کے نیچے کی گیلی مٹی سے پھوٹتی ہری کونپلیں بھی سر ابھار رہی ہیں۔

ہریالی کا ایک غیر متوقع احساس جاگتا ہے اور اسی لمحے پر موسیقی یکایک نشاطیہ نغمے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

[پردہ گرتا ہے]

انتخاب کلام نے متاثر کیا۔ کیسا کیسا ادبی اور شعری سرمایہ ہماری دسترس سے باہر رہتا ہے۔ ندا فاضلی کا یادوں کے سہارے ناظر کو کھینچتا ہوا، ان کی تجسیم کرتا ہوا اور ان کے تناظر میں اپنی شخصیت کو سامنے لاتا ہوا سیال نثری اسلوب جو ان کی خود نوشت میں ہے صد دلکش اور قابل کن ہے، ان کے مضمون "حسن نعیم ـــ ایک ادبی المیہ" میں گہرائی ملتی ہے۔ معروضات کی حقیقت اور اپروچ کی

LINTIMARY کے باوجود بعض اہم نکات رہ گئے۔ مضمون کا پھر بھی، مضمون کی مجموعی طور پر تشکیل ہی کرتا ہے۔ اختر سعید خاں اور رؤف خیر کی غزلیں اور تفسیر الیاس نظام، عذرا پروین کی نظمیں متوجہ کرتی ہیں۔ "جرعات" کے تحت منظوم اظہاریہ "آؤ اول دعا کریں" اپنے میں ایک ندرت لئے ہوئے ہے جو صحافتی تقاضوں کو عبور کر کے تخلیق ہو گیا ہے۔

القوی دسنوی ـ سیفیہ کالج، اشانت کوارٹرز بھوپال

ندا فاضلی نے "حسن نعیم ایک المیہ" میں مرحوم حسن نعیم کی بڑی المناک کہانی سنائی ہے۔ دیر تک دل و دماغ متاثر رہا۔ گھر کے دیگر افراد پر بھی اداسی چھائی رہی۔

۱۹۴۸ء میں پٹنہ میں حسن نعیم مرحوم سے ملاقاتیں رہی تھیں، دلی میں ۱۹۷۸ء میں تقریباً تیس سال بعد ملاقات ہوئی۔ میں مظفر حنفی، ڈاکٹر خالد محمود ان کے گھر گئے تھے۔ دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھایا تھا۔ بڑی سادگی اور خلوص سے ملے۔ مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہی تھیں۔ پھر فروری ۸۲ء میں وہ اچانک بھوپال آئے اور میرے یہاں تین چار دن قیام کیا۔ اس کے بعد غالباً ۱۹۸۲ء میں تشریف لائے۔ آخری ان ملاقاتوں نے ان سے ایک خاص قربت پیدا کر دی تھی۔ اس کے بعد وہ بھوپال نہیں آئے۔ چند سالوں بعد معلوم ہوا کہ وہ بمبئی میں ہیں لیکن بمبئی میں کہاں ہیں، کیا کر رہے ہیں، کس حال میں ہیں کچھ پتا نہ تھا۔ اب جبکہ ندا فاضلی نے ان کی داستانِ حیات کے آخری اوراق آپ کے سامنے بکھیر دیے تو پچھلی ساری یادیں سمٹ کے سامنے آ گئیں اور آنکھیں نمناک کر گئیں۔

حسن نعیم کے انتقال کے بعد ندا فاضلی کا یہ پہلا مضمون جو نہایت بھرپور ہے۔ بلاشبہ ان کی موت ادبی المیہ ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہم اردو والے اپنے فن کاروں کی زندگی میں اس کی پروا نہیں کرتے، نہ اس کے لیے کوئی ہمدردی کا جذبہ رکھتے ہیں۔

حسن نعیم بہرحال اردو کے ایک خوددار، کم گو، وسیع مطالعہ شاعر تھے وہ علاج اور دوا کے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو گئے جب ہم اکیسویں صدی کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف اور ترقی یافتہ قوموں سے آنکھیں ملانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

شمس رفعت ـ دردادن۔ ای فلیٹ نمبر ۳۱۹، ریسپا ٹاؤن شپ بمبئی ۹۰

ندا فاضلی کا مضمون "حسن نعیم ـ ایک ادبی مطالعہ" اپنے ادبی تعصبات کے باوجود منافقت سے ماورا ایک خوبصورت اور زندہ مضمون ہے۔

آپ نے حسن نعیم کی مٹھی بھر غزلیں بڑے اہتمام سے شائع کی ہیں۔ شمیم طارق نے اپنے مختصر سے مضمون میں نعیم صاحب کو کیا خوب خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اردو اکادمی کے ذمہ داران ان کے آخری شعری مجموعے "داستاں" کی اشاعت کی ذمہ داری کا بار اٹھا لیں۔ ابھی ظ انصاری اور حسن نعیم کا غم تازہ ہی تھا کہ راسخ العقیدہ ترقی پسندی کے الیلے شاعر عزیز حامد مدنی بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ اس جان کاہ حادثہ کی اطلاع بھی شاعر کے توسط سے ملی۔ آپ نے بڑی عجلت کے ساتھ عزیز حامد مدنی کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ورنہ شاید اردو دنیا اس سانحہ سے بے خبری رہ جاتی۔ تحسین کے المیہ سے ہم کبھی تک واقف ہو چکے۔ پاکستانی رسائل اور اخبار ہندوستان میں شاذ و نادر ہی نظر آتے تھے۔

کلاسیکی مزاج کے بزرگ شاعر اختر سعید خان کی غزلیں روح میں اتر گئیں۔ نئے شاعروں میں لطف الرحمٰن کی تازہ کار شعری حسیت کا تو میں بہت پہلے سے قائل ہوں۔ محمد علوی، حمایت علی شاعر دونوں بہت اہم شاعر ہیں۔ عذرا پروین کی تازہ "مرگِ ابابیل" ایسی خوبصورت استعاراتی نظم بہت دنوں کے بعد پڑھنے کو ملی۔ ان کی کچھ اور چیزیں چھاپئے۔

آپ کی تخلیق "آدمی ادھورا ہے" دل کے تاروں کو چھو گئی۔ نظم میں آپ کی ذہانتیں خوب کھل کر سامنے آئی ہیں۔ "کتب و رسائل" کے عنوان کے تحت آپ نے جو تبصرے کئے ہیں وہ قابلِ تقلید ہیں۔ اور مطبوعات کے علاوہ میں تو رفیق انجم کے خط سے بھی بے حد محظوظ ہوا۔ سرنے کی انھوں نے بہت خوبصورت تشریح کی ہے۔

الیاس احمد گدی کا افسانہ صفِ اول کی چیز ہے۔ سریندر کے ناول فسان کی قسط اطمینان سے پڑھوں گا اور بعد میں تفصیل سے رائے دوں گا۔

ایک زمانے سے ندا فاضلی کا فلم کے میڈیا سے تعلق ہے نثر تو وہ پہلے بھی لکھ لیتے تھے۔ لیکن خود کا PROJECTION کیسے کیا جائے۔ اب وہ یہ بھی سیکھ گئے ہیں۔ فضا آفرینی کے اعتبار سے ان کی خود نوشت دل کو کھینچتی ہے۔ کاش ذہن کو بھی متاثر کر پاتی۔ ان سے کہیے کہ وہ برٹرینڈ رسل، برنارڈ شاہ کرشنا سورتی۔ نیرد سی چودھری۔ چرچل اور ہٹلر وغیرہ کی سوانح یا سوانحی مضامین پڑھ لیں ان کے کام آئیں گے۔

اخلاق اثر ـ صادق منزل، چوکی امام باڑہ ـ بھوپال

شاعر کا تازہ شمارہ بہت جاندار ہے۔ شعری حصے میں اختر سعید خاں، محمد علوی اور حمایت علی شاعر کی تخلیقات بطورِ خاص پسند آئیں۔ کہانیوں میں الیاس احمد گدی کی کہانی "چور" کا جواب نہیں۔ بغیر کسی فنی پیچ اور الجھاؤ کے واقعات کی ترتیب اور مکالموں کی چستی اور کہانی کار کی کم سے کم مداخلت کے ذریعہ سماج کی فنی تصویر کشی کی گئی ہے۔ نسرین احمد نفیسی سے اور کہانیاں لکھوائیے۔ ان کے یہاں بڑی گنجائش ہے۔

"دیواروں کے بیچ" میں ندا فاضلی کی شوخی اور شرارت دلچسپ ہے۔ "حسن نعیم ـ ایک ادبی المیہ" پڑھ کر دل اداس ہو گیا۔ کئی دن تک دل پر اثر رہا۔ کہیں کہیں ندا فاضلی کا رویہ بہت جارحانہ لگا۔ خاص طور سے مضمون کے آخری حصے میں۔ پہلے ہی وہ بہت کچھ لکھ چکے تھے اور مضمون تو اس جملے پر ختم ہو گیا تھا۔ "کچھ روز اور اس بے حس سنسار میں جی لیجئے" (ص ۲۸) اس کے بعد جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ایک فن کار کے ساتھ ظلم ہے۔

جہاں تک مہاراشٹر اردو اکادمی کا تعلق ہے وہ اپنی ذمہ داری سے بچ نہیں سکتی۔

نامی انصاری ـ ۱۲/۱۸ ـ اے، سول لائنز ـ کانپور

شاعر کے تازہ شمارے میں ندا فاضلی کا مضمون "حسن نعیم ـ ایک المیہ" اسی حریتِ فکر اور ایمان دارانہ بے باکی کا مظہر ہے جس سے وہ اپنے سوانح "دیواروں کے بیچ" لکھ رہے ہیں۔ اردو ادب میں ایک قدیم روایت عرصۂ دراز سے چلی آ رہی ہے کہ کسی ادیب یا شاعر کے انتقال کے بعد احتراماً اس کو "رحمۃ اللہ علیہ" کی کھونٹی پر ٹانگ دیتے ہیں۔ اس دور میں جہاں ادب میں ملمع سازی کی روایت دن بدن پھیکی پڑتی جا رہی ہے۔ ایسے نا قدِ جرأت کا اظہار کرتے مرحوم کی زندگی کے روشن اور تاریک دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈال کر اس کو ایک انسان کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کرنے لگے ہیں جو ایک مستحسن اخلاقی نقطۂ نظر ہے۔ ندا فاضلی اسی روایت کے سرخیل ہیں۔ جو شخص اپنی کمزوریوں، کوتاہیوں اور عیبوں پر برسرِ عام روشنی ڈال سکنے کی ہمت رکھتا ہو وہ اگر دوسرے ادیبوں کو بھی اُن کے فطری تناظر میں پیش کرے تو یقیناً اس کی ستائش کی جانی چاہیے۔ حسن نعیم یقیناً ایک خوش فکر غزل گو شاعر تھے اور جدید غزل گو شعرا میں ان کی اہمیت کسی سے کم نہیں ہے مگر اب ایسا بھی نہیں ہے کہ غالب کے بعد حسن نعیم کا ہی نام لیا جائے۔ اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ اقبال، راشد اور فیض کے بعد عزیز حامد مدنی سب سے بڑے شاعر تھے۔ یارانِ طریقت جب کسی کو بڑھانے پر آتے ہیں تو اپنے ادبی مرتبے کا بھی خیال نہیں رکھتے!!!

شفیقہ فرحت ـ ای ـ ۳/۱۹۶ دتیا دیہات بھوپال

بظاہر دبلے پتلے لوگوں اور مختصر چہروں میں کتنا وزن، کتنی طاقت اور کتنا اثر ہوتا ہے یہ بات "شاعر" کو دیکھ کر اور پڑھ کر سمجھ میں آ جاتی ہے۔ اتنا بھرپور اور معیاری لیکن سادہ اور مختصر رسالہ اردو میں شاید ہی کوئی ہو۔

ہمیشہ کی طرح الیاس احمد گدی کا "چور" بڑا بانکا تیکھا اور گہری چوٹ کرنے والا افسانہ ہے۔ امجد جاوید کے یہاں بیان میں کچا پن ہے۔ مگر آخری چند سطروں نے لرزا دیا۔

نسرین صاحبہ کی کوشش بھی بری نہیں۔ سریندر پرکاش کے ناول کی اتنی پبلسٹی کی ہے کہ میں اسے ایک ساتھ پڑھنا چاہتی ہوں۔ ندا کے قلم میں جان ہے یہ سب جانتے ہیں لیکن کہیں کہیں نشتریت، صفائی اور جراحی کی حدوں سے گذر کر کمینگی کی سرحد میں داخل ہو جاتی ہے۔ "حسن نعیم ـ ایک ادبی المیہ" پڑھ کر یہی احساس ہوا۔ شعری حصہ ابھی پڑھا نہیں۔ الٹنے پلٹنے سے لگا اچھا ہے۔ مبارک ہو۔

مرزا خلیل بیگ ـ فیصل ولا، سرسید روڈ، سرسید نگر علیگڑھ

شاعر کا نیا شمارہ دیکھا۔ ندا فاضلی کا مضمون حسن نعیم کے بارے میں بہت خوب ہے۔ انھوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ مرحوم کی زندگی کے آخری ایام کی تصویر کشی کی ہے اور بعض ان گوشوں پر روشنی ڈالی ہے جو عام نظروں سے اوجھل تھے۔ ندا فاضلی کا یہ مضمون پڑھ کر خوشی ہوئی کہ انھوں نے مضمون اچھا لکھا اور دوستی کا حق ادا کر دیا لیکن افسوس بھی ہوا کہ مرحوم کا انجام کتنا عبرتناک تھا۔ عزیز حامد مدنی کے مرنے کا غم بھی کچھ کم نہیں۔ کراچی کے دورانِ قیام میری ان سے میری کئی بار ملاقات ہوئی تھی

ن کیا بہت عطا کردہ واتی جلد ہم سے بچھڑ جائیں گے۔

فتح قدوائی ۔ شعبۂ صحافت، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
تازہ شمارہ نظر نواز ہوا، حسن نعیم پر گوشہ مختص کر کے آپ نے ثواب کمایا اور اردو والوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا کرنے کی کوشش کی۔ حسن نعیم کو وہ قدر و منزلت حاصل نہیں ہوئی جس کے بالطور پر مستحق تھے۔ سریندر پرکاش اور ندا فاضلی کی نثر شاعر کے شعور کی بیچ تر بیاری ہے تاہم شعری حصے سے آپ کی مروت صاف جھلکتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر شعری تخلیقات کے انتخاب میں مزید برتی جائے۔

شیدا قمر بسوانی ۔ بسوان ضلع سیتا پور ـــ (یوپی)
پیش نظر شمارہ بہت پسند آیا۔ آپ کی نظم "آدمی" اد عصورا ہے خوب ہے۔ خوب صورت موڑ دیا ہے آپ نے۔ اختر سعید خاں کی غزلیں اچھی ہیں۔ ایشش کمار کا مضمون بھی اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ احمد گدی کا افسانہ اور خصوصاً سریندر پرکاش کے "نساق" کی ابھی متاثر کرتی ہے۔ حسن نعیم کی ذاتی زندگی کا خاکہ ندا نے اچھا ہے مگر کہیں کہیں ندا خود بھی حسن نعیم کی زبان استعمال کر گئے ہیں۔ خیر اور فاروق شفق کی غزلیں معیاری ہیں۔ عزیز حامد مدنی خوب ہے۔ ندا فاضلی کی "دیواروں کے بیچ" کا سلسلہ خوب ہے۔ اظہار کی زبان اور پیرایۂ بیان خود نوشت کو دلچسپ بنا رہے ہیں۔ یہ خود نوشت کتابی شکل میں کب تک آئے گی؟ ـــ عثمان کی ۷ غزلیں "بخط شاعر" کے تحت شائع ہوئی ہیں، ہیں بلکہ متاثر بھی کرتے ہیں لیکن مذکورہ غزلوں میں چند غلطیاں ہیں مثلاً "وہی تھا آغاز و انتہا بھی"۔ "بھی" کی جگہ "تک" تھا۔ "پیاسی بھی بہت ہے شام ہجراں"۔ "پی یا سی" کی جگہ ہونا چاہیے، یا سی کے وزن پہ فعولن کے بجائے وزن ہے۔ آخری غزل کا ایک مصرع "اگرچہ لہو لہان ہر" ناموزوں ہے۔ معذرت کے ساتھ۔

چنگیزی ـــ شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
شاعر ایک بار پھر اپنے گذشتہ معیار کی سمت گامزن ہے۔ شاید کوئی پس و پیش نہیں کہ یہ آپ کی لگن، خلوص کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ قسط وار سوانح [ندا فاضلی] لائق ستائش ہیں۔ دونوں کو مبارکباد۔

ذوق ـــ ملکی محلہ، آرہ ـ ۲۳۰۱ ـ ۸۰۲ (بہار)
شاعر کے تمام شمارے نظر سے گذرے لیکن ان میں وہ بات نہیں جس کی توقع میں آپ سے رکھتا ہوں۔ چند بہت معیاری ہوا کرتی ہیں لیکن باقی کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ میرے خیال سے اگر آپ صرف رشتہ داروں اور GAUROFFETTE فن کاروں کی کھیپ تیار کرنے کے بجائے تو شاعر کے حق میں بھی مفید ہوگا اور ادب کے لیے بھی۔

نعمان ـ ۲۴ ـ ڈی پاکٹ III ، میور وہار فیس ۱۱ ، دہلی
رسالہ باقاعدہ مل رہا ہے اور مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہو رہی ہے کہ تمہارا یہ جریدہ ہو

تمہارے سامنے سوال ہے کہ ابھر ہو پہچانیں ہے، وطن عزیز کا سر فہرست ادبی جریدہ ہے۔ میں نے اس میں تمہارے دل، تمہارے دل و دماغ اور تمہاری روح کی مکمل تصویر دیکھی ہے اور میں تم سے متفق ہوں کہ تم واقعی اپنے شاعری میں زندہ ہو، یہی تمہارا پیکر ہے اور یہی قالب۔ تم رہو زندہ رہو ـــ

خدا کرے کہ تم جیو ہزار برس
اور اک برس کے ہوں دن پچاس ہزار

تمہارے دور کا شاعر مدتوں اردو ادب کی ایک اہم یاد کے طور پر زندہ رہے گا۔ تم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تحریک بنا دیا ہے اور تحریکیں انسانوں سے زیادہ اہم ہوتی ہیں۔

نظام الدین نظام ۔ ایم۔اے، دیوانی مانک پور، ۵ سے
شاعر کا تازہ شمارہ خوب ہے۔ عزیز حامد مدنی اور حسن نعیم کے تعلق سے تم نے حق ادا کر دیا۔ ندا فاضلی کا مضمون مرحوم حسن نعیم کی کمزوریوں کا جارحانہ احاطہ کرتا ہے۔ غالباً ادیبوں اور شاعروں کا مقدر یہی ہے کہ ان کے راز داں اکثر تماش گر نکلتے ہیں۔

عبدالاحد ساز ۔ محمد بن آدم ایڈ کمپنی، ۸۲ چکلہ اسٹریٹ، بمبئی
تازہ شمارے میں حسن نعیم اور عزیز حامد مدنی پر خصوصی حصے اور کاردار کی شمولیت بہت بروقت اور جامع ہے۔ عزیز حامد مدنی کے

[باقی صفحہ ۲۵۰ پر]

متحد اور مستحکم ہندوستان کی تعمیر کا مصمم ارادہ کریں

سماجی اور اقتصادی مساوات اور انصاف۔ ان کے بغیر سماج کی آزادی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ گذشتہ ۳۱ برسوں سے مہاراشٹر اسی مقصد کے حصول کیلئے کام کر رہا ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں کی ترقی کا مرکزی نقطہ بلا امتیاز خود انسان ہے۔ جون ۱۹۹۱ میں وزیر اعلیٰ شری سدھاکر راؤ نائک کی اعلیٰ قیادت کے تحت اسی مقصد کو سامنے رکھ کر حکومت مہاراشٹر نے آگے کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ سنت گیانیشور، مہاتما پھلے اور ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کی دی ہوئی وسیع النظری پر مبنی سماج کے قیام کی جدوجہد اور آنجہانی یشونت جی چوہان، وسنت راؤ جی نائک اور وسنت دادا پاٹل کی دانشمندانہ قیادت نے ہمارے سامنے جن مقاصد کی نشاندہی کی تھی، انہیں کو مدِنظر رکھتے ہوئے مہاراشٹر کو آگے کی طرف قدم بڑھانا ہے نیچے دیئے ہوئے کچھ منصوبے اور لائحہ عمل ان مقاصد کے حصول کی چند مثالیں ہیں۔

- کھیتوں میں کام کرنے والے بے زمین مزدوروں کو کام کی ضمانت دینے والا "روزگار ضمانت منصوبہ"
- چھوٹے کسانوں اور بے زمین کسانوں کے لئے قرض کی معافی۔
- چھوٹے کسان، ہریجن، پسماندہ طبقات، ادیواسی ان کے کھیتوں پر پھلوں کے باغات، چراگاہوں کا پھیلاؤ اور جنگل اگانا۔
- چندر پور، گڈھ چرولی، دھولے، ناندیڑ اور یوت مال اضلاع کے ادیواسیوں کی فلاح و بہبود کیلئے "کاشتکار کرنے کے لئے"
- "محنت و مشقت سے وہی ترقی" منصوبے کو ۱۰۰۰ سے زائد گاؤں میں لاگو کرنا۔
- دھان، کپاس اور گنے کی پیداوار بڑھانے میں زبردست کامیابی۔
- پسماندہ، بے زمین کھیت مزدوروں کی اقتصادی حالت سدھارنے کیلئے "اندرا گاندھی کھیت مزدور منصوبہ"
- آٹھویں منصوبے میں ۱۰ لاکھ ہیکٹر رقبے میں پھلوں کی کاشت کرنے کا عزم۔
- پھلوں کی پیداوار پر مبنی صنعتوں کا فروغ۔
- مہنگائی روکنے کیلئے تقسیم کاری کے عوامی نظام کو زیادہ فعال بنانے کا فیصلہ۔
- چھ اضلاع میں تعلیم کے فروغ کا خصوصی پروگرام
- غربت کی سطح سے نیچے زندگی گذارنے والے خاندان کے بچوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کیلئے ان کے سرپرستوں کو "دروٹوتی" بھتہ۔
- علاقائی عدم مساوات دور کرنے کے لئے آٹھویں منصوبے میں ۲۵۰۰ کروڑ روپئے مختص۔

ترقی کی طرف گامزن مہاراشٹر کو زیادہ خوشحال بنا کر متحد اور مستحکم ہندوستان کی تعمیر کے لئے اس ۴۵ ویں یوم آزادی کے موقع پر آئیے ہم اس کا عزم بالجزم کریں۔

تعاون حکومت — مہاراشٹر حکومت

فکرِ امروز

بساطِ عجز میں ایک دل ملا۔ اک قطرۂ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

اس شعر کا تجزیہ کیجیے تو "بساطِ عجز" اور "بہ اندازِ چکیدن" دو ترکیبیں عام فہم نظر نہیں آتیں۔ اب انھیں آسان کر کے دیکھیے، مگر اس طرح کہ شعر میں جس خیال کا اظہار کیا گیا ہے، اس کا خون نہ ہو۔ بتائیے "بساطِ عجز" کی جگہ کونسی آسان ترکیب استعمال کی جائے؟

"بہ اندازِ چکیدن" کا عام فہم ترجمہ "ٹپکنے کے انداز سے" ہوتا ہے۔ "ٹپکنے کی ادا سے" لکھا جائے تو دوسرا مصرع یوں ہوگا "سو رہتا ہے ٹپکنے کی ادا سے سرنگوں وہ بھی"۔ مصرع تو عام فہم ہو گیا لیکن غالب کوئی بھی ایسا شاہکار نہ کہے گا۔ معلوم ہوا کہ غالب "بہ اندازِ چکیدن" اور "بساطِ عجز" لکھنے میں حق بجانب تھے۔ یہی حال دوسرے خیالات کا ہے۔ آپ کسی بلند شعر کے بلند الفاظ کو آسان الفاظ میں بدل کر دیکھیے تو یا تو دشوار ہوگا، یا خیال بدل جائے گا یا مصرع پست ہو جائے گا۔

[دستور الاصلاح۔ طبع نمبر ۔ جولائی ۱۹۹۰ء]

سیماب اکبرآبادی

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی
جاری شدہ ۱۹۳۰ء
سابق مدیر اعجاز صدیقی
اشاعت کا ۶۲ واں سال
علمی ادبی تہذیبی ماہنامہ

شاعر

جلد ــــ ۶۲
شمارہ ــــ ۷

فون: ۳۵۹۹۰۳

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاونہ
ناظر نعمان صدیقی

قیمت :- ۵ روپے

زرِ سالانہ ۵۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۶۰ روپے

تاحیات خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے ◆ ممالک غیر سے ۳۵۰ روپے

سرورق
ساز اور آواز

عمل
سلطان سبحانی

شمارہ نمبر ۷ [۱۹۹۱] جلد ۹۳

محفل اپنی

پچھلے اس شمارے کے متعلق

شاعر کا گذشتہ شمارہ نمبر ۸ خیر ہی سے سہی شکل ایک بار پھر تزئین حالات کے ساتھ آپ کے ہاتھوں سے گزرے ذوق کی تسکین کے لئے حاضر ہے۔ اس شمارے سے دیگر مندرجات کے ساتھ شہنشاہ مرزا مرحوم پر بعض چیزیں دی جا رہی ہیں۔ مشہور نقاد، شاعر اور صحافی فضیل جعفری کی تنقیدی کتاب "کمان اور زخم" پر شہنشاہ مرزا نے بڑا شاندار اسال کیا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ فضیل صاحب کی اہم کتاب اور مرزا مرحوم کے مضمون کے حوالے سے اردو کی نئی تنقید پر شاعر کا ایک عام شمارہ مختص کیا جائے۔ مرحوم سے مراسلت بھی ہوئی تھی۔ نئی تنقید، ناول اور کہانی پر شاعر کے بعض خصوصی شماروں کی ترتیب و تہذیب کے متعلق غور بھی کیا جا رہا تھا کہ مرزا کی علالت درمیان میں آ گئی۔ علاج وغیرہ کے متعلق خطوط آتے رہے اور پھر ہم سے ایک نہایت ہی پیارا، مخلص اور ذہین دوست بچھڑ گیا۔ تنقید پر مجوزہ اشاعتیں پیچھے رہ گئیں۔ مرزا کے انتقال کے بعد ان کے متعلق شاعر میں گوشہ شائع کرنے کے خیال کو محترم نیر مسعود نے تقویت دی اور مرحوم سے متعلق مواد فراہم کیا لیکن ایک مدت تک یہ سارا مواد رکھا ہی رہ گیا۔ اب ایک مدت بعد مرحوم دوست کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ہمیں خوشی بھی ہے اور دکھ بھی۔ یہ سارا مواد آج بھی تازہ ترین لگتا ہے بالخصوص "کمان اور زخم" پر مرحوم کا مضمون۔

غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ

شاعر شمارہ نمبر ۸ میں گوشۂ ستیہ پال آنند کی بے پناہ پذیرائی کا ثبوت یہ ہے کہ ہنوز خطوط کا سلسلہ جاری ہے۔ غزل پر جس نئی بحث کا آغاز ہم کرنا چاہتے تھے وہ ہو چکا۔ نئے قلم کار بطور خاص اس طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ غزل کی تنقید دراصل اردو شاعری کی تنقید ہے۔ لیکن اردو کے نظم گو شعراء کو بنیاد بنا کر غزل کی تنقید ہوتی رہی اور بیشتر نظری اور فکری مغالطوں اور مبالغوں نے غزل کا نقصان پہنچایا۔ غزل کے حوالے سے پوری اردو شاعری اور شاعری کی تنقید کا جائزہ ضروری ہے تاکہ نئے قلم کاروں کو نظم کی تمام اصناف کے متعلق از سر نو سوچنے کا موقع مل سکے اور صنف غزل مزید روشن آئندہ کا معیار بن سکے۔ اس ضمن میں نئے مباحث شاعر کے آئندہ شماروں میں آئیں گے۔

موصولہ خطوط کو ادبی نمبر کے تحت اسی شمارے سے جاری کیا جا رہا ہے۔ یہ سلسلہ ہر شمارے تک جاری رہے گا۔ قارئین شاعر سے گزارش ہے کہ وہ اپنے مراسلے جامع اور مختصر ہی ارسال فرمائیں۔ غیر ضروری اور تعریفی باتوں سے گریز کریں۔ اردو شاعری، تنقید اور غزل کے متعلق وہ جو کچھ سوچتے ہیں اس میں جو سوالات ابھرتے ہیں، صرف انھیں کو تحریر کریں۔ اپنے خیالات صاف اور خوشخط اور عمدہ کاغذ کے ایک طرف لکھیں۔

بحث تعمیری ہونی چاہیے۔ ذاتیات سے گریز شرط ہے۔ کسی بھی خط کی اشاعت یا عدم اشاعت کے لئے ادارہ شاعر قطعی آزاد اور غیر جانب دار ہوگا۔ کسی مکتوب نگار کے خیالات سے ادارہ شاعر کا متفق ہونا بھی ضروری نہیں۔

نئے ادبی رسائل کو خوش آمدید

اردو کے ادبی رسائل کی ایک شاندار تاریخی روایت رہی ہے۔ تمام علمی، ادبی، تنقیدی، تحقیقی اور تخلیقی سرگرمیوں کے محرک ادبی رسائل ہی ہوتے تھے۔ شعر و ادب کی سمت و رفتار کا تعین انھیں رسائل سے ہوتا تھا۔ رسائل کے حوالے ہی سے نئے قلم کار ابھرتے تھے اور تخلیق کار ابھر کر اپنا قد بناتے تھے۔ مگر پھر یہ روایت کمزور پڑتی گئی۔ اس کی کئی وجوہ ہیں۔ اردو اکادمیاں، سرکاری ادارے، شخصی اور اجتماعی رسائل کی خرابیوں نے ادبی رسائل کی روایت کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچایا ہے۔ اس بحث سے قطع نظر ہم اردو کے نئے ادبی رسائل کی اشاعتوں پر ان کے مدیران کو خوش آمدید کہتے ہیں اور مبارکباد دیتے ہوئے دعا کرتے ہیں کہ یہ رسائل اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ شائع ہوتے رہیں۔ نئے اور اچھے ادبی رسائل کی موجودگی اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے ضروری ہے۔

ذہن جدید [سہ ماہی] شعر و حکمت [ششماہی، دور ثانی]
سوغات [سہ ماہی، دور ثانی] عصری آگہی [سہ ماہی، دور ثانی]
کا ہم استقبال کرتے ہیں
کتاب نما [ماہنامہ] ایوان اردو [ماہنامہ] آجکل [ماہنامہ]
سہیل [ماہنامہ] جواز [ماہنامہ] شب خون [ماہنامہ] عصری ادب
[سہ ماہی] معلم اردو [ماہنامہ] شان ہند [ماہنامہ] مریخ
[ماہنامہ] تناظر [سہ ماہی] فکر و آگہی [ماہنامہ] انشاء [ماہنامہ]
اسباق [سہ ماہی] تکمین [دو ماہی] زبان و ادب [ماہنامہ] غالب نامہ
[سہ ماہی] روح ادب [سہ ماہی] سب رس [ماہنامہ] فکر و فن
[سہ ماہی] امکان [سہ ماہی] اردو ادب [سہ ماہی] ادیب
[ماہنامہ] شگوفہ [ماہنامہ] برہان [ماہنامہ] معارف [ماہنامہ]
نقد و نظر [سہ ماہی] فکر و نظر [سہ ماہی] انتساب [سہ ماہی]
نیا دور [ماہنامہ] تکمیل [سہ ماہی] شاہین [سہ ماہی] تعمیر ہریانہ
[ماہنامہ] پاسبان [ماہنامہ] شیرازہ [سہ ماہی] سرسبز [سہ ماہی]
قلم [سہ ماہی] روشن [ماہنامہ] رہنمائے تعلیم [ماہنامہ] آواز
[ماہنامہ] ادبی کائنات [ماہنامہ] فروغ اردو [ماہنامہ] جامعہ
[ماہنامہ] توازن [سہ ماہی] پرواز ادب [ماہنامہ] فن و شخصیت
[سالنامہ] ادبی نقوش [سہ ماہی] اکادمی [سہ ماہی] نوائے ادب
[سہ ماہی] خدا بخش جرنل [سہ ماہی] معیار و تحقیق [ششماہی]
لمحے لمحے [سہ ماہی] حرف نادر [ماہنامہ] مسائل [ماہنامہ] صبا نامہ
[سہ ماہی] مباحث [سہ ماہی] [illegible] [سہ ماہی] فروغ ادب
[سہ ماہی] کے ساتھ دیگر بالکل نئے ادبی رسائل پر بھی نظر ہے۔ ان نئے رسائل کے بھی ہم منتظر ہیں جن کے اعلانات رسائل و اخبارات میں شائع ہو رہے ہیں۔ ہم خواہش مند ہیں کہ
تحریک [ماہنامہ] کتاب [ماہنامہ] افکار [دو ماہی] سطور
[سہ ماہی] افکار [سہ ماہی] معیار [سہ ماہی] شعور [سہ ماہی]
آہنگ [ماہنامہ] تشکیلات [ماہنامہ] ہم زبان [ماہنامہ] اکمال
[سہ ماہی] دائرے [ششماہی] لفظ [سہ ماہی] جائزے
[سہ ماہی] تحریر [سہ ماہی] سبھی [سہ ماہی] چنگاری [ماہنامہ]
مفاہیم [ماہنامہ] پہچان [سہ ماہی] نقش نظر [ماہنامہ] کہسار
[ماہنامہ] اندیشہ [ماہنامہ] صبح امید [ماہنامہ] جیسے شاندار
ادبی رسائل کا دوبارہ اجرا ہو۔

شاعر ایک روایت کا نام ہے اور تمام نئے پرانے ادبی رسائل اس روایت کا حصہ ہیں۔ اس ادبی روایت کو روشن تر کرنے اور اسے تقویت پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ اردو کے تمام ادبی رسائل اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ شائع ہوں ہم اکیسویں صدی میں قدم رکھنے والے ہیں۔ ادبی رسائل کے مدیران کی ذمہ داریاں اب کچھ اور ہیں۔

شاعر کے آئندہ منصوبے

شاعر کے اپنے کئی منصوبے زیر ترتیب ہیں۔ ہم عصر اردو ادب نمبر ۱۹۹۰ء، عالمی اردو قلم کار خواتین کا ادب، اور کئی خصوصی عام شماروں کے ساتھ ضخیم موضوعاتی نمبروں پر کام ہو رہا ہے۔ انھیں کے ساتھ بعض تکنیکی منصوبے بھی زیر ترتیب ہیں۔ ان میں بطور خاص عالمی اردو قلم کاروں کے نام، پتے اور ذاتی فون نمبرس پر مشتمل ایک ڈائرکٹری کا کام تیزی سے تکمیل پا رہا ہے۔ عالمی ادبی اداروں اور انجمنوں کے نام اور پتے بھی اس ڈائرکٹری میں شامل کئے جا رہے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی وہ ڈھیر ساری معلومات جو پہلی بار اس ڈائرکٹری میں یکجا کی جائیں گی۔ شاعر عالمی اردو قلم کاروں کا سوانحی لغت بھی زیر ترتیب ہے۔ بے شمار قدیم و جدید اردو قلم کاروں کی تصاویر کے البم پر بھی کام ہو رہا ہے۔

آپ شاعر کے لئے کیا کر رہے ہیں؟

جی ہاں! شاعر کے لئے آپ کو بہت کچھ کرنا ہے۔ توسیع اشاعت میں تعاون دیجئے کہ تعداد اشاعت کا پہلا سنگ میل "دس ہزار" بن سکے۔ شاعر کا ہر قاری سال میں ایک دو اشتہار فراہم کرے۔ اردو کے تمام قلم کار حضرات اپنی مطبوعات کا اشتہار شاعر کو دیں۔ شاعر میں دیے گئے اشتہارات سے پوری اردو دنیا متوجہ ہوتی ہے اور کتاب کی نکاسی میں مدد ملتی ہے۔ اپنے بقایاجات جلد ارسال کریں۔ زر سالانہ وقت پر بھجوائیں۔ معاونین اور تاحیات خریداروں کی فہرست میں اضافہ کریں۔

قلم کار حضرات توجہ دیں

اپنی تخلیقات صاف اور خوشخط تحریر کریں۔ زیروکس اور کاربن کاپی نہ بھجوائیں۔ تخلیقات کے ساتھ مناسب ٹکٹ لگے لفافے اور ایک پوسٹ کارڈ ضرور منسلک کریں۔ ایک عدد پاسپورٹ سائز تصویر تخلیقات کے ساتھ ارسال کریں۔ کاروباری امور کے لئے الگ خط لکھیں اور خریداری نمبر یا خط کا حوالہ ضرور دیں۔ سفارشی تخلیقات قابل قبول نہیں۔

شعر و موسیقی

مجھے ان لوگوں کی روشِ خیال پر تعجب ہوتا ہے جو شعر و موسیقی سے دلچسپی رکھنے کے باوجود دونوں کے ربطِ باہمی کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ میرے خیال میں موسیقی کی بنیاد زندگی کے اس فلسفے پر ہے کہ انسان محض گوشت اور ہڈیوں کے مجموعے کا نام نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو فطرت انسانوں کی بجائے مشینوں کی تخلیق کرنے پر مجبور ہوتی۔ کیونکہ مشینیں انسانوں سے بدرجہا بہتر اور بدرجہا افضل کام سرانجام دے سکتی ہیں۔ ہمیں روح بھی ودیعت کی گئی ہے۔ اور موسیقی براہِ راست ہماری روح سے ٹکر کھاتی ہے۔ میں گراموفون کے ریکارڈ کی آواز کو حقیقی موسیقی کا درجہ نہیں دیتا۔ جو لوگ روحانیات کو اس طرح مادّی لباس پہناتے ہیں وہ میرے خیال میں ایک خوبصورت غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ گو میں ماہرِ موسیقی نہیں لیکن مجھے موسیقی سے اتنی دلبستگی ہے کہ اگر دن

میں ایک ٹھوکسی کا راگ الاپتے ہوئے سن لوں تو بجا طور پر مجھ سے شراب کا اثر ہونے لگتا ہے۔ میرے احباب کا اعتراض ہے کہ اگر مجھے واقعی موسیقی سے عشق ہے تو میں سوسائٹی میں گنگنانے کا عادی کیوں نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میری فطرت ایک حد تک خاموش واقع ہوئی ہے۔ میں جنگل میں پہاڑی کے دامن پر اور ایسی جگہ جہاں انسانیت نے اپنی مادیت کا جال نہ بچھایا ہو۔ اپنے نغموں کا ساز آزادانہ چھیڑ سکتا ہوں۔ لیکن اگر مجھے اپنے گرد و پیش مادیت کا احساس ہو جائے تو میرے دل کی کھڑکیاں بند ہو جاتی ہیں۔

جب میں کسی نغمہ خواں کو نغمہ خوانی میں مصروف دیکھتا ہوں تو میری روح اس کے نغمے میں گم ہو کر اس سے متصل ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں میری روح سے مادیت کے تمام حجابات اٹھ جاتے ہیں۔ اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ میں کہاں ہوں۔ میرا اکثر جی چاہتا ہے کہ میں نغمہ سنتے سنتے سو جاؤں تاکہ میرا خواب بھی خرم رہے اور میری بیداری بھی نغمے کی آغوش میں ہو۔ میں اس نغمے پر دنیا کی ہر چیز نچھاور کرنے کے لئے تیار ہوں جو گرمی کے موسم میں چاندنی راتوں میں آدھی شب گزر جانے کے بعد مجھے بیدار کر دے۔ میں عالمِ خواب میں جو کیفیت حاصل کرنے کے بعد پھر ایک مست و بے خبری

کھو جاؤں۔

ہماری سوسائٹی میں مغنی کو بہت بڑا درجہ حاصل ہے۔ مغنی کی حیثیت میں روح کو مسرت ہوتی ہے جس کی ہر تان پرواز روح کی دعوت اور ہر صدا بالیدگی روح کا اعلان ہوتا ہے۔ دنیا کی کوئی چیز موسیقی کے اثر سے خالی نہیں۔ کہتے ہیں کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام زبور شریف کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ تو آب رواں بھی ٹھہر جاتا تھا۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر سرود و غنا اپنی حقیقی اور فطری شان میں ہو تو وہ آسمان اور زمین کی گردش کو بھی روک سکتا ہے۔ اور پھر ان روحوں کا کیا کہنا جن کی تخلیق ہی نغمے سے ہوئی ہو۔

موسیقی سے اس قدر شغف رکھنے کے باوجود میں اکثر مغنی سے خوفزدہ رہتا ہوں اس لئے کہ اگر اس نے روح کی پوری قوت سے نغموں کا کیف برسا دیا تو میرا بے خود ہو جانا یقینی ہے۔ خدا کیلئے کسی ایسے وقت میری موت اور زندگی کا سوال پیدا نہ کرو جب سوسائٹی کو میری خدمات کی اشد ضرورت ہو۔

میں نے گراموفون کو موسیقی سے ایک الگ چیز قرار دیا ہے۔

گراموفون کی آواز بھی کسی مغنی ہی کی آواز پس پردہ ہوتی ہے۔ لیکن پھر ریکارڈ کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ میں مغنی کی آواز سننے کے ساتھ ساتھ اسے دیکھنا بھی چاہتا ہوں۔ آنکھوں سے نہیں۔ کانوں سے اور دل سے۔ نغمے کا جو اثر مغنی کی موجودگی میں ہو سکتا ہے وہ پس پردہ نہیں ہو سکتا۔ پس پردہ کہاں؟ پس مشین۔ اس مشین کے پردے میں جس میں مغنی کی آواز سائنس کے ذریعے ڈالی گئی ہو۔ گراموفون کا ریکارڈ گاتا ہے ؎

کل چمن میں چار کلیاں چن کے مجرم بن گیا
آج صحرا میں مرا ہر خار دامن گیر ہے

اگر یہی شعر کسی مغنی سے سنا جائے تو اس کی کیفیات دوسری ہونگی۔ کیا گراموفون سے دلچسپی رکھنے والے وہیں سازندوں کے ہی مقید نہیں کی جا سکتیں؟ جن کی تمام زود حسیاں گراموفون کے ریکارڈوں میں بند ہوتی ہیں۔ جب ایک مغنی اپنی خوش آوازی سے شعر پڑھتا ہے تو اس کے چہرے سے اس شعر کی تمام کیفیات عیاں اور نمایاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن گراموفون کے ریکارڈ میں بات کہاں۔ ریکارڈ کے بعد تک کی آواز ہے۔ خود اس سے مانند جو ...

رضا ابن فیضی



سلگتے دور کا ورثہ، ہنر کے نام لکھوں
میں ساری دھوپ، اسی اک شجر کے نام لکھوں
ہوئے تمام مکیں، ہجرتوں کے دشت میں گم
اب ان مکانوں کو میں کس کھنڈر کے نام لکھوں
ستونِ آب پہ ہے قصرِ زندگی قائم
بکھرتی موجوں کو، دیوار و در کے نام لکھوں
وہ مطمئن ہے بہت، بادبان پھیلا کر
کوئی پیام، ہوا کے بھنور کے نام لکھوں
نہ مانگ مجھ سے، حسابِ شکستِ چہرہ ابھی
میں کتنی تہمتیں، آئینہ گر کے نام لکھوں
لگائے خیمہ کہاں، بے طناب ہے ہر شخص
اب اس پڑاؤ کو، اگلے سفر کے نام لکھوں
خود اپنی ذات سے بکھراؤں گی، ہوں ایک بساط
اثاثہ اپنا، میں کیوں بحر و بر کے نام لکھوں
لگے جو ہاتھ، تمہارے بدن کی دستاویز
نئی تحقیقیں، فکر و نظر کے نام لکھوں
اسی ہوس نے کیا مجھ کو زیر بار اتنا
ہنر کا قرض بھی، عرضِ ہنر کے نام لکھوں
تو کس ہوا میں ہے، اے نازنیں پرندے آ!
اڑانیں اپنی، ترے بال و پر کے نام لکھوں
وہ جس کے چاک پہ گردش میں ہے وجود مرا
میں اپنا فن بھی اسی کوزہ گر کے نام لکھوں
مرا قلم ہے ابھی سے فضا کشیدہ سا
جھکا کے یہ شاخ تو، اس پر ثمر کے نام لکھوں

● سونا تھ بھنجن ۔ ۱۰۱۵ ، (یوپی)

ادریس احمد دوراں

کس قدر معصوم، کتنی بے ضرر ہے چاندنی
کیا کسی ہمدرد ہمسائے کا گھر ہے چاندنی
اے دلِ غمگیں ذرا چل وادیٔ گل کی طرف
لوگ کہتے ہیں وہاں پھر اوج پہ ہے چاندنی
جاگ اٹھا دل میں دوشیزہ خیالوں کا ہجوم
کیا کوئی سرچشمۂ فکر و نظر ہے چاندنی!
کون گزرے گا دبے پاؤں ستاروں کی طرح
مجھکو کیا معلوم کس کی رہ گزر ہے چاندنی
حال میرا پوچھنے آئی نہیں کیوں آج تک
میرے دل کے درد سے کیا بے خبر ہے چاندنی!
اپنے دیوانوں سے کوئی گفتگو کرتی نہیں
کس قدر مغرور کتنی خود نگر ہے چاندنی
لطف تب ہے جب فضائے دل میں ہو محوِ خرام
یہ نہیں تو بے مزہ ہے بے اثر ہے چاندنی
اس کے نازک دل کو میں نے ٹھیس پہنچائی عبس
جانے میں نے کیوں کہا شوریدہ سر ہے چاندنی
کل بھی تھی رعنائی اس کی سارے عالم کو محیط
آج بھی حسن و جمال بحر و بر ہے چاندنی
محفلِ گیتی کو صدیوں سے ہے جس کی جستجو
آج بھی اس امن کی پیغامبر ہے چاندنی
دلبری کرتی ابھی آئی ابھی رخصت ہوئی
آہ! اے دل مثلِ عمرِ مختصر ہے چاندنی
اس بیاباں میں جہاں آرامِ جاں کوئی نہیں
شکر ہے دوراں کہ میری ہمسفر ہے چاندنی

● محلہ فیض اللہ خان، پوسٹ ضلع دربھنگہ ۔۔۔ (بہار)

غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ

ادبی فیچر

(۱)



شاعر کے تازہ شمارے میں آپ کا مضمون "غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ" بہت اہم ہے اور میں اسی لئے اس کے بارے میں آپ سے مخاطب ہوں کہ میرا تعلق نہ غزل سے ہے نہ تنقید سے۔ مشکل یہ ہے کہ آپ کے مضمون کے بارے میں اس وقت تک کچھ نہیں لکھا جا سکتا جب تک عصری عالمی شاعری اور اردو شاعری سے متعلق سہ رکنی مکالمے اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے اختتامیے کو کم سے کم دوبارہ پڑھ لیا جائے۔ آپ کا مضمون اسی مکالمے کا شاخسانہ ہے۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند بلاشبہ ایک دانشور ہیں جن کا تقابلی ادب کا استاد اور ناقد ہونا بھی طے ہے۔ میں سوچتا ہوں وہ شاعر نہ ہوتے تو کتنے بڑے آدمی ہوتے۔ یا پھر یہ ہوتا ہے کہ ان کا عالمانہ اور قابلِ رشک بلند قامتی ان کی شاعری میں بھی در آتی۔ بنیادی طور پر وہ علامتی شاعری کے شاعر ہیں انہوں نے اپنے انٹرویو میں صاف کہا ہے کہ علامتوں کے لئے غزل میں سانس لینے کی گنجائش نہیں ہے۔ اب میں کیا عرض کروں ستیہ پال آنند بڑے آدمی ہیں جب غزل ایک تنگ نائے تھی اس وقت بھی اس میں علامتیں تھیں۔ اور اقبال کے دیوانے پر جب غزل پہنچی تو اقبال نے اسے علم و دانش کی عظمت بھی عطا کر دی یعنی نئی عظمت۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ غالب صرف غزل گو شاعر ہونے کی وجہ سے عصری عالمی شعری ادب میں کوئی مقام نہ پا سکے۔ اگر یہ انکشاف مبنی بر حقیقت ہے تو بے حد تلخ اور افسوس ناک ہے لیکن جب میں دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر ستیہ پال آنند تو غزل کو دیکھتے ہی اس عینک سے ہیں جو یا پرفوکل ہونے کی وجہ سے بعض وقت دیکھنے والے کو لڑکھڑا دیتا ہے۔ "غزل، مرن و نہیں ہے۔ جو رسایل میں چھپتی اور مشاعروں میں پڑھی جاتی ہے۔ اگر وہ یہ کہتے کہ غزل کا معیار وہ نہیں رہا ہے جو پہلے تھا تو شاید ان کا رویہ زیادہ پسندیدہ ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ تجزیہ البتہ صحیح ہے کہ صنفِ غزل کی غیر صحت مند روایات نے اردو شاعری کو ایک پلیٹ فارم پر لا کر روک دیا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا یہ سوال بھی بجا اور لائقِ توجہ ہے کہ ہماری نظمیہ شاعری میں وہ معنیاتی اور موضوعاتی تنوع یا ہمہ گیری کیوں نہیں ہے جو دوسری ترقی یافتہ زبانوں کا طرۂ امتیاز ہے۔"

اس سلسلے میں کیا یہ عرض کرنا مناسب نہ ہوگا کہ اردو ادب کی عمر کتنی ہے۔ اور پچھلے پچاس سال سے اردو زبان کن مسائل سے دوچار ہے۔ ان حالات میں اگر اردو کا نام بھی عالمی ادب اور عصری شاعری کے سلسلے میں کسی زبان پر آجاتا ہے تو بڑی بات ہے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ہر زبان کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ جن دانشوروں نے اس مکالمے میں حصہ لیا ان کے ہاں 'شعریت' ایک ضمنی چیز ہے۔ جب کہ اردو شاعری میں یہ ایک بنیادی اور لازمی چیز ہے۔ ہمارے دانشور شاعروں کو وہ مقبولیت [ ] کا ذکر مکالمے میں بار بار آیا ہے [ ] شاید اسی لئے بھی حاصل نہ ہو سکی کہ انہوں نے "شعریت" کو ضمنی چیز سمجھ لیا۔ اس صورت حال میں ان کے مقلدین کہاں سے پیدا ہوتے۔ [میراجی اسلوب کا ذکر پڑھیے] ڈاکٹر تھامس گرسے نے تو صاف اور صریح الفاظ میں پوچھا کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر راشد اور میراجی کو ان کا صحیح مقام مل پاتا نیز ان کی عظمت کو تسلیم کیا گیا ہوتا تو آج اردو شاعری مختلف ہوتی۔ اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر آنند نے فرمایا "بے شک میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔" ڈاکٹر تھامس گرسے بالکلیہ مغربی ذہن کے دانشور ہیں اس لئے غزل سے تو انہیں کوئی لگاؤ ہو ہی نہیں سکتا۔ اور انہوں نے غزل کی نفی میں جو کچھ کہا ہے برملا اور صاف صاف کہا ہے۔ مکالمے کے شرکا سے تو اپنے ادب سے متعلق بھی کچھ ذہنی تحفظات ہیں۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند کے ابتدائیے کے کچھ الفاظ تو دور تک گونج رہے ہیں۔

اس پس منظر میں آپ کا مضمون بڑی حد تک متوازن ہے۔ خاص طور پر غزل اور غزلیہ شاعری سے متعلق جو باتیں آپ نے کہی ہیں وہ مبنی بر حقیقت ہیں۔ "شاعری تو جزوِ پیغمبری ہے اور غزل بالخصوص" یہ الفاظ آپ کی ذاتی تربیت کی پوری طور پر عکاسی کرتے ہیں۔ اور آپ کی یہ بات بھی صحیح ہے کہ "اب اردو غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ ناگزیر ہے۔" آپ کے مضمون کا آخری جملہ ہے تاہم یہ تمام نظمیں [یعنی ستیہ پال آنند کی نظمیں] اردو کی جدید نظمیہ شاعری کو ایک نیا شعری وجدان دے سکتی ہیں یہ شاعرانہ مدح ہے۔ وجدان کا لفظ تو سراسر زیادتی ہے۔

بہرحال یہ انٹرویو گوپی چند نارنگ کا اختتامیہ اور آپ کا مضمون، بحث کے دروازے کھولنے کے لئے بہت کافی ہے۔

یوسف ناظم ● ۱۹۔ نیو ویب، پلاٹ نمبر ۳۴، باندرہ ریکلیمیشن، بمبئی ۔ ۴۰۰۰۵۰



اردو غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ پڑھا۔ آپ نے کچھ بہت اہم اور بنیادی سوال اٹھائے ہیں۔ غزل کی اہمیت ہمیشہ سے رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ فنون لطیفہ میں جس طرح مصوری، موسیقی اور ادبی تخلیقات فن لطیف ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن ہر ایک کی اپنی عظمت ہے۔ بالکل اسی طرح شاعری کو چاہے جتنے ہیئتی خانوں میں بانٹ لیں۔ غزل کی اہمیت مسلم ہے۔ گیت کی بلا پیچ و پیچ تغزل کا ایک شعر جیسے خیال اور مضمون کا حامل ہوتا ہے۔ ایک پوری نظم بھی اس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ بہرحال یہ تفصیل بحث ہے۔ آپ کے مضمون نے بہت متاثر کیا۔ اس بحث کو جاری رہنا چاہیئے۔

اظہار اثر ● وائی۔ بی۔ ڈی، ڈی۔ اے کالونی، نیو رنجیت نگر۔ دہلی۔ ۸



اس بار شاعر کے شمارہ نمبرہ میں عصری عالمی شاعری اور اردو شاعری پر ایک دلچسپ انٹرویو شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ اور ایک وسیع القلب شاعر اور تقابلی ادب کے استاد بھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ نہ ایک وسیع النظر شاعر ہیں اور نہ تقابلی ادب کے استاد بننے کے لائق۔ ان کی شاعری کے جو نمونے شاعر میں شائع ہوئے ہیں۔ وہ شاعری تو دور کی بات اچھی نثر بھی نہیں۔ اچھی شاعری میں کم سے کم اچھی نثر کی خوبیاں ضرور ہونی چاہئیں۔ وہ ان میں نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو شاعری نہیں کی ہے بلکہ اردو زبان میں انگریزی شاعری کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ طامس گرے کا اعتراض ان کی شاعری پر بجا ہے جس کا جواب ستیہ پال آنند خاطر خواہ نہیں دے سکے۔ نظم 'لفظ' ایک ناکام نظم ہے۔ موسیقیت اور معنویت سے عاری۔ ایک اکیلا لفظ معنی میں بند ہو یا آزاد، بذات خود ایک نظم ہوتا ہے۔

EMERSON SAYS: EVEN A WORD HAS ONE A POEM

آنند لفظ کی ہیئت سے آگاہ نہیں۔ کاش انہوں نے گیتا کا بغور مطالعہ کیا ہوتا۔ "کرشن" ایک اکیلا لفظ ہے۔ کیا یہ لفظ پوری نظم نہیں؟ "ہیملٹ" کا لفظ ہی کافی ہے۔ آنند کا غزل پر اعتراض بھی غلط اور فرسودہ ہے۔ غزل، صرف اردو شاعری کی آبرو ہی نہیں، ایک مہذب ترین صنف شاعری بھی ہے۔ EPIC سے LYRIC تک کا سفر جس طرح فطری ہے اسی طرح قصیدے سے غزل تک کا سفر بھی فطری ہے۔ ہمالیہ پہاڑ میں عظیم الشان جانوروں کے جتنے پلسے گئے جن کے مقابلے میں ہاتھی بھی چوہے کے برابر ہے۔ ایذرا پاؤنڈ نے چینی شاعری [چار مصرعوں کی] جاپانی شاعری [تین مصرعوں کی] اور کبیر کے دوہے [دو مصرعے] کا ترجمہ کیا۔ اور ہائیکو کی طرز پر اپنی ۳۰ مصرعوں کی نظم دو مصرعوں میں منتقل کیا لیکن ہائیکو میں تین مصرعے ہوتے ہیں۔ دو نہیں اس لئے یہ غزل کے ایک شعر کے طرز پر کہی گئی نظم ہے۔ اور وہ یہ ہے۔

IN A STATION OF THE METRO

THE APPARITION THEIR FACES
IN A CROWD
PETALS ON A WET, BLACK BOUGH

یہ دو سطری نظم مگدھ یونیورسٹی میں بی۔ اے۔ کے نصاب میں شامل ہے۔ آپ نے غزل سے متعلق نیا تنقیدی مکالمہ میں بڑی اچھی اور کام کی باتیں لکھی ہیں۔ اب غزل پر مزید لکھنا تحصیل حاصل ہے۔

آنند صاحب کہتے ہیں: "ہم نے اردو میں طبع شدہ کاغذوں کے گرے پڑے دریدہ ٹکڑوں کو بھی لوگوں کو عقیدت سے چومتے اور انہیں بہ حفاظت اندرونی جیب میں رکھتے دیکھا ہے۔"

افسوس۔ صد افسوس۔ لوگ اردو میں طباعت شدہ کاغذ کے ٹکڑوں کو چومتے ہیں جن پر قرآن کی کوئی آیت یا خدا اور رسول کا نام لکھا ہوتا ہے۔ کاغذ کے ہر ٹکڑے کو نہیں چومتے۔ آریہ سماج کے ایک مبلغ نے لاہور کے ایک فٹ پاتھ پر اپنے دیوتاؤں کی تصویروں کو بے حرمتی سے پڑے ہوئے دیکھ کر کہا "مسلمان ٹھیک کرتے ہیں۔ کہ اپنے پیغمبروں اور ولیوں کی تصویریں نہیں چھپواتے۔"

تاج پیامی ● محلہ محمد آرہ [بہار]



اس مراسلے کے وسیلے سے میں قارئین ادب کی خدمت میں کچھ توجہ طلب باتیں نہایت ادب کے ساتھ پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ پہلا مسئلہ "شاعر" بمبئی کے شمارہ ۱۹۹۱ نمبر ۹ میں شائع شدہ جناب ستیہ پال آنند کی اردو نظموں "دست برگ" اور ان ہی کے تحریر کردہ مضمون بعنوان "ابتدائیہ" "عصری عالمی شاعری اور اردو شاعری" کے عنوان سے ڈاکٹر تماس گرے ڈاکٹر ستیہ پال آنند اور پروفیسر عزیز پریہار کے انٹرویو، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے مضمون "اختتامیہ" [جو آنند صاحب کی نئی اردو نظموں "دست برگ" کی تعریف و اہمیت سے پُر ہے] اور جناب افتخار امام صدیقی "مدیر" شاعر بمبئی کے اداریے اور ان کے مضمون "غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ" سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، شرکاء انٹرویو اور جناب افتخار امام صدیقی جیسے تمام حضرات کی حالیہ شائع شدہ تحریروں [۔۔"شاعر" بمبئی مذکور] سے موجودہ جدید اردو شاعری اور خاص طور پر اردو غزل کی روایتی پست، غیر معیاری اور بیرون ہند کے دیگر مغربی ممالک کی "اعلیٰ و ارفع" شاعری کے تقابل میں جو تصویر سامنے لائی گئی ہے، وہ ہمارے موجودہ شعری ادب [نظم اور غزلیہ] پر ایک بھرپور طمانچہ ہے۔ میں نہایت کھلے دل سے کہنا چاہتا ہوں کہ نئی اردو نظم اور غزل کا یہ غلط اور جانبدارانہ اور تعصب آمیز جو بھی احتساب کیا گیا ہے، وہ ہماری جدید نظم اور غزلیہ شاعری کو ہندوستان میں اور خود ہندوستان سے باہر بدنام کرنے کی ایک ناکام کوشش۔ مگر مجھے تو ایک سازش معلوم ہوتی ہے۔

ادب و تنقید اور شاعری پر سنجیدہ تفکر رکھنے والے قارئین اور فنکار حضرات کو مذکورہ اصحاب کے اس عمل پر متوجہ ہونا چاہئے۔ ان کا اجمالی خاکہ یہ ہے۔

ا۔ جناب ستیہ پال آنند کی اردو نظمیں "دست برگ" ہی اس معیار کی ہیں جو عالمی شاعری کے مقابل لائی جا سکتی ہیں۔ ہماری قدیم اور جدید شاعری میں موضوعات، ہیئت اور آہنگ کا کوئی ایسا شاعر نہیں جو آنند صاحب کی اردو نظموں کا مقابلہ کر سکے اور جنہیں ہم امریکہ یا یورپ کی شاعری کے سامنے پیش کر سکیں۔ وہ سب ہیچ پوچ اور کم مایہ ہیں۔ اور محض اور میشل ہیں۔

۲۔ افتخار امام صدیقی نے اگرچہ اپنے مضمون میں جناب ستیہ پال آنند کے اس نظریے سے اختلاف کیا ہے۔ لیکن در پردہ ان کی اس "اردو شاعری" کو منوانے اور ان کے ہندی اور انگریزی کارناموں سے اردو والوں کو مرعوب کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

۳۔ "دست برگ" کے عنوان سے "شاعر" کے اس شمارے میں خود جناب ستیہ پال آنند کی نظمیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسے صاحب نظر نقاد کی تمام تنقیدی وکالت کے باوجود ان نظموں میں شاعری، آہنگ و اسلوب کا کوئی بھی رنگ نہیں ابھرتا۔ صرف موضوعات کو نظم کر دینا "شاعری" نہیں۔

۴۔ گزشتہ تین دہائیوں کے اندر اردو کی نظمیہ اور غزلیہ شاعری نے جو موضوعاتی اور اسلوبی آہنگ و رنگ کا سرمایہ فراہم کیا ہے ہمارے اردو کے سب تراجم کے ذریعہ وہ مغربی شعرا کے حلقوں میں متعارف کرایا جا سکتا ہے۔ آخر نئی غزل یا نئی نظم کا ترجمہ کر کے مترجم باہر کی دنیا میں یہ بات کیوں نہیں منواتے کہ اردو کا نیا ادب ۔۔۔ وہاں کی ادب سے پیچھا نہیں ہے بلکہ باہر سے زیادہ بامعنی ہے؟۔

ذکاء الدین شایاں ● نزد او ورسیز پوسٹ آفس بچھایا، تکیا سیت (یوپی)



ستیہ پال آنند نے "اختتامیہ" میں جو کچھ لکھا ہے وہ کافی اختلافی اور نزاعی ہے۔ اس اختتامیہ کی ہر سطر بحث کے دروازے وا کرتی ہے۔ اردو شاعری اور بالخصوص غزل کی شعریت کے بارے میں انہوں نے بڑی بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ اور بڑی حکمت اور غصّے کے ساتھ غزل کو ہیچ اور لچر قرار دیا ہے۔ اردو نظم پر کچھ رحم فرمایا ہے۔ لیکن اسے بھی بہرحال قابلِ اعتنا نہیں سمجھا ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ گوپی چند نارنگ نے ان کے ان خیالات بھرے فکر کی بڑی حد تک تائید کی ہے۔

کہاں تو پال صاحب کا یہ خطبہ اور کہاں ان کی نظمیں۔ فکری آہنگ اور اسلوب سے عاری نظمیں شاعری سے بالکل عاری ہیں۔

خیال خواہ کتنا ہی اونچا اور اچھا ہو لیکن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

نظاروں کی تکمیل اور اسلوب کے ذریعے ایک اچھی نظم یا غزل کا ایک اچھا شعر بن سکتا ہے۔ اور اگر شاعر کے یہاں جذبہ، وجدان اور احساس کا فقدان ہو تو اچھی روایت سے بغاوت اور اسلوب کا استعمال بھی صرف تجربہ کرتا ہو تو اچھا خیال بھی ایک ملی اور ناکارہ شعر یا نثر بن سکتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ پال کا ذہن مغرب زدہ ہے۔ وہ انگریزی کا ادب پڑھتے ہیں اور اسی میں لکھتے ہیں۔ آپ نے یہ مضمون بہت اچھا ترتیب دے کر پیش کیا ہے۔ بہت سی کام کی باتیں اور نئی باتیں اس میں آگئی ہیں۔

فاروق شفق ● ۳۰۔ معان گلی۔ کار پوریشن۔ کلکتہ



شاعر کا شمارہ نمبر ۹ میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند کے حوالے سے اردو شاعری کے چونکا دینے والے بہت سے پہلو سامنے آئے۔ اردو ادب کے طالب علم کی حیثیت سے یہ بھی یہ جاننے میں دلچسپی تھی کہ عصری عالمی شاعری کے مقابلے میں اردو شاعری کی کیا حیثیت ہے۔ "ابتدائیہ" میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے اپنے پراجکٹ کے سلسلے میں جو نتائج مرتب کئے ہیں وہ واقعی حیران کن ہیں:

۱۔ بے چارے اردو شاعر کو غزل کا مردہ گدھا اپنے وزن سے دبائے ہوئے ہے۔ ۲۔ گذشتہ چار دہائیوں کے ادب پر نظر ڈالیں تو ہمیں ن۔م راشد اور میراجی کے مقلدین کہیں نظر نہیں آتے۔ [حالانکہ اردو شاعری کا سفر انہیں دو شاعروں کی قیادت میں طے ہونا چاہیے تھا] ۳۔ غالب صرف غزل گو شاعر ہونے کی وجہ سے اور فیض اپنی شاعری کے مصنوعی PSEUDO ROMANTICISM کی قبیل سے تعلق کی بنا پر عصری عالمی شاعری میں کوئی مقام نہ بنا سکے۔ ۴۔ آج کسی اردو شاعر کو یہ اعزاز حاصل نہیں کہ وہ انگریزی کے ذریعے سے متعارف ہوا ہو۔ ۵۔ کیا فیض ایک بہتر شاعر تھے؟ نہیں! ۶۔ کیا فیض سچے اور ایماندار تھے؟ نہیں! ——— فیض کمیونسٹ تھے۔ راشد نہیں تھے۔"

غزل کی مدافعت میں اور اس قبیل کے دیگر نکات کے بارے میں بھی آپ کا مضمون "غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ" کافی و شافی ہے۔ یہ عجب دلیل ہے کہ جو چیز انگریزی میں ترجمہ ہو کر عالمی انداز میں پہونچے وہی معیار و وقار میں آئے۔ اور جس کا ترجمہ نہ ہو اس کا عالمی ادب میں کوئی درجہ بھی نہ ہو۔ معیار بنانے کا حق مغرب کو ہے۔ اور مشرقی ادبیات کا فرض ہے کہ اس معیار تک رسائی حاصل کرے۔ ورنہ اس کا وجود و عدم سب برابر ہے۔

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ آزادی کے زمانے کے آس پاس اردو نظم کا سفر دو سمتوں میں ہوا۔ ن۔م۔ راشد، میراجی اور حلقۂ ارباب ذوق کے دیگر شعراء مثلاً مجید امجد، یوسف ظفر، قیوم نظر وغیرہ اور دوسری سمت میں احمد ندیم قاسمی، مخدوم محی الدین، فیض، سردار جعفری، اختر الایمان وغیرہ۔ راشد اور میراجی نے شاعری کے مسلّمہ معیار سے بغاوت کی۔ اور وہ ایک خاص حصار میں محدود ہو گئے۔ فیض نے رومانی / انقلابی تصورات کو اپنایا اور ان کا کلام نہ صرف ان کے ہم عصروں نے قبول کیا بلکہ وہ اردو شاعری کے لاکھوں مداحین کے دلوں کی دھڑکن بن گئے۔ فیض اشتراکی تھے مگر ان کے سوز دروں میں وہ غیر اشتراکی تھے۔ راشد اشتراکی نہیں تھے مگر ان کی باغیانہ شاعری کسی اشتراکی یا غیر اشتراکی کے دل کی دھڑکن نہ بن سکی۔ آپ نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ

"ن۔م۔ راشد یا میراجی کو جدید شاعری کا امام تسلیم کرنا۔ ان کے مدرسۂ اسلوب کی تقلید یا تتبع پر زور دینا، یا انہیں کو عالمی عصری شاعر کے معیار کے تصور کرنا، گمراہی کے سوا اور کچھ نہیں۔"

آخر کیا وجہ ہے کہ فیض مرنے کے بعد بھی زندہ ہیں۔ اور راشد اور میراجی اپنی زندگیوں ہی میں معدوم ہو گئے۔ اس کے اسباب و علل پر معروضی انداز میں غور کرنے کی ضرورت ابھی باقی ہے۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے فیض پر جو فرد جرم مرتب کی ہے کہ وہ سچے نہیں تھے۔ ایماندار نہیں تھے۔ اور سود و زیاں سے آشنا تھے۔ اس کا کوئی ثبوت انہوں نے فراہم نہیں کیا ہے۔

میں نے ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی سترہ عدد نظمیں بھی غور سے پڑھیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ قصداً ان کو اس انداز سے لکھا گیا ہے کہ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں ان کا ترجمہ آسانی سے ہو سکے۔ اور ان کو عصری عالمی شاعری میں اردو کی نمائندگی کا منصب مل سکے۔ موضوع اور مواد کے لحاظ سے یہ نظمیں قابل فہم ہیں۔ مگر ان نظموں میں زبان جو لکھوا دی گئی ہے اور انداز بیان میں جو کچا پن ہے اس سے یہ نظمیں بے جڑ کے پودوں کی صف میں آ گئی ہیں۔ اردو شاعری کا جو مزاج اور معیار ہے اس پر یہ نظمیں نہیں اترتیں اور زیادہ امکان اس کا ہے کہ نثری نظموں کی طرح یہ نظمیں بھی ہوا میں اڑ جائیں گی۔

بہرحال ڈاکٹر ستیہ پال آنند کے اس پراجکٹ نے جتنے محاذ کھولے ہیں۔ اس پر پوری توجہ مبذول کرنی چاہیے۔ اور اس پروجکٹ کے حوالے سے اردو غزل اور نئی نظم کا آویزش و آمیزش پہلے سے زیادہ غور کرنا چاہیے۔

نامی انصاری ● ۲۱/۱۴ اے، نواب صاحب کا احاطہ، سول لائنز، کانپور ۲۰۸۰۰۱ (یو۔پی)

سلطان اختر

غزلیں

وہ سوچتا ہے کہ سارا جہان سالم ہے
کہ جیسے سر پہ ابھی سائبان سالم ہے

خبر یہ ہے پسِ طوفان ہی شہر کہنہ میں
فقیر بیچنے والی دُکان سالم ہے

بکھر گئی ہے یہاں فرد کی اکائی تک
انھیں یہ ضد ہے کہ ہر خاندان سالم ہے

فقیہِ شہر سے کہو، جو ستم حق کے لیے
زباں دونیم ہے، لیکن بیان سالم ہے

کسی اتفاق سے آیا ہے شہر میں طوفان
مکیں بچا نہیں لیکن مکان سالم ہے

بہت ہی خوش ہے وہ جُھوٹا معاوضہ لے کر
رجس کی جان سلامت، مکان سالم ہے

جنوں دریدہ ہے قرآن سے اسکا ریس کی!
زلزلوں میں بھی دل کا مکان سالم ہے

◆

چراغ تیز بہت ہیں چراغِ جاں کے لیے
کہاں سے لاؤں ہنر شعلۂ نہاں کے لیے

بس ایک بار ہمیں قدر کرے ستانا
آمادگی مسافر سرائے جاں کے لیے

سنا ہے اُس کی سواری نکلنے والی ہے
بچھاؤ راہ میں آنکھیں انگاریوں کے لیے

اب اس کی شوخیٔ قسمت کو کیا کہا جائے
زمیں پہ منتظر ہے جو تبرِ آسماں کے لیے

گلے میں باہوں کا ہالا اگر نہیں، نہ سہی
مگر فصیلِ فریب ہے شہرِ جاں کے لیے

کمند ڈال رہا ہے زمیں کے نقطے پر
یہ بات شرم کے قابل ہے آسماں کے لیے

◆

خراب حال کر ماحول کی رہائی نہ دے
بُرا سہی مگر اُسے بُرائی نہ دے

گزر چکا ہے ہر جسم و جاں کی حد سے
ترے نثار قفس کی اب رہائی نہ دے

نظر کے ساتھ ہوا ہے زوال منظر کا
اندھیرا ہے تو کچھ بھی سجھائی نہ دے

جو اپنے خون کے رشتوں کو نام پر بیچتے ہوں
تو دشمنوں کو بھی اللہ ایسے بھائی نہ دے

یہ فردِ جرم نہیں "خود نوشت" ہے میری
مرا قلم نہیں اس میں وہ دکھائی نہ دے

یہ ہو رہا ہے مگر غور ایسی یہ سب کی
جو تنگ ظرف ہو یا رب اسے بڑائی نہ دے

نتیجہ عشق یہ کیا تھا اور ہوتا تھا
بد نگاہوں کو ملا دے تو پھر جدائی نہ دے

◆

ابھی سے طے کیا انجام درمیان میں ہے
سفر طویل، مرا تیر ابھی کمان میں ہے

عجیب شخص ہے جادو سا کیا بیان میں ہے
زبان اس کی ہے دل میں کہ دل زبان میں ہے

پہاڑ کاٹ رہا ہوں تراشنے کے لیے
وہ ایک شبیہ جو پنہاں کسی چٹان میں ہے

نشان کر رہا ہوں جنگ کے محاذ پہ پہلے
جو تیر اپنا مگر غیر کی کمان میں ہے

اُسی کے دم سے ابھی آبرو قبیلے کی
وہ ایک شخص جو آوارہ خاندان میں ہے

ضمیر وقت میں جاری ہے جنگ سی دائم
یہ ایک طرفہ تماشا "بدن مکان" میں ہے

وہ ایک دوست نہ کھا ہے خود میں ہی مشرق
تمھاری مجھ پہ پلکوں کے سائبان میں ہے

◆

کسی کے قرب سے مجبور نہ کوئی دوریاں ہے
یہ بات سچ ہے، مگر کتنی لاشعوری ہے

جو آدمی ہے، وہ آتش بکف نہیں ہوتا
یہ اپنی ذات میں روزِ ازل سے نوری ہے

عجیب سلسلہ فیوض شرع سے دنیا کا
بیاں کر چکا ہوں، بیاں مگر ادھوری ہے

کھنڈر بیچ کی بلندی ہے بولیے صاحب
ہر اک بات میں کیا مصلحت ضروری ہے؟

میرے بچے والوں میں گھر گیا ہوں میں!
اے بجاؤ! مرا قدم بے ضروری سے ہے

یہاں ثبات نہیں ہے نصیب حاضر میں
وہ ایک بات جو بے ثبات ضروری ہے

بہت خود ہی قاتل و مقتول و قتل و خنجر ہوں
اب ایسے کہ بدن ہی کیا جبر و ضروری ہے

◆

نذرِ خیرہ ہے اُس کی زندگی دیکھی نہیں جاتی۔ اندھیروں کا پلا ہے روشنی دیکھی نہیں جاتی
سنا ہے روشنی آئینے سے خوف کھاتا ہے۔ کہ اُس سے اپنی ہی بے چہرگی دیکھی نہیں جاتی
مرا دشمن تو ہو کر جمیل بیلے کیسی صورت۔ منافق ہے مگر میری خوشی دیکھی نہیں جاتی
یہ کیسا شخص ہے یوں جنگلوں کی بات کرتا ہے۔ کہ جس سے شہر کی تشنگی دیکھی نہیں جاتی

بے نسبت مل رہے ہیں تعلق ہر دل سے
خلافت [illegible] کوئی چیز بھی دیکھی نہیں جاتی

بی-۱۱۷، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

احمد یوسف

کمرشیل امپوریم، صدر گلی، پٹنہ (بہار)

خواب گر خواب شکن

ایک شخص مرنے لگا تو اس نے اپنے بیٹوں کو بلا کر وصیت کی۔
"بچو! میرے بعد سب کچھ تمہارا ہوگا، اب یہ دیکھنا تمہارا کام ہے کہ نہ کسی کو کسی سے زیادہ ملے اور نہ کسی کو کسی سے کم۔ اور ہاں آپس میں لڑنا نہیں"

یہ کہہ کر وہ چل بسا۔ بیٹوں کو غم ہوا۔ اور انہوں نے پہلی بار یہ محسوس کیا کہ وہ چھت جو ان کے سر پر کھڑی تھی۔ اچانک ایک بڑے بھیانک طوفان میں اڑ گئی ہے۔ اور اب وہ ہیں اور ان کے سر پر کھلا آسمان لیکن دھیرے دھیرے وہ اس دنیا میں جہاں انہیں ان کا باپ چھوڑ گیا تھا جینے کا سلیقہ سیکھنے کی طرف مائل ہونے لگے۔ باپ کی زندگی میں تو انہیں یہ محسوس ہوتا تھا کہ انہوں نے اپنے جملہ مسائل، اپنا اٹھنا بیٹھنا پہننا اوڑھنا کھانا پینا — غرض سب کچھ اپنے باپ کو سونپ رکھا تھا۔

وہ چھ بھائی تھے، ان میں سب سے چھوٹا بھائی تھا جس کا نام فہیم تھا ہائی اسکول کا امتحان دینے والا تھا۔ اس سے بڑا کلیم انٹر کے آخری سال میں تھا۔ اس سے بڑا وسیم بی۔ اے کر چکا تھا، اور اب آگے پڑھنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ اس نے ایمپلائمنٹ ایکسچینج میں اپنا نام رجسٹر کرا لیا تھا۔ اور ادھر ادھر نوکری کی درخواستیں دیا کرتا تھا۔ اس کے اوپر عظیم ایم۔ اے کے پہلے سال میں تھا۔ تاریخ کا طالب علم تھا اور اسے ہر قدم پر تازگی کا احساس ہوتا تھا کیونکہ تاریخ کے مطالعے سے وہ سب زمانوں کو آپس میں گڈمڈ کر دیتا تھا کل اس کے نزدیک آج بھی تھا۔ اور آج اس کے نزدیک کل بھی تھا۔ اس سے بڑا سلیم باپ کی زندگی ہی میں گریجویشن کرنے کے بعد ایک اسکول میں سائنس ٹیچر ہو گیا تھا اور اپنی تنخواہ میں اپنے حالات سے مطمئن تھا کہ سمجھتا تھا یہی اس کا مقدر ہے۔ اس کے دو بچے ہو گئے تھے، ایک خدمت گزار بیوی تھی جو ہر حال میں میاں سے خوش رہتی تھی۔ البتہ جب وہ ترنگ میں آکر "اک بنگلہ بنے نیارا" گاتا تو وہ اس کی حسرت پر ہنس پڑتی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ یہ گانا وہی لوگ گاتے ہیں جو بے عمل اور مجہول ہوتے ہیں۔ اور ان ہی کمزوریوں کے سبب اپنا گھر نہیں بنا پاتے ہیں۔ حالانکہ وہ بے چارہ اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لیے یہ گیت گاتا تھا۔ کیونکہ جس نے مقدر کے آگے سپر ڈال دی ہو اسے یہ گیت گانے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔

سب سے بڑا بھائی ندیم اپنے بعد کے بھائی سلیم سے تقریباً سات سال بڑا تھا۔ ان دونوں کے درمیان دو بہنیں اور ایک بھائی اور ہوئے تھے۔ لیکن وہ تینوں بچپن ہی میں قضا کر گئے۔ اس طرح وہ اپنے بھائیوں سے اتنا بڑا تھا کہ جب باپ بہتر سے تجاوز کر گیا، تو وہ آہستہ آہستہ اپنا کاروبار، اپنی جائداد، اپنے مکانات اور بیوپار اس کے ذمہ لگانے لگا۔ بچے بھی اب اس کے بڑے ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس کے تین بچوں میں جو سب سے بڑا تھا وہ تقریباً اپنے چھوٹے چچا کی عمر کا تھا اور دسویں جماعت میں پڑھتا تھا، دوسرا آٹھویں جماعت میں تھا اور تیسرا چھٹی جماعت میں۔

تو بڑا بھائی باپ کی زندگی ہی میں باپ کے کاروباری معاملات دیکھنے لگا تھا۔ پتہ نہیں کیوں اس کے ذہن میں گھر اور جائداد کے تصور کے ساتھ ہی بادشاہ اور اس کے جانشین کا تصور بھی ابھرتا۔ بادشاہ مرتا تو اس کا تخت بالعموم بڑے لڑکے کو ملتا، پھر یا تو وہ دوسرے بھائیوں کو تہہ تیغ کر دیتا یا انہیں مختلف صوبوں کی صوبہ داریاں سونپ دیتا۔ بڑا بھائی بھی غالباً یہی سوچتا تھا کہ تخت میرا ہے جو مجھے باپ کی وراثت میں ملا ہے اور چونکہ زمانہ جنگ و جدل سے دور ہے گو ایک سرد جنگ بحال رکھنے کا ہے۔ اس لیے میں بھائیوں کی جان بخش دوں گا اور صوبوں کی حکومتیں یعنی ایک ایک کمرے ان کے حوالے کر دوں گا۔ لیکن ایک خیال کانٹے کی طرح اس کے دل میں کھٹکتا رہتا کہ باپ کی وصیت کے آگے پیچھے لکھنے میں تو ایسی کوئی بات نہیں، لیکن درمیانی ٹکڑا "نہ کسی کو کسی سے زیادہ ملے گا اور نہ کسی کو کسی سے کم" بڑا ہی تشویشناک تھا۔

باپ کے مرنے کے بعد کچھ دنوں تک تو یہ درمیانی ٹکڑا اسے ستاتا

رہا۔ لیکن آہستہ آہستہ اسے یہ محسوس ہونے لگا کہ اس کی پوزیشن مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ اور وہ پیچ ہمہ قت و تاراج کا وارث ہے اور اس کے چھوٹے بھائی ایک مضبوط مرکز کے تحت مجبور ہے بس صوبے دار — اس طرح اس کے خیال میں پانچوں چھوٹے بھائیوں نے الگ الگ صوبے سنبھال رکھے تھے۔

منجھلا بھائی چونکہ بال بچوں والا تھا اس لئے اس کے قبضے میں ایک بڑے کمرے کے ساتھ ایک چھوٹا کمرہ اور برآمدہ بھی تھا۔ ساتھ میں ایک الگ باتھ روم بھی تھا۔ اس سے ملحق کمرے میں تاریخ کا طالب علم رہا کرتا تھا جو منجھلے بھائی کا باتھ روم استعمال کیا کرتا تھا۔ اس کے ایک راہداری تھی اور راہداری کے بعد تین چھوٹے چھوٹے کمرے اور ایک باتھ روم۔ ان کمروں میں تینوں چھوٹے بھائی رہا کرتے تھے۔

گھر کا کھانا سبھوں کے کمرے میں پہنچ جاتا۔ یہ کھانا ایسا ہی ہوتا جیسا ہوٹلوں یا ہسپتالوں میں ہوا کرتا ہے۔ صبح دوپہر شام۔ ہر وقت آلو یا پھر وہ ترکاری جو موسم کے ڈھلتے پر سستی ہو جایا کرتی ہے۔ دال ایسی ہوتی کہ ہزار چمچہ گھماؤ وہ بس پانی کی پانی ہی رہتی۔ خشک چپاتیاں یا چاول۔ اس کھانے کو وہ لوگ اسٹیٹ کا کھانا کہتے تھے۔ کالج کی فیس کے علاوہ انہیں ۲۰/۲۵ روپے ماہانہ جیب خرچ کے ملا کرتے تھے۔ چھوٹے بھائی فہیم اور اس سے بڑے علیم کی بہت سارے معاملے میں ساجھے داری تھی۔ وہ دونوں اپنے روپے ایک ہی جگہ رکھتے۔ انتظام یہ تھا کہ ایک مہینہ یہ رقم علیم کے پاس ہوتی اور دوسرے مہینے فہیم کے پاس۔ وہ دونوں ایک ہی ساتھ کھانا کھاتے اور اسی خشک کھانے کو کسی قدر تر بنانے کے غرض سے کبھی بازار سے کباب لے آتے کبھی منجھلے بھائی سلیم کے منی کچن (اصطلاح ان ہی لوگوں کی وضع کردہ تھی) میں ایک آدھ انڈے کا آملیٹ بنا لیتے اور اگر میٹھے کا شوق ہوا تو گڑ یا گزک لے آتے۔

اسٹیٹ کے کچن کے علاوہ بڑے بھائی ندیم اور منجھلے بھائی سلیم نے اپنے چھوٹے کمرے کے ایک گوشے میں مٹی کے تیل کا چولہا رکھ چھوڑا تھا۔ یہ گوشہ منی کچن کہلاتا تھا۔ اور ہر دو جانب سے اس کے متعلق مکمل رازداری برتی جاتی تھی، اور بظاہر یہ سمجھا جاتا تھا کہ نہ بڑے بھیا کے منی کچن کا حال منجھلے بھیا اور دوسرے چھوٹے بھائیوں کو معلوم ہے اور نہ منجھلے بھیا کے یہاں کے منی کچن کا حال بڑے بھیا کو معلوم ہے۔ حالانکہ بڑے بھیا کے لڑکے شمشاد، دلشاد، اور نوشاد منجھلے بھیا کے یہاں آکر اکثر ان کھانوں کا ذکر کرتے جو اسٹیٹ کے کچن میں نہیں پکا کرتے تھے، اور پھر وہ ان کے یہاں کے منی کچن سے اٹھتی ہوئی خوشبوؤں کو بھی سونگھا کرتے۔

گریجویشن کے بعد نوکری کی تلاش میں سرگرداں بھائی وسیم دو ایک ٹیوشن کر لیتا تھا۔ جن سے اسے سو ڈیڑھ سو روپے کی آمدنی ہو جاتی تھی۔ اس طرح گھر کی رقم ملا کر ہر مہینے ڈیڑھ سو، پونے دو سو روپے اس کی جیب میں آ جاتے۔ نوکری کے سلسلے کی بھاگ دوڑ، اسٹیشنری، ڈاک کے اخراجات اور پوسٹل آرڈر کی خریداری کے بعد جو پیسے بچتے وہ کبھی کبھار موسم کے پھل لے آتا، اور ان میں اپنے دو چھوٹے بھائیوں اور اپنے سے اوپر کے بھائی عظیم کا بھی حصہ رکھتا۔ اسے شب و روز یہی فکر ستاتی رہتی تھی کہ کوئی نوکری مل جائے اور وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے، ویسے پاؤں پر کھڑا ہونے کا کوئی واضح تصور اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ چنانچہ ایک بار جب عظیم نے فہیم اور علیم کی موجودگی میں اس سے پوچھا کہ "مجھے یہ سمجھاؤ کہ پاؤں پر کھڑے ہونے کا کیا مطلب ہے؟" تو اس نے جواب دیا۔ "یعنی کہ میں خود کفیل ہو جاؤں۔"

تب علیم نے سوال کیا۔ "کیا اسٹیٹ کا کھانا بند کر دو گے؟"

"نہیں بلکہ میں اپنا گھر ...!" اس پر سبھوں نے بیک زبان کہا — "یعنی اس گھر سے جانے کا ارادہ ہے۔" اس پر عظیم گڑبڑا گیا — اور یعنی کہ یعنی کہ ...... کے آگے کوئی قرینے کا فقرہ اس کی زبان سے نہیں نکلا۔ تب ہی عظیم نے فیصلہ کن انداز میں کہا — "میاں پاگل ہو گئے ہو؟ سوچو کہ ابو نے آخری وقت میں کیا کہا تھا — "میرے بعد سب کچھ تم لوگوں کا ہے۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا — "پھر یہ سب چھوڑ کر تم چلے جاؤ گے؟"

اس دن کے بعد سے وسیم نے پاؤں پر کھڑے ہونے کی بات کرنا بند کر دیا۔ اب جب کبھی اس کی نوکری کا ذکر آتا، تو وہ اس موضوع کو ایک ذرا فلسفیانہ رنگ دے دیتا۔ "اگر انسان میں حصول معاش کی لگن نہ ہو تو اس میں اور جانوروں میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔"

عظیم نے بی۔ اے میں امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کی تھی، اور ہائی اسکول میں انہوں نے اچھے مارکس لائے تھے۔ اس لئے ایک کوچنگ انسٹی ٹیوٹ میں اسے جز وقتی نوکری مل گئی، جہاں وہ شام کو ہائی اسکول، انٹر اور بی۔ اے کے لڑکوں کو انگریزی، اردو اور تاریخ پڑھایا کرتا تھا۔ ہفتے میں چھ سات کلاس ہوتے۔ اس سے اسے ڈھائی سو روپے کی آمدنی ہو جایا کرتی تھی۔ ان میں جیب خرچ کے روپے ملا کر وہ اپنے کپڑوں کے شوق پورا کر لیتا تھا۔

اسٹیٹ سے سبھوں کو عید کے موقع پر عام دنوں میں پہننے والے دو جوڑے کپڑے، ایک کرتا پاجامہ، دو بنیائن اور ایک رومال مل جایا کرتا۔ عظیم چونکہ ان کپڑوں کے علاوہ بھی کپڑے سلوایا کرتا تھا۔ اس لئے اس کے پاس کچھ کپڑے جمع ہو گئے تھے۔ ان میں ایک دو جوڑے ایسے بھی تھے جو خاص خاص موقعوں پر پہننے کے لئے تھے اور جنہیں اکثر وہ سیمی انٹرویوز کے موقعوں پر استعمال کیا کرتا تھا۔ عظیم کا کیا خیال تھا کہ اس کے مقدر کے گراف لائن بتدریج اوپر کی طرف جا رہی ہے۔ یہ خیال اسے اپنی ذات میں مست رکھتا اور وہ خاصا پُرامید نظر آتا۔

باپ کے انتقال کے بعد بڑے بھیا سے اُن لوگوں کے فاصلے بڑھتے ہی گئے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ منجھلے بھیا تو ایک سلسلے کی چیز نظر آتے ہیں کہ ان کے بعد بھائیوں میں دو تین سال کا فرق ہے۔ لیکن بڑے بھیا تو بالکل ہی دوسرے نسل کے آدمی دکھائی دیتے ہیں۔

گھر میں بادرچن تھی، لیکن صبح کے دو گھنٹے اور چائے کے اوقات میں دونوں بہوئیں ایک ساتھ کچن میں رہتیں، جہاں وہ کامل سکون کے ساتھ ہنستی بولتیں، چھوٹی چھوٹی بحثیں کرتیں اور پھر بظاہر مل بھی جاتیں، پر گھر یہ بڑی بھابھی اور بڑے بھیا ہمیشہ اسٹیٹ کا سمبل سمجھے جاتے تھے یہ خیال اس وقت بہت ہی ابتدائی صورت میں تھا۔ جب باپ نے سارا کاروبار سنبھال رکھا تھا۔ صرف خانہ داری اس نے بڑی بہو کو سونپ دی تھی، پر جوں جوں دن گزرتے گئے۔ یہ خیال مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔

جب باپ مرا تو سوئم کے دن بڑے بھیا نے اپنے پانچوں بھائیوں کو بلایا، اور جب انہوں نے ان کے سر پہ ہاتھ رکھا تو، نہ جانے کیوں ان کے دل بھر آئے، اور ان کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ تب ہی مولوی ارشاد نے جو گھر کی تقریبوں اور خاص خاص موقعوں پر بلائے جاتے تھے کھنکھارتے ہوئے کہا۔ " بزرگوار نے کہا تھا کہ ان کے بعد سب کچھ تم لوگوں کا ہے آپس میں لڑنا نہیں۔"

بڑے بھیا کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ سب اپنے اپنے کمروں میں آ گئے تو بڑی بھابھی باری باری سبھوں کے کمرے پر گئیں اور سبھوں کے آنسو پونچھے۔ پچھلے تین دنوں سے یہ لوگ چھوٹے بھائیوں کی ڈھارس بندھا رہے تھے۔

بڑے بھیا کے کھانے کھانے سے جہاں انہیں سکون ملتا، وہاں وہ ایک لمحے کے لئے یہ بھی سوچتے کہ جو کچھ بھی وہ ان ہی پر سجتی، بڑے بھیا نے

اس سے بیچ والوں کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ تو بس خاندان کے کسی بزرگ کی، ان لوگوں کی یتیمی اور بے چارگی پر غم کھا رہے ہیں، اور جب یہ خیال کے دل میں آتا تو باپ کے مرنے کے بعد بڑے بھیا سے جو وہ ایک سی محسوس کرنے لگے تھے، وہ اپنائیت ناگواری میں بدل جاتی، اور اس وقت انہیں یہ محسوس ہوتا کہ سب کچھ تو ویسا ہی ہے بدلا کیا ہے؟ ۔

باپ کو مرے ہوئے چھ ماہ گزر چکے تھے۔ سارا کاروبار اور سارا بڑے بھیا کے تصرف میں تھا، تب ہی بھائیوں کے درمیان چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

چھوٹے بھائیوں نے منجھلے بھیا کو تیار کیا کہ وہ بڑے بھیا سے جا کر باپ کی جائداد بھائیوں کے درمیان کس طرح تقسیم ہو گی۔

منجھلے بھیا نے جا کر کہا۔ " ابو کے انتقال کو چھ مہینے گزر چکے، معاملات کو آگے بڑھنا چاہئے ۔"

بڑے بھیا نے کہا۔ " اگر ہم لوگ ابھی سے الگ ہو گئے تو ابو کی روح کو تکلیف پہنچے گی، سوچو کیا کہا تھا انہوں نے کہ سب کچھ تمہارا ہے۔"

منجھلے بھیا وہاں سے ایک موہوم سی امید لے کر واپس آئے۔ "سچ ہے کہ سب کچھ ہمارا ہی ہے۔ اور اگر ہم نے اس معاملے میں جلدی کی تو ابو کی روح کو یقینی صدمہ پہنچے گا کہ ان کی آنکھ بند ہوتے ہی ہم سب الگ ہو گئے جائداد کی تقسیم فی الوقت نہ بھی ہو تو کم از کم یہ تو معلوم ہو جائے کس کا کیا ہے "

اُس دن بات یہیں پر ختم ہو گئی ۔

دراصل منجھلے بھیا تو صوفی صافی آدمی تھے، انہیں تو ان باتوں کا اس وقت ہوتا، جب منجھلی بھابھی اور اُن کے چھوٹے بھائی انہیں ٹہوکا دیتے ورنہ وہ تھے، اُن کا اسکول، اُن کے بچے تھے اور اُن کا دو ایک کا قطعہ تھا۔

لیکن بڑی بھابھی اور بڑے بھیا تو سبھوں کے تیور بھانپ گئے۔

باپ کی پہلی برسی کے دو ایک دن بعد بڑے بھیا نے پانچوں بھائیوں کو سویرے سویرے بلا بھیجا۔ وہ گئے تو انہوں نے دیکھا کہ بڑے بھیا کے بازو میں مولوی ارشاد بھی کھڑے تھے۔

تب ہی بڑے بھیا نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"رات میں نے ابو کو خواب میں دیکھا۔۔۔۔۔" اور یہ کہہ کر بڑے بھیا ایک قدم آگے بڑھ گئے۔ مولوی ارشاد نے بھی ان کی تقلید کی، اور سامنے کھڑے پانچوں بھائی ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔

"ہاں تو میں نے دیکھا کہ ابو سفید کرتے پائجامے میں ملبوس ایک چٹیل میدان میں ہم سے کچھ فاصلے پر کھڑے کہہ رہے ہیں کہ سامنے کی طرف دیکھو بڑا سخت طوفان آرہا ہے' قطار بنائے کھڑے رہو' اور رجب میں کہوں تو زمین بوس ہو جانا کہ طوفان سے بچنے کا یہی طریقہ ہے۔ تب ہی ہم نے دیکھا کہ گرد آلود دیگولوں کی ایک فوج ظفر موج چلی آتی ہے۔ جس میں کچھ پیادے ہیں، کچھ شہ سوار ہیں اور کچھ فیل سوار ہیں۔

تب ہی مولوی ارشاد نے کہا۔" ہم سب تیری رحمت کے طلبگار ہیں مولا۔" وہ بتانے لگے۔" بزرگوار اپنے بچوں کیجا دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ بہ آسانی طوفانوں کا مقابلہ کر سکیں"۔

اِس کے بعد سبھی بھائیوں نے اپنے اپنے کمرے کا رخ کیا۔

عظیم نے ایم۔ اے کر لیا تو وہ پی ایچ ڈی کے رجسٹریشن کے لیے بھاگ دوڑ کرنے لگا۔ وسیم کو اب ہاتھی کے محکمے میں ایک آسامی مل گئی تھی۔ علیم انٹر کرکے بی۔ اے میں آگیا تھا اور نعیم نے میٹرک پاس کرکے انٹر میں داخلہ لیا تھا۔

اِن ہی دِنوں ایک شام جب وہ منجھلے بھیا کے یہاں بیٹھے تھے نعیم نے کہا۔

"اب منجھلے بھیّا کی شادی ہونی چاہئے"۔

اس پر منجھلے بھیا بولے "ضرور — ضرور۔ ضرور ہونی چاہئے"

یہ سُن کر عظیم نے ایک ذرا ترش روئی سے کہا۔" منجھلے بھیا اگر آپ ایک لفظ 'ضرور' کا بھی اپنے جملے میں اضافہ کر دیں تو میں شادی نہیں کروں گا۔

سبھی بیک زبان بول اُٹھے "کیوں"

"ذرا سوچئے کہ کیا میں اپنی بیوی کو اسٹیٹ کا کھانا کھلاؤں گا؟ منجھلے بھیا تو نوکری کرتے ہیں، اِس لئے وہ اِس خشک کھانے کو جو جو اسٹیٹ سے آتا ہے اپنی آمدنی سے قدرے بہتر بنا لیتے ہیں۔ لیکن میں تو ابھی بے کار ہوں۔ بیوی کو کیا کہوں گا کہ میرا یہاں کچھ بھی نہیں ہے، پھر بھی میرا سب کچھ ہے۔

سبھوں کے چہرے اُتر گئے۔ تب ہی انہوں نے دیکھا کہ بڑے بھیا کا چھوٹا بیٹا اُن کے درمیان سے اُٹھ کر چلا گیا۔

دو تین دِنوں بعد بڑے بھیّا نے پھر سبھوں کو بلایا۔ مولوی ارشاد بھی اُن کے برابر کھڑے تھے۔

بھائیو! میں نے کل رات عجیب سا خواب دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ہم سب بھائی ایک دریا کے کنارے بیٹھے ہیں۔ اچانک ابو بھی کہیں سے آگئے' اور انہوں نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا پتھر نکالا اور اسے دریا کی سطح پر اس انداز سے پھینکا کہ وہ اُچھلتا ہوا دُور دُور تک چلا گیا' اور اپنی راہ میں اس نے پورے چھ دائرے بنائے' جو پھیلتے پھیلتے آپس میں مل گئے' اور پھر دریا میں کھو گئے"۔

اِس پر مولوی ارشاد نے کہا۔" الحمدللہ کیا خواب ہے گویا بزرگوار نے بتایا کہ تم چھ بھائی الگ الگ دائرے رکھنے کے باوجود ایک عظیم کل' کا جُزو ہو۔ اور جس طرح وہ دائرے دریا میں مدغم ہو گئے' اِسی طرح تم لوگ بھی الگ الگ حیثیت رکھنے کے باوجود ایک خاندان میں ضم ہو جاتے ہو"۔

ایک دن بڑی بھابی منجھلے بھیا کے یہاں آئیں تو انہوں عظیم کو بلا کر کہا۔

"عظیم تمہارے بھائی کہہ رہے تھے کہ وہ احمد علی ایڈوکیٹ کی لڑکی سے تمہارا رشتہ مانگنے کے لئے جانا چاہتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"۔

عظیم نے کہا۔" بڑی بھابھی' آپ لوگوں کا زمانہ کچھ اور تھا یہ زمانہ کچھ اور ہے۔ اگر میری بیوی پوچھے گی کہ تمہارے پاس کیا ہے تو میرے یہ کہنے پر کہ سب کچھ ہے' سب کچھ ہے' وہ مطمئن تو نہیں ہو جائے گی"۔

بڑی بھابھی عظیم کی اِس صاف گوئی پر خاصی بدحظ ہوئیں' اور تھوڑی ہی دیر میں وہاں سے اُٹھ کر چلی گئیں۔

تب ہی منجھلے بھیا نے کہا۔" عظیم یہ دل آزاری کی باتیں ہیں"۔

اِس پر عظیم نے ذرا تلخ لہجے میں کہا۔" معاف کیجئے گا۔ منجھلے بھیا میں آپ کی طرح صوفی نہیں ہوں"۔

عظیم کا پی ایچ۔ ڈی میں رجسٹریشن ہو گیا، تو اس نے کوچنگ انسٹی ٹیوٹ سے استعفیٰ دے دیا۔ اب وسیم اسے سو روپے ماہوار دینے لگا تھا۔ اِس کے علاوہ وہ دونوں چھوٹے بھائیوں کو بھی پچاس پچاس روپے دے دیا کرتا تھا۔ اور اپنے خرچ کے لئے تھوڑی سی رقم رکھ کر بقیہ ڈاک خانے میں جمع کر دیتا۔

باپ کے انتقال کو تین سال گزر گئے، تو پھر ایک صبح بڑے بھیّا نے سبھی بھائیوں کو بلا بھیجا۔ مولوی ارشاد بھی پاس ہی کھڑے تھے بڑے بھیا نے انہیں بتایا۔

"کل رات میں نے ابو کو خواب میں دیکھا کہ ہم سب بھائیوں کو

لیے ایک بلند و بالا دیوار کے سائے میں کھڑے ہیں۔ دیوار خاصی بوسیدہ ہو چکی ہے۔ وہ دیر تک اسے دیکھتے رہے، پھر ہم سے کہنے لگے یہ دیوار اب خصوصی توجہ چاہتی ہے۔

تب بڑے مولوی ارشاد نے کہا۔ "سبحان اللہ کیا روشن ضمیر بزرگ تھے، وہ چاہتے تھے کہ خاندان کی اونچی دیوار اسی طرح کھڑی رہے۔ اور ہم لوگ وقتاً فوقتاً اس کی مرمت کراتے رہو۔"

اس کے بعد پانچوں بھائی سر جھکائے اپنے اپنے کمروں میں لوٹ آئے۔

شام کو جب وہ پانچوں ملے تو فہیم نے پوچھا۔ "آخر خواب کی حقیقت کیا ہے؟"

قبل اس کے کہ اس سوال پر کوئی کسی قسم کی رائے زنی کرے، منجھلے بھیا بولے۔ "خواب تو قرآن سے ثابت ہیں۔ سورہ یوسف میں خواب کا ذکر آیا ہے" ان کے یہ کہنے پر گفتگو کسی اور سمت چلی گئی۔

علیم ایم۔ اے کا فائنل ایئر تھا۔ اور وہ بڑی محنت سے پڑھ رہا تھا وہ کہا کرتا تھا۔ "بس یہاں محنت کر کے اپنا کیریئر بنا لو تو باقی تو سراب ہی سراب ہے۔ اس پر عظیم، وسیم اور فہیم اسے ٹوکتے۔ "کیوں خواب بھی سراب ہے؟"

پھر ایک بار منجھلے بھیا سے باپ کی جائداد کے بٹوارے کی بات کی گئی، اور یہ طے پایا کہ سب مل کر بڑے بھیا سے اس مسئلے پر گفتگو کریں گے۔

ندیم نے ان کی گفتگو میں خاصی دلچسپی لی۔ "تم لوگ بالکل صحیح کہتے ہو، میں خود بھی اس خیال کا حامی ہوں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب بھی کوئی عملی قدم اٹھانا چاہتا ہوں کہ ابو خواب میں آ کر کچھ ایسے واضح اشارے دیتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا الگ ہونا انہیں پسند نہیں ہے۔ دیکھو میں وکیل سے ملتا ہوں۔ سلیم! تم بھی میرے ساتھ چلو گے؟"

لیکن ابھی وہ پروگرام ہی بنا رہے تھے کہ ایک دن دفتر جانے سے پہلے، بڑے بھیا کے یہاں سے ان سبھوں کا بلاوا آ گیا۔ مولوی ارشاد بھی وہیں کھڑے تھے۔

پانچوں بھائی جب ان کے سامنے کھڑے ہوئے تو حسب دستور بڑے بھیا ایک قدم آگے بڑھ گئے، اور وہ پانچوں ایک ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ اس اہتمام کے بعد بڑے بھیا نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔

"بھائیو! رات میں نے خواب دیکھا کہ ابو تہبند باندھے اپنی مسہری پر ٹیک لگائے بیٹھے ہیں اور ہم سب بھائی ان کے ارد گرد بیٹھے ہیں۔ ابو کے ہاتھ میں روپے کی ایک تھیلی ہے اور وہ اسے دھیرے دھیرے اچھال رہے ہیں۔ ان کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑتی ہے۔ اور وہ کہہ رہے ہیں۔ "بچو یہ سب تمہارے لئے ہے۔ یہ سب تمہارے لیے ہے۔"

اس پر مولوی ارشاد نے اپنی داڑھی میں کنگھا کرتے ہوئے کہا۔ "واہ واہ کیا انصاف پسند تھے، وہ چاہتے تھے کہ سبھوں کی رقم ایک ساتھ رہے۔ سبھی ایک ساتھ رہیں جیسے تھیلی میں روپے رہتے ہیں۔"

شام کو جب وہ پانچوں ملے تو وسیم نے سلیم سے پوچھا۔

"کیا واقعی ابو نہیں چاہتے تھے کہ ہمیں ہمارا حق ملے، یہ آخر خوابوں کا چکر کیا ہے؟"

سلیم نے کہا۔ "خوابوں کا چکر نہیں، تعبیروں کا چکر کہو۔"

عظیم کا پی ایچ ڈی کا دو سال کا کام ہو چکا تھا۔ علیم نے بی۔ اے کے بعد ایم۔ اے (انگریزی) میں داخلہ لے لیا تھا۔ فہیم بی۔ اے کے پہلے سال میں تھا۔

اب تو یہ حال تھا کہ فہیم اور علیم کے ساتھ عظیم کو جیسے اپنے مقدر کی اوپر جاتی ہوئی گراف لائن پر بڑا ناز تھا۔ یہ سوچا کرتا کہ اب حقیقتوں کی دنیا سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔ آگے کیا ہوگا؟

"پی ایچ۔ ڈی کے بعد کیا کروں گا؟"

اس پر منجھلی بھابی کہتیں "ڈاکٹر عظیم لکھا کرنا۔"

"مذاق نہیں بھابی، کیا نوکری کے لئے مجھے بھی اسی طرح بھاگ دوڑ کرنی پڑے گی، جیسی وسیم نے کی تھی؟"

اس پر سبھی ایک ساتھ بول اٹھے۔ "نہیں نہیں پی ایچ ڈی کے بعد انشاء اللہ تمہیں لیکچر شپ تو کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی۔ پھر سرکاری نوکریاں بھی ہیں۔"

علیم بھی فکر مند رہتا۔ "ایم۔ اے کے بعد پی ایچ۔ ڈی اور پھر اس کے بعد؟"

اس بار جب بڑے بھیا نے انہیں بلایا تو وہ سبھی دفتر اور کالج جانے کو تیار بیٹھے تھے۔ تب بڑا وسیم نے کہا۔ "منجھلے بھیا کیا خواب اور خواب کی تعبیر سننے کے لئے سبھوں کا یکجا ہونا ضروری ہے؟"

منجھلے بھیا نے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا "چلو سن لو۔"

جب بڑے بھیّا نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا تو حسبِ معمول وہ اور مولوی ارشاد ایک قدم آگے بڑھ گئے اور وہ پانچوں ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔

"بھائیو! کل رات میں نے خواب دیکھا کہ ہم لوگ ایک بارات کے ساتھ اگلی صفوں میں جا رہے ہیں۔ وہیں ابو بھی نظر آئے کہ ہاتھوں میں چھڑی لیے کمخواب کی شیروانی زیبِ تن کیے بارات کی اگوائی کر رہے ہیں۔ تب ہی انہوں نے منجھلے بھیّا سے دریافت کیا۔ "تمہیں ابو کی کمخواب کی شیروانی یاد ہے نا؟" منجھلے بھیّا نے دھیرے سے ہاں کہا۔ "ہاں یاد ہے۔"

تو ہم سب بھائی ان سے بس ایک قدم پیچھے ہوں گے۔ لیکن وہ ہم سے بار بار کہہ رہے ہیں کہ قدم سے قدم ملا کر چلو اس میں بڑا حسن ہے"۔

دستور کے مطابق مولوی ارشاد بول اُٹھے۔ "کیا خوب خواب ہے کس کس طرح سے بزرگوار اس بات کا اشارہ کر رہے ہیں کہ تم لوگ ایک ساتھ مل کر چلو کہ حسن ملاپ میں ہے۔ بارات، خوشی اور شادمانی کا اشارہ ہے، کیا اچھا خواب ہے۔"

پھر جب وہ شام کو ملے تو علیم نے کہا۔ "ابو کے انتقال کو پانچ سال گزر چکے ہیں۔ لیکن اب تک ہم لوگ خواب کی وادیوں میں گم ہیں۔"

اس پر سلیم نے 'ہوں' کہا اور اسی ہوں پر سبھوں نے خاموشی اختیار کر لی۔

عظیم نے کئی جگہ لکچرشپ کی درخواست دے رکھی تھی وہ دفتروں میں بھی بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ علیم کا ایم۔ اے کا آخری سال تھا۔ فہیم نے بی۔ اے کر لیا تھا۔ اور اب سوچ رہا تھا کہ ایم۔ اے میں کون سا مضمون لیا جائے۔

پھر ایک دن بڑے بھیّا نے انہیں بلا بھیجا۔ مولوی ارشاد بھی ان کے پاس کھڑے تھے گفتگو شروع کرنے سے پہلے بڑے بھیّا ایک قدم آگے بڑھ گئے، مولوی ارشاد نے بھی ان کی تقلید کی۔

"بھائیو! رات میں نے خواب دیکھا کہ ہم لوگ ابو کے ساتھ ایک آم کے باغ کی سیر کر رہے ہیں۔ ناگاہ ہماری نظر ایک قلمی آم پر جا پڑتی ہے جو پھلوں سے لدا پھندا تھا۔ یہ دیکھ کر ہم سب بھائی ایک ساتھ اس درخت پر چڑھنا چاہتے ہیں کہ ابو ہاتھ کے اشارے سے ہمیں روک دیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ حق اس کا ہے جو تم سے بڑا ہے:

ندیم تم درخت پر چڑھو گے"۔ پھر وہ تم لوگوں کی طرف مڑ کر کہتے ہیں۔ "تم لوگ چادر پکڑ کر کھڑے رہو' ندیم آم توڑ کر اسی چادر میں پھینکے"......

اچانک منجھلے بھیّا نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ "ٹھہریے بڑے بھیّا، آپ بہت سارے خواب سنا چکے۔ آپ کے خواب اور ان کی تعبیریں سن سن کر ہمارے کان پک گئے" ابو سے ہمارا بھی وہی رشتہ تھا جو آپ کا تھا۔ چنانچہ کل رات میں نے بھی انہیں خواب میں دیکھا ہے۔

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "میں نے دیکھا کہ ہم لوگ ایک چمن کی سیر کر رہے ہیں۔ وہاں ایک بڑے گملے میں ایک پودا دکھائی دیتا ہے جس کی شاخیں کافی بڑھ گئی تھیں اور کچھ زمین پر بھی لوٹ رہی تھیں۔ وہیں پر پانچ خالی گملے اور رکھے تھے۔ اس پر ابو نے ہم لوگوں سے کہا۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔

مالی سے کہہ کر اس کی شاخیں کاٹ کر ان خالی گملوں میں لگا دے۔ اس طرح باغ میں مزید پانچ پودوں کا اضافہ ہو جائے گا۔ گویا حسن میں اضافہ ہو جائے گا۔ تعجب ہے کہ تم نے آج تک اس مسئلے پر غور کیوں نہیں کیا۔"

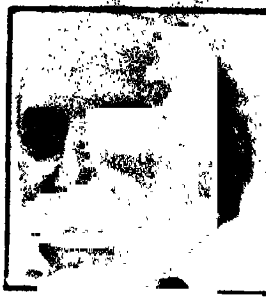
خلافِ دستور۔ وہ سب منجھلے بھیّا کے ساتھ ایک قدم آگے بڑھ کر بھونچکا بنے سوچ رہے تھے کہ کیا منجھلے بھیّا بھی خواب دیکھ سکتے ہیں۔ دوسری جانب بڑے بھیّا ایک قدم پیچھے چلے گئے تھے اور ان کا چہرہ بے حد بھیانک ہو گیا تھا۔

اور مولوی ارشاد کا تو دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ ✺

◆ بقیہ صفحہ ۴۷ نصف گھنٹے کا سفر ◆

والے کی دکان کے قریب رکا اور اسے تو کھل پان لگانے کے لئے کہا تو وہ میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا خیریت تو ہے، یہ آپ کی حالت کیا ہو گئی ہے۔ رحمٰن پان والے کی دوکان پر میں چونکا اور دوکان کے آئینے میں اپنی شکل دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ نصف گھنٹے کے سفر میں میں بوڑھا ہو چکا تھا۔ ✺

مکتوبات کے لیے مختصر، جامع اور مسائلی خطوط ارسال کیجیے جن میں تعریف و توصیف سے زیادہ شاعر کے مندرجات پر بحث کی گئی ہو۔ ذاتی نوعیت کے خطوط شائع نہیں کیے جائیں گے۔ مکتوبات کا کالم آپ کے لیے شاعر کے حوالے سے عصری ادبی مسائل اور ادب پر تاثرات ارسال کیجیے



اندر موہن دت ناداں

وہ

وہ بھی دن تھے
جب زمیں کا ہو کے بھی میں
آسماں در آسماں تھا
چاند تاروں کے جہاں کا ترجماں تھا

وہ بھی دن تھے
جب مجسم خیر بن کر
مانگتا تھا خیر میں سارے جہاں کی
زندگی کے گلستاں کی

وہ بھی دن تھے
جب پریشاں تھی نہ میرے دل کی بستی
فتنۂ دہشت گری سے
جب کھلے رہتے تھے دروازے برابر میرے گھر کے...

یہ بھی دن ہیں
جب میں اپنے گھر کی دیواروں کو اونچا کرتے کرتے
تھک گیا ہوں
اور اپنے سائے سے بھی
ڈرتے ڈرتے پوچھتا ہوں
تم کہیں "وہ" تو نہیں ہو؟

● بی۔۳۔۲۶۹، پچھم وہار، نئی دہلی ۶۳

انیس انصاری

کیا یہی وقتِ دُعا ہے

کچھ نظر آتا نہیں
حرف، نہ پیغام و سلام
بھیگے کاغذ کی طرح
دل پہ پڑھا جاتا نہیں ایک بھی نام
سرد موسم میں ابھر آئے
گئے وقت کی چوٹوں کے سلائے ہوئے درد
ہاتھ سے چھوٹ گئی لمحے میں آواز کی ڈور
درد کے بھرے میں دھند لا گیا
مانوس چمکتا ہوا چاند
ساحلِ دل پہ الٹتی رہیں لہریں خود کو
کوئی آواز بھر شہر میں روتی پھرے چپکے چپکے
ایک ایک کر کے سبھی کشتیاں غرقاب ہوئیں
کون کشتی ہے پکاریں تو پلٹ آئے گی؟
کون انکار ہے کہنے سے بدل جائے گا؟
بدگماں کون ہے سمجھائیں تو بن جائیں گے کام
کون ہے جس کے سبب دل میں نہیں چین نہ کوئی آرام
کون منزل ہے کدھر راہ، کہاں ہیں ہم گام

چار سو دھند ہے
اور چاند
نہ سورج نہ ستاروں کا ہجوم
اس گھڑی کچھ بھی نہیں راہ نہ منزل نہ دیا
اک فقط دل کے سوا
بھیگے کاغذ کی طرح جس پہ پڑھا جاتا نہیں ایک
نرم آنکھوں کے سوا
جو لکھے جاتی ہیں چاہت سے مرا پیار کا نام
کیا یہی وقت دعا کرنے کا پل ہے جاناں
کیا انہیں آنکھوں سے ڈھل جائیں گے دکھ درد
کچھ گرد دھند چھٹے، جوت بڑھے
موتیوں والی ہنسی ہنس کے پکارو مرا نام
دل کے کاغذ پہ نظر آئے
کوئی حرف
کوئی نام و پیام

● ۳۔ گلستان کالونی، لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۱ (یوپی)


میک اَپ سے چھپانے سے کیا فائدہ!
صَافی سے علاج کیجیے!
آپ میک اَپ سے اپنے چہرے کے کیل مُہاسے، پھوڑے اور پھنسیاں زیادہ سے زیادہ چھپا ہی سکتے ہیں، لیکن صافی ان تکلیفوں کو جڑ سے ہی دُور کر دیتی ہے۔ یہ خون کی اُن سب خرابیوں کا کامیاب علاج ہے، جن کی وجہ سے آپ کے مُنہ پر پھوڑے پھنسیاں نکل آتی ہیں اور آپ کی جلد پر بدنما داغ دھبے پڑ جاتے ہیں۔ صافی میں موجود مصفّیٔ خون لازمی اجزاء اور جڑی بوٹیاں آپ کی جلد پر پھپھوندی اور جراثیم کے اثرات کو پھیلنے سے روکتی ہیں۔ طبی تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ صافی ہر طرح سے بے ضرر ہے۔
صافی — ۵۰ سال سے بھی زیادہ عرصے سے قابلِ اعتماد مصفّیٔ خون!
صافی کا استعمال شروع کیجیے۔ آپ کو اپنی جلد کے داغ دھبے چھپانے کی ضرورت ہرگز محسوس نہیں ہوگی، کیونکہ صافی فسادِ خون کی شکایت دُور کر کے آپ کی جلد کو صاف و شفاف اور ملائم بنائے گی۔ صافی ان بیماریوں کا بھی مؤثر علاج ہے: جلد پھٹنا • گرمی دانے اور خارش • نکسیر • دائمی اور عارضی قبض • خسرہ • پیشاب میں جلن • عام تھکاوٹ۔
صافی موسم سرما کی تبدیلی کے دنوں میں پیدا ہونے والی بیماریوں کی روک تھام کے لیے بھی مفید ہے۔
خون اور جلد کی بیماریوں کی قدرتی دوا کا گھریلو نام
صَافی
جلد نکھارنے کا آسان طریقہ
ہمدرد

نیّر مسعود
ادبستان، دین دیال روڈ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

شہنشاہ مرزا

[ایک خاکہ]

۱۴ جنوری ۱۹۸۸ء کو دل کے دورے میں ختم ہونے والے شہنشاہ مرزا کی ظاہری شخصیت میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی تھی جو فوری طور پر کوئی خوش گوار یا ناگوار تاثر پیدا کر سکے۔ دبلا، کمزور بدن، چھوٹا قد جو اُن کے جھک کے چلنے کی وجہ سے اور چھوٹا معلوم ہوتا تھا، اور ان کی پیٹھ پر چلنے سے کوبڑ کا شبہ ہوتا تھا، سر پر لمبے لمبے بے رنگ بال، چہرے کی بجھی ہوئی رنگت، عینک کے شیشوں کے پیچھے سے جھلکتی ہوئی تھکی تھکی سی آنکھیں، سفید کرتے پاجامے کے سوا کچھ سے اچھا لباس ان کے بدن پر کم قیمت اور بُرا سلا ہوا معلوم ہوتا تھا، ان کی آواز پتلی تھی اور ہنسنے میں اور بھی پتلی ہو جاتی تھی۔ "کمال ہے" ان کا تکیہ کلام تھا اور انھیں اپنے کہنے سے زیادہ دوسروں کی سننے میں دلچسپی معلوم ہوتی تھی۔ مرزا ان لوگوں سے بہت مختلف تھے جو ایک دو ملاقاتوں یا سرسری گفتگو میں اپنا نقش قائم کر لیتے ہیں۔ لیکن ان کی وفات ہوئی تو کئی دوستوں نے جن کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ تعزیت کس سے کی جائے، مجھے جو تعزیتی خط لکھے ان میں، اور زبانی گفتگو میں بھی، اس بات پر خاص زور دیا کہ شہنشاہ مرزا سے ان کی ایک ہی دو ملاقاتیں ہوئی تھیں لیکن ان کے مرنے کا بڑا افسوس ہے، اس لئے کہ ان کے سے مخلص انسان کم نظر آتے ہیں۔ مگر یہ کیوں کر ممکن ہے؟ خلوص ایسی چیز نہیں ہے جس کا اندازہ انسان کو برتے بغیر ہو سکے، اور شہنشاہ مرزا تو خلوص کا اظہار کرنے سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ اس طرح شہنشاہ مرزا کی شخصیت ایک معمّا سی تھی جس کا حل اب، جب وہ نہیں ہیں، یہ سمجھ میں آتا ہے کہ شہنشاہ مرزا سے تعارف ہوتے ہی ان کے خلوص کا اندازہ تو نہیں ہو سکتا تھا لیکن کسی طرح یہ فوراً یقین ہو جاتا تھا کہ خلوص کے منافی صفات خود غرضی، ریاکاری، کینہ پروری وغیرہ کا اس شخص کے قریب سے گزر نہیں ہوا ہے۔ مگر یہ حل خود ایک معمّا ہے۔ دوسروں کو اپنے خلوص کا یقین تو پھر جلدی دلایا جا سکتا ہے لیکن غرض، ریا اور کینے سے اپنے پاک ہونے کا یقین دلانا بہت مشکل اور دیر طلب (اور بعض شخصیتوں کے لئے ناممکن) کام ہے۔ تو شہنشاہ مرزا ایسا معمّا تھے جو حل ہونے کے بعد بھی معمّا ہی رہے۔

گیارہ بارہ برس پیشتر میرے دو دوست ڈاکٹر عمیری کشور اور زیب غوری یوسف ظفر کے ساتھ زندہ تھے۔ ڈاکٹر لکھنؤ ہی میں مقیم تھے، زیب کان پور سے لکھنؤ آتے رہتے تھے۔ شمس الرحمٰن فاروقی بھی لکھنؤ میں تعینات تھے۔ ان کی صحبتوں میں شہنشاہ مرزا اور ان کے حلقے کے نوجوان ادیب وقار ناصری، قمر احسن، انیس اشفاق، شاہ نواز قریشی، محمد مسعود وغیرہ بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ پھر وہ صحبتیں برہم ہوئیں۔ فاروقی کا تبادلہ دلی کو ہو گیا، زیب اپنی ملازمت کے مسائل میں الجھ گئے، ڈاکٹر (۹ جولائی ۱۹۷۹ء) کو وفات پا گئے اور لکھنؤ کی ادبی رونق شہنشاہ مرزا اور ان کے ساتھیوں کے دم سے رہ گئی۔ ان نوجوانوں میں شہنشاہ مرزا کی حیثیت سب سے نمایاں تھی اس لئے کہ وہ غالب کے لفظوں میں "گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ" تھے۔ وہ ایک ایک کی ادبی سرگرمیوں کی خبر رکھتے اور ان میں سے کوئی کچھ لکھتا تو اسے دوسروں کو سنوانے کے لئے بے چین ہو جاتے تھے، اس کے بارے میں دوسروں کی رائے پوچھتے اور خود بھی رائے دیتے جو کبھی کبھی اتنی حوصلہ شکن ہوتی کہ لکھنے والا مرزا کی نقادی سے ناراض ہو جاتا لیکن خود مرزا سے راضی رہتا۔ اس زمانے میں بھی شہنشاہ مرزا بہت پڑھتے تھے اور اس معاملے میں صرف وقار ناصری ان سے ٹکر لے سکتے تھے لیکن خود مرزا کو اپنا پڑھنا کم معلوم ہوتا تھا۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب انھوں نے شاہ آباد میں ملازمت حاصل کرنے کے بعد وہاں سے مجھے خط لکھے۔ ان خطوں کے کچھ اقتباس دینا اس لئے ضروری ہے کہ ان سے مرزا کی افتادِ مزاج کے علاوہ ان کے طرزِ گفتگو کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ان خطوں کو پڑھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے اور ان کے دوسرے ملنے والوں کو بھی ایسا ہی محسوس ہوگا، کہ شہنشاہ مرزا سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔

> "یہاں کی زندگی میں بہت ٹھہراؤ ہے۔ لکھنؤ جیسے شہر سے آنے والے کو کچھ دنوں تک تو یہاں بہت ہی عجیب سا محسوس ہوگا کیوں کہ اس کے لئے زندگی کا مطلب ہی کچھ اور ہوتا ہے جب کہ یہاں زندگی دوسرے ہی معنوں میں سمجھی جاتی ہے۔ یہاں سرِ شام زندگی کی سرگرمیاں ختم ہو جاتی ہیں لوگ اپنے اپنے گھروں میں گھس رہتے ہیں اور شاید جلد کھانا کھا کر بستر کو آباد کر دیتے ہیں۔ مگر میں نے یہاں ابھی نہیں دیکھا کہ بہت صبح زندگی جاگ اٹھتی ہو۔ یہاں شام بھی جلدی ہو جاتی ہے اور صبح بھی دیر سے ہوتی ہے۔ یہ ایک عجیب قصبہ ہے۔ چوں کہ بجلی کا عرصے کے لئے ہوتی ہے اس لئے یہاں کی بیہودہ اور تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ جب بہت اچھا موڈ ہوگا اور آپ اپنی پسند نے کر بیٹھیں گے تو اچانک لائٹ چلی اس وقت اپنی بوٹیاں نوچنے کے سوا سوجھے گا۔ اس لحاظ سے میں اس کم سے بہت ہی عاجز ہوں۔ اب دیکھیے ہوگا تو اس کے بعد جھگڑا لڑاؤں گا کہ کم تبادلہ ہو جائے۔ اگر لکھنؤ مل جائے اگر لکھنؤ نہیں ملتا ہے تو اس کے آس ہی سہی۔ مگر میری دشواری یہ ہے کہ میں جیسے شہر کی زندگی بسر کی ہے۔ میرا ذہن میں جو کچھ بہ آسانی مل سکتا ہے جس ذہنی کرب میں مبتلا ہونے کی ضرورت اسے حاصل کر لو۔ اور جو نہ مل سکے کرو۔ چنانچہ اکادمی کی ملازمت بھی میں مل گئی تھی کہ کسی نے مجھے اطلاع دی یہ جگہ نکلی ہے، تم درخواست دے درخواست بھیج دی۔ پھر اکادمی کی امتحان میں اور انٹرویو میں بلایا گیا تو میں انٹرویو اور امتحان دے کر چلا آیا۔ نامہ بھیج دیا گیا تو میں چپ چاپ اکادمی میں چلا آیا۔ عمر صاحب کے زمانے میں تفریحیں بہت آتی تھیں، مگر میں پڑا رہا۔ پھر عمر صاحب کا دور ختم ہوا تو اندازی میں سب سے زیادہ سینیئر ہونے مل گئی اور میں نے اسے بھی اسی انداز۔ مگر میں حد سے زیادہ بے چین یہاں سے گلو خلاصی نصیب ہو۔ مگر نکل سکی اور میں جہاں تھا وہیں پڑا ر گورنمنٹ ڈگری کالج میں تقرر کے۔

تھی۔ ایسی درخواستیں تو آدمی بہت بھیجتا ہے
چل جاتا ہے۔ چنانچہ میں بھی بھول چکا تھا۔
یک دن مجھے یہاں تقرر نامہ مل گیا اور میں یہاں
آیا۔ اسی طرح اگر کبھی میرا تبادلہ ممکن ہوا تو
ملتا ہے ورنہ دوسرے حضرات جس طریقے پر
تے ہیں یا جس کے لئے مجھے مشورے دیے
اس پر عمل کر سکنا شاید ہی میرے لیے ممکن ہو۔
خیر ان باتوں کو چھوڑئیے۔ یہ سب تو فضول
ہیں۔ ادھر میں نے قمر احسن اور حمید سہروردی
تابیں پڑھی ہیں۔ اور بھی دو ایک نئے افسانہ
دوں کی کتابیں دیکھ رہا ہوں ...‘‘

۲۳ مارچ ۱۹۸۲ء

’’اس ملازمت سے مطمئن تو خیر کیا ہوں،
یہ سمجھئے کہ اپنا وقت گزار رہا ہوں۔ مگر چوں کہ
بھی قصباتی زندگی کبھی دیکھی ہی نہیں تھی اور نہ ہی
سے متعلق کچھ جانتا تھا اس لئے یہاں رہ
دوں کی طرح بوریت نہیں محسوس کرتا۔ پھر لکھنے
نے کے لئے اتنا وقت مل جاتا ہے کہ میں خوش
ہوں۔ پھر بھی مجھے یہ شکوہ ضرور ہے کہ قدرت
ن رات کی تقسیم ہی کچھ ایسے ناقص ڈھنگ سے
ہے کہ حسب منشا پڑھنے لکھنے کے لئے وقت ہی
مل پاتا۔ لکھنؤ میں تو یہ حال تھا کہ میں خود بھی
ہو رہا تھا اور وقت کو بھی غارت کر رہا تھا کیونکہ
وں کی ملازمت کچھ بھی کرنے کے لئے ذرا بھی
ت نہیں دیتی تھی۔ گزشتہ دس برسوں میں
، سے میں نے اکادمی کی ملازمت اختیار کی ہے
نے تاکے برابر پڑھا ہے۔ اس کے مقابلے میں ان
مہینوں میں لکھنے پڑھنے کے لئے اچھا خاصا وقت
نیا ہے تاہم میں ابھی بھی مطمئن نہیں ہوں اور چاہتا
وں کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ مجھے لکھنے پڑھنے
علاوہ کوئی بھی دوسرا کام نہ کرنا پڑے۔ اتفاق سے

یہاں نواب کا محل جنگل میں واقع ہے جو برسوں سے بالکل
ویران پڑا ہے۔ وہاں اگر آپ چلے جائیے تو دن بھر
خوب دل لگا کر پڑھیئے، کوئی ایک لمحہ کے لیے بھی
ڈسٹرب کرنے نہیں آئے گا۔ ہاں کبھی کبھی کبوتروں کے
غٹرغوں، چڑیوں کی چہکار اور کسی پرندے کی آواز آپ
کے مطالعے میں ضرور خلل ڈالے گی، درست۔ وہاں کا
جیسا پرسکون ماحول میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ اب مشکل
یہ ہے کہ میرا جی یہ چاہتا ہے کہ مجھے وہاں روز جا کر
بیٹھنے کی آزادی نصیب ہو جو بہرحال یہاں ممکن نہیں۔
چھٹیوں میں بھی وہاں جا کر دن بھر بیٹھنا اور پڑھنا
بہرحال ممکن نہیں ہے کیوں کہ میں نے جو ایک سب سے
بڑی حماقت کی وہ یہ ہے کہ بیوی کو بھی ہمراہ لیتا
آیا۔ اب ظاہر ہے کہ آدمی بیوی کا لحاظ کرے کہ مطالعے
کا شوق پورا کرے۔ ظاہر ہے کہ اس تنہا صورت کے
بھی اپنے مسائل ہیں جن سے انکار ممکن نہیں۔ اس
لئے جو موقع مل جاتا ہے اسی پر اکتفا کر لیتا ہوں۔
اب اگر تبادلہ واقعی لکھنؤ ہو جائے گا تو بہت اچھا
ہوگا۔ جہاں تک میری قناعت پسند طبیعت کا سوال
ہے تو اس حد تک تو میں واقعی قانع ہوں کہ کسی چیز
کے لئے طویل جد و جہد میرے بس کے باہر ہے۔ اب
مسعود صاحب وغیرہ نے میرے تبادلے کے لئے
کچھ کوششیں شروع کی ہیں۔ اگر ہو جائے گا تو کیا
کہنا، نہیں ہوگا تو ظاہر ہے کہ میرا کیا اختیار ہو سکتا
ہے؟ تاہم میں ضرور دل سے چاہتا ہوں کہ میں لکھنؤ
ہی آ جاؤں۔ اس ملازمت میں لکھنؤ میں رہ کر
زیادہ خوش رہوں گا اور کام کرنے کا بھی زیادہ
موقع ملے گا۔

... میں نے مقالے کو سات ابواب میں تقسیم کر دیا
ہے۔ مقالے کا عنوان اب اس طرح قرار پایا ہے: ’’اردو
ناول میں عصری اور سیاسی رجحانات کا مطالعہ — پریم چند
تا حال‘‘۔ Synopsis کو میں نے کافی وضاحت کے

ساتھ لکھ لیا ہے۔ لکھنؤ آؤں گا تو ہمراہ لیتا آؤں گا۔‘‘

(۱۳ اپریل ۱۹۸۲ء)

ذاتی مسائل پر گفتگو کرتے کرتے ادبی موضوعات پر آ جانا اور
ادبی گفتگو میں پڑ کر ذاتی مسائل کو بھول جانا شہنشاہ مرزا کی عادت تھی
اور اسی علمی سلسلے کے سلسلے میں وہ شاہ آباد سے بارہ بنکی اور بارہ بنکی سے
لکھنؤ آئے اور اب انھوں نے بے تحاشا لکھنا پڑھنا شروع کر دیا۔
اسی دوران وہ قلبی تکلیف میں مبتلا ہو گئے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ
تکلیف خطرناک نوعیت کی ہے مگر وہ اس کا ذکر اس طرح کرتے
تھے جیسے کسی اور مریض کا حال بیان کر رہے ہوں۔ مرض نے شدت
اختیار کی تو ان کی ادبی سرگرمیوں میں کمی ہونے کے بجائے اور شدت
پیدا ہو گئی۔ احباب شکایت کرتے تھے کہ مرزا کو اپنی حالت کا
اندازہ نہیں ہے لیکن مرزا کو اپنی حالت کا اندازہ تھا اور وہ اپنی
ڈائریوں میں خود کو بتاتے رہتے تھے کہ ان کا وقت قریب آ پہنچا ہے۔
شہنشاہ ادب کے ساتھ سنجیدہ ترین دلچسپی رکھنے والو
ں میں تھے اور صرف پڑھتے ہی نہیں تھے، لکھتے بھی تھے۔ ان کے اندر
خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی اور انھوں نے کئی اچھی چیزیں لکھیں، پھر
بھی ان کا تشکیلی دور تھا۔ ان کے ذہن میں بہت سے ادبی منصوبے
تھے اور وہ ان کے بارے میں اپنے دوستوں سے گفتگو کیا کرتے تھے۔
ان کے مرض کے سلسلے میں بھی دوستوں کی تشویش کم ہو گئی تھی اس
لے کہ ان کے آپریشن کے لئے رقم کا بندوبست ہو گیا تھا اور تاریخ بھی
مقرر ہو گئی تھی۔ جب انھوں نے مجھے یہ خوشخبری سنائی تو میں نے
کہا:

’’مرزا صاحب، اب فی الحال مرنے کا پروگرام ملتوی
کیجئے اور آپریشن کی میز تک زندہ پہنچ جائیے۔ اس
کے بعد آپ کو اختیار ہے۔‘‘

اور انھوں نے اپنا باریک قہقہہ لگا کر کہا تھا:

’’جی ہاں، سوچ تو یہی رہا ہوں۔‘‘

لیکن اس سے پہلے عیش باغ لکھنؤ کے گورستان میں ان
کی قبر بن گئی جس پر یہ کتبہ اگرچہ لکھا ہوا نہیں ہے
لیکن پڑھا جا سکتا ہے:

’’پھر ایک دن مجھے یہاں تقرر نامہ مل گیا اور میں یہاں چلا آیا۔‘‘

بقیہ صفحہ ۳۳ - ڈائری کے چند اوراق

ساتھ ہو گیا ہے۔ بہرحال اب صورت حال یہ ہے کہ
دل اور مجھے ابھی زندہ رہنا ہے، کب تک کن مقاصد
سب کچھ بھی مجھے معلوم نہیں اور کچھ بھی معلوم ہو سکنے کے باوجود
اس وقت تک کہ جب تک وقت پورا ہو جائے
سب پورا ہوتا ہے، مجھے قطعی نہیں معلوم۔

ابھی ۵ء کی آمد سے قبل تک میں زندگی سے بھرپور تھا۔
موت کی انتہائی تمنا کرنے کے بعد میں دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ
آیا تھا اور دونوں نے مجھے جیتا جاگتا محسوس کیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ
جب میں خود محسوس کر رہا تھا دوسروں نے بھی محسوس کیا ہو گا
مگر ۵ء اس طرح آیا کہ مجھے قطعی موت کے حوالے کر کے چلا

گیا اور اب میری زندگی میں اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ جب تک جیوں
موت کی راہ دیکھوں۔

ہو سکتا ہے کہ جو صورت حال آج ہے، وہ کل یکسر بدل جائے
اور میں ایک بار پھر زندگی کی طرف پلٹ آؤں، مگر جیسا کہ پہلے ہی
ان سے جھیل کر آدمی زندگی کی طرف کیا آسانی سے لوٹتا ہے؟

تیر اندازی اور کماں داری

شہنشاہ مرزا مرحوم

اردو میں تنقید کا مکتب وہی مدرس چلاتے ہیں، جنھیں اتفاق سے مغرب سے روشنی حاصل کرنے کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ اردو کا ہر قابلِ ذکر نقاد انگریزی ادبیات سے ایم۔ اے کرکے اردو تنقید میں اپنے نام کا سکہ چلانے آتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں مانگے کا اجالا زیادہ ہوتا ہے اور اپنا علم کم۔ ایسے حضرات رچرڈز، ایلیٹ، ریڈ، مڈلٹن مرے، کلینتھ بروکس، نارتھروپ فرائی اور امپسن، ارسطو سے لے کر کروچے، ہیگل، فرائڈ اور ژونگ تک کے حوالے دیئے بغیر نہیں تھکتے۔ بعض اوقات ان کے مضامین ان حوالوں سے اتنے بوجھل ہوتے ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ مانگے کے اس اجالے میں ان کی اپنی روشنی کی کوئی کرن شامل ہے بھی یا نہیں؟ ایسا نہیں ہے کہ مغربی ناقدین اور مفکرین کے حوالے دینا کوئی بے جا بات ہو، لیکن اس کی کوئی حد ضرور ہونی چاہیئے۔ محض علمیت کا مظاہرہ کرنے کا دور اب بیت چکا ہے۔ اب تو ایسا دور آیا ہے کہ علمیت ہوگی تو وہ اپنے آپ کو منوا لے گی، اس کے لیے مظاہرہ کرنے کی قطعی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔ قرۃ العین حیدر نے حال ہی میں اردو کے نقادوں سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ انھیں اپنی اپنی مسندوں پر عزت و احترام سے بیٹھنے کے لیے بہت سی پوتھیاں باچنی ہوں گی۔ درست لیکن پوتھیاں باچنے کا مطلب نہیں ہے کہ آپ سب کچھ وہیں سے اخذ کر لیں اور اپنی طرف سے کچھ بھی نہ کہیں۔

پچھلے چند برسوں سے اردو کے بعض جدید نقادوں نے تنقید کو میدان کارزار بنا دیا ہے اور کماں داری و تیر اندازی کا ایسا مظاہرہ کیا جا رہا ہے کہ میدانِ ادب میں کسی کے لیے بھی بلا زخم کھائے رہنا محال ہوا جا رہا ہے۔ وارث علوی، سلیم احمد، شمس الرحمان فاروقی وغیرہ مختلف نقادوں نے اس فنِ شریف میں اپنے اپنے ڈھنگ سے خوب خوب نام کمایا ہے اور اب اس لشکر میں ایک نئے تیر انداز کا اضافہ ہوا ہے، یہ فضیل جعفری صاحب ہیں جو بنیادی طور پر ایک تخلیقی فن کار ہیں، لیکن جنھیں تنقید سے بھی اتنی ہی سنجیدگی سے دلچسپی ہے، جتنی شاعری سے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ "چٹان اور پانی" کے نام سے عرصہ ہوا شائع ہوا تھا، اب جدید تنقید پر ان کا ایک بھرپور اور نہایت پُر مغز مقالہ "کمان اور زخم" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، اس موضوع پر اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے جسے پڑھ کر خوش گوار قسم کی حیرت اور ناگوار قسم کی کیفیات سے بیک وقت دوچار ہونا پڑتا ہے۔ خوش گوار حیرت تو اس لیے ہوتی ہے کہ بیشتر جگہوں پر انھوں نے مروّت اور مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر غیر جانب دارانہ انداز میں معاصر نقادوں کا محاسبہ کیا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے میراجی کی تنقیدی بصیرت کو تقریباً دریافت کیا ہے اور وزیر آغا جیسے ممتاز نقاد کے تضادات کو بخوبی اجاگر کیا ہے، اس لیے یہ کتاب پڑھ کر جی خوش ہو جاتا ہے، لیکن یہی کتاب ہمیں ناگوار کیفیات سے بھی دوچار کرتی ہے۔ ایک طرف تو غیر جانب دار بنتے ہیں اور دوسری طرف ان کے یہاں بھی پاس داریاں کسی نہ کسی حیثیت سے جگہ پا جاتی ہیں، جن کی انھوں نے کھل کر مذمت کی ہے۔ پھر جملے بازی فضیل جعفری کے یہاں بھی اسی طرح نمایاں ہے (اور جسے تنقید کے حق میں زہرِ قاتل سمجھنا چاہیئے) جس طرح اردو کے ہر اچھے نقاد کی یہ کمزوری بن کر رہ گئی ہے۔ انگریزی ادیبوں کے غیر ضروری حوالوں کی بھرمار کرکے اپنی علمیت کا مظاہرہ کرنے کی لالچ سے بھی فضیل صاحب خود کو روک نہیں پائے ہیں۔

یہ کتاب بہت سے متنازعہ فیہ مسائل اٹھاتی ہے۔ جگہ جگہ ہمیں جھنجھوڑتی ہے، متاثر کرتی ہے، للکارتی ہے اور کہیں کہیں مشتعل بھی کر دیتی ہے۔ ایک طرف تو فضیل جعفری اپنے لہجے کو متین اور مدلل بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ جملے بازی اور غیر سنجیدہ اور غیر تنقیدی اسلوب اختیار کرنے سے بھی خود کو نہیں روک پاتے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ جس طرح "شعر غیر شعر اور نثر" (شمس الرحمان فاروقی) اور "نئی نظم اور پورا آدمی" (سلیم احمد) کی اشاعت نے اردو تنقید میں ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا، اسی طرح فضیل جعفری کی یہ کتاب بھی بہت سے سوالات اٹھاتی ہے جو اپنے آپ میں خاصے ہنگامہ خیز اور نہایت اہم ہیں۔

۲

فضیل جعفری صاحب کا یہ کہنا ہے کہ "کمان اور زخم" میں "تمام جدید نقادوں کے بجائے صرف چند بنیادی اور اہم تنقیدی رویوں سے ہی بحث کی گئی ہے۔"[۱] چنانچہ اس مقالے میں بعض جدید نقادوں کا ذکر قدرے تفصیل سے، بعض کا ضمناً اور بعض کا ذکر بالکل نہیں آیا ہے۔ جن لوگوں کے ذکر سے گریز کیا گیا ہے۔ ان میں خلیل الرحمٰن اعظمی بھی شامل ہیں۔ انھوں نے اپنی تنقیدی تحریروں کے ذریعہ ترقی پسندی سے جدیدیت کی سمت فیصلہ کن انحراف کیا تھا اور اس دور میں یہ ایک اہم بات سمجھی گئی تھی، لہٰذا انھیں نظرانداز کرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ شمیم حنفی ایک خاص قسم کے تنقیدی رویے کے حامی ہیں، اس کا لحاظ کیے بغیر جدید تنقید کو بخوبی سمجھنا آسان نہیں۔ محمود ہاشمی، محمود ایاز، وحید اختر، عمیق حنفی، افتخار جالب، انتظار حسین وغیرہ مختلف حضرات نے جدید تنقید کو کچھ نہ کچھ دیا ہی ہے۔ اگر ان حضرات کا بھی تفصیلی تذکرہ کر دیا جاتا تو شاید کتاب کی افادیت بڑھ ہی جاتی۔ ویسے تو یہ مصنف کا حق ہے کہ وہ جس کے بارے میں چاہے لکھے اور جس کے بارے میں چاہے نہ لکھے، لیکن جدید تنقید پر ایک مقالہ لکھنے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس کے متعلق کوئی پہلو چھوٹنے نہ پائے۔ فضیل صاحب کے انتخاب کے انداز سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعض حضرات کو نظرانداز اور بعض کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔ یہیں یہ غیر جانب داری پر حرف آتا ہے اور خوش گوار حیرت ناگوار کیفیت سے دوچار ہو کر رہ جاتی ہے۔

جدید تنقید کے پیش روؤں میں فضیل صاحب، فراق گورکھپوری، کلیم الدین احمد، میراجی اور حسن عسکری کا شمار کرتے ہیں جن کے یہاں انھیں "جدید نقطۂ نظر کی کہیں ہلکی اور کہیں گہری پرچھائیاں" نظر آتی ہیں۔ یہ انتخاب بہت اختلافی ہے اور اس کے پیچھے کوئی واضح اصول کارفرما نظر نہیں آتا۔ کلیم الدین نے اردو تنقید میں بت شکنی کی ابتدا کی تھی، انھوں نے شاعری کی تنقید کے اصول وضع کیے اور عملی تنقید کی بنیاد ڈالی۔ انھیں جدید اردو تنقید کا پیش رو قرار دینا تو مناسب معلوم ہوتا ہے، لیکن فراق صاحب کا معاملہ بہت اختلافی ہے۔ ان کے یہاں زیادہ سے زیادہ تاثراتی تنقید کے کہیں اچھے اور کہیں برے نمونے دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ لیکن نئی تنقید کو ان سے کچھ بھی نہیں ملا۔ فراق صاحب کے سلسلے میں فضیل صاحب کو بھی اپنے بیان پر پورا اعتماد نہیں ہے، اس لیے وہ اپنا مقدمہ نہایت کمزور انداز میں یوں پیش کرتے ہیں:

"جدید اردو تنقید جن راستوں پر گامزن ہے، ان کی کچھ جھلکیاں فراق صاحب کی تنقید میں یہاں وہاں مل جاتی ہیں۔"[۲]

۳

میراجی کی شعری حیثیت پر اردو کے ترقی پسند ایسے خیالات کا اظہار کرتے ہیں، جنھیں پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ اچھی اور بڑی شاعری سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ہی ان حضرات میں نہیں کے برابر ہے۔ ان کی تنقیدی اہمیت کو جدید نقادوں نے بھی بری طرح نظرانداز کیا ہے۔ فضیل جعفری کے سر اس بات کا سہرا جاتا ہے کہ انھوں نے پہلی مرتبہ میراجی کی تنقیدی انفرادیت کو دریافت کیا اور جدید تنقید کے معمار کی حیثیت سے ان کی اہمیت کا احساس دلایا۔ میراجی نے عملی تنقید کو بہت آگے بڑھایا ہے۔ انھوں نے اردو والوں کو عالمی جدید ادب کی قدآور شخصیتوں کے کارناموں سے روشناس کرایا ہے۔ فضیل صاحب نے ان سب باتوں کی سمت پہلی مرتبہ توجہ دی۔ انھوں نے اس طرز فکر کی بھی نہایت سختی سے مذمت کی ہے کہ میراجی، ایڈگر ایلن پو اور بودلیئر جیسے فن کاروں کی ذاتی زندگیوں کی بعض معلوم اور فرضی کمزوریوں کو پیش نظر رکھ کر ناقدین طرح طرح کی داستان سرائی کرتے ہیں جس سے ادب کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ انھوں نے خود میراجی کی بھی گرفت کی ہے کہ انھوں نے بلا تحقیق کے بودلیئر کے فرضی سفر بنگال کا حوالہ دے کر ایسے نتائج اخذ کیے جن سے ادب کا کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ وہ بجا طور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کسی فن کار کی شخصی الجھنیں اس کی تنقید میں ہماری کوئی خاص مدد نہیں کر سکتیں۔

عسکری صاحب کی تنقیدی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے فضیل صاحب نے ترقی پسند نقادوں کی اچھی طرح خبر لی ہے۔ ان کا خیال قطعی درست ہے کہ عسکری صاحب نے جن علامت پسند شاعروں کے خیالات سے اردو والوں کو روشناس کرایا، ان سے استفادہ کیے بغیر "جدید ادب کی جمالیات ترتیب نہیں دی جا سکتی تھی۔"[۳] فضیل صاحب کو عسکری صاحب سے یہ شکایت ضرور ہے کہ انھوں نے اردو میں رائج ترقی پسندی ہی کو اصل مارکسزم کیوں سمجھا۔ عسکری صاحب کے سلسلے میں یہ غلط فہمی عام ہے کہ وہ مارکسیت کے مخالف تھے جب کہ انھوں نے اپنے مضمون "مارکسیت اور ادبی منصوبہ بندی" میں صاف طور پر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انسانی تاریخ میں مارکسیت کی اہمیت مسلم ہے۔ مارکسیت کی اہمیت کے اعتراف کے بعد جب وہ مارکسی ادب کے تضادات اور ترقی پسندوں کے کھوکھلے پن کو نمایاں کرتے ہوئے یہ تک کہہ اٹھتے ہیں کہ ان کے استعمال کیے ہوئے کسی لفظ کو ان معنوں میں نہ دیکھا جائے جن معنوں میں وہ مارکسیوں کے یہاں استعمال ہوتا ہے، کیونکہ وہ لوگ لفظوں کو تنگ معنی میں استعمال کرتے ہیں، تو فضیل صاحب کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اردو کے ترقی پسند ادیبوں کو ہی اصل مارکسسٹ سمجھتے ہیں۔ عسکری صاحب نے ایک زمانے میں ترقی پسندوں کی حمایت میں زوردار مضامین بھی لکھے تھے مگر چونکہ وہ ہمیشہ نئے تجربات کا ساتھ دینا پسند کرتے تھے، اس لیے انھوں نے

جب ترقی پسندوں کو روایتی راہوں پر چلتے دیکھا تو ان سے الگ ہو گئے۔ وحید اختر صاحب نے عسکری صاحب پر کیچڑ اچھالنے کی جو کوشش کی تھی، اس کی خاص وجہ غالباً ادبی روایات سے متعلق بحث تھی، جس کی تفصیل میں جانے کا یہاں محل نہیں۔ عسکری صاحب نے ادبی روایات اور اسلامی ادب سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا تھا، ان سے اختلاف کی بہت زیادہ گنجائش ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنی علمیت کے بدولت اتنے قد آور ثابت ہوتے ہیں کہ ترقی پسندوں کے لیے ان کے آدھے قد کے برابر پہنچنا بھی محال ہے۔

باقر مہدی اور وارث علوی صاحبان ہمارے دور کی دو انتہائی اہم مگر متنازعہ فیہ شخصیتیں ہیں۔ ان دونوں کے دم سے ادب میں بہت سے ہنگامے اٹھے ہیں۔ چوں کہ دونوں ہی حضرات انتہا پسند واقع ہوئے ہیں، اس لیے ان پر قلم اٹھاتے وقت بھی لوگ انتہا پسندی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ فضیل صاحب نے دونوں کے تنقیدی رویوں سے بہت کھل کر اور غیر جانب دارانہ انداز میں بحث کی ہے۔ باقر مہدی چھوٹے شہروں میں رہنے والے شاعروں کی شاعری کو محض اس لیے چھوٹی شاعری قرار دیتے ہیں کہ انھوں نے صنعتی شہروں کے مسائل نہیں دیکھے۔ فضیل صاحب نے باقر مہدی کے اس خیال سے اختلاف ظاہر کیا ہے اور ان کے تضاد کو نمایاں کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ وہ اپنے مضامین میں موضوعاتی سطح پر کی جانے والی سرکشی کو تو خوب نمایاں کرتے ہیں لیکن ہیئتی سطح پر احتشام، جالب جیسے شعراء نے جس سرکشی کا مظاہرہ کیا ہے، باقر مہدی اسے نظر انداز کر جاتے ہیں۔ مگر فضیل صاحب باقر مہدی کے ریڈیکل نظریات کی اہمیت کو مانتے ہیں اور ان کی ضرورت کا اعتراف کرتے ہیں۔

وارث علوی کے سلسلے میں فضیل صاحب کا رویہ یہ ہے کہ وہ ان کے تضادات کو بخوبی نمایاں کرتے ہیں، ان سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں، مگر ان کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ فضیل صاحب کا خیال یہ ہے کہ وارث لکھتے وقت اپنے موضوع پر کبھی نہیں رکتے، عموماً دو ٹوک اور جذباتی قسم کے فیصلے دیتے ہیں۔ سنجیدہ ادبی موضوعات کو غیر سنجیدہ انداز میں پیش کرتے ہیں اور ایلیٹ اور آڈن ان کی خاص کمزوری ہیں۔ سنجیدہ موضوعات پر بات کرتے وقت غیر سنجیدہ رویہ اختیار کرنا تنقید کے لیے سم مضر ہے۔ مگر یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ خود فضیل جعفری بھی اس معاملہ میں وارث علوی کی ہی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"وارث علوی سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ ادب کے دسترخوان پر ایلیٹ کے بغیر لقمہ نہ توڑیں اور ایلیٹ کو چٹنی کے طور پر استعمال کریں گے۔" ٥

کاش فضیل صاحب اس غیر سنجیدہ لب و لہجہ اور خالص غیر تنقیدی انداز سے بچنے کی کوشش کرتے۔

٣

فضیل صاحب نے جن دو نقادوں سے اپنا زبردست اختلاف ظاہر کرنے کے لیے اپنی کتاب کے بڑے حصے کو وقف کر دیا ہے، وہ سلیم احمد اور وزیر آغا ہیں۔ وزیر آغا کے متعلق خاص طور پر انھوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اس کا پاکستان میں سخت ردعمل ہوا ہے اور جواب میں فضیل صاحب کو اپنے دفاع میں "داغدار گھوڑے" جیسا نہایت کمزور مضمون لکھنا پڑا۔

جہاں تک سلیم احمد کا سوال ہے تو ان کی اہمیت سے اس کے باوجود انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے یہاں فضیل صاحب کی بتائی ہوئی بیشتر کمزوریاں مل جاتی ہیں۔ ان کی تنقید کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسی بات کہیں جسے پڑھ کر لوگ چونک اٹھیں اور ان کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ انھوں نے عسکری صاحب سے بہت کچھ سیکھا ہے جس کی وجہ سے ان کے یہاں جگہ جگہ عالمانہ انداز نمایاں ہوا ہے، مگر بہت سی باتیں جو سلیم صاحب عسکری صاحب سے نہیں سیکھ سکے اور جن کی نشان دہی فضیل صاحب نے کر دی ہے، ایسی ہیں کہ جن کی وجہ سے سلیم احمد کی تنقید میں ایک آنچ کی کمی رہ گئی ہے۔ اس کے باوجود ہم فضیل صاحب کے اس خیال سے اتفاق نہیں کر سکتے کہ سلیم احمد اسٹنٹ باز نقاد ہیں۔ فضیل صاحب کا تضاد یہ ہے کہ وہ انتظار حسین کے اس خیال سے بھی اتفاق کرتے ہیں کہ سلیم احمد کی تحریریں بہت سے سوالات پر نئے سرے سے غور کرنے پر مجبور کرتی ہیں اور انھیں ان کے یہاں صداقت کی کمی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اصل میں کسی کے بارے میں بھی دو ٹوک انداز میں صیغۂ جاتی بیان صادر کرنا فضیل صاحب کو خوب آتا ہے۔ جب اس بیان بازی میں وہ انتہا پسندی کا شکار ہو جاتے ہیں تو خود بھی اسی کمزوری کا شکار ہو جاتے ہیں جس کے لیے اردو کے کسی نقاد کی گرفت کرنے سے وہ نہیں چوکتے۔ مثال کے طور پر انھیں بجا طور پر سلیم احمد سے یہ شکایت ہے کہ وہ چٹ پٹے لہجے میں غیر منطقی باتیں کہہ کر قاری کی آنکھ میں دھول جھونکنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہی چٹ پٹا اور غیر منطقی لہجہ خود فضیل صاحب کو بھی بہت پسند ہے وہ سلیم احمد کی گرفت اس انداز میں کرتے ہیں:

"ان کے لہجے کا یہ عشق نما بون والا مرچ مسالے سے بھر پور چٹ پٹا پن غیر منطقی باتوں کو خالص منطقی انداز میں پیش کرنے کا سلیقہ"

> بعض اوقات بے حد معمولی خیالات کو پُرشکوہ الفاظ کا جامہ پہنا کر قاری کی آنکھ میں دھول جھونکنے کی کوشش نیز قاری کی ذہنی مدافعت کو قبل از وقت بھانپ کر فرانڈ سے لے کر مقدس کتابوں تک کے حوالوں کی بھرمار کر کے قاری کو ڈرانے، دھمکانے اور پھر اسے چاروں شانے چت کر دینے والا اسلوب وغیرہ وہ خصوصیتیں ہیں جن کی بنا پر ہم انھیں یقیناً ایک خاصا کامیاب ادبی دلال کہہ سکتے ہیں۔" ؎

رہے کہ فضیل صاحب کا مذکورہ لہجہ نہ تو تنقید کی سنجیدہ فضا کے لیے مناسب و موزوں ہے، اور نہ ہی وارث علوی اور سلیم احمد کے مخصوص لہجے سے کچھ زیادہ مختلف قسم کا انداز اختیار کیے بغیر بھی وہ اپنی بات سنجیدگی سے کہہ سکتے تھے، لیکن اس کے لیے جس تحمّل، شائستگی اور نفاست کی ضرورت ہے اس سے فضیل صاحب عاری نظر آتے ہیں۔

وزیر آغا کی تنقید پر فضیل صاحب نے سب سے زیادہ توجہ صرف کی ہے اور ان کے ماننے والوں کو کافی صدمے سے دوچار کیا ہے۔ فضیل صاحب آغا کی علمیت اور وسعتِ مطالعہ کے قائل ہیں۔ اُن سے اپنے شدید اختلاف کے باوجود انھوں نے جگہ جگہ وزیر آغا صاحب کی تعریف بھی کی ہے۔ انھیں وزیر آغا سے شکایت یہ ہے کہ وہ یونگ کی نفسیات سے غیر معمولی دلچسپی، اجتماعی لاشعور اور آرکی ٹائپ سے گہری وابستگی اور آریائی تہذیب سے اپنے شغف کی وجہ سے اپنی تنقید میں نفسیاتی تلازمات کا اتنا زیادہ استعمال کرتے ہیں کہ وہ بوجھل ہو کر رہ جاتی ہے۔ پھر وزیر آغا کی زبان بھی خاصی مغلق ہوتی ہے۔ جو تنقید کے لیے کسی بھی طرح مناسب نہیں۔ یہ درست ہے کہ مختلف علوم کے مطالعہ سے تنقید میں وسعت آتی ہے لیکن دوسرے علوم سے ایک حد تک استفادہ ہی مفید ہو سکتا ہے۔ وزیر آغا کی مخصوص کمزوریوں کا محاکمہ کرتے ہوئے فضیل صاحب کہتے ہیں:

> "اُن کی تنقید میں مختلف علوم کے ماہرین کی گھن گرج تو سنائی دیتی ہی ہے لیکن وہ تنقید کو تخلیق کی ہی ایک شکل قرار دینے کے بہانے تشبیہوں، استعاروں، تلمیحوں، نفسیاتی قلابازیوں، تاریخی حوالوں اور پھر ان سب کے ساتھ مشکل، مغلق اور ٹکنیکی الفاظ و تراکیب کا انبار لگا کر کچھ ایسا سماں باندھتے ہیں کہ قاری کی آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں اور وہ یہ سمجھنے سے قطعاً قاصر رہتا ہے کہ کب کونسی چیز زمیں مادر سے برآمد ہوئی اور کب پھر اسی سمت واپس چلی گئی۔" ؎

کچھ وزیر آغا کی نیم نفسیاتی، نیم دیومالائی اور نیم اساطیری تنقید سے اپنا سخت اختلاف زیادہ تر انتہائی جارحانہ انداز میں اور کہیں کہیں مناسب طریقے سے ظاہر کرتے ہوئے فضیل صاحب اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

> "تنقید بجائے خود ایک ترقی یافتہ علم ہے اور اُسے کسی دوسرے علم کا زرخرید غلام بنانے کی کوشش نہ تو مستحسن ہے اور نہ ہی بارآور ثابت ہو سکتی ہے۔" ؎

۵

فضیل جعفری صاحب گوپی چند نارنگ پر قلم اٹھاتے وقت عجیب کشمکش کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اچانک ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تیر اندازی کے سارے جوہر بھول کر وہ خود ہی اپنے تیر کا شکار ہوتے جا رہے ہوں۔ انھوں نے اپنی کتاب کے ابتدائی صفحات میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ بیدی صاحب باقر مہدی کی کمزوری ہیں اور سرور صاحب شمس الرحمان فاروقی کی کمزوری بنے ہوئے ہیں۔ اگر یہ درست ہے تو یہ بھی درست ہے کہ ڈاکٹر نارنگ فضیل جعفری کی کمزوری بن گئے ہیں۔ ابھی تک وہ تمام ناقدین کے سلسلے میں خاصا جارحانہ رویّہ اختیار کیے ہوئے تھے اور سبھی کے خلاف فیصلے صادر کر رہے تھے، لیکن نارنگ کے سلسلے میں اچانک انھیں اپنے لہجے کو بدلنا پڑا۔ انھیں نارنگ کو واحد اور قابلِ ذکر جدید نقاد ثابت کرنے کے لیے فضیل صاحب کو ان کے سلسلے میں ایک ایسا تذبذب بھرا انداز اختیار کرنا پڑا جو خاصا تشکیک آمیز بھی ہے۔ نارنگ کے سلسلے میں وہ اپنی بات یوں شروع کرتے ہیں:

> "میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو ایک اہم جدید نقاد سمجھتا ہوں۔" ؎

بھلا اس امر سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن ممدوح کی کچھ صفات بیان کی جاتی ہیں، بعد میں تعریفی کلمات ادا کیے جاتے ہیں۔ فضیل صاحب کو نارنگ کے اسلوبیاتی نظریے سے اختلاف ہے، مگر یہ بات وہ کھل کر نہیں کہتے۔ وہ تیزی اور طرّاری جو فضیل صاحب نے وارث اور باقر سے لے کر سلیم احمد اور وزیر آغا تک کے لیے اختیار کر رکھی تھی یہاں نہ صرف یہ کہ رخصت ہو جاتی ہے، بلکہ وہ مذبذب ہو کر تضاد بیانی کا شکار ہو جاتے ہیں، ایک زبان سے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ "میں یہ نہیں مانتا کہ اسلوبیات کا براہِ راست موضوع محض ادب ہے۔" ؎ اور دوسری زبان سے انھیں یہ بھی کہنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ "ڈاکٹر نارنگ اسلوبیات اور زبان کے درمیان موجود جس اٹوٹ رشتے کی بات کرتے ہیں، اس سے مجھے اختلاف نہیں۔" ؎ پھر آگے چل کر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عروض کی طرح اسلوبیات بھی ایک ایسا سود خود پیمانہ ہے جس کی مدد بہت کچھ

سمجھ کر لینی چاہیئے ۔[۱۳۲] صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ فضیل صاحب ذاتی طور پر اسلوبیاتی تنقید کو پسند نہیں کرتے، مگر وہ یہ بھی نہیں کہنا چاہتے کہ نارنگ نے اسلوبیاتی تنقید کو اختیار کر کے اپنے دائرے کو محدود کر لیا۔ لہٰذا وہ ایک درمیانی راستہ نکالتے ہیں :

مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر نارنگ نے اسلوبیاتی طرزِ تنقید کی زبردست نظریاتی مدافعت کرنے کے باوجود اس طریقۂ کار کو اپنے چند مضامین تک ہی محدود رکھا ۔"[۱۳۳]

فضیل صاحب کے اس رویّے سے یہی پتہ چلتا ہے کہ نقّاد کتنا ہی غیر جانب دار کیوں نہ بننا چاہے، اُسے کہیں نہ کہیں پاس داریوں کا لحاظ رکھنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے ۔ یہاں یہ بیان کرنا مقصود نہیں ہے کہ نارنگ صاحب کی جدید نقاد کی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں، ان کی اہمیت سے کون انکار کرے گا وہ فکشن کے ایک بڑے نقاد ہیں۔ فضیل صاحب نے بھی بجا طور پر اس امر کا اعتراف کیا ہے، مگر بوجوہ وہ نارنگ صاحب کی کمزوریوں کا ذکر کرنے سے گریز کرتے ہیں، اور اگر کرتے بھی ہیں تو قدرے نرم لہجے میں :

حقیقت یہ ہے کہ نارنگ صاحب کا تنقیدی ذہن تو یقیناً بنیادی طور پر تجزیاتی ہے، لیکن، چونکہ وہ ایک بے حد مصروف آدمی ہیں، اس لیے مطالعہ سے اپنی تمام تر دلچسپی یا یوں سمجھئے کہ اپنے تمام تر وسیع مطالعہ کے باوجود بسا اوقات ٹھوس تجزیاتی مطالعہ کے لیے وقت نہیں نکال پاتے ۔"[۱۳۴]

فضیل صاحب نے اگر کسی جدید نقاد کا سب سے زیادہ توازن کے ساتھ اور نہایت مدلّل انداز میں محاکمہ کیا ہے تو وہ شمس الرحمان فاروقی ہیں ۔ فاروقی صاحب کی عظمت کو وہ پہلے ہی تسلیم کر لیتے ہیں اور ان کی تنقیدی کاوشوں کو قابلِ رشک قرار دیتے ہیں۔ اس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوگا کہ فاروقی صاحب نے جدید تنقید کی سمت و رفتار متعین کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے ۔ چنانچہ فضیل صاحب نے فاروقی کے تنقیدی رویّے کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ تنقید میں ایسی قدروں کو دریافت کرتے ہیں جن کا براہِ راست ادب سے تعلق ہو وہ فاروقی صاحب کے مقالے، شعر، غیر شعر اور نثر کی بجا طور پر بہت تعریف کرتے ہیں ۔ وہ اس کے دو تہائی حصّے سے اتفاق کرتے ہوئے جزوی طور پر کہیں کہیں اپنا اختلاف بھی ظاہر کرتے ہیں ۔ ان کا خیال یہ ہے کہ فاروقی صاحب نے شعرفہمی کے لیے کچھ بنیادی اصول وضع کیے اور اچھی شاعری کو بری شاعری سے ممیز کر کے دکھایا۔ فاروقی نے ترسیل اور ابلاغ کے مسائل پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے، فضیل صاحب انھیں بھی قبول کرتے نظر آتے ہیں، مگر انھیں فاروقی صاحب سے دو مقامات پر اختلاف محسوس ہوتا ہے ۔ ایک منزل تو وہ ہے جب بقول فضیل صاحب، فاروقی، یگانہ اور فراق جیسے شاعروں کو رد کرنے کے لیے انھیں عمودی بیانات پر اتر آتے ہیں، جن کے وہ سخت خلاف ہیں ۔ فراق صاحب کے معاملے میں فضیل، فاروقی کی کوئی بات ماننے پر آمادہ نہیں ۔ فاروقی نے فراق پر جو اعتراضات کیے ہیں، فضیل ان کا اپنے طور پر جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں ۔ ان کا خیال یہ ہے کہ "مرزا غالب کے بعد فراق اردو کے تنہا شاعر ہیں، جنھوں نے بکثرت نئی تراکیب، نئے الفاظ اور نئے موضوعات کو برتا ہے ۔"[۱۳۵] چونکہ یہ ایک طویل اور خاصی اختلافی بحث ہے، جن کی تفصیل میں جانے کا یہاں محل نہیں، اس لیے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ فراق صاحب کی شعری اہمیت کو تسلیم کرنے کے باوجود، فضیل صاحب کا مذکورہ بیان خاصا مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے ۔ اسے بھی اردو نقادوں کے عمومی بیانات کے ذیل میں رکھ کر دیکھنا چاہیئے ۔

البتہ فاروقی نے افسانے کے متعلق جن اختلافی اور متضاد خیالات کا اظہار کیا ہے، ان سے فضیل نے بخوبی اختلاف ظاہر کرتے ہوئے فاروقی کا محاسبہ کیا ہے ۔ ان خیالات کو لے کر ایک زمانہ فاروقی سے اپنے اختلافات کا اظہار کر چکا ہے، فضیل صاحب نے فاروقی کے بعض اعتراضات کا مدلل جواب بھی دیا ہے

۶

فضیل جعفری صاحب نے اردو کے مشہور نقادوں کے بعض غیر ادبی رویّوں سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے :

ایک طرف تو وہ نقاد ہیں، جو فراق اور جوش تک کو یوں تو خاطر میں نہیں لاتے، لیکن جب یہی حضرات نہ صرف غیر اہم بلکہ ناقابلِ برداشت شاعروں کے مجموعہ ہائے کلام پر دیباچہ لکھنے بیٹھتے ہیں تو ان کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے، اور منہ کے بل زمین پر نظر آتے ہیں ۔ ناقابلِ مطالعہ شاعروں یعنی ناشاعروں تک کا لہجہ منفرد اور مجموعۂ کلام اردو شاعری میں "اضافہ" قرار دیا جاتا ہے ادھر تنقید کے نام پر تضحیک والے رویّے میں بھی یہی سب کچھ نظر آتا ہے ۔ ہندوستانی سماج کی روایتی، شرافت اور اخلاق کی جھوٹی رسموں نے ہم سے وہ "قدر" چھین لی ہے جسے اخلاقی جرأت کہا جاتا ہے ۔ ہم میں اتنی ہمت نہیں کہ جس سے ناراض ہوں، ایک بار جی بھر کر اس کی ماں بہن تول کر رکھ دیں، اور پھر ہمیشہ کے لیے معاملہ کو بھول جائیں ۔ اس کے بجائے ہم اپنی چھوٹی چھوٹی خفگیوں اور دشمنیوں کو سنبھال سنبھال کر رکھتے ہیں اور بات جب ذہنی انقباض تک ــــ

پہنچ جاتی ہے تو مجبوراً تنقید سے مسہل کا کام لینا پڑتا ہے"۔ [۱۶]

فضیل صاحب کے لہجے کی جھلاہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے یہاں ان سے اتفاق کرنا پڑتا ہے۔ یقیناً ہمارا ادبی ماحول خاصا "فاسد" ہو چکا ہے۔ اس ماحول کو بدلنے کے لیے بے لاگ اور دو ٹوک انداز اختیار کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ فضیل صاحب نے "کمان اور زخم" میں جو طریقہ اختیار کیا ہے، وہ کس حد تک اس تبدیلی کے لیے آمادگی ظاہر کرتا ہے، اگر یہ دریافت کر لیں تو "کمان اور زخم" جیسا اہم مقالہ سپردِ قلم کرنے کا مقصد پورا ہو جائے بلکہ جدید تنقید تک رسائی حاصل کرنے کا صحیح راستہ صاف ہو جائے۔

اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ جدید تنقید کو ہر حال میں معروضی اور تجزیاتی ہونا چاہیے۔ وہ اگر چاہے تو بقدرِ ضرورت اسلوبیاتی، ہیئتی اور نفسیاتی انداز اختیار کر سکتی ہے، لیکن اسے ہر حالت میں ادب کے دائرہ میں ہی رہنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ دوسرے علوم کے حوالوں سے وہ اتنی بوجھل ہو جائے کہ تنقیدی نہ رہے۔

حوالے کی بات آئی ہے تو یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ نقاد کو جہاں تک ممکن ہو اپنی بات اپنے ہی حوالوں سے بے کم و کاست بیان کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اگر کبھی دوسرے خصوصاً غیر زبان کے معنیت کا حوالہ دینا نہایت ضروری ہو تو مجبوری ہے، ورنہ اسے کسی بیساکھی کا سہارا نہیں لینا چاہیے۔ اگر حوالہ دینا ضروری ہی ہو تو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ تنقید حوالوں سے بوجھل نہ ہونے پائے۔

علمیت کے مظاہرہ کا چلن نقادوں میں عام ہے۔ اس سے قاری پر کوئی خوشگوار تاثر مرتب ہونے کے بجائے صاحبِ ذوق قاری بدمزگی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ علمیت ایسی چیز ہے کہ اس کے مظاہرہ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی، نقاد میں اگر وہ صفت موجود ہے تو اس کا اظہار اس کی معروضی تحریروں میں ہو کے رہے گا۔ بڑا نقاد علمیت کا مظاہرہ نہیں کرتا، لیکن لوگ اس کی علمیت سے متاثر ہو کے رہتے ہیں، اردو میں حسن عسکری اس کی بہترین مثال ہیں۔

تنقید ایک مہذب علم ہے، اس کے لیے جو زبان استعمال کی جائے اُسے بھی مہذب ہونا چاہیے۔ جملے بازی، ادبی گالم گلوچ اور چیٹ پٹا لب و لہجہ جو وارث علوی سے لے کر سلیم احمد تک سب کی کمزوری بنا ہوا ہے تنقید کا کوئی بہتر معیار نہیں پیش کرتا، اچھا اور بڑا نقاد وہی ہو گا جو مہذب اور شائستہ لہجہ میں بھی سخت سے سخت بات کہنے کی صلاحیت رکھتا ہو گا۔

زبان کے سلسلے میں اس کا خیال بھی رکھنا ہوتا ہے کہ اسے سادہ اور معنیٰ کی روانی میں سہل ہونا چاہیے۔ یہ درست ہے کہ بعض مفاہیم کو ادا کرنے کے لیے ان اصطلاحوں کا استعمال کرنا پڑتا ہے، جو ہر ایک کی سمجھ میں آسانی سے نہیں آتیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنی زبان کو ڈاکٹر شمیم حنفی کی طرح گنجلک اور مغلق بنا دیں اور اس میں اتنا ابہام پیدا ہو جائے کہ کسی کی کچھ سمجھ ہی میں نہ آسکے۔

عمومی بیانات یا فیصلہ جاتی احکامات صادر کرنے کے بجائے نقاد کو ایسے تنقیدی معیار وضع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، جن کی روشنی میں فن پارے کی صحیح قدر معلوم ہو سکے۔ ایسا کرنے کے لیے اسے تاثرات اور تعصبات سے بلند ہو کر ٹھوس دلائل کی روشنی میں بات کرنی ہو گی۔

تنقید برائے تضحیک یا تنقید برائے توصیف کے رائج طریقوں سے بچنے کا یہی راستہ ہے کہ ہم ایسی تحریروں کو سامنے لائیں جن میں غیر جانب داری اور دیانت داری برتی گئی ہو۔ کسی تخلیق کو شعوری طور پر پروجیکٹ کر کے اہم نہیں بنایا جا سکتا، اور نہ ہی کسی کو جان بوجھ کر نظر انداز کرنے کی کوشش اس کی اہمیت کو کم کر سکتی ہے۔ اردو میں دونوں قسم کی مثالیں بہ کثرت موجود ہیں جن کا عبرت ناک انجام بھی سب کے سامنے ہے۔

فضیل صاحب نے "کمان اور زخم" میں معروضی اور تجزیاتی انداز اختیار کرنے کی کافی حد تک کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں دوسرے مصنفین کے حوالے بہت کم ہیں لیکن شاید یہ ان کی مجبوری ہو، رہی علمیت کے مظاہرے کی بات تو وہ اس لالچ سے بھی خود کو نہیں روک سکے ہیں۔ وہ کافی حد تک غیر جانب دار بھی رہے ہیں، لیکن کہیں کہیں وابستگی کا کھل کر اظہار بھی ہو جاتا ہے۔ بنیادی مسائل پر ان کی نظر بہت گہری ہے اور وہ اوسط درجہ کے تجزیاتی ذہن کے مالک ہیں۔ عمومی بیان بازی تو ان کے یہاں نسبتاً کم ہے، لیکن صیغہ جاتی بیانات سے وہ خود کو روک نہیں پاتے۔ جگہ جگہ "میں" کی تکرار اکثر اچھی نہیں معلوم ہوتی، اچھا ہوتا اگر وہ اس کمزوری کو دور کرنے کی کوشش کرتے۔

تنقید کے لیے وہ جس زبان کا استعمال کرتے ہیں، وہ اپنے مطالب کی ادائی میں سہل اور سادہ ہے۔ لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کی زبان مہذب بھی ہے۔ جگہ جگہ وہ طنز دار زبان یا غیر تنقیدی لہجہ اختیار کرنے سے خود کو روک نہیں پاتے۔ یہ طریقہ سنجیدہ اندازِ نقد کے لیے قطعی موزوں و مناسب نہیں ہے۔ ان کمزوریوں سے اگر فضیل صاحب گریز کرنے کی کوشش کریں تو جدید تنقید ان سے بہت سی توقعات وابستہ کر سکتی ہے۔ ✻

---

[۱] تا [۱۶] "کمان اور زخم" فضیل جعفری، علی الترتیب صفحات ۲۳، ۲۲، ۴۵، ۹۵، ۱۰۳، ۱۵۵، ۲۰۱، ۲۲۳، ۲۲۵، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۶، ۲۲۹، ۲۴۹، اور ۱۱



ش ک نظام
کلّوں والی گلی، جودھ پور، راجستھان

تنقیدی تجزیے — ایک جائزہ

پچھلے چند برسوں میں جن نوجوان لکھنے والوں نے اُردو دُنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے شہنشاہ مرزا ان میں سے ایک ہیں۔ شہنشاہ مرزا شاعر بھی ہیں اور نقاد بھی "تنقیدی تجزیے" ، ان کے بیس مضامین کا پہلا تنقیدی مجموعہ ہے۔ تین حصص میں منقسم "تنقیدی تجزیے" کا پہلا حصّہ ناول، دوسرا افسانہ اور تیسرا شاعری سے متعلق ہے۔

کتاب کے پیش لفظ میں اردو تنقید کا تذکرہ اور اس کی صورتِ حال شہنشاہ مرزا نے یوں بتائی ہے "تنقید لکھنے کے لیے جس سلیقے اور آگہی کی ضرورت ہوتی ہے اس کی ہمارے ادب میں آج بھی کمی ہے۔۔۔ ہم ابھی تک اپنے درمیان ایسے تنقیدی شعور کی تعمیر نہیں کر سکے ہیں جس کے بغیر ادب کی صحیح شناخت دشوار ہے اور جس کی بناء پر تنقید ہنوز بھٹکے ہوتے مسافر کی طرح اپنی منزل کی جستجو میں سرگرداں نظر آتی ہے" "تنقیدی تجزیے" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے شہنشاہ مرزا نے اپنی تحریروں کو جارگن سے محفوظ رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ وہ غیر ضروری ناولیوں سے اپنی تنقید کے تحفظ کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ اپنی رائے کا واضح طور پر اظہار کرتے ہیں مثلاً "جب ناول نگار مبلغ بننے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا فن مجروح ہو جاتا ہے۔ پریم چند کے بیشتر ناولوں میں تبلیغی انداز نمایاں ہے جس کی وجہ سے وہ بڑے فن کار نہیں بن پاتے ... مگر آگے لکھتے ہیں" دراصل ناول نگار زندگی کا انتخاب کچھ اس طرح کرتا ہے کہ اُسی سے اس کے فلسفۂ حیات کا اظہار ہو جاتا ہے۔ بہر حال ناول نگار کسی بھی قسم کی زندگی کا انتخاب کیوں نہ کرے، اسے ہر حالت میں بنی نوعِ انسان کی بھلائی اور بہبودی کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے کیونکہ ناول بنیادی طور پر بنی نوعِ انسان ہی سے متعلق ہے۔" اور جب ایسا ہوگا تو ہم اسے تبلیغی بھی کہہ سکیں گے؟ شہنشاہ مرزا نے کامیو کے حوالے سے اپنی بات واضح کی ہے اور اس کے ناول "پلیگ" کا بھی حوالہ دیا ہے۔ مگر قاری کے ذہن میں جو سوال پیدا ہوتا ہے اس کا جواب شہنشاہ مرزا نہیں دیتے۔ یعنی وہ کیا چیز ہے جو تخلیق کو تبلیغ اور تبلیغ کو تخلیق بنا دیتی ہے؟ وہ کیا چیز ہے جو بقول شہنشاہ مرزا، بغیر راہ راست مخصوص عقیدے کے اظہار کے اس کے (کامیو کے) ناول کی ایک ایک سطر (پلیگ) میں وجودیت کے فلسفے کا برملا اظہار ہوتا ہے۔ اور جس کے فقدان کے سبب پریم چند کے یہاں ایسا نہیں ہو پاتا؟ شہنشاہ مرزا نے پنچ تنتر اور قدیم داستانوں کا بھی حوالہ دیا ہے۔ جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے پنچ تنتر، راجہ امر شکتی کے تین جاہلِ مطلق شہزادوں کو غیر معمولی عالم بنانے کے لئے وشنو شرما نے کہانی کی شکل میں لکھی تھی۔ وشنو شرما نے اس میں پانچ ابواب رکھے ہیں اور سنسکرت ادب میں نیتی شاستر پر اس سے آسان اور معنی خیز تصنیف شاید کوئی اور نہیں ہے۔ اسی طرح "باغ و بہار" میں لکھا ہے "یہ قصّہ چار درویش کا، ابتدا میں امیر خسرو دہلوی نے اس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا زری زر بخش، جو ان کے پیر تھے، ... ان کی طبیعت ماندہ ہوئی تب مرشد کے دل بہلانے کے واسطے، امیر خسرو یہ ہمیشہ کہتے اور بیمار کی میں حاضر رہتے۔ اللہ نے چند روز میں شفا دی۔ تب انہوں نے غسلِ صحت کے دن یہ دعا دی کہ جو کوئی اس قصّے کو سنے گا، خدا کے فضل سے تندرست رہے گا۔" پنچ تنتر نیتی شاستر، اور "باغ و بہار" دل بہلانے کی غرض سے کہی گئی اس کے باوجود وہ افسانوی یا فکشن کی دنیا میں اہم ہیں تو کن عناصر کی وجہ سے؟ اگر شہنشاہ مرزا اس طرح کے سوالوں کا بھی احاطہ کر لیتے، جو ان کے لئے مشکل نہیں تھا، تو افسانوی تنقید میں ان کے یہ مضامین اور زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے۔ "اردو ناولوں میں "انقلاب" " از خواجہ احمد عباس ایک بھرپور مضمون ہے مگر ان کے اس جملے سے متفق نہیں ہوا جا سکتا کہ "دراصل خواجہ احمد عباس تو ان کی حیثیت افسانہ نگار کے طور پر بھی کچھ ایسی معتبر نہیں کہ ان کی ناول نویسی کو قابلِ ذکر قرار دیا جائے" تو کیا وہ افسانہ نگار جن کی افسانہ نگاری معتبر مان لی گئی ہے ان کی ناول نویسی لازماً قابلِ ذکر ہے؟ چیخوف، ہارڈی، ڈکنس، موپاساں، وغیرھم کے نام ہمارے

سامنے کے ہیں۔ مگر اس کے باوجود شہنشاہ مرزا نے جن دلائل و شواہد کی روشنی میں انقلاب کے متعلق یہ لکھا ہے کہ "انقلاب اردو جرنلسٹ کی انگریزی ناول کا اردو ترجمہ ہے" یا یہ کہ 'انقلاب' سنہ ۱۹۴۹ء میں مکمل ہو چکی تھی اور دوسری زبانوں میں شائع بھی ہو چکی تھی اردو میں سنہ ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی ہے اس لئے اسے بنیادی طور پر اردو کا ناول نہیں مانا جانا چاہئے۔ شہنشاہ مرزا نے انقلاب کے متعلق پروفیسر وارث علوی کی یہ رائے نقل کی ہے "روس میں انقلاب جیسے کمزور ناول کی مقبولیت دیکھ کر یہ سوال اٹھتا ہے کہ کہیں سرمایہ دارانہ نظام ہی کی مانند اشتراکی نظام نے بھی کتابوں کے ذہین قاری کے بجائے محض کتابوں کے CONSUMER تو پیدا نہیں کئے۔" وارث علوی کی بات میں ایک اضافہ اس خبر سے بھی ہو سکتا ہے کہ چین میں گلشن نندہ کی ایک ناول لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو کر ایسا مقبول ہوئی کہ ایک مہینہ کے اندر اندر ختم ہو گئی۔ 'انقلاب' کی زبان کے متعلق شہنشاہ مرزا کے قول کو مان لینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

'تنقیدی تجزیے' کا دوسرا حصہ افسانے سے متعلق ہے۔ اس کا پہلا مضمون شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب 'افسانے کی حمایت میں' کے متعلق ہے شہنشاہ مرزا نے یہ مضمون نہایت محنت اور لگن سے لکھا ہے۔ فاروقی کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے اپنے اختلافات کا شائستگی سے بے لاگ اظہار کیا ہے۔ اس لاجواب مضمون میں اگر شہنشاہ مرزا فاروقی کے بنیادی نکتہ سے بھی بحث کرتے تو اور لطف آتا۔ فاروقی کے نزدیک شاعری افسانے سے بڑا آرٹ ہے شہنشاہ مرزا لکھتے ہیں "شاعری ہو یا افسانہ ناول ہو یا ڈرامہ کوئی صنفِ ادب ایک دوسرے سے نہ تو برتر ہے نہ بدتر یہ تو تخلیق کار کی اپنی سطح ہوتی ہے جس کے ذریعے ہم اس کی تخلیقات کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہیں۔" یہاں فاروقی صاحب کے اس بیان سے بھی بحث ہونی چاہئے تھی کہ "بڑی صنفِ سخن وہ ہے جو ہمہ وقت تبدیلیوں کی متحمل ہو سکے۔ افسانے کی چھوٹائی یہی ہے کہ۔ اس میں اتنی جگہ نہیں ہے کہ نت نئے تجربات ہو سکیں۔ ایک آدھ بار تھوڑا بہت تلاطم ہوا اور بس۔" اس کا سبب فاروقی TIME کو مانتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں "آپ TIME SEQUENCE کو الٹ پلٹ سکتے ہیں۔ لیکن افسانے میں TIME ہی نہ ہو یہ ممکن نہیں ہے۔ گویا افسانہ TIME کے چوکھٹے میں قید ہے۔" ممکن ہے شہنشاہ مرزا مستقبل میں اس کے بارے میں بھی ہمیں بتائیں گے۔ اس کے علاوہ نیر مسعود کا افسانے، نیا اردو افسانہ، اندیشے اور امکانات ایسیا۔ ایک خواب ناک افسانہ، قمر احسن کے افسانوں میں بیانیہ سے انکار کی کشمکش ایسے مضامین ہیں جن میں شہنشاہ مرزا نے اپنی تنقیدی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا ہے۔

کتاب کا تیسرا حصہ شاعری سے متعلق ہے۔ اس میں شہنشاہ مرزا نے مجید امجد کی غزلیں، فہمیدہ ریاض کی 'کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے'، فراق کی روپ، مخدوم محی الدین اور یاس یگانہ چنگیزی سے متعلق مضامین لکھے ہیں۔ شہنشاہ مرزا خود شاعر ہیں اس لئے اس باب میں ان سے خصوصی توجہ متوقع ہے۔ چند بنیادی سوالوں کے جوابات بھی ان سے قاری کو ملتے تو اچھا ہوتا مثلاً طویل نظم یا لمبی نظم کی طوالت یا لمبائی افسانے کی لمبائی ہے یا مصرعوں کی؟ ایسے میں کسی طویل یا لمبی نظم میں آئی کہانی اور نظم کے مابین کیا رشتہ ہے؟ اگر ان کے درمیان کوئی رشتہ نہیں تو وہ کیا چیز ہے جو کسی نظم کو طویل یا لمبی نظم کا اسم عطا کی ہے؟ کسی طویل نظم میں افسانے کا کیا رول ہو سکتا ہے؟ طویل نظم مثنوی، شہر آشوب، قصیدہ وغیرہ میں تکنیکی اور موضوعی تفرق وغیرہ۔ ایسے سوالات کی توقعات شہنشاہ مرزا ہی تو ہم میں جگاتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ طویل نظم کی کامیابی کافی حد تک اس بات پر منحصر ہوتی ہے کہ وہ ایک خاص قسم کی بصیرت اور معنویت شاعرانہ جلال کے ساتھ پیش کرے۔" 'کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے' کا تجزیہ انھوں نے بہت اچھا کیا ہے۔ پورے تجزیے کے بعد انھوں نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ فہمیدہ ریاض کی اس نظم کا "اختتام خالص جذباتی اور ایک حد تک رومانوی ہے۔ سرخ انقلاب کا سرخ آفتاب طلوع ہونے کے بعد اگر یہی سب ہوتا ہے تو ماں کے لئے اتنے بڑے انقلاب کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

مختصر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ 'تنقیدی تجزیے' قابلِ مطالعہ اس لئے بھی ہے کہ یہ قاری کے ذہن میں سوالات پیدا کرتی ہے اسے غور و خوض کے لئے تیار کرتی ہے۔ کسی بھی تنقیدی کتاب کا اس سے زیادہ کیا رول ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے شہنشاہ مرزا مبارکباد کے مستحق ہیں۔

شہنشاہ مرزا

نثری نظمیں

غیر مطبوعہ نظموں سے انتخاب

تم اپنے ہونٹوں پر تشنگی کا
الاؤ یونہی جلائے رکھنا
تمھارے ہونٹوں کی پیاس
میرے لبوں پہ بھی یوں مچل رہی ہے
کہ مجھکو محسوس ہو رہا ہے
کہ تم نہیں میں تڑپ رہا ہوں
وہ دن بہت جلد آ رہے ہیں
کہ جب دوبارہ ملیں گے ہم تم
میں ایک بوسہ کی بوند سے
اس دہکتے روشن الاؤ کو
سرد یوں کروں گا
کہ یہ الاؤ
حسین ہونٹوں کو پھر کبھی بھی نہ چھو سکے گا

کتاب دل تمھارے سامنے ہے
تم اس کے ہر صفحے کو دیکھ ڈالو
اور اس کے بعد یہ مجھ کو بتا دو
کہ اس کا کون سا ایسا صفحہ ہے
نہ جس پہ نام لکھا ہو تمھارا
اور اس کے بعد اپنے دل سے پوچھو
کہ ان اوراق ہائے منتشر کو
کبھی یکسوئی سے تم نے پڑھا ہے؟
اجازت ہے
تم اس کا ہر وہ صفحہ
خوشی سے نوچ ڈالو جس پہ
تمھارا نام لکھا ہے ابھی تک
مگر اتنا بتا دو
تم کہاں تک
صفحے نوچا کروگی اور کب تک؟

تمھاری زندگی کتنی پرائی ہے
کہ اس کی ہر گھڑی پہ دوسروں کا کس قدر حق ہے
مجھے تو بس
تمھاری زندگی کی چند بوجھل ساعتوں پہ اس قدر حق ہے
کہ میں ان چند بوجھل ساعتوں میں
پاس تم کو پا کے بھی
گھٹ گھٹ کے رہ جاؤں
تمھارا ڈر
کہ جو ان چند بوجھل ساعتوں پر
اس طرح چھایا سا رہتا ہے
کہ میں محسوس کرتا ہوں
کہ ان دل دوز اور سفاک لمحوں میں
مرے نزدیک رہ کر بھی
تمھارے جسم کے باہر
کوئی شے
مجھ سے کوسوں دور رہتی ہے

آج کی دوپہر
کس قدر گرم تھی
کس قدر سخت تھی
پھر بھی تیرے قریں
وقت یوں کٹ گیا
جیسے اربوں برس بوڑھی دنیا کا صرف ایک پل
کاش ایسا ہی ہو
وقت یوں ہی گزرتا رہے
سارے لمحوں کے آزاد پنچھی
وقت کی قید سے
یونہی چھوٹتے رہیں
کاش ایسا ہی ہو
ہم یونہی روز ملتے رہیں
کاش ایسا ہی ہو

اب جیسے سب ختم ہوگیا
س کائنات کی تخلیق کا مقصد ہی تمام ہوگیا
یہاں، وہاں، چاروں طرف
س ایک خلا ہے
کوئی کسی کا مونس ہے، نہ دلدار
ہ دل دہی کے وعدے
ینے کی خواہشیں
ہ بندھن
ب ٹوٹ گئے
ُند کا تشنہ پرندہ
امیں بھٹکنے کو آزاد ہوگیا
ہوں اسے یہ آزادروی کب تک راس آئے گی؟

ا اس بے رحم لمحے سے بہت ہی خوف کھاتا ہوں
بس لمحے
سارا زمانہ ہو مخالف
یں سارے زمانے کا مخالف ہوں
نظریں تمہاری سمت اٹھیں
ل سوچوں
اس جنگ میں مری طرف سے
کے اس دنیا سے ٹکرلو
یں تم کو اس لمحے
ت سمت میں پاؤں
کی روایاتِ کہن کی ہمنوا بن کر
اُدِ تم میرے اصولوں کی حقیقت کو
شوں کی اس جدوجہد میں

خونخوار اور بے راتب کتّے
آزاد چھوڑ دیے گئے ہیں
وہ اپنے دانت لپلپا رہے ہیں
ان کے بھونکنے کی دہلا دینے والی آوازیں
فضا میں گونج رہی ہیں
ہولناک ویرانے میں
اپنی پھٹی ہوئی قمیض کو سنبھالے
میں تنہا دوڑتا چلا جا رہا ہوں
ہانپتی ہوئی سانسوں کو سنبھالتا
خود کو اپنے ہونے کا یقین دلاتا
میں مسلسل دوڑتا چلا جا رہا ہوں
اور بے راتب کتّے
سر پر آن پہنچے ہیں۔

تم بھی سنوری ہوئی اس دنیا کا
ایک حصّہ ہو
تم سے وابستہ کتنے ہی چاہت کے قلعے ہیں
ان قلعوں میں جذباتی رشتوں کی فصیلیں
تم کو گھیرے رہتی ہیں
میں ان چاہت کے رنگین قلعوں میں
اک ٹوٹا سنسان کھنڈر ہوں
ٹوٹے اور سنسان کھنڈر کی خاطر
چاہت کے محلوں سے نکلنا
جذباتی رشتوں کو کچلنا
کوئی اچھی بات نہیں ہے
تم ان چاہت کے محلوں میں
شاد اور آباد رہو گی

پھر تم سے شکوہ بھی کیا ہو
مگر یہی تو مجبوری ہے
چاہت کے محلوں میں رہ کر
جذباتی رشتوں سے گھر کر
تم ٹوٹے سنسان کھنڈر کا غم کرتی ہو۔

یہاں کوئی شریکِ غم نہیں ہے
دکھوں کا انت ہی شاید نہیں ہے
میں اکثر سوچ کر حیران ہوتا ہوں
مرے دکھ کا کوئی احساس بھی تم کو نہیں ہے
تو پھر کوئی کسی کے دکھ کو کیسے بانٹ سکتا ہے
مرا غم صرف مری ذات کا غم ہے
میں اس غم کو اکیلے ہی سہوں گا
بس یہی غم ہے
مگر اک دائرہ وہ بھی تو ہوگا
جس میں تم تنہا
خود اپنی ذات کے غم میں گھری
میری طرح
شکوؤں کے طوفانوں سے ٹکرلے رہی ہوگی
تمہارے دکھ سے میں بھی بے خبر ہوں
ایسے ہی جیسے
مرے دکھ کا کوئی احساس تم کو ہو نہیں پایا
ہم اپنے دکھ بیاں کس سے کریں
جب ہم ہی اپنے واسطے اتنے پرائے ہیں؟

شہنشاہ مرزا

ڈائری کے چند اوراق

[انتخاب]

۲ر مارچ ۱۹۸۳ء

عرصہ ہوا کہ واقعات پر میری کوئی گرفت نہیں رہی۔ گھنٹا ئیں گشتی رہتی ہیں اور میرے حافظے کے کسی دور افتادہ مقام پر جا کر سو جاتی ہیں۔ پھر میں ذہن پر بہت زور دیتا ہوں تو بھی کچھ یاد نہیں آتا۔

ڈائری میں بہت پابندی سے لکھا کرتا تھا مگر اب مدت ہوئی چھوڑ دیا۔ اب تو بس کبھی کبھار موڈ بن گیا تو یونہی دو چار سطریں گھسیٹ دیں اور چلتے پھرتے ہوئی کسی بات کی تصدیق کرنے کے لئے اگر ڈائری کے صفحات الٹے تو زیادہ تر سفید ملتے ہیں۔ اس طرح زندگی بہائے لے جا رہی ہے اور کوئی یادداشت نہیں تو ان واقعات کی نشان دہی کر سکے۔

ایسے ہی ایک دن میں یادداشت سے بھی محروم ہو جاؤں گا کیوں کہ اب جہاں زندگی نے لا کر چھوڑا ہے وہ کچھ عجیب مقام ہے۔ بس ایک بے بسی کا منظر ہے جو محیط ہے۔ نہ آگے کا کوئی علم نہ پیچھے کی کوئی یاد۔ ساحر نے اپنے فلمی انداز میں ہی سہی مگر غلط بھی کیا کہا ہے؟ ؎

آگے بھی جانے نہ تو پیچھے بھی جانے نہ تو

جو بھی ہے بس یہی اک پل ہے

لہٰذا میں تو بس موجود ہی سے واقف ہو کر رہ جاتا ہوں اور اس سے بھی اتنی واقفیت بنتی ہے جتنی دیر کہ وہ یہاں رہتا ہے۔ پھر یادداشت کی سلیٹ سادہ رہ جاتی ہے۔

اب اس وقت میں ایک ایسے لمحے سے دو چار ہوں جب خاصی ہنگامی کیفیت ہے۔ تاہم یادداشت کو کھرچنے کا موقع مل رہا ہے۔ بارہ بجی ریلوے اسٹیشن کا یہ ریفریشمنٹ روم کا بظاہر پرسکون ماحول۔ سامنے پلیٹ فارم ہے تاکہ کبھی ٹرینیں آ جا رہی ہیں اور ایسے ہنگامی ماحول میں یادوں کی پورش۔ ریل کے سفر میں وقت بہت کھلتا ہے۔ کبھی ٹرین میں بیٹھے بیٹھے کبھی ٹرین کی راہ دیکھتے دیکھتے مگر اس وقت کا مناسب استعمال بھلا کون کرسکتا ہے اور کس کے بس میں ہے کہ وقت بھی تو ہاتھ سے مچھلی کی طرح پھسل پھسل جاتا ہے۔

۱۵ر جولائی ۱۹۸۳ء

داستان کی کڑیاں ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں اور اکثر داستان ادھوری رہ جاتی ہے۔ اپنی داستان بہت سوچ سمجھ کر سنانی ہوتی ہے کہ مبادا ایسا نہ ہو کہ لوگ ہنسیں اور ہم تماشہ بن جائیں۔

تماشہ گاہ میں تو لوگ آتے ہیں۔ پیسہ پھینک کر ٹکٹ خریدتے ہیں اور اپنی نشست حاصل کر لیتے ہیں پھر آپ کے سامنے اور کوئی چارہ نہیں رہ جاتا، سوائے اس کے کہ آپ ان کی دل بستگی کے لیے جو کچھ بھی ہو سکے کرتے رہیے۔ اور پھر ایک دن ایسا بھی آتا ہے جب لوگوں کو آپ کے تماشہ ہی میں کوئی دلچسپی نہیں رہ جاتی۔ کوئی دوسرا آپ سے زیادہ زندہ کردار آپ کی جگہ لے لیتا ہے۔

لیکن تماشہ گاہ کی نشستیں اسی طرح ناظرین سے بھری رہتی ہیں۔

۳۰ر نومبر ۱۹۸۳ء

وقت کی اذان اور بجتے ہوئے بے جان پر نمدے۔ اندھی رات میں اندھیرے کی سمت بڑھتی ہوئی تیز رفتار طوفان ایکسپریس۔ بجلی غائب سراسر اندھیرا سنسناتا ہوا، چیختا ہوا اور شور مچاتا ہوا۔

یہ صورت حال ہے جو نہ جانے کب سے قائم ہے۔ سہمے ہوئے مسافر سکڑے ہوئے بیٹھے ہیں۔ نامعلوم منزل پر ٹرین کب جا کر ٹھہرے گی یہ بھی کسی کو نہیں پتہ۔ ایک عجیب سی بھیانک کیفیت ہے۔ اس کیفیت میں ایک دن اندھیرا دائمی طور پر بڑھ جائے گا اور پھر اندھیرے کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا۔

بہر نومبر انیس سو تراسی یعنی ایک سال اور آخری ہچکی لینے کی تیاریوں ہی میں مصروف ہے۔ گزشتہ اٹھ ماہ کا پارہ ہجگی کا غیر طلائی تقریباً غیر انسانی ماحول۔ نوچ کھسوٹ کا دور دورہ ایک دوسرے کو کھانے کے لئے لوگ تقریباً ملتے ہوئے۔

امید کی ایک کرن کا خواہ مخواہ پھوٹنا پھر ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جانا۔ ستمبر سے لے کر شروع نومبر تک امید و بیم کی کیفیت اور پھر لوربن رپورٹ کہ جس پر تیس روپے بھی بے کار برباد ہوئے۔ رپورٹ کے ذریعہ یہ انکشاف کہ ساری امیدیں محض ایک سراب تھیں اور یہ کیفیت جو ہے وہ دائمی طور پر برقرار رہے گی۔

محاذ پر خاموشی۔ جنگی توپیں خاموش ہیں۔ صف آرائی کے باوجود فریقین نے جنگ بندی پر رضامندی کا اظہار کر دیا ہے مگر یہ جنگ بندی بڑی طاقتوں کی مداخلت کی وجہ سے ممکن ہو سکی ہے اور محض عارضی ہے اس کا نفاذ نہایت بے یقینی کے ماحول میں ہوا ہے۔ فریقین میں سے کوئی بھی اس جنگ بندی کو توڑ سکتا ہے مگر بار بار اس امر کا اعلان بھی ہو رہا ہے کہ ہم نے مصلحتاً وقت دیا ہے تاکہ نظرثانی کر لی جائے اس کے بعد تو بالآخر ایک فیصلہ کن جنگ ہو کر رہے گی۔

ڈوبتے ہوئے جہازوں کو خاموشی سے ڈوبتا ہوا دیکھنا اور ایک لفظِ تاسف بھی زبان پر نہ لانا موجودہ عہد کی مصلحت ہے۔ اس مصلحت کے پیچھے آپ کیا تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کوئی افسانہ نہیں یہ تو محض ایک مخصوص صورت حال کی تصویر کشی ہے۔

۵ر فروری ۱۹۸۵ء

یہ سال کچھ اچھے طریقے سے نہیں آیا ہے۔ بس الجھنیں ہی الجھنیں رہیں۔ کام بھی پورا نہ ہو پایا۔ بہت سے ضروری اور غیر ضروری کاموں میں پھنسے رہنا اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ بیماری کا کھٹکا رہنا۔ پیٹ کی بیماری کا سلسلہ تو مسلسل جاری ہے اور اب بلڈ پریشر کا قصہ بھی شروع ہو گیا ہے۔ ہائی بلڈ پریشر اور گزشتہ کئی دنوں سے اس مصیبت میں مبتلا ہوں کہ ہاتھ پیر دل کی جان جیسے بالکل نکل گئی ہے اور نہ پوچھیے کہ کیا حال ہے۔

تنقیدی تجزیے "چھپ گئی ہے۔ جیسی تیسی سہی۔ اس کے لئے مختلف جگہوں پر بھیج بھی دی گئی ہے۔ نادر صاحب "دریچے" بھی چھپ گئی ہے۔ یگانہ کی صد سالہ تقریبات کا سلسلہ چل رہا ہے۔ ۴ر فروری کو کہ جب یگانہ آج سے انتیس برس اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ ہم ان کی قبر پر دعائے دھوم دھام سے کر آئے۔ اور بھی بہت سی چیزیں ہیں کہ جو جا سکتی ہیں یا یہ کہ جن میں دلچسپی ہو سکتی ہے۔ مگر فی الحال یہی کافی ہے کہ اب ملک پارلیمانی انتخابات سے فارغ ہو۔ بعد پھر سے اسمبلی انتخابات کے بخار میں مبتلا ہو جائے اور ہائی بلڈ پریشر میں ذرا کام کر لو تو ایسا محسوس ہوتا۔ مجھے بہت ہو گیا۔ اب تھک کر چور ہو گئے ہیں۔

۲۸ر جولائی ۱۹۸۵ء

... کینسر وارڈ جیسی ناول پڑھنے کے بجائے اگر آپ کینسر کے موذی میں مبتلا مریض کا تڑپنا دیکھ لیں تو آپ کو قائل ہونا ہوگا کہ زندگی میں تڑپ تو بہت ہے لیکن موت سے لڑنے کے لئے اس کے پاس بہت کچھ ہے...

۹ر اگست ۱۹۸۵ء

عسکری صاحب:

میں عسکری صاحب کے بارے میں زیادہ نہیں جا... اگر میں یہ کہوں کہ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تو کچھ غلط نہ ہوگی۔ بات یہ ہے کہ عسکری صاحب کے پا... ادیب اردو میں بہت کم پیدا ہوئے ہیں، اور ان کے ... فکر کے بارے میں تھوڑا بہت جان لینا بھی بہت بڑی بات... مگر میں نے عسکری صاحب کے متعلق جو کچھ بھی جانا ہے تضادات کے ذریعہ جانا ہے۔ ہر شخصیت تضادات کا ... ہے اور بلند ادبی شخصیت میں تو تضادات بھی بے بنیاد... لہٰذا ہر ادبی شخصیت کو اس کے تضادات کے پس منظر... دیکھنا ہی مفید ہوتا ہے۔ اگر ہم اس کے تضادات کے ... جائیں گے تو ہم ادب میں اس کے مقام کو صحیح طور پر سمجھ ہی نہ...

عسکری کے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ ان کے ... میں جب بھی بات کی جاتی ہے تو اس میں انتہا پسندی کار... آتی ہے۔ ان کے ماننے والوں کا ایک حلقہ ایسا ہے جو کہ... اس طرح پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے جس طرح لوگ آ... کتب کی وحی اقوال حوالے کے طور پر پیش کرتے ہیں... حضرات کو یہ سننا بالکل پسند نہیں کہ عسکری میں کچھ کمزو... تھیں۔ ان حضرات کا بس ہی نہیں چلتا کہ کس طرح وہ ... کو فوق البشر ثابت کر دیں۔

دوسرا طبقہ وہ ہے جس نے عسکری کو کبھی ہی سنجیدگی...

پڑھا۔ پھر اس میں عسکری کی کوئی شرط بھی نہیں کہ ایسے حضرات کسی بھی چیز کو سنجیدگی سے پڑھنا کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ عسکری سے ناراض نظر آتے ہیں۔ ایسے لوگوں نے عسکری کے نظریات سے چڑ کر ان کے خلاف بے تکی ہانکنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔

۱۱ر اگست سنہ ۱۹۸۵ء

آج کا قومی آواز میں نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ میں قومی آواز بقدرِ ضرورت ہی دیکھ لیتا ہوں حالانکہ گھر میں یہ اخبار برابر آتا ہے۔ شام کو انیس نے مجھے بتایا اور تب میں نے ان کی بات پر یقین نہ کرتے ہوئے کاظم ہوٹل جا کر اخبار دیکھا اس کے پہلے صفحہ پر ہی یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ زیب صاحب کا کراچی میں حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے اچانک انتقال ہو گیا۔

میرے لئے اس خبر پر یقین کرنے کے سوا اور چارہ بھی نہیں تھا پھر انیس اشفاق ایسا مذاق کیوں کرتے اور وہ کرتے تو کرتے قومی آواز والے کیوں کرتے؟ ویسے تو انیس اشفاق نے یہ بھی کہا کاش منیر نیازی کی طرح یہ خبر بھی غلط ثابت ہو۔

اب مجھے نہیں معلوم حقیقت کیا ہے مگر میرا المیہ یہ ہے کہ اپنی اداسی میں کسی کو شریک بھی نہیں کر سکتا۔ زیب صاحب کی شخصیت زندگی سے کتنی بھرپور ہوا کرتی تھی، کس قدر ہنستے اور ہنساتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ انھیں اپنی ناموری اور شہرت کا ضرورت سے زیادہ خیال رہتا تھا لیکن دوستوں کے دوست تھے۔ صاحب کراچی کیوں گئے یہ بھی نہیں معلوم۔ اگر گئے تھے تو اتنے دنوں تک انھوں نے وہاں قیام کیوں کیا؟ وہ تو جون ۸۵ء میں لوٹ کر آنے والے تھے۔ ان کی غزلوں کا نیا مجموعہ بھی شائع ہونے والا تھا۔ ادھر انھوں نے بہت کم شاعری کی تھی۔ انھیں مجھ سے شکایت بجا طور پر تھی کہ میں نے ان پر کبھی قلم نہیں اٹھایا اور گزشتہ کئی برسوں سے ان کی شاعری پر کچھ لکھنے کے لئے مسلسل پر تول رہا تھا

اور ان کے ہمراہ وہ آخری ملاقات بھی کتنی دلچسپ رہی وہی آخری کیوں؟ ان سے میری ہر ملاقات نہایت دلچسپ تھی۔ انتہائی اپنائیت بھرے انداز میں شور مچاتے ہوئے وہ ملنے آ جاتے تھے اور پھر سارا وقت کس طرح گزر جاتا تھا یہ آج تک نہیں چل پایا۔ معلوم ہوا کہ ہم لوگ بانو دارابِ وفا کے یہاں بیٹھے شور مچا رہے ہیں۔ کبوتروں کی نسل پر چڑیا بازار میں کھڑے صاحب اظہارِ خیال کر رہے ہیں۔ نیر صاحب کے گھر پر ہم سب ہیں۔ زیب صاحب بات بات پر قہقہے لگا رہے ہیں اور تازہ غزل جو انھوں نے کہی ہے وہ سنا رہے ہیں اور غزل ایسی ہے کہ مسعود اور کیا انیس اشفاق اور کیا وقار ناصری سبھی داد دینے پر مجبور تھے۔

یہ سب سلسلے اب ختم ہو گئے۔ جیسا کہ اخباری اطلاع سے ہے اخبار کو یہ بھی کہنا ہے کہ زیب صاحب تو یکم اگست ہی کو چل بسے ہو گئے تھے۔ اس کمپیوٹر عہد میں ہم تک یہ اطلاع پورے دس دن بعد پہنچی کمال ہے۔ مجھے آج کیسری کشور بھی بے حد یاد آ رہے ہیں۔ یہ دونوں ہی شاعر ہم لوگوں کے لئے بہت عزیز تھے۔ بہت ہنسنے ہنسانے والے اور محبوب شخصیت کے مالک تھے اور دونوں ہی کو موت نے ہم سے چھین لیا اور ہم سب ہاتھ ملتے رہ گئے۔

چنانچہ زیب صاحب کا سوگ منانے سے اب کوئی فائدہ نہیں ان کو مرنا تھا وہ مر گئے، تہِ خاک سو گئے۔ نہیں معلوم ان کے کتنے منصوبے ادھورے رہ گئے۔

۱۶ر اکتوبر سنہ ۱۹۸۵ء

آدمی کے اندر موت سے لڑنے کی قوت بے پناہ ہے لیکن بالآخر تو فتح موت کو ہی نصیب ہوتی ہے۔ لیکن جب تک دم رہتا ہے جدوجہد جاری رہتی ہے۔ آج بھائی جان کتنے طویل عرصے سے موت کے خلاف جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں لیکن جو وقت گزر رہا ہے، ان کی شکست کے آثار نمایاں ہیں۔

اس وقت گھر میں پورا خاندان جمع ہے۔ سورہ یٰسین پڑھی جا رہی ہے۔ ان کے حواس جواب دے چکے ہیں۔ نیم بے ہوشی کا عالم طاری ہے۔ ایک ناک سے خون بھی جاری ہو چکا ہے جو صاف موت کی نشانی ہے۔ تاہم ان کی جدوجہد جاری ہے۔ کل کی رات بے حد کرب میں گزری سرسامی کیفیت اور ہذیانی سراسیمگی کا عالم رہا۔ نہیں معلوم انھوں نے کیا کچھ یاد کیا۔ ان کی اس ازلی مجبوری کو دیکھ کر بعض اوقات دل اتنا بیٹھ جاتا ہے کہ ساری روحانیت ہوا ہو جاتی ہے۔ آدمی کو اتنا مجبور بنا کر چھوڑ دینا بڑی عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ یہ درست ہے کہ دنیا میں اس طرح اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ خراب حالت میں لاکھوں افراد روز لقمۂ اجل بنا کرتے ہیں لیکن موت کی کشمکش سے دوچار کسی مریض کو دیر تک اس عالم میں دیکھنا ایک ایسا اذیت ناک عمل ہے جسے لفظوں میں بیان کرنا کسی بھی طرح ممکن نہیں ہے......

۱۸ر اکتوبر سنہ ۱۹۸۵ء

مرنے کے بعد رات کیسی ہوتی ہے مجھے معلوم ہی نہ ہو سکا کیونکہ میں تو گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا۔ البتہ جب تک نیند نہیں آئی طرح طرح کے خیالات ذہن میں سماتے رہے۔ کبھی وہ کرب کے عالم میں چیختے، چلاتے اور فریاد کرتے نظر آتے، تو کبھی یہ گمان ہوتا کہ جو مرض بھائی جان کو لاحق ہوا یقیناً اس میں میری بھی جان جائے گی۔ اکثر تو یہ گمان گزرے کہ بس اب سانس اکھڑنے والی ہے اسی طرح کی تکالیف میں میرا وجود بھی مبتلا ہو جائے گا۔

مگر یہ سب کچھ نہیں ہوا۔ نیند جب آئی تو ایسی آئی کہ کچھ نہ پوچھئے۔ موت کا کھیل تو ختم ہو گیا لیکن زندگی کا کھیل تو جاری ہے اور زندگی ہمیں کیا دکھانا چاہتی ہے یہ کسی کو بھی نہیں معلوم۔ زندگی معمول پر لوٹ آئے گی، سب کچھ نارمل ہو جائے گا۔ زندگی میں ایسی ہی قوت ہوتی ہے "خونِ جگر ہونے تک" میں جمعدار جلیل الدین کا کردار یہی تو کہتا ہے۔ گلہریوں کو کتر کتر کرتے دیکھ کر کیسی طمانیت کا احساس ہوتا ہے؟۔

آج کالج گئے اور چھٹی لے کر چلے آئے۔

کل بھائی جان اٹھ گئے اور کل ہی اتر پردیش پبلک سروس کمیشن الہ آباد سے انٹرویو کا خط آ گیا۔ ڈگری کلاسوں کو پڑھانے کے لئے میں نے چار سال قبل درخواست بھیجی تھی۔ کمال ہے ڈاکیہ کو بھی یہی دن ملا تھا؟۔

۱۳ر نومبر سنہ ۱۹۸۵ء

میں سوچتا ہوں کہ کہنے سے حاصل بھی کیا؟ کیا لکھا جائے اور کیا نہ لکھا جائے کہ کہنے سننے کی ہر بات کہی جا چکی ہے۔ اب کیا کہا جائے؟ میرے دل میں بعض نہایت دلچسپ، لطیف اور نئے احساسات اکثر کلبلایا کرتے ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں لکھ دوں مگر پھر یہ خیال آتا ہے کہ کچھ بھی لکھنے سے کیا ہوگا یہ سب کچھ پچھلے بزرگ کہہ چکے ہیں۔ کیا مولانا عبدالحلیم شرر، محمد حسین آزاد، رتن ناتھ سرشار اور ایسے ہی کتنے لوگ جو کہہ گئے ہیں کم ہے؟ پھر میں جب فکشن کے متعلق ڈی ایچ لارنس کے خیالات پڑھتا ہوں تو مجھے ان میں اتنی وسعت نظر آتی ہے کہ میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔ اب اس کے آگے میں کیا لکھوں؟ لارنس کی تحریروں کے آگے تو مجھے ای ایم فارسٹر اور اس قسم کے دوسرے تمام نقادوں کی لکھی ہوئی تحریریں پھیکی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ پھر اردو میں بھلا کون ہے؟ کوئی بھی تو نہیں۔ پھر کچھ بھی لکھنے سے کیا فائدہ، کچھ بھی کہنے سے کیا حاصل؟

ہر بات ایک تفصیل چاہتی ہے۔ اس کا اظہار اس وقت مکمل ہی نہیں ہو سکتا جب تک وہ بات تفصیل سے نہ کہی جائے اور یہاں یہ عالم ہے کہ یار لوگ تفصیل سے جان چراتے ہیں۔

پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟ میرے خیال سے مجھے تمام خیالات کو جھٹک کر لکھنے پڑھنے کے کام میں لگ جانا چاہئے۔ بہرحال لکھنا پڑھنا ہی میری زندگی ہے۔

۲۶ر جون سنہ ۱۹۸۶ء

میں کسی کو الزام نہیں دیتا مگر مجھے بعض اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ مجھے اس دنیا میں آنا ہی نہیں چاہئے تھا کیونکہ یہ میرے معیار اور پسند کے مطابق نہ تھی اور نہ ہی مجھ میں اتنی صلاحیت اور قوت ہے کہ میں اسے اپنے معیار اور اپنی پسند کے عین مطابق بنا سکوں۔ مگر مشکل یہی ہے کہ نہ تو اس دنیا میں آنے پر میرا کوئی اختیار تھا اور نہ جانے پر کوئی اختیار ہوگا۔ اب کیا دل کے دو شدید دورے جھیل لینے کے بعد آدمی کو زندہ رہنا چاہئے۔ میرے خیال سے قطعی نہیں لیکن اس کے باوجود میں زندہ ہوں لیکن یہ زندگی عین ایک مرے ہوئے انسان کی زندگی ہے۔

ایسی زندگی گزارنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ درست ہے کہ اس سے بھی زائد خطرناک قسم کے امراض سے لوگ چھٹکارا حاصل کر کے کافی عرصہ تک زندہ رہتے ہیں۔ مگر بات پھر وہیں آ کر ختم ہوتی ہے کہ اس کے باوجود ایک دن ایسا آتا ہے کہ انھیں اس بھری ہوئی دنیا کو چھوڑ کر چپ چاپ چلا جانا ہوتا ہے۔ ۱۹ر اپریل سے لے کر ۲۰ر اپریل کی شام تک مجھے کچھ علم نہیں کہ میرے جسم کے ساتھ کون سا ناٹک کھیلا گیا اور کس طرح اس میں دوبارہ جان ڈالی گئی؟ واقعی مجھے اس وقت ختم ہو جانا چاہئے تھا اور مجھے کچھ علم بھی نہیں ہوتا اور سارا کام کاج پورا ہو جاتا۔ مگر معاملہ یہ ہوا کہ مجھے موت کے منہ سے گھسیٹ لیا گیا اور بعد میں جب مجھے ہوش آیا تو مجھے تو ایسا محسوس ہوا جیسے بہ آسانی گھسیٹ لیا گیا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا نہ ہوا ہو بلکہ ڈاکٹروں خاص طور پر ڈاکٹر بھنڈاری کو سخت کشمکش سے گزرنا پڑا ہو۔ مگر مجھے ہوش آنے پر یہی محسوس ہوا جیسے سب کچھ نہایت

[باقی صفحہ ۱۳ پر دیکھئے]

مٹھی بھر غزلیں

◆

…کی نبض، اس کی عظمتِ کردار گرتی ہے
…ھا سامنے ہے، حالتِ بیمار گرتی ہے

…ں کی سیاست میں خسارہ میں اٹھاتا ہوں
…ے آنگن میں اکثریت کی دیوار گرتی ہے

…م نور کے مینار سے لپٹے رہے تو کیا
…س کی روشنی تو جھیل کے اس پار گرتی ہے

…اپنے آبلوں سے راستے گلنار کرتے ہیں
…سے پاؤں پر قوسِ قزح بیکار گرتی ہے

…بجلی کو گرنا ہے گرے دشت و بیاباں میں
…ے پھلتے درختوں پر ہی کیوں ہر بار گرتی ہے

…ظالم دیکھ لیتا ہے تو دل پر تیر چلتے ہیں
…جھکائے تو تلوار پر تلوار گرتی ہے

…فرو مرے فن کی بلندی دیکھتی کیسے
…ھر تو دیکھ کر تنقید کی دستار گرتی ہے

◆

سنا ہے عافیت خطرے میں ہے عزت مآبوں کی
تو پھر جاری رہے یلغار ساحل پر حبابوں کی

کبھی طوفان اٹھتے ہیں، کبھی سیلاب آتے ہیں
ضرورت پڑ گئی محلوں کو ہم خانہ خرابوں کی

تبسم سب کے ہونٹوں پر، محبت سب کے سینوں میں
مگر تعبیر الٹی ہے مرے معصوم خوابوں کی

ہماری آبلہ پائی نے کیا کیا گل کھلائے ہیں
ادھر جنگل ہے کانٹوں کا، ادھر فصلیں گلابوں کی

کسی گوتم، کسی سرمد، کسی سقراط سے پوچھو
کہ یہ فہرست میں شامل ہیں میرے ہم رکابوں کی

جنوں کے پاؤں میں زنجیر، وحشت کے لیے زنداں
خردمندو! کوئی حد ہے تمہارے احتسابوں کی

مظفر عالموں کے خون میں حدت نہیں ہوتی
سکھاؤ تجربے کی دھوپ میں سیلن کتابوں کی

◆

عیاں رفیقوں پہ تھیں کم عیاریاں میری
عداوتوں میں کھلیں وضع داریاں میری

ہر ایک شہر میں معصوم لوگ رہتے ہیں
خود اپنی ذات پہ ہیں سنگباریاں میری

میں برگِ زرد سہی، آسماں پہ ہے دماغ
بگولے آگ، سمندر سواریاں میری

تمام رات چنے اپنے پاؤں کے کانٹے
ستارے کرنے لگے غمگساریاں میری

گھٹا نہیں ہوں مگر ٹوٹ کر برستا ہوں
دھنک نہیں ہوں مگر تازہ کاریاں میری

سمٹ کے پھول بنیں تتلیوں کا روپ لیا
میاں فضول نہیں آہ و زاریاں میری

مظفر آج کے شداد ہوں کہ ناقد ہوں
سبھی کے دل میں غزل کی کٹاریاں میری

❀



مظفر حنفی

◆

…بنو گے حسین چہروں سے، شغلِ بادہ نہیں کروگے
…یف نامہ امری غزل سے تم استفادہ نہیں کروگے

…انے جتنے کے تیغ و خنجر میں اپنے سینے پہ جھیلتا ہوں
…قسم کھاؤ، سر جھکانے کا پھر اعادہ نہیں کروگے

…نے وہ سرخ سیلاب ہو سکتی ہے وہ زرد آندھی
…ن ہوگے تو کوئی دیوار ایستادہ نہیں کروگے

…ہیں کہ دو چار بار ٹوٹا جو پارساؤں نے راستے میں
…راستی کی سڑک پہ تم بھی سفر زیادہ نہیں کروگے

…کی لئے بار بار میرے قدم اسی سمت بڑھ رہے ہیں
…ہا گیا ہے کہ شہرِ ممنوع کا ارادہ نہیں کروگے

…تمہاری اپنی انا کے ہاتھوں سے زخم آتے ہیں روح و دل پر
…نہ بھریں گے یہ زخم جب تک مزاج سادہ نہیں کروگے

…ہ کج ادائی، یہ کم نگاہی، یہ خود پرستی، یہ بدگمانی
…گھٹن بڑھے گی، تم اپنے دل کو اگر کشادہ نہیں کروگے

…قرآن پہ حرف آئے مظفر مگر گرہ میں یہ باندھ لینا
…بہت کم بچا ہے تن میں، کسی سے وعدہ نہیں کروگے

سہ شعوری لغزش

◆

پھول زخموں کے چنے، دھول کلہ پر رکھی
خون کی بوند مظفر نے مژہ پر رکھی

زرد پتے پہ دمکتی ہوئی شبنم تو نے
آگ سی میرے دلِ خاک شدہ پر رکھی

میں گنہ گار بھی ہوں لالۂ صحرا جیسا
جس نے خوشبو کی بنا داغ سیہ پر رکھی

آج نیزے پہ سرافراز ہے کل تک جس نے
تیغ کی شان بھی دشمن کی زرہ پر رکھی

داورِ حشر نے ایمان عطا فرمایا
ہم نے ایقان کی بنیاد شبہ پر رکھی

غالباً آج بھی شب خون ہے پڑنے والا
کوئی قندیل نہیں شہر پناہ پر رکھی

عرض کرتے بھی تو کیا، حال سناتے کیسے
گفتگو آپ نے مرکوز نفعہ پر رکھی

اس سے پہلے کہ کروں کم نگہی کا شکوہ
اس نے تہمت مری بے باک نگہ پر رکھی

◆

مری نگاہ میں عزت مآب آپ نہیں
کہ خوفِ جاں ہے جہاں ہم رکاب آپ نہیں

ہر ایک درد پہ لازم نہیں کہ دل میں ہو
کچھ اور ہے، سببِ اضطراب آپ نہیں

بجا کہ مانگا ہوا ہے مرا لحاف ابھی
مگر حضور، مرے آفتاب آپ نہیں

بلا سے تیز ہوائیں چلیں خطر کیا ہے
حباب آپ نہیں ہیں گلاب آپ نہیں

کوئی ٹھکانہ ہے ہم خانہ خرابوں کا
ہزار شکر کہ خانہ خراب آپ نہیں

مبارک آپ کو یہ اعتمادِ ساحل پر
ہماری طرح ابھی زیرِ آب آپ نہیں

یہی ہے طور مظفر غزل کی محفل کا
جنابِ شیخ پئیں گے شراب آپ نہیں

◆

الجھے داڑھی چوٹی میں
کھیلو پھاگ لنگوٹی میں

بکتا دیکھا ہے ایمان
دو بوٹی اک روٹی میں

سچے در سچے ہیں ہم
سارا کھوٹ کسوٹی میں

سب اپنوں کا حصہ ہے
میری بکا بوٹی میں

آج مظفر ماند ہوئے
کل تک تھے کب اوٹی میں

پروفیسر اقبال چیئر، کلکتہ یونیورسٹی، کلکتہ

سریندر پرکاش

۴/۴۳، یوگی راج آشرم، ہنس بگا مارگ، کالینہ، بمبئی ۔ ۹۸

فسان

[قسط نمبر ۵]



دور سے اسٹیشن کے انجن کی آواز اندھیرے اور خاموشی کو چیرتی ہوئی ابھری۔ اور پھر آہستہ آہستہ قریب آنے لگی حتیٰ کہ کوٹھی کے باہر پہنچ کر اسکے رکنے کا احساس ہوا۔ اور پھر انجن بند ہو گیا۔ کچھ لوگوں کے آپس میں باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ اور پھر قدموں کی چاپ۔ ان آوازوں میں اقبال کے والد سردار دیوان چند کی آواز بہت نمایاں تھی۔ اقبال نے سوتے سوتے یہ سب سنا۔ اس کا باپ کہہ رہا تھا۔

"دیکھا تم نے منشی جی! اس حرامی تحصیل دار کے کرتوت، ہمیں کچھ کہتا رہا۔ اور کمشنر صاحب کو اور ہی کچھ لکھتا رہا۔ گورو صاحب نے ٹھیک کہا ہے۔ اگر مسلمان تیل میں بانہہ ڈبو کر پھر کالے تلوں کی بوری میں بانہہ ڈال دے اس پر جتنے تل چڑھ جائیں اتنی قسمیں کھائے تو بھی اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بڑی بے ایمان قوم ہے۔"

"چلو شاہ جی اب تو سب ٹھیک ہو گیا، کمشنر صاحب نے تو اس کی مٹی ہی پلید کر دی سب کے سامنے" منشی بولا۔

"اور نہیں تو۔ اچھا منشی جی یاد سے کمشنر صاحب کو ڈالی بھجوا دینا۔"

"جی بہت بہتر۔ میں اب جاؤں۔؟"

"ہاں! چلو رات کافی ہو گئی ہے۔" پھر قدموں کی آواز اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ اقبال نے آہستہ سے سر اٹھا کر شوکت کے بستر کی طرف دیکھا شوکت بدستور آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ اقبال پھر بھی تسلی کرنا چاہتا ہے۔ کہ وہ کہیں جاگ تو نہیں رہا، اس نے یہ سب سنا تو نہیں؟ اس نے دبی آواز سے پکارا:۔

"شوکت!"

شوکت نے جواب میں کروٹ بدلی اور پھر اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا "یا اللہ!"

اقبال نے گاڑی کے قریب کھڑے ہو کر اپنے ورثے کو انتہائی غور سے دیکھا اور پھر ملازموں کے سلام کا جواب دیتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔

شام ہو گئی تھی۔ سائے اپنے اپنے خلا میں سمٹ گئے تھے۔ گھر کے ملازم لکھو نے بہت سی لالٹینیں برآمدے میں رکھی تھیں۔ ان میں سے کچھ لٹکانے والی تھیں، کچھ میزوں پر رکھنے والی اور کچھ دیواروں پر ٹانگنے والی۔ سب کی چمنیاں الگ کر کے لشکائی جا رہی تھیں۔ بتیاں کاٹی جا رہی تھیں اور ان کی ٹنکیوں میں کیروسین بھرا جا رہا تھا۔ پھر یہ سب ختم ہوا اور ایک ایک کر کے لالٹینیں جل اٹھیں۔ اقبال نے اور شوکت نے یہ سارا عمل برآمدے میں پڑی آرام کرسیوں پر بیٹھ کر دیکھا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اندھیرا ہو گیا۔ اور ساری لالٹینیں ایک ایک کر کے وہاں سے اٹھیں۔ اور اپنے اپنے ٹھکانے پر جا بیٹھیں۔ ایک لالٹین ٹھیک ان کے اوپر دیوار سے لٹکا دی گئی تھی۔ اور وہ پیلی مدھم سی روشنی میں اس طرح بیٹھے باتیں کر رہے تھے جیسے ہزاروں برس پرانے بھوت قبرستان کی چار دیواری پر بیٹھے ہوں۔

"روٹی ٹیک گئی ہے چھوٹے شاہ جی!" ایک آواز جیسے کسی قبر سے آئی۔

یہ اسی لکھو ملازم کی آواز تھی۔ جس نے دن ڈھلتے لالٹینیں جلائی تھیں۔

"آؤ شوکت کھانا کھا لیں!" اقبال نے کہا اور وہ دونوں اٹھے اور اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں ایک بڑا سا ڈائننگ ٹیبل لگا تھا۔ سر پر ہاتھ سے کھینچنے والا پنکھا تھا۔ جس کی رسی کسی دوسرے کمرے میں سے کھینچی جا رہی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ لمبا سا سائیڈ بورڈ تھا جس کے اوپر کچھ آرائشی سامان پڑا تھا۔ اور شیشے کے دروازوں والے خانوں میں انگلش کراکری رکھی تھی۔ میز پر ایک بڑا سا چاندی کا کینڈل اسٹینڈ تھا جس پر تین موم بتیاں جل رہی تھیں۔ اچھی خاصی روشنی تھی۔ دیوار کے ساتھ بڑا سا سفید سیفری جرمیر تھا۔ جو کیرو سین سے چلتا تھا۔

یہ محاورہ غیر منقسم پنجاب کی روزمرہ گفتگو میں بولا جاتا تھا ورنہ تو جس عظیم شخصیت سے اسے منسوب کیا گیا ہے ان کی اعلیٰ تعلیمات سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ مصنف کو اس کے استعمال کی ناگزیریت پر بے حد دکھ ہے۔ تاریخ داں حضرات تعصبات کی نفسیات سے بخوبی واقف ہیں۔ [سریندر پرکاش]

شوکت کو یہ سب بہت شاندار لگا۔ اسے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ سردار اقبال چند سبھروال ولد سردار دیوان چند سبھروال والے کافی متمول لوگ ہیں۔ وہ کھانے کے گرد آمنے سامنے بیٹھ گئے تھے۔ بیچ میں میز جس پر سفید لنن بچھی تھی۔ ایک طرف کچھ نیپکن بڑے قرینے سے طے کر کے رکھے تھے۔ اور ایک بڑے سے باؤل میں مالٹے رکھے تھے۔ جن کی جلد گہری سبز تھی۔ دونوں کے درمیان میز کا فاصلہ شوکت کو بہت زیادہ لگا۔ اس نے دھیرے دھیرے اس فاصلے کو پاٹنے کی کوشش کی۔ ملازم نے پلیٹیں لگا دیں اور ڈونگوں میں کھانا آگیا۔

"لو یہ مرغ ہے!" اقبال نے کہا شوکت نے ہاتھ بڑھا کر ڈونگا لیا۔ سروس اسپون سے مرغ کی ایک ٹانگ اور شوربا پلیٹ میں ڈالا۔

"اور یہ لو کوفتے!"

"شوکت نے ڈونگا ہاتھ میں لے کر بڑی دبی زبان سے پوچھا۔

"اقبال! یار برا نہ ماننا۔ کوفتوں کا گوشت؟.....؟"

"کیا مطلب؟؟"

منشی عطر سنگھ نے اٹھ کر اس کا سواگت کیا۔ اقبال نے محسوس کیا۔ منشی عطر سنگھ کافی بوڑھا ہو گیا ہے۔ وہ اسے اپنے والد کی یادگار دکھائی دیا۔ سردار دیوان چند کی موت کے بعد منشی عطر سنگھ نے اسے ایک کمرے میں لے جا کر سارا حساب کتاب سمجھا دیا تھا۔ اس کی والدہ دہلی دروازے کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اور جب عطر سنگھ کام ختم کرنے کے بعد ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوا تھا۔ اور اس نے کہا تھا۔ شاہنڈی جی چھوٹے شاہ جی اب میرے لئے کیا حکم ہے؟ تو دونوں ماں بیٹے منشی کے گلے لگ کے دھاڑیں مار مار کر رونے لگے تھے۔ اس کی والدہ نے کہا تھا۔

"منشی جی آپ تو ہمارے کنبہ کے آدمی ہیں۔ وہ بھی تو نام ہی کے مالک تھے۔ سارا کام کاج تو آپ ہی چلاتے تھے۔ اس بچے کے سر پہ اپنا ہاتھ رکھ دیں آپ کے بغیر ہم کس کام کے ہیں۔؟"

منشی جی نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی تھی۔ اور کہا تھا۔

"شاہنڈی جی آپ نے مجھے بڑی عزت بخشی ہے۔"

اقبال کھڑا بغور منشی کے چہرے پر دیکھتا رہا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی عمر کا جائزہ لے رہا ہے۔

"کیسا چل رہا ہے کام منشی جی؟" اس نے ایسے ہی پوچھ لیا۔

"واہگورو کی کرپا ہے۔ مگر اس شہر میں کچھ زیادہ ملنے والا نہیں" دونوں بیٹھ گئے اور ایک ملازم نے مٹکے میں سے پیتل کا گلاس بھر کر اقبال کے سامنے رکھ دیا۔ اقبال نے پانی پیا اور بولا۔

"چلو عزت تو رہ جائے گی۔؟"

سڑک پر بیری بچھانے کی آواز۔ انجن کے بری کھینچنے کی آواز اور تیز ہوا کی سائیں سائیں۔ اقبال اس سارے ماحول میں دبکا بیٹھا رہا۔ سب کچھ اپنے آپ ہو رہا تھا۔ یہ تو اس کے والد کے وقت بھی اپنے آپ ہوتا تھا۔ اور اچانک اسے ایک عجیب سی اکتاہٹ سی محسوس ہونے لگی۔

"اچھا تو پھر میں چلتا ہوں منشی جی۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھا میں پرسوں گھر آتا ہوں" منشی جی نے جواب دیا۔ اور اقبال کھوکھے سے نکل کر پھر گاڑی میں آ بیٹھا۔ یعقوب ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا، گاڑی نے حرکت کی، اچکے سے ہوتی ہوئی گاڑی موڑ کاٹ کر پھر پکی سڑک پر آگئی۔

"دردِ دل، دردِ دل......" اقبال کے ذہن میں دل، اور دردِ دل کے الفاظ گونجنے لگے۔

اگلی صبح جب شوکت اور اقبال بیدار ہوئے تو ان دونوں کو لگا دنیا بدل چکی ہے۔ نیچے سے اقبال کی والدہ کی آواز آ رہی تھی۔ وہ شاید برآمدے میں مونڈھے پر بیٹھی۔ جپ جی صاحب کا پاٹھ کر رہی تھی۔

اقبال نے جھانک کر نیچے دیکھا۔ صحن میں ساری دنیا ویسی کی ویسی بسی تھی جیسی کہ تصور کی جا سکتی تھی۔ اور برآمدے میں سے جپ جی صاحب کے پاٹھ کی آواز ابھر رہی تھی۔

شوکت اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔ اس نے اقبال کے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھا۔ اقبال نے پلٹ کر دیکھا "کیا سوچ رہے ہو؟" شوکت نے پوچھا۔

"کچھ نہیں...... ایسے ہی....." اقبال کو خود محسوس ہوا اس نے دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ بول دیا ہے۔ وہ اپنے احساس کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا

"آؤ ذرا باہر ہو کر آئیں۔" شوکت نے پھر کہا۔

"پاخانہ تو گھر میں بھی بنا ہوا ہے۔" اقبال نے یونہی کہہ دیا۔

"نہیں باہر ہی چلتے ہیں۔"

دونوں چپ چاپ سیڑھیاں اتر کر صحن میں سے گزرتے ہوئے مکان سے باہر نکل گئے۔

کھیت چنے سے بھرے پڑے تھے۔ چنے کے ساتھ ہرے ہرے توتے یوں لہراتے تھے جیسے بہت سے چند آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہوں۔ تھوڑی

[باقی صفحہ ۱۴۱ پر دیکھئے]



نعمان شوق

میری آنکھوں میں دمکتا ہوا چہرہ اس کا
کب سے جزدان میں رکھا ہے صحیفہ اس کا

صاف بچ جاتے مرے ہاتھ قلم ہونے سے
کاش میں نے بھی لکھا ہوتا قصیدہ اس کا

کون ہے جو اسے کہتا ہے اندھیروں کا نقیب؟
شام ہوتی ہے تو کھل اٹھتا ہے چہرہ اس کا

ہنس رہا ہوگا کسی شاخ کے پیچھے سورج
پیڑ سے چھین رہا ہے کوئی سایہ اس کا

زندگی کیسی لگی تم کو بتاؤ لوگو
میں نے دیکھا بھی نہیں ٹھیک سے چہرہ اس کا

وہ پرندہ جسے جنگل کی ہوا بھی نہ لگی
لوگ دکھلائیں کے ہر شاخ سے رشتہ اس کا

رہ گذر یاد کی سوئے ہوئے مدت گذری
اس گلی میں کبھی کھلتا تھا دریچہ اس کا

● ملکی محلہ آرہ ۱۰۲۳۰۸ ـ (بہار)



ناظم جعفری

مجھے یقین کا دھوکہ کبھی گماں پہ نہیں
قدم زمیں پہ رکھتا ہوں آسماں پہ نہیں

سلیقہ عمر گذرنے پہ آئے گا ہم کو
کہاں پہ اپنی زباں کھولئے کہاں پہ نہیں

کبھی تو فکر و عمل کا حصار ٹوٹے گا
کروں گا فخر نتیجہ پہ امتحاں پہ نہیں

نہ آئے گا مری چوکھٹ پہ سر جھکانے کو
ستارا میرے مقدر کا آسماں پہ نہیں

تمہاری آنکھوں کا پیغام مل گیا مجھ کو
دروغ گوئی کا الزام اب زباں پہ نہیں

نہ جانے کونسی منزل کہاں پہ آئے گی
بھروسہ مجھ کو ذرا میر کارواں پہ نہیں

نہ پوچھیں بزم میں ناظم کا حال ناظم سے
وہ دل کی بات کہے گا مگر یہاں پہ نہیں

● ہر تیرتھ کلینک حکیم محمد جعفر روڈ، دال منڈی، وارانسی ـ ۱



ضمیر کاظمی

دنیا کی سلطنت میں خدا کے خلاف ہیں
شہر چراغ میں جو ہوا کے خلاف ہیں

فرسودہ و فضول روایت کے نام پر
اپنے تمام دوست وفا کے خلاف ہیں

خاموشیوں کے دشت میں کیوں چیختے ہو تم
قانون سب یہاں کے صدا کے خلاف ہیں

کب سے اڑا رہی ہیں قناعت کی دھجیاں
یہ حاجتیں جو صبر و رضا کے خلاف ہیں

انسانیت کی خیر ہو یارب زمین پر
کچھ بے شعور لمحے قضا کے خلاف ہیں

لب کے تمام حرف ہوئے بے اثر ضمیرؔ
حالات زندگی کے دعا کے خلاف ہیں

● ۱۲۹ـ۱۳۲، پائپ روڈ کرلا ویسٹ بمبئی



جاوید اقبال

روزنامہ ہندستان، ایکسپریس ٹاور، نریمان پوائنٹ، بمبئی ۲۱

سیمنٹ کے درخت

'آپ کو کہاں جانا ہے صاحب؟ میں کہوں، آپ مزدور سیمنٹ فیکٹری جائیں گے۔ آپ جیسے سوٹ بوٹ اور بیگ والے صاحب تو سیمنٹ فیکٹری ہی جاتے ہیں۔ فیکٹری نہیں جائیں گے تو کیا ہم لوگوں کی بستی جائیں گے۔

'نہیں صاحب! اب کوئی سواری نہیں ملے گی۔ اب تو شام ہونے کو آئی۔ اس منی بس کو بھی یہیں خراب ہونا تھا۔ سالے اوپر نیچے بوروں کی طرح سواری لاد لیتے ہیں، قصائی کی طرح پیسے وصولتے ہیں، ہم جیسے لوگوں کو تو گالیاں بھی دیتے ہیں۔ بالکل اپنی رعیت سمجھتے ہیں صاحب! اوپر سے گاڑی کی مرمت پر دھیان نہیں دیتے۔ گاڑی خراب نہ ہو تو کیا ہوائی جہاز کی طرح چلتی رہے۔ مگر ہم لوگ بھی کیا کریں؟ مجبوری ہے۔ آنے جانے کا اور کوئی اپائے نہیں ہے۔ سب جھیلنا پڑتا ہے۔ سرکار بھی تو ادھر بس نہیں چلاتی۔

'فیکٹری؟ یہی کوئی آدھا کوس ہوگی اب۔ لائیے میں آپ کا بیگ لے لوں۔ آپ جیسے لوگوں کو تو پیدل چلنے کی عادت بھی نہیں ہوتی۔ اس لئے آپ کو دقت ہو رہی ہوگی۔ ہم لوگوں کے نصیب میں تو پیدل چلنا ہی لکھا ہے۔ منی بس سے اترنے کے بعد بھی پیدل چلنے کیلئے کوس بھر پیدل چلنا پڑتا ہے۔ دکھ ہی دکھ ہیں ہماری زندگی میں۔ ایک دو باتیں ہوں تو بتا دی جائیں۔ پینے کا پانی لانے کے لئے بھی بہت دور جانا پڑتا ہے۔ گرمی میں یہ دوری اور بڑھ جاتی ہے۔ جو تھوڑی بہت فصل ہوتی تھی، وہ بھی اس سال ماری گئی۔ سرکار کی طرف سے کم قیمت کا اناج ایک دو بار ہی ملا۔ پھر پتہ نہیں وہ کہاں غائب ہوگیا۔ کوئی بیمار پڑے تو علاج کرانے کو پاتے نہیں۔ کہنے کو تو بستی میں ایک سرکاری دواخانہ ہے۔ مگر اس کے ڈاکٹر اور ان کا سارا عملہ شہر ہی میں رہتا ہے۔ اسپتال میں بس چوکیدار رہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کے عملے کے درشن مہینے دو مہینے میں ایک بار ہی ہوتے ہیں۔

' آپ صاحب کیا فیکٹری میں کام کرتے ہیں؟ نہیں! تو کیا آپ نئی بحالی پر جا رہے ہیں۔ اچھا تو آپ اخبار والے ہیں۔ میں بھی تو بدھو ہوں، آپ کے گلے میں لٹکی یہ چیز فوٹو کھینچنے کا کیمرہ ہے نا! اسے دیکھ کر مجھے آپ کے جانے بغیر ہی سمجھ جانا چاہئے تھا۔ اصل میں اخبار والوں کو دیکھنے کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ اب تک کی زندگی میں بس دو تین بار ہی اخبار والوں کو دیکھا ہے۔ پچھلے سال جب فیکٹری کے گیٹ پر گولی چلی تھی اور اس سے کالو مارا گیا تھا تو پولس والوں کے ساتھ کئی اخبار والے بھی آئے تھے۔ ارے گولی بے وجہ چلی تھی صاحب! مزدوروں کی پگار کا حساب کرنے والی مشین سے حساب کرنے میں غلطی ہوگئی۔ مزدوروں نے اپنی واجب پگار مانگی۔ مگر افسروں کو مشین پر زیادہ بھروسہ تھا۔ انہوں نے بات نہیں مانی۔ بات بڑھتی گئی اور فیکٹری والوں نے پولس کو بلایا۔ ایک دن فیکٹری کے گیٹ پر سارے مزدور جمع تھے اور واجب پگار دینے کے لئے نعرے لگا رہے تھے۔ پولس کو لگا کہ مزدوروں کے ارادے خطرناک ہیں۔ پولس نے گولی چلا دی۔ بے چارہ کالو مارا گیا۔ کئی مزدور گھائل ہوگئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ مزدوروں کی بات ہی ٹھیک تھی۔ آپ تو اخبار والے ہیں۔ ساری باتیں جانتے ہی ہوں گے۔

'اچھا تو آپ کالو کے گھر والوں سے بھی ملیں گے۔ ان کی حالت جاننے کے لئے بھی آئے ہیں۔ ان کی حالت بہت خراب ہے صاحب! ایک اکیلا کالو ہی اپنے گھر میں کمانے والا تھا۔ کالو کے گھر والوں کو سرکار نے بھی مدد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر اب تک کوئی مدد نہیں ملی۔ فیکٹری والوں نے کالو کی بیوہ کو کچھ روپئے دئیے تھے۔ اس کو نوکری دینے کا بھی وعدہ کیا تھا۔ مگر پھر فیکٹری والوں نے اس کی کوئی کھوج خبر نہیں لی۔ آپ ملنے جائیں گے ہی۔ ساری باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ پھر انہیں اخبار میں چھاپئے گا۔ لیکن اخبار میں چھپنے سے کیا ان کی مصیبت دور ہو جائے گی؟ اچھا' سرکار اور اونچے افسروں تک ان کی حالت کی خبر پہنچے گی۔ چلئے اسی سے شاید کچھ ہو جائے۔'

'یہ تو صرف کالو کی بات ہوئی۔ سیمنٹ فیکٹری کے پاس بنی مزدوروں کی کالونی اور آس پاس کی بستیوں کے لوگوں کو جو نرک بھوگنا پڑتا ہے، اسے آپ نہیں جانتے ہوں گے صاحب! سب سے پہلے یہی کیا کم تکلیف ہے کہ جب فیکٹری چلتی

ہے تو کالونی اور بستیوں کے گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں بند رکھنی پڑتی ہیں۔ فیکٹری کی چمنیوں سے نکلنے والی سیمنٹ کی دھول سے بچنے کے لئے۔ اگر بھول سے کھڑکیاں اور دروازے کھلے رہ گئے تو یہ دھول کھانے پینے کی چیزوں پر جم جاتی ہے اور کھانا حرام ہو جاتا ہے۔ آپ تو کالونی جائیں گے ہی۔ وہاں کے گھروں کی چھتوں، پیڑوں اور پودوں کو غور سے دیکھئے گا۔ آپ کو لگے گا جیسے یہ چیزیں سیمنٹ کی بنی ہوں۔'

' نہیں صاحب، میں شاعری واعری اور اس جیسی باتیں بھلا کیا جانوں میں تو پڑھا لکھا بھی نہیں ہوں۔ بچپن میں گھر سے بھاگ کر رانچی چلا گیا تھا۔ وہاں ایک بڑے صاحب ملے رحمان صاحب۔ ان کے گھر میں کئی برسوں تک کام کرتا رہا۔ وہیں دو لفظ بولنے کا ڈھنگ آگیا۔ آپ جیسے لوگوں سے چار باتیں کر لیتا ہوں۔'

' میں زہریلی دھول کے بارے میں بتا رہا تھا صاحب۔ اس زہریلی دھول نے نہ جانے کتنے معصوم لوگوں کی جانیں لی ہیں صاحب۔ ہم گھروں کی کھڑکیاں اور دروازے تو بند رکھتے ہیں مگر دن رات گھر میں بیٹھے تو نہیں رہ سکتے ہزار کام ہوتے ہیں۔ باہر تو نکلنا ہی پڑتا ہے۔ بس تبھی یہ زہریلی دھول ہماری سانسوں کے راستے پھیپھڑوں میں جمع ہوتی رہتی ہے اور انہیں کھوکھلا بناتی رہتی ہے پھر بیمار کر دیتی ہے۔ ہم غریبوں کو کھانا پینا تو ٹھیک سے میسر ہوتا نہیں، اسپتال میں دوا ملتی نہیں، پرائیویٹ علاج کرانے کی طاقت نہیں۔ انجام یہ ہوتا ہے کہ کھانستے کھانستے مر جاتے ہیں۔'

' بات یہیں ختم نہیں ہوتی صاحب! اس زہریلی دھول نے اور دور تک پنجے گاڑے ہیں۔ اس نے ہمارے کھیتوں کی فصل بھی چھین لی ہے۔ کبھی سونا اگلنے والی دھرتی اب بنجر ہوتی جا رہی ہے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے صاحب کہ فیکٹری کا زہریلا پانی کھیتوں میں بہایا جاتا ہے۔ اب لاکھ محنت کریں کچھ اُپجتا ہی نہیں۔ پہلے کھیتوں کی اُپج سے کافی سہارا ملتا تھا۔ اب یہ آسرا بھی نہیں۔ یہی نہیں، پھل دینے والے پودوں اور پیڑوں کے پھولوں میں بھی یہ اجلی دھول جم جاتی ہے اور پھل دینے سے پہلے ہی پھول جھڑ جاتے ہیں۔ ساگ سبزی کی کھیتی بھی محال ہو گئی ہے۔'

' اس زہریلی دھول نے ہماری روزی کا ایک اور راستہ بند کر دیا ہے اخبار والے صاحب! یہاں کی سُنیرا ندی ہمارے لے جیون دائنی تھی۔ آس پاس کی بستیوں کے لوگ اسی ندی کا پانی پیتے تھے۔ کنارے کے کھیتوں میں بھی یہی پانی پٹاتے تھے۔ مگر اب فیکٹری کا کیمیکل ملا پانی ندی میں بھی بہایا جاتا ہے۔ اس سے پانی بہت گندا ہو جاتا ہے۔ آس پاس کی آبادی کے لئے نزدیک میں پینے کے پانی کا اور کوئی آپاتے نہیں۔ دور سے ڈھو کر اور کتنا پانی لایا جا سکتا ہے۔ سو مجبوری میں لوگوں کو ندی کا گندا پانی بھی پینا پڑتا ہے۔ یہ پانی بھی بیماریوں کی جڑ ہے۔ میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ دوا علاج کا ان بستیوں میں نہ کوئی مناسب انتظام ہے اور نہ لوگوں کے پاس اتنے پیسے ہیں کہ شہر جا کر علاج کرا سکیں۔ بس بیماریوں سے کھلتے رہتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔'

' میں اتنی دیر سے آپ کا دماغ چاٹے جا رہا ہوں۔ میری بک بک سے آپ پریشان ہو گئے ہوں گے۔ اچھا! ایسی بات نہیں ہے! یہ سب جاننے کے لئے ہی آپ یہاں آئے ہیں۔ تب تو میری بک بک بیکار نہیں گئی۔ مگر اب تک تو آپ تھک گئے ہوں گے۔ پیدل چلنے کی عادت جو نہیں آپ کو۔ دیکھئے کچھ دور پر آپ کو جو جھونپڑی دکھائی دے رہی ہے وہاں آپ کو چائے مل سکتی ہے۔ سگریٹ بھی چاہیں گے تو مل جائے گی۔ لیکن سستی والی سگریٹ ملے گی۔ ولیس نہیں جس کے ایک کنارے پر روئی لگی رہتی ہے۔ اتنی مہنگی سگریٹ یہاں کون پیئے گا۔ اچھا، آپ کے پاس اپنی سگریٹ ہے۔ تب تو کوئی بات نہیں۔ چلئے چائے پئیں گے اور دم لے کر آگے بڑھیں گے۔ بس اب زیادہ دور نہیں چلنا پڑے گا۔ سامنے وہاں جو پہاڑی دکھائی دے رہی ہے نہ، بس اُس کے پرلے طرف ہی فیکٹری اور ہم لوگوں کی بستیاں ہیں۔'

' ہاں صاحب! چائے پینے کے بعد تو پھرتی آگئی ہے ..... نہیں ایسا نہیں ہے کہ سیمنٹ فیکٹری کی زہریلی دھول کے نقصان سے ہم انجان تھے۔ فیکٹری لگنے کے کچھ ہی مہینوں بعد ہمیں پتہ چل گیا تھا کہ یہ دھول زہریلی ہے۔ ہم لوگوں نے فیکٹری کے افسر سے یہ بات کہی۔ ان لوگوں نے فیکٹری کے ڈاکٹر کو اس معاملے کی جانچ کرنے کے لئے کہا۔ آپ ہی بتائیے کہ فیکٹری ہی میں اپنی روزی کمانے والا ڈاکٹر بھلا کیوں سچ بات کہہ کر اپنی نوکری خطرے میں ڈالتا کہ اس کی دھول سے بیماریاں پھیلتی ہیں۔ لیکن ہم لوگ تو سیدھی بات جانتے ہیں۔ فیکٹری لگنے سے پہلے یہ بیماریاں نہیں تھیں ـــــ فیکٹری اور اس کی دھول ہی ساری بیماریوں کی جڑ ہے۔'

' کئی برسوں بعد ہم نے پھر آواز اٹھائی۔ اس بار مزدوروں کے کئی لیڈر بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہم نے سرکاری افسروں تک بھی اپنی بات پہنچائی پھر وہی ہوا۔ سرکاری افسروں کی ایک ٹولی آئی۔ انہیں فیکٹری کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا۔ ان کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ ہماری بستی کا سالو، ریسٹ ہاؤس میں کام کرتا تھا، اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان افسروں کو جیپ سے ہمارا علاقہ گھمایا گیا۔ وہ لوگ تو چلے گئے لیکن انہوں نے کیا رپورٹ دی، اس کا پتہ آج تک نہیں چل سکا۔ مزدور نیتا لکھن پھر نظر

نہیں آتے "

" پچھلے سال یہاں محکمہ منتری آئے تھے صاحب! ہم لوگوں نے بڑی مشکل سے ان سے ملنے کا وقت لیا اور اپنی بات کہی۔ محکمہ منتری نے فیکٹری افسروں سے پوچھا۔ سب سے بڑے افسر نے بتایا کہ دھول کو روکنے کا اُپائے کیا جا رہا ہے۔ جلد ہی دو کروڑ روپئے کی ایک مشین لگائی جائے گی جس سے دھول کا نکلنا بند ہو جائے گا۔۔۔۔ اچھا اُس دن آپ بھی آئے تھے۔ تب تو میں بیکار یہ سب باتیں آپ کو بتا رہا۔ لیکن اصلی بات آپ نہیں جانتے ہوں گے۔ میں بتاتا ہوں۔ ہاں تو تین مہینے بعد دو کروڑ کی وہ مشین لگائی گئی۔ سرکار کے ایک بڑے افسر نے مشین کو چالو کیا۔ لیکن میں آپ سے بتاؤں؟ مشین لگنے کے کئی دنوں بعد بھی وہی حالت ہے۔ فیکٹری کی چمنیوں سے نکلنے والی دھول کا زہر اب بھی ہماری زندگی میں گھل رہا ہے صاحب!"

" مشین لگنے کے بعد بھی سرکار کے کئی افسر آئے۔ انہوں نے مشین کو دیکھا پرکھا۔ اس کی جانچ کی۔ جانچ کے بعد انہوں نے بتایا کہ مشین ٹھیک کام کر رہی ہے۔ بھید کی بات تو رگھوبیر نے بتائی۔ رگھوبیر کو آپ نہیں جانتے ہوں گے۔ پاس کی بستی کا لڑکا ہے۔ کالج تک پڑھا ہے۔ کسی پارٹی کا ممبر ہے۔ پارٹی کا نام تو مجھے یاد نہیں۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ سرکار اس پارٹی کے لوگوں کو پسند نہیں کرتی۔ ان کی دھڑپکڑ کرتی رہتی ہے۔ حالانکہ مجھے تو رگھوبیر اور اس کے ساتھیوں میں کوئی ایسی ویسی بات نظر نہیں آئی۔ اچھے بھلے لڑکے ہیں۔ لوگوں سے ایک ہونے اور اپنے ادھیکاروں کے لئے لڑنے کی بات کرتے ہیں۔

" دیکھئے میں تو دوسری ہی بات کرنے لگا۔ ہاں تو رگھوبیر نے بھید کی جو بات بتائی وہ میں اب آپ کو بتاتا ہوں۔ اُس نے بتایا کہ دھول روکنے والی مشین لگا تو دی گئی ہے لیکن چلائی نہیں جاتی۔ پہلے تب تو دھول رُکے مشین بند رہتی ہے۔ جب کوئی منسٹر یا سرکار کے اعلیٰ افسر آتے ہیں تو فیکٹری کے افسران انہیں مشین چلا کر دکھا دیتے ہیں۔ وہ لوگ سنتشٹ ہو جاتے ہیں۔ فیکٹری کے افسر واہ واہی لوٹتے ہیں کہ انہیں فیکٹری کے کامگاروں اور آس پاس کی بستیوں کا بہت خیال ہے۔ مگر سچی بات تو یہ ہے کہ فیکٹری ہمارے لئے ابھشاپ بن گئی ہے۔ اس نے ہمارے لوگوں کے کلیجے چھلنی کیے، ان کی قربانی لی۔ اس نے ہمارے کھیتوں کی فصل چھینی، ہمارے پینے کا پانی چھینا اور لگاتار ہماری زندگی میں زہر گھول رہی ہے۔"

" نہیں نہیں۔ ہم لوگوں کو فیکٹری سے کوئی دشمنی نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ سیمنٹ دیش کی ترقی کے لئے بہت ضروری ہے۔ ہم فیکٹری کے خلاف بھی نہیں۔ لیکن ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ یہ فیکٹری ہماری دھرتی کا اور ہمارے لوگوں کا لہو چوستی رہے۔ ہم اتنا چاہتے ہیں کہ اس فیکٹری سے زہریلی دھول کا اڑنا بند ہو۔ ہمارے کھیتوں کو فصل دینے لائق بنانے کے لئے کچھ کیا جائے۔ جن لوگوں کو اس دھول نے بیمار کر دیا ہے ان کا علاج ہو۔ بستیوں میں اسپتال ٹھیک سے کام کرے۔ ہمیں پینے کا صاف پانی ملے۔ ہم یہ بھی چاہتے ہیں اخبار والے صاحب کہ ہمارے بچے بھی پڑھیں لکھیں!

" آپ ہی بتائیے یہ مانگیں کیا نامناسب ہیں؟ نہیں نہ! چلئے آپ نے میری بات نہیں کاٹی۔ آپ ہماری بات بھی اخبار میں چھاپیے۔ اخبار تو بڑے لوگ اور حکام بھی پڑھتے ہیں۔ شاید کوئی اثر پڑے۔ میری موٹی عقل میں تو یہ بات آتی ہے کہ سرکار کے افسر اگر اچانک فیکٹری میں لگی مشین کی جانچ کریں تو سارا بھید کھل جائے۔ لیکن یہ ہو تو کیسے؟ رگھوبیر کہہ رہا تھا کہ سرکاری افسر بھی فیکٹری کے افسروں سے ملے ہوتے ہیں۔ پھر ہم غریبوں کی سنوائی کیسے ہو؟

" بس اب پہنچ ہی گئے صاحب! وہ دیکھئے فیکٹری کی چمنی دکھائی دے رہی ہے۔ وہاں پہاڑی پر جو بتیاں چمک رہی ہیں، وہیں ریسٹ ہاؤس ہے۔ یہ لیجئے سبزی بازار بھی آ ہی گیا۔ مجھے وہاں ایک کام ہے۔ اس بیچ آپ یہ سوچ لیجئے کہ آپ کو کدھر جانا ہے۔ یا تو آپ اسی سڑک سے ریسٹ ہاؤس چلے جائیے۔ وہاں خوب آؤ بھگت ہوگی۔ جیپ سے علاقہ گھمایا جائے گا اور وہی سب کچھ دکھایا جائے گا جو وہ دکھانا چاہیں گے۔ پھر شاید آپ بھی اپنے اخبار میں چھاپ دیں کہ فیکٹری میں دھول روکنے والی مشین ٹھیک کام کر رہی ہے۔۔۔ یا اگر اصلی بات جاننی ہے تو ہماری بستی چلیے۔ ساری باتیں تو میں نے آپ کو بتا ہی دی ہیں۔ آپ خود چل کر ہمارے بیمار لوگوں کو دیکھیے ہمارے بنجر ہو گئے کھیتوں کو دیکھیے، گندی ہو گئی ندی کو دیکھیے۔ چاہئے تو فوٹو بھی کھینچ لیجیے۔ پھر اُسے اپنے اخبار میں چھاپیے۔۔۔ آپ طے کر لیجئے اگر ریسٹ ہاؤس جانا ہو تو سیدھے چلے جائیے گا۔ اگر ہماری بستی میں جانا ہو تو رُکے رہیے گا۔ میں پانچ منٹ میں آ جاؤں گا۔۔۔۔

✱

بقیہ صفحہ ۳۰ ــــ نشانے

خنک ہوا۔ دور سے کسی مِل کے انجن کی کُو، کُو کی آواز اور درختوں پر چڑیوں کا چہچہانا۔ سب مل کر بہت شور تھا۔ اور دونوں کو اب لگا جیسے ان کی آواز اس شور میں دب گئی ہے۔ وہ ایک دوسرے سے کچھ نہیں بول رہے تھے۔ چپ چاپ وہ ایک بگ مختلف پگڈنڈیوں پر چلنے لگے۔ اور پھر جنگل جھاڑیوں کے پیچھے گم ہو گئے۔ [جاری]



جینت پرمار

ڈاکٹر امبیڈکر کیلئے

گندی جھونپڑپٹی کے اک کونے میں
پھول کھلا
میرا اپنا پھول
جس کی پتی پتی سے
کرنیں پھوٹ رہی تھیں
جس کی خوشبو
مرے لیے مکتی کے گیت سناتی تھی
سخت دھوپ
اور تیز ہوا نے
اس پر ظلم بہت ڈھائے تھے
آج بھی وہ
مرے لیے مکتی کے گیت سناتا ہے
گندی جھونپڑپٹی کے اسی کونے میں

● ۴۰۰/اسے، ابیلی خالا، سرکی واڑہ، شاہ پور، احمد آباد - ۱



راشد جمال فاروقی

تیسری جنگ عظیم کے بعد

چلو مراجعت کریں
مہیب جنگلوں کو پھر چلیں
نہ کوئی سمت طے رہے
نہ کوئی رخت ساتھ ہو
ان اژدہوں کا پیٹ
پھر بھریں
وہ غار پھر چہک اٹھیں
وہی لباس کھال کا
وہی خوراک، جس کے ذائقے سے
آشنائیاں بھی اب نہیں
تمام دشت صحن ہو
اور آسمان تان لیں
چلو مراجعت کریں
کہ اور کوئی صورت دگر نہیں

● ا سے - ۱۵۲۸، آئی ڈی پی ایل، ویربھدرا (رشی کیش)، دہرادون۔



قمر ادیب

گدائے رنگ وبو

اک طرف .....
حسین ایزل
موقلم
ہری نیلی سرخ
رنگ کی ڈلیاں
اک طرف .....
مصور کے آئینوں کی تاریخی
(اور گدائے فن جیسے)
بے لباس شاخوں کے
ہاتھ ہیں بلندی پہ
جھولیوں میں
آنکھوں کی

منظروں کے سکے ہیں

● ۱۴/ اللہ بس گنج - ہردوئی ۱۰۰ ۲۴۱

شفیقہ فرحت
ای۔ ۱۹۶/۲ دریا دھار۔ بھوپال ۔ ۲

چلتے چلاتے

چل تو ہم بہت دنوں سے رہے ہیں۔ لیکن ہمارے چاروں طرف وہ گھور اندھیرا تھا اور تیر تلوار کٹار اور بندوقوں اور بموں کے چلنے کی وہ کان پڑی آوازیں تھیں کہ نہ کچھ دکھائی دیتا تھا نہ کچھ سنائی۔

تو ہم چلتے ہوتے بھی رُکے ہوتے تھے۔ کان کے ہوتے ہوئے بھی بہرے بنے تھے۔ اور چہرے پہ کھلی آنکھیں جڑے جاتی، اور سور داس بنے ہوتے تھے۔

کوشش کریں گے کہ ان امراض کے حملوں کو روک دیا جائے کہ دیگر امراض اس سے زیادہ سخت اور جان لیوا ہونگے۔

مگر —— ؟

تو خیر عرض کیا ہے۔

ہمارے مانیہ اور آدرنیہ پردھان منتری ارتھات وزیر اعظم ودائے ہر زبانِ اردو کہ اس کی تعلیم آج کل ہندی میڈیم کے ذریعہ ہوتی ہے۔ انہوں نے بڑے جوش اور بڑے افسوس سے فرمایا کہ ٹنوں بلکہ ٹرکوں سونے کی ہیرا پھیری ہمیں فارن ایکسچینج کی وجہ سے کرنی پڑی اور روپیہ بھی اسی بنا پر گرانا پڑا۔

اے حضور! روپیہ کی فکر آپ نہ کیجئے۔ اس کا گرنا کیا اور اٹھنا کیا۔ ذرا سا تو ہے کمبخت۔ قیمت کی بات تو رہی الگ جسامت بھی تو دیکھئے۔ گھل گھل کے سوکھ ساکھ کے اٹھنی کے برابر بھی نہ رہا۔

کوئی ملکہ وکٹوریا کا زمانہ تو ہے نہیں کہ خوبصورت بنانے والے کارخانے یعنی بیوٹی پارلر سے نکلی خاتون کے چہرے کی طرح چمکتے دمکتے روپئے کو دیکھ کر ہی لگتا تھا کہ ہاں صاحب یہ کسی خوش حال ملک کا سکہ ہے!

کھاتا پیتا نہیں کیونکہ۔ کہ کھانے پینے میں تو ہمارا ملک صفِ اول میں جگہ پاتا ہے۔ صف کیوں۔ کہ کہاں کی صف اور کیسی صف۔ وہ تو نتھی بگڑتی رہتی ہے اپنی اس ادا میں تو وہ اول ہے، واحد ہے۔ چوٹی پر آسمان کی بلندیوں پر وہی وہ ہے۔ یعنی یہی کہ

ع سارے جہاں سے اچھا

خیر —— یہ جھاڑ جھنکاڑ۔ کل پھندے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں۔ بڑی تنگ کرتی ہیں۔ اصل بات ہی سے بھٹکا دیتی ہیں۔ گویا باجو والی گلیوں میں چلتے چلتے انسان اصل راہ ہی بھول جاتے۔

عرض یہ ہے کہ روپئے کو پھسلنے، گرنے، لڑھکنے دیجئے۔ اس کی آپ فکر نہ کیجئے۔ اس کی فکر آپ نہ کیجئے۔ غریب غربا کو ضرورت ہوگی تو وہ اسے پکڑنے کے لئے جان لڑا دیں گے۔ ان کی جان کا بھی تو روپیہ کی طرح ہو گیا ہے۔ اور ہر لحہ ہوتا ہی جا رہا ہے۔

گویا مقابلہ دو پہلوانوں میں نہیں بلکہ دو بیماروں میں ہوگا۔!

آپ سونا بچاتیے۔ لیکن بچے گا کیسے۔؟ آپ سونے کی اسمگلنگ نہیں کریں گے۔ چھوٹے ڈاکو کرتے رہیں گے۔

لیکن آپ کا معاملہ اسمگلنگ کا تھوڑا ہی ہے۔ آپ تو صرف سونا عزت واحترام کے ساتھ دے رہے ہیں۔

اور وہ چوری چھپے لاتے ہیں۔!

تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ لاتے رہیں۔ آپ دیتے رہیں۔ دونوں خوش یہ تو میرا خیال ہے۔ مجھے اپنی کم علمی اور بے عقلی دونوں کا اعتراف ہے۔

آپ نے فرمایا کہ فارن ایکسچینج آپ کو چاہئے۔ ضروری کا شیاء کی درآمد کے لئے۔ مثلاً تیل، دوائیں، ہتھیار۔

خیر ہتھیار تو ضروری ہو سکتا ہے ورنہ بیچارے آتنگ وادی کیا کریں گے باقی چیزوں کو ضروری اشیاء کی فہرست میں نہ ڈالئے۔ وہ دوائیں جو آپ اسپتالوں میں تقسیم کے لئے بھیجتے ہیں۔ وہ مریضوں تک پہنچتی کب ہیں۔ بالا بالا حکامِ بالا کے اونچے محل و محلوں میں پہنچ جاتی ہیں۔ اس کے بعد اسٹور پہنچا پڑ جاتا ہے۔ اب اگر غریب کی اپنی نظروں میں خود اس کی جان کی کچھ قیمت ہے

(دوسروں کی نظر میں قبیح نہیں۔ !) تو وہ چنگیز خان اور ریڈ پیرول سے رجوع کرے گا ورنہ دربارِ خدا کی DIRECT FLIGHT پکڑے گا۔

رہے چوہے۔ تو وہ جلتے ہی کب ہیں۔ ان پر کچھ چڑھ جانے پکنے کو ہو تو جلیں۔ باہر سے تیل نہ آئے گا تو کچھ خود تیں ہی جلنے جلانے سے بچ جائیں گی۔

لیکن فارن ایکسچینج نہ ملا تو V.I.Ps کا کیا ہوگا جو زکام کے علاج کے لئے اسپیشلسٹ کے EXPERTS کے پاس جاتے ہیں۔ ان کا زکام ٹھیک نہ ہوا تو ملک کا بیڑا غرق ہو جائے گا۔ (ہزاروں سوراخ تو پہلے ہی اس بیڑے میں ہو چکے ہیں۔)

اس بھارتیہ کلچر کا کیا ہوگا جس کی دریافت کے لئے ہمارے چار چار سو بلکہ چار چار ہزار نمائندوں کے وفد روس، فرانس، چین، جاپان وغیرہ وغیرہ جاتے ہیں۔

خیر یہ کوئی نئی بات نہیں۔ بھائی علامہ اقبال بھی کہہ چکے ہیں۔

غربت میں جا کے چمکا گمنام تھا وطن میں

اور جب اقبال نے کہا ہے تو ان سے دو ہزار برس قدیم فلسفیوں نے بھی کچھ اسی قسم کے نکتوں کا اظہار کیا ہوگا۔ دنیا کے سارے فلسفیوں میں بڑا تال میل ہوتا ہے۔ چاہے ان میں فاصلہ ہزار دو ہزار میل کا ہو یا ہزار دو ہزار برس کا۔

تو جب تک فارن کا ٹھپّہ نہ لگے ہم اپنے آپ کو اور اپنے مال کو پہچانتے ہی نہیں۔!

اس کے علاوہ بھی آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہے۔ خوشی میں۔ غمی میں۔ دیارِ غیر کے کسی امیرے کبیرے وزیرے کا انتقال ہو جاتے تو کیا ہم اپنے ملک کے نوحہ خواں اور کندھا دینے والے بھی نہ بھیجیں! نہیں دو فنونِ لطیفہ میں تو ہم ماہر ہیں۔

تو پھر فارن ایکسچینج تو چاہئے نا۔

لہٰذا بھیجئے سونا۔

تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن ؟ ❋

اپنا زرِ سالانہ وقت پر ارسال کیجئے ❋ شاعر کی توسیع اشاعت میں تعاون دیجئے

دھنک رنگ

شمس تبریزی

بری آواز، لب ولہجہ، نسب جانتا ہے
ہ مگر مجھ کو مرے نام سے کب جانتا ہے
سامنے وہ بھی بزرگوں کے نہیں بولتا کچھ
ابھی اب میری طرح پاسِ ادب جانتا ہے
یری صحبت کا اثر کچھ تو لیا ہے اس نے
ب وہ لکھتا ہے اگر خط تو لقب جانتا ہے
تجزیہ اپنے زمانے کا میں جب کرتا ہوں
نطے وہ سینے میں اٹھتے ہیں کہ رب جانتا ہے
بھی حالات ہوں آتی نہیں ماتھے پہ شکن
شمس باحوصلہ ہے جینے کا ڈھب جانتا ہے

۶۱۰ سیکٹر ۶ - پنچکولہ (ھریانہ)

حکیم مخدوم اشرف

نے لگی خود ریت پہ تعمیر حویلی
ب لوگ بجھانے لگے شعروں میں پہیلی
نالوں میں رہا جس کے نہ خود اپنا مقدر
ختار بنا عمر وہ لوگوں کی ہتھیلی
اور تری ذات پہ قربان کروں میں
نے مرے جذبات کی نرمی بھی تو لے لی
ئی تو موسم پہ نازاں ہیں بہت لوگ
سے الجھی ہوئی آفات سے کھیلی
غور سے دیکھا ہے تو اندازہ ہوا ہے
ب کی کرنیں ہیں ستاروں کی سہیلی

۲۳۰ سی، ایل، اردوڈوا نمباڑی - ۶۳۵۷۵۳

محمد وسیم

روشنی کا بدن ہوا ریزہ
روح پہ گرد رات کا ریزہ
فکرِ غلطاں ہے تن، بدن پہ جب
نقشِ اسلوب ہو گیا ریزہ
دل میں رہتے ہو کس طرح بولو!
کیوں ہوا گھر کا آئینہ ریزہ
آج یہ کس نے دل پہ دستک دی
محورِ زیست میں اٹھا ریزہ
پھر سمیٹوں وسیم خود کو میں
اب تو سایہ بھی ہو گیا ریزہ

اشرف اطہر ہوسٹل، ندوہ کالج، لکھنؤ

شیدا رومانی

ساحل، ریت، سمندر، شام
ساتھ ہے میرے پل بھر شام
خواب کی خوشبو، نیند کے پھول
بانٹ رہی ہے گھر گھر شام
رات سے پہلے آجاؤ!
پھیل رہی ہے مجھ پر شام
دور ابھرتی لہروں میں
ڈوب رہی ہے ہنس کر شام
اپنے گھروں کو لوٹ چلو!
آئی ہے لے کر خنجر شام

اودے پرنٹرس، راجگوڈ ۱۰۱ ۵۸۴ کرناٹک

اختر شاہجہانپوری

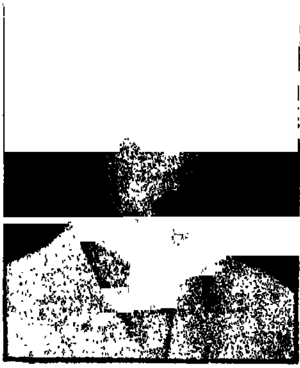
منظر میں کون ہے پسِ منظر میں کون ہے
لہروں میں کون گھرے سمندر میں کون ہے
دیر و حرم میں سب کے لئے باعثِ شرف
اہلِ خرد بتاؤ تو پتھروں میں کون ہے
ہر شخص دست بستہ مجھے دیکھ کر ہوا
مجھ کو خبر نہیں مرے پیکر میں کون ہے
مقتول کی رگوں میں حنا رنگ کوئی ہو
قاتل کے دست و بازو میں خنجر میں کون ہے
افلاس و نامرادی ہی میراث ہے مری
میں جس جگہ کھڑا ہوں برابر میں کون ہے

محلہ رنگین چوپال، شاہجہاں پور ۲۴۲۰۰۱

غضنفر غزنی

تمام رابطوں رشتوں سے کٹ کے دیکھ لیا
خود اپنے آپ میں ہم نے سمٹ کے دیکھ لیا
رہا نہ وزن نہ تعداد، گھٹ کے دیکھ لیا
کہ ہم نے آج اکائی میں بٹ کے دیکھ لیا
نہیں تھا غم کا تاثر کسی کے چہرے پہ
یہ رنگ بھی دمِ رخصت پلٹ کے دیکھ لیا
عجیب کرب نے آنکھوں سے چھین لیں نیندیں
کبھی جو صفحۂ ماضی الٹ کے دیکھ لیا
تمام لفظ معانی سے ہو گئے عاری
غزل سے ہم نے ذرا دیر ہٹ کے دیکھ لیا

۲۵ چوہٹہ ترینان خورجہ، بلند شہر یوپی



نصف گھنٹے کا سفر

کلیم احمد
۸۰ بیت المسلم ڈھاکہ (بنگلہ دیش)

مسافروں سے بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ پھر بھی بس کا لونڈا اب تک بس کے ٹین کی دیواروں کو پیٹتا ہوا آواز لگا رہا تھا۔

فارم گیٹ ــــ میرپور ــــ

ابے او ئے فارم گیٹ میرپور کا بچہ۔ بس چھوٹتا ہے یا نہیں؟

بس میں گرمی سے اکتائے ایک مسافر نے جب آواز لگانے والے چھوکرے کی حسب و نسب دیکھنا چاہی تو کنڈکٹر اور ڈرائیور کے کان کھڑے ہوئے اور پھر بس آہستہ آہستہ سڑک پر رینگنے لگی۔

بس اسٹارٹ ہوتے ہی میری بھی جان میں جان آئی۔ میرے قریب ہی لوہے کی راڈ سے جھولتا ہوا ایک شخص بولا۔ اُف! گرمی بہت ہے اور ہوا بھی جھلسا دینے والی ہے۔ میں نے پورے زور سے سانس کھینچتے ہوئے کہا۔

شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ بڑھتی ہوئی آبادی کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگلے پانچ برسوں میں فضا میں آکسیجن گھٹ کر نصف رہ جائے گی۔

قریب کھڑا ہوا ایک نوجوان بڑی دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔ "فکر کی کوئی بات نہیں۔ آکسیجن کی الگ مارکیٹ ہوگی۔ اور دوسری چیزوں کی طرح آکسیجن ماسک بھی لے کر گھومتے رہیں گے۔" پہلا شخص دبے دبے لفظوں میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ "جناب! اتنے وزن کے ساتھ کیا آدمی کا چلنا پھرنا آسان ہوگا؟" میں نے اس کی جانب ایک اچٹتی نظر ڈالی اور سوچنے لگا۔ کیا واقعی ہم کسی نئے بوجھ کے متحمل ہو سکتے ہیں؟" آج کا نحیف و کمزور ترین آدمی جو پورے جسم سے کتا بھٹا ہوا ہے اور مرمت و پیوندکاری پر کھڑا ہوا ہے۔ کیا اتنے سارے بوجھ اپنے سر پہ لاد کر اپنا وجود قائم رکھ سکتا ہے؟ میں ابھی ابھی ڈاکٹر کے پاس سے آرہا ہوں۔ جس نے سختی سے ہدایت کی ہے کہ بس کے ذریعہ سفر نہ کروں اور میں بس میں سفر کر رہا ہوں۔ اس نے ہدایت کی ہے کہ کھانے میں دودھ انڈا، مکھن کے علاوہ تازہ پھلوں میں سیب، انگور، کیلا اور کچھ سوکھے میوے میں بادام کشمش استعمال کروں۔ میں جانتا ہوں یہ سب کچھ نہیں ہوگا۔ کہ یہ سب میرے لئے وہ بوجھ ہیں جنہیں میں اپنے سر پر اٹھانے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میں نے اپنی سوچ کے دائرے سے نکل کر اس شخص کی طرف دیکھا۔ جو میری ہی طرح اجڑا اجڑا سا تھا۔ لیکن ابھی چہرے پر رنگ و روپ کی کچھ تلچھٹ باقی رہ گئی تھی۔

اے ڈرائیور ــــ بھائی بس روکنا ــــ پیچھے سے آواز آئی۔

بھائی تم کیا بہرے ہو۔ آنکھیں تمہاری سامنے ہیں۔ لیکن کانوں سے تو سن ہی سکتے ہو۔ ایک آدمی کا برا حال ہے۔ شاید سانس الٹی چل رہی ہے۔ ارے کہتا ہوں روکو۔۔ بس روکو ــ!

کئی آوازیں ایک ساتھ گونجیں تو بس ایک دھچکے کے ساتھ رک گئی۔ میں نے اپنے قریب راڈ سے جھولتے ہوئے شخص سے دریافت کیا۔ ارے یہ کیا ہوا بس کیوں رک گئی؟ اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی گردن کو ذرا باہر نکالا اور ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔" وہ بڑے میاں۔ شاید ان کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ لگتا ہے ایک ہچکی کی کسر رہ گئی ہے۔

بڑے میاں کو اتارنے کے بعد بس دوبارہ چلنے لگی۔ تو میں نے بس کے اندر ادھر ادھر جھانکنا شروع کیا۔ شاید کوئی اور بوڑھا آخری ہچکی لے رہا ہو۔ لیکن وہاں کوئی اور بوڑھا نہیں تھا۔ جس کو بڑے میاں کہا جا سکتا۔ کیوں کہ بڑے میاں سے مراد سفید بالوں اور جھریاں مرجھایا ہوا چہرہ اور ڈھلتی ہوئی گردن جیسے ــــ میرے بیٹے کا نانا ــــ

وہ فرش پر ٹہلتا ہوا اپنی لمبی سی عبا اور سفید داڑھی کے ساتھ ہنستا ہوا آئے ڈھیروں دعائیں دیتا ہے۔ اپنے سے زیادہ لمبی عمر کے لئے اسے دعائیں دیتا ہے۔ میرا نانا سو سال جئے۔ اور ہر سال کی عمر سو سال ہو۔

میری ماں کے سارے بال پک گئے ہیں اور انہیں آنکھوں سے بھی کم دکھائی دیتا ہے۔ لیکن انہوں نے زندگی میں کم ہی بہاریں دیکھی ہیں

زیادہ تر انہیں خزاں کے زرد پتے ہی ملا ہیں۔ جو ہمیشہ ہی ان کے دل میں پھپھولے ڈالتے رہے ہیں۔ جب ان کی شادی ہوئی تو وہ ہنگاموں کا دور تھا۔ گھر کا بٹوارا ہو رہا تھا ــــ کبھی بیٹھے بیٹھے ماضی کا ذکر چھڑتا ہے تو ان کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ اور وہ اپنی بے نور سی آنکھوں سے دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے کہتی ہیں آج بھی انو یاد ہے۔ سنتشر اب بھی میرے سامنے کھڑی ہے۔ اف خدا ایک دن میں کتنی اموات، پورا کا پورا کنبہ ختم ہوگیا؛ اور میں تھوڑی اب بھی زندہ ہوں۔ نہ جانے کتنی عمر لے کر آئی ہوں۔ اب تو چلا بھی نہیں جاتا۔ ہانپنے لگتی ہوں۔

بس دوبارہ ایک جھٹکے کے ساتھ رکی تو میں نے اپنی سوچوں سے منہ موڑتے ہوئے بس کی ایک ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے جھانکا۔ یہ دیکھنے کیلئے کہ بس کیوں رکی ہے؟ معلوم ہوا سامنے سڑک پر کوئی ہنگامہ ہوا ہے۔ ہنگامے کی خبر سن کر کچھ مسافر تیزی سے بس سے اترے۔ ان پر نظر پڑتے ہی میں ٹھٹکا۔ یہ باریش لوگ کون ہیں۔ بس میں کب سوار ہوئے۔ کچھ دیر قبل میں نے بس میں کسی بوڑھے کو نہیں دیکھا تھا۔ شاید یہ کوئی آسمانی لوگ ہیں اور اللہ کے دین کو از سر نو سنوارنے اترے ہیں۔ لیکن ــــ لیکن بس میں ــــ میری سوچ کو دھچکا لگا اور بس آگے بڑھ گئی۔ ــــ شام کا دھندلکا پھیل کر سیاہی مائل ہو رہا تھا۔ برقی قمقمے جل اٹھے تھے۔ لیکن ان کی روشنی ناکافی تھی کیوں کر کچھ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اپنے قریب کھڑے ہوئے شخص سے پوچھا۔

اے بھائی! اتنا اندھیرا کیوں ہے؟ اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا" یہی تو میں آپ سے پوچھنے والا تھا۔ اب تو یہ پتہ چلا کہ یہ اندھیرا صرف میری ہی آنکھوں میں نہیں بیٹھا بلکہ آپ کی یا اور لوگوں کی آنکھوں کو بھی چھو رہا ہے۔"

وہ شخص بول کر خاموش ہوگیا۔ بس میں سارے لوگ خاموش تھے۔ مجھے یہ خاموشی بھیانک لگ رہی تھی۔ کیوں کہ خاموشی کی شکل میں موت میرے سامنے کھڑی تھی۔ اور موت سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں قبرستان کبھی نہیں جاتا۔ کیا پتہ قبروں میں گڑھے مُردے مجھے دبوچ لیں۔ اور کھینچ لیں۔

اے میاں! جانے کہاں ہو؟ دیکھو اصل زندگی یہ ہے۔ آؤ تمہیں اس اس دنیا کی سیر کرائیں۔ سرسبز پودے دکھائیں ــــ میں نرم نرم گھاس پر ان کے ساتھ چل پڑتا ہوں۔ ڈرا ڈرا سا ہونے کے باوجود نہ جانے ان کے ساتھ چلتے ہوئے مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ میں خود کو بہت توانا اور ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہوں۔ میری حد نگاہ تک نرم نرم مخمل گھاس کی چادر بچھی ہوئی ہے۔ یہ گھاس اگی ہے نا؟

ہاں یہ گھاس ہی ہے۔ لیکن یہ سوال کیوں؟

تمہارے آنگن میں بھی گھاس ہوں گی؟

ارے ہاں۔ بھائی ہم اسی فرش پر گہری نیند سوتے ہیں۔ گہری نیند اور طویل نیند۔

گھاس میں چھپے ہوئے زہریلے کیڑے مکوڑے بھی ہوں گے جو تم کو کاٹتے بھی ہوں گے۔ اور تمہاری نیند میں خلل پڑتا ہوگا؟

نہیں یہاں کیڑے مکوڑے نہیں ہیں۔ ہاں تتلیاں ہیں، رنگ برنگی حسین تتلیاں ــــ آؤ تمہیں ہم اپنا گھر دکھائیں۔ اور گھر کے دوسرے لوگوں سے ملوائیں۔ یہ دیکھو یہ میرا گھر ہے۔ یہ میری ماں اور یہ میرے ابا ہیں۔

ارے واہ یہ تمہاری ماں اور یہ تمہارے ابا۔ گھاس کھا گئے ہو کیا؟ اب اتنا بھی بھولا بے وقوف نہیں ہوں کہ تم مجھے صاف الو بنا کر نکل جاؤ گا

سچ بھائی! یقین مانو۔ یہ میری ماں ہے اسے ہاں تم میرے بیٹے سے تو ملے ہی نہیں۔ وہ ابھی نہیں ہے ورنہ تم کہتے کیوں بے وقوف بنائے جا رہے ہو مجھے

اچھا! وہ کہاں ہے؟

وہ ــــ وہ ــــ ارے وہ تم...... تمہارے سامنے ہی تو کھڑا ہے!

یاد ملی ــــ!

میں نے اپنے قریب کھڑے ہوئے شخص سے دریافت کیا۔

آپ کا نام یاد علی ہے؟

"جی ہاں فرمائیے۔"

"آپ کے والد؟"

"ان کا انتقال ہوگیا۔"

"اور آپ کا؟"

"ارے جناب! آپ بھی کمال کے آدمی ہیں، میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں اور آپ......... خیر جانے دیجئے یہ آپ کا نہیں آپ کی عمر کا قصور ہے اس عمر میں اکثر لوگ سٹھیا جاتے ہیں۔"

"میری عمر کا؟ ــ میں سٹھیا گیا ہوں؟ یعنی میں بوڑھا ہوں؟ کیا میں آپ کو بوڑھا لگتا ہوں؟"

"نہیں ــ نہیں آپ نہیں ــ میں بوڑھا ہوں۔

"ہاں آپ! کیوں کہ آپ کے بال آدھے سے زیادہ پک چکے ہیں۔ چہرے پر جھریاں تو نہیں ہیں لیکن پیشانی پر موٹی موٹی لکیریں ضرور ابھر آئی ہیں۔"

وہ ہنسا اور پھر خاموش ہوگیا۔ جیسے میں نے کچھ غلط کہہ دیا ہو۔ میں اس کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑا ہوگیا۔ اور جب بس رکی تو تیزی سے نیچے اترا کیوں کہ گنبار ونمبر بس صرف منٹ بھر کے لیے ٹھہرتی ہے۔ بس سے اتر کر میں دھن پاں

[باقی صفحہ ...]

فکرِ امروز

شاعرانہ ذوق ایک فطری ذوق ہے جو ہر قوم وملّت میں پایا جاتا ہے ان میں سے بعض لوگوں کو تکمیل ذوق کا صحیح راستہ مل جاتا ہے اور بعض لوگ محروم رہ جاتے ہیں۔ اس محرومی کا الزام تمام تر انھیں لوگوں پر نہیں ہے بلکہ ان اساتذۂ سخن پر بھی ہے جو ان کے ہمسایہ اضلاع میں مدّت العمر سے گمنامانہ زندگی بسر کر رہے ہیں مگر چوں کہ ان کی نظر محدود ہے اس لئے وہ اپنے گردوپیش کی ضرورتوں [تبدیلیوں] سے متاثر نہیں ہوتے اور متاثر کیا ہوں جب کہ ان ضرورتوں کی طرف ان کی نظر ہی نہیں جاتی۔ مجھے بہت افسوس کے ساتھ اپنے اس احساس کا اظہار ناگزیر معلوم ہوتا ہے کہ اس محدود بینی یا خود بینی نے ہمارے بعض کہنہ مشق بزرگانِ ادب کو بھی علوم جدیدہ اور ایجادات وتنوّع کی بہرہ مندی سے روک دیا ہے۔ دوسروں کی خدمت دراصل اپنی خدمت ہے۔ ایک مدرّس ومعلّم کی ذہنی ورسائی قوتیں اس شخص سے بہر کیف زیادہ ہوتی ہیں جس کا کام درس وتدریس نہیں ہوتا۔

آ[illegible]

شاعر

جاری شدہ ۱۹۳۰

اشاعت کے ۶۲ ویں سال

جلد — ۶۲
شمارہ — ۹

فون: ۲۵۹۹۰۲۳

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت: ۷ روپے

زرِ سالانہ ۵۰ روپے
لائبریریوں سے ۹۰ روپے

تاحیات خریداری [illegible] روپے
معاونین سے ۱۰۰ روپے
ممالکِ غیر سے ۳۵۰ روپے

شمارہ نمبر ۹ [۱۹۹۱ء] جلد ۶۲

عالمی اُردو کانفرنسیں، سیمینارز اور مشاعرے

(۲)

گزشتہ چند برسوں تک پاکستانی مشاعروں کی فضا ادبی اور معیاری تھی۔ ۱۹۸۰ء سے ۸۲ء تک کے مشاعروں میں ہندوستان سے جن شعراء کو مدعو کیا جاتا رہا ہے ان میں سے بیشتر معتبر ہی رہے ہیں جو کچھ نئے نام ان میں شامل ہوئے وہ کم معروف یا کسی حد تک معروف نام تھے لیکن بہر حال وہ شاعر تھے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ ہندوستانی مشاعروں نے کرتب باز کاروباری شعراء ان میں شامل ہونے لگے اور انھیں کے ساتھ خواتین بھی۔ اب پاکستانی مشاعروں کی فضا بھی وہی بن گئی ہے جو ہندوستانی مشاعروں کی تقریباً ہے۔ پاکستان میں یہاں کے شعراء کا انتخاب دبئی اور ابوظہبی وغیرہ کے مشاعروں سے کیا جاتا ہے۔ عرب امارات کے ان مشاعروں میں ہندوستانی شعراء کا ٹھیکہ شاعروں کے کسی بھی بزرگ شاعر کو دے دیا جاتا ہے۔ مذکورہ شاعروں کے کیسٹ پاکستان کے گھر گھر میں دیکھے جاتے ہیں۔ پاکستان ٹی وی پر انھیں قسطوں میں دکھایا جاتا ہے اور پھر یہ ہوتا ہے کہ ہر نئے شاعر نے کی فہرست میں ترنم اور تحت کے یہ اداکار شامل ہو جاتے ہیں۔ منتظمین مشاعرہ ان شعراء اور شاعرات کو مدعو کرنے کے لئے ہندوستان آتے ہیں کاروباری شعراء سے ملتے ہیں اور یہ فہرستیں اس طرح غیر معیاری ہو جاتی ہیں۔ ہندوستان کے چند نامور بزرگ شعراء کے ساتھ ان لوگوں کی بھی پذیرائی ہوتی ہے اور خوب ہوتی ہے۔ وہاں شاعروں کے منتظمین سے گفتگو کے دوران یہ انکشاف بھی ہوا کہ ان لوگوں کو معلوم ہی نہیں کہ ہندوستان میں اچھے اور معیاری شعراء بھی ہیں جو ادب اور شاعروں میں یکساں مقبول ہیں، معروف ہیں۔ چنانچہ یہ ان لوگوں کی سادہ لوحی ہے یا کوئی سیاسی مصلحت ہے یا پھر زمانے کی پاکستان کے ایک مشہور کالم نویس نے اپنے اخبار کالم کی سرخی لگائی "ہمارے شاعر، بھرتی کے شاعر"۔

عرب امارات، گلف اور پاکستانی مشاعروں کے ساتھ امریکہ اور یورپ کے مشاعروں میں بھی انھی شعراء اور شاعرات کو مدعو کیا جا رہا ہے۔ یہ مشاعروں کا عروج نہیں زوال ہے۔ غیر تربیت یافتہ کو رے اور لاعلم شاعروں سے مشاعرے، اردو شاعری اور ادب کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے۔

(جاری)

Zoe Ansari

reside : 32, shirin, colaba post office, bombay 400 005 • dial : 21446[illegible]
office : university club house, b. road, bombay 400 020 • dial : 28729[illegible]

* ظ انصاری بنام اعجاز صدیقی

حضرت،

آپ کی برہمی بجا

معذرت کروں تو خطاوار۔

تب تو میرا نام 'ادارے' میں شامل تھا، تبصرہ کرتے وقت بے محابا سوچا تا تو
ادارے پر حرف آتا (آپ کی وضعدارانہ احتیاطوں کو سمجھتا ہوں) اب آزاد
ہوں۔ دھوم دھام کے تبصرے لکھوں گا۔ چاروں (مجھے تو ۳ ہی ملی تھیں)
کتابوں پر لکھوں گا اور جیسوں میں سارے ورق حوالے کر دوں گا۔
جی چاہے ایک پرچے میں چھاپیے۔ جی نہ چاہے تو دو میں، ورنہ تین میں۔
یہ ایک اخلاقی قرض ہے میرا، اسے بہرحال ادا کرنا ہے۔ اور سنیے صاحب!
تعارفی بنا کر کتابیں جو واپس فرمائیے گا۔ میری بیٹی، کتاب ہے، واپس
کرتے وقت دل بیٹھ جائے گا۔

والسلام مع الاکرام

ظ

11.XII.77

ظ انصاری [ظل حسنین] [illegible]

کاوش بدری

کسی کا احساں کیوں اٹھاؤں خدا ہے جب کارساز میرا
تمام جو بے صلہ ہوا تھا وہ قطرۂ امتیاز میرا

بدن معمول کو سند جاناں میں خار بن کر ہر ایک میرا بوسہ
جو سنگ دستِ جفا سے چھوٹا وقارِ تجدیدِ نیاز میرا

ہے نقش بے صورت کشش کچا تھا وہ میرا مانند جیسے
سرِ نیاز اتنا خم ہوا تھا کہ گنبدِ سرفراز میرا

جہاں کہیں بھی جبیں جھکا دی وہ سرزمیں حبیب نکلی
جبیں میں ہر سجدہ سار وہ ہی خشوعِ رنگیں نماز میرا

[illegible] ہم کو کہ چشمیاں ہیں، [illegible] کہ رہ تمنا
کبھی میں محسود بن کے ابھرا، کبھی میں خنجر رباز میرا

غزل کا جز ہم [illegible] ایسی مطابق مقیم ہیں ہر
بدید ہوا [illegible] کاوش میں ہے عشق منزد ساز میرا

حجاب چشم ہے حجاب سے بڑا حجاب ہے
نظر اٹھا تو کر چہرہ بیں نقاب ہے

ملا دیا یار سے ایسی تجلّیوں سے آ
طلوعِ صبح ہو کرن ہے آفتاب ہے

تمام لفظ ادھورے سے ختم ختم ہے نفرت
نہ تھا جو قابلِ اظہار انتخاب ہے

تمام نیکیاں مقدار میں رقم ہیں بہت
گناہ کیوں نہ گنتے میں بے حساب ہے

شرارِ حسن کا ہم معنٰی گر ہے شعلہ طواف
مقابلے میں پتنگے ہی کا حیا ہے ہوا

نشے کی جھونک میں پیمانہ کا [illegible]
کبھی دنیا ہوش کے عالم میں بلا پاب ہوا

یہی ہے صرف سروکار حسن عالم سے
ملا ہے نظارہ جو اپنا حسن بہ انداز ہوا

تمام عمر گنی کم ظرفوں کی کاوش کی
بجائے خاک میں یا مرگیا تو خراب ہوا

[illegible]

غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ

ادبی فیچر (۴)

"شاعر" میں محترم ستیہ پال آنند کا مضمون اور ان کی نظمیں، نیز ان کی تائید میں محترم پروفیسر گوپی چند نارنگ کا مضمون ——— یہ سب چیزیں چونکا دینے والی ہیں۔ اور ان پر آپ کا اظہار خیال بہت اچھے ڈھنگ سے انکی تنبیہ کو ظاہر کرتا ہے۔ جو "شاعر" کے اس شمارے کے مطالعے کے بعد اردو زبان و ادب کے ہزاروں بہی خواہوں نے اپنے دلوں میں محسوس کی ہوگی۔



ستیہ پال آنند صاحب ایک امریکی ادارے کے لئے کام کرتے رہے ہیں اور یہ بات اب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ غیر ملکی ادارے خواہ ان کا تعلق سرمایہ دار ممالک سے ہو یا نام نہاد سوشلسٹ ممالک سے اپنی کارگزاریوں کے لئے بے غرض نہیں ہوتے وہ جب بھی کسی ادبی یا علمی معاملے میں دلچسپی لیں گے ان کا مقصد محض ادبی یا علمی نہیں ہوگا اس کے پیچھے کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ سیاسی محرکات ضرور رہیں گے۔ ان محرکات کا تعلق فوری اموسے بھی ہو سکتا ہے۔ اور دور رس امور سے بھی۔

حالیؔ اور محمد حسین آزاد اپنے عہد کی دو قد آور شخصیتیں تھیں۔ ان کی اصلاحی کوششوں سے اردو شاعری نئی جہتوں سے آشنا ہوئی۔ ہم ان کی نیک نیتی پر بھی شبہ نہیں کر سکتے لیکن اتنا تو اب ہم جان چکے ہیں کہ ان کی کوششوں کو غیر ملکی سامراجی حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ اور یہ سرپرستی بے غرضانہ نہیں تھی۔ مولانا حالی نے غزل اور غزل کے بنیادی موضوع یعنی جذبۂ عشق کو جس طرح ہدف تنقید بنایا، وہ اس تہذیبی روایت کا مکمل استرداد تھا، جو ہماری قومی پہچان کا ایک حصہ تھی۔ اپنے تہذیبی حصار کو منہدم کر دینا، اپنے باطنی وجود کو کھو دینا ہے۔ اور بالا دست قوتوں کے لئے زیر دست قوموں کا یہی رویہ پسندیدہ ہوا کرتا ہے۔ کلیم الدین مرحوم کا رویہ کتنا ہی درشت یا بعض لوگوں کے نزدیک نا شائستہ رہا ہو لیکن انہوں نے مولانا حالی اور ان کے ہمنواؤں کی کوشش کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے، اس میں بصیرت و تجزیہ بہت سامان ہے۔

مولانا حالی کے بعد غزل اور عشقیہ شاعری پر دوسرا بڑا حملہ ترقی پسندوں کی طرف سے ہوا۔ اور انہوں نے محبت کی جگہ جو ارفع ترین انسانی جذبہ ہے۔ شاعری کو نفرت اور تشدد کی تبلیغ کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی۔ مولانا حالی تو بیچ سادگی اور شرافت

یہی شاید وہ دانستہ طور پر غیروں کا آلۂ کار بن گئے تھے۔ لیکن ترقی پسند تحریک کے بانیوں نے غالباً سوچ سمجھ کر غیروں سے راہ و رسم پیدا کی تھی۔ اس تحریک کے خدوخال نمایاں طور پر سیاسی تھے۔ اور یہ حقیقت بلا تاخیر سامنے آ گئی کہ یہ عالمی کمیونسٹ تحریک کا ایک محاذی ادارہ ہے لیکن ابتدا میں جو شاعر اور ادیب اس سے وابستہ ہو گئے تھے انہوں نے مطلق دور تک ان کا ساتھ دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس تحریک کی بدولت بھی اردو شعر و ادب کے سرمایے میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ایسا اس تحریک کی بدولت نہیں۔ اس تحریک کے منفی کردار کے باوجود ان شاعروں اور ادیبوں کی انفرادی صلاحیتوں کی بدولت ہوا جو اس تحریک سے وابستگی کے باوجود اپنے بہترین لمحوں میں بہترین شاعرانہ اظہار پر قادر تھے۔ یہ بات اب مانی جا چکی ہے کہ ترقی پسند ادب کا بیشتر حصہ وقتی ہے جو تحریکی اثرات کا نتیجہ تھا۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی صاف گوئی قابل ستائش ہے۔ انہوں نے اس سچائی پر کوئی پردہ نہیں ڈالا ہے۔ کہ انہوں نے اردو شاعری بالخصوص اردو غزل کی موجودہ صورت حال کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے، وہ ان کے ذاتی غور و فکر کا نتیجہ نہیں، ایک ایسے امریکی ادارے کے تجزیۂ تحقیق پر مبنی ہیں جو مشرق کی تہذیبی اور علمی دنیا میں دخل انداز ہونے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ انہوں نے یہ اعتراف بھی برملا طور پر کر لیا ہے کہ "دست برگ" کے نام سے شائع ہونے والے ان کے شعری مجموعے میں جو سو نظمیں شامل ہیں، وہ انہوں نے اسی ادارے کی ایما پر اور اس کی طرف سے فراہم کردہ ہنر مندی سے بہرہ یاب ہو کر کہی تھیں۔

اس ادارے کے طریق تحقیق پر آپ نے جو محاکمہ کیا ہے، اس سے اس کے نتائج تحقیق کی بے وقعتی پوری طرح نمایاں ہو گئی ہے۔ حیرت اس پر ہے کہ جو نکات آپ نے اٹھائے ہیں وہ نارنگ صاحب جیسے زیرک نقاد کی نظروں تک کیسے نہیں پہنچے اور انہوں نے اپنے قلم سے ایک بے جان مفروضے میں جان ڈالنے کی کوشش کی۔

● منصور سعیدی ——— سی - ۱۰ ، نئی دہلی ہائے فلیٹس، آصف علی روڈ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شاعر کے شمارہ نمبرہ میں "غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ" آپ کا ایک جرأت مندانہ سوال ہے جو اردو غزل کو حمایت میں نہیں بلکہ خود اہل غزل کی عالمی عصری شاعری میں نمائندگی کا جانب سے بیانیہ

اور فرسودہ گردانتے کے واسطے ارتکاب جرم کیسے نقاب کرتا ہے جیسا کہ غزل ہی اردو ادب کے حوالے سے عالم گیر واقعہ ہے۔ بیشتر نقلیں تو اب قادر ہو گیا، کاغذ کے حقے سے بھی نہیں ہٹ سکیں۔ آپ کا مقالہ ایمانداری سے بہت سے سوال اٹھاتا ہے۔ دیکھیں اس سلسلے میں کیا کل کھلتے ہیں۔

● منصور سبزواری — نوح، ضلع گڑگاؤں، ہریانہ — ۱۲۲۱۰



گوشۂ ستیہ پال آنند بہت زوردار ہے میرے خیال میں شاعری ستیہ پال آنند کو ادب میں زندہ رکھے گی۔ عصری عالمی شاعری اور اردو شاعری کا مکالمہ مذاکرہ گہرائی اور وسعت لیے ہوئے ہے۔ تمہارا مقالہ بہت جاندار ہے۔ غزل کے متعلق بہت ساری معلومات فراہم کرتا ہے۔ اور کئی نئے سوالات بناتا ہے۔ مبارکباد۔

● شفیقہ فرحت — ۱۵۔ $\frac{196}{2}$ ودیا وہار بھوپال — ایم پی



شمارہ نمبرہ کئی اعتبار سے بے حد اہم اور معیاری ہے۔ گوپی چند نارنگ کا انتخاب اور ستیہ پال آنند کی منفرد سامانز کی نظمیں اور ڈاکٹر عباس کرے سے ان کی بات چیت بہت معلوماتی اور قابلِ توجہ۔ آپ کا مضمون ''غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ'' موثر دل'' اور کئی نئے سوال اٹھاتا ہے

● ظہیر غازی پوری — ی، ایس، آر، ای ''کا ریڈیشن ہزاری باغ (بہار)



شاعر میں تمہارے مضمون ''غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ'' نے تحریک پا کر میں ''سر سبز'' کا ایک ایسا نمبر ترتیب دینے کے متعلق سوچ رہا ہوں جس میں ملک کے تمام ممتاز غزل گو شعرا کے چیدہ چالیس شعر دیے ہوں۔ یہ غزل کی حفاظت اور اس پر لگائے گئے الزامات کے رد عمل کے طور پر شائع ہوں، تمہارا کیا خیال ہے

● کرشن کمار طور — ای ۱۳۴، کھانیارا روڈ، دھرم شالہ ۱۷۶۲۱۵ ہماچل پردیش



آپ نے بہت اچھا کیا کہ ''شاعر'' میں ستیہ پال آنند کی گوشہ کے ذریعہ امیشن اسٹڈیز سینٹر یونیورسٹی کے ذریعہ عصری عالمی شاعری کے پروجیکٹ کے جنوبی ایشیائی زبانوں کے پروگرام سے اردو والوں کو واقف کرادیا۔ ورنہ کون جانتا کیسے جان پاتا کہ اردو کے خلاف دنیا میں کیا کیا سازشیں ہو رہی ہیں۔؟! سچ کہا آپ نے کہ گویا اردو شاعری اور اردو غزل پر ایک نئے مرحلے کا آغاز ہے۔

یہ پراجیکٹ اگر اردو شاعری کے آزادانہ مطالعہ پر مبنی ہوتا تو اسے اردو ادب و شاعری کے حق میں ایک مستحسن کوشش قرار دیا جاسکتا تھا۔ لیکن یہاں بات ہی دوسری ہے۔ پہلے سے [اپنے مطلب کے] نتائج مرتب کرلینے کے بعد پروجیکٹ پر کام شروع کیا گیا ہے۔ یعنی بات پہلے سے مان لی گئی کہ گذشتہ چالیس برسوں میں اردو شاعری ایک ایسے پڑاؤ پر آکر رک گئی ہے جہاں پر صنفِ غزل کی عمومیت بند ہیئات اور اس کے تخلیقی مضمون میں یک رنگی اور اسلوب بیان میں یک آہنگی نے اسے اکتا دیا۔ اس اقرار کی روشنی میں پراجیکٹ کو یہ دیکھنا تھا کہ ہمارے اردو شاعر کو جسے ''غزل'' کا مردہ گدھ اپنے دانتوں سے دبائے ہوئے ہے، کیسے آزاد کرایا جائے؟ اور اردو شاعری کو صنفِ غزل سے آزاد کرانے میں کس حد تک کامیابی ہو سکتی ہے اور یہ کہ اس نوع کی سعی کو تحریک کی شکل دینا ممکن ہوگا۔

ایسی صورت میں اس پراجیکٹ کو آزادانہ اور غیر جانبدارانہ مطالعہ کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ اردو غزل کے خلاف ایک محاذ ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بہ حیثیت کل ''اردو'' ہی کے خلاف ایک سازش ہے یورپ کی اور بہت سی سازشوں کی طرح۔ اس لئے بھی کہ پراجیکٹ میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ اردو کا تعلق اب صرف مسلمانوں کے ساتھ رہ گیا ہے۔ [یہ اشارہ بڑا معنی خیز ہے] اور اب کیا اردو شاعری کی نسلیات کی سوچے گا؟ یہاں سے اندازہ ہوگا کہ اب اردو شاعری سے اتنی ہمدردی ہوگئی کہ انگریز کے نیچے سے اس کے سدھار کی کوشش کی جارہی ہے۔

غزلیہ شاعری اردو شاعری کی ایک بہت مضبوط روایت ہے۔ اردو والے بیک جنبش اس روایت سے توڑ کر اسے معلق کر دینے کی کوشش اسے اپنی تہذیبی ورثے سے جدا کرنے کی کوشش ہے اور اس کوشش سے منفعت بخش ہیں جب کہ غزل کو برابر اردو کے فنا کی رسم الخط کو چھینا جارہا تھا۔

میں نے یہاں صرف پراجیکٹ کی نیت کی طرف اشارہ کیا ہے اس کے دوسرے ناقص پہلوؤں اور اس سے اٹھنے والے سوالوں کی طرف تو آپ نے ''غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ'' میں اشارے کر ہی دیئے ہیں۔ اور اس کے متعلق گوشہ سامنے لاکر اردو والوں کے ذہن کو مہمیز کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اردو والے اس کا کیا رد عمل قبول کرتے ہیں۔

● ظاہر عثمانی — ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، مدراس یونیورسٹی، مدراس ۶۰۰۰۰۵ (تامل ناڈو)



رشید حسن خاں

ڈی سی - ۹ گوائر ہال دہلی یونیورسٹی، دہلی ۱۱۰۰۰۷

ہندوستانی فارسی میں تلفظ اور املا کے بعض مسائل

①

یاے مجہول اور واو مجہول کی آوازیں دو قدیم ہند ایرانی مصوّتے ہیں۔ ہندوستان میں یہ آوازیں یہاں کے نظامِ صوتیات کا جُز ہیں۔ ایرانی لہجے میں بھی یہ آوازیں موجود تھیں، لسانیات کی زبان میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ آوازیں فارسی صوتیات کا حصّہ تھیں۔ فارسی کی مختلف کتابوں میں، خاص کر علمِ قافیہ اور صرف و نحو سے متعلق کتابوں میں عام طور پر ان کی صراحت ملتی ہے۔ یہی حال نونِ غنّہ کی آواز کا ہے، مگر کچھ مدّت سے، مختلف اسباب کی بنا پر (جن میں سے بعض سبب سیاسی بھی ہیں) ایران کے مرکزی لہجے میں مجہول اور غنّہ آوازیں باقی نہیں رہیں۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ فارسی کا [یا یوں کہیے کہ جدید فارسی کا] ایرانی معیاری لہجہ وہ ہے جو تہران میں رائج ہے اور وہ ان آوازوں سے خالی ہے۔

یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ اس مسئلے سے اصلاً دوچار ہونا پڑتا ہوگا ان لوگوں کو، جو فارسی کے کلاسکی ادب کی یا ہندوستانی اساتذہ کی کتابوں کو مرتب کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان مرتبین کو بہ طورِ خاص اس مسئلے سے دوچار ہونا پڑتا ہے؛ لیکن اُردو والے بھی مسلسل اور متواتر اس سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو ادب کے بیشتر مآخذ فارسی میں ہیں، خاص کر تذکرے اور تاریخ کی کتابیں۔ ان مآخذ کے اقتباسات اُردو تحریروں میں آتے رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ تذکروں کو از سرِ نو مرتب کرنے کا بھی کام ہے۔ اسی طرح فارسی کی ضرب الامثال، اشعار اور مصرعے اُردو کی عبارتوں میں اب بھی نقل کیے جاتے ہیں، حُسنِ کلام کے لیے بھی اور کسی بحث میں سند کے طور پر بھی۔ جب بھی فارسی کی کسی عبارت کو نقل کیا جائے گا، یا فارسی میں لکھے گئے کسی تذکرے کو یا تاریخ کی کتاب کو یا ایسے ہی دوسرے مآخذ کو مرتب کیا جائے گا، اس وقت یہ مسئلہ اچانک سوالیہ نشان کی صورت میں سامنے آ جائے گا۔

اس کے علاوہ، ہندوستان کے معروف فارسی شاعروں کے دواوین کو مرتب کرنے کا بھی مسئلہ ہے۔ امیر خسرو سے لے کر بیدل اور غالب اور اس کے بعد اقبال تک فارسی شاعری کا نہایت معتبر و قیمتی سرمایہ، ہندوستانی ادبیات کے گراں قدر ذخیرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کتابوں کو مرتب کرنے کا کام جب بھی شروع کیا جائے گا، اس وقت ایسے مسائل مرتب کے سامنے آئیں گے اور اُس کا ذہن اگر ان کے سلسلے میں وضاحت اور قطعیت کی روشنی سے محروم ہے تو پھر تدوین کے فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہو پائے گا۔

یاے مجہول اور واو مجہول :- جیسا کہ کہا جا چکا ہے، کلاسکی فارسی میں غنّہ اور مجہول آوازیں موجود تھیں اور قواعد کی کتابوں میں التزام کے ساتھ ان کا ذکر کیا جاتا تھا۔ مثلاً قواعد کی مشہور ترین قدیم کتاب المعجم فی معاییر اشعار العجم کو لیجیے، جس کے ایرانی مصنّف نے شیخ سعدی کا زمانہ پایا تھا۔ اس کتاب میں حروفِ قافیہ کی بحث میں یاے معروف و مجہول اور واو معروف و مجہول کی تفریق کو دیکھا جا سکتا ہے۔ مصنّف نے قوافی کے بیان میں حرفِ ردف کے ذیل میں لکھا ہے:

> ● بدانکہ ہر الف و واوٗ و یاء ماقبلِ روی باشد، آنرا ردف خوانند ...... بشرطِ آنکہ ماقبلِ واو مضموم باشد و ماقبلِ یا مکسور ..... و فتحۂ ماقبلِ واو در لغتِ پارسی دو گونہ بود: مُشْبَعَہ و مُلَیَّنَہ۔ مشبعہ چنانکہ فتحۂ حور و سور۔ و ملیّنہ چنانکہ ضمّۂ روز و پوز۔ و ہمچنیں کسرہ ماقبلِ یا دو گونہ باشد: مشبعہ و ملیّنہ۔ مشبعہ چنانکہ کسرۂ تیل و زنجیل و ملیّنہ چنانکہ کسرۂ دیر و پیر۔ و متقدمانِ شعرا متحرک بفتحۂ مشبعہ را در قوافی معروف خوانند و متحرک بفتحۂ ملیّنہ را در قوافی مجہول۔ و ہمچنیں متحرک بکسرۂ مشبعہ را مکسورِ معروف و بکسرۂ ملیّنہ را مکسورِ مجہول۔ [المعجم فی معاییر اشعار العجم، مرتبۂ اُدورڈ براؤن و محمد ابن عبد الوہاب قزوینی، ص ۲۲۵]

الف سے پہلے حرف کی حرکت کے ذیل میں مصنّف نے لکھا ہے:

"وآن یائی است ملیّنہ کی در اواخرِ اسمار علامتِ نکرہ باشد چنانکہ اسپے فریدم ، غلامے فروختم ۔" [ص ۲۳۱]

اسی طرح "حرف شرط و جزا" کے ذیل میں لکھا ہے :

"وآن یائی است ملیّنہ کی در اواخرِ افعال معنی شرط و جزا دہد چنانکہ اگر بخواستے بدادمے ، اگر بفروختے بخریدمے ۔ و در صیغتِ تمنّی نیز بیاید چنانکہ کاش بیامدے ، کاشکے چنین بودے ۔" (ایضاً)

مطلب یہ ہوا کہ اسموں کے آخر میں تنکیر کے لیے یاے مجہول آتی ہے [جیسے : شخصے آمد، کوئی شخص آیا] اور معنی شرط و جزا کے لیے بھی افعال کے آخر میں یاے مجہول آتی ہے ۔ اسی "حرفِ ردف" کے بیان میں مزید وضاحت اور قطعیت کے ساتھ لکھا ہے : "و بہیچ حال میانِ مکسورِ معروف و مکسورِ مجہول در قوافی جمع نشاید کرد" (ایضاً ص ۲۰۲) یہیں پر مصنّف نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ یاے مجہول کا قافیہ اُس لفظ کے ساتھ جائز ہے جس میں امالہ ہوا ہو اور مثال میں انوری کے یہ دو شعر لکھے ہیں :

بدین دو روزہ توقّف کہ بوک خود نبود | درین مقامِ فسوس و درین سرای فریب
چرا قبول کنم از کس آنچ عاقبتش | ز خلق سرزنشم باشد از خدای عتیب

اس سے قطعی طور پر تائید ہوتی ہے دو باتوں کی : ایک تو یہ کہ "فریب" میں یاے مجہول ہے (جسے مصنّف یائے ملیّنہ کہتا ہے) دوسرے یہ کہ جن لفظوں میں امالہ ہوتا ہے ، اُن میں یاے مجہول الف کی جگہ لیتی ہے ، جیسے "عتاب" امالے کے بعد "عتیب" بنا ہے ۔ قواعد نویسیوں نے متفقہ طور پر اپنی کتابوں میں یہ صراحت کی ہے کہ امالے میں الف ، یاے مجہول سے بدل جاتا ہے ، جیسے : کتاب سے کتیب ، حجاب سے حجیب ۔ یا جسے معنیٰ سے معنے اور تقویٰ سے تقوے ۔ براہین العجم میں امالے کی بے شمار مثالیں جمع کر دی گئی ہیں ، اُس کتاب کو دیکھا جا سکتا ہے تفصیلات کے لیے ۔ براہین العجم کے مصنّف سپہر کاشانی نے نہایت سختی کے ساتھ اس کی ہدایت کی ہے کہ جن لفظوں میں امالہ ہو ، اُن کو ایسے لفظوں کے ساتھ ہم قافیہ نہیں کرنا چاہیے جن میں یاے معروف ہو ، اس بنا پر کہ امالے والے لفظوں میں یاے مجہول ہوتی ہے ۔ یعنی "عتیب" کو "فریب" کا ہم قافیہ تو بنایا جا سکتا ہے ، مگر "نجیب" یا "نصیب" کا ہم قافیہ نہیں کیا جا سکتا ۔ اس کتاب کی عبارت کا حوالہ آگے آئے گا ۔

اب میں زمانۂ حال کے ایک مصنّف کے یہاں سے ایک اقتباس پیش کروں گا ، تاکہ اس روایت کا تسلسل واضح ہو سکے ۔ لغت نامۂ دہخدا اسی زمانے کی تالیف ہے ، اس کی چالیسویں جلد میں مشہور ایرانی فاضل جلال الدین ہمائی کا ایک طویل مقالہ "دستورِ زبانِ فارسی" کے عنوان سے شامل ہے ، اُس میں مقالہ نگار نے "آہنگہا و حروفِ گویای فارسی" کے عنوان کے تحت صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ مجہول آوازیں فارسی زبان کا جز ہیں ، جو اب بھی بعض لہجوں ، خاص کر کُردوں کے لہجے میں موجود ہیں ۔ مقالہ نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ دو الگ الگ آوازیں ہیں جو "مختصّاتِ زبانِ فارسی" میں شامل سمجھی جاتی ہیں اور شامل سمجھی جانا چاہییں ۔ متعلقہ عبارت یہ ہے :

"آہنگہای فارسی و حروفِ مصوّتہ بیش از سہ تا چہار تا ست ۔ درست است کہ واو و یا در کلماتِ فارسی گاہی برای بیانِ حرکت ، یعنی از حروفِ مصوّتہ است ، امّا کیفیتِ آہنگِ آن تفاوت دارد ۔ مثلاً واوِ معروف در کلماتِ نوروز ، فیروز ، آموز ؛ با واوِ مجہول در امثالِ شور ، کور ، مور ، وہم چنین یاءِ مجہول در کلمۂ سیر ، ضدِّ گرسنگی ، وہم چنین شیرِ درندہ ؛ با یاءِ معروف در سیر مرادفِ پیاز و شیرِ خوردنی در قدیم دو آہنگ داشتہ ۔ وہم اکنون ہر دو آہنگ در بعضی لہجہ ہای بومی از قبیلِ لہجۂ کُردہا باقی ماندہ است ۔ بنابرین واوِ معروف و واوِ مجہول وہم چنین یاءِ معروف و یاءِ مجہول دو آہنگ ممتاز است ، کہ از مختصّاتِ زبانِ پارسی شمردہ میشود و باید در حروفِ مصوّتہ کاملاً شرح داد ۔"

ایران کے مشہور فاضل لسان الملک محمد تقی سپہر کاشانی (متوفی ۱۲۹۷ھ) نے علمِ قافیہ کے موضوع پر ایک قابلِ قدر کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے براہین العجم فی قوانین المعجم ، مصنّف نے بے شمار مثالیں دی ہیں ایسے لفظوں کی جن میں یا معروف ہے یا مجہول اور واو معروف ہے یا مجہول ، اور بہت تاکید کے ساتھ لکھا ہے کہ قافیے میں معروف اور مجہول آوازوں کے فرق کو لازماً ملحوظ رکھنا چاہیے ۔ [مثلاً "شور" کا قافیہ "سرود" نہیں ہو سکتا اور اسی طرح "تیز" کا قافیہ "پرہیز" نہیں آ سکتا] اس کتاب سے صرف ایک اقتباس پیش کروں گا :

"پس باید دانست کہ واو و یای معروف با واو و یای مجہول قافیہ نتوان آورد ، مثلاً "شور" را با "سرود" و "شمشیر" را با ..."

قافیہ کردن صحیح نیست۔

و باید دانست کہ بعضے الفاظ کہ با واو و یا میباشند، معانی مختلف دارند۔ بسا باشد کہ در بعضے معانی بہ یا و واو مجہول اند، و در بعضے از معانی بہ یا و واو معروف .... مثل شیر کہ چوں بمعنی درندہ بود، بیای مجہول است، و چوں بمعنی شیر خوردنی، بیای معروف است۔ مولوی معنوی در مجہولات یائی غایت سعی نمودہ .... کہ فرمودہ است:

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر ؞ گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر " (ص ۱۳۱)

مصنف نے بجا طور پر اس طرف توجہ کیا ہے کہ واو اور یے کے معروف یا مجہول ہونے کے لحاظ سے معنوی فرق بھی پیدا ہو جاتا ہے، اس کی مثال "شیر" (جانور) اور "شیر" (دودھ) دی ہے۔ ہمیں اس پر اتنا اضافہ کرنا چاہیے کہ معنوی فرق کا تعلق صرف تلفظ سے نہیں ہوتا، اب ہمارے یہاں طریقِ کتابت بھی اس کا ذمے دار ہوتا ہے۔ مثلاً "شخصے" لکھا جائے تو اس کے معنی ہوں گے: ایک شخص یا کوئی شخص۔ اور "شخصی" لکھا جائے تو وہ دوسرا لفظ ہوگا۔ اقبال کا مشہور قطعہ ہے:

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید ؞ نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سرآمد روزگارِ ایں فقیرے ؞ دگر دانائے راز آید کہ ناید

یہ قطعہ ارمغانِ حجاز میں اسی طرح چھپا ہے (اور صحیح طور پر چھپا ہے) اب اگر کوئی صاحب (ایران کی جدید روش کے مطابق) "نسیمی" اور "فقیری" لکھیں [یعنی: نسیمی از حجاز آید کہ ناید، اور سرآمد روزگارِ ایں فقیری] تو ہمارے یہاں کے چلن کے مطابق "فقیری" اسمِ مصدر بن جائے گا اور "نسیمی" اسمِ منسوب، اور اس طرح معنوی خلفشار پیدا ہوگا۔

یہاں پر احتیاطاً یہ صراحت کر دی جائے کہ اب سے پہلے، یعنی اس صدی کے اوائل تک، خطاطی کے اثر سے، آخرِ لفظ میں "یی" یا "یے" کی کتابت میں لازمی طور پر امتیاز ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا، مگر تلفظ میں اس امتیاز کو لازماً ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ یعنی جس لفظ کے آخر میں اصلاً یائے مجہول آنا چاہیے، جیسے ایک شخص یا کوئی شخص کے معنی میں "شخصے"، تو اسے خطاط خواہ "شخصے" لکھتا یا "شخصی"، پڑھا جاتا تھا "شخصے"۔ یہی حال یائے معروف کا تھا۔ مثلاً "امیری" کو اگر خطاط "امیرے" لکھ دیتا تھا، تب بھی پڑھنے میں "امیری" ہی آتا تھا۔ اس کے خلاف کبھی نہیں ہوتا تھا۔ اب کتابت اور تلفظ کی یکسانی کو بہ طورِ التزام ملحوظ رکھا جاتا ہے، اور اس التزام کے نتیجے میں اب یہ صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے کہ اگر "امیری" کو "امیرے" لکھا جائے، یا "فقیرے" کو "فقیری" لکھا جائے، تو یہ طریقِ بے امتیازی اب بہت سی الجھنیں پیدا کرے گا۔

یہ بات ہمارے ذہن نشین رہنا چاہیے کہ خاص خاص ایرانی اہلِ نظر بھی ہندوستان میں مروّج تلفظ اور کتابت کے ان مسائل سے ناآشنا نہیں۔ وہ یہ مانتے ہیں کہ ہندوستان میں، وہاں کے نظامِ اصوات اور طریقِ نگارش کے تحت، معروف و مجہول اور غنہ آوازوں کا فرق تلفظ اور کتابت دونوں میں کارفرما رہتا ہے۔ مثلاً مشہور اور ممتاز ایرانی فاضل بہار نے اپنی قابلِ قدر کتاب سبک شناسی میں لکھا ہے:

" در رسم الخطِ ہند دو نکتہ وجود داشتہ و دارد، کہ در ایران بے سابقہ است، و گویا در خراسان قدیماً بودہ است و بہ عراق سرایت نہ نمودہ، و آن معین کردنِ نونِ غنہ و یاءِ مجہول است در کتابت" [جلد سوم ص ۳۰۸]

اسی سلسلے میں مصنفِ مذکور نے مزید لکھا ہے کہ ہندوستان میں نونِ غنہ اور یائے مجہول کی کتابت میں امتیاز کو ملحوظ رکھا جاتا ہے اور آخرِ لفظ میں نونِ غنہ کو نقطے کے بغیر لکھا جاتا ہے اور تلفظ میں بھی امتیازی کیفیت شامل رہتی ہے:

"یاءِ مجہول یائیست در وسط یا آخر کلمہ کہ صدای کسرہ میدادہ است.... و متقدمان ازین روی یاءِ مجہول را با یاءِ معروف قافیہ نمیکردند.... این حرف بلاشک بایستی علامت داشتہ باشد.... ولی در کتبِ ایران ہیچ امتیازی برای شناختنِ آنہا در دست نداریم، اما خطاطانِ ہند امتیاز را در نونِ غنہ و یاءِ مجہول یا ماقبل مفتوح محفوظ داشتہ و دارند، و ہم اکنون آنستا دانِ خطِ نونِ غنہ ما در آخر بدونِ نقطہ نویسند و در وسط علامتی مانند عدد ہفت روی آن گذارند و آنرا از خیشوم و بینی تلفظ کنند" [ص ۳۰۹]

ڈاکٹر شوکت سبزواری (مرحوم) نے "دو ہندایرانی مصوّتے" کے عنوان سے اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی (مرحوم) نے "فارسی کا ہندوستانی لہجہ" کے عنوان

نے دو پُر از معلومات مقالے لکھے ہیں، جو ارمغانِ مالک کی جلد اوّل و دوم میں شامل ہیں، اِن مقالات میں تقریباً سبھی اہم حوالے آگئے ہیں، مزید تفصیل کے لیے ان کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ان حوالوں سے تفصیل کے ساتھ معلوم ہوگا کہ ایران کے اربابِ علم اس بات کو کھلے دل سے مانتے آئے ہیں کہ مجہول آوازیں قدیم فارسی کا جز تھیں اور کردستان اور ہندستان میں وہ اب تک موجود ہیں اور وہاں کے لہجے کا جز ہیں۔ بہار نے سبک شناسی میں تفصیل کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ کس زمانے تک یہ آوازیں ایرانی فارسی میں موجود رہیں۔ مثلاً انھوں نے شیخ سعدی کی گلستان کے متعلق لکھا ہے کہ :

"در صیغہ ہای قدیمی کہ با یای مجہول ... معمول بودہ است، در گلستان نیز آمدہ است" [جلد سوم ص ۱۳۹]

اور اس ذیل میں بہت سی مثالیں دی ہیں۔ ہندستان (و پاکستان) میں یہ آوازیں نظامِ اصوات کا جز رہی ہیں اور کسی طرح کی ادنا تبدیلی کے بغیر یہی صورتِ حال اب تک برقرار ہے۔ فارسی کے جس قدر مستقل لغت یہاں لکھے گئے ہیں، ان میں اکثر لفظوں کے ذیل میں یہ صراحت موجود ہے کہ ان میں واؤ یا ی معروف ہے یا مجہول، اور غنّہ آواز کا ذکر بھی آجاتا ہے۔ میں اس سلسلے میں صرف تین مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ فرہنگِ جہانگیری کا شمار اعلا درجے کے محققانہ لغات میں کیا جاتا ہے، اس کے مؤلف نے مقدّمۂ لغت میں اپنے طریقِ کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے :

" و واوے کہ در حور و سور ، و یائے کہ در نیل و زنجبیل و امثالِ آں باشد، آں واو و یا را معروف نوشتم۔

و واوے کہ در روز و سوز، و یائے کہ در سیر و مانندِ آں بود، آں واو و یا را مجہول مرقوم نمودم"۔

مثلاً لفظ "پیشہ" اس طرح لکھا ہے : "بالوّل مکسور و یای مجہول و شین منقوطۂ مفتوح" [ضمنی طور پر یہ بھی عرض کروں کہ "شینِ منقوطۂ مفتوح" کی صراحت سے یہ بھی متعین ہو جاتا ہے کہ اسے "پیشَہ" پڑھا جائے گا، جدید ایرانی تلفّظ کی رعایت سے "پیشِہ" (بہ یائے معروف و شین مکسور) نہیں کہا جائے گا۔ یہ جو بہت سے جدید فارسی خواں ایران کے جدید لہجے کی تقلید میں کردہ، گفتہ، رفتہ وغیرہ کہتے ہیں؛ یہ فارسی کے ہندستانی لہجے کے بھی خلاف ہے اور اربابِ لغت و قواعد کی تصریحات کے بھی خلاف ہے] ۔ صاحبِ برہانِ قاطع نے مقدّمۂ لغت میں لکھا ہے :

" و دیگر یائے تعجب است کہ اگر مخاطب باشد، معروف خوانند و گویند : تو مرد بدی، و بسیار بدی۔ و اگر غائب باشد،

مجہول خوانند و گویند : فلانے مرد بدے بود"۔

"خوانند" اور "گویند" سے قطعیت کے ساتھ معلوم ہو جاتا ہے کہ ایسے مواقع پر مجہول اور معروف آواز کی معنوی تفریق کے ساتھ ہی ایسے الفاظ کو زبان سے ادا کیا جائے گا۔ یہ وہی بات ہے جو اس مضمون کے آغاز میں "فقیری" اور "فقیرے"، "شخصی" اور "شخصے" کی مثالوں کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ یعنی لازم ہے کہ حاضر کے لیے "بدی" کہا جائے اور غائب کے لیے "بدے" اور یہ بھی لازم ہے کہ انھیں اسی امتیاز کے ساتھ لکھا بھی جائے۔ اگر پڑھنے میں بے امتیازی برتی جائے گی تو معنوی طور پر خرابی لازم آئے گی اور لکھنے میں بے امتیازی برتی جائے گی تب پڑھنے میں خرابی پیدا ہوگی۔

سراج الدین علی خاں آرزو کا شمار دورِ آخر کے افاضل میں کیا جاتا ہے، انھوں نے اپنے لغت چراغِ ہدایت میں جگہ جگہ معروف و مجہول آوازوں کی صراحت کی ہے، مثلاً لفظ "تیشہ" کے ذیل میں لکھا ہے : "بہ یائے مجہول"۔

نونِ غنّہ :۔ یائے مجہول اور واوِ مجہول کی آوازوں کی طرح نونِ غنّہ کی آواز بھی فارسی زبان میں شامل رہی ہے۔ اس کا خاص طور پر تعین ہوتا ہے اُن کتابوں میں جو قواعد کے موضوع پر لکھی گئی ہیں، خاص کر قواعدِ عروض پر۔ قواعدِ عروض کے مطابق نونِ غنّہ وزنِ عروضی میں شامل نہیں ہوتا (جس طرح ہائے مخلوط (دو چشمی) اردو میں وزنِ عروضی میں شامل نہیں ہوتی)۔ مثلاً قواعدِ عروض کی معتبر ترین کتاب معیار الاشعار میں، اُن حرفوں کے بیان میں جو تقطیع میں ساقط ہو جاتے ہیں، لکھا ہے :

" و حرفہای دیگر باشد کہ ہم از ترکیبِ دو حرف حادث باشد، مثلاً چنانکہ از ترکیبِ یکے از حروفِ مد با غنّہ در لفظِ "دون" و "دان" و "دین" باشد، و امثالِ این اندکہ بر وزنِ "دو" و "دا" و "دی" باشد" [معیار الاشعار مع حاشیۂ مفتی سعد اللہ الموسوم بہ میزان الافکار، مطبعِ علوی، ص ۷]

پھر اس سلسلے میں واوِ معدولہ کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے :

" و واوِ معدولہ [illegible] حرفیست آنست کہ در وزن بجای یک حرف است مثل "خوان" کہ در کتابت [illegible]

مشتمل بر چہار حرف است و در تلفظ مرکب از دو حرف است، چہ بروزنِ "خا" است" (ایضاً)۔

شمس الدین محمد بن قیس رازی نے المعجم فی معاییر اشعار العجم میں لکھا ہے:

"اما نونِ غیر ملفوظ، ہر نون کی ماقبلِ آن ساکن باشد و در شعر بہ تحقیقِ آن احتیاج نبود، در تقطیع ساقط آید، چنانک،

چون نگارین روی او در شہر نیست

کی نونِ غنہ "چون" و "نگارین" از تقطیع ساقط اند (ص ۵۰)

اب اگر کوئی صاحب اس مصرعے کو اس طرح لکھیں: چون نگارین روی در شہر نیست، (یعنی "چون" اور "نگارین" مع نونِ نقطہ دار) اور پڑھیں بھی اِن دونوں لفظوں کو بہ اعلانِ نون، تو کیا مصنف کا بیان غلط آلود نہیں ہو جائے گا اور بے معنی نہیں ٹھہرے گا؟

ہمارے یہاں اخفا و اعلانِ نون کی بحث بہت تفصیل کے ساتھ رسالوں اور کتابوں میں ملتی ہے اور یہ ساری بحث اور اس کی طویل تفصیلات جن میں نونِ غنہ کی آواز کے وجود پر؛ اگر جدید ایرانی لہجے کی غیر ضروری اور قطعاً غیر مناسب تقلید میں آخرِ لفظ میں واقع نونِ غنہ کو نونِ نقطہ کی طرح پڑھا جائے اور لکھا جائے تو یہ سارے قاعدے مہمل ٹھہریں گے اور بے معنی ثابت ہوں گے۔

اُردو میں جو اساتذہ نے یہ قاعدہ بنایا تھا کہ جہان، تحسین، خون جیسے لفظ جب فارسی ترکیب کے ساتھ آئیں، تو اِن کے نون کا اعلان نہیں ہونا چاہیے، یعنی شعر میں اِن کو مع نونِ غنہ لانا چاہیے، اور اسی طرح پڑھنا چاہیے؛ تو وجہ اس کی یہی بتائی گئی تھی کہ فارسی میں ایسے مواقع پر ایسے لفظوں کو بہ اعلانِ نون نہیں لایا جاتا [اس کی تفصیلی بحث راقم الحروف کی کتاب زبان اور قواعد میں ملے گی] قاعدۂ عروض کا ذکر ابھی آچکا ہے کہ تقطیع میں نونِ غنہ ساقط ہو جایا کرتا ہے اور اس پر ایرانی اور ہندستانی قواعد نویسوں کا اتفاق ہے مثلاً "جہان" جب فارسی ترکیب کے ساتھ آئے گا، جیسے: رنگِ جہاں، تو آخر کا نون غنہ ہوگا پڑھنے میں بھی اور لکھنے میں بھی۔ اسی بنا پر "جہان" جو ویسے چار حرفی لفظ ہے، تقطیعِ شعر میں "جہا" (بروزنِ فعل) تین حرفی رہ جائے گا۔ اب اگر "جہان" (مع نونِ نقطہ دار) لکھا جائے اور جدید ایرانی لہجے کے مطابق "جہَن" پڑھا جائے تو سارا قاعدہ ہی چوپٹ ہو جائے گا، اس بنا پر کہ ایسا کوئی قاعدہ نہیں کہ "جہان" کو "جہَن" پڑھ کر، درمیان کے الف کو ساقط فرض کر لیا جائے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کے لیے ایک ہی قاعدہ تھا اور ہے کہ نونِ غنہ جب آخرِ لفظ میں واقع ہوگا تو اُسے تقطیع میں ساقط کر دیا جائے گا یہ نہیں ہوگا کہ اُسے برقرار رکھا جائے اور اس سے پہلے والے حرف کو ساقط کر دیا جائے۔ اور اب قطعیت کے ساتھ اِس کی بھی پابندی کی جاتی ہے کہ ایسے نون کو لکھا جائے نقطے کے بغیر۔ اگر اب "جہاں" کو "جہان" لکھا جائے گا، تو اسے پڑھا بھی جائے گا مع اعلانِ نون "جہان" بروزنِ فعول۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ لکھا تو جائے "جہان" اور اُسے پڑھا جائے "جہاں" یا "جہَن"۔ "سبک شناسی" کا اقتباس اس مضمون میں شروع ہی میں آچکا ہے جس میں ملک الشعرا بہار نے وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ ہندستان میں نونِ غنہ کو آخرِ لفظ میں نقطے کے بغیر لکھتے ہیں اور درمیانِ لفظ میں اُس پر سات کے ہندسے جیسی علامت بنا دیتے ہیں اور یہ بالکل درست ہے۔ سات کے ہندسے والی علامت تو خاص خاص لفظوں ہی پر بنائی جاتی ہے، مگر آخرِ لفظ میں واقع نونِ غنہ کو التزاماً نقطے کے بغیر لکھا جاتا ہے، فارسی میں بھی اور اُردو میں بھی۔ مثلاً اقبال کے جس قدر مجموعے اُن کی زندگی میں چھپے ہیں۔ اُن سب میں اس قاعدے کی پابندی ملتی ہے۔ اب اگر کوئی صاحب اقبال کا کوئی ایسا شعر نقل کریں جس کے کسی لفظ میں یا الفاظ میں آخرِ لفظ میں نونِ غنہ آیا ہو، اور وہ اسے مع نونِ نقطہ دار لکھیں تو یہ مسلّمہ قاعدے کے بھی خلاف ہوگا اور مرادِ مصنف کے بھی خلاف ہوگا۔ ایسے کسی بھی حالت میں قابلِ قبول قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اضافت کے زیر کا تلفظ: اس سلسلے میں مزید تین باتیں ایسی ہیں جو ہماری توجہ کی مستحق ہیں۔ اِن میں سب سے پہلے اضافت کا مسئلہ ہے۔ اضافت کے قاعدے سے ہم سبھی واقف ہوں گے۔ اضافی مرکبات جب زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ تو اضافت، خفیف مجہول آواز کی صورت میں اپنے آپ کو نمایاں کیا کرتی ہے، جیسے: شامِ تنہائی، دلِ عاشق، محفلِ عیش، خدائے دو جہاں۔ یہ تلفظ کا عام اور متعارف انداز ہے جو فارسی میں (اور فارسی کے اثر سے اُردو میں) شروع سے کار فرما رہا ہے۔ جدید ایرانی لہجے کی تقلید میں اسے اگر مائل بہ معروف کر کے پڑھا جائے [مثلاً "دلِ عاشق" کے پہلے جز کو DELE کی بجائے DIHI کہا جائے] تو یہ محسوس ہوگا بولنے والا تلفظ کی صحیح ادائگی پر قادر نہیں۔ بات وہی ہے کہ بسیط مجہول آواز اور خفیف مجہول آواز، یہ دونوں ہمارے لہجے کا حصہ ہیں، جب اُن کو بالجبر تبدیل کیا جائے گا تو اجنبیت ضرور پیدا ہوگی اور تلفظ کا چہرہ مہرہ بگڑتا ہوا ضرور محسوس ہوگا۔

یائے ماقبل مفتوح: دوسری بات: وہ لفظ جن میں یائے تحتانی سے پہلے والے حرف پر زبر ہو اُن کے تلفظ اور کتابت کا معاملہ ہے۔ ایسے لفظوں کے

دو صورتیں ہیں: ایک تو یہ کہ یائے تحتانی لفظ کے آخر میں ہو، جیسے: سے، طے، رہے، نے، رے وغیرہ۔ ایسے لفظوں میں تلفظ اور کتابت دونوں کے تعین کا مسئلہ ہے۔ دوسرے یہ کہ یائے تحتانی لفظ کے درمیان ہو، جیسے: دیر، سیر، بیل، فیدا، خیبر (؟) وغیرہ)۔ دونوں صورتوں میں اس ی کی آواز واضح اور متعین ہے۔ ایسے لفظوں کو اگر تقلید کے پھیر میں آکر زبان سے اس طرح ادا کیا جائے کہ زبر کی آواز نیچے کی طرف مائل ہو کر یعنی ذرا سی کھینچ کر نکلے، تو یہ تلفظ بے حد نامانوس معلوم ہوگا [مثلاً خیبر KHYBAR کو KHAIBAR کہا جائے، جس طرح تازہ مقلدین ایرانی تلفظ کہتے ہیں]۔ اسی طرح اوّل الذکر الفاظ کے آخر میں اگر یے کے بجائے ی لکھی جائے، یعنی سے کو سی اور رہے کو رہی اور نے کو نی لکھا جائے [جس طرح بعض مقلدین لکھتے ہیں] تو یہ لکھاوٹ لفظوں میں خلفشار پیدا کرنے کا ذریعہ بنے گی۔ جب "نے" کو "نی" لکھا جائے گا تو اُسے "نے" [یعنی شراب] کیسے پڑھا جا سکتا ہے؟

اِمالہ: - تیسری بات امالے سے متعلق ہے، جس کا ذکر اس سے پہلے بھی آ چکا ہے۔ جن لفظوں میں امالہ ہوا ہے [اور فارسی میں اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں] ایسے لفظوں میں مسلّمہ طور پر یائے مجہول ہے۔ کتابوں میں اس کی صراحت موجود ہے۔ اگر جدید لہجے کی مطابقت میں مثلاً کتاب کی امالہ شدہ صورت "کتیب" (ک ت ے ب) کو کتیب (ک ت ی ب) پڑھا جائے، تو یہ عمل امالے کے قاعدے کو تباہ کرنے کے مرادف ہوگا۔ سپہر کاشانی نے اپنی کتاب براہین العجم میں لکھا ہے:

"اِمالہ، میل نمودن از الف بہ کسرہ است..... و دیگر میل نمودن از الف بہ یا بود، چنانکہ کتاب را کتیب و حجاز را حجیز خوانند۔ و باید دانست کہ یائیکہ در کلماتِ ممالہ بود، بہ ترقیق خوانند، و با یای مجہول بجہاں انبار بود و قافیہ شود۔ و ایراد آنہا با یای معروف بر غلط بود، مثلاً کتیب و حسیب با نسیب و غریب قافیہ شود، امّا با طبیب و حبیب روا نبود" [ص ۴۴]

مصنّف نے مزید لکھا ہے: "یای در کلماتِ ممالہ حالتِ یای مجہول دارد و با یای معروف قافیہ نشود (ص ۴۳)۔ اس قاعدے کے ذیل میں اس کتاب میں بہت زیادہ مثالیں یک جا کر دی گئی ہیں، اُنھیں دیکھا جا سکتا ہے۔ میں صرف دو مثالیں اس کتاب سے نقل کرتا ہوں۔ مصنّف نے ایسے لفظوں کا ذکر کرتے ہوئے، جن کے آخر میں یائے مجہول ہے، لکھا ہے:

"آرے، بارے، بے [یا یای مجہول برای مفارقت بود، چنانکہ گویی بے او و بے من و امثالِ آں] و بے، نے [بکسر اوّل و یای مجہول افادۂ لا ی نفی کند] انوری گوید:

صبا بسبزہ بیاراست دار دنیے را ... نمونہ گشت جہاں مرغزار عقبے را
بہ بارگاہِ تو دایم بیک شکم زاید ... زمانہ صورتِ سوال و جوابِ آرے را

حکیم ناصر خسرو:

چہ چیز بہتر و نیکو تر است در دنیے ... سپاہ نے، گلّہ نے، ضیاع نے، رمہ نے
نگاہ کن کہ بدیں حرفہا چگونہ خبر ... بجانِ زید رساند زبانِ عمرو سے
ہمیت گوید ہر یک کہ کار خویشتن بکن ... اگرت چشم درست است، در نگر بارے

قصائد کے اشعار بہت ہیں، میں نے مثالاً چند شعر نقل کیے ہیں۔ ایسی بہت سی مثالوں کے بعد لکھا ہے:

"با ایں اشعار و قوافی یای دلغاتِ فارسی جای آں نبود کہ کس ایں قصائد را با الف خواند و حرفِ بعدی را الف داند"

[ص ۸۰]

میں بس ایک مختصر سا حوالہ اس سلسلے میں اور پیش کرنا چاہتا ہوں، تاکہ ایک ہندوستانی مصنّف کا قول بھی سامنے آ جائے۔ مشہور فاضل مفتی سعد اللہ صاحب نے معیار الاشعار کے حاشیے موسوم بہ میزان الافکار میں لکھا ہے:

"و بالاتفاق جمع میانِ یای مجہول و کلماتِ عربی کہ امالۂ آں در فارسی شہرت یافتہ، جائز است۔ انوری گوید:

تا ماہ بود یم از مہ رخ مہ رجیب دارد ... نے دیدہ صبر دارد ہستہ دل شکیب دارد" (ص ۱۸۹)

یعنی "جیب" کو [illegible] "شکیب" کا ہم قافیہ ہو سکتا ہے، کیونکہ "شکیب" میں یائے مجہول ہے۔

سلام بن رزاق

۱۰۱، ایل، آئی جی، کالونی، کرلا ویسٹ، بمبئی ۔ ۴۰۰۰۷۰

آبلہ

(۱)

آدھے گھنٹے بعد مجھے ملی باغ سے گون پاڑا جانے کے لیے دوسری بس مل گئی۔ اس وقت سوا بارہ ہو رہے تھے۔ میں نے کنڈکٹر سے پوچھا تو معلوم ہوا ٹھیک ایک بجے یہ بس گون پاڑا کے اسٹاپ پر اتار دے گی۔ میں نے پندرہ روز پہلے ہی دامودر کو خط لکھ دیا تھا۔ کہ میں دوپہر کا کھانا گون پاڑا میں اسی کے ساتھ ہی کھاؤں گا۔ اور کھانے میں چاول کا گرم گرم روٹ اور زرائی گیلے بومبل ضرور ہونے چاہئیں۔

دامودر جب تک بمبئی میں تھا۔ بومبل کے سیزن میں تقریباً ہر ہفتہ میں اس کے گھر بومبل زرائی اور چاول کی روٹی کھانے پہنچ جایا کرتا تھا۔ دامودر کی بیوی پرملا ایسے مست بومبل زرائی کرتی تھی کہ مدینہ ہوٹل کے مشہور زمانہ سیخ کباب بھی ان بومبلوں کے سامنے پھیکے تھے۔ دامودر مجھے میرے خاندانی نام شیخ سے 'شیخو' پکارا کرتا تھا اور پرملا مجھے شیخو دادا کہا کرتی تھی۔ مراٹھی میں بڑے بھائی کو دادا کہتے ہیں۔ وہ ہر سال رکشا بندھن پر بلا ناغہ مجھے راکھی باندھتی اور مجھ سے ایک عدد ساڑی وصول کرتی تھی۔ بمبئی میں میری اور دامودر کی دوستی تقریباً بیس برس پرانی تھی۔ ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے پرملا اور میری بیوی زاہدہ بھی ایک دوسرے کے قریب آ گئیں۔

دامودر کوکن کا رہنے والا تھا۔ اور گون پاڑا اس کا آبائی گاؤں تھا۔ ایک بار اس کی بہن کی شادی میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ گون پاڑا میں دو ہفتہ رہ آیا تھا۔ گاؤں کا کھلا ماحول مجھے اور میری بیوی کو بے حد پسند آیا تھا۔ البتہ بچے بور ہونے لگے کیوں کہ وہاں ان کے دوست اور سہیلیاں نہیں تھیں۔ اور گاؤں میں اس وقت تک کسی کے ہاں ٹی وی بھی نہیں آیا تھا۔

پھر تین برس پہلے کی بات ہے اچانک ایک دن دامودر نے بتایا کہ وہ بمبئی چھوڑ کر اپنے گاؤں گون پاڑا میں مستقل سکونت اختیار کرنے والا ہے۔ گون پاڑا میں اسے اس کی آبائی زمین کا خاصہ بڑا حصہ مل رہا تھا۔ اس نے اس زمین پر ایک چھاپہ خانہ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دامودر بمبئی کے ایک مراٹھی پریس میں کمپوزیٹر تھا اور اسے پریس کا اچھا خاصہ تجربہ تھا۔ میں نے اس سے پوچھا تھا۔

"مگر دامودر! تو پریس کے لئے اتنے روپئے کہاں سے لائے گا؟"

"مجھے نہیں معلوم، مگر پریس کوئی دو چار ہزار میں تو نہیں آئے گا نا؟"

"کتنے روپے؟" دامودر نے مسکراتے ہوئے الٹے مجھ ہی سے پوچھ لیا؟

"تو صحیح کہہ رہا ہے۔ پریس مشین، ٹائپس، کٹر مشین وغیرہ کل ملا کر تین لاکھ روپئے لگ جائیں گے۔"

"تین لاکھ۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔ تیرے پاس ہیں تین لاکھ۔؟"

"ارے میرے پاس کہاں سے آئے مگر انتظام ہو جائے گا۔"

"کیسے؟"

"دیکھ میرا فنڈ اور گریجویٹی ملا کر مجھے اپنی کمپنی سے ایک لاکھ روپے تک مل جائیں گے۔ میرا فلیٹ چھوٹا ہے مگر کم از کم دو لاکھ میں تو بک ہی جائے گا۔"

"تو اپنا فلیٹ بھی بیچ دے گا؟ گویا تو بمبئی سے پوری طرح اپنا رشتہ ختم کر کے جا رہا ہے؟" میں نے ایک دم سے اداس ہو کر کہا۔

"صرف بمبئی سے بمبئی والوں سے نہیں۔"

اس نے مسکرا کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ میں کچھ نہیں بولا میری سنجیدگی کو دیکھ کر دامودر بھی سنجیدہ ہو گیا۔ اور میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "دیکھ شیخو! بمبئی کی آبادی اور آب و ہوا اتنی ہارڈ ہو گئی ہے کہ ہم لوگ بارہا اس پر تشویش کا اظہار کر چکے ہیں۔ مگر یہاں سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہے۔ تو یقین جان، اگر مجھے وہ خاندانی زمین نہیں ملی ہوتی تو شاید میں بھی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ اب جب کہ قسمت نے ایک موقع

دیا ہے، میں اس زمین کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہاں دوبارہ بسنے میں مجھے کافی دشواریاں آئیں گی۔ مگر میں بس جاؤں گا۔ پچیس برس پہلے جب میں بمبئی آیا تھا تو میرے پاس کیا تھا۔ سوائے بدن کے کپڑوں کے؟ آخر یہیں رہ کر میں نے نوکری حاصل کی۔ کام سیکھا، اپنی ایجوکیشن مکمل کی۔ گھر بنایا۔ گھر بسایا۔ جب بمبئی جیسے بے مروت شہر میں سیٹل ہو سکتا ہوں تو پھر گون پاڑا تو میرا آبائی گاؤں ہے یار! دوسری بات یہ کہ خاندانی زمین کا حصہ مل جانے سے مجھے کافی حوصلہ ملا ہے۔ اتنی زمین ہے کہ ضرورت پڑنے پر تھوڑی بہت بیچی بھی جا سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے یار۔ خدا تجھے تیرے ارادوں میں کامیابی دے۔ جہاں بھی رہے خوش رہے۔" میں نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

دامودر چلا گیا۔ اس نے جیسا کہا تھا ویسا کر دکھایا۔ دو برس کے اندر اندر اس کا پریس اچھا چل نکلا کہ اس نے بینک سے قرض لے کر ایک اور مشین خرید لی۔ کبھی مشین کے پرزوں کی خریداری کبھی کاغذ وغیرہ کے لیے وہ ہر مہینہ، پچھواڑے بمبئی کا ایک چکر ضرور لگاتا۔ اور جب کبھی آتا مجھ سے ملے بغیر نہیں جاتا۔ وہ گاؤں میں بے حد خوش تھا اس کی صحت بھی اچھی ہو گئی تھی۔ وہ مجھ سے اکثر کہتا رہتا، "کبھی گاؤں آؤ۔ یار۔"

اور میں ہر بار اس سے کہتا۔

"تو اگلی بار جب آئے گا تو ساتھ ہی چلیں گے۔"

مگر تین برس ہو گئے میں ایک بار بھی اس کے ساتھ اس کے گاؤں نہیں جا سکا۔

پچھلے چار مہینوں میں مجھے فلمی گھوسٹ رائٹنگ کا اتنا کام مل گیا کہ میرے پاس یک مشت تیس چالیس ہزار روپے جمع ہو گئے۔ میں نے اور میری بیوی نے بہت غور کیا کہ ان تیس چالیس ہزار روپیوں کو کہاں انویسٹ کریں۔ اچانک مجھے دامودر کا خیال آیا۔ میں نے بیوی کے سامنے تجویز رکھی کہ کیوں نہ ہم ان روپیوں سے گون پاڑا میں زمین خرید لیں۔ وہاں ہمارے لئے دامودر تو ہے ہی۔ آگے چل کر اسی زمین پر فارم ہاؤس بنوا لیں گے۔ اس طرح ریٹائرڈ ہونے کے بعد بچے بھلے ہی بمبئی میں رہیں گے، ہم گاؤں میں منتقل ہو کر زندگی کے آخری چند برس سکون سے گزار سکتے ہیں۔ بچوں کے لئے بھی تعطیلات وغیرہ میں آنے جانے کے لئے ایک ٹھکانہ ہو جائے گا۔ بیوی کو تجویز پسند آئی اور میں نے دامودر کو خط لکھ دیا کہ میں گاؤں میں زمین خریدنا چاہتا ہوں وہ فارمنگ کے لئے کوئی مناسب زمین دیکھ رکھے۔ میں نے اسے اپنی خریداری کی حدود سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔

میرے والد حیدرآباد پولیس ایکشن کے بعد وہاں سے ہجرت کر کے بمبئی میں آ بسے تھے۔ اور تبھی سے ہم لوگ کرائے کے مکانوں میں رہتے آئے تھے۔ ہمارا حیدرآباد میں بھی کوئی زمین جائیداد نہیں تھی۔ میں سوچ رہا تھا اسی بہانے تھوڑی بہت ہی سہی اپنی زمین ہو جائے گی۔ زمین خریدنے کے تصور سے میرے دل میں عجیب سی مسرت آمیز گدگدی ہو رہی تھی۔ جس میں احساس تفاخر بھی شامل تھا۔ واقعی اپنی زمین ہونا کیسی فخر و مسرت کی بات ہے حالانکہ ابھی یہ سارا معاملہ ہوا میں معلق تھا۔ مگر مجھے پتا نہیں کیوں یقین تھا کہ دامودر میری تجویز پر بے حد خوش ہوگا اور وہ ہر طرح میری مدد کرے گا۔

بس جس سڑک سے گزر رہی تھی اس کے دونوں طرف ناریل اور سپاری کے بے شمار درخت چھتریوں کی طرح سایہ کیے ہوئے تھے۔ درختوں کے گھنے پتوں اور اونچی پھنگیوں کے درمیان سے سورج اپنی شعاعوں کے تیر برساتا تو ایسا لگتا جیسے بس چند لمحوں کے لئے بجلیوں کی زد میں آ گئی ہو۔ شروع مارچ کا مہینہ تھا اور دوپہر کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے مگر ان درختوں کی چھاؤں کے سبب گرمی کا بالکل احساس نہیں ہو رہا تھا۔ ایسا خوشگوار موسم تھا کہ بمبئی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے کھڑکی سے گردن نکال کر دو چار گہرے سانس لئے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر درختوں کے جھنڈ میں اکا دکا مکان نظر آ جاتا تھا۔ کسی مکان کے آنگن میں ایک عورت چارپائی پر چادر بچھائے پاپڑ سکھا رہی تھی۔ ایک جگہ نو نو دس دس برس کے دو ہم عمر بچے کنویں کے پاس ننگے کھڑے ایک دوسرے پر پانی اچھال رہے تھے۔ اچانک بس کے بریک چرچرائے۔

"او آئی آئی لا۔"

ڈرائیور نے کسی کو گالی دی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا۔ ایک بھینس سڑک کے دائیں طرف درختوں کے جھنڈ سے نکل کر خراماں خراماں بائیں کو جا رہی تھی۔ اور اس کی پیٹھ پر ایک چودہ پندرہ برس کا لڑکا اطمینان سے بیٹھا ڈرائیور کی طرف دیکھ کر ہنس رہا تھا۔

"آئی مائی لا۔ ورنہ بیٹا ہنستو ئے۔" [اس کی ماں کی۔ اوپر سے ہنس رہا ہے] ڈرائیور نے بس اسٹارٹ کر کے پہلے اپنے آپ سے کہا۔ بس دوبارہ چل پڑی۔ بھینس درختوں کے جھنڈ میں روپوش ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے بعد پانچ منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ کنڈکٹر نے آواز لگائی "گون پاڑا۔"

میں نے ہڑبڑا کر اپنی اٹیچی سنبھالی۔ بس کی رفتار دھیمی پڑ چکی تھی۔ وہ رینگتی ہوئی سڑک کنارے رک گئی۔ میں نے کھڑکی میں سے دیکھ لیا تھا۔ دامودر قمیض اور دھوتی پہنے کھڑا تھا۔ اسے اس حلیے میں پہلی نظر میں پہچاننا مشکل تھا۔

کیوں! وہ تو ہمیشہ ہی سے شرٹ پینٹ پہننے کا عادی تھا۔ اور اب بھی جب کبھی آتا تو بش شرٹ پینٹ ہی میں آتا تھا۔ گاؤں میں شاید وہ دھوتی کرتا ہی پہنتا تھا۔ میں جیسے ہی نیچے اترا وہ لپک کر آگے بڑھا۔ میں نے اٹیچی زمین پر رکھ دی اور دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ اس نے انتہائی گرم جوشی سے مجھے گلے لگا لیا۔

"کیسے ہو شیکھر۔"

"ایک دم چنگا۔ تو بتا۔"

"مزے میں ہوں۔" پھر اس نے مڑ کر اپنے پیچھے کھڑے ایک لڑکے سے کہا۔

"بالو یہ اٹیچی اٹھا لے۔" بالو نے آگے بڑھ کر اٹیچی اٹھا لی۔ ہم لوگ ایک دوسرے کی خیریت پوچھتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ بالو اٹیچی لئے ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ ایک گلی میں داخل ہوتے ہی میرے نتھنوں سے ایک مخصوص قسم کی بو ٹکرائی۔ ایسی بو اکثر پرنٹنگ پریس سے آتی ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ ہو نہ ہو، دامودر کا پریس یہیں کہیں ہوگا۔ اور میرا اندازہ صحیح نکلا۔ گلی کا موڑ ختم ہوتے ہی ہم لوگ اس کے پریس کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ ایک منزلہ عمارت تھی جس میں نیچے پریس تھا اور اوپر شاید دامودر کی رہائش گاہ تھی۔ عمارت کے اوپر ایک بڑا سا سائن بورڈ لگا تھا۔ جس پر مراٹھی میں لکھا تھا۔ 'پربھات پرنٹنگ پریس' 'پربھات'، دامودر کے بیٹے کا نام تھا۔ دامودر بمبئی میں تھا تب تک اس کی دو اولادیں تھیں۔ ایک لڑکی سمترا اور لڑکا پربھات۔ گاؤں پلٹ آنے کے بعد دوسرے سال اس نے مجھے خط سے اطلاع دی تھی کہ دس برس کے بعد ان کے گھر میں ایک اور سنتان ہوئی ہے۔ بچی کا نام اس نے لکھا ضرور تھا مگر مجھے یاد نہیں رہا۔

ہم لوگ گیٹ سے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئے۔ پریس میں کام چل رہا تھا۔ باہر کمپاؤنڈ میں پریس کی کسی پرانی ناقابلِ استعمال مشین کا ایک حصہ پڑا تھا۔ دامودر مجھے لئے ہوئے پریس کے اندر داخل ہونے کی بجائے زینوں کی طرف بڑھ گیا۔

"پہلے نہا دھو کر کھانا کھا لے پھر پریس دکھاؤں گا۔ پرملا اوپر تیرا انتظار کر رہی ہے چل۔"

میں اس کے پیچھے پیچھے زینے طے کرنے لگا۔ زینے طے کر کے ہم ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے میں دو چارپائیاں بچھی تھیں ایک طرف دو پرانی کرسیاں رکھی تھیں۔ دیواریں نئی تھیں اور آئیل پینٹ سے چمک رہی تھیں لگتا تھا ابھی حال ہی میں ان پر روغن کیا گیا ہے کیوں کہ کمرے میں آئیل پینٹ کی مخصوص بو بھی بسی ہوئی تھی۔ دامودر نے اندر کے دروازے کی طرف منہ اٹھا کر آواز دی۔

"پرملا! بگھ تُزا بھاؤ آلا ہے۔" پرملا دیکھ تیرا بھائی آیا ہے۔

سامنے کے دروازے کا پردہ ہٹا اور پرملا ایک بچی کو گود میں لئے مسکراتی ہوئی داخل ہوئی۔ اس نے گہرے سبز رنگ کی بیل دار ساڑی پہن رکھی تھی۔ پرملا نے ایک ہاتھ سے بچی کو سنبھالتے ہوئے مجھے پرنام کیا۔ میں نے مسکرا کر اس کے پرنام کا جواب دیا۔ پھر آگے بڑھ کر بچی کا گال ہلکے سے تھپتھپاتے ہوئے پوچھا۔

"بھئی! اس ننھی گڑیا کا نام کیا ہے۔ دامودر نے خط میں لکھا تھا مگر میں بھول گیا۔"

"پاروتی!" میں نے دیکھا کہ نام بتاتے بتاتے جانے کیوں پرملا شرما گئی اور دوسری طرف منہ پھیر کر مسکرانے لگی۔

"اس کا نام تو اس کے دادی کے نام پر پاروتی رکھا ہے۔ مگر ہم سب "پارو" کہہ کر پکارتے ہیں۔" دامودر کہتے کہتے ہنس پڑا۔ میں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ میں جانتا تھا۔ دیوداس کی "پارو" دامودر کو بہت پسند تھی۔ اس نے پارو کو دیکھنے کے لئے دیوداس پندرہ بار دیکھی تھی۔ پرملا بھی ہنستی مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"بھابھی کیسی ہیں؟"

"مزے میں ہیں۔ تمہیں سلام کہا ہے۔"

"وعلیکم السلام" پرملا نے خالص مسلمانی انداز میں سلام کا جواب دیا اور ایک بار پھر ذرا شرما کر ہنستی ہوئی بولی۔

"شیکھر دادا! بچوں کو بھی ساتھ لے آتے۔"

"اسے بڑی مشکل سے دو روز کی چھٹی ملی ہے دفتر سے، اس دوڑ میں انہیں کیا لاتا!"

"دامودر نے پرملا کے ہاتھ سے پارو کو لیتے ہوئے کہا۔

"پرملا تم جا کر کھانے کی تیاری کرو۔ شیکھر جب تک نہا کر تیار"

"شیکھا" دامودر مجھ سے مخاطب ہوا" ادھر دائیں طرف باتھ روم ہے جا کر نہا لے۔"

"میں نے اپنی اٹیچی کھول کر تولیہ اور صابن نکالنا چاہا۔ دامودر "تو کسی لاج یا ہوٹل میں نہیں آیا ہے جو اپنا تولیہ یا صابن استعمال کر۔ باتھ روم میں جا، وہاں سب کچھ رکھا ہے۔"

"اچھا بابا، اچھا۔ ناراض مت ہو" میں باتھ روم میں چلا گیا۔

باتھ روم میں نہا تولیہ اور صابن کی نئی ٹکیہ رکھی ہوئی تھی۔ باتھ روم کسی ہوٹل کے باتھ روم کی طرح صاف ستھرا اور گیزر، شاور سے لیس تھا۔ سفر کے بعد غسل آدمی کو کسی چڑیا کی طرح ہلکا پھلکا بنا دیتا ہے۔

میں غسل خانے سے باہر نکلا تو کمرے میں دسترخوان بچھ چکا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی دامودر نے آواز لگائی۔ "پرملا! کھانا لاؤ۔"

دیکھتے ہی دیکھتے پرملا نے پلیٹوں اور رکابیوں سے دسترخوان بھر دیا۔ "قورمہ، پراٹھے، بگھارے چاول، گوبھی کا ساگ، قیمہ بھری شملہ مرچ، تین تین قسم کا اچار، پاپڑ، دہی اور ایک بڑی سی قاب میں تلے ہوئے مسالے دار پومبل اور سبوری بھوری چاول کی روٹیاں، میں نے حیران ہو کر پوچھا۔"

"کھانے پر کچھ اور لوگ آ رہے ہیں کیا؟"

"کون آ رہا ہے؟" دامودر نے مجھ سے بھی زیادہ حیرانی کا اظہار کیا۔

"میں یہ پوچھ رہا تھا۔ یہ اتنا بڑا دسترخوان، اتنی ساری ڈشیں کیا اور لوگ بھی آ رہے ہیں کھانے پر؟"

"نہیں یار۔ چلو شروع کرو۔ ہاں تم لوگ کھانے سے پہلے کیا بولتے ہو۔ اللہ، اللہ۔"

"اللہ، اللہ نہیں بے بسم اللہ۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ ہاں۔ وہی بسم اللہ،" دامو نے میری پلیٹ میں بڑے بڑے دو فرائی پومبل ڈالتے ہوئے کہا۔ "پہلے تیری فرمائشی ڈش سے شروع کرتے ہیں۔"

"ابے یار! دامو" یہ ساری چیزیں تیار کرنے کے لیے میرا خیال ہے پرملا کو تو نے رات بھر جگایا ہوگا۔"

"یہ تو تو اپنی بہن سے پوچھ لینا۔ چل پہلے کھانا کھا۔"

کھانے کے دوران پرملا برابر آس پاس منڈلاتی رہی۔ جوں ہی کسی قاب میں کوئی چیز کم ہوتی تو وہ فوراً اسے بھر دیتی۔ مجھے لذیذ کھانوں کا شروع سے شوق رہا ہے۔ مگر اس روز کا کھانا میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ کھانے سے زیادہ دامودر اور پرملا کے خلوص، اپنائیت اور چاہت کی بارش نے مجھے شرابور کر دیا تھا۔ کھانے کے بعد دامودر مجھے پریس دکھانے لگا۔ پریس میں بڑے سلیقے سے کام چل رہا تھا۔ چھپائی، بائنڈنگ، کمپوزنگ، پروف ریڈنگ ہر کام کے لیے الگ الگ کاریگر مقرر تھے اور سبھی بڑے خلوص سے [illegible] دامودر نے بتایا کہ اس کے پاس

دس کاریگر مستقل ملازم ہیں۔ اس کے علاوہ پروف ریڈنگ وغیرہ کے لیے قریب کے کالج سے چھ سات طلبا و طالبات جز وقتی کام کرنے آتے ہیں۔ اس طرح اس کا کام بھی نکل جاتا ہے اور ان طالب علموں کو مالی فائدہ بھی ہو جاتا ہے۔ دیوالی، دسہرے کے موقع پر یا شادی بیاہ کے موسم میں وہ پانچ سات عارضی ملازم بھی رکھ لیتا ہے۔ اس نے ہنستے ہوئے فخر و مسرت کے لہجے میں کہا۔

"بمبئی میں اپنی تنخواہ میں صرف اپنی گرہستی چلانا ہی مشکل ہو جاتا تھا۔ میں یہاں اپنے ساتھ کم از کم دس پندرہ خاندانوں کی پرورش کر رہا ہوں۔" میں نے بھی ہنستے ہوئے گردن ہلائی اور بولا۔

"تو سچ کہتا ہے۔ اب جلدی سے مجھے بھی ایسی جن سیوا کا موقع دے۔ میں بھی بمبئی کی بھاگتی دوڑتی زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا فکر مت کر۔" اس نے اپنے مخصوص اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔ "شام میں چل کر سائٹ دیکھتے ہیں۔ میں نے تیرے لیے ایک پلاٹ دیکھ رکھا ہے۔ جہاں تھوڑی سی محنت سے بہت خوبصورت فارم بن سکتا ہے۔" پریس سے نکل کر ہم لوگ عمارت کے پچھواڑے آ گئے۔ پچھواڑے خالی زمین میں دامودر نے ایک چھوٹا سا باغ بنا لیا تھا۔ جس میں ناریل کٹہل اور کاجو کے پیڑ تھے۔ وہ ہیں تھوڑی سی سبزیاں بھی اگا لیتا تھا۔ باغیچے میں ایک کنواں تھا۔ جس میں ایک چھوٹی سی موٹر بھی لگی تھی۔ غالباً اسی کے پانی سے ان پیڑوں کی سینچائی ہوتی تھی۔ باغ کے ایک کونے میں پھوس کا ایک چھپر سا بنا رکھا تھا۔ چھپر کے نیچے دو چار پائیاں تھیں۔ جن پر دھلی ہوئی چادریں بچھی تھیں۔ دامودر نے ایک چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تو تھوڑی دیر یہاں آرام کر۔ ہم پانچ بجے چائے پی کر سائٹ دیکھنے چلیں گے۔ میں پریس سے آتا ہوں۔"

کھانا ضرورت سے کچھ زیادہ ہو گیا تھا۔ پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ [illegible] کی اس جھونپڑی نے جیسے مجھے جنت کا پروانہ دے دیا۔ میں دوسرے ہی لمحے چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔ اور دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے باندھ کر چت لیٹ گیا اور بولا۔

"ٹھیک ہے تو پریس ہو آ!"

دامودر چلا گیا۔ باغ میں چاروں طرف درختوں نے اس طرح گھیر رکھا تھا کہ جگہ جگہ دھوپ کے ٹکڑے سے بکھرے ہوئے تھے۔ ہوا خوشگوار انداز میں چل رہی تھی۔ اور درختوں کے پتے آہستہ آہستہ [illegible]

بجتے ہوئے بے ایمان عجیب سی خوشبو کا احساس ہوا۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔ ہوا کے لطیف جھونکے بدن سہلاتے ہوئے گزرنے لگے۔ اور شاید دس منٹ گزرنے سے بھی کم عرصے میں میری آنکھ لگ گئی۔

اگر دامودر نے مجھے چائے کے لئے نہ اٹھایا ہوتا تو پتا نہیں میں کب تک سوتا رہتا۔

"ساب۔۔ ساڑھے چار بج گئے ہیں چائے پئیں گے نا۔"

میں نے اپنی من من بھر بوجھل پلکوں کو بڑی مشکل سے کھولا۔ اور بھرائی آواز میں بولا۔ "ہاں پئیں گے۔"

"تو پھر ساب کنوئیں کے پاس چل کر ہاتھ منہ دھو لیجئے۔ میں آپ کو بالٹی سے پانی کھینچ کر دیتا ہوں۔"

"اچھا چلو۔ میں چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور سلیپر پہن کر کنوئیں پر آ گیا۔ نوکر میرے پیچھے پیچھے تھا۔ کنوئیں کے کنارے ایک چوڑے پتھر پر صابن دانی اور ایک پیتل کا لوٹا رکھا تھا۔ رسی پر تولیہ پڑا تھا۔ کنوئیں کی منڈیر پر ایک لوہے کا آنکڑا سا گڑا تھا۔ جس میں ایک رسی بندھی تھی اور اسی رسی سے ایک بالٹی کنوئیں میں لٹک رہی تھی۔ نوکر پھرتی سے آگے بڑھا اور اس نے دو چار ہاتھ میں پانی سے بھری بالٹی اوپر کھینچ لی۔ میں نے منہ پر دو تین چھپاکے مارے۔ پانی اتنا ٹھنڈا تھا کہ اس کی تراوٹ مجھے اندر تک سلگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ نوکر مجھے اوپر لے گیا۔ دامودر چائے پر میرا انتظار کر رہا تھا۔

چائے پی کر میں نے کپڑے تبدیل کئے۔ اور دامودر کے ساتھ باہر نکل آیا۔ نیچے دو سائیکلیں کھڑی تھیں۔ ایک سائیکل دامودر نے سنبھالی اور دوسری کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔ "سائیکل چلانے لگا نا!"

"سائیکل؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔ "سائیکل کیوں پیدل چلتے ہیں ٹہلتے ہوئے۔"

"نہیں ساب ذرا فاصلے پر ہے۔ پیدل جائیں گے تو شام ہو جائے گی۔" میں کئی برس کے بعد سائیکل پر سوار ہوا تھا مگر مجھے سائیکل چلانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ یہ عجیب بات ہے، سائیکل چلانا اور تیرنا آدمی ایک بار سیکھ لے تو پھر زندگی بھر نہیں بھولتا۔ چاہے برسوں اس کی مشق چھوٹ جائے۔

شام کی ہلکی ہلکی ہوا میں سانپ کی طرح بل کھاتی سڑک پر سائیکل چلانے میں بڑا لطف آ رہا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف دور دور تک دھان کے کھیت بکھرے ہوئے تھے۔ فاصلے فاصلے سے سپاری اور ناریل کے درختوں کے جھنڈ یوں لگ رہے تھے جیسے ان کھیتوں کی حفاظت پر تعینات کئے گئے ہوں۔ ڈھلان پر بغیر پیڈل مارے سائیکل اولاتے پھسلنے لگتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے میں سائیکل پر نہیں گلائیڈر پر اڑا جا رہا ہوں۔ مجھے پچیس تیس برس پہلے کا زمانہ یاد آ گیا۔ جب میں اپنے دوستوں کے ساتھ سائیکل پر ہر اتوار کو نیچے والے بابا کے مزار پر جایا کرتا تھا جہاں ہم لوگ نمک مرچ کے ساتھ املی کے کتارے، کیریاں اور کروندے کھا کھا کر اپنا گلا خراب کر لیا کرتے تھے۔ پھر مجھے اسماعیل کی یاد آ گئی جو ہم سب کی مدد سے سائیکل پر چڑھتو جاتا تھا مگر اترتے وقت یا تو کسی اونچے پتھر کا سہارا لیتا تھا یا پھر دھپ سے گر پڑتا تھا۔ ہم سبھوں نے بہت کوشش کی کہ اسے سائیکل پر از خود چڑھنا اور اترنا آ جائے مگر آخر تک وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ ہم سب اسے گوگا اسماعیل کہہ کر پکارتے تھے اب یہ یاد نہیں کہ اسے گوگا کیوں کہا جاتا تھا۔ مگر یہ سچ ہے کہ وہ گوگا کہنے پر چڑتا بہت تھا۔ میں انہیں خیالات میں گم سائیکل پر چلا جا رہا تھا۔ آگے آگے دامودر چل رہا تھا اور مجھے آس پاس کے علاقے کی معلومات دیتا جا رہا تھا۔ یہ بالاجی مندر ہے۔ وہ جگدر بانک ہے۔ یہ زمین شیورام پاٹل کی ہے۔ یہ راستہ دھان سرگاؤں کو جاتا ہے۔ اس کے آگے کھاڑی شروع ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ہم لوگ ایک مسطح قطعۂ اراضی کے پاس پہنچ گئے۔ دامودر سائیکل سے اتر کر سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا تھا۔ دور پہاڑی کے پیچھے سورج غوطہ لگانے کے لئے پر تول رہا تھا۔ پیش منظر میں سفید بگلوں کی ڈار اڑتی جا رہی تھی۔ پھولی ہوئی شفق کے درمیان سورج کا چہرہ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی دوشیزہ نے اچانک اپنا سرخ گوٹے کا گھونگھٹ الٹ دیا ہو اور سفید بگلوں کی ڈار دوشیزہ کے گلے میں موتیوں کی مالا کے مانند چمک رہی تھی۔ مجھ جیسے شہری بابوؤں کو ایسا منظر سوائے فلموں کے کہاں دکھائی دیتا ہے۔ میں بت بنا پلک جھپکائے بغیر اس طلسماتی منظر کو دیکھ رہا تھا دامودر کی آواز کان میں آئی جیسے دور کی بات دھیان میں آئی۔ کیا کھو گئے ہو۔

بقیہ صفحہ ۲۲ - ایک رات

SHAKESPEARIN CRITICS میں شامل کر لے میں تجھ سے کیا پوچھوں؟ میں شیکسپیئر سے پوچھتی ہوں کہ اگر وہ اس وقت مجھے اپنی کائنات کے ساتھ دیکھ لے تو کیا اُسے دنیا کے انتخاب پر افسوس نہ ہوگا۔۔۔!؟"

وہ ایک ٹک آئینے میں اپنے عریاں جسم کو تکے جا رہی تھی۔ اس کا انہماک ایک نقطہ بنا جا رہا تھا، آئینہ مسلسل پیچ بدلے جا رہا تھا کہ دنیا کے تمام دوسرے آئینے بجھتے میں جب اس کا انہماک ایک نقطے سے بھی چھوٹا ہوا تو وہ مکمل طور پر آئینے میں منتقل ہو گئی۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ چونکی پھر گھبرا گئی۔ حواس باختہ سی اٹھی بیڈ پر پڑی چادر ایک جھٹکے سے کھینچی۔ پھر ایک سرعت سے لپیٹ کر چادر قدم آئینے پر ڈھکی اور کسی حد میں آگے بڑھ کر برہنہ حالت میں دروازہ کھول دیا۔۔۔



قسط نمبر ۳

سریندر پرکاش

۴/۳۴، یوگی راج آشرم، ہنس بگرا مارگ، کالینہ، ممبئی ۹۸

فسان

گاؤں میں داخل ہوئے تو اقبال کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، وہ شوکت کو کیا بولے گا۔ وہ کیوں آگیا ہے؟ اور کیا شوکت اسے دیکھ کر خوش ہوگا؟

ٹانگے والے نے ایک بڑی سی حویلی کے باہر جاکر آواز لگائی۔

"خان صاحب آپ کے مہمان آئے ہیں۔ اقبال حسین۔۔۔"

اقبال بالکل گھبرا گیا۔ وہ ٹانگے کو دوڑا اور نہ جانے کیوں اس کا جی چاہا کہ وہ وہاں سے بے تحاشہ بھاگ جائے۔ گاؤں کی گلی میں سے گذرتے ہوئے اس نے ہر آنے جانے والے کی نظروں میں اجنبیت اور تشکیک محسوس کی تھی۔ سب طرف دھندلکا پھیل چکا تھا۔ کہیں کہیں گھروں کے اندر چراغ روشن ہوگئے تھے لیکن گاؤں کی گلیاں اندھیری تھیں۔ اچانک حویلی کی چہار دیواری میں بنا دروازہ کھلا اور ایک بوڑھا سا ملازم دکھائی دیا۔

"کہاں سے آئے ہیں صاحب جی؟" اس نے پوچھا۔

"راولپنڈی سے" اقبال نے دبی آواز میں جواب دیا۔ "میں شوکت کا ہم جماعت ہوں۔"

"ماشاء اللہ آجائیے، اندر آجائیے۔ خان صاحب اور چھوٹے خان زمینوں پر گئے ہیں۔ بس آتے ہی ہوں گے۔" ملازم نے بڑے ادب سے جواب دیا۔

پھر ٹانگے سے اقبال کا سامان اتار کر صحن میں رکھ دیا گیا، ایک کھاٹ بچھا دی گئی اور ٹانگے والے کو ملازم نے یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ صبح آکر خان صاحب سے کرایہ لے جائے۔ اندر سے ایک پیالے میں گرم گرم چائے آگئی اور اقبال نے چسکیاں لے کر لذیذ دال چینی والی چائے پی۔

وہ بہت تھک گیا تھا کھاٹ پر سستانے کے لئے دراز ہوا اور اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس نے محسوس کیا تھا، گلی میں اندھیرا اور سناٹا ہے گھر کے اندر پراسرار خاموشی ہے۔ اور کچھ روشنیاں سے حرکت کر رہی ہیں۔ اور پھر وہ اندھیرا اور سناٹا اقبال کے وجود کا حصہ بن کے دماغ پر چھا گئی۔

ایک دم سے کہیں سے آواز آئی "کون ہو؟ اقبال ہو؟ میرا ہم جماعت؟

راولپنڈی سے آیا ہے۔!" اسے لگا یہ آواز جانی پہچانی سی ہے۔ اس آواز میں حیرانی تھی۔ تھوڑی گھبراہٹ تھی اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔ اقبال نے آہستہ آنکھ کھولی۔ صحن میں دروازے کے قریب ہی تین سائے آپس میں محو گفتگو تھے۔ اندھیرے میں وہ منظر بڑا پراسرار سا لگ رہا تھا۔

"کیوں شوکت! تیرے ساتھ کوئی اقبال حسین بھی پڑھتا تھا لاہور میں؟" ایک کڑک بھری آواز نے تجسس کا اظہار کر دیا۔

"اوہ! اچھا اقبال حسین۔ وہی آیا ہوگا اور جس کے ہاں میں چلا گیا تھا۔"

"لیکن وہ تو تم بتا رہے تھے ہندو تھا۔"

"ہاں وہ ہندو ہے۔ بہت ہی دوست ہے۔ اقبال حسین کہہ رہا تھا میں تیرے گاؤں آؤں گا۔" شوکت کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔

اقبال کے اندر کا ڈر اور گہرا ہو گیا۔ اتنا گہرا کہ وہ اس گہرائی میں ڈوبنے لگا۔ سائے اس کے قریب آئے، شوکت کی آواز ابھری۔

"مسلم ہے اقبال بھائی۔"

اقبال چونک کر اٹھا اور اس کے منہ سے نکلا "السلام علیکم"

"وعلیکم السلام" شوکت کے والد اور شوکت نے ایک ساتھ کہا۔

"خوش آمدید۔ سفر میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟" شوکت کے والد خان صاحب نے پوچھا۔

"جی نہیں شکریہ۔۔"

"اچھا شوکت تم بھائی کے پاس بیٹھو۔ باتیں کرو۔" خان صاحب نے کہا اور گھر کے اندر کی طرف بڑھ گیا۔ تب ہی اقبال نے دیکھا کہ خان صاحب کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ اور ایک بندوق شوکت کے کندھے سے بھی لٹک رہی تھی۔ والد کے جانے کے بعد شوکت ملا اور اقبال سے لپٹ گیا۔

"آؤ میرے یار۔۔"

معافی چاہتا ہوں [illegible] تمہارے جانے کے بعد مجھ سے کچھ ایسا اچاٹ ہوا کہ یہاں آنے پر مجبور ہو گیا [illegible] اب محسوس کر رہا ہوں غلطی ہو گئی۔"

"نہیں اچھا کیا۔ [illegible] تمہیں دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ لیکن یار اقبال تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ ابھی بہت کچھ بنانا یا دھلا دھلایا دوسرے پیر ملا ہے۔ اور ہم ابھی ان جوتوں کو ٹوٹنے کے قابل نہیں ہوئے۔" شوکت کا گلا بھر گیا۔

"نہ جانے محلے والے نے مجھے اقبال حسین سمجھا جبکہ میں نے صرف اقبال کہا تھا۔"

"وہ اپنے منہ موڑنے پر مجبور تھا لیکن ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔"

وہ دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

باہر والے کمرے میں دسترخوان بچھا دیا گیا تھا۔ بہت سے لوگ کھانا کھانے کے لئے کھڑے ہو گئے تھے۔ شاید کچھ ملازم بھی تھے۔ چھوٹی چھوٹی چنگیروں میں بڑی بڑی تندوری روٹیاں تھیں۔ مسور کی دال تھی۔ پلاؤ تھا۔ اور ایک سالن۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے سب کی نظریں بچا کر شوکت نے اقبال کے کان میں کہا۔ "سالن مت کھانا۔" اقبال نے پلٹ کر حیرانی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر وہ اپنے آپ ہی سمجھ گیا کہ سالن بڑے کے گوشت کا ہوگا۔

"بسم اللہ" خان دلاور نے نعرہ لگایا۔ اور پھر سب نے نوالے توڑے۔ کمرے میں دھندلے دھندلے دو لیمپ روشن تھے۔ جن کی روشنی میں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کئی صدیوں سے یہاں ایسی ہی رات ہے۔ اور یہ دو کمزور لیمپ ایک ہاری ہوئی جنگ جیتنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ اور کچھ لوگ اس ہاری ہوئی جنگ کے دھندلکے میں اپنی زندگی کی آخری عبادت میں مصروف ہیں۔

پوجا سماپت کر کے کوٹلیہ نے وشنو بھگوان کی وشال پرتما کو پرنام اور پلٹ کر مندر کے آنگن میں کھڑے یونانی، ایرانی اور ہندو راجکماروں کی اور دھیان پوروک دیکھا۔ جو ابھی تک سر جھکائے اپنی سمردھی کے لئے پرارتھنا کر رہے تھے۔ کوٹلیہ کی لمبی چوٹی اس کے کندھوں پر جھول رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں ایسی دیا کتا تھی۔ مندر کے پرانگن سے باہر نکل کر وہ تکشلا کی اونچی چہار دیواری کے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگا۔ اس کے سارے شریر میں رکت سنچار تیزی سے گتی شیل تھا۔ اور اسکا پورا استتو پارہ کی بھانتی تھر تھرا رہا تھا۔

دو یار بھی اپنے اپنے گھروں کی اور جا رہے تھے۔ وہ لانگ والی دھوتیاں باندھے ہوئے تھے اور اوپر کے دھڑ سے ننگے تھے۔ پہلوؤں کے گلے میں جنیو لہرا رہے تھے اور سر پر گھٹے کے گرد تنی بڑی چوٹیاں تھیں۔ وہ سب کوٹلیہ کے شسیہ تھے جو اپنے اپنے دیشوں سے ہندو چنتن کا گیان پراپت کرنے آئے تھے۔ اور کوٹلیہ گندھارا و دیاپیٹھ کا مکھیہ آچاریہ تھا۔ پگ گھٹ میں دیپ ٹمٹمانے لگے تھے اور کوٹلیہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا بڑی دیوار کے اوپر پہنچ گیا۔ وہ دیر تک کھڑاویں اتار کر دیوار پر چلتا رہا تب اچانک رک گیا اور اس نے اپنی درشٹی ہندو کش پربت کی سرمئی چوٹیوں پر جما دیں، اندھکار میں پھیلا ہوا پہاڑی سلسلہ ایسے لگا جیسے پراکرتی نے کوئی بہت بڑا گرنتھ کھول رکھا ہو۔ اور اس گرنتھ کے ایک پنے پر اس نے دارائی پر لکھے پڑھی۔ کوٹلیہ کا دل دہل اٹھا۔ پھر اس گرنتھ کے پھیلے ہوئے پنوں میں سے بے شمار گھوڑے ہنہناتے ہوئے اسے اپنی اور بڑھتے ہوئے دکھائی دیے اور واتاورن میں ایک دھیمی سی گونج نکلی۔ الگزینڈر .... الگزینڈر .... الگز ......

وہ تیزی سے اترا اور اپنے اپنے شیشن گھٹوں میں نیند میں ڈوبے راجکماروں کے چہروں کو ایک ایک کر کے نہارنے لگا۔ یونانی۔ ایرانی کشان اور ہن۔ اور پھر ہندو راجکمار۔ لیکن اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ اسے وہ نہیں ملا۔ اسے وہ چہرہ کسی چہرے میں دکھائی نہیں دیا۔ اسے وہ پر کافی کہیں نہیں پرتیت ہوا۔ وہ آنگن میں کھڑا ہوا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور گرجا۔

"شکتی شالاتی! وہ کہاں ہے؟"

لیکن پتھریلی خلا نے کوئی اتر نہیں دیا۔ اس نے اپنی بانہوں کو سمیٹ کر سینے کے گرد لپیٹ لیا اور ہاتھوں کو اتنی زور سے کھینچا کہ اس کی انگلیوں کی پوروں سے لہو ٹپکنے لگا۔ تبھی آکاش پر ایک بھیانک چیخ پھیل گئی۔ کوٹلیہ نے آکاش کی اور دیکھا۔ ایک گھائل چیل اپنے پر پھڑپھڑاتی، کراہتی ہوئی نیچے دھیمی گتی سے آکاش سے شہر میں ٹکتی سی جان پڑی۔ وہ سوچنے لگا۔ کیا اسے الگزینڈر کے سینک نے اپنے بان سے گھائل کیا ہے؟

کوٹلیہ نے اپنی کھڑاویں پہن لیں۔ اور پھر دور تک پھیلے ہوئے بن کی اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا بن میں پھیلے اندھیرے میں گم ہو گیا۔

(جاری)

سیف الرحمٰن عباد

معرفت: عبید الرحمٰن۔ محلہ سید واڑہ غازی پور (یوپی)

ایک رات

نہ جانے وائیلا نے اُس کی انا کے قالب پر دانت کاٹا تھا یا پروفیسر کے ذائقہ لیتے ہوئے بوڑھے ہونٹ اُس کی شہ رگ سے مس ہو کر اُس کے جسم میں اپنی ناگوار حدت اتار گئے تھے، کہ وہ چونک کر ایک ہیجانی کیفیت میں اُٹھ بیٹھی تھی۔ نیند کچی ہو تو ذہن پکا ہوا پھوڑا بن جاتا ہے۔ دُکھتا ہے۔ اذیت دیتا ہے۔ اس کا ذہن بھی اُسے اذیت دے رہا تھا کہ اُس کی انا بھی لہولہان ہوتی جا رہی تھی۔

کمرے میں مکمل تاریکی تھی۔ اس نے اپنی سانسیں درست کیں، نائٹی کا بند باندھا اور بیڈ کے قریب کا ٹیبل لیمپ آن کر دیا۔ ابھی صرف گیارہ بجے تھے۔ روشنی ہوئی تو سب سائے جیسے گوشوں میں چھپ گئے۔ اُس نے ایک لمبا سانس کھینچا تو خلا میں کہیں پروفیسر کے بوڑھے ہونٹوں کی شبیہ بن گئی۔

وائیلا بہت خوبصورت تھی۔ شیکسپیئر نے اپنے ذوقِ جمال کی پوری توانائی کی خوشبو وائیلا کے کردار میں بھر دی تھی۔ وائیلا جانتی تھی کہ سونے سے بھی زیادہ حُسن و جوانی کے لٹیرے اس دُنیا میں موجود ہیں۔ اسی لئے جہاز کے حادثے میں بچنے کے بعد وائیلا ایک مرد کے بھیس میں ڈیوک کے یہاں کام کرنے لگی۔ ڈیوک اُس کے حُسن سے بے حد متاثر تھا گو کہ وہ اُسے مرد ہی سمجھتا تھا۔ وائیلا کا حُسن اتنا فطری اتنا بھرپور تھا کہ مرد کے بھیس میں بھی اُس کی شعاعیں نہ دب سکیں۔

اُسے پروفیسر کا رک جانا یاد آیا۔ جیسے وہ آگے بڑھنے سے پہلے وائیلا کو ایک بار پھر بھرپور طریقے سے سوچ لینا چاہ رہا ہو۔ وہ ہمیشہ کی طرح پروفیسر کے بالکل سامنے اور بالکل قریب والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اس نے پروفیسر کے اندر کا گرداب دیکھا تھا۔ اُس کے چہرے کی جلا دیکھی تھی۔ پروفیسر کے باطن میں اُس کی خلوت بسی ہوئی تھی۔ اور یہ لمحہ اُس کے لیے اذیت ناک تھا۔ وہ اپنی نفسیات کے کرب کو اپنی مٹھیوں میں بھینچے [illegible] پروفیسر اس دو فٹ کے فاصلے سے کہیں دور تھا۔

اُس کے جسم میں ایک تناؤ سا پیدا ہوا اور پھر جیسے اُس کی پت کی تھیلی پھٹ گئی۔ ایک انتہائی کڑوا ذائقہ اُس کے گلے کی جھلیوں میں سرایت کر گیا۔ اس نے ہلکے سے سر جھٹکا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کھڑکی کے قریب آ گئی۔ پھر کھڑکی کے پٹ وا کئے۔ ہوا کے اُلٹتے ہوئے جھونکے بڑی تندی سے اندر گھس پڑے۔ نرم ہواؤں کے لمس سے اس کا جسم ڈھیل گیا۔ جسم پھول کی طرح ہلکا ہو گیا۔ گیسوؤں کی ایک لٹ اُس کی گردن پر رینگ رہی تھی۔ وہ ایک دوسری بیلا کے شعور میں داخل ہو گئی۔ اب گردن کے اس مقام پر لٹ کی جگہ اُس کی انگلی کا لمس رینگ رہا تھا۔ انگلی کا کیڑا اپنی جگہ بناتا ہوا ٹیڑھا میڑھا رینگتا رہا۔ پھر گردن کے نشیب میں اُترا، گردن کے بیچوں بیچ سے پھر نیچے کی ڈھلوان پر کھسکنے لگا۔ اُسے ایک لذت آمیز جھرجھری آ گئی۔ وہاں اُس نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی کے کیڑے کو بائیں ہاتھ میں دبوچ لیا۔ یہ ایک مرد تھی۔ دالکنش کی نگاہوں کی مرمریں دالکنش کی نگاہیں یہیں پہنچ کر تڑپتی رہی تھیں۔ ایک مردانگی کے احساس سے جھجکتی تھیں گردن کے اُس مقام کے قریب وہ انگلی سیدھی کر کے اُس کے پاس شدت ناخن سے آہستہ آہستہ کرتی رہی۔ پھر یکایک اُس نے مٹھی بھینچ لی۔ اُس کی مٹھی میں دالکنش کی آنکھیں آ گئی تھیں۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کمرے کی تنہائی نے اُس کی اس خیالی کی پذیرائی کی ہو۔ اس کے ہونٹوں پر ایک گہرا تبسم کھل اُٹھا۔ اُس بے حد لذیذ تبسم کو ہونٹوں سے دبائے وہ کچھ سوچتی رہی، پھر اپنی بند مٹھی کو گردن کے اُسی مقام پر لا کر کھول دیا، ساتھ ہی نائٹی کے اوپری دو بٹن بھی کھول دئے۔ اور دالکنش کی نگاہوں کو راہ دے دی۔

اب دالکنش کی نگاہوں کا اُس کے جسم پر نیچے اُترنا اُسے اچھا لگ رہا تھا۔ کھڑکی سے ہٹ کر وہ ایزی چیئر پر دراز ہو گئی۔ دالکنش کی نگاہیں اُس کے حُسن کے خزینے [illegible] نکل گئی ہوں گی۔ یہ خیال آیا تو اُسے ایک لذت آمیز جھرجھری آ گئی۔ ایک نیم بے خودی کے عالم میں اُس نے اپنے پیروں کو پھیلا دیا [illegible] پنڈلیاں چمک اُٹھیں۔ [illegible]

گو کہ شیکسپیئر کے THE TWELFTH NIGHT کی ہیروئن تو اولیویا ہے لیکن دراصل تو وائیلا ہی اس ڈرامے کی ہیروئن تھی۔ ڈیوک اولیویا سے محبت کرتا ہے مگر اولیویا ڈیوک سے محبت نہیں کرتی۔ وائیلا جب ایک مرد کے بھیس میں اولیویا کو ڈیوک کا پیغام سناتی ہے تو اولیویا اُس کے حُسن سے بے حد متاثر ہوتی ہے اور اُس کو مرد سمجھ کر دل دے بیٹھتی ہے۔ اولیویا جنس پہچاننے میں یقیناً غلطی کرتی ہے لیکن حُسن کو پہچاننے میں سو فیصد کامیاب رہتی ہے۔ کتنی حسین ہوگی وائیلا ۔۔۔؟"

ایک لمحہ کو پروفیسر کی آنکھیں خلا میں جامد ہو گئی تھیں جیسے وہاں وہ وائیلا کی کوئی تخیلی شبیہ بنا لینے میں کامیاب ہو جائے گا۔

اُس وقت اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی دونوں پنڈلیاں سُن ہو گئی ہوں ۔۔ پروفیسر کی آنکھیں اُس کی شیشوں میں نہ آسکی تھیں ورنہ انھیں بے رونق کر دیتیں۔

"وائیلا ۔۔ !!" اچانک اس کے منہ سے ایک گھٹی گھٹی چیخ نکلی اور سارا جسم مرتعش ہو اٹھا۔ اندر کی آگ سے گھبرا کر پسینہ باہر نکل آیا، اُس نے اپنی دونوں پنڈلیوں کو آپس میں رگڑ ڈالا اور ایک غیر شائستہ تکلیف سے کراہ اٹھی۔

کمرے کی خاموشی سوالیہ نشانات اُگل رہی تھی۔ سائیں ۔ سائیں ۔ سائیں۔ بہوت کا خمیر گیلا ہو کر گندا کیچڑ بننے لگا تو وہ تڑپ کر ایک تیسری بیداری کی سرحدوں میں داخل ہو گئی۔ اُس کی گوری گوری نرم انگلیاں اُس کے بھرے بھرے شانوں کی گولائیوں کو سہلانے لگیں، جسم کے خفتہ خوابیدہ کائنات کو جگانے لگیں۔ اُس کے خیالات آگ کی مانند کہیں نیچے لپکے۔ کالج کیمپس میں جب منظیر اُس کی کمر کو نشانہ بناتا ہے تو اُس کی جستجو کا سرکیل ہی ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے چہرے پر کیسا غبار سا اُٹھنے لگتا ہے اور آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔

اُس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے جنھیں ایک احساس نے اچک کر آہستہ سے چوم لیا۔ اس کے دونوں ہاتھ کھسکتے کھسکتے کمر تک آئے اور وہاں کی زمین کی ملائمت میں حقیقت اُبھرتے رہے۔ منظیر کی آنکھیں تکلیف سے چلا اٹھیں تو اُس نے شانوں کے بیچ اتنی آگ اس طرح کھینچ کر وہ کمر کے پاس گر کر پھیل گئی۔ حُسن جوانی کے بیچے آتش فشاں اُٹھانے لیے کھڑے تھے جیسے ابھی لاوا اُگل دیں۔ اُس کے ہاتھ اُن چٹانوں کو چھوتے ہوئے نیچے کھسکے، ملحق کہساروں میں بھٹکتے رہے اور پھر کمر کی اُچھال پھاند کر رک گئے۔ منظیر کی جستجو کی آنکھیں نے اُس کی ہتھیلیوں میں ایک لذت آلود دی اور ایک خمار کے جوش سے بھر گئی ۔۔

"وائیلا ۔۔۔ !!"

وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر چلانے کے لیے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی نفسیات کا پہاڑ ارس رہا تھا۔ اور ایک بے پرواہ اضطراب اس کی رگ رگ میں رچ بس رہا تھا۔ چہرہ وہاں ... پیدا کرنے لگا وہ ایک بے آرامی کی کیفیت

میں کھڑی ہو گئی۔ نائٹی کا اوپر کا حصہ بند کے پاس سے اُس کے قدموں میں گر گیا۔ نائٹی گھسیٹتی ہوئی وہ گوشے تک آئی، صراحی سے ایک گلاس پانی نکال کر غٹ غٹ پی گئی۔ اندر کی آگ پر پانی پڑا تو ذہن کچھ پرسکون ہوا لیکن پرسکون ذہن نے اور تیزی سے سوچنا شروع کر دیا۔ دیوار پر کہیں وائیلا کی شبیہ اُبھری، اُس نے غضبناک نگاہوں سے شبیہ کو گھورا ۔۔

"ابھی فیصلہ باقی ہے وائیلا ۔۔ !!"

وہ آنکھیں بند کر کے پھر خود میں کہیں ڈوب گئی، مگر اندر کے ہیبتناک خیال ڈر کر بہت جلد اُبھر آئی، پھر فوراً سے تیز قدموں سے چل کر قدِ آدم آئینے کے سامنے بیٹھ گئی۔ اوپر کا عریاں دھڑ آئینے میں ایک چھاکے کی طرح نمودار ہوا، یہ آواز اُس نے بجلی سی سنی تھی۔ اس کی نگاہیں بڑے غور سے آئینے کی نگاہیں دیکھ رہی تھیں۔ آئینے نے سچ بولا تو اُسے اپنے گورے کنوارے، بے حد خوبصورت جسم پر انتہائی پیار آ گیا، وہ ذرا آگے جھک آئی، پھر کچھ اور آگے۔ کچھ اور، اور پھر آئینے میں ہی اپنی شبیہ پر اپنے ہونٹوں کا خراج رکھ دیا۔

اُس کی نگاہیں آئینے میں اپنے بھرپور جسم کے بھرپور عکس کا تجزیہ کر رہی تھیں۔ پھول سے نرم عارضوں کو چھوتی ہوئی اُس کی انگلیاں گرم ہونٹوں تک آ پہنچیں، اس نے غور سے اُن متحرک ہونٹوں کا ردِعمل دیکھا تو اپنے ہی بوسوں کی لذت اس کے شعور کے تالاب کو گدگدا گئی، انگلیاں نیچے کھسکیں، ٹھوڑی کو چھوتی ہوئی گردن کے ڈھلوان پر اُتر آئیں، پھر چار انگل کا وہ فاصلہ بھی طے کر گئیں جس کے بعد کی حدوں کی برتری سے ایک عورت ہزاروں عورتوں سے ممتاز ہوتی ہے۔ اس کی سانسیں تیز ہو اٹھیں، اُن حدوں میں مد و جزر اُٹھ رہے تھے، آئینہ مسلسل سچ بولے جا رہا تھا۔ ایک غرور، یقین کی ہنسی بن کر اُس کے نسیجی چہرے پر منعکس ہو گیا۔ اُس کے ہونٹ زاویئے بدلنے لگے۔

"وائیلا! دیکھ ۔۔ تو بھی دیکھ لے۔ ان دریاؤں میں کتنے گرداب ہیں۔ کسی بھی مرد کا شعور ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے گا۔ مگر تو نہیں مانے گی۔ تُو تو اپنی ہی کہے گی۔ رُک جا وائیلا! میں اپنے گریبان کو ہٹاتی ہوں۔ بس ذرا رُک جا ۔۔"

ایک ہیجانی کیفیت میں اُس نے نائٹی کا بند کھولا اور نائٹی کو جسم سے الگ کر کے دور پھینک دیا۔ حُسن کے سارے اسرار آشکارا ہو گئے۔ آئینے کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں ۔۔

"آؤ راکیش، آؤ اور اپنی نگاہوں کی منزلیں دیکھ لو۔ آؤ منظیر، آؤ مسلیم، آؤ شیکھر، آؤ راجن، آؤ جاوید، آؤ آکاش، آج میں تمہاری مجبوریوں اور محرومیوں پر ترس کھاتی ہوں۔ آؤ آج اپنے تصوراتی کائنات کی عریانیاں دیکھ لو، اور ایک دستاویز لکھ دو کہ سب کچھ ایک حقیقت کی طرح میرے پاس تصورات کی طرح حسین اور دلکش ہے۔ اور اسے پوشیدہ ... خوبصورت جسم کو

افتخار امام صدیقی

*

غزل — ۹۰

پاکستان میں اردو غزل کے حوالے سے

پاکستانی اردو شاعری کا ایک انتخاب "غزل ۹۰" قارئین شاعر کے پیش ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کا کئی وجوہ ہیں۔ کتاب میں شامل کئی شعراء نے شاعر کے لیے اپنا کلام بھجوایا تھا۔ یا بعض شعراء نے جو غزلیں اس سال کے تعین وہ پاکستانی رسائل میں شائع ہوئیں اور مذکورہ کتاب میں شامل ہو گئیں۔ کتاب تبصرے کے لیے وصول ہوئی تھی۔

حالیہ برسوں میں بعض مفروضے سرحدوں کے ادھر ادھر گردش کرتے رہے ہیں کہ پاکستان میں ادب تخلیق ہوتا ہے۔ اس کی تنقید ہندوستان میں لکھی جاتی ہے یا اردو غزل پاکستان میں زیادہ عصری، تازہ کار اور تخلیقی ہے۔ ہندوستان میں صرف تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ جو زیادہ معیاری ہے۔ ہندوستان میں اردو مر رہی ہے۔ پاکستان میں شاعر افسانہ اپنے اعلیٰ ترین معیار کے ساتھ تخلیق ہو رہا ہے ہندوستانی شعرا پاکستانی شاعری کا چربہ اتارتے ہیں، سرقہ کرتے ہیں۔ ان کے یہاں تکرار ہوتا ہے جبکہ اور یہ بھی کہ مختلف سیاسی مسائل اور زبان کے مسائل کے ساتھ ہندوستانی غزل زیادہ توانا، روشن، تہہ دار اور متنوع ہے۔

میرے نزدیک اس قسم کے تمام مفروضے فضول، جذباتی اور غیر منطقی ہیں۔ بچوں کی بحثوں میں شخصی اور اجتماعی جذباتیت، انا اور اپنے آپ کو برتر ظاہر کرنے کی ضد شامل رہتی ہے۔ سو دونوں طرف یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ہند و پاک کی اردو غزل کا مطالعہ ان سطحوں پر لایعنی ہی ٹھہرے گا۔ غزل، ہندوستان میں ہو، پاکستان میں یا کہیں اور، علاقائی زبانوں اور بولیوں ٹھولیوں کے اختلاط سے مختلف تو ہو گی ہی۔ پھر جغرافیائی تہذیب، علاقائی لہجے اور مجموعی ادبی رویوں اور رجحانات کے ساتھ بھی مختلف ہو گی۔ پاکستان میں سندھ اور پنجاب کی غزل میں مواد، اظہار اور اسلوب کا فرق ہے دیگر صوبوں میں بھی تقریباً یہی کچھ ہے۔

پاکستانی اردو غزل میں ظاہری سجاوٹ، تراش خراش اور فارسی زدگی نمایاں ہے۔ غزل کی لوؤں سے کریدیے تو اندر اتنا کچھ نہیں جو اوپری سطح پر ہے۔ یہ غزل پڑھنے اور سننے میں اچھی لگتی ہے۔ مفرد اور مرکب تراکیب نے پاکستانی غزل میں تنوع پیدا کیا۔ لسانی دائرے قدرے وسیع ہونے کو۔ محاوروں کا استعمال صوبائی رنگ نے غزل کو تازہ کار بھی کیا۔

پاکستانی نقاد اپنے یہاں کی شاعری میں نئی تبدیلیوں اور تجربوں کی ابتدا ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۰ء کی بنیادوں پر کرتے ہیں یعنی ہند و پاک جنگیں اور سقوط ڈھاکہ سے ملک میں جمہوریت اور مارشل لا کے آجانے پر نت نئے موضوعات و تجربات کو اردو غزل نے اپنے اندر سمویا۔ غزل کا لہجہ، اس کا اسلوب اور لفظیات میں تبدیلیاں آئیں۔

غزل ۹۰ کے مرتب قائم نقوی نے اپنے مذکورہ انتخاب کے بارے میں لکھا ہے کہ:

مجھے غزل ۱۹۹۰ء کے متعلق کچھ کہنا ہے کہ اس سال غزل نے کن رنگوں کو اپنے اندر سمیٹا۔ ایک سال کی غزل کے بارے میں کچھ حتمی رائے نہیں دی جا سکتی کیونکہ ہمارے یہاں ادبی جرائد اتنی سست رفتاری سے شائع ہوتے ہیں کہ ۱۹۹۰ء کی بہت سی غزلیں ابھی منظر عام پر آئی ہیں اگرچہ غزل ۱۹۹۰ء میں کچھ تجربات ضرور سامنے آئے کہ گزشتہ دو سالوں [۱۹۸۸ء اور ۱۹۸۹ء] کی غزل کے مقابلے میں اس سال کی غزل میں بہت اور کچھ انداز میں اپنی جھلک دکھانے سے قاصر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اپنے اندر نئے موضوعات کو سمویا ہے اور اس کا فنکارانہ اظہار بھی کیا ہے۔

پاکستان کے ادبی رسائل و جرائد اور شعری مجموعوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ غزل کے مقابلے میں نظم کا حصہ زیادہ رہا ہے۔ نظم کی مختلف اصناف میں شعراء نے طبع آزمائی کی مگر غزل کا تخلیقی سفر بہر حال جاری رہا ہے۔

یہاں ہندوستان اور پاکستان کی اردو غزل کا موازنہ مقصود نہیں کیونکہ ان موازنوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان پاروں کا معیار اور خلوص شعری تو نہیں کہ کس معیار کے ساتھ ہے کہ دیکھا جائے۔ تخلیق کار تو نامعلوم سمتوں کا سفر ہے اور فن پارہ ان سمتوں کے امکانات کی دریافت کرتا ہے۔ ہند و پاک کی اردو غزل کو دوسرے رخ سے دیکھیں تو پاکستان کا منظر نامہ قدرے مختلف ہے۔ یہاں اخبارات کے ادبی ایڈیشن میں کسی غزل کی اشاعت شام، رات یا دوسرے دن تک قارئین تک پہنچ جاتی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ادبی پروگرام پاکستان کے پورے خطے پر پھیل جاتے ہیں۔ مشاعرے اور ادبی نشستیں، شعر و ادب کو تحریک دیتے اور اشاعت کا ذریعہ بنتی ہیں۔ پاکستان کی غزل کا ادب اور شعرا کو عوامی مقبولیت حاصل ہے۔ خوبصورت شعری مجموعوں کی اشاعت اور ہندوستان [illegible]

ایک موضوع ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی اردو غزل [ ] کے مشترکہ انتخاب میں اپنے تمام تر مسائل کے باوجود اردو پر بوجھ نہیں ہیں۔ زبان کے نقطۂ نظر سے اگرچہ وہ علاقائی
جغرافیائی نہیں ہیں لیکن پاکستان کے اچھے غزل یا اچھے شعر کا تعارف تو ہے مگر ہندوستانی شاعروں میں ان کی نمائندگی کو بھلا دیا گیا ہے۔ ہندوستانی ادبی پیمانے پر
سے کا جواز اور اہم شاعر کی غیر حاضری ہے۔ یہاں کے غزل گو شعرا جانے پہچانے ہیں اور ان کے یہاں کلام کا انتخاب، غالب، داغ، جگر، حسرت سے آگے شخصی
جائزہ یعنی پاکستانی غزل گو شعرا کے انتخاب پر انحصار۔ پاکستانی شعرا کے معیار کی وجوہ تقریباً یہی ہیں۔ ہندوستان میں اردو زبان، شعرا اور شاعری
اس تناظر میں دیکھنا چاہیے۔
پاکستانی اردو غزل کا ایک منتخبہ انتخاب تو نہیں ہے اور ویسے بھی کسی شعری انتخاب کے لیے مرتب کی غیر جانبداری مشکوک رہے گی۔ خواہ انتخاب کتنا ہی ایماندار
سا کیوں نہ کیا گیا ہو۔ پسند اور نقطۂ نگاہ کی گنجائش رہتی ہے جیسا کہ مرتب نے تحریر کیا ہے:
اس سے قبل تین سالوں کے غزل ۸۸، غزل ۸۹، غزل ۱۹۹۰ انتخاب غزل چھپ چکے ہیں۔ اگرچہ ان مجموعوں کی بہت پذیرائی ہوئی اور ان کو پسند کیا گیا
مگر پھر بھی کچھ احباب نے اعتراضات کیے کہ ان غزلوں میں بڑے ناموں اور بڑے شہروں کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ کچھ ادبی جریدوں سے زیادہ غزلیں
لی گئی ہیں اور کچھ سے کم۔ حالاں کہ میں نے انتخاب کرتے وقت بڑے ناموں، اور بڑے شہروں اور مخصوص ادبی جرائد کو ترجیح دی بلکہ میں نے صرف
اور صرف غزل کو منتخب کیا ہے۔ میری پسند اور نقطۂ نظر آپ کو اختلاف کرنے کا حق ہے۔ ص۳
اب یہاں کئی سوال ابھرتے ہیں۔ کسی سال کی شعری انتخاب کا معیار کیا ہونا چاہیے؟ جن بڑے شعرا کو شامل نہیں کیا گیا تو ان کی وجہ کیا ہے؟ ان پر بحث ہونی چاہیے۔
کسی ایک سال کی شاعری کا انتخاب یقیناً آسان نہیں۔ اچھی اور سچی غزل جن ناموں سے عبارت ہے ان کے حوالے سے شعرا اور مجموعی تخلیقی سفر کے متعلق تجزیہ
ضروری ہے تاکہ اندازہ ہو کہ جو نام شامل نہیں۔ چھوٹے گئے ہیں انہوں نے اس ایک سال میں تخلیقی کام کیا بھی کہ نہیں۔ یا جو شاعری رسائل میں آئی وہ اس قابل نہیں تھی کہ اسے
انتخاب میں شامل کیا جا سکے۔ کسی ایک سال کے مجموعی شعری سفر کو جاننے کے لیے انتخاب کے تمام پہلوؤں پر غور کرنا ضروری ہوتا ہے کہ یہ انتخاب ادب کا رفتار نما ہوتا ہے۔
بعض شعرا نظم و غزل میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ بعض دونوں میں سے کسی ایک میں اور بعض نظم و غزل میں کہیں کہیں چمک اٹھتے ہیں۔ اب یہ مرتب کا کام ہے کہ وہ
ناموں پر تصور رکھتا ہے یا فن پارہ دیکھتا ہے یا پہلے سے اس کے ذہن میں کسی شاعر کے متعلق کوئی رائے قائم ہوتی ہے جو انفرادی / اجتماعی لاشعور کی دین ہے۔
مذکورہ انتخاب میں کئی نئے اور تازہ کار شعرا کو شامل کیا گیا ہے مگر یقیناً ان میں کئی اہم نام رہ گئے ہیں۔ مثلاً: صبا اکبرآبادی۔ تابش دہلوی۔ منیر نیازی، محسن
احسان جعفری، ضیا جالندھری، قاسمی، بخاری۔ شبنم رومانی، جون ایلیا۔ عبدالحمید عدم، محبوب خزاں۔ رضی اختر شوق۔ صابر ظفر، محمد اظہار الحق، پروین
توصیف تبسم۔ غلام حسین ساجد، جلیل عالی، امجد اسلام امجد، صفدر سلیم سیال، افتخار عارف وغیرہ ہم (فہرست طویل ہے)
ایک اختلاف مذکورہ انتخاب کو محدود کرتا ہے۔ وہ یہ کہ پاکستان کے چھوٹے بڑے اخبارات کے ادبی ایڈیشن، ہفت روزہ، پندرہ روزہ
رسائل، اور نیم ادبی رسائل سے صرف نظر کرتے ہوئے ادبی رسائل ہی کو ماخذ بنایا گیا ہے۔ اور اسی لیے ایک معیار کا سطح بنی ہے ورنہ نوجوانوں کا
کے لیے ادبی رسائل اور اخبارات و کتب میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ اس سے ادبی رسائل کی کوئی وقعت نہیں رہ جاتی۔ ۱۷ ادبی رسائل سے مذکورہ
انتخاب کے لیے غزلیں لی گئی ہیں۔ ان میں ماہِ نو سے ۲۲ اور فنون سے ۱۹ غزلیں منتخب کی گئیں۔
مذکورہ کتاب کی فہرست میں اقبال حیدر (ص ۷۹–۸۰) اور شفیق سلیمی ص ۹۲ کے نام شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔ خورشید بیگ میلسوی
(ص ۴۵–۴۶) اور عزم (اقبال امرت) کی غزلوں کے حوالے نہیں دیے گئے ہیں کہ کس رسالے سے لی گئی ہیں۔ ۱۱۲ صفحات میں ۸۰ شعرا کی شمولیت
ساتھ کئی شعرا شامل ہو سکتے تھے اگر ایک صفحے پر ایک غزل دی جاتی۔
ہندوستان میں پاکستانی اردو غزل کے قارئین کے لیے ایک آزادانہ مطالعے کے طور پر اور غزل پر تنقیدی مکالمے کے تناظر میں اس انتخاب
دیکھا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں غیر ضروری جذباتی تجزیوں سے پرے ہند و پاک کی اردو شاعری کا اشتراکی انتخاب دونوں ملکوں کے لیے ہونا چاہیے تاکہ
ادبی افق پر دونوں ممالک کے نئے شعری نیا سوچ ابھر سکے۔ ورنہ تو سیاسی سطح پر دونوں ممالک میں کوئی ایسی مفاہمت ممکن ہی نہیں لگتی ہے جو
تخلیقی سطح پر شعر و ادب عوام و خواص کے دلوں کو ایک کر سکیں۔
اور اردو شاعری ... [illegible] ... کیا۔

غزل ۹۰ء

[انتخاب]

قائم نقوی

احمد ندیم قاسمی

ہر تغیر سے ماورا ہوتا
کتنا دشوار ہے خدا ہونا

کوئی کہتا نہیں بُروں کو بُرا
کتنا اچھا رہا بُرا ہونا

پیار بھی عیب ہو جنسِ بازاری
اک مجبوری ہے باوفا ہونا

مجھ کو پاسِ گناہِ آدم ہے
سہل تھا ورنہ پارسا ہونا

قتل کے حادثے سے کم تو نہیں
پھول کا شاخ سے جدا ہونا

اک عبادت ہے ایک نیکی ہے
حبس میں موجۂ ہوا ہونا

جسے فن سے ندیمؔ نسبت ہے
میری قسمت [illegible] ہونا

احمد فراز

تھکا گیا ہے مسلسل سفر اُداسی کا
اور اب بھی ہے مرے شانے پہ سر اُداسی کا

وہ کون کیمیا گر تھا کہ جو بکھیر گیا
ترے گلاب سے چہرے پہ زرد اُداسی کا

مرے وجود کے خلوت کدے میں کوئی تو تھا
جو رکھ گیا ہے دیا طاق پر اُداسی کا

میں تجھ سے کیسے کہوں یارِ مہرباں میرے
کہ تو علاج نہیں میری ہر اُداسی کا

یہ اب جو آگ کا دریا مرے وجود میں ہے
یہی تو پہلے پہل تھا شرر اُداسی کا

نہ جانے آج کہاں کھو گیا ستارۂ شام
وہ میرا دوست مرا ہم سفر اُداسی کا

فراز دیدۂ پُر آب میں نہ ڈھونڈ اسے
کہ دل کی تہہ میں کہیں ہے گہر اُداسی کا

ارشاد ارشی

نہ روشناس نہ ہی معتبر کا ساتھ رہے
بڑا مزہ ہو جو اس بے خبر کا ساتھ رہے

ہمارے پاس تو کچھ بھی رہا نہ کھونے کو
اُٹھا کے سر کو چلیں گے جو سر کا ساتھ رہے

محبتوں کا بہت حوصلہ ہے اس دل میں
یہی دعا ہے کہ اس بے ہنر کا ساتھ رہے

چہکتے اُڑتے پرندوں کے سو ٹھکانے ہیں
اگر چہکتے ہوئے بال و پر کا ساتھ رہے

روش روش کی دعائیں کہ آندھیاں وہم ہیں
کلی کلی کی تمنا شجر کا ساتھ رہے

تمام شہر کے طوفان میرے گھر آئیں
بپھرتی موج کا ارشیؔ بھنور کا ساتھ رہے

نیرنگِ خیال [illegible]

احمد ضیاء

لبوں پہ درد کا اک ذائقہ سا لگتا ہے
کہ اپنے درمیاں اک فاصلہ سا لگتا ہے

مری کہانی پہ یوں تبصرہ کیا اُس نے
سنا سنایا سا اک واقعہ سا لگتا ہے

قدم قدم پہ ستارے روش روش جگنو
یہ راستہ تو ترا راستہ سا لگتا ہے

کبھی گلاب کبھی خوشبوئیں، کبھی آنکھیں
تمام خوابوں میں اک رابطہ سا لگتا ہے

میں چاہتا ہوں ضیاؔ خاک سے بچا کے لئے
یہ شہرِ سنگ مجھے آشنا سا لگتا ہے

اسماء راجہ

آئیں گالی راتیں اور پھر گھر لوٹنے والے دن
گزرے ہوئے دن اچھے تھے یا آنے والے دن!

بھی خوشی کے لمحوں جاتے ہیں چند ہی لمحوں میں
ہفتوں اور مہینوں میں ڈھل جانے والے دن

دل پر یوں تو بہت دنوں کا بوجھ پڑا ہے عذاب کے
لیکن یہ منڈلانے، اُڑنے، گانے والے دن

عمریں کھوج میں بیت گئی ہیں، ایسا کر یاور
ایک ذرا سی بات پہ روٹھا جانے والے دن

کالی تیز ہوا میں اُڑ گئے سارے عہد پرانے
اب کیا رنگ دکھائیں گے یہ آنے والے دن

موتیے، مخمل، چاندنی جیسی مرے "ابّی" کی گود
پریوں جیسے خواب تھے اور من بھانے والے دن

اشرف جاوید

غبارِ شب ہے، فشارِ خوشبو کہ خواب موسم
سحر کی آنکھوں میں جاگتے ہیں سراب موسم

کبھی تو شاخِ دعا پہ حرفِ اثر کھلیں گے
جمالِ تخلیق بہار ہوں گے عتاب موسم

ہوائے شہرِ انا کے سب ذائقے ادھورے
پسِ فصیلِ گماں بنے اضطراب موسم

یہ میری مٹی مرے نمو سے تہی رہی ہے
اُگے ہیں بطنِ زمیں سے بھی عذاب موسم

سفر سے لوٹے تو ہم چہرے کا آئینہ تھا
ملامتوں کی شکن سے مہکے حجاب، موسم

ہم آپ اپنے گواہ ٹھہرے ہیں ــ دیکھ لینا
لکھیں گے برگِ ہوا پہ اِک دن حساب موسم

احسان رانا

تحفۂ ہوا جو آپ کے ورثے میں آگیا
سارے جہاں کا غم مرے حصے میں آگیا

اِک اَن کہی سی داستاں بچے کی آنکھ میں
انگلی پکڑ کے باپ کی میلے میں آگیا

سورج کی تیرگی میں جلانا محال تھا
پھر بھی چراغ لے کے میں رستے میں آگیا

حسرت کا یہ لباس عطائے نصاب ہے
اِک مژہ پہ اشک وظیفے میں آگیا

تحفۂ ہوا پہ بجھ گئیں پھولوں کی چھتریاں
رقصِ ہوائے شام بھی پتے میں آگیا

بیٹھا تھا اس فصیل پہ اِک طائرِ سوال
خلقِ خدا کے خوف سے پنجرے میں آگیا

بارش کی جلترنگ تھی کچھ دیر کے لئے
کیچڑ تمام شہر کا رستے میں آگیا

احسان کیا کہے گی یہی سر پھری ہوا
اک جوشِ انتقام جو شعلے میں آ گیا

اسرار زیدی

اپنے آپ سے خود ہی گریزاں لگتے ہیں
بھیڑ میں سارے چہرے یکساں لگتے ہیں

وہ گھر جب ذہن سرابوں میں بھٹکے
اس لئے تو شہر بھی ویراں لگتے ہیں

جھانکتے ہیں سناٹے بند دریچوں میں
آنے والے دَور کے طوفاں لگتے ہیں

اس کے ہونٹوں سے جب نغمے پھوٹتے ہیں
شہرِ طرب کے لوگ غزل خواں لگتے ہیں

کیا کہیں سب کی کہانی کتنی ہے
سب کے گریباں اپنے گریباں لگتے ہیں

جیسے جیسے پت جھڑ کا موسم ڈھلتا ہے
منظر سارے شہر کے ویراں لگتے ہیں

احسن بٹ

کسی کی قید میں رہنا نہیں ہے
کناروں میں کبھی بہنا نہیں ہے
اُسے پاکر ہم اپنے سے جُدا ہیں
مگر ہر شخص سے کہنا نہیں ہے!
نہیں رہنا ہمیشہ اِس بدن میں
ہمیشہ کرب یہ سہنا نہیں ہے
شکستہ جسم لے کے چل پڑیں گے
بکھر جاتا ہے پر ڈھنا نہیں ہے
حقیقت ہے کہ خوابوں کا لبادہ
بُنا تو ہے مگر پہنا نہیں ہے
سنبھالے گا کہاں تک جسم کو تُو
یہ مٹی ہے کوئی گہنا نہیں ہے
خلا میں کھو کے ہی رہ جائیں خود
سمٹ کر اس قدر رہنا نہیں ہے
اُسے رکنا ہے خوش فہمی میں احسن
وہ چھوڑتا ہے مگر کہتا نہیں ہے

اشرف سلیم

یادوں سے تری مہک رہے ہیں
جو شعر ابھی ابھی کہے ہیں

راہوں میں بسی ہوئی ہے خوشبو
وہ مجھ سے ابھی جدا ہوئے ہیں

کس کس کو کہوں میں اپنا دشمن
چہرے تو تمام ایک سے ہیں

اب ہم سے کہیں نہ مل سکیں گے
ہم دور بہت چلے گئے ہیں

اعجاز رضوی

کوئی دیا تو شب بھر زیرِ آب رہے
یا پھر اپنی مٹھی میں مہتاب رہے

ڈوبنے والا کشتی میں بھی ڈوب گیا
عمر بھر اپنے پاؤں تلے سیلاب رہے

سب آنکھوں نے روز نویلے خواب بُنے
اپنی آنکھوں میں بس تیرے خواب رہے

سورج ڈوب کے چاند ستارے چھوڑ گیا
ہر صورت میں روشن آس گلاب رہے

زخم سجا کر ہم نے دعا بھی دی اعجاز
دشمن سے بھی صاف تمام حساب رہے

اعجاز حسن

موتیوں کے قول پر کب انگلیاں رکھی گئیں
ساحلِ دریا پر خالی سیپیاں رکھی گئیں

گھر کی چھت پر بیٹھ کر بھی اپنا دم گھٹتا رہا
کل ہوا کے پاؤں میں یوں بیڑیاں رکھی گئیں

میں کسی منظر کے سینے میں اُتر سکتا نہ تھا
بند آنکھوں کی مری یوں کھڑکیاں رکھی گئیں

باپ ساری رات اندھی محفلوں میں گم رہا
سوچ کے گرداب میں کیوں بیٹیاں رکھی گئیں

رنگ خوشبو پھول پتے سب مناظر تھے اُداس
قید کر کے پنجروں میں تتلیاں رکھی گئیں

زندگی کی ہر علامت بہہ گئی سیلاب میں
زیرِ آب پانی میں ڈوبی بستیاں رکھی گئیں

رات بھر اعجاز میں جلتا رہا برسات میں
[illegible] بوندوں کے [illegible] رکھی گئیں

اقبال حیدر

کب تیرگی مکمل بدلی ہے روشنی میں
لیکن کوئی کرن تو چمکی ہے روشنی میں

مدت سے چل رہی تھی بادِ سموم ہر سُو
اک پھول تو کھلا ہے صحرائے زندگی میں

کہنے کو جنس رہتے تھے پہلے بھی ہونٹ لیکن
کچھ بات ہی نئی ہے اب اِن دنوں ہنسی میں

ہر دُکھ نہیں مٹا ہے پھر شکوہ نہیں ملا ہے
قدرے کمی ہے لیکن اب دل کی بے کلی میں

مضبوط آمریت کے بُت ٹکڑوں ٹکڑے ہیں
یہ بات کم نہیں ہے اس دورِ آذری میں

اُمیدِ بہتری میں خاطر کو جمع رکھو
کچھ بھی نہ ہو گا حاصل جلد بازی میں

جمہوریت کی راہیں ہموار ہو رہی ہیں
بیدار ولولے ہیں اقبال زندگی میں

اقبال کوثر

میں نے جو تصویر بنائی آپ ادھوری رکھی ہے
جتنی قربت قدر نہ کھوئے اتنی دوری رکھی ہے

پیار کے کتنے بھید ہیں لیکن اس سے فقط یہ کہہ دو
[illegible]

اک دنیا بن آئے ہیں ہم پر لفظوں کے شاکے میں
خود کو پورا سکنے کی گنجائش پوری رکھی ہے

دھیان تمہارا آتا ہے تو بجھتا جینا پڑتا ہے
تم نے میرے مرنے میں بھی کیا مجبوری رکھی ہے

افتخار بخاری

پل بھر ہوں اظہار کی خواہش وقت کی اس مٹھی میں
مجھ پر بھی اک بوند گرے تیرے رنگوں کی ہولی میں

کون کڑی ہے جس نے اک شب جینے کا سامان کیا
کس نے چاند کا سکہ ڈالا شام کی خالی جھولی میں

سہمے کبھی لے سونے والی بے سجائے کمروں میں
جاگ رہی ہے یاد تری اک دل کی اجڑی کھولی میں

ہری رُتوں میں بیچ کر جس کو اس بستی میں آنا تھا
وہ دُلہن تو بوڑھی ہو گئی بیٹھے بیٹھے ڈولی میں

نانک ہو یا شاہ حسین، بخاری ہو یا بھگت کبیر
سب نے ایک ہی درد لکھا ہے اپنی اپنی بولی میں

اکبر حمیدی

بدن میں موجزن لہروں کو پانی چھوڑ جاتا ہے
بہت آہستہ سے دریا روانی چھوڑ جاتا ہے

یہ دنیا ہے مگر جیسے سرائے داستاں گویاں
جو آتا ہے یہاں اپنی کہانی چھوڑ جاتا ہے

زمانہ یاد رکھتا ہے اُسے جو اس سرائے فانی میں
دلِ عالم میں نقشِ غیر فانی چھوڑ جاتا ہے

چلو ہم عشق کرنے کی بجائے دوستی کر لیں
پرانا حکمراں اب حکمرانی چھوڑ جاتا ہے

کیا ہے اُس نے خود کو منتقل آئندہ نسلوں میں
وہ اپنے بچوں میں اپنی جوانی چھوڑ جاتا ہے

[illegible]
[illegible]

اکرام [illegible]

[illegible] ہوں بہت [illegible] کی صورت
ہوا بجھا [illegible] تو حباب کی صورت

یہ قرض واسطے ہر سانس ہو گیا پت جھڑ
مہک رہا ہے مگر تو گلاب کی صورت

عجیب لوگ ہیں اپنی غرض سے چلتے ہیں
یہ شہر اب تو ہوا ہے عذاب کی صورت

پیا ہے آنکھ کے پیالوں سے گھونٹ گھونٹ تجھے
بدن میں اترا ہے تو۔ تو شراب کی صورت

کسی کی یاد تبسم لب کے جاتی ہے
جوان جسم کے رنگین خواب کی صورت

انجم رومانی

جو زود رنجی سے پیدا اور ابتری کریں گے
گمراہ ہیں جو خود ہی کیا رہبری کریں گے

سیکھیں گے دشمنوں سے فن گفتگو کا ہم بھی
ہو گوش لا کے دل میں باتیں کھری کریں گے

محدود ہے زمیں تک حضرت کی پارسائی
کیا کچھ نہ خلد میں یہ مرد جری کریں گے

مانوس ہر بشر ہے لیکن کسے خبر ہے
کس کو سزا ملے گی کس کو بری کریں گے

در پردہ چل رہا ہے سب کاروبار عالم
ہشیار بھی رہیں تو کیا مشتری کریں گے

اٹھے جہاں سے ہو کر خوار یکی سوا کمد
[illegible] آئینوں کی صیقل گری کریں گے

[illegible]
[illegible]

انجم سلیمی

وحشت سی ہو رہی ہے عجب مخمصے میں ہوں
شاید خود آگہی کے کسی مرحلے میں ہوں

اب تک میں اپنے آپ پہ ظاہر نہیں ہوا
محسوس ہو رہا ہے، ابھی تجربے میں ہوں

کیسے کرے گا تو مری ہستی سے انحراف!
میں تیرا عکس بن کے ترے آئینے میں ہوں!

مجھ کو سفر نے کوئی نیا پن نہیں دیا
یوں چل رہا ہوں جیسے کسی دائرے میں ہوں

اک بوجھ ہو گئی ہے مرے واسطے حیات
میں تھک چکا ہوں اور ابھی راستے میں ہوں

انصر علی انصر

دوری منزل کا دکھ ساکت نظر کے ساتھ ہے
اک تھکا ہارا مسافر رہ گزر کے ساتھ ہے

بے صدا ماحول میں محسوس کرتی ہے حیات
جیسے ویرانی ابھی تک میرے گھر کے ساتھ ہے

پست جذبوں نے نوچ ڈالے سائے پیڑوں سے تمام
اک ہرا پتہ مگر میرے شجر کے ساتھ ہے

جگنوؤں کی قرض ایک دن میں پرندوں کے لئے
آشیاں کی یاد بھی ایک ایک پر کے ساتھ ہے

میرا مستقبل بلاتا ہے مجھے اپنے قریب
میرا ماضی بھی مری گرد سفر کے ساتھ ہے

سرفرازی جھک کے رہنے میں ہے انصر [illegible]
[illegible] ہے مگر من گھر کے ساتھ ہے

ازہر منیر

فراق جاوداں ٹھہرا ہوا ہے
خزاں کا کارواں ٹھہرا ہوا ہے

دکھوں کا دیوتا کتنے دنوں سے
مرے گھر میہماں ٹھہرا ہوا ہے

یہ کس نے بستیوں میں صور پھونکا؟
کہ محشر کا سماں ٹھہرا ہوا ہے

یہ کیسا نفرتوں کا گھپ اندھیرا
ہمارے درمیاں ٹھہرا ہوا ہے

یہ کس کا فیض ہے ازہر کہ اب تک
سروں پہ آسماں ٹھہرا ہوا ہے

انیل چوہان

نفرتوں کے آنکھوں میں شعلے لئے پھرتے ہے
لوگ میرے واسطے تحفے لئے پھرتے ہے

زندگانی صدق سے بس مسکراتی رہ گئی
اور ہم تو بے خبر جذبے لئے پھرتے رہے

ان کو صحرا کی مسافت میں نہ منزل مل سکی
جو سروں پر ابر کے ٹکڑے لئے پھرتے ہے

قاتلوں پر قتل کے دھبے بھی باطل ہو گئے
پیرہن پر خون کے دھبے لئے پھرتے ہے

[illegible] اپنے انیل
ہم زباں پر [illegible] لئے پھرتے ہے

بخش لائلپوری

قاتل ہوا خموش تو تلوار بول اٹھی
مقتل میں خونِ گرم کی ہر دھار بول اٹھی

پوچھا سبک سروں کا نمائندہ کون ہے
سن کر فقیہہ شہر کی دستار بول اٹھی

اہلِ ستم کے خوف سے جو چپ تھی وہ زباں
جب بولنے پہ آئی سرِ دار بول اٹھی

میری تباہیوں کی ہے اس میں خبر ضرور
از خود ہر ایک سرخیِ اخبار بول اٹھی

چہرہ تھا زخم زخم کوئی پوچھتا نہ تھا
یوسف بنے تو گرمیِ بازار بول اٹھی

اک ناخدا تھی یورشِ طوفاں پہ چپ رہا
چپو کبھی تو اور کبھی پتوار بول اٹھی

کچھ اس طرح سے نقش تھے اینٹوں پہ سانحے
زنداں میں مجھ کو دیکھ کے دیوار بول اٹھی

پرتو روہیلہ

حرص مال و منال میں کھویا
ہم نے فردا بھی حال میں کھویا

ایک لمحہ تھا تجھ کو پانے کا
وہ بھی فکرِ مآل میں کھویا

میں نے پندارِ عاشقی سارا
اک ادھورے سوال میں کھویا

وہ ستارا جو راہ دکھلاتا
خود عروجِ کمال میں کھویا

کارواں محو ہے اندھیروں میں
رہنما قیل و قال میں کھویا

ساتھیو سرنگوں گزرتی ہیں
وقت اس کے خیال میں کھویا

میں بھی کب سے تلاش کرتا ہوں
... کسی خیال میں کھویا

تنویر سپرا

تعلق ہے اندھیروں سے مرا شب زاد جالوں سے
نگاہیں دھند کی تحویل میں ہیں چند سالوں سے

ہماری نفرتوں میں بند ہے دو داستانوں کا
تری یاری شکاری سے میری یاری غزالوں سے

یہ گر مطمئن کرتا ہے تو زندہ دلیلیں دے
تسلی غیر ممکن ہے مری مردہ حوالوں سے

چلو تنویر سپرا کوئی عامل ڈھونڈ کر لائیں
چھلاوے چیز خالی کر گئے ہیں خوش جمالوں سے

جعفر شیرازی

تشنگی آنکھوں میں رہے دل میں جوانی تو رہے
زندگانی تیرے ہونے کی نشانی تو رہے

اس کی خاطر تو روا کوئی بن باس بھی ہے
سب کے ہونٹوں پہ مری رام کہانی تو رہے

ضبط میں یہ بھی ہے گویائی کا اپنا انداز
لب ہوں خاموش مگر اشک فشانی تو رہے

گر اجالوں سے گریزاں ہے دھندلکوں میں آ
دن بھر ہو نہ سکا شام سہانی تو رہے

تو نہ شیریں نہ میں فرہاد مگر یوں تو نہیں
ہم رہیں یا نہ رہیں اپنی کہانی تو رہے

آؤ کچھ دیر کریں بیٹھ کمال کی باتیں
یاد اس پیار کی وہ رسم پرانی تو رہے

تیری آنکھیں تو نہیں خشک جو ہیں جعفر
یہ جو دریا ہیں تو دریاؤں میں پانی تو رہے

جہانگیر عمران

ایک نظر کا دیکھنا مہنگا پڑا
پھر مسلسل سوچنا مہنگا پڑا

پاؤں اُٹھتے ہی نہیں دہلیز سے
مڑ کے پیچھے دیکھنا مہنگا پڑا

پار کر لیتا سمندر میں سراط
ایک ذرا سا ڈولنا مہنگا پڑا

خود سے بھی ڈرنے لگی ہے ذات بھی
اپنے اندر جھانکنا مہنگا پڑا

شہر سارا مجھ پہ ہے اب سنگ زن
بھید دل کا کھولنا مہنگا پڑا

کیا میں اپنے وقت کا سقراط ہوں
کیوں مجھے سچ بولنا مہنگا پڑا

حمایت علی شاعر

(اپنے وطن کے بیانِ حال لوگوں کے نام)

چہرے ہیں پیرِ فرشتے ہوئے شبنم سرشت لوگ
دوزخ کو بھی بنائے ہوئے ہیں بہشت لوگ

گل کیا کریں بہار رہے ہیں بصد خلوص
اپنا نصیب بیچ کے ہوئے سنگ و خشت لوگ

سینے میں آئینے کی طرح پاک صاف دل
معصوم و سادہ ہے مگر خوب و زشت لوگ

اپنا علم ہی وہ جنس ہیں کہ حرف حرف
پڑھ لیں خود اپنے عہد کی ہی سر نوشت لوگ

اک عمر کٹ کر بھی غم سہتے رہے
... لوگ

حسین انجم

وہ اقلیمِ سحر تھا چراغِ شام نہ تھا
فنا کے وسطِ شجر میں مگر کلام نہ تھا

امیرِ شہر بھی، قاضی بھی، کوتوال بھی وہ
قدامتِ بستی، قاتل کا ایک نام نہ تھا

وہ تھا اسیرِ کرم یا تھا صیدِ جبر و ستم
تھا کون دیدہ ور ایسا جو زیرِ دام نہ تھا

قفس سے نکلے جب آئے نیور سوئے چمن
شجر کے بام و سقف تھے شجر کا نام نہ تھا

تھا میرے قتل پہ اجماعِ اہلِ دیر و حرم
کہ قصرِ شاہ میں کوئی تنگ حسام نہ تھا

وہ قولِ جنوں تھا کہ خوف جوارِ حضرتِ شیخ
جو بزمِ یار میں پہلا سا اہتمام نہ تھا

ہے طرزِ نعت کہ دارِ فلک کے قبضے میں
تھا جس کے ہاتھ میں خنجر اسی کا نام نہ تھا

دل گرفتہ انجمؔ چمن میں کب لگتا
کہ رنگِ گل تو بہت تھے وہ خوش خرام نہ تھا

حسین اصغر تبسم

نظر نظر میرے حرف و بیاں پہ ٹھہری ہے
کہاں کہوں کسی کارِ زیاں پہ ٹھہری ہے

فصیلِ شب سے اُدھر ماتمی دھنوں کی صدا
کسی قبیلۂ بے خانماں پہ ٹھہری ہے

میری گواہ جو ہوتی دیارِ ظلمت میں
وہ روشنی ابھی بجھتے آسماں پہ ٹھہری ہے

جو استعارۂ سنگِ طرب تھی سب کے لئے
وہی دعا مرے وہم و گماں پہ ٹھہری ہے

مجھے قیامِ مسلسل نہیں قبول کہ اب
میری نظر دلِ آشفتگاں پہ شب سی کا ہے

میرے جنونِ دل سے نکل کے پھر کوئی یاد
نگاہِ شام ترے آستاں پہ ٹھہری ہے

حلیم قریشی

اب ترے وصل کا موسم بھی کہاں یاد آئے
بس اُن کے جو اُٹھا تھا وہ دھواں یاد آئے

اپنی دھرتی کی ذرّوں ہی سے بے تو بو سے
پیار سے گود میں لیتی ہے تو ماں یاد آئے

موسمِ ہجر میں ہم خود سے بھی محروم رہے
تم ملے ہو تو ہمیں سارے زیاں یاد آئے

ساری خوش فہمیاں جب روند کے تو چھوڑ گیا
شب یقیں وہ ہوئے سارے گماں یاد آئے

ایک دھاگا سا مجھے کھینچا جائے پیہم
جب کراچی میں حلیمؔ اپنا "گراں"[1] یاد آئے

[1] "گراں" پنجابی میں گاؤں کو کہتے ہیں۔

خادم رزمی

کسی طوفاں کا آنا بولتی ہے
ہوا پیڑوں سے اونچا بولتی ہے
وہ بے منصب ہوا ہے اب تو اس پہ
زبانِ شہر کیا کیا بولتی ہے!
جھکتا تھا کبھی اخلاص ہی میں
اب ان آنکھوں میں دنیا بولتی ہے
یہ کارِ عشق بے قیمت نہیں ہے
کہ خلقِ شہر ایسا بولتی ہے!
مری تشنہ لبی کا جرم یہ ہے
ابھی صحرا کو سہما بولتی ہے
دھواں دیتی بجھی لو اک دیئے کی
کئی صدیوں کو لمحہ بولتی ہے
نجانے کیوں بھری بستی کی رونق
فقط مجھ کو اکیلا بولتی ہے
پتّی ہے نئی تازہ ہوا کی
کہیں پہ موجِ دریا بولتی ہے
پُھلنے پیڑ کی شاخوں میں مستی!
نئے موسم کی چڑیا بولتی ہے

خاقان خاور

بے یقینی کی ہے جو دھول بہ
ریزہ ریزہ ہو سئے اصول بہ

ہجر کے زرد موسموں کے بہ
گِل دیوار پہ ہیں پھول بہ

دامنِ گل کی خیر ہو یا رب
اس برس بھی آگے ببول بہ

خلد سے خاک داں میں گرنے تک
آدمی کو ہے ایک بھول بہ

وہ بھی شامل ہے سُننے والوں
بات کوٹے سے ہے ہو طول بہ

کوئی دیوار گر گئی خا و
دل میں اُٹھنے لگی ہے دھول بہ

خاور زیدی

اُبھرا اک منظر نیا صدیوں کے منظر کا
شہ رگوں نے رکھ دیئے ہیں آج خنجر کا

یہ نئی ترمیم جانے رنگ کیا دکھلا
مہرباں لکھا ہے اُس نے اب ستم گر کا

کس نے منتقل کر دیا ہے گلستاں
سولیاں کس نے بنا دی ہیں صنوبر کا

ضبطِ حرفِ صدق سے سر تو سلامت
کھا گیا کوئی مگر اندر ہی اندر کا

کٹ نہیں سکتے کسی صورت دلوں کے
معلقی انکار جو قائم ہے پر کاٹ

[illegible]

مکتوب

ولی شفیق ۔ بی ۵۰۱۵، دھالی گیٹ کمپاؤنڈ، بھنڈی بازار، کلکتہ ۔ ۲۳

شاعر کا تازہ شمارہ پچھلے معمول سے کچھ زیادہ ہی پسند آیا۔ اس کی وجہ اس کے مندرجات کی رنگا رنگی تنوع اور تازہ کاری ہے۔ شہنشاہ مرزا اور ادبی نیچر کی وجہ سے یہ شمارہ بہت ہو گیا ہے۔ بالکل خاص نمبر کا حکم رکھتا ہے۔ "نظمی بحر غزلیں" ... شاعر" کے تحت آپ نے جو غزلیں شائع کی ہیں وہ خوب ہیں۔ مظفر حنفی کی غزلیں خاص طور سے پسند آئیں۔ جس طرح آپ نے "تبادلۂ سخن جدید" کا خوش گوار سلسلہ شروع کیا ہے اسی طرح "نظمی بحر غزلیں" اور "نئے شاعر" کے کالم کے بالکل تازہ کار لیکن معتبر آواز رکھنے والے شاعروں کو بھی موقع دیں۔ یقیناً ایسی صلاحیت رکھنے والے شاعر ہمارے یہاں ہیں اور ایسے قارئین کی بھی کمی نہیں جو ان شاعروں کا ڈھیر سارا کلام یکجا صورت میں پڑھنے اور دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔

میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ "غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ" کے سلسلے میں میرے خیالات کو ادبی نیچر میں جگہ دے کر نمایاں کیا۔ میرے لئے یہ بات بھی باعث اطمینان ہے کہ ادبی نیچر کے تمام شرکا نے بنیادی خیالات کی تائید کی ہے۔ سب کا وہی اختلاف ہے جو میرا ہے۔ چلئے ایک کام کی بحث چل پڑی ہے۔ شماروں میں اس سلسلے میں اور بھی بہت کچھ جاننے اور پڑھنے کو ملے گا۔ آپ کو ایک بات کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ کا ذہن واقعی بڑا تخلیقی اور نفاست پسند ہے۔ معیاری چیزوں کا انتخاب اور پھر انہیں کاغذ پر خوبصورتی سے سجانا کوئی آپ سے سیکھے۔

"شہنشاہ مرزا" بحیثیت مجموعی ٹھیک ہے۔ میں اسے عالم تشنگی کی کوشش کہوں گا۔ مرزا کے فن اور شخصیت کے تمام پہلو دستیاب نہیں ہو سکے۔

... نیر مسعود نے مرزا کی شخصیت کا جو خاکہ کھینچا ہے وہ سرسری اور تشنہ ہے۔ پھر بھی مرحوم کی شخصیت کو سمجھنے میں بڑی مدد کرتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ عصمت چغتائی منٹو کا جیسا خاکہ تو ہر کوئی لکھ نہیں سکتا۔ برادرم فضیل جعفری کی کتاب "کمان اور زخم" پر مرحوم مرزا کا تبصرہ بالکل مناسب نہیں ہے۔ یہ تبصرہ پڑھنے سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ فضیل جعفری کے تنقیدی تحفظات کا کچھ رعب ایسا تھا کہ وہ کچھ کھل کر نہ کہہ سکے۔ دوسری بات یہ کہ تبصرہ کچھ ایسی نوعیت کا ہے جس سے مختلف نقادوں کے بیان اطلاعات ملتی ہیں کہ ... کا طریقہ کیا ہے ... [illegible]

حقیقت ضائع کرنے کی بجائے اصل کتاب پڑھی جائے ... نقاد کے تعلقات فلاں نقاد سے اچھے ہیں، فلاں کی تنقیدی نثر شاندار ہے، اور حقیقت یہ ہے فلاں کی جیبیں پوری کا ذائقہ رکھنے والی چیزیں ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی حد تک ذہن رکھنے والے نقاد یا ان کی تنقید پر تبصرہ کرنے کے لئے ویسا ہی ادراک ذہن چاہئے۔

مصطفیٰ امومن ۔ رحمت گنج، ... (بہار)

شاعر کا تازہ شمارہ نمبر۲ نظر نواز ہوا۔ پرچہ بہت خوب صورت ہے، معیاری بھی اور شاندار بھی۔ عنوان چشتی اور مظفر حنفی کی غزلیں، شہنشاہ مرزا کی نثری نظمیں بہت خوب ہیں بلکہ مجھے بہت پسند آئی ہیں۔ "غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ"۔ ادبی نیچر ہمعصر نہایت معلوماتی ہے۔ مختلف شرکا کی تنقیدی رائے جو معلوماتی ہی نہیں بلکہ واضح خوش گوار تبدیلیوں کا تذکرہ ہے جو قابل مطالعہ ہے۔ یہ بات قابل تحسین ہے کہ شاعر پابندی سے نکل رہا ہے۔ اور حیران ہوں کہ اتنی کم قیمت پر ایسا اور اتنا اچھا آپ کیسے شائع پیش کرتے ہیں۔

شہاب اکبر آبادی ۔ ... شمارہ ... کے متعلق بعض باتیں گوش گزار کر رہا ہوں۔

(۱) غزل پر "تنقیدی مکالمہ" کے تحت آپ نے جن خیالات کو شائع کیا ہے اور آئندہ شائع کیا جائے گا وہ ایک تدریجی عمل ہے کا خیال ہے جو غزل فہم نہیں اسے غزل پر جن کچھ کہنے کا حق نہیں۔ غزل کی طرح وسیع الدامن کوئی بھی صنف سخن نہیں ہے۔

(۲) عنوان چشتی صاحب کی غزلیں بہت خوب ہیں۔

نظر کے ساتھ ہوا ہے زوال کا منظر
اندھیرا وہ ہے کہ کچھ بھی نہ سجھائی دے

● غزل بحر مجتث میں تھوڑا ہلاؤ ہوتا تو کم اور بھی بہتر کرتے۔

(۳) شہنشاہ مرزا مرحوم کی نثری نظمیں درحقیقت آزاد نظمیں ہیں۔ پہلی نظم بحر متقارب میں ہے۔ دوسری، تیسری، چھٹی اور نویں نظم بحر ... سالم ... میں ہے۔ چوتھی نظم ... بحر متدارک میں ہے۔ ۵۔۷۔۸ واقعی نثری نظمیں ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ نثری نظم کا مستقبل ہے۔ ... وقت نوٹ سے ہمیں سبق لینا چاہئے ... سے اپنا دامن بچا کر رکھنا چاہئے۔

صغیر رحمانی ۔ ... [illegible]

شاعر کا تازہ شمارہ ... [illegible]

مستند مواد فراہم کر کے مبارکباد کے مستحق ہو گئے ہیں۔ "غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ" شاعر کے روایتی معیار کا ایک اچھا سلسلہ ہے۔ اسے جاری رکھیں۔ محترم گوپی چند نارنگ نے اپنے اقتباس میں ڈاکٹر وزیر آغا کے متعلق بجا فرمایا ہے کہ انھوں نے اردو زبان میں انگریزی ... کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

نعمان شوق کی غزل کا یہ شعر

صاف نکھ جاتے مرے ہاتھ قلم ہونے سے
کاش میں نے بھی لکھا ہوتا قصیدہ اس کا

بہت پسند آیا اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر ... سے پیش آیا جائے تو صلاحیت نئے لکھنے والوں میں بھی موجود ہے۔ افسانوی حصہ مزید توجہ طلب ہے۔

مظفر نزملی ۔ مکان نمبر ۳-۲-۱۰۳، ... ۵۰۰۰۰۱

شاعر شمارہ نمبر۲ میں نثر و نظم دونوں حصے خوب ہیں۔ جدید لب و لہجہ کے ساتھ ساتھ روایتی حسن کی جھلکیاں بھی کافی دلکش اور معیاری ہیں۔ ترتیب و تدوین بھی بے حد پسند آئی جس کے لئے دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

محمد ندیم .... ، لکھنؤ ...

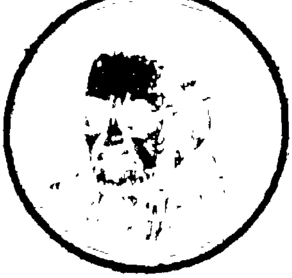
شاعر شمارہ ... موصول ہوا۔ شمارہ ... اداریہ بے حد جاندار ہے ... بعض ... آپ کی توجہ کے مستحق ہیں ... کے اعادے سے قبل ہندی زبان کے الفاظ کا استعمال ... مثلاً "شیری"۔ جب کہ جناب ... کی بہتر ضمانت رکھتا ہے۔ اگر ... "ترشی" ... "ترشی"۔

● دراصل "تیشہ اور ... " والی ... [illegible]

محفوظ عارف ۔ ... [illegible]

شاعر کا شمارہ نمبر ... [illegible]

فکر امروز



شاعری کا تعلق انسانی جذبات واحساسات سے ہے۔ جذبات واحساسات کی تخلیق وبقا انسان کے ساتھ ہے۔ جب تک دنیا میں انسان کا وجود ہے، جذبات واحساسات کا بھی وجود ہے اور جب تک جذبات واحساسات باقی ہیں، شاعری بھی بطور ترجمانِ جذبات باقی رہے گی۔ ہر دور اور ہر زمانہ میں انسانی جذبات میں انقلاب آتا رہتا ہے۔ شاعری بھی اس انقلاب سے ضرور متاثر ہوتی ہے مگر دیکھئے سلطنتیں مٹ گئیں، قومیں تباہ ہو گئیں، ملک اور شہر تباہ ہو گئے، تمدن وتہذیب میں تغیر رونما ہو گیا۔ فلسفہ اور اس کے نظریات میں تبدیلیاں آئیں مگر شاعری اپنی الہامی قوتوں اور بے پناہ کشش کے ساتھ نہ جانے کب سے باقی ہے اور کب تک باقی رہے گی۔

[۲۳ مئی ۱۹۴۸ء]

سیماب اکبرآبادی

شاعر

جلد — ۶۷
شمارہ — ۱۰

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۱۰ روپے

زرِ سالانہ ۵۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۷۰ روپے

تاحیات خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ اداروں سے ۱۰۰ روپے ◆ ممالک غیر سے ۳۵۰ روپے

دبئی وغیرہ میں خواتین کے عالمی مشاعروں میں ہندوستان کی نمائندگی کرنے والی شاعرات میں سے کتنی ہیں جو واقعی شاعری کرتی ہیں؟ فن شاعری سے واقف ہیں؟ شعر و ادب کی سمت و رفتار کا علم ہے، مطالعہ کرتی ہیں اور ادبی رسائل سے جڑی ہوئی ہیں؟ گذشتہ سال پاکستان کے عالمی اور انڈو پاک مشاعروں کی بعض منتظمین نے ہندوستانی شاعرات پر بڑے ہی رکیک فقرے کسے تھے مگر جو تخلیق کار نہیں ہیں ان پر ان فقروں کا کیا اثر؟

ہندوستان کی بعض اکاڈمیاں خواتین کے کل ہند مشاعرے منعقد کرتی ہیں اور انھیں شاعرات کو زیادہ تر مدعو کیا جاتا ہے جو خود شعر نہیں کہتیں۔ تو ان اکاڈمیوں کا معیار کیا ہے؟ اکاڈمیوں کے ذریعے منعقد کیے جانے والے مشاعروں کا معیار کیا ہے؟ یہ اردو کا بہت بڑا المیہ ہے کہ اکاڈمیاں اپنی تمام تر سرگرمیوں میں بیشتر میکانکی اور غیر معیاری ہوتی جارہی ہیں۔ جب یہاں کا یہ حال ہے تو ممالکِ غیر کے مشاعروں کا جو حال ہو، کم ہے۔

مشاعروں کے کمرشیل شعرا کی یہ خواہش رہتی ہے کہ ان کی پسندیدہ شاعرات کو بطورِ خاص مدعو کیا جائے۔ کلام چاہے کسی کا بھی ان کا خریدا ہوا ہوتا ہے، ان کا اپنا تو بس غنیمت سا ترنم اور ان کے آؤ بھاؤ۔ تعجب تو ان ناکارہ شعرا پر ہوتا ہے جو ان خواتین کو نوازتے ہیں، خود نہ تو ادیب ہیں اور نہ شاعر ہیں۔ ان میں اتنی اخلاقی جرأت ہی نہیں کہ وہ یہ سوچ سکیں کہ ان کے اس نوع کے کاروبار سے نہ صرف مشاعروں کا معیار پست ہو رہا ہے بلکہ جو واقعی شعرا ہیں ان کا حق بھی مارا جارہا ہے۔ مشاعروں کا معیار شاعری نہیں رہا بلکہ جملے، فقرے لطیفے، حرکات و سکنات اور ڈرامائی انداز پیشکش کا نام مشاعرہ ہو گیا ہے۔ منتظمینِ مشاعرہ اور سامعین اس طرح کے مشاعروں کے بھی ذمہ دار ہیں۔ وہ خوبصورت خواتین کو اسٹیج پر دیکھنا پسند کرتے ہیں انھیں مائک پر بہت دیر تک روکنا چاہتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں نظم و غزل کے اہم معتبر بڑے شعرا کو پھر کون [illegible]۔ لیکن ایسا نہیں کہ ہندوستانی شاعرات میں جو مشاعروں میں آتی ہیں تمام ہی غیر شاعرات ہیں۔ بعض پڑھی لکھی اور واقعی شاعری کرنے والی خواتین بھی مشاعروں میں آتی ہیں۔ ادبی رسائل میں کئی خواتین کا کلام شائع ہوتا ہے۔ ان میں بھی بعض مشاعروں میں شامل ہونے کی اہل ہیں لیکن نہ جانے کیوں گریز کرتی ہیں۔ پاکستانی مشاعروں میں جو خواتین شریک ہوتی ہیں ان میں اب جو شامل ہوتی ہیں ان کی شعری [illegible]

به خطِ شاعر

دھواں، غبار، سمندر، سحاب اپنی جگہ
مگر ہیں اور دلِ اضطراب اپنی جگہ

ہوا کی زد میں ہے ہر چیز خار و خس کی طرح
کھڑے ہوئے ہیں جب حباب و خواب اپنی جگہ

پسِ عقب میں ہے آوازۂ لہو کی گونج
ہے دشتِ جاں کے سفر کا باب اپنی جگہ

زباں کو دیتا ہے احساسِ تشنگی سے نجات
وہ ذائقہ ہے سکوتِ سراب اپنی جگہ

نہ جانے ہو گا کہاں صنمِ بدن مشتاق
کہ چھوڑنے کو ہے ہر اک طناب اپنی جگہ

مشتاق ظفر

ہتھیلیوں میں چھپے پتھروں نے کیا نہ ک
تعاقب نے مرے پیروں میں جب آشیانہ

ہیں برس کی راہ کا اک سنگ تھا، ملا
لگا کے ہاتھ مجھے شاملِ خزانہ

نہ جانے ٹوٹ کے کب وہ کھنا سی
کھلے اس نے باغِ بدن کو دیے ہرا

دکھائے اس نے مناظر مجھے زمانوں
مگر مجھے رہے رازوں سے آشنا

ہوائے تیز تری مہربانیاں ہیں
کہ تو نے سر پہ غباروں کو شامیانہ

تیز قدموں سے ابھرتا ہوا ڈر بھی کیا ہے
گھپ، گھنے گھر سے اندھیرے کا سفر بھی کیا ہے

دشت میں سبزۂ روشن کی یہ بے داغ بہار
آج محسوس ہوا دیدۂ تر بھی کیا ہے

ایک اک کر کے جدا ہو گئے جب سارے رفیق
تب خیال آیا کہ یہ راہگذر بھی کیا ہے

دشت مخصوص سبھی خاک اڑانے کے لیے
دل اگر سینے میں آ جائے تو گھر بھی کیا ہے

گھور رکھا ہے تمناؤں نے دل کو مشتاق
شہر کے بیچ یہ خارش کھنڈر بھی کیا ہے

اجڑی دیواریں ٹوٹے ہوئے در میں رہ جا
چاندنی آج کی شب میرے کھنڈر میں رہ جا

ہے یہی وقت کہ لکھ دوں نیا اوراق کی
ساعتِ شوق مرے دستِ ہنر میں رہ جا

لفظ آئے کوئی امکانِ تو شادابی کا
گزرے موسم کی صدا بن کے شجر میں رہ جا

کچھ تو ہو دشت ہوا میں ترے ہونے کا سراغ
سیل خوشبو کی طرح گردِ سفر میں رہ جا

مشتاق رک چیز ہے یہ منظرِ بیاباں کی
نقشِ پا بن کے کسی راہگذر میں رہ جا

غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ

ادبی فیچر

(۴)



شمارہ ہٰذہ میں شامل انٹرویو میں اردو شاعری اور بالخصوص صنفِ غزل پر جناب عباس گرے اور ڈاکٹر آنند صاحب نے غزل پر جو الزامات عائد کئے ہیں، وہ سب "گھسے پٹے اور چبائے ہوئے نوالے" ہیں۔ ان حضرات سے بہت پہلے کئی حضرات یہ الزامات بار بار لگا چکے ہیں۔ اور آپ جیسے حضرات یہ الزامات لگا چکے ہیں۔ اور آپ جیسے حضرات کے ذریعہ دلیلوں اور مثالوں سے ان الزامات کو رد بھی کیا جا چکا ہے۔ انٹرویو پڑھ کر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ عصری عالمی ادب صرف وہی ادب ہے جس کے موضوعات صرف "جنسیات" سے متعلق ہوں۔ آرٹ کا عالمی تصور جو ان حضرات کے ذہن میں ہے وہ اس شمارے میں شائع ڈاکٹر آنند صاحب کی نظموں سے واضح ہے جن میں آرٹ کم اور فکر زیادہ ہے۔ ان کے موضوعات بھی وہی ہیں جن کو اردو کے سیکڑوں قدیم و جدید شعراء بار بار غزلوں اور نظموں میں برت چکے ہیں جیسے جنس، حیوانی حاجتیں، غیر یقینی فضا، احساسِ محرومی، وقت ٹھہر جانے کی آرزو، قول و فعل کا تضاد، دوا کا نہ ہونا، بے انصافی، خود نگاہی کا نہ ہونا، نیند، بیکراں وقت وغیرہ۔ صرف اندازِ بیاں ڈاکٹر آنند صاحب کا اپنا ہے۔ اور یہی ہوتا بھی ہے۔ اندازِ بیان ہی سے "چبائے نوالوں" اور "نئے نوالوں" کے فرق کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ جذبات دنیا کے تمام انسانوں کے یکساں ہیں۔ صرف ان کے اظہار کے ذرائع اپنے اپنے ہیں۔ مکمل غزل سے لطف اندوز ہونے کے لئے جس PREVIOUS KNOWLEDGE کا ذہن میں ہونا ضروری ہے معترض حضرات میں اس کا فقدان دیکھا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو غزل و نظم کا کینوس واقعیت، تاثریت، علامیت، استقبالیت، مکعبیت، پیکریت، اظہاریت، ترقی پسندیت اور وجودیت کے رنگ سے لئے وسیع تر ہے اور وسیع ترین ہوتا جا رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ معترض حضرات اپنے طور پر تیار کی ہوئی شعرا کے ناموں کی فہرست کے ساتھ دیگر حضرات کی تیار کی ہوئی شعراء کے ناموں کی فہرست پر بھی خلوص کے ساتھ غور فرمائیں۔ یہی ادبی انصاف کا تقاضہ ہے اور یہی کسی ادب کے ادبیات کی صف میں شامل کرنے کی ناگزیر شرط ہے۔ آج کل دنیا کے دو بڑے سیاسی کیمپوں کی طرح "عالمی ادب" بھی دو بڑے کیمپوں میں منقسم ہے۔ دونوں ہی کیمپوں کے پاس اپنی اپنی فہرستیں ہیں۔ دونوں ہی اپنی فہرستوں کے ادیبوں کو "عالمی ادیب" سمجھتے ہیں اور دوسرے کی فہرست کے ادیبوں کو کم تر گردانتے ہیں۔ نظریات اور روایات سے کسی کو مفر نہیں۔ شعوری اور غیر شعوری طور پر نظریات اور روایات فنکار کی شخصیت اور فن پر کم و بیش اثر انداز ہوتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کیا زیرِ غور ادب کے ادب پارے ایسے ہیں کہ عالمی برادری کی سرخوشی و سرفرازی اور اتحاد و اتحاد میں معاون ہو سکیں۔ اگر جواب اثبات میں ہے تو وہ ادب عالمی ادبیات کی صف میں شامل ہونے کا حق دار ہے۔ خدا کا شکر ہے اردو شاعری اور اس کی صنف "غزل" اس وصف کی حامل ہیں۔ جو کوفت اور تکلیف انٹرویو کے کچھ الفاظ، کلمات اور احساس کمتری میں مبتلا کرنے کی کوشش سے ہوئی تھی، وہ آپ کے مضمون "غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ" پڑھ کر دور ہو گئی۔ مضمون مدلل جامع اور حقیقت پر مبنی ہے اور بہت خوب ہے۔ بہت بہت مبارکباد۔

اسرار اکبر آبادی ـــ نیم بچھا، منٹولہ، آگرہ ـــ ۲۸۲۰۰۳

امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ شاعر کا شمارہ ملا۔ گزشتہ ستیہ پال آنند کو موصول ہوا۔ مجرمات کے تحت آپ نے یہ جو لکھا ہے کہ یہ گزشتہ ستیہ پال آنند کے فکر و فن کو ابھارنے سے کہیں زیادہ ان کے سلسلے عصری اردو شاعری کے بعض اہم مسائل کو ابھارتا ہے۔ آپ اسے اپنی تعریف بے جا پہلو نہ کریں تو میں یہ کہوں کہ آپ کا ترتیب کردہ مقالہ "غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ" ماحصل شمارہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد اردو شاعری خصوصاً اردو غزل سے متعلق بہت سارے سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں جن پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ اردو غزل کو طعن و ملامت کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

[illegible] آپ نے غزل کی حمایت میں زیرِ نظر مضمون لکھ کر بڑی جرأت سے کام لیا ہے ـــــ اردو کو عالمی شاعری کے مقابلے میں رکھنے کے لیے کیا ضروری ہے کہ غزل پر زیادہ سے زیادہ کام کیا جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اردو شاعری کا مطالعہ اگر غزل کے بغیر کیا گیا تو یہ ایک ادھورا مطالعہ ہوگا اور عالمی سطح پر تو کیا کسی بھی سطح پر بھی اردو شاعری اپنا کوئی مقام نہیں بنا سکے گی۔

آپ کے اس خیال سے اکثر ناقدین بھی متفق ہوں گے کہ غزل کا ایک شعر ایجاز و اختصار کا شاہکار ہوتا ہے۔ اور سکڑتے ہوئے لمحوں کے اس دور میں غزل کا ایک شعر بیسویں صدی ہی نہیں بلکہ اکیسویں صدی کی بھی ضرورت بن سکتا ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ اربابِ نقد و نظر اکیسویں صدی کی اس ضرورت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اردو شاعری کا مطالعہ اردو غزل کے خصوصی حوالے سے کرنے کی کوشش کریں گے، اسے نظر انداز کر کے نہیں۔

● **ارشد کمال** ۲۴۳، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر نئی دلی۔



میں نے آپ کا انٹرویو بڑے شوق سے پڑھا ہے۔ بڑا لطف آیا ہے ان باتوں سے بھی جن سے میں سو فیصد آپ سے متفق ہوں۔ اور ان باتوں سے بھی جن سے مجھے اختلاف ہے۔ انٹرویو سے اندازہ ہوا کہ میرا جی اور راشد کے بعد [آپ کے خیال کے مطابق] اردو نظم نے ترقی نہیں کی۔ نیز نظم پر غزل کے اثرات بہت زیادہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ بات درست نہیں ہے۔ میرا جی اور راشد کے بعد ایک سب سے اہم شاعر مجید امجد ہے۔ جس کے بارے میں میرا یہ خیال ہے کہ وہ اقبال کے بعد سب سے توانا آواز ہے۔ اب اس کی کلیات بھی چھپ گئی ہے۔ مجید امجد کے علاوہ قیوم نظر، مختار صدیقی، صفدر میر، منیر نیازی، اختر الایمان ــــ اور بلراج کومل اور متعدد دوسرے نظم گو شعرا نے میرا جی، راشد اور مجید امجد کے خالص نظمیہ انداز ہی کو آگے بڑھایا ہے۔ خود میں نے نظموں کے پانچ مجموعے پیش کیے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک طویل نظم آدھی صدی کے بعد بھی کتابی صورت میں شائع کی ہے۔ اس کے انگریزی اور ہندی ایڈیشن بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان تمام شعرا کے ہاں آپ اردو نظم کو ارتقا کی منازل طے کرتے دیکھ سکتے ہیں۔ غزل کا زیادہ اثر ترقی پسند نظم گو شعرا کے ہاں ہے۔ ان لوگوں نے اس سلسلے میں فیض کا تتبع کیا ہے جس کی ساری امیجری اور لفظیات غزل سے مستعار ہے۔

یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ میرا جی اور راشد پر تنقید نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان دونوں پر نیز مجید امجد پر کافی بہت اچھے اور مفصل مضامین لکھے گئے ہیں۔ میں نے بھی ان پر بہت سے مضامین لکھے ہیں۔

غزل کے بارے میں آپ کے تاثرات جان کر میں بہت محظوظ ہوا۔ خود میں نے ۱۹۳۶ سے لے کر ۱۹۶۰ تک نظم نگاروں کی اور اس دوران غزل کے بارے میں میرے تاثرات بھی وہی تھے جو آپ کے ہیں۔ مگر پھر جب "اردو شاعری کا مزاج" لکھتے ہوئے مجھے غزل کی POETICS سے تعارف حاصل ہوا اور میں نے دیکھا کہ غزل انسانی بصیرت کے اس بُعد DIMENSION تک رسائی پا لیتی ہے جو نظم کا مقدر نہیں ہے۔ نیز اس میں شاعر کا COLLECTIVE SEELF اپنا اظہار کرتا ہے تو غزل کی طرف میری دلچسپی جاگ اٹھی۔ اور پھر میں نے بہت غور سے غزل کا مطالعہ کیا بلکہ خود بھی تقریباً ایک سو غزلیں لکھیں۔ مگر میرا اصل میدان نظم ہی رہا۔ میں آپ سے متفق ہوں کہ محض غزل کہہ کر ہم دنیا کی MAIN STREAM میں شامل نہیں ہو سکتے۔ غزل کا ایک اپنا LOCALE ہے اور ایک عجیب سی پراسراریت جو ہمارے ثقافتی ورثے سے اس بری طرح منسلک ہے کہ دوسری ثقافتوں والے اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے غزل کا دیگر زبانوں میں ترجمہ کرنا بھی بہت مشکل ہے۔ لہٰذا میں اپنے دوستوں سے یہی کہتا ہوں کہ اگر WORLD POETRY سے منسلک ہونا ہو تو نظم کہیں۔

غزل کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ بڑی مشکل سے اس میں اعلیٰ پائے کا زندہ رہنے والا شعر نکلتا ہے، لہٰذا رطب و یابس بہت ہوتا ہے۔ جس سے طبیعت متنفر ہوتی ہے مگر جو اچھا شعر برآمد ہوتا ہے وہ اس سب کی تلافی کر دیتا ہے۔

[بنام ستیہ پال آنند: ۲۷ نومبر ۱۹۹۶ء]

● **وزیر آغا** ۵۸۔ سول لائنز۔ سرگودھا (پاکستان)

بقیہ صفحہ ۱۸ ـ آبلہ

بڑی عجیب سچویشن تھی۔ گوپال اور گوکھلے کھڑے ہو گئے تھے۔ شاید ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ سبھی نشے میں تھے گوکھلے کہہ رہا تھا۔

"اے! ڈامورد! اشوک صاحب یہ کیا بچپنا ہے۔ ارے آپ لوگ رو رہے ہیں۔ رونے سے تھوڑے کام چلے گا۔ ہمیں پاگل جیسے لوگوں کو سبق سکھانا ہوگا۔ چلو۔ اٹھو۔ کھانا کھاتے ہیں۔ گوپال! چلو، بھابھی سے کھانا لگانے کو کہو۔"

گوپال چلا گیا۔ گوکھلے ہماری پشت پر آ کر کھڑا ہو گیا اور ہمارے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کے ہمیں تسلیاں دینے لگا۔ کبھی مجھے چپ کراتا، کبھی ودّھو کو سرزنش کرتا، اور ہم دونوں مسلسل روئے جا رہے تھے۔

مجھے لگ رہا تھا کیسے میرے دل پر کوئی بوجھ رکھا ہوا ان آنسوؤں میں دھیرے دھیرے دھلتا جا رہا ہے۔

رشید حسن خاں
ڈی ہی۔۹ گویر ہال، دہلی یونیورسٹی، دہلی ۱۱۰۰۰۷

ہندوستانی فارسی میں تلفظ اور املا کے بعض مسائل

(۲)

اگر جدید ایرانی لہجے کی کورانہ تقلید میں ایسے لفظوں کو (جن میں امالہ ہوا ہے مسلّط طور پر ایسے لفظوں میں یائے مجہول ہوتی ہے) یائے معروف کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں اشعار کے قوافی غلط خوانی کا شکار ہو کر رہ جائیں گے اور املا کا قاعدہ بھی بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ غالب کی رائے: لہجے کا تتبع بھانڈوں اور بہروپیوں کا کام ہے:۔ اب ہم اس بحث پر ایک اور پہلو سے روشنی ڈالتے ہیں۔ آغاز مضمون میں لکھا ہے کہ خسرو، بیدل، غالب اور اقبال جیسے ہندستانی شاعروں کے کلام کی تدوین کے ذیل میں مرتب کو اس مسئلے سے خاص طور پر دوچار ہونا پڑے گا۔ اس سلسلے میں مرزا غالب کے اقوال کو پیش کرنا افادیت سے خالی نہ ہوگا اور ضمناً یہ فائدہ بھی ہوگا کہ غالب کے فارسی کلام کی تدوین کے متعلق درست طریقۂ کار کا تعین ہو سکے گا۔

پُرانے اساتذہ میں سید انشا کے بعد مرزا غالب دوسرے شخص ہیں جن کی مختلف تحریروں میں قواعدِ زبان، طریقِ املا اور مباحثِ لغت سے متعلق بہت سی باتیں محفوظ ہیں۔ کچھ باتیں تو اس قدر اہم ہیں کہ اُس زمانے میں بھی اور ہمارے زمانے میں بھی وہ علمی بحثوں کا موضوع بنی ہیں۔ ایک بہت اہم مسئلہ جو مرزا صاحب کے سامنے تھا، وہ ہے لہجے اور قواعد کا فرق۔ ان کا کہنا تھا کہ اہلِ زبان کی تقلید قواعد میں ضروری ہے، مگر لہجے کا تتبع غیر مناسب ہے۔ یہ ایسا اہم مسئلہ ہے کہ اس پر پوری طرح توجہ کیے بغیر اور اس کے متعلقات کو پیشِ نظر رکھے بغیر، نہ صرف یہ کہ غالب کے فارسی کلام کی تدوین صحیح طور پر انجام نہیں پا سکتی، بلکہ دورِ اول سے آج تک ہندستان میں جس قدر فارسی ادب وجود میں آیا ہے، اس کی تصحیح و ترتیب بھی صحیح طور پر عمل میں نہیں آ سکتی۔

مرزا صاحب کی فارسی دوستی اور ایران پرستی سے سب واقف ہیں، وہ تو ہندستان کے لغت نویسوں تک کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور قابلِ استناد نہیں مانتے تھے؛ با ایں ہمہ، وہ قواعد اور لہجے کے فرق کو پوری طرح مانتے تھے اور لہجے کی تقلید کو اُنھوں نے "بھانڈ پن" کہا ہے۔ علائی کو ایک خط میں لکھا ہے:

> "صاحب بندہ! تحریر میں اساتذہ کا تتبع کرو، نہ مغل بچے کا۔ لہجے کا تتبع بھانڈوں کا کام ہے، نہ دبیروں اور شاعروں کا۔ ایسی تقلید کو میرا سلام۔" [خطوطِ غالب، مرتبۂ مہیش پرشاد، ص ۱۶۹]

یہی بات اُنھوں نے اپنے رسالے تیغِ تیز میں لکھی ہے، وہاں نونِ غنّہ زیرِ بحث ہے۔ معترض کے اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "اس ۱۸ اور ۱۹ صفحے میں جہاں "کندیدن" کو غلط بتاتے ہیں اور "ماند" و "خواند" کو بروزنِ "چاند" غلط بتاتے ہیں اور "تند" و "خند" کو بروزنِ "تند" و "کند" صحیح فرماتے ہیں۔۔۔۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللہ! اہلِ ایران اس کو سُنا دیتے ہیں، اور یہ لہجہ ہے، نہ قاعدہ۔ شاعر اور منشی کو تتبع قواعد کا چاہیے۔ لہجے کی تقلید بہروپیوں اور بھانڈوں کا کام ہے۔" [قاطع برہان و رسائلِ متعلقہ، مرتبۂ قاضی عبد الودود، ص ۲۷۰]۔

واضح بیان کے بعد اگر کوئی صاحب مثلاً غالب کے اس شعر میں:

> ہم وعدہ وہم منع ز بخشش، چہ حساب است
> جاں نیست، مکرّر نتواں داد شراب است

"جاں" اور "تواں" کو تلفظ وار نون کے ساتھ لکھیں اور جدید فارسی لہجے کے مطابق پڑھیں [جس میں بقول غالب الف کو گُسلا دیا جاتا ہے] تو اس طرز کو کیا کہا جائے گا؟ کیا یہ لہجے کی وہ تقلید نہیں ہوگی جسے اُنھوں نے بہروپیے اور بھانڈوں کا کام بتایا ہے!!

سیّد انشا کی راے لہجے کی تقلید کے متعلق :۔ سیّد انشا نے بھی دریاے لطافت میں مغل کے لہجے کی تقلید کا مذاق اُڑایا ہے اور اسے تمغل کہا ہے۔ مرزا صفدر الدین صفاہانی اور مولوی عبد الفرقان ہندستانی کی گفتگو جہاں لکھی ہے، وہاں مولوی صاحب کے ایسے متعدد لفظوں کو بہ طورِ مثال لکھا ہے، مثلاً یہ کہ مرزا صاحب نے "شما" کو "شمو" تمغل کی وجہ سے کہا۔ یا "ایشاں" کے بجاے "ایشوں" "مغلیت کے غلیان" کی وجہ سے۔

لہجے کی تقلید سے متعلق محمد شاہ کے دربار کا ایک واقعہ :۔ ہندستان میں اس جدید ایرانی تلفظ کو کبھی پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ انشا کا قول آپ ابھی پڑھ چکے ہیں اور غالب کی راے بھی آپ کے سامنے آچکی ہے۔ مزید وضاحت کے لیے میں اس سلسلے میں ایک حوالہ اور پیش کرنا چاہوں گا۔ میر تقی میر نے اپنی کتاب ذکرِ میر میں کچھ لطیفے بھی لکھے ہیں۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم نے اُن میں سے کچھ لطیفوں کے اُردو ترجمے ایک مضمون کی صورت میں پیش کیے تھے۔ [یہ مضمون مرحوم کے مجموعۂ مضامین نگارشاتِ ادیب میں شامل ہے] ان میں سے ایک لطیفہ یہ ہے :

"عراقیوں کے لہجے میں، ہر الف کو، جس کے بعد نون آتا ہے، واو سے بدل دیتے ہیں۔ صفدر محمد خاں عراقی ایک دن محمد شاہ کے مجرے کو گیا۔ بادشاہ نے اس خیال سے کہ اس قسم کے بعض الفاظ عراقیوں کے لہجے میں قباحت پیدا کرتے ہیں، اُس کو مخاطب کر کے شیخ سعدی کا یہ مصرع پڑھا :

اے مرغِ سحر عشق ز پروانہ بیاموز

خانِ مذکور فوراً بات کی تہ کو پہنچ گیا اور بولا : جی ہاں، کون سوختہ را جون شد و آواز نیامد"۔

ڈاکٹر نیر مسعود رضوی نے مجھے بتایا کہ تہران میں اُنھوں نے بعض غیر تہرانی ایرانیوں کی زبان سے یہ مصرع سُنا تھا :

زبانِ مردمِ تہراں زبون است

اور یہ وہی بات ہے جو صفدر محمد خاں عراقی کے لطیفے میں ہے۔ جس طرح "وہاں" "کاں" [جو کہ "آں" کا مخفف ہے] لہجے کے پھیر میں "کون" بن گیا (ایک فحش لفظ ہے) اُسی طرح "زبان" "زبون" بن گیا اور معنی ہی بدل گئے [اور طنز کا حق بھی ادا ہو گیا]۔

یہ بات ہمارے ذہن میں رہنا چاہیے کہ ایرانیوں کے لیے یہ مسئلہ صرف تلفظ کا ہے، جس کا تعلق لہجے سے ہے؛ یعنی وہ "کاں" کو "کون" تو کہیں گے، مگر اسے "کون" لکھیں گے نہیں، اور مثلاً "چوں" کا قافیہ بھی نہیں بنائیں گے؛ مگر ہمارے لیے یہ مسئلہ تلفظ کا بھی ہے اور کتابت کا بھی، اس بنا پر کہ ہم اب آخرِ لفظ میں واقع یاے معروف و مجہول اور نونِ غنہ کی کتابت میں اختلافِ صورت کے امتیاز کو ملحوظ رکھتے ہیں، اور تلفظ اسی طرح کتابت کے مطابق کرتے ہیں۔

غالب کی صراحت یاے مجہول اور واوِ مجہول کے بارے میں :۔ مرزا غالب نے کئی خطوں میں اور اپنی کتاب پنج آہنگ میں جگہ جگہ یہ صراحت کی ہے کہ فلاں لفظ میں یاے معروف ہے اور فلاں لفظ میں یاے مجہول ہے۔ اسی طرح واوِ معروف اور واوِ مجہول کی بھی صراحت کی ہے۔ مثلاً چودھری عبد الغفور سرور کو ایک خط میں سمجھایا ہے کہ "گفتے" اور "گفتی" میں کیا فرق ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ "گفتی" یہ یاے معروف صیغۂ واحد حاضر ہے۔ اُنھی کو ایک اور خط میں لکھا ہے :

"اے کریمے کہ از خزانۂ غیب، ہرگز یاے معروف نہیں ہے، یاے مجہول ہے۔ یاے معروف یہاں نامعقول ہے۔ خدائے کہ بالا و پست آفرید، ایسا خدا، ایسا کریم، اس تحتانی کو یاے وحدت کہو، یاے توصیف کہو، یاے تعظیم کہو، جس طرح کہو، یاے مجہول آئے گی"۔

ایک اور جگہ لکھا ہے : "شدے، بیاے مجہول، بمعنیِ میشد" [فرہنگِ غالب، ص ۱۵۵]۔ تفتہ کو ایک خط میں لکھا ہے کہ یاے مصدری معروف ہوتی ہے اور مثال میں لفظ "آشنائی" لکھا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ یاے توحید و تنکیر مجہول ہوگی اور مثال میں "آشنائے" لکھا یعنی ایک آشنا یا کوئی آشنا لکھا ہے۔ لفظ "نویں" کے متعلق لکھا ہے : "بہ نونِ مفتوح و یاے مجہول" [فرہنگِ غالب، ص ۲۴۰]۔ لفظ "کشکول" کے متعلق یوں صراحت کی ہے : "بہ کافِ مفتوح و واوِ مجہول" [ایضاً، ص ۲۰۱]۔ غرض کہ غالب کی تحریروں سے ایسی بہت سی صراحتیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جب مرزا غالب وضاحت کے ساتھ یہ لکھتے ہیں کہ یاے وحدت / یاے تنکیر / یاے تعظیم / یاے توصیف مجہول ہوتی ہے تو پھر مزید وضاحت

تے ہیں کہ "سے کہتے ہیں" ہرگز یاے معروف نہیں ہے، یاے مجہول ہے" اور اس پر اکتفا نہ کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں کہ "یاے معروف یہاں نامقبول ہے" اتنی صحت کے ہوتے ہوئے اور اس قدر تکرار اور اصرار کے باوجود اگر کوئی صاحب غالب کے کلام میں یاے وحدت یا یاے تنکیر (وغیرہ) کو جدید فارسی لہجے کے تتبع میں معروف پڑھیں اور اسی طرح لکھیں بھی، مثلاً مرزا صاحب کے اس مطلع کو :

اے ز وہم غیر غوغاے در جہاں انداختہ   گفتہ خود حرفے و خود را در گماں انداختہ

یوں لکھیں :

ای ز وہم غیر غوغاے در جہاں انداختہ   گفتہ خود حرفی و خود را در گماں انداختہ

اور پڑھیں بھی جدید ایرانی لہجے میں، یعنی "ای" اور "حرفی" اور اسی طرح "جہاں" اور "گماں" کے نونِ غنہ کو مرحوم بنا کر (بہ قول غالب) الف کو مُلا دیں نونِ بے نقطہ کو نونِ نقطہ دار میں تبدیل کر دیں، اسی طرح "انداختہ" اور "گفتہ" کو (جن میں ت پر زبر ہے) "انداختِہ" اور "گفتِہ" (ت کے زیر کے ساتھ) ، تو غالب کی روح کیا کہے گی! کیا یہ منشاے مصنف کے خلاف نہیں ہوگا؟ اور کیا اصولِ تدوین کے تحت منشاے مصنف کے خلاف اُس کے کلام کو پیش کرنا مستحسن ہوگا؟ مرزا صاحب نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے، اُس سے اُن کا نقطۂ نظر اچھی طرح اور پورے طور پر سامنے آجاتا ہے اور یہ نقطۂ نظر ہے جسے یہاں کے سارے لغت نویس اور قواعد نگار متفقہ طور پر مانتے آئے ہیں۔ اس صورت میں آج اگر مرزا صاحب کے فارسی کلام نظم و نثر کو مرتب کیا جائے تو لازم ہوگا کہ کلامِ غالب کو، یہاں کے مسلّمہ رواج اور خود غالب کے واضح کردہ قاعدوں کے مطابق اور طریقِ نگارش کے مطابق مرتب کیا جائے اور اُسے پڑھا بھی جائے اُسی طرح۔ اگر لکھنے میں یا پڑھنے میں تلفظ اور املا سے متعلق اِن امور کو ملحوظ نہیں رکھا جائے گا تو اُس کو قابلِ قبول نہیں قرار دیا جا سکتا۔

مرزا صاحب نے قاطعِ برہان میں لکھا ہے :

"مدہوش لغتِ عربی الاصل است، مفعولِ دہشت، و ہیچ صیغۂ مفعول در عربی بہ واوِ مجہول نیست، پارسیاں تصرف کردہ بہ واوِ مجہول، مرادفِ مست و مخمور می آرند" [ایضاً ۲۱]

اب اگر کوئی شخص غالب کے کلام میں اس لفظ کو بہ واوِ معروف (مدہوش) پڑھے، تو غالب کی جو تحریر اس لفظ کے متعلق اوپر نقل کی گئی ہے کیا وہ بے معنی نہیں ہو جائے گی؟

لفظِ شکوہ (بہ کسرِ شین) کے متعلق مرزا صاحب نے لکھا ہے :

"شکوہ بہ ضمِ شین زنہار نیست، ہماں بہ کسرۂ شین و ضمۂ کاف و واوِ مجہول اسمِ جامد است" [ایضاً ۹۶]

اسے بہ واوِ مجہول پڑھنے کے بجائے بہ واوِ معروف "شُکوہ" کہنا کیسے جائز ہوگا؟ کوئی صاحب جدید ایرانی لہجے کی تقلید میں اسے بہ واوِ معروف ادا کریں، تو کورانہ تقلید کا حق تو ادا ہو جائے گا، مگر غالب کی تحریر کردہ عبارت بے معنی بنا دینے کے بھی وہ ذمّے دار ہوں گے اور غالب کی حُجت کی ہوا نکلنے پر بھی صادق آئے گی۔

کلامِ غالب کے سلسلے میں بے ضابطگی کی دو مثالیں : اوپر جو تفصیلات لکھی گئی ہیں، اُن کی ضرورت خاص کر یوں محسوس کی گئی کہ ہمارے سلسلے میں اچھا خاصا خلفشار پایا جاتا ہے۔ اس موضوع کے متعلقات پوری طرح پیشِ نظر نہ ہونے سے تدوین کے اصولوں کی بھی خلاف ورزی ہوتی رہتی ہے اور متن بھی صحیح طور پر نقل نہیں ہو پاتے؛ یعنی متن اُس طرح سامنے آتا ہے جو منشاے مصنف سے مطابقت نہیں رکھتا۔ میں ایک مثال سے اس کی مزید وضاحت کرنا چاہوں گا۔

غالب صدی کے موقع پر غالب کا کلیاتِ فارسی مکتبۂ میری لائبریری، لاہور سے شائع ہوا تھا، اس کے مرتب تھے ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی۔ اس میں ایک شعر اس طرح چھپا ہے :

نمی جنبیم در عالم ز نشئۂ کاسہ سامان ما   چو نور از چشمِ نابینا نہ ساغر رفت صہبا را

نگہ نازندہ را چندیں، دلی بستان و جانی ہم   دماغِ نازکی من برنمی تابد تقاضا را

ان دو شعروں میں سب سے پہلی بات تو یہ سامنے آتی ہے کہ ایک جگہ "نشاط" (بہ یائے مجہول) ہے اور دو مقامات پر "دلی" اور "جانی" (بہ یائے معروف) ہیں، اور یہ دو رنگی کسی طرح ٹھیک نہیں۔ فرمودۂ غالب (نیز مسلّمہ قاعدے کے مطابق) تینوں لفظوں کو مع یائے مجہول [نشاطے، دلے، جانے] ہونا چاہیے تھا۔

دوسری بات یہ کہ "آسمان" اور "چندیں" ان دونوں لفظوں کو مع نونِ نقطہ دار لکھا گیا ہے [جن لفظوں کے آخر میں نونِ غنہ آنا چاہیے، اس نسخے میں وہ ہر جگہ مع نونِ نقطہ دار ملتے ہیں] اور یہ بھی درست نہیں۔ اس سلسلے میں غالب کا قول نقل کیا جا چکا ہے: "کاسماں" اور "چندیں" لکھا جانا چاہیے تھا۔ مرتّبِ مذکور ہی کا ترتیب دیا ہوا غالب کا کلیاتِ فارسی، پنجاب یونی ورسٹی (لاہور) کی طرف سے اُسی زمانے میں شائع ہوا تھا، اُس کے نسخے میں یہی دونوں اشعار اس طرح ملتے ہیں:

نمی بینیم در دو عالم نشاطی کاسمان ما را   چو نور از چشمِ نابینا ز ساغر رفت صہبا را
مکن نازد ادا چندیں دلی بستان و جانی کم   دماغِ نازکِ من بر نمی تابد تقاضا را

یہاں اس سے پہلے نسخے کے اندراج سے بالکل مختلف صورت سامنے آتی ہے۔ وہاں "نشاطے" ہے، مگر اِس نسخے میں "نشاطی" ہے اور اُس اشاعت میں "دلے" اور "جانے" ہے اور اِس میں "دلی" اور "جانی" ہے۔ البتہ نون دونوں نسخوں کے دونوں لفظوں میں نقطہ دار ہے۔

اِن دونوں نسخوں میں چوتھے مصرعے میں "بر نمی تابد" ہے، حالاں کہ اسے (اگر منفصل لکھا جائے تو) "بر نمے تابد" (مع یائے مجہول) لکھا جانا چاہیے تھا۔ "بر نمی تابد" صریحاً فرمودۂ غالب کے خلاف ہے۔ غالب نے لکھا ہے:

"ہرگاہ خواہند کہ ماضیِ استمراری سازند، میم و تحتانیِ مجہول تنہا ما قبلِ صیغۂ ماضی آرند، چنانکہ رفت ماضی، و مے رفت ماضیِ استمراری۔ ہم چنیں تحتانیِ مجہول تنہا در آخرِ صیغۂ ماضی ہماں کارے کند کہ میم و یای مجہول در اوّل۔ و ہمیں میم و تحتانیِ مجہول است کہ ماقبلِ صیغۂ ماضی معنیِ تمنّا و شرط دہد۔۔۔۔۔ دیگر ایں میم و تحتانیِ مجہول در اوّلِ صیغۂ مضارع افادۂ معنیِ دوام در استقبال مے کند" [فرہنگِ غالب، ص ۲۳۵]

اس واضح قول کی روشنی میں مذکورۂ بالا جملہ افعال میں کلامِ غالب میں "مے" لکھا جائے گا، جیسے: مے رفت، مے کرد، رفتے، کردے، می رود، مے گوید (وغیرہ) [اگر دونوں لفظوں کو الگ الگ لکھا جائے، جیسے: "مے تابد"۔ اگر ملا کر لکھا جائے، جیسے: "میتابد" تو تلفظ میں یائے مجہول کو برقرار رکھا جائے گا، یعنی پڑھنے میں "مے تابد" ہی آئے گا]۔

ایک بار پھر اس کی وضاحت کر دی جائے کہ غالب کی تخصیص نہیں، غزنوی دور سے اب تک جس قدر فارسی ادب یہاں وجود میں آیا ہے، وہ نظم ہو یا نثر، لازم ہے کہ اُس کو اُسی طرح ضبطِ تحریر میں لایا جائے جس طرح وہ لکھا گیا تھا، یعنی یائے معروف و مجہول، واوِ معروف و مجہول اور نونِ غنہ کی آوازوں کے امتیاز کو پوری طرح ملحوظ رکھا جائے اور اُسے پڑھا بھی جائے اسی مطابقت کے ساتھ۔ یہ سارے قاعدے اُن کتابوں میں محفوظ ہیں جو لغت، قواعدِ زبان اور علمِ قافیہ کے موضوع پر یہاں لکھی گئی ہیں۔

جو لوگ آج اس پر اصرار کرتے ہیں کہ خسرو سے لے کر اقبال تک کے کلام کو جدید ایرانی لہجے میں پڑھا جائے اور اُسی کے مطابق لکھا جائے، وہ لوگ غالباً زبان کی تاریخ سے کم آشنا ہیں اور اس سلسلے میں اب تک ایران اور ہندستان میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اُس کو بھی یا تو اُنھوں نے پڑھا ہی نہیں، یا توجہ کے ساتھ نہیں پڑھا۔ یہ بات ہمارے ذہن میں رہنا چاہیے کہ ہندستان میں فارسی تہران کے راستے سے نہیں آئی تھی، ماوراءالنہر اور خراسان کے راستے سے آئی تھی اور اِن دونوں علاقوں کا لہجہ معروف و مجہول آوازوں کے لحاظ سے وہی تھا جو ہندستان کا تھا۔ خاص کر خراسان میں (جو زبان و ادب کا اوّلین مرکز تھا) مجہول آوازیں موجود تھیں۔ جب فارسی زبان ہندستان میں آئی تو اِن آوازوں کو ساتھ لے کر آئی اور حُسنِ اتفاق سے یہ آوازیں یہاں پہلے ہی سے موجود تھیں اور یوں اس حد تک لہجے کی یکسانی نے اِن آوازوں کو فارسی زبان کا جُز بنائے رکھا۔

ایران میں سیاسی حالات نے (خاص کر حملۂ مغول نے) پہلے خراسان سے مرکزیت چھینی اور اُسے پہلے شیراز کے اور پھر اصفہان کے حوالے کیا اور آخر یہ شرف تہران کے حصے میں آیا۔ سیاسی مرکزیت کے خاتمے نے ادبی مرکزیت کا شرف بھی خراسان سے چھین لیا تھا، یوں خراسانی لہجہ اپنے آپ کو برقرار نہیں رکھ

اور دیگر مختلف حالات کے اثر سے بھی رفتہ رفتہ مجہول اور مخفی آوازیں تحلیل ہونے لگیں، لیکن کم از کم عہدِ سعدی تک شیرازی لہجے میں مجہول آوازیں موجود تھیں (سبک شناسی)۔ یہاں تک کہ تہران کی سیاسی مرکزیت نے اُسے ادبی مرکزیت بھی عطا کر دی اور یوں تہرانی لہجہ معیار اور مثال کے طور پر چھا گیا۔ مگر ہندوستان میں ایسی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی جو ایران کی طرح لہجے پر اثر انداز ہوتی۔ یہاں وہی لہجہ برقرار رہا جو غزنوی اور خلجی دور میں تھا۔

ایران میں چھاپی گئی ہندوستانی کتابیں :۔ اب میں اس بحث کے ایک اور پہلو کی طرف توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں۔ ہندوستانی تہذیب اور فارسی زبان و ادب سے متعلق ہندوستانی مصنفین کی بہت سی کتابیں ایران میں شائع کی گئی ہیں۔ جو کتابیں وہاں چھپی ہیں، اُن میں مکمل طور پر جدید ایرانی تلفظ، املا اور لہجے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور اس طرح بہت ہی عجیب صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے۔ یعنی اصل کتاب میں جو تصریحات ہیں، کتاب کی نئی ترتیب و تصحیح میں اُن کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اس طرح جو متن سامنے آتا ہے، وہ صریحاً مرادِ مصنف اور منشائے مصنف کے خلاف ہوتا ہے۔ میں اس سلسلے میں صرف ایک کتاب سے محض دو اندراجات بطور مثال پیش کروں گا، انہی سے صورتِ حال کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ایران کے مشہور اشاعتی ادارے بنیادِ فرہنگ نے ایک قابلِ قدر کتاب تحفۃ الہند بھی شائع کی ہے۔ یہ کتاب ہندوستان میں عہدِ اورنگ زیب عالم گیر میں لکھی گئی تھی۔ مصنف نے ہندی عروض (پنگل)، ہندوستانی سنگیت، سنگار رس، النکار جیسے اہم، کارآمد اور دلچسپ موضوعات پر مفصل بحث کی ہے۔ اس کتاب کے مقدمے میں دراصل کتاب حوالہ کی ہے۔ ہندی کے خاص حروف ٹ، ڈ، ڑ فارسی زبان میں موجود نہیں، ہائے مخلوط (ھ) بھی فارسی میں نہیں، جب کہ اس کتاب میں ایسے بے شمار الفاظ آئے ہیں جن میں یہ حروف موجود ہیں۔ اُن لفظوں کو اگر مصنف کی صراحت کے مطابق نہ لکھا جائے تو اُن کی شکل بدل جائے گی، بل کہ بگڑ جائے گی۔ مثلاً اس کتاب میں مقدمے پر یہ عبارت ملتی ہے :

"و ت کہ در لفظ توپ بمعنی کلاہ واقع شدہ، آنرا بتای فوقانی منقلہ ثبت نمودم۔ و حرف تہ کہ در لفظ ٹھگ بمعنی عیار واقع شدہ، آنرا تای فوقانی اثقل مرقوم ساختم"۔

میں نے عبارت اُسی طرح نقل کی ہے جس طرح وہ چھپی ہوئی ہے۔ پہلے جملے میں مصنف نے تو یہ لکھا ہے کہ ٹ جو لفظ ٹوپ میں آئی ہے، اُس کو میں "تاے فوقانی" بمعنی ٹ کے ساتھ لکھا ہے، مگر مرتب نے یہ لکھ کر کہ "ت کہ در لفظ توپ واقع شدہ" بات ہی کو بدل دیا ہے۔ مصنف کی عبارت بدل گئی ہے۔ مصنف نے "ٹوپ" لکھا ہے، "توپ" نہیں، اور اُس نے ٹ کا ذکر کیا ہے، ت کا نہیں۔ "ٹوپ" اور "توپ" بالکل مختلف لفظ ہیں، لیکن اس عبارت میں وہ ایک بن گئے ہیں۔ اسی طرح مرادِ مصنف "ٹھگ" ہے، "تھگ" نہیں۔ "تھگ" تو بے معنی لفظ ہے۔

یا مثلاً یہ عبارت :

"و حرف دال کہ در لفظ ڈر بمعنی خوف و ترس واقع شدہ آنرا دال اثقل ثبت کردم و حرف دہ کہ در لفظ ڈھول بمعنی دہل واقع شدہ آنرا دال اثقل ضبط نمودم"۔

"در" اور "دھول" دونوں شکلیں مرادِ مصنف کے خلاف صرفِ ظہور میں آئی ہیں۔ مصنف کی مراد "ڈر" اور "ڈھول" سے ہے۔ "دھول" کے معنی "ڈھول" اور "در" کے معنی "ڈر" ہو ہی نہیں سکتے۔ "ڈر" کو "در" اور "ڈھول" کو "دھول" لکھا جائے گا تو یہ عمل لفظ کی صورت کو بدل دینے کے مترادف ہوگا اور اصولِ تدوین کی کھلی ہوئی خلاف ورزی ہوگی۔

اصولاً ایسے جملہ مقامات پر لفظ کو اصل زبان کے مطابق لکھا جانا چاہیے۔ ایسی کتابیں ہندوستان، پاکستان، ایران، افغانستان، سبھی ملکوں کے پڑھنے والوں کے لیے ہوتی ہیں۔ ایرانی اُن کو اپنے لہجے کے مطابق پڑھے گا اور ہند و پاک کے لوگ اپنے لہجے کے مطابق پڑھیں گے۔ محض ایرانی لہجے کی بنا پر ہندوستانی الفاظ کی صورتیں کیوں بگاڑی جائیں۔ لہجہ اور املا دو مختلف چیزیں ہیں۔ لفظ کا املا صحیح طور پر لکھا جانا چاہیے اور اسے پڑھنے والے کے لیے چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ اپنے لہجے کے مطابق اُسے کس طرح پڑھتا ہے۔ ناشر کو اس کا حق نہیں پہنچتا اور نہ مرتب کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مصنف کے نقوش کو بدل دے اور بگاڑ دے۔ یہی بات ہے کہ شمالی ہند والے کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی زبان کے لفظوں کا املا محض اس بنا پر بدل دے کہ شمالی ہند والے اُن لفظوں کو مختلف طریقے سے بولتے ہیں۔

اس سلسلے میں ہمیں مستشرقین کے طریقِ کار کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ مثال کے طور پر آپ پلیٹس کی اردو ہندی ڈکشنری کو دیکھیے، ہر حرف کا تعین ملے

تھا۔ جو پڑھنے والا خاص آواز کو ادا نہیں کر سکتا، وہ نہ کرے، ذرا بھی مضائقہ نہیں، مگر لفظ کی صورت کیوں بدلے۔

مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم جدید ایرانی تلفظ سے بے جا طور پر مرعوب ہو کر رہ گئے ہیں، مثلاً ایک سیدھا سا لفظ "شگلا" ہے، جو بعض ہندستانی ناموں کے ساتھ کلاً نسبت کے طور پر آتا ہے (جیسے: رام چند شگلا) اسے "شوکلا" لکھنا محض ستم ظریفی ہے۔ اگر ایران والے "شُنبہ"، "شنبہ"، "شذرہ"، "شفقت"، "شمرہ" جیسے لفظوں کو بہ خوبی ادا کر سکتے ہیں اور ادا کرتے ہیں اور لکھتے بھی اسی طرح ہیں، تو پھر اس سادہ سے لفظ "شگلا" نے مثلاً کیا گناہ کیا ہے۔

فارسی کا ہندستانی لہجہ کلاسکی لہجہ ہے: ۔ اس بحث میں ایک اور اہم بات ایسی ہے جسے ضرور پیشِ نظر رہنا چاہیے۔ ہندستان میں فارسی زبان کو غیر ملکی زبان کے طور پر نہیں، بل کہ اپنی تہذیبی اور علمی زبان کے طور پر پڑھا جاتا تھا۔ کوئی بھی زبان بولی جاتی ہو، مگر علمی اور تہذیبی حیثیت فارسی زبان کو حاصل تھی۔ جس زمانے میں بہ قولِ بہار ایران میں درباری زبان کے طور پر ترکی زبان کو افضلیت حاصل ہو گئی تھی، اُس زمانے میں بھی ہندستان میں درباری اور سرکاری زبان فارسی تھی۔ اسی طرح لغت اور قواعد کی کتابیں یہاں اُس زمانے میں بھی لکھی جا رہی تھیں۔ جب ایران میں یہ دونوں موضوع کم رواجی اور بے التفاتی کے مارے ہوئے تھے۔ ایران کے اہلِ نظر نے اس صورتِ حال کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔ بہار نے صفوی دور میں فارسی زبان کے تنزل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"یک حقیقت را باید اعتراف کرد کہ پایۂ معلومات ہم درین زمان تنزل یافتہ بود۔ زبانِ فارسی بہ سببِ طولِ زمان و عدمِ تتبع و از یاد رفتنِ لغاتِ دری محتاج بہ تحصیل بود، ولی تحصیل نمی شد۔ و کتاب ہم کم بود..... امّا اہالیِ ہندوستان بہتر بودند، چہ پایۂ زبانِ آن قوم از اصل خراسان است، معذالک از قدیم در تحصیلِ قواعدِ حروف و اصوات.... سعی داشتہ و فارسی را بدرس میخواندند" [سبک شناسی، سوم، ص ۲۸۹]

مصنف نے اسی سلسلے میں یہ بھی لکھا ہے:

"در دہلی دربارِ بزرگتری تشکیل شد، کہ باید آنرا دربارِ ثانیِ ایران نامید، بلکہ دربارِ اصلیِ ایران۔ چہ رواجِ زبانِ فارسی و ادبیات و علوم در دربارِ دہلی زیادہ از دربارِ اصفہان بودہ است۔ و شکی نیست کہ در دربارِ اصفہان پادشاہ و خاصانِ درگاہ بزبانِ ترکی صحبت میفرمودہ اند، ولی در دربارِ دہلی شاہ و دربار و حرم سرائیان ہمہ بفارسی گفتگو میکردہ اند، و در آن عہد زبانِ فارسی در ہند زبانِ علمی و زبانِ مترقی و دلیلِ شرافت و فضل و عزت محسوب میشد، و در دربارِ اصفہان ہرگز زبانِ فارسی این اہمیت را پیدا نکرد" [سبک شناسی، جلد سوم، ص ۲۵۸]

امیر خسرو کی رائے: ۔ اس بحث میں امیر خسرو کی ایک عبارت بھی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ امیر نے اپنے دیوان غرۃ الکمال کے دیباچے میں زبانِ ماوراء النہر کو زبانِ خراسان پر ترجیح دی، مگر اصل بات یہ لکھی ہے کہ ہندستانی فارسی دراصل "فارسی دری" ہے، یعنی اصل فارسی ہے اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ "ادائے زبان با نقشِ کتابت" مطابق ہے، لکھتے ہیں:

"و اگر زبانِ پارسیست کہ از پارسیان رسیدہ است، جز بعبارتِ ماوراء النہر کہ موافق است با پارسیِ ہندوستان، دیگر ہیچ عبارتے را درستیِ لفظ نیست، زیرا کہ خراسانی "چہ" را "چی" میگویند و بعضے "کجا" را "کجو" میگویند و در کتاب "چہ" نویسند نہ "چی" و "کجا" نویسند نہ "کجو"۔ و لفظِ درست آنست کہ در کتابت آید..... امّا گفتارِ پارسی در ہندوستان از لبِ آبِ سند تا محیطِ دہانۂ دریا یک زبان است..... این پارسی پارسیِ دریست... پارسی درین چہار ہزار و اند فرسنگ یکیست و پارسیست کہ ادای زبان با نقشِ کتابت موافق و مطابق است"

خسرو کی اس عبارت کے سلسلے میں یہ بات ہمارے پیشِ نظر ضرور رہنا چاہیے کہ وہ خود ترک تھے اور یہ بھی کہ خلجی، غوری، تغلق تمام ہندستان کے یہ سبھی حکم راں خاندان قومی یا ترک تھے۔ ہندستان میں وسطی ایران کا اثر ہمایوں کی واپسیِ ایران کے زمانے سے شروع ہوتا ہے، اُسی وقت وہاں وسطی ایران یعنی شیراز و اصفہان کو اہمیت حاصل تھی، مگر شیرازی لہجہ دورِ اوّل میں معیاری نہیں سمجھا جاتا تھا (سبک شناسی)، ہندستان میں یہ ہر طور فارسی مشرقی ایران سے آئی تھی اور اپنے لہجے کو ساتھ لے کر آئی تھی، یہ لہجہ ہندستانی لہجے سے مطابقت رکھتا تھا [illegible]

لہجے کو اصل حیثیت حاصل رہی ہے۔

مولانا عرشی (مرحوم) نے اپنے محولۂ بالا مقالے میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

" اہلِ ہند کا لہجۂ فارسی کلاسکی ہے اور ایران، افغانستان، ماوراء النہر، کردستان اور ترکی سب کا مسکوک ہے، نیز یہ ساتویں صدی سے آج تک فنی حیثیت رکھتا ہے؛ اس لیے قواعدِ فارسی کی ساری کتابوں میں، خواہ وہ ایران میں لکھی گئی ہوں یا کہیں اور، اسی لہجے کو معیاری قرار دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران کے تازہ مؤلف اس کے خلاف لکھتے ہیں۔ تو یہ ضرور بتا دیتے ہیں کہ اب یوں بولتے ہیں، یا فلاں جگہ کا یہ لہجہ ہے جو ہم لکھ رہے ہیں۔ ہندیوں نے اب تک اس کے خلاف نہیں لکھا ہے، لہٰذا امیر خسرو یا کسی دوسرے ہندستانی شاعر کے یہاں ایرانی لہجے کی تلاش غلط ہے"۔

کلاسکی ایرانی شاعروں کے کلام کی تدوین: ہندستانی شاعروں کی طرح ایران کے کلاسکی شاعروں کا لہجہ بھی یہی تھا، اسی بنا پر یہ بھی فرض ہے کہ فردوسی، سعدی، رومی، حافظ، اور سنائی و عطار جیسے کلاسکی فارسی شعرا کے کلام کو بھی پرانے لہجے، یا یوں کہیے کہ کلاسکی لہجے کے مطابق ہمیں پڑھنا چاہیے اور لکھنا بھی اسی کے مطابق، اس کے خلاف نہ کیا جائے۔ مثلاً سعدی کے کلام میں اگر یائے مجہول کو یائے معروف سے بدل دیا جائے گا (پڑھنے میں یا لکھنے میں) تو تدوین کے نقطۂ نظر سے اسے تحریف قرار دیا جائے گا اور لہجہ بگڑنے کا سوا الگ، کلاسکی فارسی اشعار جدید ایرانی لہجے میں سن کر، بے ساختہ آتش کا یہ مصرع یاد آجاتا ہے:

زباں بگڑی تو بگڑی تھی، خبر لیجے دہن بگڑا

مولانا عرشی کے الفاظ میں اس بات کو دُہرایا جاتا ہے کہ "اہلِ ہند کا لہجہ کلاسکی اور باقاعدہ ہے اور ایرانیوں کا تلفظ نیا، جو کسی خاص علاقے سے نکل کر، سیاسی یا ادبی اثرات کے تحت عمومی حیثیت اختیار کر گیا ہے؛ اس لیے اہلِ علم کے لیے ضروری ہے کہ کلاسکی شعرائے فارسی کے کلام کو قدیم لہجے کی روشنی میں دیکھیں اور اُن کے قوافی وغیرہ کو جدید لہجے کے مطابق پڑھنے سے احتراز کریں" (ایضاً)۔

یہ سب مسائل ہماری خصوصی توجہ کے متقاضی ہیں، خاص کر تدوین کے نقطۂ نظر سے۔ جو لوگ پرانے متنوں کی ترتیب و تصحیح کی ذمّے داری قبول کرتے ہیں، اُن کے لیے لازم ہے کہ وہ اِن سب مسائل سے کما حقّہٗ واقفیت رکھتے ہوں اور اِن کے متعلقات سے آشنا نہ ہوں۔ یہ بھی واضح کر دوں کہ یہ جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا تعلق تدوین کے مسائل سے ہے اور یہی لوگ اس تحریر کے اصل مخاطب ہیں۔ اِس تحریر کو اسی روشنی میں دیکھنا چاہیے، ایران جانے کے لیے جو لوگ سرٹی فکٹ کورس کے طور پر جدید فارسی پڑھتے ہیں، یا دوسرے طلبہ جو جدید ایرانی زبان و ادب پڑھتے ہیں، وہ اس تحریر کے مخاطب نہیں، وہ بالکل مختلف مسئلہ ہے۔

بقیہ صفحہ ۲۲ بنگالی مارکیٹ کی مٹھائی

بقیہ صفحہ ۲۲

رکھ دیا تھا۔

ایک دن سلونی دوڑی دوڑی میرے پاس آئی۔ وہ کافی گھبرائی ہوئی تھی

اُس نے کانپتے ہوئے کہا "وہ آ رہے ہیں"؟

"وہ کون؟" میں نے تعجب سے پوچھا

"پرشانت موہن جی"

وہ جیسے آئی ویسے ہی بھاگتی چلی گئی۔ وہ نظر سے اوجھل ہو رہی تھی کہ پرشانت موہن جی آ دھمکے۔

ان کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پہ بوندیں ابھر آئی تھیں کپڑے پسینے سے تر ہو کر جسم سے چپک گئے تھے ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کے گھر میں آگ لگ گئی ہو۔ اور وہ اس سے بچنے کے لیے ادھر ادھر بھاگ رہے ہوں۔

"سلونی کو دیکھا تم نے؟" انہوں نے جذباتی لہجے میں پوچھا۔

"پرشانت موہن جی..."

قطع کلام کرتے ہوئے وہ بولے "تم نے پڑھا نہیں پیپر میں کہ گرمی کی وجہ سے دلی انتظامیہ نے کل سے مٹھائی پر پابندی لگا دی ہے"

میں نے پرشانت موہن جی کی جانب دیکھا۔ وہ تھر تھر کانپ رہے تھے جیسے زندگی کے باقی ماندہ لمحات ان کے ہاتھوں سے پھسل رہے ہیں اور کل آنے والا نہ ہو۔ "کہاں ہے سلونی؟" انہوں نے زور دیتے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں نے اُن کے سیاہ ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھا اور مجھے ... نظر آ گیا۔

سلام بن رزاق

۱/۱۷۹، ایم۔ آئی۔ جی۔ کالونی، کرلا ویسٹ بمبئی ۰۰

آبلہ

(۲)

"آں۔ ہاں۔"

"یار! یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی زندگی میں اس سے زیادہ دلکش منظر دیکھا ہو۔"

"تو چاہے تو ہمیشہ کے لئے اس منظر کا ایک حصہ بن سکتا ہے۔"

"کاش ایسا ہو۔"

"تو فارم کے لئے زمین خریدنا چاہتا ہے نا۔"

"ہاں۔"

"یہ سامنے والا پلاٹ کیسا رہے گا فارم کیلئے؟"

"پلاٹ تو اچھا ہے۔"

"اس پلاٹ کے دائیں طرف جھاڑیوں کے پیچھے سے ایک چھوٹا سا نالا بھی گذرتا ہے پانی کی بھی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"مگر یہ زمین کتنے کی ہوگی؟"

"تیرا بجٹ کتنا ہے؟"

"پچیس تیس ہزار ہیں میرے پاس۔"

"زمین پچاس ہزار کی ہے۔ تو فی الحال تیس ہزار دے دے۔ باقی روپے قسطوں میں ادا کرنا ہوگا۔"

"قسطوں میں؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔ "زمین کس کی ہے؟"

دامودر نے مسکرا کر کہا کسی کی تھی۔ سمجھو آج سے تیری ہو گئی۔"

"تو۔ کیا زمین تیری ہے؟" میں نے تقریباً ہکلاتے ہوئے پوچھا

"ہاں۔" دامودر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگلے ہفتے تیس ہزار لے کر آجا۔ میں زمین کے کاغذات تیار کروا لوں گا۔ فی الحال تیس ہزار دے دے۔ باقی روپے فارم شروع کرنے کے بعد دھیرے دھیرے ادا کرتے رہنا۔ اور سن! فارم شروع کرنے کے لئے میں نے اپنے بینک میں تیرے لئے قرض کی بات بھی کر لی ہے۔

"دامو!" میں حیرت اور خوشی کے مارے کچھ نہیں بول سکا۔ میرا گلا رندھ گیا تھا۔

"چلو۔ واپس چلیں۔ سورج ڈوب گیا ہے۔ تھوڑی دیر میں اندھیرا ہو جائے گا۔"

دامودر نے دھیرے سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

جب ہم لوگ گھر پہونچے تو شام کی پرچھائیاں گہری ہو چکی تھیں گاؤں کی گلیوں میں لیمپ پوسٹوں کا ملگجا اجالا اونگھنے لگا تھا۔ ہم سائیکلیں لئے ہوئے عمارت کے گیٹ میں داخل ہوئے۔ پریس بند ہو چکا تھا آفس کے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ سائیکلوں کی کھڑکھڑاہٹ سن کر آفس سے کوئی باہر نکلا۔ دامودر نے پوچھا۔

"کیوں گوپال۔ سب چلے گئے۔"

"جی ہاں۔"

دن میں دامودر نے گوپال سے مجھے ملایا تھا۔ گوپال بیس پچیس برس کا ایک نوجوان تھا۔ شام میں وہ چار گھنٹے بیٹھ کر پریس کا حساب کتاب دیکھا کرتا تھا۔ دامودر نے بتایا کہ گوپال اس کے لئے بڑے کام کا آدمی ہے۔ وہ پریس کا حساب دیکھنے کے علاوہ اس کے اوپر کے دوسرے کئی کام بھی کر دیا کرتا ہے۔ جیسے بینک جانا، قسطیں ادا کرنا، دوسرے قصبوں سے آرڈر بک کرنا۔ پریس کی چھوٹی موٹی چیزیں خریدنا وغیرہ۔"

"گوکھلے کو میرا پیغام دیا تھا؟"

"جی۔ وہ تو پندرہ منٹ سے باغ میں بیٹھے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"اچھا۔ اچھا۔"

"اور بار کیا ہے وہ بوتلیں لا کر رکھ دی ہیں۔ ..."

"ٹھیک ہے۔ بالو کہاں ہے؟"
"شاید اوپر ہی ہے، بائی صاحب نے بلایا تھا۔"
"ٹھیک ہے دیکھو، تم جاکر چارپائیاں ٹیبل ویغرہ ٹھیک کرو۔ گوکھلے کہنا ہم لوگ پانچ منٹ میں آتے ہیں۔ اور سنو! تم آج ہمارے ساتھ ہی کھانا کھاؤ۔"
"جی ٹھیک ہے۔"
ہم لوگ جیسے ہی اوپر جانے کے لئے مڑے گوپال بولا۔
"داوا! شیورام پاٹل آیا تھا۔"
"کیا بولتا تھا؟"
"پوچھ رہا تھا کیا دامودر کا بمبئی والا دوست آگیا؟"
"بمبئی والا دوست؟ میرے دوست سے اسے کیا کام؟ کہیں گیتھلی تو نہیں تھا؟"
دامودر نے مسکراتے ہوئے۔ سیدھے ہاتھ کے انگوٹھے سے دارو کا اشارہ کیا۔
"پیا تو نہیں تھا پر پینے جا رہا تھا۔"
گوپال نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ میں کچھ سمجھا نہیں خلافاً ہنس دیا۔" جب ہم کپڑے تبدیل کرکے نیچے اترے تو دامودر نے بتایا کہ آج اس نے میرے اعزاز میں گارڈن پارٹی رکھی ہے۔ اور بل ہوم میڈ فینی کا انتظام کیا ہے۔ ہم عمارت کے پیچھے باغ میں پہنچے۔ اس کے پیڑ کے نیچے ہم نے دوپہر میں آرام کیا تھا۔ دو بلب جل رہے بلب کی روشنی میں ایک بڑی سی میز کے گرد چار کرسیاں لگی تھیں۔ میز پر شیشے کے گلاس اور دو بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ ایک سا پر کوئی بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ کھڑا ہوگیا۔ دامودر نے آگے بڑھ کر تعارف کرایا۔
"گوکھلے! اس سے ملو، میرا دوست شیو، جس کا میں اکثر ذکر کرتا اور شیو! یہ ہے گوکھلے، ایڈوکیٹ منوہر گوکھلے میرا بچپن کا دوست۔"
ہم دونوں نے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ گوکھلے نے گرم جوشی سے دباتے ہوئے کہا۔
"شیو صاحب! دامودر نے آپ کے بارے میں اتنا کچھ بتا دیا ہے لگتا ہے ہم لوگ اس سے پہلے بھی کئی بار مل چکے ہیں۔"
"تو اس سے کئی بار ملا ہوگا۔ مگر بے چارہ تو آج تجھ سے پہلی بار ملا ہے۔" دامودر نے گوکھلے کی بات کاٹ دی۔ ہم تینوں زور سے ہنس دیئے اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔
اتنے میں بالو ایک بڑی سی ٹرے لے کر آیا۔ ٹرے میں چھوٹی چھوٹی کئی پلیٹیں رکھی تھیں۔ گوپال پلیٹیں میز پر سجانے لگا۔ پاپڑ، کھاری سینگ، باریک مینو اور تلی ہوئی مچھلی کے قتلے۔ گوکھلے نے میز سے بوتل اٹھا کر اس کا کاگ کھولا اور خوشبو سونگھتے ہوئے آنکھیں بند کرکے توصیفی انداز میں بلند آواز سے واہ کا نعرہ لگایا۔
"بارکیا کی ہوم میڈ ہے نا۔؟"
"ہاں۔" دامودر نے ہامی بھری۔
پھر گوکھلے مجھ سے مخاطب ہوا۔
"شیو صاحب! آپ نے یقیناً بمبئی کی پارٹیوں میں اچھی سے اچھی شراب پی ہوگی مگر آج ہمارے بارکیا کی ہوم میڈ فینی چکھ کر دیکھئے۔ میرا دعویٰ ہے کہ۔۔۔۔۔ نہیں پہلے آپ ایک پیگ لیجئے بعد میں اس پر بات کریں گے۔"
شراب ڈھال کر سوڈا مکس کیا گیا۔ دامودر نے گوپال سے کہا۔
"گوپال! ایک آدھ پیگ تم بھی لے لو۔"
"لے لوں گا سر!" گوپال نے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ میری نظر دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے بھی جواباً مسکرا کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔ گلاس بھر چکے تھے۔ سب سے پہلے گوکھلے نے گلاس اٹھایا۔ پھر ہم تینوں نے بھی اپنے اپنے گلاس اٹھائے۔ اور چیرز کی آواز کے ساتھ باری باری ایک دوسرے کے گلاس سے اپنا گلاس ٹکرایا۔ میں نے ہلکی سی سپ لی۔ شراب کا ذائقہ واقعی لاجواب تھا۔
"کیوں شیو بھائی کیسی ہے؟" گوکھلے نے آنکھیں چمکا کر پوچھا۔
"ویری نائس!" میں نے بھی خوش دلی سے جواب دیا۔
"بس یوں سمجھئے۔ اس کا نشہ دھیرے دھیرے یوں چڑھتا ہے جیسے کوئی نوخیز شرمیلی لڑکی شب وصال بستر پر دھیرے دھیرے کھل رہی ہو۔"
"ابے چپ۔ ناولوں کے رٹے رٹائے جملے سنا کر بور مت کر۔" دامودر نے مصنوعی غصے سے گوکھلے کو گھورا۔ ہم لوگ ہنس دیئے۔
جوں جوں رات گہری ہوتی جا رہی تھی، فینی کا نشہ بھی گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ ہوا کی انگلیاں بالوں اور گالوں کو یوں سہلا رہی تھیں کہ شراب کا نشہ دو آتشہ ہوگیا تھا۔ باغ میں پاس ہی کہیں رات رانی مہک رہی تھی اور دور کسی اندھیرے کونے میں جھینگر الاپ رہا تھا۔ میں شراب کا عادی نہیں ہوں مگر اچھی صحبت میں اچھی شراب میرے لئے ہمیشہ کشش کا باعث رہی ہے۔

منوہر گوکھلے بہت زندہ دل شخص تھا۔ اس نے اپنے پیشے سے متعلق ایسے ایسے دلچسپ تجربے بیان کئے۔ اور کورٹ روم کے ایسے ایسے لطیفے سنائے کہ ہنستے ہنستے ہمارے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ اس بیچ بالو دو تین بار مچھلی کے گرم گرم قتلے لے آیا۔ وہسکی کے گھونٹ کے ساتھ گرم گرم مچھلی کا قتلہ لطف دے جاتا تھا۔ داموَدر بھی موڈ میں آگیا تھا۔ وہ جب بھی موج میں آتا مراٹھی یا کونکنی کا کوئی گیت یا نظم الاپنے لگتا تھا۔ اس نے اپنے جھونپڑے کی طرف اشارہ کرکے الاپنا شروع کیا۔

" راجاس جی محالی، سوکھے کدھی ملالی
تی سرو پراپت زھالی یا جھوپڑیت مازھیا"

راجا کو اپنے محل میں جو آسائشیں نصیب ہیں۔ وہ ساری آسائشیں مجھے اپنی اس چھوٹی سی کٹیا میں میسر ہیں۔

" بھارست آئی تھویا تیالوٹ ہوتی ہوریا
داراس ناہی دوریا ، یا جھوپڑیت مازھیا"

"چوکس پہرے کے باوجود تجوریوں سے چوریاں ہو جاتی ہیں۔ لیکن میری اس جھگی کا کمال یہ ہے کہ اس کے دروازے پر کوئی سانکل ہی نہیں ہے۔

محالی متو جھلنے قندیل شامدانی
آہی زمین ملنے یا جھوپڑیت مازھیا"

محل میں ریشم و کمخواب کے گدے اور بستر موجود ہیں۔ قندیل اور شمع دان ہیں۔ لیکن ہم خاک بسر اپنی اس جھوپڑی کے فرش پر مست و مسرور ہیں۔

داموَدر گا رہا تھا اور ہم سب جھوم جھوم کر اسے داد دے رہے تھے۔ اتنے میں عمارت کے گیٹ کی طرف سے کسی کے زور زور سے چلانے کی آواز آئی۔ کوئی داموَدر کا نام لے کر پکار رہا تھا۔

"کون ہے یار! اتنی رات گئے۔"

داموَدر نے گیت روک کر قدرے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

"شیو رام پاٹل کی آواز معلوم ہوتی ہے داموَدر دادا" گوپال نے میری طرف تشویش آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

باہر سے مسلسل داموَدر کے نام کی پکار ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا تین چار لوگ یکے بعد دیگرے داموَدر کا نام لے کر پکار رہے ہیں۔ داموَدر جھنجھلا کر اٹھا۔

"لگتا ہے آج پاٹل نے کچھ زیادہ ہی چڑھا لی ہے۔"

داموَدر عمارت کے گیٹ کی طرف بڑھا۔ اس کے پیچھے گوپال بھی اٹھ گیا۔ جب تھوڑی دیر تک دونوں میں سے کوئی بھی لوٹ کر نہیں آیا تو گوکھلے بھی اٹھتا ہوا بولا۔

"دیکھوں تو آخر کیا بات ہے؟ یہ پاٹل بہت موڈی آدمی ہے۔" گوکھلے کے جانے کے بعد میں نے ایک سگریٹ جلائی اور اٹھ کر ٹہلتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے گیٹ کے پاس گلی کے لیمپ پوسٹ کی روشنی میں چار پانچ لوگوں کو کھڑے ہوئے دیکھا۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

"ہم کسی بھی مسلمان کو گاؤں کی زمین خریدنے نہیں دیں گے۔"

میرے قدم ٹھٹھک گئے۔ داموَدر کی آواز آئی۔

"پاٹل تم اس وقت دارو پیئے ہو اور میں نے بھی تھوڑی پی رکھی ہے تم گھر جاؤ کل صبح بات کریں گے۔"

کسی اور شخص کی آواز آئی۔

"داموَدر دادا! پاٹل کھرا بولتا ہے۔ اس گاؤں کی زمین مسلمان کو نہیں بیچے گا۔ مسلمان لوگ کا لاڈ بہت ہو گیا۔"

"راگھو! پاٹل گاؤں کا پنچ ہے۔ میں اس کی عزت کرتا ہوں مگر تم بیچ میں پٹ پٹ مت کرو۔ سمجھے۔" داموَدر کی آواز قدرے تیز ہو گئی۔

اتنے میں گوکھلے نے بیچ بچاؤ کیا۔ "پاٹل! کل پنچایت میں بات کریں گے۔ اب ان لوگوں کو لے جاؤ، اندر مہمان بیٹھا ہے۔"

"کون؟ گوکھلے وکیل؟" پاٹل نے جھومتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں میں ایڈوکیٹ گوکھلے ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ کل پنچایت میں بات کریں گے۔ چلو رے چلو۔" پاٹل نے نشے میں جھومتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور لڑکھڑاتا ہوا دوسری طرف مڑ گیا۔ اس کے تینوں ساتھی بھی لڑکھڑاتے ہوئے اس کے ساتھ چلنے لگے۔ وہ چاروں بیک وقت باتیں کر رہے تھے مگر وہ کیا بول رہے تھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ البتہ ان چاروں کی آوازیں گلی کے نکڑ تک سنائی دیتی رہیں۔ اچانک داموَدر کی غصیلی آواز ابھری۔

"میں اپنی زمین کسی کو بھی بیچوں گا، یہ سالے کون ہوتے ہیں میرے ذاتی معاملے میں دخل دینے والے۔ دیکھتا ہوں مجھے کون روکتا ہے۔"

گوکھلے نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"چھوڑو یار۔ ہر معاملے میں ٹانگ اڑانا پاٹل کی پرانی عادت ہے۔ چلو۔ کل پنچایت میں دیکھ لیں گے۔"

میرے سر میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میں لڑکھڑاتا ہوا چلا اور آکر اپنی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ پاٹل کے الفاظ میرے کانوں میں سیسہ پگھلا رہے تھے۔

"ہم کسی مسلمان کو گاؤں کی زمین خریدنے نہیں دیں گے۔"

میں مسلمان ہوں؟ کیا میں صرف مسلمان ہوں؟ کیا مسلمان ہونا پاپ ہے؟ بیس برس سے میں اور دامودر ایک جان دو قالب ہیں۔ میں مسلمان ہو کر بھی اس کا دوست ہوں۔ وہ ہندو ہو کر بھی میرا یار ہے۔ پھر مجھے آج کیوں لگ رہا تھا جیسے مجھے کسی نے کیچڑ میں دھکیل دیا ہو۔ پاٹل نے کوئی گالی نہیں دی تھی مگر اس کی بات مجھے گالی کی طرح کیوں لگ رہی تھی۔ خود میری نظروں میں میرا وجود ایک عجیب و غریب سوال میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔

اتنے میں دامودر، گوکھلے اور گوپال آ گئے۔ تینوں اپنی اپنی کرسیوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ ہم چاروں خاموش تھے۔ میں نے دامودر کی طرف دیکھا وہ مجھ سے آنکھیں چرا رہا تھا۔ ہم چاروں کی خاموشی بڑی غیر فطری لگ رہی تھی۔ گوکھلے نے پہلو بدلا اور کھنکار کر بولا۔

"چلو بھئی ایک ایک آخری جام بناتے ہیں۔ اس کے بعد کھانا کھائیں گے۔" گوکھلے بوتل سے شراب گلاس میں ڈھالنے لگا۔

"ہاں، ٹھیک ہے۔"

دامودر نے ایک سگریٹ سلگا کر اپنے آپ میں لوٹتے ہوئے اس کی تائید کی۔ اچانک گوپال بولا۔

"دامودر دادا! پاٹل بہت کمنس بانہے۔ اب پورے گاؤں میں آپ کی بدنامی کرے گا۔"

"کیا بدنامی کرے گا وہ میری۔ میں نے کیا اس کے بیل مارے ہیں۔"

دامودر کا لہجہ پھر کڑوا ہو گیا۔

"گوپال! اب یہ ٹاپک رکھو، بات نہیں ہوگی، دارو پیو کھانا کھاؤ اور گھر چلو۔ کل دیکھا جائے گا۔" گوکھلے نے گوپال کو ٹوک دیا۔

گوپال نے میری طرف دیکھا اور گلاس اٹھا کر ایک سپ لے لی۔

"گوکھلے صاحب! آپ جس بات کو مجھ سے چھپانا چاہتے ہیں وہ بدقسمتی سے میں سن چکا ہوں۔ دامو! مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تو خواہ مخواہ ایک دھرم سنکٹ میں پڑ گیا۔" بالآخر میں نے زبان کھولی۔

دامودر نے کوئی جواب نہیں دیا گلاس اٹھا کر ایک لمبا گھونٹ بھرا اور گلاس واپس میز پر رکھ دیا۔

"شیخو صاحب! اگر آپ نے بات سن لی ہے تو اسے بھول جائیے۔ پاٹل کو گاؤں میں کوئی بھی سنجیدگی سے نہیں لیتا۔ سب جانتے ہیں وہ ایک شرابی اور دوغلا آدمی ہے۔" گوکھلے نے لقمہ دیا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں گوکھلے صاحب! مگر اب وہ زمین خرید کر میں اپنے دوست کو پریشانی میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا۔"

"ارے کاہے کی پریشانی! کیا وہ زمین پاٹل کے باپ کی ہے؟ میری زمین ہے میں کسی کو بھی بیچوں۔ وہ کون ہے بکواس کرنے والا۔ تو دیکھنا کل اس کی پنچایت میں کیا درگت کرتا ہوں میں۔"

اچانک دامودر بھڑک گیا۔

"مگر دامو! اس سے کیا حاصل۔ میں اس گاؤں میں اس لئے آنا چاہتا تھا کہ اپنی زندگی کے باقی دن آرام و سکون سے گزاروں۔ اگر میرے یہاں آنے سے فساد کی فضا پیدا ہوتی ہے تو میں ایسا کبھی نہیں چاہوں گا خاص طور پر میری وجہ سے اگر تجھ پر آنچ آئے تو میں بھلا یہاں سکون سے رہ سکوں گا؟"

"کچھ نہیں ہوگا۔ سب گاؤں والے پاٹل کی طرح کمینے نہیں ہیں۔"

"تو سچ کہتا ہے۔ مگر فضا خراب کرنے کے لئے اکیلا پاٹل ہی کافی ہے نا؟"

"تو کیا ہم کسی پاٹل کے ڈر سے اپنی محبتیں تقسیم کر لیں؟"

"یہی ہوتا ہے دامو! یہی ہوتا ہے۔ ہم سب ایک دھند میں سفر کر رہے ہیں۔ دھند میں نہ راستے صاف دکھائی دیتے ہیں نہ چہرے۔ یہ غنیمت ہے اس سفر میں تیرے میرے جیسے لوگ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے چل رہے ہیں۔ مگر دامو! مجھے ڈر لگتا ہے۔ دھند لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی جا رہی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو دھند اس قدر گہری ہو جائے ہم جو ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے چل رہے ہیں۔ ہماری نظروں میں ایک دوسرے کے نقوش بھی دھندلا جائیں۔ میں بدگمانی کا وہ دن طلوع ہونے سے پہلے مر جانا چاہتا ہوں۔ دامو میں قیامت کے دن کا مقابلہ کر سکتا ہوں مگر اس دن کا مقابلہ نہیں کر سکتا جب ہمارے درمیان بدگمانی کا غبار پھیلا ہوا ہو اور ہم ایک دوسرے کے مقابل اس طرح کھڑے ہوں کہ ہماری گردنوں پر ہمارے چہرے غائب ہو چکے ہوں۔ دامو! ہمارے اندر بے شمار سور اور ان گنت کتے دبکے بیٹھے ہیں جنہیں ہم نے تہذیب کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ بس دامو! میں یہ سوچ سوچ کر کانپتا رہتا ہوں کہیں پاٹل جیسے شخص کی شہ پر کتے زنجیریں توڑ کر بھونکنے نہ لگیں۔ دامو! میرے ارد گرد پھیلی بربریت نے میرے دل میں چھالا ڈال دیا تھا جس کا مجھے علم نہیں تھا۔ آج پاٹل نے اسے چھو لیا اور وہ پھوٹ گیا۔ دامو! مجھے کوشش کرنی ہوگی۔" اچانک میری آواز بھرا گئی اور میں یک بیک چپ ہو گیا۔ میری پلکوں پر آنسو جھلملا اٹھے۔ میرا حلق خشک ہو گیا تھا اور زبان پر چھالے نکل آئے تھے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر میز سے اپنا گلاس اٹھا لیا۔

اور غٹ غٹ ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا۔ تب جا کر مجھے چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا لگا۔ صرف رہ رہ کر بڑ کے پتوں کے سرسرانے کی آواز آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد داموور نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور لرزتی آواز میں ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگا۔

شیخو! میں ہانی کی بات پر بہت شرمندہ ہوں۔ تو جانتا ہے میں کتنا ہندو ہوں؟ میں جانتا ہوں تو کتنا مسلمان ہے؟ ہماری ذات، ہمارے نام، ہمارے مذہب الگ ہو سکتے ہیں شیخو، مگر ہمارے تعلق کی ڈور جس کا ایک سرا تیرے ہاتھ میں ہے اور دوسرا میرے ہاتھ میں کسی مذہب یا دھرم کی کھونٹی سے نہیں بندھی ہے۔ ہمیں اسی ڈور کو تھامے رکھنا ہے شیخو! جس دن ہمارے ہاتھ سے یہ ڈور چھوٹ جائے گی ہم وقت کے ریلے میں تنکوں کی طرح بہہ جائیں گے۔ تو یہاں نہیں آنا چاہتا۔ مت آ۔ مگر میرا فیصلہ بھی سن لے۔ میں اب وہ زمین کسی کو نہیں بیچوں گا۔ کسی کو نہیں دوں گا۔ وہ اسی طرح ویران پڑی رہے گی۔

داموں کی آواز بھدی ہو گئی تھی۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ شاید وہ اپنے اندر اٹھے کسی طوفان کو سختی سے دبانے کی کوشش کر رہا تھا ---- داموں کو اس قدر جذباتی ہوتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شاید میں نے کچھ زیادہ ہی کٹھورتا کا اظہار کر دیا تھا۔ مجھے اس قدر جذباتی نہیں ہونا چاہئے تھا۔ میں سمجھا تھا داموور بھی جیسے بدل گیا ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ ابلا اس کے سینے میں ہی تھا۔ جس طرح یہی آگ تھی بلکہ جیسے مجھ پر میں نے اپنے دوست کا دل دکھایا۔ جس نے آپ کو ٹوٹنے بکھرنے کی ترنگ میں شاید احساسات کچھ زیادہ ہی گداز ہو گئے ہیں۔ اچانک میرے سینے میں ایک بگولہ سا اٹھا اور میں بے اختیار رونے لگا۔

"ارے یہ کیا کر رہے ہو؟" داموور نے گھبرا کر میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

مجھے بھی حیرت تھی کہ میں کیوں رو رہا ہوں۔ مگر میں رو رہا تھا بہر انداز کے باوجود لرز رہا تھا۔

"نہیں شیخو! اس طرح مت رو۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔ شیخو! چپ ہو جا۔

بھگوان کے لئے چپ ہو جا ورنہ......"

اور کہتے کہتے داموں بھی رونے لگا۔

(باقی صفحہ ۴ پر دیکھئے)

سریندر پرکاش

فسانے

قسط نمبر ۸

تب سرشٹی کی کوکھ سے کئی دن جنمے اور راتری کی گپھا میں جل کر راکھ ہوئے۔ وشال بن کے روما نچک واتاورن میں ایک بڑھے برہمن کے ... کی کھڑاویں وکشتھ تال نے اپنی دھولی بکھیرتی رہیں۔ پھر ایک نیا ... ہوا اور اس نے بڑھ کر سوریہ دیوتا کے چرنوں میں پرنام کرکے ... میں اٹھایا۔ اور آخیر وادے کے لئے اٹھے ہوئے سوریہ دیو کے ساتھ ... کے روپ میں پاٹلی پتر کے چہرہ اور بنی جھیل پر پھیل گئے۔

کوٹلیہ اپنے گھائل پاؤں لئے چلتا ہوا چپ چاپ سر جھکائے نگر دوار پر دفعت ہوا۔ تب کسی کو کانوں کان اس بات کا سماچار نہ ملا کہ کتنا بڑا بدلاؤ پاٹلی پتر میں پرویش کر گیا ہے۔

مگر دو لڑکیں مہاپدم نند نے اپنے سنگھاسن پر بیٹھے ہوئے کئی بار ... بدلا اور اپنے سامنے کھڑے دبلے پتلے شریر کے کالے کلوٹے ... برہمن کی اور دیکھا جو دیکھنے میں بھیانک تھا جس کے سامنے کے ... ٹوٹے ہوئے تھے۔ مہاپدم نند اس کی درشٹی سے اس برہمن کے ... سے سرد تر گھورتے کی چیشٹا کر رہا تھا ——— جو ابھی ابھی ... تھی جس نے نندراج کو ایک بہت بڑے یگیہ کی چنوتی دی تھی۔ ...... ایسا ہوا کہ وہاں ایک لکشمی ہیں ... کچھ دکھائی نہ ... جیسے کے چہرے پر کچھ دکھائی دیتا ہو یا ... ان کے ... رہی تھیں۔

تب مہاپدم نند نے اپنا گھاؤ ریز کھولا۔

"چلیہ پترو شوبھیت کوٹلیہ۔ ہم آپ کے دربار میں آپ کا سواگت کرتے ہیں۔ آپ نے جو چنوتی دی اس کے لئے ہم ابھار مانتے ہیں۔ کنتو ...

ہو جائیں گے۔ آپ دیر تو ہی ہمیں یہ بھیت کرنے کی چیشٹا کر رہے ہیں۔"

کوٹلیہ نے اپنی درشٹی مہاپدم نند کے چہرے پر جما دی۔ مہاپدم نند کو پرتیت ہوا کہ اس کی آنچ اس کے نکٹ ہوتی جا رہی ہے۔ پھر بڑے ہی گمبھیر سور میں کوٹلیہ نے کہا۔

"میں سینک آکرمن کی بات نہیں کر رہا مہاپدم نند۔ سانسکرتک آکرمن کی بات کر رہا ہوں سینکوں کے ستے ہوئے ہاتھوں میں کوئی شستر ایسا نہیں جو اس آکرمن کا سامنا کر سکے۔"

کوٹلیہ نے تیزی سے بھون چھوڑ دیا۔ اور اس کی کھوج میں نکل پڑے جسے نندوں نے اس کارن بن باس دے دیا تھا کہ اس کی ماں کا لہو نندوں کے باپ کے لہو سے نیچ تھا۔

پاٹلی پتر نگر دوار سے نکل کر کوٹلیہ نے گنگا میں اشنان کیا اور پلٹ کر دیکھا۔ مندروں اور راج بھون کے کلشوں پر پھیلی اداس دھوپ کسی پشاچ کی بھانتی منڈلاتی اپنے دانت نکوس رہی تھی۔

مندر میں سے دیو درشن کر کے نکلنے کے بعد انہوں نے سوریہ کو پرنام کیا اور اپنے سر پر بندھی پگڑیوں کو درست کر کے سامنے چٹان پر کھڑے کیسری کا بانے پہنے پانچ بھکشوؤں کو دیکھا۔ سب کے سر گھٹے ہوئے تھے۔ اور سورج کی کرنیں ان کی چندیوں پر مسکرا رہی تھیں۔

"بدھم شرنم گچھامی۔ دھمم شرنم گچھامی ......"

پانچوں بھکشوؤں نے آنکھیں موندے ہوئے اپنے ہاتھ جوڑ کر سینے سے لگائے ہوئے تھے اور وہ منتر کا اچارن کر رہے تھے دھیرے دھیرے واتاورن پر ایک عجیب اشانتی پھیل گئی تھا کہ کوئی جادو کا منتر پھونکا گیا ہے اور سب اس میں منتر مگدھ ہو گئے ہیں۔ پھر کسی ایک نے اپنا سر جھٹک کر اونچی آواز میں پوچھا۔

"بدھ کون ہے۔؟ دھم کیا ہے؟"

"وہ سدھارتھ ہے۔ گوتم ہے اور شاکیہ منی ہے۔ اور نروان پراپت کرنا دھرم ہے۔" پانچوں بھکشو ایک زبان سے بولے۔

"وہ سدھارتھ گوتم اور شاکیہ منی کیوں ہے۔؟" دوسرے نے سوال کیا۔ پانچوں بھکشوؤں نے ایک دوسرے کے چہرے پر دیکھا اور جو عمر میں بڑا تھا۔ بولا۔

"اوستھا کے ساتھ منشیہ کو اپنے دکتویہ کے نئے گھونٹے کے درشن ہوتے ہیں۔ اور ہر نیا گھونٹا اپنا نیا نام گرہن کرتا ہے۔ اور ان گھونٹوں سے چھٹکارا پانا ہی نروان ہے۔ بدھ چاہتا ہے۔ سنسار کے سبھی پرانی اپنے گھونٹوں کے درشن کریں۔ اور ایک گھونٹے سے دوسرے گھونٹے تک کی یاترا کا انوبھو پراپت کریں۔

"بدھ کیا ہے؟" سوال کیا گیا

"وہ بودھ ہے" جواب ملا

"سب سے بڑا بودھ کیا ہے؟" پھر سوال ہوا

"سب سے بڑا بودھ ہے۔ اپنی آتما کا بودھ۔" پھر جواب دیا گیا۔

"اور پھر اس کے بعد کیا ہے۔؟"

"اس کے بعد گیان کا مارگ آرمبھ ہوتا ہے اور نروان میں منشیہ مکتی پراپت کرتا ہے۔"

"گیان کیا ہے؟"

"وہ پرکاش ہے۔"

"پرکاش کیا ہے؟"

"وہ منشیہ کے اندر ہے۔ اسی کو کھوجنا نروان ہے۔ جب باہر کا پرکاش اور اندر کا پرکاش۔ باہر اور اندر کے بھید کو بھول جاتا ہے۔ جب منشیہ ارتھ کی ستھتی سے ارتھ ہینتا کی ستھتی کو پا لیتا ہے۔ وہیں بدھ اس کے سواگت کے لئے کھڑا ملتا ہے۔"

"بدھ کیسا ہے۔ کیا ہم اسے دیکھ سکتے ہیں؟" ان سب نے سوال کیا جن کے چہروں پر کبھی منگول اور کبھی یونانی اور کبھی آریہ نقش جھلکنے لگتے تھے جن کے سروں پر پگڑیاں بندھی تھیں اور جن کی پیشانیوں پر ان کے دیوتاؤں کے ثبت کئے ہوئے بوسے درخشاں تھے

پانچوں بھکشوؤں نے ایک بار پھر ایک دوسرے کے چہرے پر دیکھا اور پھر اپنے کندھوں پر لٹکے ہوتے جھولوں میں سے چھینیاں اور ہتھوڑے نکال لئے اور پہاڑ کی ایک چٹان پر پے در پے انگنت وار کئے۔ اور حتیٰ کہ ان کی انگلیاں لہولہان ہو گئیں۔ اور وہ لہو جب پتھریلی زمین پر گرا تو ایک دھندلا سا دھواں اٹھنے لگا اور اس دھوئیں کی خوشبو سے سارا ماحول مہک اٹھی اور چٹان پر ویسے ہی نقش ابھرنے لگے جیسے کہ ان کے تھے محو حیرت اس عمل کو دیکھ رہے تھے اور پھر ایک دیو قامت تصویر ان کے سامنے تھی۔ ویسی ہی جیسے وہ تھے۔ وہ سب متحیر ہوتے اور پھر بول اٹھے۔ "تو کیا وہ بھی خود سدھارتھ گوتم اور شاکیہ منی ہیں۔؟"

"ہاں۔ ویسا ہی ہے۔ جیسے کہ ہم سب ہیں۔ وہ جہاں بھی جاتا ہے وہ ہی ہو جاتا ہے۔" بھکشوؤں نے جواب دیا۔

"لیکن اس کے سر پر دستار کہاں ہے؟ وہ سب ایک ساتھ بول اٹھے۔ بھکشوؤں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اور انہوں نے آگے بڑھ کر بدھ کے سر پر دستار باندھ دی۔

یہ زمانہ تھا۔ جب سمراٹ اشوک نے سارے آریہ ورت کو اکھنڈ کر لیا تھا۔ لاکھوں سینک اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو چکے تھے۔ اور اشوک نے اپنے ننانوے بھائیوں کو قتل کر کے اپنی خون سے لت پت تلوار مہاندی کے پوتر جل میں دھو ڈالی تھی۔ اور تب بدھ کی شرن میں پناہ لی تھی۔

موسلا دھار بارش۔ ندیوں میں بپھری باڑھ اور تیز طوفان۔ سب کچھ طوفان اور باڑھ کی نظر ہو گیا۔ اور پھر وہ خیبر میں ہزاروں سائے لہرانے لگے اور ان گنت گھوڑوں کی ٹاپیں گونج اٹھیں۔ گھوڑوں پر سوار اسلامی سپاہ نے ایمان کے گہرے جذبے میں ڈوب کر نعرہ لگایا۔ اور ہر مورتی جو راستے میں آئی کھنڈرات کر دی۔ مندروں میں سے دیوتا دبے پاؤں نکل کر آسمان کی پناہ گاہوں میں جا پہنچے۔ سب طرف کلمہ توحید سنائی دینے لگا۔

"لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔" باز خان نے کلمہ پڑھ کر ثواب حاصل کیا اور اپنا سر روئے کعبہ جھکا دیا۔ آج وہ سفر پر جا رہا تھا۔ وہ بیوپاری تھا۔ اور اپنی تجارت کے لئے اسے نئی منڈیوں کی تلاش تھی۔ اس کے پیچھے چھوٹا سا کارواں تھا خچروں پر خشک میوے لدے تھے اور کئی ملازموں کے علاوہ بوڑھے سفید ریش باز خان کا جواں سال بیٹا طرہ خان بھی ایک خچر کی لگام تھامے ہوئے تھا۔

(جاری)

ہندی:۔ ایم۔ ایل۔ اے ورا ٹپانڈے
حیدر جعفری سید
۱۱۷/۱۹ بانس منڈی، بجلی نمبر ۲۴۸، کانپور-۱

بنگالی مارکیٹ کی مٹھائی

آپ نے سمندر میں لگاتار گرتی اٹھتی چھوٹی بڑی جھاگ دار لہریں تو دیکھی ہی ہوں گی۔ انسان کے دل میں آتی جاتی آرزوئیں بھی کچھ اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ انسانی زندگی اُن کے اور مشکل کی وصف رہی تو ہے۔ خواہشوں کی تکمیل کا نام مسرت اور ادھورے رہنے کا غم۔ امید انسانوں کو تمناؤں کی تکمیل کے لیے کوشاں رکھتی ہے اور اُس کا نقطۂ نظر بتا بو میں رکھتا ہے۔ ان سب نے انسان کو اس کشتی کے مانند بنا دیا ہے جو طوفان میں لہریں کھا کھا کر ڈگمگاتی رہتی ہے۔

ویسے پرشانت موہن جی کی کشتی کب ڈگمگا اٹھی یہ کہنا تو مشکل ہے کیوں کہ جب میں دیکھتا رہا لہریں اُن کے قابو میں تھیں لیکن یہ کہنا بھی مناسب نہیں۔ سچ تو یہ ہے لہریں کشتی کے کنٹرول میں نہیں ہوتیں بلکہ کشتی ہی لہروں کے کنٹرول میں ہوتی ہے۔ تو یہ چاہیے کہ لہریں اٹھیں تو کشتی ڈولی۔

تو اب بات یہ آتی ہے کہ لہر اٹھی کیوں؟ اور کشتی ڈولی کیوں؟ لہر بھی تو نہیں اٹھی تھی اور اٹھی ہی تو کشتی بھی تو سنبھل سکتی تھی۔

اس قسم کے بحث کے جال میں انسان اُسی وقت پھنستا ہے جب وہ سوچتا ہے ہر چیز کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے۔ اسی لئے تو "کیوں" کا سہارا لیتا ہے لیکن کچھ باتیں ہی ہوتی ہیں جن کی کوئی وجہ نہیں ہوتی اور ہوتی بھی ہے تو سمجھ میں نہیں آتی۔ بس ہوتی ہے لہٰذا بحث کرنا فضول عبث ہے۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ لہر اٹھی اور پرشانت موہن جی کی کشتی ڈولی ایسا کیوں ہوا آپ ان ہی سے دریافت کریں لیکن جہاں تک بات میری سمجھ میں آتی ہے اس کا کچھ سلونی سے ضرور تھا۔

اب آپ مجھ سے ناراض ہو کر یہ ضرور کہیں گے کہ کسی موضوع سے وابستہ ہونے لڑکی کا نام جیسا کہ ہونا چاہیے رادھا کیوں نہیں؟ تو میں پہلے ہی عرض کر دینا چاہتا ہوں لہروں پر میرا کنٹرول نہیں۔ جو نام تھا وہ میں نے بتا دیا۔ ہونا نام کے لیے تھوڑی ...

تو پرشانت موہن جی نے سلونی کو دیکھا اور شاید اسی سے لہر اٹھی اور شاید اُسی سے ہی کشتی ڈولی۔

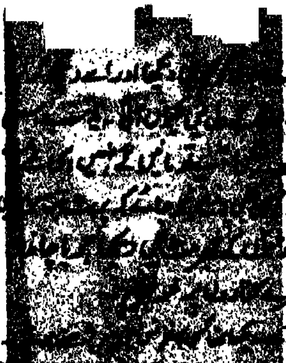
میں جانتا ہوں کہ آپ کیا سوچنے لگے ہوں گے، افسانے، ناول وغیرہ پڑھ کر آپ کا تخیل کافی تیز ہو گیا ہوگا۔ تو اُس نے جال بُننا شروع کر دیا ہوگا مزیدار تعلقات کا، جو کسی پیڑ کے ارد گرد ناچ گا کر یا مہکتے خط لکھ کر بُنا جاتا ہے۔

سچ تو یہ ہے یہ سب کچھ صفحات پر یا صرف پردۂ سیمیں پر ہی وقوع پذیر ہوتا ہے تو آپ کا تخیل اتنا ہی شوخ ہو اٹھا ہو تو کسی ماہنامے میں افسانہ لکھ ڈالیے یا فلم کے گیت اور ڈائیلاگ۔ پرشانت موہن جی کسی باغیچے میں جا کر درخت کے ارد گرد ناچے نہ انہوں نے مہکتے خط لکھے۔ باغ میں جانا تو انہیں قطعاً پسند نہیں تھا۔ ہاں وہ بچپن میں ایک آدھ بار لودھی گارڈن ضرور گئے ہوں گے، لیکن کھیلتے کھیلتے وہ کسی مقبرے سے پھسل کر گر پڑے تھے۔ وہ تجربہ کچھ خاص مسرت انگیز نہیں تھا۔ کسی گاؤں سے آنے والے مہمانوں کو دلی گھمانے کے بہانے بھی کسی پارک میں نہیں لے گئے۔ بلند شہر کی اپنی خوبصورت کزن کو بھی نہیں جسے پیڑ، ناچ، گانا کافی پسند تھا۔ اور جسے پارک میں لے جانے سے کئی رومانٹک امکانات روشن ہو سکتے تھے۔ لیکن باغ میں بیٹھے ہوئے مقبروں کو دیکھ کر پرشانت موہن جی کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔

اور خط لکھنے کے معاملے میں تو وہ پیدائشی آلسی تھے۔ بھارتی محکمۂ ڈاک نے خطوط کی شرح بار بار بڑھا کر انہیں اور بھی پست ہمت کر دیا تھا۔ انہوں نے کچھ دوستوں کو رنگین لفافوں میں گلاب کی پنکھڑیاں ڈال کر بھیجتے ضرور دیکھا تھا لیکن کچھ ہی دنوں بعد وہ احباب لٹکے ہوئے منہ، نظر چرا کر بھاگتے نظر آئے تب انہوں نے گھر کے گملوں میں بھول کر بھی گلاب کا پھول نہیں لگایا تھا۔

مطلب یہ ہے کہ مرد اور عورت کے تعلقات کا ذکر چھڑا تو لوگوں کی بحث محبت والفت تک پہنچ جاتی ہے۔ اُن تعلقات میں محبت بھی تو شامل ہو سکتی ہے۔

خیر چھوڑیئے۔ تو میں عرض کر رہا تھا کہ سلونی کو دیکھ کر پرشانت موہن جی نے سوچا کہ اُسے بنگالی مارکیٹ لے جا کر مٹھائی کھلانی چاہیئے صرف اتنا ہی اور کچھ نہیں، بالکل کچھ نہیں۔



پرشانت موہن جی ...
مٹھائی کھلانے والی بات
کہانی کے ضمن میں فضول ...
دینا چاہئے تاکہ آپ کی یہ غلط ...
نے اسے کسی ہلکی شام کو د...
رات میں ندی کے ہرے بھرے ...
پرشانت موہن جی نے ا...

موضوع ہوگا "ہندی افسانے میں بنگال کے پڑوسی یا ہمجولی ادب میں دانتوں (مسواک) کا اہتمام" کہنے کا مطلب اتنا ہی ہے کہ ہزاروں کا نفسیں ہوتی ہیں۔ ہزاروں میں پڑھے جاتے ہیں اسے کون یاد رکھے۔ تو میرے ہفتے ہفتے پرشانت موہن جی کے دل میں ایک لہر اٹھی۔ پہلے تو انہیں محسوس ہوا کہ کوئی سوال ابھر رہا ہے۔ انتظار کرتے رہے لیکن کوئی سوال نہیں ابھرا۔ لیکن جب چائے کی میز پر کسی نے ان کا تعارف سلونی سے کروا دیا تو دل میں اٹھی اس لہر کا روپ رفتہ رفتہ واضح ہوتا گیا۔

وہ لہر کوئی سوال نہ تھی بلکہ ایک آرزو تھی بے بہرہ لیکن سیدھی سادی بھولی بھالی معصوم۔ بتا سلونی کو بنگالی مارکیٹ میں لے جا کر دودھ کی مٹھائی کھلانے کی۔

اب بنگالی مارکیٹ ہی کیوں؟ چاندنی چوک کیوں نہیں؟ اور مٹھائی ہی کیوں پان کیوں نہیں۔ یہ تمام باتیں بیکار ہیں۔

انسان کو ایسا کیوں لگتا ہے ویسا کیوں نہیں اس کا جواب نہ تو نفسیات میں بھی نہیں ہوتا حالانکہ ہمارے پاس اس کا جواب ہے ہر قسم کی گہیں وہ منزل پا سکتی ہے۔

تو کبھی ایسی لہر اٹھی اور ایسی کشتی ڈولی۔ بندگی کشتی ڈولی اور ڈول ہی جاتی ہے لیکن کسی ہرنی کو چھوا کچھ ہوتا کہ افسوس میں پیر تک پڑھنے کی صلاحیت رکھتی ہو اسے مٹھائی کھلانے کی آرزو کوئی غیر فطری یا ناجائز تو نہیں کہی جا سکتی۔ بھارت کا پینل کوڈ بھی کسی کو شش بھی اس کا مخالف نہیں ہے۔

لیکن پرشانت موہن جی نے اس وقت سلونی سے کچھ نہیں کہا صرف اس کا فون نمبر مانگ لیا۔ سلونی ذرا جھجکی تو ضرور لیکن اس نے پیشانی کا فون نمبر انہیں دے دیا اور سب کچھ بھول گئی۔

ایک دن کی بات ہے کوئی آرٹیکل ایڈٹ کر رہا تھا تو سلونی ہاتھ میں ... کا غذ لئے وہاں آ گئی۔ مجھے معلوم تھا آپ یہ پڑھ کر کہیں گے بہت ہی مزہ دار ہو گئے ہوں گے۔ سلونی میرے پاس کیسے؟ یہ تو سوچتا آپ کا سوال؟ ایسا سوال آپ کے دل میں ابھرا اس کے بعد میں وضاحت کیوں کروں میں نے آپ کو یہ بتایا ہی نہیں کہ ہم دونوں ایک ہی اخبار کے دفتر میں کام کرتے ہیں۔

تو سنو ... میرے پاس آ کر بولی ... تم پرشانت موہن جی سے واقف ہو؟ پھر

میں نے جواب دیا۔ "ہاں ..."

"ان کا فون تھا"

"تو؟"

انہوں نے کہا کہ تمہیں بنگالی مارکیٹ کی مٹھائی کھلانی ہے"

"تم بھی ..."

"کہاں دیکھوں گی"

چلی جانا سنا ہے وہاں رس گلے اور دودھ اور گھوٹے کی مٹھائی اچھی ملتی ہے۔

میں سامنے رکھے کاغذات میں گم ہو گیا۔ سلونی چلی گئی مجھے تو کچھ نہیں لگا۔

لیکن بات یہاں نہیں رکی۔ کچھ دنوں کے بعد پھر وہی فون آیا اور سلونی میرے پاس چلی آئی۔

"تو اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے؟" میں نے اسے سمجھایا "تمہیں مٹھائی ہی تو کھلانا چاہتے ہیں۔"

"لیکن کیوں؟"

"اس کا جواب تو میرے پاس نہیں ..."

"تم جو تسبیح پڑھو کیوں نہیں ..."

اس کے بعد پرشانت موہن جی کا فون آیا تو میں دفتر میں نہیں تھا لیکن سلونی نے مجھے اطلاع دی۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے سلونی؟" میں نے جھلا کر کہا "تمہیں کسی کے ساتھ جانے میں اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ تمہارے لئے تمہارا دوست ہیں پرشانت موہن جی۔ تمہارا کیا مل جائے گا؟"

سلونی نے کوئی جواب نہیں دیا بس وہاں سے چلی گئی۔

پھر ایک دو بار پرشانت موہن جی کا فون آیا۔

لیکن سلونی تو ملی ہی نہیں۔ ایک آدھ بار جو ملی ہو گی تو اس نے ٹال دیا اور بات ٹالی کر دی۔

فون آتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پرشانت موہن جی بہت ہی DESPERATE ہو گئے تھے وقت جیسے تھم گیا تھا اور تیز و تند کی شخص بیکلی انہوں نے طوفان کا روپ اختیار کر لیا۔ سلونی کو ... جا کر بنگالی مٹھائی کھلانا جیسے ان کی زندگی اور موت کا سوال بن گیا تھا۔ ان کی زندگی کا ... تھی ان کے فون کی گھنٹی ایسے بجتی تھی جیسے خطرے کی گھنٹی ہو۔ ایک بھولی آرزو ایک طوفان بن گئی تھی جس نے ان کے تمام وجود کو جھنجھوڑ کر

غزل سنہ ۱۹۹۰ء

خورشید بیگ میلسوی

[illegible]
عہد رفتہ کی ابھی باقی ہیں تصویریں بہت

[illegible]
دل کے آنگن میں اُتر آئیں کی تنویریں بہت

[illegible]
کر رہے ہیں اپنے ناموں کی جو تشہیریں بہت

[illegible]
لفظ بے تاثیر کو بخشی ہیں تاثیریں بہت

[illegible]
[illegible] کو تعبیریں بہت

[illegible]

رسا چغتائی

ابھی رونے کے اندیشے بہت ہیں
[illegible]

نہیں [illegible]
[illegible] بہت ہیں

[illegible]
کہ اس [illegible] بہت ہیں

ابھی آپس میں [illegible]
[illegible] بہت ہیں

کسی سے پوچھ [illegible]
ہمارے شہر میں [illegible] بہت ہیں

نہ آئے [illegible]
جہاں میں تجھ سے [illegible] بہت ہیں

سُنا ہے چاند کی [illegible]
[illegible] بہت ہیں

[illegible] محمود

عجب نہیں [illegible] کھلے
ہوا کے تو پروں سے نئی اُڑان کھلے

اُتر گئے تھے [illegible]
نہ خواب ختم ہوئے اور نہ بادبان کھلے

رگوں میں [illegible]
کوئی الاؤ جلے، کوئی داستان کھلے

خدا کرے [illegible]
وہ اک یقین کہ جس پر کئی گمان کھلے

یہ کس نگاہ [illegible]
یہ کس پکار پہ [illegible] کھلے

بکھر چکا ہے لبوں سے دعا کا سناٹا
ذرا سی دیر میں شاید کوئی زبان کھلے

روحی کنجاہی

اس دوری پر اس قربت پہ خوش بھی نہیں ناخوش وہ بھی نہیں
[illegible] بھی نہیں

[illegible]
[illegible] اپنی اپنی حالت پر خوش [illegible] بھی نہیں

[illegible]
[illegible] اپنی اپنی قسمت پر [illegible] بھی نہیں

[illegible]
[illegible] بھی نہیں

روشن نگینوی

ہم اختلاف کی کیوں دوسروں سے بات کریں
کوئی گلہ ہے تو باہم مذاکرات کریں

جو دوسروں کو سدا [illegible] دکھاتے ہیں
وہ آپ بھی تو ذرا احتساب ذات کریں

حیات تجھ سے عبارت ہے [illegible]
تجھے بھی آکے شریک غم حیات کریں

وفا تو خیر، جفا پہ بھی وہ نہیں مائل
اب ان سے [illegible]

[illegible]
جہاں کسی پہ نہ دل کے معاملات کریں

شفیق سلیمی

میں جہاں گرمِ سفر تھا وہ کوئی صحرا نہ تھا
راہ میں میری شجر اور [illegible] سایا نہ تھا

میں کہ صدیوں کا تھا پیاسا اللہ پیاسا ہی رہا
یوں تو وہ برسا تھا لیکن ٹوٹ کر برسا نہ تھا

سوچ کا محور وہی ہے جب سے دیکھا ہے اُسے
حرکتیں بچوں سی تھیں حالانکہ وہ بوڑھا نہ تھا

ہو رہا ہے منعکس میرے در و دیوار سے
ایک دن بھی آ کے جو گھر میں مرے ٹھہرا نہ تھا

کون ہو گا سنگدل ایسا شفیق اس شہر میں
سامنے میرے تھی میری لاش میں رویا نہ تھا

شان الحق حقی

جو بیڑیاں پیروں میں تھیں وہ تو نہ کٹیں کڑیاں
وحشت میں گریں ٹوٹ کے کچھ اور ہتھکڑیاں
کچھ سلسلے تھے شوق کے پھولوں کے سے گجرے
ہیں جن کی کفِ دست میں ٹوٹی ہوئی لڑیاں
یاں بیت گئی سر سے قیامت یہ قیامت
وہ گنتے رہے رجعتِ بیٹھی ہی کی گھڑیاں
اے دردِ محبت تجھے بہلائے گا اب کون
بہتر ہے کہ اظہار کی صورت نہ پکڑیاں
ان کانوں پہ پڑتے ہیں عجب طرح کے کوڑے
جو اپنے جبینوں سے بھی سُنتے نہ تھے کڑیاں
خوشبو سے وہ بھی ہیں تھے بسے حرفِ ملامت
فقرے سے تھے سلیقے سے بھی پھولوں کی پنکھڑیاں
سنتے ہیں کہ اُترے تو کبھی عرق وہ لیکن
کچھ اور بلائیں ہیں لگے آن کے پڑیاں
جس سمت نظر کیجیے اشکوں کی ہے برسات
صحراؤں میں بہنے لگیں ساون کی سی جھڑیاں
میں تھا کبھی اس در کبھی اس در کا گدا
کیا کیا نہ قیامت سے مرے دیکھے تجھے تڑیاں
جگ بیت گئے سُنئے اک افسانہ کہ حقی
کھلیاں سلئے ٹہنیاں تیری نہ نبڑیاں

شہزاد احمد

مزاجِ یار سے جُوں جُوں شناسا ہوتا جاتا ہے
مرا دل اور تنہا اور تنہا ہوتا جاتا ہے
یہ قربت تو ہمیں آنکھیں جھپکنے بھی نہیں دیتی
بہت نزدیک سورج کا اُجالا ہوتا جاتا ہے
نظر جوں جوں بلندی کی طرف پرواز کرتی ہے
اِسی نسبت سے دل کا زخم گہرا ہوتا جاتا ہے
سمٹتی جا رہی ہیں وسعتیں دشتِ تمنا کی
سمندر موج میں آیا ہے دریا ہوتا جاتا ہے
بالآخر یہ کھلا ، ہے موت ہی میں زندگی اپنی
ستارے بجھتے جاتے ہیں سویرا ہوتا جاتا ہے
اِدھر ہم کو مسافت کے قرینے آتے جاتے ہیں
اُدھر کچھ اور ناہموار رستہ ہوتا جاتا ہے
بہت جانی ہوئی راہیں بھی پہچانی نہیں جاتیں
ترے ہوتے ہوئے یہ شہر کیسا ہوتا جاتا ہے
اسی نے روک رکھی تھی تمازت جلتے سورج کی
وہی اک ابر پارہ ، پارہ پارہ ہوتا جاتا ہے
اُبھر آئی ہیں چاروں اور سے بے نام تصویریں
وہ سیل اب جمع آنکھوں میں دوبارہ ہوتا جاتا ہے
قیامت ہے در و دیوارِ دنیا کو تکے جانا
یہ جینا تو نہیں لیکن گزارا ہوتا جاتا ہے
مرے سینے کے اندر ٹوٹتی جاتی ہے کوئی شے
خلا سا روح میں شہزاد پیدا ہوتا جاتا ہے

شاعر لکھنوی

جشنِ تعبیر کا منظر دیکھا
خواب اک خواب کے اندر دیکھا

تیری آنکھوں سے ملاقات کے بعد
ہم نے ساحل سے سمندر دیکھا

شمع و پروانہ کی جاں سوزی میں
ہم نے اپنے کو بھی چھو کر دیکھا

کھوئی کھوئی سی سہی بینائی
دیکھنے کو تجھے اکثر دیکھا

ہم نے معنی کا دہکتا پیکر
حرف کی آگ میں جل کر دیکھا

ساقی فاروقی

سفر کی دُھوپ میں چہرے سنہرے کر لیے ہم نے
وہ اندیشے تھے رنگ آنکھوں کے گہرے کر لیے ہم نے

خدا کی طرح شاید قید ہیں اپنی صداقت میں
اب اپنے گرد افسانوں کے پہرے کر لیے ہم نے

زمانہ پیچ اندر پیچ تھا ہم لوگ وحشی تھے
خیال آزاد تھے ، لہجے اکہرے کر لیے ہم نے

مگر ان سیپیوں میں پانیوں کا شور کیا تھا
سمندر سُنتے سُنتے کان بہرے کر لیے ہم نے

وہی جینے کی آزادی وہی مرنے کی جلدی ہے
دِوالی دیکھ لی ہم نے دسہرے کر لیے ہم نے

شہرت بخاری

ہنستے روز ، مہکتی شب ، سب بھول گئے
چھوڑ گئے وہ ہم کو کب ، سب بھول گئے
کون ہے باعث مرنے کا کیوں یاد کریں
کون رہا جینے کا سبب ، سب بھول گئے
وقتِ جُدائی اتنا اندھیرا چھایا تھا!
کس نے چھوڑا ، کس کو ، کب ، سب بھول گئے
دل کے ورق پر لکھا سب کچھ محو ہوا!
ہجر کا دن اور وصل کی شب ، سب بھول گئے
سود و زیاں میں فرق فریبِ فکر ہوا!
موت کا ڈر ، جینے کی طلب ، سب بھول گئے
اتنی خبر ہے دیدہ و دل پر سکتہ تھا
کس نے کیا تھا مہر بلب سب بھول گئے
اُن کے آنے اور جانے کا افسانہ
یاد تھا کب تک ، کب سب بھول گئے
اُس نے کبھی پیمانِ وفا بھی باندھا تھا
کچھ دن پہلے یاد تھا ، اب سب بھول گئے
روز غزل کہتے ہو شہرت حاصل کیا!
سُننے کہنے والے جب سب بھول گئے

سلطان رشک

یک کی دستار کے خم ٹوٹ رہے ہیں
و تو ذرا قیصر و جم ٹوٹ رہے ہیں

یری جدائی ہے کہ تقسیم ہماری
س یہ ہوتا ہے کہ ہم ٹوٹ رہے ہیں

وں میں لئے پھرتے ہیں کشکول گدائی
رب مسلسل ہے کہ دم ٹوٹ رہے ہیں

ن کی فضا ہے کہ قیامت کی ادا ہے
یوں سے جو پتے تھے ہم ٹوٹ رہے ہیں

ز کیسے دیں کہ تذبذب کی فضا ہے
انے تحیر میں قدم ٹوٹ رہے ہیں

سعید کوکب

چاند اور سورج کے اُجالے تھے مرے گھر میں
یا شام، دونوں کے حوالے تھے مرے گھر میں

جب لوٹا عجب اِک جشنِ ویرانی کا منظر تھا
دیوار پر مکڑی کے جالے تھے مرے گھر میں

ن کی طرح بڑھ کر سمیٹے اپنے دامن میں
نگارے جو دشمن نے اچھالے تھے مرے گھر میں

دلیز پہ دم توڑنا، غم کا مقدر تھا
، اولاد کی صورت پالے تھے مرے گھر میں

رجب کبھی ساون رُتیں آئیں تو یاد آیا
نے پیار کے جھولے بھی ڈالے تھے مرے گھر میں

لتا ہوں پہ در گزر کرتے تھے سب کوکب
دل کشادہ ظرف والے تھے مرے گھر میں

شبنم شکیل

کبھی عزیز ہیں طوفاں کبھی کنارے ہیں
عجب عجب مری خواہش نے روپ دھارے ہیں

فضا بتائے گی جب وہ قریب پہنچے گا
کہ شہرِ غم کے بھی اپنے کچھ استعارے ہیں

کرے وہ قوتِ گویائی بھی عطا مجھ کو
صحیفے جس نے مرے قلب پر اتارے ہیں

نہ کھاؤ خوف اندھیروں سے اے اُجالے والو!
تمہاری آنکھ میں آنسو نہیں ستارے ہیں

شکستِ دل نے تجھے کیا نہیں دیا شبنم
یہ پوچھ اُن سے، جو جیتے کبھی نہ ہارے ہیں

شہزاد قمر

اس کے سارے مسکن ہیں ذات کے حصاروں میں
آدمی کو دیکھو تو آج بھی ہے غاروں میں

اُس سے کیا بچھڑنا تھا، ہم بچھڑ گئے خود سے
وہ جو گھر کی باتیں تھیں، اب ہیں اشتہاروں میں

وہ تو ہم تھے جن کو بس، ادب کر بھی جانا تھا
ورنہ کون اترا ہے اتنے تیز دھاروں میں

ہم بھی کس حقیقت کے خواب چننے نکلے تھے
رہ گئی ہیں آنکھیں ہی بے جہت ستاروں میں

گھر کے سب پیالوں میں کس نے زہر گھولا ہے؟
کس نے نفرتیں بانٹیں ماں کے ان دلاروں میں؟

خود ہی اپنی آنکھوں کو دی ہے یہ جلن شہزاد
ہم نے آگ کے منظر خود بھرے نظاروں میں

سید ضمیر جعفری

عام لوگوں کی طرح اظہارِ غم کرتے نہیں
گریہ ہم کرتے ہیں لیکن آنکھ نم کرتے نہیں

لفظ کو مرنے نہ دیں پھولوں کو مرجھانے نہ دیں
کام کچھ اِس کے سوا اہلِ قلم کرتے نہیں

گھر کے دروازے نہ تم کھولو یہ ہم کو ناپسند!
ہم صرف محراب چمکائیں، یہ ہم کرتے نہیں

کربلا کا نام تو ہم صبح و شام لیتے ہیں، مگر
کربلا کو آج بھی پانی بہم کرتے نہیں

اب گھروں میں صرف پتھر ہی نہ رہ جائیں کہ ہم
صحن کم کرتے ہیں دیواروں کو کم کرتے نہیں

تخت والوں سے کہہ کے اپنے لفظ کم کرتے نہیں
دل کی برساتوں کو بے موسم رقم کرتے نہیں

عقیل عباس جعفری

ہیں بظاہر مطمئن یوں تو سبھی اپنی جگہ
ہاں مگر اک نام پر ہے بے کلی اپنی جگہ

آج تک قائم ہے اس کے لوٹ آنے کی اُمید
آج تک ٹھہری ہوئی ہے زندگی اپنی جگہ

گھر بنایا تھا بڑی محنت سے لیکن آج بھی
جانے کیوں باقی ہے وہ آوارگی اپنی جگہ

آسماں کی وسعتوں کو کر لیا تسخیر پھر
لوٹ کر گھر آ گیا ہے آدمی اپنی جگہ

لاکھ یہ چاہا کہ اس کو بھول جاؤں [illegible]
[illegible] اپنی جگہ [illegible] ہے لیکن اپنی جگہ

طاہر عباس بخاری

حالات رہیں پیشِ نظر جاگتے رہنا
بستی پہ ہے شبخون کا ڈر جاگتے رہنا

ممکن ہے کہ تاریکیٔ شب میں کوئی غدار
پھر کھول دے اس شہر کا در، جاگتے رہنا

پھر چال نہ چل جائیں اندھیروں کے مداری
پھر دور نہ ہو جائے سحر، جاگتے رہنا

آئیں گے ابھی اور کئی سخت مقامات
باقی ہے ابھی اور سفر، جاگتے رہنا

جب تک نہ ہو موصول کوئی خیر کا پیغام
جب تک نہ ملے کوئی خبر، جاگتے رہنا

علی اصغر عباس

غبارِ شام میں ڈوبا ہے آج کا دن بھی
ہمارے ساتھ مشقت سے تھک گیا دن بھی

کہا جو رُکنے کو ہم نے وہ ایک پل کے لئے
مسافرت کا بہانہ بنا گیا دن بھی

عجیب شخص تھا، سورج کے ساتھ ساتھ چلا
گیا سفر پہ تو ساتھ اپنے لے گیا دن بھی

اب ایک عمر گزاریں گے کس طرح تنہا
تری جدائی میں جن سے نہ کٹ سکا دن بھی

پرندے لوٹ کے آئے تو دیکھتے کیا ہیں
شجر کے ساتھ لپٹ کر تو کٹ چکا دن بھی

محمد ایوب

پتّے پتّے کو جُدا کرنے لگی
کام کیا تازہ ہوا کرنے لگی

اُن فصیلوں سے نکلنا کیا ہوا
روشنی بے دست و پا کرنے لگی

اور اب اس کا مداوا کیا کریں
قتل کی موجِ صبا کرنے لگی

دل کا صحرا یوں سمندر پی گیا
آنکھ پانی کی دعا کرنے لگی

ظلمتِ شب میں مسیحائی تری
سوئے زخموں کو ہرا کرنے لگی

عبدالرحمٰن خالد

آنکھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں
پھر بھی سب کچھ کہہ جاتی ہیں

اشکوں کے سیلاب میں اکثر
زندہ لاشیں بہہ جاتی ہیں

بڑھ جاتے ہیں خوف کے سائے
جب دیواریں ڈھہ جاتی ہیں

دل دریا میں درد چٹانیں
کتنی تہہ در تہہ جاتی ہیں

مائیں ہوتی ہیں پھر مائیں
بیٹوں کے دُکھ سہہ جاتی ہیں

زخم تو بھر جاتے ہیں خالد
ٹیسیں باقی رہ جاتی ہیں

علامہ طالب جوہری

اس کی سرد حویلی تک دُھوپ کا پہرا تھا
اوٹ میں سوکھی جھاڑی کے سایہ چھپ کر بیٹھا تھا

گونج رہی تھی جب یہ صدا اسمار کی تشریح کرو
بول رہا تھا صرف انسان چار طرف سناٹا تھا

ماہی گیر اکیلا تھا، لوٹ کے کیسے گھر آیا!
ناؤ کے چپّو ٹوٹے تھے اور سمندر گہرا تھا

ہم نے جو گھر بار تجا ایک ستارے کی خاطر
اُن دیکھی دنیاؤں سے کوئی سا ایسا رشتہ تھا!

فطرت کی بے ظرفی بھی کیا کیا روپ بدلتی ہے
آگ لگی تھی جب گھر میں بادل ٹوٹ کے برسا تھا

سایہ بانٹنے والا خود سائے سے محروم رہے
قسمت نے ان پیڑوں کو دھوپ میں جلتا رکھا تھا

کوزہ گروں کی بستی میں مٹی کی کمیابی سے
کو زے کتنے مہنگے تھے پانی کتنا سستا تھا!

اک موہوم نشانی پر طالب ہم نے کوچ کیا
منزل بھی انجانی تھی رستہ بھی اَن دیکھا تھا

ظفر اقبال

زمین سہمی ہوئی ہے اور ستارے رُک گئے ہیں
یہ کیسی رات ہے، سارے کے سارے رُک گئے ہیں

تماشائے سفر جاری ہے گویا خواب در خواب
بھٹکتے ہیں قدم لیکن ہمارے رُک گئے ہیں

کسی صورت کہیں بار دگر جل بجھ سکیں ہم
اگر اس راکھ سے اُٹھتے شرارے رُک گئے ہیں

ہماری سرزمیں سمتیں ہی کھو بیٹھی ہے اپنی
ہمارے آسمانوں کے اشارے رُک گئے ہیں

ہوا حیران ہو کر تھم گئی ہے باغ تا باغ
مہکتے موسموں کے سبز دھارے رُک گئے ہیں

زمیں پر سو گئی ہیں بہتے بہتے میری ندیاں
فلک پر چلتے چلتے میرے پیارے رُک گئے ہیں

ہمیں رُکنا نہیں تھا اس مسافت میں کہیں پر
یہ کیا دیوار تھی جس کے سہارے رُک گئے ہیں

روانی سے زیادہ روشنی تھی راستوں پر
اب آ کر شامِ غربت کے کنارے رُک گئے ہیں

یہ خاک خشک پیاسی ہی پڑی رہ جائے شاید
ظفر لگتا ہے سب دریا تمہارے رُک گئے ہیں

غلام محمد قاصر

بس ایک یہ منظر تہہِ افلاک نہ بدلے
اے شہرِ وفا! رنگ تری خاک نہ بدلے

ہر آنکھ اسے پیرہنِ سبز میں دیکھے
اے کاش وہ تا دیر یہ پوشاک نہ بدلے

اس عہد نے پتھر کی لکیریں بھی بدل دیں
اس پر بھی مرے صاحبِ ادراک نہ بدلے

پانی بھی نیا، رنگِ روانی بھی نیا ہے
اب ڈوب ہی جائیں گے جو تیراک نہ بدلے

سر پشت سے افلاس کا رُخ میری طرف ہے
یہ آگ ہے وہ، جو خس و خاشاک نہ بدلے

اس دن تو اُترتے ہیں تمناؤں کے موسم
کیوں آب و ہوا لے دلِ صد چاک نہ بدلے

عاطر عثمانی

سحر ہونے سے پہلے گھر گئے ہیں
ستارے روشنی سے ڈر گئے ہیں

جو میری آستیں میں پل رہے تھے
وہ اپنا کام آخر کر گئے ہیں

جہاں جھکتے تھے سر خود بے خودی میں
گئے وہ آستاں، وہ در گئے ہیں

تمہارے نام سے زندہ رہیں گے
تمہارے پیار میں جو مر گئے ہیں

خدارا اب تو کوئی تیر پھینکو
پرانے زخم اب تو بھر گئے ہیں

حصارِ ذات کے آسیب عاطر
بشر کی وحشتوں سے ڈر گئے ہیں

عدنان بیگ

میرے لیے یہ خلوتِ جاں اور ہی کچھ ہے
میں اور ہی کچھ ہوں یہ جہاں اور ہی کچھ ہے

یہ بات یقینی ہے کہ تم آ نہ سکو گے
اِس رات مگر دل کو گماں اور ہی کچھ ہے

تنقید کیا کرتے تھے ہم اہلِ جنوں پر
یہ قریۂ وحشت تو میاں اور ہی کچھ ہے

باہر سے میں کچھ اور نظر آتا ہوں لیکن
دیکھو مرے اندر کہ جہاں اور ہی کچھ ہے

ہم لوگ ترے دھیان کی جنت کے مکیں ہیں
اپنے لئے یہ جائے اماں اور ہی کچھ ہے

تم اور ہی کچھ اُس کو سمجھتے رہے اب تک
وہ شخص تو عدنان میاں اور ہی کچھ ہے

عباس تابش

اِک ٹہنی پہ پھولے پھلے ہیں پاکستان اور میں
ہر موسم میں ساتھ رہے ہیں پاکستان اور میں
کالی رات ہوا طوفانی مولا پار اُتار
ایک ہی کشتی میں بیٹھے ہیں پاکستان اور میں
غافل بھی نہیں رہنے دیتی خوف سے کی رات
باری باری سو لیتے ہیں پاکستان اور میں
اس کے سر پہ باپ کی پگڑی میں ہوں نافرمان
ایک ہی شخص کے دو بیٹے ہیں پاکستان اور میں
اور ابھی کچھ وقت لگے گا تھکن اُتارنے میں
ہجرت کرکے آئے ہوئے ہیں پاکستان اور میں
کوئی بھی ہم کو بُری نظر سے دیکھ نہیں سکتا
سورج کے ہم شکل بنے ہیں پاکستان اور میں
اپنی مثال تو یوں ہے تابش جیسے دو مجذوب
اپنے آپ میں گم رہتے ہیں پاکستان اور میں

فہیم شناس کاظمی

چراغ آخرِ شب تک نظر تیا بتاہے
لہو ہمارا ہمیشہ سفر میں رہتا ہے
نہیں ہے وہ تو یہاں گفتگو کریں کس سے
ہمارا دھیان تو اس کی خبر میں رہتا ہے
اُسے جو دیکھوں تو بس اس کو دیکھتا جاؤں
وہ حسن خاص بڑے کروفر میں رہتا ہے
تمہارے خواب مرے رتجگوں میں جاگتے ہیں
تمہارا چہرہ مری چشمِ تر میں رہتا ہے
ستارے شام سے اب آنکھیں موند لیتے ہیں
عجب سکوت سا دیوار و در میں رہتا ہے
وہاں پہ کیسے بنا راستہ ترا شے کوئی
ہر ایک شخص جہاں اپنے ڈر میں رہتا ہے
کبھی یہاں بھی دعائیں سنائی جاتی تھیں
یہ شہرِ خاک جو اب شور و شر میں رہتا ہے
کبھی اسے بھی ہو احساس اپنی حالت کا
شناس اب تو غبارِ سفر میں رہتا ہے

لطیف ساحل

تصویر سا کیوں بنا ہوا ہے
اے شہر نگار کیا ہوا ہے

ہاتھوں پہ چراغ جل رہے ہیں
دیوار پہ دل دھرا ہوا ہے

میں زخم چھپا چھپا کے رکھوں
یہ پھول ترا دیا ہوا ہے

چہکی ہیں جو خواہشوں کی چڑیاں
پھر دل کا شجر ہرا ہوا ہے

پھر مڑ کے بہار دیکھتی ہے
اک پھول ابھی کھلا ہوا ہے

دشمن کی بھی خیر چاہتا ہوں
ہر لفظ مرا دعا ہوا ہے

وہ پھر سے ہے مہربان ہم پر
وہ غیر سے پھر ملا ہوا ہے

قتیل شفائی

نہ ہو فن کار باقی، اُس کا فن موجود رہتا ہے
پرندہ اُڑ بھی جائے تو چمن موجود رہتا ہے
سبھی کرتے ہیں اُس کا تذکرہ میرے حوالے سے
ہر اک محفل میں وہ جانِ سخن موجود رہتا ہے
نہیں پڑتی ہے جب تک ماند اس کی بوئے پیراہن
مری آغوش میں اُس کا بدن موجود رہتا ہے
چلا جائے وہ دنیا چھوڑ کر، سر پھوڑ کر اپنا
مگر تیشے کے دل میں کوہکن موجود رہتا ہے
جہاں دو مسلکوں کے رہنما یک جا نظر آئیں
ہمیشہ اُس جگہ اِک گورکن موجود رہتا ہے
نہیں ہے واسطہ اپنا دکھاوے کے جہادوں سے
ہمارے باطنی سر پہ کفن موجود رہتا ہے
کوئی دور آئے، کتنی مشکلات آئیں قتیل اُس پر
غزل میں زندگی کا بانکپن موجود رہتا ہے

محمود رحیم

پیار دے ایسی وسعتوں جیسا
ہجر ہو مجھ کو راحتوں جیسا
دیکھنا بھی کسک ہے سینے کی
سوچنا بھی اذیتوں جیسا
بات کہنا نئے تناظر میں
عشق کرنا روایتوں جیسا
موت شاید مصیبتیں ٹالے
اپنا جینا مصیبتوں جیسا
آئینے میں تو عکس بے تاثیر
تیری آنکھوں میں قربتوں جیسا
خاک واپس بھی مانگ سکتی ہے
قرض اپنا، شناختوں جیسا
پھر کوئی بخش بے تھکن منزل
پھر سفر دے رفاقتوں جیسا
سو روئیے شرافتوں کے رحیم
ایک لہجہ بغاوتوں جیسا

محشر بدایونی

آ گیا زیست میں ہنگام یہ کیا
ایک لمحہ نہیں آرام یہ کیا
کل بھی بازاروں میں سناٹا تھا
بند ہیں آج بھی سب کام یہ کیا
سر پہ سایہ تو وہی ہے لیکن
دل کو ڈستے ہیں در و بام یہ کیا
کیسی گلیوں میں تھی رونق ہر شب
شہر سونا ہے سرِ شام یہ کیا
کتنے آسودۂ ناموس تھے لوگ
خیریں ہوتی ہیں نیلام یہ کیا
سچ کے مسلک میں ہمیں فرض گزار
ہم پہ ہی سیکڑوں الزام یہ کیا
جشن نزدیک کے گھر میں تھا ابھی
اور ابھی پا گیا کہرام یہ کیا

واصف سجاد

صرف نادانیوں کا نام نہیں
عشق آسانیوں کا نام نہیں

زندگی اور بھی بہت کچھ ہے
یہ پریشانیوں کا نام نہیں

تجھ سے بے درد کا بچھڑ جانا
دل کی ویرانیوں کا نام نہیں

سچ کا عکاس بھی ہے آئینہ
صرف حیرانیوں کا نام نہیں

جس نے دیکھا اُسے کہا واصف
دن ہی تابانیوں کا نام نہیں

محمد سلیم شہ

خیال سو گئے ذہنوں کے سر
کوئی کہیں ہی نہیں مقابِ
وہ اک بہانہ بھی ہوتا تو بات
گزر ہی جائے گی عمرِ رواں
امیرِ وقت کو آزادیوں کا
پھر اہلِ شہر تھے کیوں بند قید
زمین ظلم و ستم میں کچھ اُن سے
شریکِ کار ہے یہ بھی تو آ
گلشن کا گھر فضاؤں پہ اِس ط
کہ شعر سے جذبے اسکتے ہیں
خزاں کے جور سے کلیں نہ خود
اک ایسا وقت بھی گزرا ہے
جو میرے دل کی زباں کو سمجھ
ملا نہ ایک بھی ایسا زبان

محیط اسمٰعیل

تمہاری راہ سے ہٹ کر نہ جانے ہم کہاں پہنچے
زمیں ہی مستقر ٹھہری نہ سیدھے آسماں پہنچے
ہمیں کو شوق تھا کچھ بے خودی کی تہہ میں جانے کا
سفینہ یاد کا لے کر بھنور کے درمیاں پہنچے
پڑاؤ سے کہیں زنجیر پڑ جائے نہ پیروں میں
ہٹا لیتا ہے منزل بھی کو جب تک کارواں پہنچے
سفر سے لوٹنا بھی کس قدر تکلیف دہ ٹھہرا
کوئی مانوس اک تنکا نہ تھا جب آشیاں پہنچے
تو آخر کچھ تو ہونی چاہیے پھولوں کی جانب سے
عجب آتی دور سے چل کر گلستاں میں خزاں پہنچے
لئے ترکِ تعلق میں تامل ہے ابھی شاید
تھے ہم تو بے وفا کیوں پھر قریبِ امتحاں پہنچے
محیط افسوس کوئی تجربہ اپنے نہ کام آیا
یہاں بھی دور تھا آنکھوں کے آگے ہم جہاں پہنچے

مرتضیٰ برلاس

وقتِ ایجابِ دعا تھا کوئی نعمت مانگتے
سامنے جابر کے سچ کہنے کی جرأت مانگتے
جن کے آنکھیں تھیں انہیں بھی کچھ نظر آتا نہ تھا
ایسے اندھے شہر میں ہم کیا بصارت مانگتے
یہ بھی کیا کہ ہاتھ تو پھیلا گر بولے نہ کچھ
مانگنا ہی تھا تو پھر حسبِ ضرورت مانگتے
چارہ جوئی خواہشوں کے قتل کی کرتا مگر
منصفینِ وقت تو عینی شہادت مانگتے
اُن سے کیوں اُمید رکھتے جن کے کام آتے تھے ہم
کیا خلوصِ دل کی ہم دنیا سے قیمت مانگتے
تم تو عقدِ وصل دے کر بھی نہ کر پاتے ادا
ہم اگر اس کارِ جاں سوزی کی اُجرت مانگتے
تھا بضد جیسا کہ وہ ٹیلے پہ اب محفوظ ہے
پھر نزولِ قہر کی ہم کیسے مہلت مانگتے

مقصود وفا

جو ہو یارو بہر صورت چراغوں کو جا
ہوائیں کتنی برہم ہیں یہ ہم نے جا
تمہیں یہ ماننا ہوگا کہ ہم نے اپنے لب
سکوتِ شب کی مٹی میں کوئی موفا
شبِ ہجراں میں در آتی ہیں کیسے یہ
تماشا ہائے خلوت نے ہمیں حیران

تری جھولی میں لا ڈالیں گے قرضے اس
کہ ہم شوریدہ سر ہیں کب کوئی احسا

ہمیں شوق اذیت ہے وگرنہ اس
تری یادیں جلانے کو بہت سامان
سجا سکتے تھے یادوں کے کئی چہرے
مگر کچھ سوچ کر ہم نے یہ گھر ویرا
فصیلِ جاں کے قیدی ہیں مگر یہ جیا
ہوا کے واسطے ہم نے در امکان

ناصر زیدی

جو میری آخری خواہش کی ترجماں ٹھہری
وہ ایک غارتِ جاں ہی متاعِ جاں ٹھہری

یہ غم نہیں کہ مرا آشیاں رہا نہ رہا
خوشی یہ ہے کہ نہیں برق بے اماں ٹھہری

وہ تیری چشمِ فسوں ساز تھی کہ موجِ کرم
وہیں وہیں پہ میں ڈوبا جہاں جہاں ٹھہری

کبھی تھے اس میں مری زندگی کے ہنگامے
وہ اک گلی جو گزرگاہِ دشمناں ٹھہری

وہی تھی زیست کا حاصل وہی تھی نعمتِ حیات
وہ ایک ساعتِ دلگیر جو بیکراں ٹھہری

میں اُس کو بھول بھی جاؤں تو کس طرح ناصر
جو شہرِ خاص میرے، اُن کے درمیاں ٹھہری

نسیم سحر

جس قدر اُس کے کرم کی بارشیں ہوتی رہیں
تشنگی میں غرق اپنی خواہشیں ہوتی رہیں

گھر کی دیواروں میں جتنی لرزشیں ہوتی رہیں
زلزلوں کی اتنی ہم پر یورشیں ہوتی رہیں

پیچھے پیچھے چاٹتا جاتا تھا دیمک بھی اُسے
اندرونِ مکاں زیبائشیں ہوتی رہیں

اس میں خفیہ ہاتھ بھی شاید مرے اعدا کا ہو
اپنے حلقے میں مگر سب سازشیں ہوتی رہیں

خشک سالی نے سبھی کھیتوں کو صحرا کر دیا
اور پھر کتنے دنوں بے وقت بارشیں ہوتی رہیں

کچھ تو اپنا عہد بھی تھا عہدِ پرساں نسیم
اور کچھ ہم سے بھی اکثر لغزشیں ہوتی رہیں

یوسف حسن

کچھ کر زیرِ فلک اپنی آبرو کیا ہے
زمیں کا خواب تھا کیا خواب کی نمو کیا ہے

کچھ ایسے مسخ ہوئے خدوخال چہروں کے
کہ آئینے بھی کہیں اپنے روبرو کیا ہے

نہ اعتبار ہے کوئی نہ اختیار کوئی
پھر اس گلی سے گزرنے کی آرزو کیا ہے

وہ نگاہ وہی راہ آشنائی کی
غبارِ شام میں اور اپنی جستجو کیا ہے

ہم اپنی سمت جو آئیں تو کچھ خبر پائیں
رضائے دوست ہے کیا نیتِ عدو کیا ہے

مسافروں کے قدم ڈولنے لگے یوسف
ہواؤں اور چراغوں میں گفتگو کیا ہے

نعیم ثاقب

شاخ در شاخ کئی بار سجا دیں آنکھیں
پھر بھی حالات نے مٹی میں ملا دیں آنکھیں
اس سے پہلے کہ لہو ان کا مقدر ہوتا
ہم نے چپ چاپ سرِ شام بجھا دیں آنکھیں
ایک تو ہی تھا جو بس اپنا مہکتا تھا
آئینے، تو نے بھی کیوں آج دکھا دیں آنکھیں
جسم کے سارے گناہ تھے مرے مصرف میں
اُس نے پردے میں مگر اپنی چھپا دیں آنکھیں
جانتا ہوں وہ کسی طور نہیں لوٹے گا
پھر بھی ہر صبح کو کھڑکی میں سجا دیں آنکھیں
سانس کی تار تو غربت سے نہ ٹوٹی لیکن
میرے چہرے پہ اُگیں اُس نے بجھا دیں آنکھیں
منتظر رہتا ہے اُس پار وہ میرا شاید
میں بھی صبح کے دریا میں بہا دیں آنکھیں
لوٹ آئیں گے کبھی میرے خدا ثاقب
بہتے پانی پہ بھی اب میں نے لگا دیں آنکھیں

مسعود اکاڑوی

تجھ سے بچھڑے ہیں تو سنسان ہوئے ہیں کیسے
آئینہ دیکھ کے حیران ہوئے ہیں کیسے

ماننے والے کو مارا ہے اِسی الجھن نے
وہ جو مشکل میں تھے آسان ہوئے ہیں کیسے

سر میں سودا ہے نہ آنکھوں میں ستارا کوئی
اس قدر بے سروسامان ہوئے ہیں کیسے

زندگی بھر کا سفر چار قدم چلنا تھا
آبلے پاؤں کے بلطان ہوئے ہیں کیسے

لوٹ کر آیا تو لے کے لئے سوچے گا
یہ در و بام بیابان ہوئے ہیں کیسے

مطمئن میں بھی نہیں اس کو بھی پچھتاوا ہے
فیصلہ کر کے پشیمان ہوئے ہیں کیسے

وہ جو قسمیں تھیں مرے نام پہ مر مٹنے کی
اب کسی اور سے پیمان ہوئے ہیں کیسے

نکہت یاسمین گل

گل بوٹے میں کاڑھ کے دامن کے ورق سجاتی جاؤں
آنکھوں سے اک موتی لے لوں، بیج لگاتی جاؤں

پلک پلک شبنم سے سجاؤں، راہ تکوں سورج کی
چھائی ہے گھنگھور گھٹا، پر آس لگاتی جاؤں

کتنا سکوں محسوس کروں جب بیٹھے بیٹھے
ہاتھ سے تیرا نام لکھوں، پھر آنکھوں سے لگاتی جاؤں

تیز ہوا کے جھکڑ، بارش اور گلی کا پانی
دیکھ کے جانے کیا کیا سوچوں اور گھبراتی جاؤں

لوٹ گئے جو اس دھرتی کے مکین سکھ سے
وہ دو کبھی اک نظر کر دو اپنی جاؤں

شیخ حسین
شروت منزل۔ مکان نمبر ۱۱-۱۲-۱ شاہ بازار اورنگ آباد (مہاراشٹر)

صدیوں پُرانا آدمی

دُنیاداری سے اُکتایا ہوا ایک شخص جوگی بننے کے بعد جب اپنے گیان دھیان کے حصار سے باہر نکلا تو اُسے اپنی بستی یاد آنے لگی۔ وہ آسن یاد آنے لگا جس پر بیٹھ کر وہ لوگوں کو گیان دیا کرتا تھا۔ سفید گھنی بھوؤں کے نیچے سے پلکوں کی چادر کو اُٹھا کر اُس نے ایک نظر اپنے اطراف بکھرے ہوئے منظر پر ڈالی۔ پھر اپنے آپ کا جائزہ لیا۔ سُنسان جنگل کے پیڑ پودوں نے اُسے جکڑ لیا تھا۔ وہ ایک آہ بھر کر رہ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اُس نے اپنے آپ پر قابو پایا اور پوری سختی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پیڑ پودوں کی ٹہنیاں ٹوٹ ٹوٹ کر اُس کے قدموں میں گرنے لگیں۔ اور وہ انھیں نہایت بےدردی سے کچلتا ہوا بستی کی طرف بڑھنے لگا۔

جونہی اُس نے اُمید بھری نظروں سے بستی کی طرف دیکھا، ٹھٹھک گیا۔ چھوٹے بڑے راکشسوں کو ساری بستی میں آباد پایا۔ اُن کے دہانے دھواں اُگل رہے تھے۔ صدیوں سے تھکے ہوئے قدم لڑکھڑاتے ہوئے بستی کی طرف اُٹھ رہے تھے۔ اور رات کی چادر میں چھپا ہوا دن آہستہ آہستہ مُسکرا رہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں سے اُمید افزا کرنیں پھوٹنے لگیں۔ وہ بستی کی دہلیز پر ٹھٹھک کر رہ گیا۔ کوئی پرندہ پھڑپھڑا کر اُس کے قدموں پر گر پڑا۔ ساری بستی جالوں سے پٹی پڑی تھی۔ ایک لمحہ کو اُس نے کچھ سوچا اور پھر جالوں بھری بستی میں داخل ہو گیا۔ خطرناک جالوں کی باہیں اُس سے لپٹنے لگیں۔ اُس نے اپنی لاٹھی پر مضبوط گرفت کی، اور پھر اُسے خلاؤں میں گھماتے ہوئے اور راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ راکشسوں کے دہانوں سے دھواں اُبلنے لگا، اور اُن کے خوف سے مُرجھاتے ہوئے لوگ جوگی اور راکشسوں کے درمیان سہمے ہوئے حیرت زدہ تھے۔ مکڑیوں نے پوری طرح ان کے اطراف جالے بُن دیے تھے۔ وہ سوچنے لگا میں تو دنیاداری سے اُکتا گیا تھا، اور ضعیفی کے جالے میرے دل و دماغ پر چھا گئے تھے۔ لیکن اِس بستی کے لوگوں کو کیا ہوا۔؟ وہ بستی پر پھیلے ہوئے جالوں کو توڑتا ہوا قدم اُٹھائے چلا جا رہا تھا۔ بستی کے لوگوں کے جسموں پر بےچینی کی چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ اور وہ خوف کے مارے گھگھیانے لگے تھے۔ "پاگل ہے۔ ؟ کوئی دیوانہ" جانے کیوں وہ خلاؤں میں لاٹھی گھمانے لگا۔ اور پھر کچھ بعد دیکھتے دیکھتے آوازوں کا شور بڑھتا گیا۔ جوگی کی آنکھوں سے خوف کا کبوتر لمحہ بھر پھڑپھڑایا اور پھر اندر ہی اندر اُتر گیا۔ اُس نے لوگوں کی طرف دیکھا، وہ سب جکڑے ہوئے تھے۔ پھر وہ کہنے لگا "توڑ دو اِن جالوں کو سب مل کر توڑ دو گے جلد یہ سب جالے ختم ہو جائیں گے تم اس بستی کے لیے مجاہد ثابت ہو سکتے۔ دیکھو ساری کائنات سِسک رہی ہے۔ جانے کب یہ جالے بڑھتے بڑھتے حسین دنیا کو آخری ہچکی لینے پر مجبور کر دیں۔ انھیں توڑ دو ورنہ یاد رکھو تم سب گھٹ کر مر جاؤ گے۔" بستی کے سارے لوگ اُس کے اطراف جمع ہو گئے۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ لیکن جالے کہاں ہیں؟ ہونٹوں سے سرگوشیاں اُبھریں۔ اُن کے جسموں سے چیونٹیاں نیچے اترنے لگیں اور انھیں دوبارہ گھسیٹ گھسیٹ کر دُور کرنے لگیں۔ جوگی پکارتا رہا۔ رُک جاؤ۔ اِن جالوں کو پھینکو۔ تمہارے آگے چیونٹیوں کی کوئی حقیقت نہیں تم بس ارادہ ہی کر لو تمہارے قدم رُک جائیں گے۔ لیکن چیونٹیاں انھیں گھسیٹتی رہیں۔

جوگی نے پھر جالے توڑنا شروع کر دیے اِس سمت سے اُس سمت اور اُس سمت سے سمت تک۔ لیکن وہ جب بھی پلٹ کر دیکھتا جالے نظر آتے۔ آخر وہ تھک گیا۔ اور سوچنے لگا میں تنہا کب تک اِن جالوں سے لڑتا رہوں گا۔ اسکے سُست ہاتھ تھم گئے۔ اور وہ نیچے بیٹھ گیا، اچانک اُسے نروان ملا۔ "ان جالوں سے نجات کا ایک ہی راستہ ہے! میرا آسن کہاں ہے؟ جہاں گیان دھیان کی باتیں سمجھایا کرتا تھا۔ مجھے اپنے آسن کو تلاش کرنا چاہیے"

اب وہ جالوں میں اُلجھتا ہوا اپنے ہی آسن کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ چلتے چلتے اُس کے قدم پھر ٹھٹھک گئے۔ سامنے جالوں سے تنا ہوا ایک راستہ تھا۔ جالوں کے اِس طرف ایک بھیڑ تھی اور ایک شخص اِس بھیڑ کو عینکیں تقسیم کر رہا تھا۔ وہ تیزی سے جالوں کو صاف کرتا ہوا اُس طرف بڑھنے لگا۔ لیکن جب پہنچا تو نہ عینک ساز تھا اور نہ عینکیں بس لوگوں کا ہجوم تھا، وہ سب جالوں میں اُلجھے ہوئے تھے، اُس نے انھیں پکارا، اور وہ اُسے دیکھتے ہی

فرار ہوگئے۔ وہ آگے بڑھا۔ اب اُس کی نظریں حلوائی کی ایک دُکان پر مرکوز ہوگئیں خاکی کپڑوں میں ملبوس حلوائی اپنی کڑھائی سے بے فکر بیٹھا تھا۔ اور سیاہ بلیاں جن کے چہرے سفید تھے، اپنی آنکھیں نیند کے آرام سے کڑھائی میں منہ ڈالے دودھ پی رہیں تھیں اور حلوائی اپنی موٹی توند پر ہاتھ پھیرے مُسکرا رہا تھا۔ کبوتر نے پھر جوگی کی آنکھوں سے پرے پرواز کی، ایک لمبا گشت لگایا اور دوبارہ جوگی کی آنکھوں کی وسعتوں میں گُم ہو گیا۔ وہ پھر تن تنہا جالے توڑتا ہوا آگے بڑھنے لگا، پتہ نہیں اِن جالوں کا سلسلہ کہاں تک پھیلا ہوا ہے، وہ کب تک اُن سے اُلجھتا رہے گا اور دُور دُور تک اُس کے سوا اپنی اُس کا پتہ نہیں تھا۔ وہ اب یہ سوچ سوچ کر ہی ڈر رہا تھا جیسے دلدل میں پھنسا کوئی انسان زمین کی تہہ کو تلاش کرتا ہے۔ اُس کی نظریں پھر ایک جگہ رُک گئیں، ایک تنومند شخص، زرق برق لباس میں ملبوس اپنے سیاہ عیب دار بڑے پیٹ کو چھپائے، ایک نیم برہنہ شخص جس کی ہڈیوں پر صرف کھال چپکی ہوئی تھی، ہنس ہنس کر اس کی پسلیاں گن رہا تھا۔ کبوتر ایک بار پھر آنکھوں کے حصار میں پھڑ پھڑایا، اور پھر باہر نکل کے ایک راہ پر آ گیا۔ جوگی پھر اپنے کام کی طرف لوٹ آیا اور جالے توڑنا شروع کر دیئے۔ سورج کی حدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ جالے توڑتا توڑتا کچھ دیر سُستانے کی خاطر جونہی درخت کے نیچے پہنچا، اسکی حیرت کی انتہا نہ رہی، سایہ درخت کے اوپر ہی اوپر پھیلا ہوا تھا۔ اس نے دوسرے درخت کی طرف دیکھا، لیکن وہاں بھی وہی منظر تھا۔

اس نے گھبرا کر بستی میں قائم اونچے نیچے گھروں کی طرف دیکھا، لیکن وہاں بھی کسی دیوار کے نیچے کوئی سایہ نہ تھا۔ بس تیز دھوپ چمک رہی تھی۔ گھبرا کر اُس نے باری باری سب گھروں کے اندر جھانکنا شروع کیا۔ کمروں کے اندر بھی تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ کمروں میں موجود لوگ اپنی اپنی چھتوں کے نیچے جھلس رہے تھے۔ اور سارے دروازوں اور دریچوں پر دبیز سیاہ جالے جھول رہے تھے۔ ہر گھر کی چوکھٹ پر ایک سیاہ ڈبہ کھلا ہوا تھا۔ ہر ڈبے کے اندر ایک دہشت ناک اژدھا اپنے چہرے پر خوبصورت مکھوٹا چڑھائے اپنی سحر آلود زبان سے اُن کے دل و دماغ کو چاٹ رہا تھا۔ بچے تالیاں بجا رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے، انھیں احساس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اژدھوں کی زبان سے آگ کے شعلے برس رہے ہیں اور اُن کا دماغ پگھل کر بہہ رہا ہے۔

جوگی کی آنکھوں کا کبوتر اب کی بار ایک لمبی اُڑان لے کر جب اُس کی آنکھوں میں اُترا تو جوگی کے دماغ میں پھر ایک عجیب سنسنی دوڑی۔ اُس نے جالے توڑتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو روک لیا۔ اور سوچنے لگا کہ اب وہ جالے نہیں توڑے گا بلکہ اس بڑی مکڑی کا پتہ دریافت کرے گا کہ آخر وہ کہاں ہے اور اُس نے کس [illegible] کر کے یہ جالا بن بن کر رکھا ہے۔

وہ راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھا۔ اُس کے سامنے کتابوں کا ایک پہاڑ تھا جس پر ایک لومڑی اونگھ رہی تھی۔ اسے دیمک کا سا لگا اور سامنے بیٹھے تھے کسی حادثے کی بو سونگھنے لگے۔ آنکھوں میں اب کے کبوتر نے ایک بار پھر اڑان بھرنا چاہی لیکن اُس کے پَر جیسے اپنے آپ ہی جھڑنے لگے تھے۔ اور ایک نیم برہنہ عورت اُس کی آنکھوں کی تیز شعاؤں کا ہدف بنی فضا میں اُڑ رہی تھی اور اسکے جسم سے جالے گر رہے تھے اور ساری بستی کو جکڑ رہے تھے۔ اس کی نظریں جونہی جوگی سے ٹکرائیں ایک بھیانک چیخ مار کر واپس ہو گئیں۔ جوگی اُس کے تعاقب میں بھاگنے لگا۔ نیم برہنہ عورت نے جالوں کی بارش کر دی لیکن جوگی انھیں بُری طرح روندتا ہوا تیز تیز اُس کا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ فوراً ایک اونچی عمارت میں داخل ہو گئی۔ عمارت کے دروازوں پر سنگی پہرے دار کھڑے تھے۔ جوگی انھیں بھی روندتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ تب اس کی آنکھوں نے عجیب منظر دیکھا۔ اس عمارت کے عین وسط میں اس کا گمشدہ آسن رکھا ہوا تھا۔ اور وہ برہنہ عورت اس پر براجمان تھی۔ اُس کی آنکھیں اپنے ہی نشے سے مدہوش تھیں اور لوگوں کا ایک بڑا ہجوم اُس کے آگے سجدہ ریز تھا۔

جوگی کی آنکھوں میں اب کی بار کبوتر نہیں پھڑ پھڑایا بلکہ آنسو اُمڈ آئے۔ وہ تیزی سے عمارت کے باہر نکلا۔ اور پھر ایک بار اُس منزل کی طرف لوٹنے لگا جہاں سے وہ دنیاداری کے رشتوں کو تیاگ کر آفاقی وسعتوں میں گم ہو گیا تھا۔

وہ اپنے ہی پیروں کے نشانات پر اپنے قدم جمائے واپس لوٹ رہا تھا اُس کے عقب میں کبوتر کی لاش پڑی تھی۔ بے شمار چیونٹیاں اور جالے اس سے لپٹے ہوئے تھے۔ ●

مکتوب

سلیم شہزادی سی۔ ۲۸، ٹیپرز کالونی، دہلی روڈ، پٹنہ سا
حسن نعیم صاحب کے لئے شاعر کے صفحات دے کر آپ نے
ادب دوستی اور ادیب نوازی کا ثبوت دیا ہے۔ ندا فاضلی نے ان
پر مضمون لکھ کر دوستی کا حق ضرور ادا کیا ہے مگر ان کا انداز کہیں کہیں
جارحانہ ہو گیا ہے اس سے حسن نعیم صاحب کی شخصیت مجروح ہوتی
ہے یہ مناسب نہیں اس لئے کہ اب حسن نعیم ان الزامات کا جواب
دینے سے معذور ہیں۔ مثال کے طور پر ندا فاضلی کا یہ لکھنا کہ حسن
نعیم نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دیا تھا، بالکل غلط ہے اور
سراسر الزام ہے۔ یوں بھی ہماری تہذیبی روایت رہی ہے کہ ہم
مرحومین کی زندگی میں برائیاں تلاش نہیں کرتے۔ حسن نعیم ایک
شاعر تھے اور ہمیں ان کی شاعری سے بحث کرنی چاہیے نہ کہ ذاتیات
سے خاص طور سے وہ لوگ جو خود شیشے کے گھر میں بیٹھے ہوں پتھر اٹھانے
کی غلطی نہیں کرتے۔

شمیم طارق نے مختصر مگر اچھا مضمون لکھا ہے۔ حسن نعیم
بدقسمت شاعروں میں سے تھے جن کی وقت نے قدر نہ کی۔

مرغوب شہاب ۔ ۵ ڈائمنڈ ہاربر روڈ ———— کلکتہ
شاعر کے ایک قاری ہونے کی حیثیت سے آپ سے ایک
شکایت کرنی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جہاں اس کے صوری و معنوی
محاسن کو آپ نے پیش نظر رکھا ہے کاش کہ وہاں اس کی
کتابت کی بہتری کا بھی لحاظ کرتے۔
شاعر کا شمارہ نظر سے گذرا۔ اداریہ میں آپ نے ایک نیا
لفظ "آجانا" استعمال کیا ہے۔ نہ معلوم یہ ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ
ہے یا کتابت کا سہو؟

حنیف نجمی ۔ سودھا، ملا اپروس، پوسٹ ماگل ۔۔۔ (بہار)
شاعر کے شمارہ نمبر ۵ کے تمام ہی مشمولات دلچسپ اور
معیاری ہیں مگر آپ کا اداریہ اور ڈاکٹر محمد حسنین صاحب کا
مضمون خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ مبارکباد۔

رفیع الدین ہاشمی ۔ استاد شعبۂ اردو اورینٹل کالج لاہور
شاعر کے پرچے مسلسل مل رہے ہیں۔ بے حد قابل تعریف
ہے۔ یہ آپ کی عنایت ہے کہ آپ ایسا عمدہ پرچہ پڑھنے
کو فراہم کرتے ہیں۔ شماروں کے متعلق تفصیلی خط جلد لکھوں گا
انشاء اللہ۔

راجن سرحدی ۲۰۵/۲ ڈوگرا ہال، کنال روڈ جموں توی
شاعر برابر مل رہا ہے۔ ماہ بہ ماہ اس کے حسن میں نکھار
آتا جا رہا ہے۔ اس کے معیار اور حسن میں اضافہ کرنے کے لئے آپ
نئے نئے تجربات کرتے رہتے ہیں جو بہت حد تک کامیاب
ہیں۔ جموں کشمیر کی فضا، خاص طور پر ادبی فضا کافی خراب چل
رہی ہے۔ اب ذوق و شوق کی سیرابی ممکن نظر نہیں آتی۔
بس ادبی رسائل کی چھپ چھپا لینا اور پڑھ لینا ہی مصروفیت
رہ گئی ہے۔ شکر ہے کہ شاعر اس دور میں بھی بہت اعلیٰ سرگرمی
کو باقی رکھے اور تشنہ ذہنوں کی پیاس بجھانے کی معاون ہو رہا ہے۔

زینت اقبال ۔ مونگیر (بہار)
ادب کے قارئین اور شائقین میں ایسے لوگ بھی
جنہیں اچھا شاعر یا اچھا ادیب بننے اور معیاری رسائل
میں چھپنے کی تمنا رہتی ہے۔ لیکن یہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے
تھوڑی بہت محنت یا ریاضت سے بڑا فن کار بن جائے اور
چھپنے کے لئے رسالوں میں پورے پورے صفحات مل جائیں۔
لہٰذا ایسے شوق کے مارے مکتوبات، خطوط آپ کی ڈاک
کے کالم میں اپنی تحریر کی دو چار سطور کو کالی سیاہی میں چھپا
دیکھ لیتے ہیں، انھیں کسی نہ کسی درجے میں اپنے ذوق کی تسکین
کا سامان مل جاتا ہے اور وہ کم از کم "مکتوب نگار ادیب" کہلانے
کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ مگر اب یہ بیماری اتنی زور پکڑ چکی
کہ مکتوبات کے کالم پر بھی بڑے بڑوں کا قبضہ ہو گیا ہے اور
قاری یا شاعر یا مبتدی ادیب کے لئے کوئی جگہ ہی نہیں بچی ہے۔
کے بیشتر شماروں میں بھی اب مکتوبات کے صفحوں پر بڑے
بڑے شاعروں کے نام نظر آتے ہیں۔ کیا میری بات غلط ہے

مکتوب نگار نے اپنی دانست میں سچ بولنے کی جرأت کے باوجود
پتہ تحریر نہیں کیا لیکن ادارے کو علم ہے کہ اس تحریر کی پشت پر
کون ہیں۔ "مکتوب ادیب" کے مسائل اور اس کی بحث سے قطع نظر صرف
یہ عرض کرنا ہے کہ رسالہ شاعر میں جو خطوط شائع ہوتے ہیں
بڑی تعداد میں وصول خطوط سے منتخب کئے جاتے ہیں، ان میں عام
کے خطوط کو ترجیح دی جاتی ہے۔ [ادارہ]

فکرِ امروز

میرے خیال میں ضرورتِ اصلاح کا داعی وہ ذوقِ تنقید تھا جو گیارہویں صدی ہجری کے بعد ملک میں پیدا ہوا۔ شاعری کی بڑھتی ہوئی دلچسپیوں نے بکثرت شاعر پیدا کر دیئے اور ان کے کلام پر تنقیدیں ہونے لگیں، مجبوراً شعرا کو اپنے لئے رہنمائی کی ضرورت ہوئی جو انھیں تنقید کے بے پناہ وار سے بچا سکیں۔ اور نکتہ چینیوں کے قلم و زبان سے محفوظ رکھ سکیں، اس پر بھی میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ جن شعراء کے استادوں کا تاریخ پتہ نہیں دیتی وہ کسی کے شاگرد نہ تھے۔ یہ تو مسلّم ہے کہ پرانے زمانے کے شاعر علوم متداولہ کے ماہر ہوتے تھے اور یہ علوم علمائے وقت سے حاصل کئے جاتے تھے۔ وہ آج کل کے شاعروں کی طرح نہ تھے کہ اردو کی پہلی دوسری کتاب پڑھی اور شاعر بن بیٹھے۔

[دستور الاصلاح - ۱۹۴۰ء]

شاعر

شاعر کے ۶۲ ویں سال

جلد — ۶۲
شمارہ — ۱۱

فون: ۳۵۹۹۰۳۰۱

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاونت
ناظر نعمان صدیقی

قیمت: ۷ روپے

زرِ سالانہ ۵۰ روپے — لائبریریوں سے ۶۰ روپے

تاعمر خریداری ۱۰۰۰ روپے — معاونین سے ۱۰۰ روپے — ممالکِ غیر سے ۳۵۰ روپے

ہم عصر اردو ادب نمبر ۱۹۷۷ء

کے بعد

شاعری کا

ہم عصر اردو ادب نمبر ۲

زیر ترتیب ہے

ترتیب

مقالات

نئے نام نئے استعارے

۱۹۸۵ء میں شاعر کے شمارہ نمبر ۱۲ جلد ۵۶ میں نئی شاعری۔ نئے نام کے تحت ۲۵ شعراء کا ایک خوب صورت انتخاب پیش کیا گیا تھا۔ شعراء کی تصاویر، سوانحی اشارے اور ہر شاعر کی انفرادی تخلیقی کائنات کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس پیش کش کو نہ صرف یہ کہ پسند کیا گیا بلکہ اس کی گونج مدتوں سنائی دی گئی۔ شعراء کے شعری تجزیے موضوع بحث بنے رہے ۱۹۸۵ء تک ان میں سے کئی شعراء جو اپنی پہچان بنا رہے تھے یا جن کے یہاں تخلیقی جوہر امکانی افق روشن کر رہے تھے، کئی نام بلکہ بیشتر نام یا تو اعتبار پا چکے ہیں یا پھر علمی و ادبی حلقوں میں جن کا ذکر [illegible] ہوتا رہتا ہے اور یہ بڑی بات ہے۔ گو یہ بحث [illegible] ہے کہ موجودہ تنقیدی رویوں میں یہ سارے نام کہاں اور کتنا موضوع بحث بنے ہیں، حوالوں میں آتے ہیں، فہرستوں میں شامل ہوتے ہیں۔ اجتماعی ذہنی گونج بنے ہوئے ہیں یا صرف ذاتی خطوط تک محدود ہیں۔

اسی سلسلے کی توسیع کے طور پر نئی شاعری۔ نئے نام ۔ ۲ کے لیے ہم نے ۳۵، ۴۰ شعراء کا ایک بار پھر انتخاب کیا۔ جسے ۱۹۸۶ء، ۸۷ء تک شاعر میں پیش کرنا تھا۔ نئے شعراء نے اپنی تخلیقات ارسال بھی کیں، وعدے بھی ہوئے، یاد دہانیوں کے باوجود بعض ناگزیر وجوہات کے سبب اس سلسلے کی دوسری قسط پیش نہیں کی جا سکی ہاں یہ ضرور ہوا کہ شاعر کی اپنی دیرینہ روایت کے تحت بغیر کسی حوالے کے ان شعراء کا کلام شائع کیا جاتا رہا۔ ہم پر ایک قرض تھا جس کی ادائیگی اب ایک دوسرے ڈھنگ سے کی جا رہی ہے۔ جو شعراء اس دوسری قسط میں شامل ہیں ان میں سے کئی ایک صاحب دیوان ہیں یا جن کے شعری مجموعے شائع ہونے والے ہیں بعض بالکل نئے ہیں۔ یہ سارا کلام بہت حد تک غیر مطبوعہ بھی نہیں رہا کہ یہ چند سال پہلے کا ہے۔ لیکن ایک معیار ضرور بتاتا ہے۔ ان میں کئی نام ایسے ہیں جنھوں نے اپنی شاعری میں اچھی اور کچی بلکہ اپنی شاعری کے امکانات روشن کیے ہیں۔ ابھی تیسری چوتھی قسط شاعر میں آنا باقی ہے کہ ۱۹۸۰ء کے بعد کچھ اور نئے نام اپنی شاعری کے ذریعہ مکالمہ کر رہے ہیں، اپنی شاعری واردات میں کہیں بچے، کہیں مختلف اسلوب میں اپنے عہد کو تخلیقی [illegible] کر رہے ہیں جن کے یہاں ختم ہوتی ہوئی بیسویں صدی کے تاریخی [illegible] ہیں اور ۲۱ویں صدی کی دھڑکنیں ہیں۔

نئی شاعری، نئے استعارے کے اس انتخاب کو اس کے ساتھ چھپے ہوئے چھوٹے چھوٹے جملوں کو "غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ" کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ انتخاب کئی نئے سوال بنائے گا، سامنے سوال رد کرے گا۔

اختر اورینوی بنام اعجاز صدیقی

No. 8 Chhajjubagh Quarters,
Patna - 4

S. A. Ahmad, M. A; D. Litt;
PROF. & HEAD OF THE DEPTT. OF URDU.
PATNA UNIVERSITY.

Dated 24. 10.

مجی اعجاز صدیقی صاحب، السلام علیکم

شاعر کے اکثر شمارے نظروں سے گزرتے رہتے ہیں۔ آپ جس خلوص و محنت سے اس جریدہ کے ذریعہ
کی خدمت کر رہے ہیں وہ قابل ستائش ہے۔ سب سے بڑی خوبی جو میں دیکھ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ شاعر کے
ت میں پرانے فنکاروں کی نگارشات قلم کے ساتھ ساتھ نئے فنکاروں کے معیاری مضامین نظم و نثر بھی
ع کرتے ہیں۔ اس سے نئی نسل کے ابھرتے ہوئے قلمکاروں کی ہمت افزائی بھی ہوتی ہے، لہٰذا یہ ایک بڑا
م ہے۔

میں مدت سے شاعر کے لئے کچھ لکھنے کی فکر میں تھا، لیکن یونیورسٹی کی بڑھتی ہوئی مصروفیات
ساتھ خود اپنی تساہل برابر سدِ راہ رہی۔ بہرحال اتفاق سے ایک تنقیدی مضمون لکھ سکا ہوں جو
بے ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ ایک مدت سے مجھ پر شاعر کا جو قرض چلا آ رہا تھا وہ اس مضمون
سے کسی حد تک ادا ہو جائے گا۔

امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

آپ کا مخلص

اختر اورینوی

بہ خطِ شاعر



شفیق مجیبی

شامت سمندر جیسا جب ہے دھوم مچانے والا
اپنے دل کی دیواروں سے سر ٹکرانے والا

دل کی راہ گزر کھلتی ہے جانے کیسا رستہ
اک مدت سے کوئی نہیں جب آنے جانے والا

اس چھوٹی اوقات پہ اپنی کس سے رکھنا بیر
آنکھیں نیر بہانے والی دل گھبرانے والا

اتنا الگ لگاؤ ہے باقی اب بھی شہر میں جبر
مرہم لیکر آجاتا ہے زخم لگانے والا

چاند چمکتا موجوں پر تھا گہری نیندیں کشتی
کس کو یہ معلوم تھا اک طوفان ہے آنے والا

کس بے رحم قبیلے میں ہے بود و باش مجیبی
جگنو بھی جس وادی کا ہے آگ لگانے والا

● سینٹرل اسٹریٹ، ہندپیڑی، رانچی (بہار)

کن بول خدا ارض و سما تو ہی مجھے دے
پرواز عطا کی تو فضا تو ہی مجھے دے

اے موسم گل میری شناخت ہے ترے ہاتھ
میں شاخِ برہنہ ہوں قبا تو ہی مجھے دے

منصف نہ بنا دہر کو اعمال کا میرے
یارب ترا مجرم ہوں سزا تو ہی مجھے دے

تو نے بھی مجھے چھوڑ دیا حال پہ میرے
ہر مژدۂ جانسوز بھی آ تو ہی مجھے دے

لب ریز جوانی سے رہے قامتِ خوش دید
جی بھر کے تجھے دیکھوں دعا تو ہی مجھے دے

رسوا سرِ بازار ہوا عشق میں تیرے
اب خاک کی چادر بھی اڑھا تو ہی مجھے دے

خاکسترِ جاں نذر کروں دشتِ جنوں کو
جب آگ ہوں ٹھہری تو ہوا تو ہی مجھے دے

بس ایک بوند تھی اور رگِ جاں میں پھیل گئی
بنامِ ہجر مری داستاں میں پھیل گئی

ہوا نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ لو میری
ہزار صورتِ صوت و بیاں میں پھیل گئی

وہ خواب تھا کہ کسی کا تھا دریچۂ شب بھر
ترے وصال کی خوشبو مکاں میں پھیل گئی

جو اس کے بعد ہوا اس سے بے خبر سب تھے
ہوا نے کچھ نہ کہا بادباں میں پھیل گئی

میں اس کے طرزِ تخاطب کا زہر پی تو گیا
لہو کی آگ مگر صحنِ جاں میں پھیل گئی

زباں نصیبِ شعارِ وفا سرشت میں ہے
یہ بات کیسے صفِ دشمناں میں پھیل گئی

غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ

ادبی فیچر ⑤



آپ کا مضمون "غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ" میں نے پڑھا ہے، اور میں آپ سے سو فیصد متفق ہوں لیکن اس مسئلے کو آگے بڑھانے کیلئے میں بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میں جناب ستیہ پال آنند سے واقف ہوں کہ میں اس شہر کا باشندہ ہوں جہاں وہ تقسیم ملک کے بعد آکر بسے تھے۔ میں ان کے افسانوں اور شاعری کے علاوہ ذاتی طور پر بھی روشناس ہوں اور ان کی افتادِ طبع اور زندگی کے نظریے سے بھی بخوبی واقف ہوں۔

غزل کے بارے میں ان کی جو رائے ہے وہ صرف اپنے آپ کو منفرد جتانے کی کاوش ہے۔ وہ اردو کا زمین سے جو بھی کہیں ان کا حق ہے۔ لیکن کوئی تخلیق کار اس قدر ذہنی منافق ہو سکتا ہے۔ یہ وہی شخص جان سکتا ہے جو اردو کے علاوہ اس زبان سے بھی واقف ہو، جس میں جناب ستیہ پال آنند نے کچھ لکھا ہے۔ وہ اردو اور انگریزی کے علاوہ پنجابی زبان میں بھی لکھتے ہیں اور ان کے پنجابی غزلوں کے مجموعے شائع بھی ہوئے ہیں، اگر وہ غزل کو اتنا ہی ہیچ سمجھتے ہیں تو انہوں نے پنجابی زبان میں غزلیں کیوں کہیں؟ وہ اس لئے کہ جب اردو غزل میں وہ اپنا مقام نہ بنا سکے تو اس ڈگر پر چل پڑے جہاں انہوں نے غزل کے میدان کو کھلا پایا۔

غزل کے بارے میں آپ ہی کی رائے کی وضاحت کے سلسلے میں اردو غزل اور نظم کے فرق کی میں صرف دو مثالیں دوں گا ویسے تو یہ ایک سلسلہ لامتناہی ہے۔ مرزا غالب کا ایک شعر ہے۔

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی اور بھی ہم پر ستم ہوئے

اور اسی شعر کی تفسیر [تفسیر لفظ خط کشیدہ ہے] فیض کی ایک پوری مشہور نظم ہے۔

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا وغیرہ وغیرہ

دوسرا شعر سیماب اکبر آبادی کا ہے۔

ہے غارت چمن میں یقیناً کسی کا ہاتھ
شاخوں پہ انگلیوں کے نشاں دیکھتا ہوں میں

اب اس شعر کو تقسیم ملک سے پہلے کے حالات پر یا آج کے حالات پر ہر جگہ چسپاں کیا جا سکتا ہے۔

فیض کی مکمل نظم مرزا غالب کے ایک شعر تک ہی پہنچ پائی تھی۔ اور سیماب اکبر آبادی کے شعر پر سینکڑوں نظمیں اور سینکڑوں افسانے اپنے اپنے ڈھنگ سے لکھے جا چکے ہیں۔ اور لکھے جا رہے ہیں۔ ایسی ہی اور بھی ہزاروں مثالیں جہاں غزل کا ایک شعر نظموں پر بھاری ہو دی جا سکتی ہیں۔ اور یہ بات اس لئے ستر نہیں کی جا سکتی کہ ستیہ پال آنند کی رائے انکی اپنی مختلف ہے۔

ستیہ پال آنند فیض کی شاعری کو اس لئے ہیچ سمجھتے ہیں کہ وہ آج کے بدلے حالات کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی۔ اگر میں بھی فیض کے بارے میں لکھتا تو یہی کہوں گا کہ ان کا عوام سے کوئی تعلق نہیں تھا کیوں کہ وہ اس طبقے سے نہیں تھے جس کی وہ بات کرتے تھے۔ یہی کچھ آنند صاحب نے "عصری عالمی شاعری اور اردو شاعری" میں فیض کے بارے لکھا ہے لیکن اس کے باوجود فیض کی شاعری دل سے گذر کر روح کو چھو جاتی ہے۔

دراصل پچھلے دو تین سالوں میں جناب آنند کا رویہ زندگی اور فن کے بارے میں وہی رہا ہے جو ایک امریکن کا ہو سکتا ہے کیوں کہ وہ نوکری سے سبکدوش ہو امریکہ میں جا بسنے کا فیصلہ کر چکے ہیں [وہ ایک عرصہ سے گرین کارڈ ہولڈر ہیں] اور وہ امریکہ میں اپنی دھاک فیض اور اس تحریک سے منسلک لوگوں کے بارے وہی کچھ کہہ کر جما سکتے ہیں جو انہوں نے اس انٹرویو میں کہہ دیا ہے۔

غزل کے بارے میں ان کی جو رائے ہو سو ہو۔ میں نے ان کی کتاب جس سے کچھ نظمیں آپ نے اپنے "شاعر" میں شائع کی ہیں پڑھی ہیں۔ انہوں نے کتاب کا نام "دست برگ" رکھا ہے کہ فیض کی کتاب کا نام "دست صبا" وہ اپنے آپ کو فیض سے بلند شاعر ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ جو نظمیں "شاعر" میں اور "دست برگ" میں شائع ہوئی ہیں۔ وہ فیض کی گرد کو نہیں پہنچ سکیں۔ چاہے قارئین فیض کے نقطہ نظر سے متفق ہوں یا نہ ہوں۔

آنند کی نظموں میں نہ کوئی آہنگ ہے نہ اردو شاعری کا رکھ رکھاؤ اور لحاظ سے بھی کوئی دل میں اترنے والی تراکیب ہیں نہ ندرت۔ ہر مصرعے کو توڑ دوسرے مصرعے سے جوڑنا انگریزی طرزِ شاعری کی تقلید میں ایک بھونڈا مذاق

یہ ضرورتِ شعری کے لئے کہیں کہیں استعمال کیا گیا ہے یا ہوا ہے لیکن انگریزی شاعری کی اندھی تقلید میں اردو شاعری کی طبع پر گراں ہے۔

ستیہ پال آنند نے پچھلے دنوں "بیسویں صدی" میں رتن سنگھ صاحب سے اپنے بارے میں ایک مضمون بھی لکھوایا تھا۔ میں حیران تھا کہ رتن سنگھ صاحب نے پچھلے چالیس سالوں میں آنند پر کچھ نہیں لکھا اب اچانک۔

رتن سنگھ صاحب سے تو انہوں نے سرِ نیدر پرکاش کے توسط سے یہی لکھوا لیا کہ ستیہ پال آنند صاحب کرشن چندر سے بھی اچھا لکھتے ہیں۔

کرشن چندر کے زاویۂ نظر سے کوئی متفق ہو یا نہ ہو یہ بات تو مسلم ہے کہ ایک دو دہائی تک جب ترقی پسند تحریک کا دور دورہ تھا کرشن چندر عظیم کہانی کار گردانے گئے۔ اور ان کے کئی افسانے اردو ادب کی جان ہیں۔ "زندگی کے موڑ پر" "ان داتا" اور ایسی ہی کئی کہانیاں ہیں جہاں آنند تو کیا اس دور کے بیشتر کہانی کار نہیں پہنچ سکتے۔ کرشن چندر کی گھٹیا سے گھٹیا کہانی آنند کی اچھی سے اچھی کہانی سے اس لئے بہتر ہے کہ آنند صاحب کی زبان ناقص اور بیان اغلاط سے پر ہیں۔ اردو بھی زبان ان کی "دستِ برگ" میں ان کی کمزوری بن کر رہ گئی ہے

ہو سکتا ہے مندرجہ بالا عبارت میں میرے ذاتی تعصبات کا بھی دخل ہو۔ کیوں کہ میں آنند صاحب کو بطور شاعر بطور کہانی کار نہیں بطور انسان کے بھی جانتا ہوں۔ لیکن میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ "دستِ برگ" کی نظمیں نہ تو کسی سمت کی نشان دہی کرتی ہیں اور نہ ہی شعری لحاظ سے قابلِ قدر ہیں۔ الجھے الجھے خیالات کا مرقع اردو شاعری میں کچھ اضافہ نہیں کر سکتا۔ وہ ن۔ م۔ راشد اور میراجی کی تعریف اس لئے کر گئے کہ انہیں فیض کے خلاف کچھ کہنا تھا۔

میں یہ خط لکھ چکا تھا کہ آپ کا مضمون "غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ" پڑھا اور محسوس کیا کہ اپنے طویل خط کے باوجود میں کچھ بھی نہیں لکھ پایا۔ آپ نے تو بہت ساری باتیں کہہ دی ہیں۔ ہاں! کچھ مزید باتیں اور عرض کرتا چلتا ہوں۔ ستیہ پال آنند کا تجربہ منظومات کے سلسلے میں بھی کوئی نیا نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اردو کے بعض قارئین کے لئے نیا ہو۔ لیکن وہ اشخاص جنہوں نے دیومالائی ادب یا اس کے یورپ کی مختلف زبانوں میں لکھا جانے والا ادب یا شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ یہی انہی کے یہاں ملتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ آنند صاحب نے دیومالائی اور عملی لمری شاعری کو خلط ملط کر دیا ہے۔

● اوم کرشن راحت ۔ ۱۵۲/۱ ار ایل ۵، فرید آباد ٹاؤن شپ۔

۱۲۱۰۰۱۔



"شاعر" کا شمارہ ۵، اپنی نوعیت کا بہت ہی اہم شمارہ ہے۔ روایتی باتوں سے ہٹ کر گوشۂ ستیہ پال آنند کے ضمن میں بہت سی ایسی باتیں سامنے آئیں جس نے اردو ادب کے سنجیدہ قاری اور میں سمجھتا ہوں کہ تخلیق کاروں کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ گوشۂ ستیہ پال آنند کے سلسلے میں ابتدائیہ اختتامیہ، طویل انٹرویو اور پھر آنند صاحب کی ستر نظموں کے مجموعے "دستِ برگ" سے منتخب نظموں کو پڑھ کر احساس اور فکر پر جو ردِ عمل پیدا ہوا یا یوں کہئے کہ طبیعت میں جو اتھل پتھل مچی اس کا مداوا آپ کے مقالے "غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ" کی شکل میں سامنے آ گیا جسے پڑھ کر بڑی راحت ملی۔ آپ نے آنند صاحب کے اٹھائے ہوئے سوالوں کو جس شدت سے محسوس کیا اور پھر حق واضح اور لاجواب پیرائے میں اپنی بات رکھی ہے وہ صرف آپ کی بات نہیں ہے۔ بلکہ ہر مخلص اور باشعور محب اردو کے دل کی آواز ہے۔ میں زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتا بلکہ معمولی تجربہ کے ناطے اپنے احساسات اور تجربوں کی بنیاد پر صرف آپ کی بات کو دہرانا چاہتا ہوں کہ غزل اردو شاعری کا وہ اثاثہ ہے جس سے روشنی لئے بغیر اردو ادب یا شاعری کے متعلق کوئی کامل یا حتمی رائے قائم کر لینا غیر دانش مندی کا عمل ہوگا۔ اور پھر ایسی ناقص رائے کو مستند یا معیاری قرار دینا دوسری غیر دانشمندی ہوگی۔ اور یہ حقیقت بھی سیکڑوں مثالوں کے ساتھ پیش کی جا سکتی ہے کہ اردو غزل کا صرف ایک تنہا شعر معنوی، فکری، شعوری اور فنی اعتبار سے انگریزی ادب کی طویل نظموں پر بھاری ہے اور ہزار پیرائے اختیار کرنے کے باوجود انگریزی نظموں میں وہ ہمہ گیری، وسعتِ فکر اور فنون سازی پیدا نہیں ہو سکتی جو اردو غزل کا صرف ایک شعر پیش کر سکتا ہے۔

میں یہاں سامنے کی صرف ایک مثال یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ELEXANDER POPE کی مشہور نظم ODE ON SOLITUDE جو عام طور پر ہر جگہ شاملِ نصاب ہے اس نظم میں شاعر ہر طرح کی نمائش اور نام و نمود سے دور تنہائی اور گمنامی میں رہنا چاہتا ہے۔ اسی خیال سے وہ اپنی قبر پر اپنے نام کا کوئی کتبہ بھی لگانا نہیں چاہتا۔

THUS LET ME LIVE UNSEEN, UNKNOWN;
THUS UNLAMENTED LET ME DIE;
STEAL FROM THE WORLD, AND NOT A STONE
TELL WHERE I LIE.

غالب نے اپنی مشہور غزل کے ایک شعر میں اسی خیال کو کہیں زیادہ موثر انداز میں پیش کیا ہے کہ،

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

[illegible]

گفتگو

شکیل الرحمٰن
۱۲۸۲۔ اے، سیکٹر بی، وسنت کنج، نئی دہلی

ماضی کی حسیت اور جدید اردو نظم

ماضی کی حسیت، اس عہد کی اردو شاعری کی ایک نہایت اہم اور معنی خیز حسیت ہے۔ تاریک مستقبل کے احساس، خاندان اور خاندانی روایات کی شکستگی، متوسط طبقوں کی نئی تقسیم، تہذیبی بحران۔ تناؤ اور صنعتی زندگی کی بھیڑ بھاڑ نے اردو شاعری میں اس حسیت کو متحرک بنا دیا ہے۔

ماضی کی حسیت، تخلیق کا سرچشمہ بھی ہے اور نئی نظموں کی تکنیک کی تشکیل کی بہت حد تک ذمہ دار بھی۔ یہ زندہ اور متحرک حسیت ہے۔ نئے حوصلے بھی عطا کرتی ہے، کمزوری بھی بناتی ہے، مایوس اور اداس بھی کر دیتی ہے، شخصیت کی شکستگی کو آئینہ بھی دکھاتی ہے۔ تقابلی مطالعے کا عرفان بھی عطا کرتی ہے۔ آنے والے لمحوں کا بھی احساس دیتی ہے۔ اس حسیت سے نئی اردو شاعری میں مختلف رجحانات پیدا ہوئے ہیں۔ اس ایک امتیازی حسیت کا مطالعہ کیا جائے تو نئی اردو شاعری کے کئی رجحانات کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

میراجی کی شاعری کے حسی پیکروں میں ماضی کی حسیت کامل موجود ہے۔ "جنگل"، "غار"، "سمندر"، "ماں"، "وشنو"، "رادھا"، کرشن، کالی، شیولنگ ان سے میراجی نے تاثر کو گہرا کیا ہے۔ اور ماضی کے پیکروں سے کئی جہتوں کا احساس عطا کیا ہے۔ معاشرے کی موجود کیفیتوں کو اپنے احساس اور اپنی حسی کیفیتوں سے بھلانے کے لئے اساطیری، مذہبی، افسانوی اور تاریخی پیکروں کو نئی معنویت بخشی ہے۔

میراجی ماضی سے گہرا باطنی اور ذہنی رشتہ قائم کرتے ہیں۔ ماضی میں واپس جانے کی آرزو ان کی شاعری کا ایک واضح رجحان ہے۔ باطن کی آگ کو ماضی کے سلسلے میں لے جانے اور آسودگی حاصل کرنے کا یہ رجحان نئی اردو شاعری کا ایک مستقل عنوان ہے۔ ماضی کی حسیت نے میراجی کے کرب اور ان کی بے چینی کو بڑھایا بھی ہے۔ اور اسے سکون بھی عطا کیا ہے، اداسی، بے بسی اور خوف کے شدید ترین احساس اور جذبے کو ماضی اور اساطیر نے سہارا دیا ہے۔ ان کی شاعری کے نفسیاتی تصادم کے پیچھے ماضی اور اساطیر کا گھنا سایہ ہے۔ شاعر کا باطن ماضی ہے۔ جنگل ہے، اندھیرا ہے، کھنڈر ہے۔ اسی باطن میں غار ہے۔ کالی مائی ہے۔ اور اسی باطن میں "دھرتی ماں" کا لمس ہے اور اس کی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو ہے۔ اکثر نظموں میں ماضی میں جذب ہو جانے کی خواہش اور ماضی کی تاریکیوں میں گم ہو جانے کی آرزو ملتی ہے اور ان ہی لمحوں میں وہ "[illegible]" ماں کے قدیم ترین حسی اور ذہنی پیکر کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ن۔ م۔ راشد ماضی کو ایک بوسیدہ قبر سمجھتے ہیں لیکن ان کا تخلیقی فکر ماضی کی حسیت سے علیحدہ نہیں ہو سکا ہے۔ عجمی اور عربی تلمیحات اور اساطیر کا مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ ماضی لاشعور میں کس قدر متحرک ہے۔ ان کی نظموں کی تکنیک پر ماضی کی حسیت کا گہرا دباؤ ہے۔ راشد کی رومانیت کا مطالعہ کرتے ہوئے ماضی کی حسیت کے تحرک کو قاری شدت سے محسوس کرتا ہے۔ ماضی نے انھیں حال کے تجزیے کا حوصلہ بخشا ہے۔

ماضی کے فرسودہ حقوق اور بے اصول فلسفوں اور ماضی پرستی سے نفرت کے باوجود راشد کا ذہن ماضی سے ایک بامعنی باطنی رشتہ قائم کرتا ہے۔ ان کے اہم ترین استعاروں، علامتوں اور اشاروں میں ماضی کی حسیت کے عمل کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ماضی کے احساس کے ساتھ راشد زمانے کے رجحانات کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ تقابلی مطالعے کا احساس اسی حسیت نے عطا کیا ہے۔ ماضی کا یہ عرفان انھیں دوسرے جدید شعرا سے علیحدہ کر دیتا ہے۔ شعری تجربوں میں اس عرفان کی روشنی موجود ہے۔ "جہاں تارے تراب ہے"، "اقلیم شیر و شہد و شراب و زمزم"، "یاجوج و ماجوج"، "مرائی"، "کاہن"، "اسرافیل"، "الوند"، "سلیمان"، "سبا"، "ریگ"، "صدیوں کا جمال"، "کیقباد"، "سایۂ آمر کی چاپ"، "آگ"، "الاؤ"، "آگ سے ہوا کا رشتہ"، "بوسے آدم زاد"، "کتبہ"، "دیو"، "جنگل کا سناٹا"، "راہب"، "راہبہ"، "سراب" اور اس قسم کے دوسرے اشارے ماضی کی حسیت کے تحرک کو پہچانتے ہیں۔ ان کے چند اہم استعاروں میں ماضی کی حسیت سے جو معنی خیز جہتیں پیدا ہوئی ہیں وہ بطور خاص توجہ چاہتی ہیں۔

ماضی کے تعلق سے راشد کا واضح رویہ ہے۔ "زندگی! تو اپنے ماضی کے کنوئیں میں جھانک کر کیا پائے گی / اس پرانے اور زہریلی ہوا کے سینے میں بھرے سونے

کتنے ہیں / جیسے کہ اس کی خبر کیا لائے گا / اس کا بہتہ میں سنگریزوں کے سوا کچھ بھی نہیں رہ گیا ہے یا کچھ بھی نہیں۔

لیکن اس شعوری احساس کے باوجود تخلیقی عمل کی پراسرار فضا میں راشد کا ذہن ماضی کی آندھیوں، روشنیوں، ماضی کی علامتوں اور اساطیری اشاروں سے ایک گہرا رشتہ قائم کر لیتا ہے۔ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے تاریخی اور اساطیری اشاروں اور ماضی کی تاریکی اور روشنی کے پیکروں کو تشبیہ اور استعارہ کی صورت دے دیتے ہیں۔ اس رشتہ کو جذباتی رشتہ کہنا چاہیے۔ اس کی وجہ سے ان کی نظموں میں " جذباتی سطح " توجہ کا مرکز بنتی ہے۔ اس جذباتی سطح پر کبھی آگ [ملا۔ ریگ صحرا۔ زنجیر۔ تیرگی] اور ریگ کا جلال و جمال متاثر کرتا ہے۔ اور کبھی سمندر کی سنگین تہہ میں معذوروں کی دنیا، پاتال کا ریوڑ، جنگل کی پریاں اور وہاں جادوگروں کی صدائیں [سمندر کی تہہ میں] متاثر کرتی ہیں۔

راشد کی نظموں میں شخصیت کی شکستگی کا احساس اس وقت زیادہ ہوتا ہے جب وہ ماضی کے زہر کو پی کر انسان کے طویل سفر کے تجربوں کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ہمیں انکشاف ذات اور انسانی وجود اور زندگی کی بے معنویت کا شدید احساس ہوتا ہے۔ راشد بڑی پیچیدگی کے ایک اہم شاعر ہیں۔ اور انسان کے ایسے کرب کی دنیا کو جگاتے ہیں۔ اور زندگی کی وہ راہیں جو ابھی تک پردوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس منزل پر ماضی کی حیثیت متحرک ہوتی ہے۔ یہ حیثیت بصیرت عطا کرتی ہے۔ ان کے اشراقی امیجری اور ان کے عربی اور عجمی اشاروں اور استعاروں سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تخلیقی عمل کی منزلوں پر ماضی اور حال دونوں ایک دوسرے میں جذب ہو گئے ہیں۔

نئی اردو شاعری میں " یادوں " کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ماضی کے اچھے خوبصورت لمحوں کو یاد کرنا، ماضی کے جلووں کو یاد کرنا اور عصری ہیجانات کو اپنی یادوں کے آئینے میں دیکھنا نئی اردو کی نئی شاعری کا ایک نمایاں رجحان ہے۔ اختر الایمان اس رجحان کے ایک اہم شاعر ہیں۔ " یادیں " اور " بنت لمحات " کا تجزیہ یا مطالعہ ماضی کی حیثیت کا مطالعہ ہے۔ ان مجموعوں کی نظموں سے ماضی کی یادوں کے پس منظر میں کئی جہتوں کا علم ہوتا ہے۔ " اذیت پرست "، " بازآمد " ایک لڑکا، " وہ لوگ " " اے لوگو "، " مسجد "، " یادیں "، " ایک یاد "، " پرانی فصیل "، " اعتراف "، " پگڈنڈی "، " بے تعلقی "، " بنت لمحات "، " معمول "، اور دوسری خوبصورت نمائندہ نظموں میں ماضی کی حیثیت کی لہریں ہر لمحہ محسوس ہوتی ہیں۔ ماضی کی یادیں کئی جہتوں کو نمایاں کرتی ہیں۔ اختر الایمان کے لیے ماضی ایک معنی خیز اور تہہ دار سرچشمہ ہے کہ تخیل اس کے مختلف آہنگ کو قبول کرتا رہتا ہے۔

نئی اردو شاعری میں اختر الایمان نے ماضی کو اپنی " سائیکی " PSYCHE میں جتنی شدت سے ابھارا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ ماضی کی حیثیت کے محرک سے اختر الایمان کی شاعری میں کئی جہتیں ابھری ہیں۔ ان کے کلام میں " وہ آسیب ناپ " کا مطالعہ کیا جائے تو ماضی کے اندھے غار سے ذہنی رشتے کا علم بھی ہوگا ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوگا کہ اس غار کی تہہ سے زندگی کا کتنا خوبصورت چشمہ پھوٹتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی سب سے معنی خیز علامت " سمندر " سے مطالعے کی ابتدا ہوتی ہے۔ ماضی کی حیثیت کے شدید دباؤ اور شاعر کی سائیکی میں ماضی کے وجود کے پیکر کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوگا۔ ماضی کی حیثیت نے اختر الایمان کو ایک جمالیاتی اساطیری رجحان عطا کیا ہے۔

خلیل الرحمن اعظمی کی " یاد "، " شامِ وداع "، " جاگتے سائے "، " آپ بیتی "، " کہانیاں "، " بن لکھی کہانی "، " اپنی یاد "، " اپنی تفریح سے "، " خلوت کا چراغ "، " بن باس "، " فاصلہ "، " دوسری ملاقات "، " رفتگاں "، " تسلسل "، " ایک دن "، اور دوسری کئی نظموں کے تخلیقی تجربے سے ہم آہنگ ہو کر خوبصورت شعری تجربے بن گئے ہیں۔ یادوں کی اس دنیا میں شاعر کی ذات مرکز بن جاتی ہے۔ اور اس کے ایسے تجربے آہستہ آہستہ ہمیں بہت قریب بلا لیتے ہیں۔ ماضی کی حیثیت نے شخصیت کی شکستگی کو ایسی معنی خیزی عطا کی ہے کہ ان آئینوں میں ہم اپنی ذات کی شکستگی کا نظارہ کرنے لگتے ہیں۔ خلیل الرحمن کے تمام تجربے شاعر کے بعض حادثوں سے ذہن کو قریب کر کے تازگی اور نیا پن کا احساس عطا کرتے ہیں۔ شاعر کا ذہن ماضی سے وابستہ ہے۔ اپنی یادوں کو اس طرح ابھارتا ہے کہ عصری ہیجانات کی ایک سے زیادہ صورتیں اجاگر ہو جاتی ہیں۔ اس کے بظاہر انتہائی عام اور معصوم اور جانے پہچانے روایتی تجربے بھی تازہ اور نئے نظر آنے لگتے ہیں۔ ماضی کی حیثیت کے ابھار نے ان یادوں کو تخلیقی سطح پر نقش بنا دیا ہے۔

شاذ تمکنت کی " یاد "، " آخر شب "، " حیاز نیم شبی "، " خواب بے رنگ ونام "، " گونج "، " آب و گل "، " پرستش "، " دھیرے آ رہا "، " نسیاں "، " عمارت شکستہ " ایسی نظمیں ہیں جن میں یادوں کے جلتے بجھتے رنگ ملتے ہیں۔ یہ نظمیں اردو شاعری میں اضافہ ہیں۔ شاذ کی اس حیثیت نے تخلیقی سطح پر شاعر کو کبھی کبھی لاشعور کے پچھلے پہر کے سمندر میں اس طرح اتار دیا ہے کہ شاعر نے لاشعور کا سہارا لے کر اپنے تجربوں کا اظہار کیا ہے اور ان کی صورت پر بھی اس کے اثرات قائم ہو گئے ہیں۔ " گونج " اور " پرستش " میں یادوں کی شکستگی کی تصویروں میں احساس کی پراسراریت، خواب کی پراسراریت بن گئی ہے۔ پیکروں کی تہہ داری کیفیتیں متاثر کرتی ہیں۔

ندا فاضلی کی نظمیں " ایک پرانی یاد "، " بجلی کا کھمبا "، اور " سفر " ایسی حیثیت کو نمایاں کرتی ہیں۔ تخلیقی سطح پر یہ ماضی کی حیثیت بیدار ہوتی ہے تو محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر انسان کی چھوٹی چھوٹی معصوم یادوں کو سمیٹ کر اسے معنی خیز اور تہہ دار علامت بنا رہا ہے۔ ماضی کی حیثیت کا مطالعہ کرتے ہوئے ندا فاضلی تک آتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ چونکا دیا جائے۔ " سفر " کی تکنیک کے لحاظ سے اردو شاعری میں قابل قدر اضافہ ہے۔ اس نظم کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے شاعر نے انسانی تہذیب کی تمام اعلیٰ اور نفیس قدروں کی یادوں کو محفوظ کر کے اپنی سائیکی پر ان کے اثرات کا گہرا احساس دلایا ہے۔ اور اپنے وجود کو ان کی علامت بنا کر ان کا ماتم کیا ہے۔ یہ ماتم انسان کا ہے۔ تمام تہذیبوں کا ماتم ہے۔

اور فلسفیانہ افکار سے بھرے ہوئے انسان اور ساتھ ہی اس کی آرزوئیں اور خوبصورت زندگی کی یادوں کا ماتم۔

میرا جی کی نظم "صرف سادہ ورق" شہاب جعفری کی "خونیں صدیاں"، "خواب تشکیل"، "شتیز فطرت کے بعد" میں، "شام اور کھنڈر"، "زمانہ"، "زلف طرار"، "تلاش"، "شہر پارکی نظمیں"، "اپنی یاد میں"، "اجنبی"، "ماضی"، "سہارا"، "سیال آدمی داستان" اور "ایک لمحے سے دوسرے لمحے تک"، بشر نواز کی نظم "فاصلہ"، "سجاد کی نظم"، "بے نظیر یہ آنکھیں"، "کمار پاشی کی" "گندے دنوں کا قصہ" اور "دیکھو تم جو لوٹو"، محمود ایاز کی نظم "نوحہ"، محمود سعیدی کی نظم "ایک پرانا شہر"، "زیر دو نظمیں" پرانی بات ہے لیکن یہ انہونی سی لگتی ہے۔" منظر امام کی نظم "آنگن میں ایک شام"۔ اردو میں بہت سی نظمیں یادوں کے جانے کتنے لطیف اور کرب ناک لمحوں کو ذہن کو قریب تر کر دیتی ہیں۔ معاشرے کی موجود کیفیتیں اور شکست و ریخت کے ایک طرف یادوں کو طرح طرح سے ابھارا ہے۔

جنگل اور پہاڑوں اور بے نام جزیروں کی طرف لوٹ جانے کا رجحان بھی ماضی کی حیثیت کا دین ہے۔ میرا جی کے بعد بعض نے شعرا نے اسی رجحان کو شدت سے محسوس کیا۔ میرا جی، محمد علوی، سلیم الرحمٰن، وغیرہ اس رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ زندگی سے محبت، اپنے عہد کے انتشار سے گریز، زندگی کی لامعنویت، اور فطرت کے حسن سے شعوری اور لاشعوری وابستگی، ان کے تاثرات ماضی کی حیثیت کے ساتھ ملتے ہیں۔ جیسے حنفی کی طویل نظم "سرگم"، ماضی کی حیثیت کے فطری دباؤ اور جمالیاتی اظہار کی ایک عمدہ مثال ہے۔

ماضی کی حیثیت کے شدید تحرک سے اردو شاعری میں پیکروں، استعاروں، ترکیبوں اور علامتوں کا ایک ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ اردو کے نئے فنکار روایتی تحقیق ان میں بہتر دار معنویت پیدا کی ہے۔ نئی شعری جمالیات میں انہیں بہت اہم سمجھتا ہوں مثلاً "یادکی سبز پریاں"، "پارینہ کتاب"، "غواص جادوگر"، "پرانی قبریں"، "زنگ خوردہ ہتھیار" "ماضی کی گفتگو کرتے ہیں"، "دشت سلسلے"، "پتھرائی ہوئی آنکھیں"، "چٹانوں پر تراشے ہوئے بت"، "گزشتہ اہرام"، "خوابیدہ زمین"، "پتھر یلی چپ"، "تزدان"، "گوتم"، "کیلاش"، "غار حرا" ... "کے پر"، "آذر"، "جھاڑیوں کی پراسرار سرسراہٹ"، "جنگل میں پھیلی دھوپ"، "جھینگر آوازیں"، "تبیلوں کی لڑائی"، "صحراؤں کے برگد"، "کالے سانپ"، "بدھ"، "شاید"، "سورج"، "تکلی ہوئی رات"، "الاؤ"، "لاوا"، "عقاب"، "گھپائیں"، "چھپا ہوا سایہ"، "کالے سمندر"، "ہوا کا سانپ"، "آسیب"، "چڑیل"، "سراب"، "پاتال"، "آتشیں سانپ"، "ترشول"، "ہابیل و قابیل"، "کاہن"، "ناقوس"، "سقراط"، "یوسف گم گشتہ"، "پرومیتھس"، "بن باس"، "برگد کی سوکھی جٹا"، "غول"، "جادوگر"، "دیوتاؤں کا مقدس رس"، "پتھر کے معبد" وغیرہ۔

فضاؤں کی پراسراریت کو ابھارنے اور حیرت کے جذبے کو ابھارنے کے لئے اردو کے نئے شعرا نے بعض استعمال شدہ لفظوں اور پیکروں کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے جاذب نظر بنا دیا ہے۔ ماضی کی حیثیت نئی شعری جمالیات کا ایک اہم موضوع بن گئی ہے۔ ✻

بقیہ صفحہ ۱۷۔ فسان

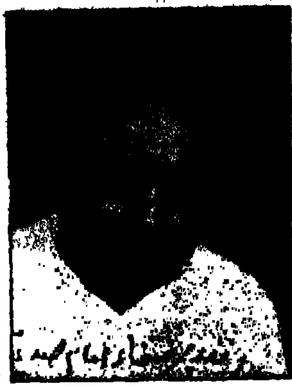
سرخی نمودار ہوئی اور وہ سرخی آدھے آسمان تک پھیل گئی اور پھر سارے میں سبزہ کھل اٹھا۔ ہری گھاس میں جنگلی جھاڑیوں پر لگے ست رنگے پھولوں میں۔ دور دور تک پھیلے ہوئے چھوٹے چھوٹے باجرے اور مکئی کے کھیتوں کے سبزے میں سبزہ بغیر نظر آئے سرایت کر گیا۔ اور گڑھی سیداں کے مزارعوں، ترکھان، راج، بھنگیوں اور برکت رام کھتری کے بیٹے نے اپنی آنکھیں اٹھا کر اپنے سامنے کھڑے طرہ خان کو دیکھا۔ اس کی شعلے برساتی آنکھوں کو دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے طمنچے کو دیکھا اور اس کے ملازموں کے ہاتھوں میں پکڑی شمشیروں کو دیکھا اور سب نے ہی اپنے سر جھکا دیئے۔

"ہم اپنے علاقے کے ساتھ امن اور آشتی سے رہنا چاہتے ہیں۔" طرہ خان نے گرج کر کہا۔ "جاؤ اپنا اپنا کام کرو اور پرانا شاہ دینے میں تمہاری حفاظت کے لئے موجود ہیں۔ اگر کسی نے زبان کھولی تو گھمان بچہ گھمانی کر دی گئی۔"

سب چپ چاپ اس حویلی سے نکل کر اپنے اپنے گھروں کو دیئے۔ جو کبھی رحیم یار کی تھی۔ کسی نے نہ پوچھا کہ رحیم یار اس کی بیوی بچے کہاں گئے؟

طرہ خان کی وفات پر دلاور خان جوان ہو چکا تھا چند ہی ماہ اس کی شادی چوپڑہ کوٹ کے زمیندار خان وصی کی دختر نیک اختر رشیدہ سے ہوئی تھی۔ وراثت میں دلاور خان کو گڑھی سیداں کی زمین چند مزارعے۔ ایک چھوٹی سی مسجد اور پیر کی درگاہ کے علاوہ بوڑھا رام کھتری اور اس کا خاندان ملا تھا۔ حویلی کافی پھیل گئی تھی اور ایک کمرے میں بہت سی بندوقیں، تلواریں، طمنچے اور کارتوس بند تھے۔

پھر اللہ کی نظر ستلی ہوئی اور اس کے یہاں چاند سا بیٹا تولد ہوا۔ مولوی صاحب کے فال کے مطابق اس کا نام شوکت خان رکھا اور دو برس بعد بیٹی پیدا ہوئی تو پیار سے اس کا نام زینب رکھا گیا۔ [جاری]



حسین الحق

ستی سلطان، نیو کریم گنج، گیا (بہار)

گونگا بولنا چاہتا ہے

گونگے نے بڑے بھدے بھینڈے سے پہلو بدلا۔

دوسروں نے شاید اس کی بے چینی محسوس نہیں کی، یا اس کی بے چینی شاید قابل توجہ ہی نہیں تھی۔ جو بھی ہو مگر وہاں موجود لوگوں پر اس کی بے تابی کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیا۔ معاملہ ہی اتنا اہم تھا کہ اس کے سامنے ایک گونگے کی بے چینی کیا معنی رکھتی۔

جنوری کی انتہائی سرد رات.... تقریباً ۹ بجے کا عمل۔ محلے کے چوراہے پر "ماشاء اللہ" ہوٹل میں۔ بالکل کنارے، ایک گول میز پر، جس کے چاروں طرف آٹھ دس کرسیاں..... ایک پر چوڑے مستری اور دوسری پر کلن خان ٹھیکیدار، تیسری پر ہیوٹیلر، چوتھی پر محلے کی مسجد کا موذن عبد مجید، پانچویں پر جبو جرّاح، چھٹی پر ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج سید پوش پہلوان، ساتویں پر سوشل ورکر عبد الرؤف، آٹھویں پر قوالوں اور رمضان میں قافلہ والوں کو "سحری" کو کر دینے والا مقامی شاعر جمال خوفانی، آٹھویں پر چوتھا دین بیڑی ساز.... اور نویں پر بے چینی سے پہلو بدلنے والا گونگا۔

گونگا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا مگر گونگا جو ٹھہرا، بولتا کیا، البتہ اس کی اپنی مصیبت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ بول نہیں سکتا تھا مگر سن سکتا تھا اور سمجھ سکتا تھا۔ یہ کیسے ہوا یہ ایک الگ داستان ہے جس کے بیان کا یہ موقع نہیں ہے۔ ابھی تو بس ایک ہی مسئلہ سامنے ہے کہ امریکہ کیسے ہارے گا؟

جب سے عراق نے کویت کی بادشاہت سے آزادی دلائی اسی وقت سے جنگ شروع ہونے اور خوفناک ہوتے جانے تک تقریباً پانچ چھ مہینے کی مدت گزر گئی۔ ان پانچ چھ مہینوں کے درمیان ہوٹل ماشاء اللہ کی یہ گول میز کبھی خالی نہیں رہی۔ ہوٹل کھلنے سے بند ہونے تک، باقاعدہ ایک گروپ کا قیام رہتا اور ایک پیالی چائے پی اور بجھنگ اسکواڈ میں آ گئی، ٹیک، بال اٹھا تا اور بڑی بیڑے بنتا رہتا۔ شروع شروع میں تو ہوٹل کے مالک رمضان علی خان نے بہت اعتراض کیا، میں بجھ ... [illegible]

گئے۔ اس نے بڑے بڑے حرفوں میں لکھوا کر چاروں طرف دیواروں پر چسپاں کرا دیا..... "سیاست پر گفتگو منع ہے۔" مگر ہر دن اور ہر وقت وہی بات وہی موضوع۔ تنگ آ کر ایک گروپ کو ٹوک دیا "یہ بھائی دیکھتے نہیں؟ سیاست پر گفتگو منع ہے!" تو ان میں سے ایک نے ہنس کر کہا "ابھی سیاست پر گفتگو کون کرتا ہے۔ یہاں تو جنگ پر بات ہو رہی ہے۔"

رمضان علی گڑبڑا کر رہ گئے.... سیاست اور جنگ کے فرق کا مسئلہ۔

دوسرے گروپ سے انہوں نے دو ٹوک کہا "بھائی ہوٹل کھانے پینے کی جگہ ہے خوش گپی کی نہیں۔"

اس پر ایک منچلا بول اٹھا "رمضان میاں کربلا اور نجف پر بمباری کے تذکرے کو آپ خوش گپی کہتے ہیں۔؟" اور تب رمضان علی کے پاس اپنے دفاع کے لیے کچھ نہیں رہ جاتا۔

ایک دن ان کے بیٹے نے انہیں سمجھایا کہ "ابا اگر دس آدمی ایک پیالی چائے پر ایک گھنٹہ بیٹھتے ہیں تو گویا ایک گھنٹے میں دس پیالی اور آپ کا ہوٹل صبح سات بجے سے رات دس بجے تک کھلا رہتا ہے یعنی ۱۵ گھنٹے..... اس طرح ایک دن کی صرف چائے کی کمائی ۱۵۰ روپے ہو جاتی ہے تو پھر بحث سے کیا نقصان ہے؟"

یہ نکتہ رمضان کی سمجھ میں آ گیا اور بحث جاری رہی۔

اس رات بھی بحث جاری تھی اور ایک ہی مسئلہ سامنے تھا کہ امریکہ کیسے ہارے گا۔

کچھ دیر پہلے ریڈیو خبر نشر کر چکا تھا کہ امریکی فوجیوں نے بغداد سے ایک بنکر پر بمباری کی اور اس کے اندر چھپے ہوئے ہزاروں افراد پل بھر میں موت کے منہ میں چلے گئے۔

اس خبر سے کچھ دیر کے لیے سب پر سناٹا طاری ہو گیا۔ پھر اچانک سناٹے کو چیرتی ہوئی جمال خوفانی کی آواز گونجی "یہ چپ رہنے کی نہیں، زبان خنجر ہو جانے کا وقت ہے۔" جمال خوفانی کی اس آواز پر جیسے عبد الرؤف چونک اٹھے اور گھمبیر لہجے میں کہا "ایک مردہ قوم کا ایک نشان زبان بند رکھنا ہے، زبان وقت ..." [illegible]

اسی شیطانِ اعظم امریکہ کی دم چھلے ہیں۔ عراق کی خبریں کہاں آ رہی ہیں۔ جو ہم یقین کر لیں کہ واقعی اتنے لوگ مارے گئے۔ یہ سنتے ہی چونا فیکٹری والے ساز اس طرح اشتعال میں آگیا جیسے کسی نے پٹاخے کو آگ دکھا دی ہو: "ارے عراقیوں نے تو ان کے چھکے چھڑا دیئے۔ اسرائیل کو کیا مار رہا ہے۔ نعش پر نعش، نعش پر نعش ...... اور اسرائیل اور امریکہ کی مجال نہیں ہو رہی ہے کہ عراق کو چھیڑیں اور صدام... نجدی کی اولاد الگ جلتا پھر رہا ہے۔ کبھی وہ ایران سے بھاگ گیا کبھی سیاحت سے اور یہ شیطان بش کہتا ہے کہ ہم نے ہزاروں کو مار ڈالا... جھوٹا ہے... !!"

ٹھیک اسی وقت جمال خوفانی کا بیٹا ہوٹل میں داخل ہوا... "ابا - ابا! بابو کو پھر کھانسی کا دورہ پڑ گیا ہے۔ اماں بلا رہی ہیں۔"

"ابے تو اماں سے کہہ کہ لو دوا دے دے جو طاق پر رکھی ہے۔" جمال کے چہرے سے اکتاہٹ ٹپک رہی تھی۔

"اور دوا تو دے دی ہے۔"

"اچھا تو چل۔ ہم آ رہے ہیں۔"

"جمال بھائی۔ شادی کسی بھی سالی مصیبت ہے۔" محمود مستری بولا۔

"یار مصیبت میں مزا بھی تو ہے۔" گوپو روزی کی ٹھی ٹھی کر کے ہنسا۔ اس کے سارے دانت پیلے ہو رہے تھے۔

"ہنسو مت۔ عبدالرؤف جیا۔ یہ ہنسنے کا وقت نہیں ہے۔ فیصلے کی گھڑی ہے۔ تم کو یاد نہیں خلافت کے زمانے میں کیا ہوا تھا۔

بولیں اماں محمد علی کی، جان بیٹا خلافت پہ دے دو...

ایک مرتبہ پھر جان دینے کی باری آئی ہے۔!"

"مگر یار عبدالرؤف" جمال خوفانی بہت مدھم آواز میں بولا۔ "خلافت کے وقت جان دے سکے ملا؟" "دیکھو جمال بھائی" عبدالرؤف آنکھیں لال کر بولا "تم شاعر لوگوں کی یہی بہت خراب عادت ہے۔ عمل کے وقت پیچھے ہٹ جاتے ہو۔"

"نہیں یار بھاگنے والوں کی کیا بات ہے۔ اور میرے ہٹنے سے بھی کیا ہوتا ہے۔ میں تو بس یوں ہی پوچھ رہا تھا۔"

جمال خوفانی اتنا بول کر چپ ہو گیا۔ گونگا پہلو پر پہلو بدلتا رہا اور ماشاء اللہ ہوٹل میں بھانت بھانت کی آوازیں گونجتی رہیں۔... صدام تو مردِ مجاہد ہے... پھر ایک نئی کربلا در پیش ہے... اب کے صدام حسین کو انکار کر کے دم لے گا... مگر کویت پر اسے قبضہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کویت اور سعودی کے حکمران تو ایک نمبر کے عیاش ہیں۔ صدام نے اپنی قوت کا صحیح استعمال کیا... ٹھیک اسی وقت کسی اسٹیشن سے خبریں آنے لگیں

"... بنکر پر حملہ اتنا شدید تھا کہ بم آٹھ فٹ موٹی چھت پھاڑ کر اندر گھس گیا؛ ایک اندازے کے مطابق اس بنکر میں ۱۵۰۰ اشخاص نے پناہ لے رکھی تھی۔ اطلاعات مظہر ہیں کہ پناہ لینے والوں میں زیادہ تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی۔ امریکہ نے اس بنکر کو فوجی تنصیب کہا ہے۔"

عید محمد موذن جمیل خان کو بتا رہا تھا کہ میرٹھ میسو کا بالکل ہے وہ بہت جھوٹ بولتا ہے۔ مگر مقامی تبلیغی جماعت کا امیر ہے اور محلے میں تبلیغی جماعت کا اثر دن بدن بڑھتا جا رہا ہے اس لئے اس کی حمایت کو بھی لوگ نکل جاتے ہیں۔

عراق پر امریکی حملہ جاری تھا۔

گونگے نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ٹھنڈ کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ اس نے کلکتے سے لیے بیٹے کی پیچی کمبل اپنے ارد گرد کس کر لپیٹ لی اور جمال خوفانی کو گھر جانے کا اشارہ کیا جس کے بیٹے کو پھر کھانسی کا دورہ پڑا ہوا تھا۔

جمال خوفانی نے گونگے کے اشاروں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی، اس وقت تو وہ وہاں پہ موجود لوگوں کو کل کے مشاعرے میں پڑھی جانے والی نظم سنا رہا تھا...

ہم مردِ مجاہد ہیں / ہم عدل کا ساماں ہیں / ہم عزم کا عنواں ہیں / ہم نے ہی زمانے کو اخلاق سکھایا ہے / ہم جب بھی اٹھے تب تب / ہر فتح ہمارا ہے / ہر ملک ہمارا ہے / ہم مردِ مجاہد ہیں۔

گونگے کو پھر وہ بو یاد آیا۔

آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے لوگ اٹھتے گئے۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ٹھنڈ اور بڑھ گئی تھی، عید محمد موذن کا سب سے برا حال تھا۔ ایک ہاف سویٹر اور اس پر ایک سوتی چادر۔ جمال خوفانی کے بدن پر پرانی ہی سہی مگر گرم چادر تو تھی۔ محمود مستری پرانا فل سویٹر اور کمبل اوڑھے ہوئے تھے۔ سرد ہوا سب کے بدن چیرتی ریڑھ کی ہڈی میں اترتی چلی جا رہی تھی۔ بس جنگ کی باتیں کچھ گرمی پیدا کر سکتی تھیں مگر فتح کی خبریں بھی تو نہیں آ رہی تھیں۔

"لوگوں پر بم گرتا ہوگا تو کیا تڑپ تڑپ کر دم توڑتے ہوں گے۔" جمال خوفانی بڑبڑایا... گونگے نے چونک کر اسے دیکھا... یہ اب تک گھر نہیں گیا۔ اس کا بیٹا کتنا بیمار ہے۔

"بھائی اللہ کی مرضی میں کس کا دخل؟" محمود مستری نے ٹھنڈا سانس لیا۔ اور اچانک ایسا لگا جیسے سردی دوگنی ہو گئی۔

"برف گرنے لگی..." گونگے نے آسمان کی طرف دیکھا... آسمان بالکل صاف تھا مگر گونگے کو ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان گدلا گیا ہے کالا دھواں میلا دھواں... جیسے کہ اس کا دم گھٹ جائے گا۔

"دیکھو یار بھول مت جانا۔ کل جلسے میں سب لوگ آنا" جمال خوفانی نے یاد دلایا۔

"ہاں بھائی کل ہمارے شاہ کو خوب داد ملنی چاہیے۔" عبد الرؤف ہنسا۔
پھر سب آہستہ آہستہ کسی نہ کسی موضوع پر بولتے رہے۔

جمال غوغائی جب اپنے گھر پہنچے تو ساڑھے دس بج چکے تھے۔ سب بچے سو گئے تھے۔ بس بیوی بیمار بچے کو سینے سے لگائے جاگ رہی تھی۔ دروازہ اسی نے کھولا مگر بولی نہیں۔ مگر جب جمال غوغائی اس کا چہرہ دیکھ کر جھینپ گئے۔ "ذرا دیر ہو گئی۔ بابو کیسا ہے؟"

بیوی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گود میں لیٹے بچے کے منہ پر سے آنچل ہٹا دیا۔ ہڈیوں کا پنجر، چہرہ بے جان جیسے کسی نے کپڑے کو کس کر نچوڑ دیا ہو۔ کمزوری کے سبب آنکھ پوری طرح نہ کھل رہی تھی۔ نہ بند ہو رہی تھی۔ پیاس کے غلبے کے سبب منہ کھلا ہوا۔ زبان خشکی سے کانٹے کی طرح کھردری۔

"کھانسی رک گئی ہے نا؟" جمال نے پوچھا۔

"پندرہ منٹ سے تو رکی ہوئی ہے۔"

اچانک جمال غوغائی چونکے۔ "بی بی سی کا وقت ہو رہا ہے۔"

بی بی سی سے خبریں نشر ہونے لگیں۔ "دوسری جنگ عظیم کے بعد سب سے بڑا ہوائی حملہ۔"

بچے پر پھر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔
"ہم آخری دم تک جنگ کریں گے۔
بچے کا بدلہ لیں گے۔"

"ہم مرد مجاہد ہیں۔" جمال غوغائی نے اپنی نظم ناری اور کل کے جلسے کے بارے میں سوچا۔

بیوی بچے کی تکلیف دیکھ کر رونے لگی۔

"عراق کا آسمان امریکی طیاروں سے بھر اٹھا ہے۔" خبریں مسلسل آ رہی تھیں۔

"اللہ کی مرضی میں کس کا دخل!" پہلے دوست کا جملہ یاد آیا۔

"بیوقوف عورت کیوں روتی ہے؟ اللہ چاہے گا تو بابو کو کچھ نہیں ہوگا۔" جمال غوغائی نے بیوی کو ڈانٹا۔

"نئی دنیا کا تازہ شمارہ سامنے پڑا تھا... وسط ایشیا کی پیشین گوئی! امریکہ کی کامیاب حکمت عملی کے سبب جنگ کا پلڑا امریکہ کے حق میں جھک چکا ہے۔" مبصر اپنی رائے پیش کر رہا تھا۔

بچہ کھانسنے کے دم توڑنے کی منزل میں آ گیا۔ "مگر ذرا نہیں۔"

عراق اور امریکہ کی جنگ جاری تھی۔ "اللہ کی مرضی میں کس کا دخل۔"

جمال غوغائی کا بیٹا بی بی سی کے اس خبری اور صوتی منظر نامے میں گم تھا۔ [illegible] مگر کہیں تو ہوگا۔

اور جہاں ہوگا وہ پہلو پر پہلو بدل رہا ہوگا یہی قیاس کا مسئلہ ہے کہ وہ دوسروں کی باتیں سمجھ لیتا ہے مگر دوسرے اس کی بات نہیں سمجھ پاتے۔ ✻

بقیہ صفحہ: غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ

ایسی سیکڑوں بلکہ ہزاروں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں مگر ممکن ہے کہ ان مثالوں کو بھی "اوور سمپلی فکیشن" کہہ کر رد کر دیا جائے۔ لیکن اگر ۱۹۳۶ء سے اب تک کی مدت ہی کو معیار مان کر خلوص دل سے اردو کی اچھی اور معیاری غزلوں کو کھنگالا جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ عصری حسیت سے مملو اردو کے اشعار دستیاب نہ ہوں یا عالمی ادب میں جن مسائل یا موضوعات کو لایا جا رہا ہے ہمارے اشعار میں اس کی بازگشت نہ ملتی ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ یورپی ناقدین یا ہمارے یہاں موجود ان مقلدین کے فہم و ادراک کی رسائی وہاں تک نہ ہو سکی ہو۔ اور وہ صنف غزل کو یکسر رد کر کے چند گنی چنی نظموں کی بنیاد پر اپنا فیصلہ صادر کریں اور اسے بطور حکم منوانے کی کوشش بھی کریں۔ ایسے موقع پر مولانا ابو الکلام آزاد کی وہ بات یاد آتی ہے کہ

"جب لوگ قرآن حکیم کی بلندیوں تک نہیں پہنچ سکے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے سے عاجز رہے تو کہہ دیا کہ یہ اونٹوں کے زمانے کی کتاب ہے اور آج کے دور سے مطابقت نہیں رکھتی۔"

آنند کی نظمیں گرچہ صوتی حسن کاری سے بالکل خالی ہیں جو اردو شاعری کی اہم چیز ہے، لیکن معنوی اور فکری لحاظ سے کچھ ایسے گوشوں کی طرف اشارہ ضرور کرتی ہیں۔ جہاں اردو شاعری [میرے خیال میں] اب تک نہیں پہنچ سکی ہے، نرسنگ ہی کی تو، اور جزیرہ یقینی طور پر ایسی نظمیں ہیں جو ہیئت کے اعتبار سے شعور کو تحریک کرتی ہیں اور نیا انداز فکر پیدا کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ لیکن پھر "گھر میں اجنبی" "لفظ" "نئی آنکھیں" اور "طلبا انعام"، ایسے مضامین کو پیش کرتی ہیں جو اردو شاعری میں بہت گھس پٹ چکے ہیں۔

جناب ستیہ پال آنند سے مجھ کو سے کالونی انٹرویو پڑھ کر بے شک بہت سی نئی باتوں کا علم ہوا لیکن ساری باتوں سے کلی طور پر اتفاق نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یا ن۔م۔ راشد اور میراجی سے متعلق جو کچھ آپ نے اپنے مضمون میں فرمایا ہے وہ درست اور قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ آخر میں یہ بھی کہتا چلوں کہ آپ نے اردو غزل کے سلسلے میں جو تین سوال اٹھائے ہیں (۱) اردو غزل کے ناقدین کو اپنی تنقیدی تحریروں کا احتساب کرنا ہوگا۔ (۲) اردو غزل کہنے والوں کو اپنی شاعری کا محاسبہ کرنا ہوگا اور یہ کہ (۳) اب اردو غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ ناگزیر ہے۔ مسئلہ تو صحیح ہے کہ اردو ادب کے مخلص ناقدین اور تخلیق کار حضرات اس جانب جلد توجہ فرمائیں گے۔

فارسی: فریدہ رازی

ترجمہ: نیر مسعود

"ادبستان" دین دیال روڈ، لکھنؤ۔ ۳

بلی کا خون

اب میں اپنی بلی کے بدن پر نظر کرتی ہوں کیسا سوکھ کر رہ گیا ہے اور بے ڈھنگا ہو رہا ہے۔ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر سکتی ہوں۔ کوئی خاص بات نہیں۔ وہ مر گئی ہم دونوں کو چین پڑا۔

کب سے وہ اپاہجوں کی طرح گھسٹ رہی تھی۔ اس کی میاؤں میاؤں سے پتہ چلتا تھا کہ دکھ جھیل رہی ہے مگر ظاہر نہیں کرتی۔ اس کی گھٹی گھٹی پتلی آواز میں فریاد کی سی کیفیت آگئی تھی وہ سارے وقت کسی کونے میں سکڑی پڑی رہتی اور کبھی کبھی آنکھوں سے میری طرف دیکھا کرتی تھی۔ اس کی نگاہیں غصے میں بھری ٹٹولتی نگاہیں میری ہڈیوں کے گودے تک کو جلائے ڈال رہی تھیں۔

روز بروز وہ کمزور اور دبلی ہوتی جا رہی تھی بال اس کے سوکھے ہوئے بدن پر چپک کر رہ گئے تھے۔ اور ان کی آب جاتی رہی تھی۔ وہی بلی جو پہلے چوہا یا کوئی کیڑا دیکھ پاتی تو چیتے کی طرح جست مارتی اور ایسا پھنکارتی کہ مجھ کو خوف آنے لگتا۔ اب ایسی بے جان ہو گئی تھی کہ میں اسے جتنا بھی پچکارتی وہ شل پڑی رہتی یا میری طرف توجہ کیے بغیر اٹھ کر کسی اور گوشے میں جا پڑ رہتی۔

اس سے پہلے وہ ہمیشہ مست رہتی تھی۔ قالین پر لمبی لمبی لیٹ جاتی نرم سفید سینہ ابھار ابھار کر بند پنجوں سے مجھ کو نوچتی تھی چاہتی تھی میں اس کو گدگداؤں، اس کا سینہ کھجاؤں اور وہ خرخرانا شروع کر دے۔ آنکھیں نشیلی بنا کر پیچھے مڑ جاتی کہ اس کے ساتھ کھیلوں جب وہ تھک جاتی تو صوفے کے ایک کنارے پھیل کر لیٹ جاتی۔ اور خراٹے بھرا کرتی تھی۔ اس زمانے میں اس کے گدبدے جسم پر پھولے پھولے بال چمک مارتے تھے۔

اس کے گول منہ اور صاف ستھری مونچھوں سے خوشی پرستی تھی۔ لیکن اب اسے دیکھ رہی ہوں تو جی مسوس رہا ہے وہ گھل کر رہ گئی تھی۔ ہر وقت روتی رہتی تھی۔ میں اسے بہلانے کے لاکھ جتن کرتی، کوئی فائدہ نہ ہوتا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کا کچھ دل ہی نہ چاہتا تھا بس مجھے دیکھ کر رہ جاتی تھی۔ نہ کھانا پینا، نہ گھومنا پھرنا، نہ کھیلنا کودنا کچھ نہیں۔

یہ سب گزشتہ سال بہار کے موسم میں شروع ہوا۔ کئی دن سے ایک سرمئی بلا منڈیر پر آکر میاؤں میاؤں کیا کرتا تھا اور میری بلی کے کان پھڑکنے لگتے۔ بدن تن جاتا اور وہ لپک کر کھڑکی کے پاس پہنچ جاتی۔ میں دروازے بند رکھا کرتی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ باہر نکل جائے، پھر بچوں کا جھول چھوڑ دے تو میری مصیبت ہو جائے لیکن ایک دن جو میں گھر لوٹی تو وہ غائب تھی میں نے سب جگہ ڈھونڈا کہیں نہیں ملی کئی دن بعد کھڑکی کے باہر اس کی آواز سنائی دی میں نے دروازہ کھولا تو جست مار کر وہ اندر آگئی اور مجھ کو نظر انداز کرتی ہوئی سیدھی باورچی خانے میں گھس گئی۔ معلوم ہوتا تھا بہت بھوکی ہے۔

وہ دبلی ہو گئی تھی مگر چاق و چوبند تھی۔ ہر چیز کے گرد گھومتی۔ جو پاتی کھا لیتی اور کسی گوشے میں پڑ کر سو رہتی کچھ دن تک مجھ سے کھنچی کھنچی رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کی پرانی عادتیں لوٹ آئیں۔ اب وہ مجھ سے کبھی کبھار کھیلنے لگی۔ صبح صبح میرے بستر پر آجاتی اور میرے چہرے پر آہستہ آہستہ تھپکی مار کر مجھے جگا دیتی۔

یہاں تک کہ ایک دن پھر اسی سرمئی بلے کی آواز سنائی دی میری بلی کی آنکھیں چمکنے لگیں، بال کھڑے ہو گئے، اس نے انگڑائی لی اور اپنی جگہ پر تھرکنے لگی۔ پھر دونوں نے کھڑکی کے

شیشے کے آر پار سے کھیلنا شروع کیا۔ سرمئی بلے کی سبز چمکیلی آنکھیں
چمک رہی تھیں۔ اس کے چھوٹے چھوٹے نرم بال تھے۔ اور چھوٹا سا
نرم منہ بھلا لگتا تھا۔ دونوں دیر تک اپنے کھیل میں مست
ایک دوسرے کو گھورتے میاؤں میاؤں کرتے، غراتے رہے
پھر تھک کر کھڑکی کے قریب پڑ رہے۔ اور آہستہ آہستہ دمیں
ہلانے لگے۔

آخر میری بلی سے نہ رہا گیا۔ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی
میرے پاس آئی کود کر میرے زانو پر بیٹھ گئی۔ چاپلوسی شروع
کر دی۔ اس کی جو جو ادائیں مجھے پسند تھیں، سب اس نے دکھائیں
سر میری گردن سے رگڑا۔ آنکھیں میچ کر زمین پر لوٹیں کھائیں۔ لیکن میں
ذرا بھی نہ پسیجی۔ کیونکہ میں خوب سمجھ رہی تھی وہ کیا چاہتی ہے میں نے اس
کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اچانک وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔ اور
میرے سامنے کھڑے ہو کر پھنکارنے لگی۔

سرمئی بلا دیر تک کھڑکی کے پیچھے میاؤں میاؤں کرتا رہا
آخر وہاں سے چلا گیا۔ لیکن میری بلی صبح تک کھڑکی کے سامنے بیٹھی
رہی۔

میں نے سوچا کوئی بات نہیں کچھ دن میں بھول بھال جائے گی
اور وہ بھی اپنے گھر لوٹ جائے گا۔ لیکن ایک رات جب میں اپنے گھر
آئی تو دیکھا سرمئی بلا کھڑکی کے پیچھے بیٹھا ہے اور دونوں ایک
دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ مجھے تاؤ آگیا ڈپٹ کر اس کی طرف
لپکی اور وہ بھاگ گیا۔ میری بلی نے ناچ ناچ کر میاؤں میاؤں کرنا
شروع کر دیا۔ پھر پنجوں سے دروازہ کھرچنے لگی۔ میں اسے چھوڑ کر
اپنے کام میں لگ گئی کئی دن تک میں نے نگرانی رکھی کہ دروازہ بند
رہے۔ اور وہ بھاگ نہ جائے میری پیاری تھی وہ میری بلی تھی
ایک دن پھر شام کے وقت سرمئی بلا احاطے میں نظر آیا۔
میں جھٹ لکڑی اٹھا کر میں نے احاطے بھر میں اس کو بھگایا
اور مار مار کر باہر نکال دیا۔ واپس آئی تو میری بلی چیتے کی طرح میرا
راستہ روکے کھڑی تھی۔ میں جدھر بھی مڑتی وہ اچھل کر ادھر
آجاتی۔ بری طرح بپھری ہوئی تھی۔ اس کی انگارے برساتی ہوئی
آنکھیں پھیل کر دگنی ہو گئی تھیں۔ پتا ہوا منہ بھیانک ہو رہا تھا
میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی بہت ترکیبیں آزما ڈالیں لیکن وہ
اپنے آپے میں نہیں تھی۔ آخر وہ مجھ پر جھپٹ پڑی۔ میری گردن
سے لپٹ کر اس نے اپنے نکیلے دانت میرے چہرے میں اتار دیئے
میری سانس رکی جا رہی تھی میں خوف زدہ ہو کر چیخنے لگی۔ یہاں
تک کہ کسی نے مدد کو آکر اسے ہٹایا۔ میں نے بڑے حالوں کمرے
کے اندر گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ میری بلی نے بغاوت کر دی تھی
میرے خلاف اور میرے ظلم کے خلاف۔

صبح تک وہ راہداری میں روتی پھری۔ میں نے اسے نکلنے
کا موقعہ نہیں دیا۔ اس کے بعد سے وہ روزانہ رات رات بھر کھڑکی
سے لگی بیٹھی رہتی۔ مگر سرمئی بلے کا کہیں پتہ نہ تھا۔ میں نے اس
کے لئے بہترین کھانے تیار کئے جو جو اسے بھاتا تھا سب
دیا۔ لیکن اس نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ میں اس کے جتنے لاڈ
کرتی اتنی ہی وہ ضدی اور چڑچڑی ہوتی گئی۔ میں نے اسے کھلی
چھوٹ دے دی کہ جن جگہوں پر اس کو پاؤں دھرنے کی جرأت
نہ ہوتی تھی۔ وہاں جا کر سوئے۔ لیکن وہ روز بروز نڈھال
ہوتی جا رہی تھی۔

ایک دن پڑوس کے کوٹھے پر کسی بلی کی آواز سنکر وہی میری بلی جو
بمشکل خود کو ایک سے دوسرے کمرے تک گھسیٹ کر لے جاتی
تھی اور جس کے اندر کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اچانک اس طرح چھلانگ
مار کر کھڑکی سے باہر کودی کہ ٹانگ تڑوا بیٹھی اور فریادیوں کی
طرح گلی میں پکارنے لگی۔ میں اسے گھر میں اٹھا لائی۔ بہت دن
میں جا کر ٹھیک ہوئی۔ لیکن لنگڑانے لگی کوشش بے کار تھی۔ وہ
بدل چکی تھی اور اب میرا بھی حوصلہ جواب دینے لگا۔ اس کی
سسکیوں، اس کی چیخوں، اس کی بد مزاجی، اس کی شکستہ حالی
سے میرا ناک میں دم تھا۔ اس کا ایک کونے میں پڑے ہوئے
چوہے کی طرح پڑے رہنا مجھے دکھ دیئے دے رہا تھا۔ میں
سمجھتی تھی اچھی طرح سمجھتی تھی کہ وہ دکھ جھیل رہی ہے اور
گھل رہی ہے۔ میں اس کے قریب جاتی تو اس کی آنکھیں پتھرا
کر گھورنے لگتیں، وہ سر اٹھاتی، کچھ دیر تک پلکیں جھپکاتی پھر
گردن ڈال دیتی اور سو جاتی۔

کل ایک بلی کی آواز سنائی دی میں نے کھڑکی کھول دی
کہ اس کا جی چاہے تو باہر چلی جائے۔ اس نے سر اٹھا کر [illegible]
[illegible]

سریندر پرکاش

۴۰/۳، یوگی راج آشرم، ہنس بوگیا بلڈنگ، کالینہ، بمبئی ۹۸

قسان



[قسط نمبر

کابل سے پشاور اور پشاور سے کارواں اجناس کا تبادلہ کرتا ہوا اور سکہ رائج الوقت اپنی تھیلیوں میں رکھتا ہوا اور اپنی تھیلیوں کو بیلوں میں اڑستا ہوا ضلع مظفر آباد کے موضع گڑھی سیداں میں پہنچا۔ یہاں پر طرہ خان کے کئی کئی مقروض تھے جنہوں نے اس کے مرحوم والد باز خان سے چھوٹے موٹے قرض لے رکھے تھے اور عند الطلب ادا نہ کر سکنے کے بدلے میں اپنی زمین اور جائداد کھو چکے تھے۔ اب طرہ خان صرف ان سے سالانہ فصل میں سے حصہ وصول کرنے آتا تھا۔ لیکن بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لوگوں کا کوئی ایمان نہ رہ گیا تھا۔ وہ طرہ خان کی آمد سے پہلے ہی سارا اناج خرد برد کر دیتے تھے اور بیاج دینے سے معذوری ظاہر کرتے ہوئے اپنے ننگے پیٹ دکھا دکھا کر رحم کی درخواست کرنے لگتے تھے۔ طرہ خان اس بار جھنجھلا گیا۔ تہیہ کر کے آیا کہ بے ایمانوں کو کیفر کردار تک پہنچا کر ہی چھوڑے گا۔ طرہ خان کے لئے ایک پریشانی اور بھی تھی۔ کہ اس کے والد باز خان کی موت کے بعد اس کی آبائی زمین چھ بھائیوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ بیاج کا یہ کاروبار اور ایک چھوٹا سا بادام کا باغیچہ اس کے حصے میں آیا تھا۔ اور اس آمدنی سے اب اس کی گذر بسر مشکل ہو گئی تھی

گڑھی سیداں میں اس کی زیادہ تر رقم رحیم یار کی طرف لگتی تھی جو اپنے والد عمر یار اور طرہ خان کے والد باز خان کے وقت سے مقروض تھا۔ گویا کہ طرہ خان اور رحیم یار کو یہ قرضدار اور قرض خواہ کا رشتہ ورثے میں ملا تھا۔ رحیم یار کے علاوہ گڑھی سیداں میں طرہ خان کے لئے برکت رام کھتری بھی ایک مسئلہ تھا۔ جو وقتاً فوقتاً رحیم یار کی چھوٹی موٹی ضرورت پوری کرتا رہتا تھا۔ اور رحیم یار کو طرہ خان کے خلاف بدظن کرتا رہتا تھا۔

اس بار طرہ خان اپنے ساتھ اپنی بیوی گل شیخ اور اپنے اکلوتے بیٹے دلاور کو بھی لے کر آیا تھا جس کی چار برس کا دلاور ابھی گل شیخ کی گود ہی میں تھا۔ اور چچا تیوں سے دودھ پیتا تھا۔

سورج غروب ہونے کو تھا۔ گھاٹی کے اوپر چڑھ کر طرہ خان نے دیکھا نیچے وادی میں موضع گڑھی سیداں کسی بے یار و مددگار بچے کی طرح اپنی بانہیں بغلوں میں دبائے سر جھکائے اداس بیٹھا نظر آیا۔ پھر اس نے سامنے دیکھا کوہ ہندوکش کا لمبا سلسلہ جھٹپٹے میں کراہ رہا تھا۔ اور اس کے پیچھے ایک لمبا چوڑا زمین کا خطہ تھا جو نظروں سے اوجھل تھا جسے ہند کہتے تھے جس میں بڑے بڑے شہر تھے۔ جن میں لاکھوں کی آبادی تھی۔ لاہور۔ ملتان۔ امرتسر۔ دلی۔ لکھنؤ۔ کلکتہ۔ بمبئی اور مدراس ان پر کبھی اس کے ایمان بھائی مسلمانوں کی حکومت تھی۔ جلالی پرچم لہراتا تھا اور شیر بکری ایک ہی گھاٹ پانی پیتے تھے۔ طرہ خان نے اپنی آنکھوں سے نہ کبھی وہ لہراتا ہوا پرچم دیکھا تھا اور نہ ہی شہر اور نہ ہی ان شہروں میں رہنے والوں سے صورت آشنا تھا۔ یہ سارے قصے اس نے یخ بستہ راتوں کو الاؤ کے گرد بیٹھ کر حقہ گڑگڑاتے اپنے بزرگوں سے سنے تھے۔ جن کی نظر میں انسانی تاریخ چند سو برس پرانی تھی۔ جب مکہ شریف میں نور الٰہی کا ظہور ہوا تھا۔ اور رسول اللہ نے بنی نوع انسان کو زندگی کرنے کا درس دیا تھا۔

"اللہ اکبر" کہہ کر طرہ خان نے اپنی نظروں کا جال سمیٹ لیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا جو اس کے ملازم تھے اور اس کے منتظر تھے۔

رحیم یار کے گھر میں جلتا ہوا چراغ ابھی بجھا نہیں تھا۔ وہ اور اس کی بیوی اور تینوں بچے ابھی ابھی مسور کی دال کے پانی میں روٹی ڈبو کر کھا چکے تھے۔ رحیم یار نے حقہ تازہ کر کے چند گہرے کش لئے تھے اور بستر پر دراز ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔ بیوی نے چولہے کی راکھ میں پڑے اپلے ڈھکے تاکہ صبح تک پھلتی پھولی رہے آگ۔ رحیم یار نے متفکر نظروں سے اپنی بیوی کے چہرے پر دیکھا۔ اچانک دونوں کی نظر ہٹ کر اٹھی۔ رحیم یار کے

پر ایک لمحے کے لئے شہوانی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی بیوی رضیہ نے سر جھکا لیا اور بڑبڑاتی ہوئی اپنے بونے کی طرف بڑھ گئی۔

"اللہ قسم آج بہت تھک گئی ہوں"

رحیم یار کے چہرے پر اس کی مسکراہٹ نے دم توڑ دیا اور چراغ کی دھندلی روشنی میں اس کی آنکھیں اور گہری ہو گئیں۔ اس نے پے در پے حقے کے کئی کش لئے اور دھوئیں کے ڈھیروں بادل اگل دیئے۔ حتیٰ کہ چلم میں سے تمباکو جل کر غائب ہو گیا اور آگ بجھ کر خاک ہو گئی۔ تب اس نے وہ دعا پڑھی جو اسے مولوی صاحب نے سکھائی تھی جسے پڑھنے سے شیطان کی آنتیں اور دشمن رات بھر گھر کی چار دیواری سے باہر رہتا ہے۔ اور کمر سیدھی کرکے لیٹنے لگا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ رحیم یار کے چہرے پر حیرانی کے بادل چھا گئے۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا۔ پھر اس نے قریب ہی سوئے ہوئے اپنے بچوں اور بیوی کی طرف دیکھا اور پھر اچانک اس کی نظر آخری سانس لیتے مٹی کے چراغ کی طرف اٹھ گئی۔ وہ اٹھا اور باہر والان کی طرف بڑھتا ہوا پکار اٹھا۔

"کون ہے۔ آدھی رات کے وقت"

دروازے پر دوبارہ پھر دستک ہوئی

"آتا ہوں۔" رحیم یار نے خفگی سے کہا اور جا کر دروازہ کھول دیا۔ باہر اندھیرا تھا اور اس اندھیرے میں کئی سائے بے حرکت کھڑے تھے۔

"کون۔؟" رحیم یار نے تجسس بھری آواز میں پوچھا۔

"طرہ خان" جواب ملا۔ لیکن طرہ خان کی آواز ایسی بھرائی ہوئی تھی کہ اندھیرے میں مزید پر اسرار اور خوفناک ہو گئی۔ رحیم یار کو جیسے بالکل سانپ سونگھ گیا اس کے سارے جسم میں عجیب سا تناؤ پیدا ہوا اور پھر سردی کے باوجود پیشانی پر پسینہ آ گیا۔ اس نے جواب کے لئے الفاظ اپنی گرفت میں لینے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے بڑی شدید جد و جہد کے بعد وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

"آؤ۔" اور دروازے سے ہٹ گیا۔ طرہ خان اور اس کے تین ساتھی آنگن میں داخل ہوئے۔

"رحیم یار ہم تیری زمین کا قبضہ لینے آئے ہیں۔" طرہ خان بولا

"خان۔ جو زمین میرا پیٹ نہیں پالتی تیرے کیا کام آئے گی۔؟"

"جو بھی ہو۔ اب میں اسی گاؤں میں رہنے کے ارادے سے آیا ہوں۔ سفر کرتے کرتے میرے پاؤں پھٹ گئے ہیں اور پھر تم ہمارا اپنے

منہ کالا کرو۔"

"خدا اور رسول کے لئے ایسا ظلم نہ کرو خان۔ میں اپنے بیوی بچوں کو لیکر کہاں جاؤں گا؟"

"کہیں بھی۔ ہندوستان چلے جاؤ۔ محنت مزدوری کرو اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالو۔ لیکن لین دین کے معاملہ میں خدا اور رسول کو بیچ میں مت لاؤ"

"لین دین۔؟ کیسا لین دین۔؟ میں نے کبھی اپنے باپ کو تیرے باپ سے کچھ لیتے نہیں دیکھا۔ بس کہتے سنتے میں آ گیا پیٹ کاٹ کر تمہیں دیتا رہا۔ میں اس گھر کی دہلیز چھوڑ کر نہ جاؤں گا۔ یہ گھر یہ زمین میرے پرکھوں کی طرف سے مجھے ملی ہے۔ اسی زمین میں ان کی ہڈیاں دفن ہیں۔"

"رحیم یار۔ جہاں تیرے پرکھوں کی زمین گھر اور ہڈیوں پر تیرا حق ہے وہاں ان پر واجب قرض کی ادائیگی بھی تیرا فرض ہے۔ پچھلے کئی برسوں سے تو پورا بیاج بھی نہیں دے سکا اور اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے میں اپنے پرکھوں کے قرض کی وصولی کے لئے بھکاریوں کی طرح بھٹک نہیں سکتا۔"

اس کے ساتھ ہی طرہ خان کے ساتھیوں نے اپنے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی تلواریں میان سے نکال لیں۔ اندھیرے میں تلواریں چمک اٹھیں اور طرہ خان نے خنجر نکال کر رحیم یار کے پیٹ پر رکھ دیا۔ رحیم یار برف کی سل کی طرح یخ بستہ ہو گیا اس نے پلٹ کر اپنی کوٹھری کی طرف دیکھا جہاں اس کے بچے اپنی ماں کی ٹانگوں سے لپٹے تھر تھر کانپ رہے تھے اور اس کی بیوی کا پورا وجود اس کی خوف زدہ آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔

رحیم یار کے سب سے بڑے لڑکے اللہ یار نے یہ سارا منظر دیکھتے ہوئے دل و جان سے کانپتی ٹانگوں اور غصہ کے مارے جلتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اپنے باپ کو جبر کے سامنے بے بس پایا اور اندھیرے میں شمشیروں کی چمک دیکھی اس کے دس برس کے کمہلاتے ذہن میں ایک خیال کوندے کی طرح لپکا۔ انسان سے زیادہ وہ خنجر طاقتور ہے جس کی نال اس کے باپ کے پیٹ پر رکھی ہوئی ہے اور اس شمشیر کی دھار بڑی تیز ہے جو طرہ خان کے آدمیوں کے ہاتھوں میں ہے اگر یہ بدل جائیں تو یہی ہتھیار اپنے مالک کے خلاف اسی سنگدلی سے رحم اور نفرت کا باعث بن سکتے ہیں۔ اور پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اللہ یار کا باپ رحیم یار اپنے بچوں اور بیوی اور معمولی سامان کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا ہوا گھر سے باہر نکلا اور سرد اور گہری سنگدل رات کی آغوش میں گم ہو گیا۔ اس اندھیرے میں دو معصوم ننھی سی آنکھیں کبھی کبھی جگنوؤں کی طرح چمک کر بجھ جاتی ہیں۔

عباس خان
کارواں بک سینٹر، صدر ملتان (پاکستان)

مختصر مختصر کہانیاں

بیٹی

آپ بیٹی کیوں نہیں چاہتے۔ جاہلیت وہ زمانہ حالاں کہ گذر چکا ہے جس میں لوگ بیٹیاں پسند نہیں کرتے تھے۔"

"وہ زمانہ مسلسل باقی ہے"

"وہ کیسے؟"

"پہلے کے لوگ دوسرے کی بیٹی کے ساتھ آزادی چاہتے تھے اور اب بیٹی دوسروں کے ساتھ آزادی چاہتی ہے۔ بات وہیں کی وہیں ہے۔"

صحت

"اس کی صحت بہت اچھی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ وہ ایک امیر آدمی ہے۔ اس کو سب آسائشیں میسر ہیں۔ پھر وہ اپنی خوراک کا خاص خیال رکھتا ہے۔"

"اس کی صحت کے اچھا ہونے کی یہ وجوہ نہیں ہیں۔"

"اور کون سی وجہ ہے؟"

"وہ بے حس ہے۔"

ظاہر و باطن

"آپ نے آج تک اس کو نہیں دیکھا۔ آپ کو پھر کیسے معلوم ہوا کہ وہ قبل از وقت بوڑھی ہو گئی ہے۔"

"اس کی ڈریسنگ ٹیبل دیکھ کر۔"

"ڈریسنگ ٹیبل سے آپ نے اس کی عمر کا اندازہ کیسے لگایا؟"

"ڈریسنگ ٹیبل پر پہلے آرائش و زیبائش کی اشیاء رکھی ہوتی تھیں مگر اب وہاں ادویات پڑی ہوتی ہیں۔ جو لوگ اپنے ظاہر کا صرف خیال رکھتے ہیں ان کا باطن ان سے اس طرح انتقام لیتا ہے۔"

خدا کے نزدیک

"طاہر کہاں چلا گیا ہے؟"

"اس کو اللہ تعالیٰ نے بلا لیا ہے۔"

"اوہ! اللہ تعالیٰ مغفرت کرے۔ وہ ایک اچھا انسان یہ خبر سن کر بہت دکھ ہوا ہے۔"

"وہ مرا تو نہیں ہے۔"

"آپ ہی نے تو کہا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے بلا

"جناب وہ دیہات میں رہنے چلا گیا ہے۔"

بقیہ صفحہ ۱۵ بلی کا خون

کی تھکی تھکی بجھتی بجھتی نگاہیں مجھ پر جم گئیں اس نے کسی یا کے انداز میں میاؤں میاؤں کی آواز نکالی دانت نکو دو بارہ سو گئی۔ اور آج میں نے اس کو مار ڈالا۔

[فارسی عنوان: گربہ ام راکشتم]

نئے نام
نئے استعارے
۱



جاوید ناصر

◆

سب کچھ یہاں روا ہے تو جینا محال کیا
اس شہر میں ہواؤں کی تازہ مثال کیا
اچھا ہوا کہ میں نے ہی دھوکا دیا تجھے
گرد و غبار بن کے اڑے ماہ و سال کیا
یہ ذکر اور ہے کہ پریشان ہیں سبھی
لیکن ذرا سی بات پہ اتنا ملال کیا
ہم سیدھے سادے لوگ لفظوں پہ جائیں گے
لہجے کے بعید بھاؤ سے سمجھیں گے حال کیا
ممکن نہیں کہ ایک ہی لمحہ رفیق ہو
ان قربتوں کے دور میں اپنی مجال کیا

◆

کہنے کو آسمان ہے ہر خاص و عام کا
میں ترک کر رہا ہوں ارادہ قیام کا
آندھی چلی تو کون کہاں، اتنا یاد ہے
خوشبو کا قافلہ تھا، بڑا تام جھام کا
میں جیسے پھڑپھڑا کے جھٹکتا ہوں یاد کو
اب تک بدن پہ بوجھ ہے مٹیالی شام کا
میں نے دعا کو اپنا بتایا ہے ترجماں
اس پہ کھلے گا کوئی تو مطلب پیام کا
ٹوٹے اگر ہوا تو اندھیرے کا گل جھڑے
مکتوب لے گئی ہے سویرے کے نام کا

رہائی

ہم دھرتی کے اندھے بچے
دنیا جیسے
او جھل پنچھی ______،
______ کاغذ کے سنتوش زمانے
برسوں کا تیزاب چھڑک کر
جھوٹی سچی آگ لگا کر
آنکھوں سے
خود لپٹ گئے تھے ______،
ریت کے اُجلے سینے سے ہم
راتوں کے الفاظ اٹھا کر
اپنے گاؤں لوٹ رہے تھے ،

اب تو گھر
سورج کا ماتھا
دیواریں بھی پُرکھوں جیسی ______،

اب تو روز پرندے آکر
پلکوں سے زر دوش دعائیں

چن چن کر لے جاتے ہیں
جنگل جنگل گاتے ہیں

آل انڈیا ریڈیو، بمبئی ۔ ۴۰۰۰۲۰

مختار شمیم

تمام منظروں کو میری آنکھ میں اتار دے
میں بے بصر ہوں تو مجھے نگاہِ اعتبار دے

میں حیرتوں کا سلسلہ کہ جیسے ایک آئینہ،
اس آئینے میں تو مجھے بگاڑ دے سنوار دے

ہر ایک لفظ بے صدا، ہر ایک حرف بے نوا
میں کم سواد و کم نگہ، متاعِ اعتبار دے

اب آنسوؤں کی فصل بھی ہری بھری رہی نہیں
جو سوتے خشک ہو گئے ہیں ان کو آبشار دے

وہ میں۔ کہ میری ہر نظر سوال ہی سوال ہے
وہ تو۔ کہ اپنی سلطنت میں مجھ کو اختیار دے

گھر میں وحشت تھی کہیں اور ٹھکانا نہ ہوا
صحن گھر کا ہوا حق میں مرے صحرا نہ ہوا[1]

بجھ گیا چاند کہیں، اور کہیں تارا ٹوٹا
تیرہ بختی کا کوئی ایک تقاضا نہ ہوا

یوں تو ہر سر پہ تھی دستارِ فضیلت لیکن!
اک مری بے خبری کا ہی مداوا نہ ہوا

یوں بھی صیقل ہوا اعجازِ سخن سے جوہر
اور آئینہ اور اک بھی دھندلا نہ ہوا

کس کے گھر جاتے کہ تنہائی کا رونا روتے
کوئی مختار شمیم آپ سا تنہا نہ ہوا

پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی رکھے کتاب میں
کچھ رنجشیں کھلی ہیں محبت کے باب میں

جاں بخش سایہ دار درختوں کے سلسلے
خود بھی پناہ ڈھونڈ رہے تھے سحاب میں

مہکا ہے جیسے خونِ تمنا بہ دستِ شوق
چھلکا ہے جیسے رنگِ تمنا گلاب میں

اِن جنگلوں میں دوستو! رستے بھی کھو گئے
دشتِ تعلقات بھی آئے سراب میں

دستار اپنی کیسے سنبھالیں گے صاحبو!
اُس آسمان بخت، فلک سر جناب میں

حرف بے نامعتبر سوچا کئے
سادہ کاغذ، دیر تک دیکھا کئے

رات بھر شاخِ نہالِ غم کے پاس
چاند میں چہرا ترا دیکھا کئے

چاندنی کے پھول کمہلائے کہیں
یاد کے موتی کہیں بکھرا کئے

اور تو کیا تھا ہمیں بھی اختیار
چپکے چپکے رات دن رویا کئے

ہے طلسمِ شب کا منظر آنکھ میں
دل رہا بیدار ہم سویا کئے

[1] غالب سے معذرت کے ساتھ

● ایف-۳، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کیمپس-اندور (ایم پی)

شاہد کلیم

◆

ہمارے عہد کا ہر شخص بے تدبیر ہے شاید
نظر میں دھند ہے پیروں میں بھی زنجیر ہے شاید

مجھے پہچان ہے ہر رنگ کی، ہر روشنائی کی
کسی کے خون سے لکھی ہوئی تحریر ہے شاید

کوئی منظر نہ جانے کیوں مجھے اچھا نہیں لگتا،
مری آنکھوں میں آویزاں تری تصویر ہے شاید

دریچوں، روزنوں سے خوشبوئیں کمرے میں در آئیں
تمہارے ہاتھ میں لالہ نہیں شمشیر ہے شاید

اُجالوں کا تسلسل ختم ہوتا ہی نہیں شاہد
بدن کے دشت میں بھی شعلۂ تنویر ہے شاید

◆

کسی کی پروا، نہ اپنا ہی کچھ خیال رہا
خزاں کے دور میں اپنا عجیب حال رہا

میں بجھ گیا تھا مگر روشنی سی ہوتی رہی
مرے زوال کا ہر لمحہ لازوال رہا

میں مشتِ خاک بکھرتا رہا ہواؤں میں
مرا وجود اسی طرح پائمال رہا

اُسی کا نام لئے جا رہا تھا میں شاہد
اندھیری رات میں جو پیکرِ جمال رہا

◆

حقیقتوں کا کہاں انکشاف ہوتا ہے
میں سچ کہوں تو زمانہ خلاف ہوتا ہے

اُجالے میں بھی نہ پہچان پاؤ گے ہم کو
ہمارے چہرے پہ ہر دم غلاف ہوتا ہے

میں آدمی ہوں مجھے آدمی نے گھاؤ دیئے
کسی چٹان میں کیسے شگاف ہوتا ہے

بھٹکتی پھرتی ہے گھر گھر عجیب سی آواز
یہ شہر رات گئے کوہ قاف ہوتا ہے

کوئی ندی تو نہیں رنگ جس میں گھل جائے
میں آئینہ ہوں مرا عکس صاف ہوتا ہے

◆

شمار رات کا دن کا حساب کیا کرتا
کہ میں ہمیشہ رہا محوِ خواب کیا کرتا

نہ خوشبوؤں کی طلب تھی نہ رنگ کی خواہش
میں لے کے ہاتھ میں تازہ گلاب کیا کرتا

ورق ورق تھا شکستہ مٹے مٹے سے حروف
میں رکھ کے کمرے میں ایسی کتاب کیا کرتا

خموش تھا کہ اسی میں تھی عافیت اپنی
میں قتل گاہ میں ذکرِ ثواب کیا کرتا

کچھ ایسی دھوپ تھی صحرائے زندگی میں کلیم
میں چیختا ہی رہا آب آب کیا کرتا

دودھ کٹورا، گیا-۸۲۳۰۰۱ (بہار)

پرویز رحمانی



◆

تو کیوں باقی ہے تو کیوں لافانی ہے
تیرے سوا ہر شے کیوں آنی جانی ہے

سچائی کا رشتہ ہے جب شہ رگ سے
پھر کیوں مجھ میں خوابوں کی ارزانی ہے

رات کے لب پر ہر لمحہ دوپہرا درد،
دن کی زباں پر ہر پل شب گردانی ہے

آئینہ دولمحتی پر مسرور ہے آج
سبزہ سبزہ تن ہے صورت دھانی ہے

تو یعنی میں لایعنی سمجھائے کون
فکر یہ دوزانوں کب سے رحمانی ہے

◆

رائیگاں جاتی نہ کیوں پھر ہمہ کوشی اس کی
تھی غرض کار بہت حلقہ بگوشی اس کی

ہر طرف اس نے دیا جسم نمائی کو رواج
خوب مشہور ہوئی سایہ فروشی اس کی

بر سرِ عام مری چُپ کی جو تشہیر ہوئی
مشتعل ہو اٹھی آواز بگوشی اس کی

منعکس ہو نہ سکی کوئی بھی صورت اس سے
یعنی بیکار گئی آئینہ پوشی اس کی

آگیا وہ مری خورشید پناہی کے تلے
مجھ سے دیکھی نہ گئی خانہ بدوشی اس کی

◆

اسے تب دیکھتے شاداب تھا جب
یہ صحرا ہر طرف خوش خواب تھا جب

اُمیدی سیپیاں عرفان سے تھیں
سمندر فکر کا پایاب تھا جب

چھلکتی خوشبوئیں تھیں مچھلیوں کی
جزیرہ خواب کا دشاب تھا جب

قدم خود سے بڑھاتے تھے نہ رستے
برستا چار سو گہراب تھا جب

سبھی جس کو اُجالا سوچتے تھے
ہماری آنکھوں میں نقشاب تھا جب

◆

یہاں وہاں تک سلگتی خشکی سی دیدۂ ہم شعار میں بھی
نہ بھی وہ خنجر کی آبگی میں جو بات باتوں کی دھار میں بھی

نگاہ کی سنگ باریوں سے چٹانیں کتنی چٹخ گئی ہیں
تو پھر بھلا کانچ کی یہ بے مایہ زندگی کس شمار میں بھی

یہاں تو خود اپنے ہاتھوں اپنی عجیب بے وقعتی ہوئی ہے
یہ ذات کچھ بھی نہیں بھی اس وقت پھر بھی وزن و وقار میں تھی

بدن بدن زرد فرد سایوں کے خوف سے دُور دُور آنکھیں
طرف طرف رنگ رنگ منظر کہ فکر فکر انتشار میں بھی

قدم قدم وا ہمے خموشی سے دائرہ باندھے بڑھ رہے تھے
سفید سی ایک رُوح پرویز حال کے کارزار میں تھی

ڈورنڈہ ـ رانچی ۸۳۴۰۰۲ (بہار)



نظام الدین نظام

◆

ی انقلاب باقی ہے
! ابھی اک عذاب باقی ہے
حرفِ اظہار دفن ہے دل میں
یہ گہر زیرِ آب باقی ہے
یپ میں چاندنی کی ٹھنڈک بھی
میں عکسِ خواب باقی ہے
دھوپ میں بے سبب نہیں ہے سفر
دیکھتا ہوں ! سراب باقی ہے
ت بھی سود خور بنیا ہے
ت لے لی ، حساب باقی ہے

◆

مٹا تو سکتی نہیں ، پائدار کرتی ہے
عبث اَنا کو طلب سنگسار کرتی ہے
میرے حریف ، تیرے عزم کی توانائی
ترے خلاف مجھے شہسوار کرتی ہے
وہ یاس ہے جو بدلتی ہے اپنا پیراہن
شبِ فراق ترا انتظار کرتی ہے
اے تنگ دل ، تری نفرت کی بدنصیبی ہے
اُسی کو موت نہیں ، جس پہ وار کرتی ہے
جو تیرے شہر میں مجھ سے ملی ہے بے پردہ
وہ دوستی ہے ، مگر کاروبار کرتی ہے

◆

اُس طرف دستِ سخا بھی ہے ، نوازش ہی نہیں — اپنی جانب سے مگر کوئی گزارش ہی نہیں
دیکھ اے چشمِ طلب دیدہ ، یہاں مت کھلنا — کیسی شادابی ، جہاں خون کی بارش ہی نہیں
زندگی ہے تو وسیلے بھی ضروری ٹھہرے — مرنے والوں کے لیے کوئی سفارش ہی نہیں
اب تو اس شہر میں جینے کا مزہ ہی نہ رہا — اب تو قاتل بھی کرایے کے ہیں سازش ہی نہیں
دل کہاں ، مقبرہ ماضی کا ہے سینے میں نظام
کوئی دھڑکن ، کوئی جذبہ ، کوئی خواہش ہی نہیں

رشید امکان

کسی کے نام کو میزان بے عدد کرے
یہ جس یقین پہ آؤں اُسی کو رد کرے

ہر اک سبیل اندھیروں کی خاک پا بن جائے
ابھی ذرا سا اُجالا تو بے مدد کرے

اُتار سکے گر کسی دن تو شعلۂ دستار
کسی یزید کا اعزاز مسترد کرے

میرے شریک مسافر ہیں اور صحرا ابھی
شجر نہ دے میرے سائے کا لمبا قد کرے

میرے خلاف جو پھیلی ہوئی ہے چاروں طرف
ذرا سی اور ہوا سے کے مستند کرے

رہنے لگا اُسی طرح آیا گیا سا پھر
وہ مجھ سے جوڑتا ہے کوئی سلسلہ سا پھر

بو دیں تھیں میں نے اپنی دسوں انگلیاں جہاں
پیروں میں آرہا ہے وہی راستہ سا پھر

خاموشی بھاگنے لگی خیمے اکھاڑ کر
کانوں میں گونجتا ہے کوئی جا بجا سا پھر

آثار کچھ نہ ہوں مگر ایسا ضرور ہے
جیسے بندھا رہا ہو کوئی حوصلہ سا پھر

گذرا تھا وہ تو میرے بہت ہی قریب سے
لیکن میں خود ہی چوک گیا ہوں ذرا سا پھر

وہم و گمان سے دور کہیں پیش پیش ہے
وہ مرحلہ جو میرے تئیں پیش پیش ہے

اب اُس کے ساتھ کیسے میرا سر بلند ہو
جس آسماں کے ساتھ زمیں پیش پیش ہے

چنتی ہے میرے واسطے جو راہ نت نئی
مجھ میں وہ شے کہیں نہ کہیں پیش پیش ہے

اُس کا بچھڑنا میرے لئے نیک فال تھا
ہر لمحہ اب وہ میرے تئیں پیش پیش ہے

جب وہ قریب تھا تو بہت لایقین تھا
اب وہ نہیں تو اس کا یقیں پیش پیش ہے

ثبوت دے کوئی اپنے وجود کا پھر سے
ہتھیلیاں تیری خالی ہیں آگ لا پھر سے

وہ منھ کی بھاپ ہوئے سارے نقش چہروں کے
وہ حرف حرف اُڑا لے گئی ہوا پھر سے

میں اپنی آنکھ بھی چپکا رکھوں گا کانوں سے
مجھے الانگ نہ جائے کوئی صدا پھر سے

کہ جیسے بڑھ کے ابھی آسمان چھو لیں گے
کہیں کہیں سے یوں پھوٹے ہیں دست و پا پھر سے

دراڑیں ڈال دوں دھرتی کے ریشے ریشے میں
قریب ہونے نہ پائے وہ فاصلہ پھر سے

گوشۂ تخلیق ۵۳ توپ خانہ روڈ، اوجین ۔ ۴۵۶۰۰۱

رئیس منظر

◆

؛ چاہتا ہوں، کچھ اتنا اداس ہوجاؤں
ہ اس صدی کا حقیقت شناس ہوجاؤں

ہ بات ہوں کہ دلوں میں رہوں یقیں بن کر
یاں ملے تو بعید از قیاس ہوجاؤں

ہ آدمی ہوں، اگر تجزیہ کروں اپنا
ی کا جسم، کسی کا لباس ہوجاؤں

ھپا ہے مجھ میں جو اک شخص، مجھ سے کھل جائے
ا از کم اتنا حقیقت شناس ہوجاؤں

بجز یہ بھی عجب ہے کہ اپنے آپ سے میں
ی سوال کروں اور اداس ہوجاؤں

◆

کون نکلے گھر سے باہر، کون دیکھے کیا ہوا
میرا ہمسایہ ہے خود میری طرح سہما ہوا

آسماں حل کر سکے شاید زمیں کے مسئلے
کھول کر دیکھوں صحیفہ طاق میں رکھا ہوا

بھیڑ اک نظروں کی اُس کے بال و پر کے آس پاس
اک پرندہ نیلگوں آکاش میں اُڑتا ہوا

کچھ معزز لوگ میرے جھوٹ کو سچ کہہ گئے
سُرخرو ہو کر مجھے ذہنوں کا اندازہ ہوا

بارشوں کے قہر کی زد میں ہیں دیواریں تمام
دیکھئے، بچتا ہے کس کے ہاتھ کا لکھا ہوا

مشترک تھا ایک موسم میرا اُس کے آس پاس
وہ بھی کچھ بکھرا ہوا سا، میں بھی کچھ ٹوٹا ہوا

میرے گرد و پیش منظرؔ، اس کی گنجائش کہاں
قتل کر دے گا مجھی کو خود مرا سوچا ہوا

◆

مرا سفر مجھے حیران کر گیا کیسا
نظر میں ایک ہی منظر ٹھہر گیا کیسا

پکارتا رہا کہسار کا سکوت مجھے
میں ایک سیلِ رواں سا گزر گیا کیسا

گناہ جس کے پنپتے تھے ظلمتِ شب میں،
طلوعِ صبح کی آہٹ سے ڈر گیا کیسا

نہ کوئی آندھی ہی اُٹھی، نہ قافلہ گزرا
غبار سا مری آنکھوں میں بھر گیا کیسا

چھپے ہوئے تھے مجھی میں ہزار امکانات
میں اپنی آگ میں تپ کر نکھر گیا کیسا

عجب شناس تھی اُس کے اداس لہجے کا
وہ تشنہ لب مجھے سیراب کر گیا کیسا

کوئی شراب تھی کیا فکرِ شعر میں تحلیل،
یہ نشہ سا رگ و پے میں اُتر گیا کیسا

● گلی لبا بزان، [illegible] دہلی

حمد

جلیس نجیب آبادی

تاریک مرحلوں میں صحرا کا یقیں ہے تو
جس نے جہاں پکار لیا ہے وہیں ہے تو

گہری، سیاہ چپ میں شعاعِ اُمید تو
اور دشتِ انتشار میں خوابِ حسیں ہے تو

کچھ بے گھری کا خوف، نہ بے سائیگی کا ڈر
تو میرا آسمان ہے میری زمین ہے تو

بے لفظ، بے صدا مرے فکر و خیال سب
سوچوں کی رہگذر میں سخن آفریں ہے تو

دو چار الجھنیں ہوں تو اظہار بھی کروں
یا رب! دلوں کے حال سے واقف نہیں ہے تو

◆

اُس کا بھیگی ہوئی آنکھوں سے بچھڑنا چپ چاپ
میری دہلیز پہ رکھا ہے وہ لمحہ چپ چاپ

تتلیاں، پھول، ندی، ریت، گھروندے، جھولے
دشتِ امروز میں بچپن کا زمانہ چپ چاپ

میں بھی جلتا رہوں دن رات اکیلا، تم بھی
شمع کی طرح پگھلتی رہو تنہا چپ چاپ

میں بھی دوں برگِ تخیل کو کڑی دھوپ کا سچ
تو بھی آکاش سے دھرتی پہ اُتر آ چپ چاپ

میں نے دیکھا ہے کھلی آنکھ سے، کل آخرِ شب
خودکشی کرتا ہوا ریت میں دریا چپ چاپ

◆

اپنے اندر جھانکنے کا حوصلہ تک لے گیا
کون تھا؟ اندھی اڑانوں کی ادا تک لے گیا

آتے جاتے موسموں کے رنگ پھیکے پڑ گئے
کارخانوں کا دھواں تازہ ہوا تک لے گیا

روشنی ہوتی تو کچھ دیوار و در سے پوچھتے
وقت بوسیدہ گھروندوں سے دیا تک لے گیا

اک مسلسل خامشی کا سلسلہ ہے اور میں
درد کا سیلاب تو حرفِ نوا تک لے گیا

سو رہی تھی میری اپنی ہی صدائے بازگشت
کیا ہوا گر وہ مجھے کوہِ ندا تک لے گیا

◆

بھیگی راتوں نے طلسمات جگائے کیا کیا
آسمانوں سے برستے رہے قصے کیا کیا

فرصتیں کم ہیں، نہ کر روح کے زخموں کا علاج
سوچ، اس شہر کے لوگوں سے ہیں رشتے کیا کیا

میری آنکھوں میں نہیں، دل میں اُتر کر دیکھو
اس سمندر کی تہوں میں ہیں جزیرے کیا کیا

ان کتابوں میں ضخامت کے سوا کچھ بھی نہیں
حاشیوں پر ملے بے کار حوالے کیا کیا

میری صورت مہ و انجم بھی ہیں بکھرے بکھرے
رات بھر سوچتے رہتے ہیں خلائی کیا کیا

● پٹھان پورہ، نجیب آباد- ۲۴۶۷۶۳ (یوپی)

عطاء الرحمٰن طارق

◆

ں وحشت و توقیر و طمطراق سمجھ
لگے جو ہاتھ، جہاں میں تو اتفاق سمجھ

ے اختلاف ہی ٹھہرا تو پھر تکلف کیا
میں حادثہ جسے لکھوں اُسے مذاق سمجھ

یری روح کی گہرائیوں میں کھو جاؤں
مری فسردہ دلی تو شبِ فراق سمجھ

ہے دھندسی، بیگانگی کی آنکھوں میں
دلوں میں بیٹھ چکا مستقل، نفاق سمجھ

تجھے خبر بھی نہ ہوگی میں تجھ سے بچھڑا ہوں
تو میرے یار مجھے اس ہنر میں طاق سمجھ

◆

ں ایسا تکلف ہے گھروں میں
ے آرام سے ہیں دفتروں میں

سلطان بننا چاہتے ہیں
ب سودا سمایا ہے سروں میں،

ر ساری دُنیا چاہتا تھا
یلے چاری ہے ٹھوکروں میں

ے جیت دیمک پھوڑ رہے
گردن دبا لی اپنی پروں میں

ابھی طارق تمہاری عمر کیا ہے
رہے کس لئے تم گھروں میں

◆

سورج کی بات ہے کبھی خالی نہ جائے گی
دن کی نمود رات سے ٹالی نہ جائے گی

بچے سُنا کریں گے، مزے کی کہانیاں
ذہنوں میں بات آج کی ڈالی نہ جائے گی

گھر سے اُٹھتے ہیں ہم کو مسائل زمین کے
ہم سے تو آسماں کی دعا لی نہ جائے گی

مشکل ہے کوئی فیصلہ قسمت کے باب میں
کردار کی چوٹی اچھالی نہ جائے گی

چل کر جوان ہو بھی چکیں سازشیں مگر
طارق تمہاری خام خیالی نہ جائے گی

◆

غم سے گذرے نشاط سے گذرے
ہر طرف احتیاط سے گذرے

سر بسر ارتقاء ضروری تھا
سر بہ سر انحطاط سے گذرے

کھائے کیوں جذبہ ناروا کا فریب
آدمی کیوں بساط سے گذرے

دل وریدوں میں خون رکتا ہے
جانے کیا ارتباط سے گذرے

زندگی یوں تمام کی طارق...
جیسے اک پل صراط سے گذرے

جمال اویسی

زرد چاند آکاش میں اُگتا ہُوا
چہرۂ آفاق مرجھایا ہُوا

میں رہا ساحل پہ تنہا رات تک
تھا سمندر شام سے بپھرا ہُوا

ٹوٹ کر بکھری زمیں پر کوئی شے
منتشر کرے کا سناٹا ہُوا

کتنے تارے آسماں میں بجھ گئے
میں کہاں دنیا سے پوشیدہ ہُوا

اک نگاہِ یاس ڈالی ہر طرف
زیست کا غم جب کبھی تازہ ہُوا

◆

اکیلے جینے والوں کا کوئی ہمدم نہیں ہوتا
وہ جس کے ساتھ دُنیا ہو اُسے کچھ غم نہیں ہوتا

میں شب بھر جاگ کر جلتا ہوں تنہائی کے خیمے میں
چراغِ راہ کی مانند میں مدھم نہیں ہوتا

اچانک چلتے چلتے ساتھ کوئی چھوڑ دیتا ہے
کسی کی بے وفائی کا اب اتنا غم نہیں ہوتا

چرا کر لے گئی آہ و فغاں آندھی جو آئی تھی
کسی کی موت پر اب شہر میں ماتم نہیں ہوتا

غموں کے راستے ہوں یا اداسی کا سمندر ہو
مسافر رہگذاروں میں کبھی بے دم نہیں ہوتا

◆

میں تیرے پاس رہ کر بھی نہیں ہوں
مرے دل! میں ترا ساتھی نہیں ہوں

جہاں کے لوگ ہوں معصوم، سادہ
میں ایسے شہر کا شہری نہیں ہوں

مرا لہجہ یوں ہی شاک ہوگا
وفا، اخلاق کا عادی نہیں ہوں

ہوا ہوں تیز تر چلتا ہوں، لیکن
خدا شاہد ہے میں آندھی نہیں ہوں

مرا غم مجھ کو لذت بخشتا ہے
سکھی جیون سے میں راضی نہیں ہوں

◆

رسالوں سے باہر قدم رکھ چکی
غزل اب دکانوں میں بکنے لگی

کتابوں کے کردار دھندلا گئے
ضرورت ہے روشن حکایات کی

فصیلوں پہ لکھا گیا کیوں اسے
محبت تو سینہ کی تحریر تھی

اُٹھے ہاتھ جب جب دعا کیلئے
ہمیں زندگی دم پہ بھاری لگی

کرن کوئی پھوٹی ہے لیکن جمال
سرِ رہگزر یہ بھی سو جائے گی

عذرا پروین

اب اپنی چیخ ہی کیا۔ ہائے اپنی بے زبانی کیا
محض اسیروں کی زندگانی کیا

رتیں جو تو نے اتاری ہیں خوب ہونگی مگر
ببول پیڑ پہ سجتی ہے گل فشانی کیا

ہے جسم ایک تضادات کے کئی خانے
کریگا کوئی انھیں اک رنگ آسمانی کیا

ہزار کروٹیں جھنکاری سناتی ہیں
یوں چھپانے سے زنجیر ہو گئی پانی کیا

زمیں کے اور تقاضے فلک کچھ اور کہے
قلم بھی چپ ہے کہ اب موڑ لے کہانی کیا

انا تو قید کی تشہیر سے گریزاں تھی
ہمارا عشق ہوا مستقل بے زبانی کیا

یہ خشک نخل ہی، جنگل طویل، تیز ہوا
بکھیر دے گی مجھے بھی یہ بے نشانی کیا

◆

میری تباہی نہ میری اپنی، نہ ڈوبنے کے جواز میرے
کہ بحر تیرے، بھنور بھی تیرے، جو ڈوبے وہ سب جہاز تیرے

اڑانیں میری، نہ پنکھ میرے ہوا بھی تیری فضا بھی تیری
جو سر ہوئے وہ فلک بھی تیرے جو چھن گئے وہ فراز تیرے

میں خود بھی اپنی کہاں ہوں زد پہ تیرے اشاروں پہ اڑ رہی ہوں
بے اختیاری ہے وصف میرا ہیں باقی سب امتیاز تیرے

اسیرتن کو بھی دعوتِ رقص دینے والی ہوا چلی ہے
کہ میرے اطراف بج اٹھے ہیں عجب ارادوں سے ساز تیرے

یہ مجھ میں سہما ہوا پرندہ بھی تیری خلقت پہ مشتمل ہے
مگر مجھے کیوں یہ لگ رہا ہے کہ تو ہے باذوں کا باز تیرے

◆

سوچ لیے ہیں باری باری سکھیں [illegible]
جل جائیں کہ آزاد اڑانیں کونسی ماریں [illegible]
لپٹا پنچھی پر نہ بے جو ہر کا جلتا [illegible]
اڑوں کدھر پرے پنکھ نے تھر کیتے [illegible]
قبل اسکے کریں جشن منا دُکی پچھلی ہوئی [illegible]
تیر تعاقب ہیں چل نکلی پر بیت جھنکا [illegible]
پھر عرفان گزیدہ ہونے کی باہر تنگنہ [illegible]
کھینچ رکھی ہے پھر پہلو کی تصویر اسر [illegible]
اسکی ہر تحریر ہے مبہم ساری عبارت [illegible]
لاکر پہلو میں بھول گیا۔ لگتی ہے [illegible]
یہی جھنکاروں آد کان ہمارے چونکا [illegible]
رت لائی ہے اب کہ برس زنجیری جھنکا [illegible]

◆

بہر حیرانی خود کو جلانے والا [illegible]
دھوئیں میں اپنے کب چھپا تھا [illegible]
ہر یالی در کار — اڑانیں بھی [illegible]
کھو چکی ہیں۔ کدھر بھی جانے والی [illegible]
دھنک رنگ کے جال بچھانے [illegible]
الجھ کے اپنا آپ گنوانے والی [illegible]
میری چپ کا جشن منانے [illegible]
گھائل دل سے کرشمے [illegible]
[illegible]
[illegible]

شہناز نبی

کسی کے نام رکھا رہن اور چھڑا نہ سکی
میں اپنی عمر خود اپنے لئے بچا نہ سکی

وہ جگمگاتا رہا میری روشنی سے مگر
میں اُس کے نرم اُجالوں کا لمس پا نہ سکی

وہ اک صدا پہ مری مڑ کے دیکھ ہی لیتا
انا کی گونج بھی ایسی، اُسے بلا نہ سکی

جب اتنا جان لیا مجھ سے اور بھی ہیں بہت
اکیلے پن کی چبھن، میرا دل دکھا نہ سکی

سبھی بلند اُڑانوں میں یاد آتی رہی
وہ ایک شاخ، کہ میں جس پہ پَر کھلا نہ سکی

میں کہ خود سے ڈر رہی ہوں، تم نے کب سوچا
اپنے اندر مر رہی ہوں، تم نے کب سوچا

منزلیں تم سے لپٹی ہیں وہاں پرہااور میں
مدتوں سے گھر رہی ہوں، تم نے کب سوچا

اس جہانِ بال و پر کی اونچی پروازوں میں
کس قدر بے پر رہی ہوں، تم نے کب سوچا

تم نے سارا گھر کھلونوں سے سجایا پھر بھی میں
کیوں خفا اکثر رہی ہوں تم نے کب سوچا

جانے کتنے چاند تاروں، سورجوں میں گھر کے بھی
دھند کا منظر رہی ہوں، تم نے کب سوچا

جب نئی سمت چلو، یاد مجھے بھی کرنا
جب کوئی چہرہ پڑھو یاد مجھے بھی کرنا

لفظ بکھرے ہوئے احساس کا آئینہ ہے
جب کوئی شعر کہو، یاد مجھے بھی کرنا

میں تو موسم کے ہر اک لمس سے آزاد ہوئی
تم کسی شاخ کھلو، یاد مجھے بھی کرنا

رات بے درد ہے ہنستوں کو رلا دیتی ہے
تم کسی رات جگو، یاد مجھے بھی کرنا

ریزہ ریزہ مری آنکھوں کو رلاتا ہے بہت
تم اگر خواب بنو، یاد مجھے بھی کرنا

اُدھر کھلا سا بادباں وہ، ساحلوں میں قید ہے
میں ہوں وہ موجِ ہوا جو جنگلوں میں قید ہے

میرے اطراف و جوانب چیختی پرچھائیاں
میرا دل بجھتی ہوئی چنگاریوں میں قید ہے

کس کو پھر اکتا رہے ہیں روز و شب کے سلسلے
کس کا چہرہ زندگی کی وحشتوں میں قید ہے

میں ہتھیلی کی لکیروں کو کھرچنے بھی لگی
اور قلم اس کا ابھی تک واہموں میں قید ہے

قربتیں دھندلا رہی ہیں پھر دلوں کے آئینے،
سحر اس کی شخصیت کا فاصلوں میں قید ہے

● [illegible] ۲۸/۲، [illegible] لین، کلکتہ ـ [illegible]

مکتوبات

سلطان سبحانی ۔ [illegible]

اردو افسانے کی ناک اول کے نام ”شاعر“ کا تازہ شمارہ نظر سے گزرا۔ اس شمارے میں عصمت چغتائی کے فکر و فن اور شخصیت سے متعلق مجھے آپ کا مقالہ زیادہ پسند آیا۔ اس پسند کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ فکر و فن اور شخصیات کے احاطے کے لئے آپ نے ایک نیا طرز اظہار دریافت کیا ہے۔ یہ ایک ایسا اسلوب ہے جو اختصار نویسی، عجلت اور تیز رفتاری کے باعث کوزے میں سمندر کو بند کرتا ہے۔ پر ہاذم کرتا ہے مگر متفرق نہیں کرتا ہے۔ اس کی لپیٹ میں صحافت، تنقید، انشائیہ و خاکہ نگاری کے بہت سے جوہر آ شامل ہوتے ہیں، سوال و جواب، تذبذب اور تجسس وغیرہ سے عبارت بنتے ہیں اور نامکمل جملے مربوط ہو کر ایک معنوی فضا تیار کرتے ہیں۔ ممکن ہے آپ کے اس طرز اسلوب کے بارے میں پہلے کبھی نے اظہار خیال نہ کیا ہو لیکن یہ درست ہے کہ آپ کے اظہار کا یہ انداز اتنا تقلف بھرا اور توانا ہے کہ کوئی کوئی جملہ بند دروازے کو توڑ دیتا ہے۔

اس مقالے کے تعلق سے دوسری اہم بات یہ ہے کہ آپ نے بعض ناقدین کے طے شدہ ارشادات سے اتفاق نہ کرتے ہوئے عصمت کے فن سے متعلق اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ میری دانست میں یہ عصمت پر پہلا مضمون ہے جس میں انھیں دیگر ناقدین کی آنکھ سے دیکھنے کی بجائے اپنی آنکھ سے دیکھا گیا ہے جس میں تحقیق بھی ہے، تنقید بھی اور تحکم بھی۔ اس غیر تقلیدی انداز کی وجہ سے ان کے فن کے وہ گوشے بھی سامنے آ گئے ہیں جو ابھی تک پردۂ خفا میں تھے۔ اگرچہ عصمت پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن ایک تیار شدہ ماحول اور مخصوص فضا میں، کچھ طے شدہ حوالوں اور نتائج کے ساتھ! جو مسلسل دہرائے گئے ہیں اور ابھی تک دہرائے جا رہے ہیں۔

تیسری اہم بات یہ ہے کہ آپ نے ایک نہایت اہم سوال کیا ہے کہ یہ فحش نگاری کیا ہوتی ہے؟ لکن نے فحش نگاری کی کوئی مکمل تعریف نہ کر سکے کھل کر درمیان اپنی بحث اور کچھ آگے کے وہ جملے اتنے کے بے مثال نمونے بن کر سامنے آ جاتے ہیں جن پر کسی غلاظت یا گندگی کی پرچھائیں بھی نہیں۔ وہ حضرات جو فن کاری اور کاری گری کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں کھینچ سکتے وہ حقیقت نگاری اور فحش نگاری کے درمیان کوئی تمیز کس طرح کر سکتے ہیں۔ [illegible] کے بعض شماروں کو کسی [illegible] دیکھنے کے باعث کی کے [illegible] [illegible] [illegible] افسانہ لحاف [illegible] [illegible] [illegible]

کی بدنصیبی ہے کہ عصمت کے بیشتر بہترین افسانوں کو نظر انداز کر کے ساری توجہ ”لحاف“ پر مرکوز کر دی گئی۔ یہ سلسلہ ہماری تنقید کا یہ عجیب معیار و ساری ہے کہ انقلاب کے تدریجی ارتقاء کو نظر انداز کر کے اس کی ساری عمر کی تخلیق ہوتی کہانیوں میں محض ایک یا دو (اچھی یا بری) کہانیوں پر شہرت کا سکہ لگا دیا جاتا ہے۔ اس قسم کا اختراع پیدا کرنا ادبی و تنقیدی بددیانتی ہے۔ کیوں کہ اس طرح ۔۔۔ ان سے بہتر کہانیاں پس منظر میں چلی جاتی ہیں۔

افسانہ لحاف پر سب سے پہلا اعتراض غالباً منٹو نے کیا تھا لیکن اس کا اعتراض فن کارانہ تھا جو ”لحاف“ کے صرف آخری جملے پر تھا اور اس اعتراض کا مطلب یہ تھا کہ عصمت نے افسانے کے آخر میں ایک غیر ضروری جملہ لکھ کر اس کے مرکزی خیال کو کمزور یا مجروح کر دیا لیکن اس کی بات پر کسی نے فن کارانہ سطح سے غور نہیں کیا بلکہ یہ مطلب اخذ کیا کہ عصمت نے بے باکی کا مظاہرہ کر دیا؟ (جب کہ منٹو نے اپنی ایک تحریر میں ان کی بے باکی کو رد کیا ہے)

دراصل اس افسانے کے خلاف جو لوگ متحرک تھے شاید وہ افسانہ کو ردو ادب جہاں نہیں بلکہ جیسے دینی و تبلیغی اجتماع کا ہو پمفلٹ سمجھتے تھے یا شاید وہ ایسا سمجھتے تھے کہ عورت کو جنسی مسائل پر اظہار خیال کرنا یا سماج و معاشرے کے گھناؤنے پہلوؤں پر کچھ لکھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

تعجب ہے کہ اب سے ساٹھ سال پہلے ”لحاف“ کے بارے میں چند ناقدین نے جو رائے دی تھی اسی پر آج تک تکیہ کیا گیا ہے۔ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان ساٹھ برسوں میں اردو تنقید میں کوئی تبدیلی ہی نہیں آئی ہے اور جوں کا توں سب قائم ہے۔ تعجب ہے۔ یہ تنقیدی ”سرگرمیاں“ اور دوسروں کی آنکھ سے کسی کی سمت دیکھنے کا یہ ”ہنر“ اپنی نظر کیسا ٹک ہے۔ اور کتنے بکاؤ تھے وہ لوگ جو اپنے شہر [illegible] کے بازار اور [illegible] کو برداشت کر لیتے تھے لیکن منٹو کے افسانوں کو برداشت نہیں کر سکے اور انھوں نے ان کے چھ افسانوں پر لاہور کی عدالت میں فحاشی کے مقدمے دائر کئے اور کتنے ”سنجیدہ اور پرشش“ ہیں وہ لوگ جو منٹو کو اس کے دیگر افسانوں کی بجائے ”بو“، ”دھواں“، ”ٹھنڈا گوشت“ وغیرہ کی وجہ سے پہچانتے ہیں۔ اس صورت میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ ادب کس تہذیب کا نام ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ عصمت کے مزاج میں عنصر سرکشی اور بغاوت کا ان تھی اور یہ سب انھیں اسی ماحول سے حاصل ہوا۔ میری دانست میں وہ ادب کا [illegible] [illegible] کے یہاں بغاوت کے اثرات اس قدر [illegible] [illegible] بھی ان کے علاوہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] فرق ہے۔ اگر عصمت نے [illegible] [illegible] کتاب [illegible] [illegible]

علی احمد فاطمی ۔ شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد

عصمت سے متعلق آپ کا مضمون میں نے پڑھا ہے۔ اچھا ہے آپ نے بہت ہی لکھ کر لکھا ہے۔ لیکن کچھ باتیں عصمت سے متعلق [illegible] کا باعث رہی ہیں آپ نے تقریباً اسی بحث کو سنت انداز میں چھیڑا ہے۔

دراصل جنس ہمارے یہاں ہمیشہ بحث طلب بنی رہی۔ کچھ منطقی انداز میں۔ کچھ تہذیبی سطح پر ۔۔ عصمت کو پڑھتے سب ہیں پسند بھی کرتے ہیں لیکن اوپری سطح پر باتیں کم کرتے ہیں۔ کیا آپ کہتے ہیں کہ عصمت کا افسانہ لحاف محض ایک انسانہ ہے۔ کیا آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ صرف اور صرف لزبینزم پر افسانہ ہے؟ دراصل ہم اردو والوں کی مشکل یہ ہے کہ جہاں اوپری سطح پر جنس ہوتی ہے اس کے پیچھے پردہ میں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ عصمت کے لحاف اور منٹو کی ٹھنڈا گوشت کے ساتھ ہم نے یہی سلوک کیا۔ احساس کے بجائے اس کا سماجی شعور۔ انسانی رشتوں کے نازک اشارے ہماری گرفت میں نہیں آ پاتے۔ اور بھی مسائل ہیں جن پر صرف فحاشی کا نام لگانے کی ضرورت نہیں بلکہ عصمت کے سماجی [illegible] [illegible] پوری ایمانداری سے تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ کچھ [illegible] کی ہوائی ہیں جسے ہم لے اڑتے ہیں۔

میرا خیال ہے آپ عصمت پر ایک ضخیم نمبر نکالئے۔ یہ نمبر کا حکم ہے اور آپ کا فرض بھی تب تو بات بنے گی۔ گو بات بننے والی نہیں ۔۔ نمبر آپ ہی نکال سکتے ہیں۔

عطا نقوی پوسٹ بکس نمبر ۵۱۱۰ ریاض (سعودی عرب)

آپ کی تحریر ”عالمی اردو کانفرنس“ پیہم شمارے۔ پڑھ کر بڑا لطف آیا۔ ”دل ڈھونڈتا ہے“ ہوا۔ میں خود اس قسم کی بہت سی چیزوں کی چشم دید گواہ ہوں۔

یہاں تک میں سمجھتی ہوں کہ بیرونی ممالک میں رہنے والے تارکین وطن اردو کے نام نہاد چھوٹے اس قسم کی سرگرمیاں کرتے ہیں ان کا مرکز و محور فقط شہرت ہے ورنہ یہ لوگ پیشتر محسوس کرتے ہیں اپنے گھر زبان اور ماحول کی تشنگی۔ لہٰذا وہ لوگ جنھیں ہند و پاک میں اردو سے [illegible] [illegible] کے [illegible] [illegible] جاتے ہیں۔ ان شاعروں اور [illegible] [illegible] [illegible] نہیں ہے۔

[illegible] وطن کی دوسری نسل [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہو سکے۔

[illegible]

...بعد اس گروپ میں ہند و پاک، بنگلہ دیش ہر جگہ کے لوگ شامل تھے لیکن ہمارے ڈراموں نے نئی نسل کے نوجوانوں کو شامل ہی نہیں کیا۔ پھر دھیرے دھیرے ہم لوگ انگریزی میں اسکرپٹ لکھنے لگے۔ اس طرح کہ اسٹیج پر ہمارے تارکین وطن کے مسائل کو ڈرامہ ٹائز کر سکتے تھے۔ ہمارے ساتھ بہت سے SECOND GENERATION امیگرنٹ لڑکے لڑکیاں بھی شامل ہو گئے۔

اور آج یہ گروپ بہت کامیاب اور خوشحال ہے ہم لوگ یا تو کہیں سے اچھا اسکرپٹ لیتے ہیں یا خود لکھتے ہیں۔ خود ایکٹنگ کرتے ہیں اور پروڈیوس کرتے ہیں۔

یہاں سعودی عرب میں بھی اردو کا ایک اچھا خاصہ حلقہ ہے۔ جو کتابوں کے اردو داں حلقوں سے بڑھتا جا رہا ہے۔ یہاں پاکستان کی کتابیں اور ادبی رسائل بھی مل جاتے ہیں۔

"شاعر" میں سریندر پرکاش کا ناول "نسیان" پڑھ رہی ہوں مگر مجھے ہر بار قسط کم مختصر لگتی ہے۔ دو صفحات میں بات نہیں بنتی۔ سلیم مقصود کی نظم "ہواؤں کا رخ" پسند آئی۔

غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ بہت دلچسپ ہے۔ غزل اردو شاعری کا مزاج ہے روایت ہے اس کو یکسر کھرچا سکتا بھی نہیں کہہ سکتے، ٹھیک ہے پامال شدہ موضوعات، استعارات اور الفاظ نے غزل کو بے روح کر دیا ہے۔ لیکن پھر بھی بعض اوقات غزل کے ایک شعر میں پوری ایک نظم سما جاتی ہے۔ تازہ شمارے میں آشفتہ چنگیزی نے اپنی غزل میں، مرتضیٰ، افراآفری، غازی، بلبقی، فیاضی اور سردی کے قافیے باندھے ہیں جو میری تو سمجھ میں آتے نہیں۔

شفیقہ فرحت۔ ۱۴۶/۲ بدر فیس کالونی، بھوپال

شاعر کا نیا شمارہ یعنی "اردو افسانے کی فلک اول عصمت چغتائی" نمبر ملا۔ اول تا آخر ہر صفحہ دامن نگاہ کھینچ رہا ہے۔

اتنا دیدہ زیب، پُر وقار اور مناسب سرورق بر سوں بعد دیکھنے کو ملا۔ "عصمت۔ شاعر" کا بلکہ کسی اور پرچے کا بھی۔ یہ عصمت آپا کی بہترین تصاویر میں سے ایک ہے۔ "میرے الفاظ واپس دے دو" اس کا ایک ایک لفظ کئی کئی صفحات پر بھاری ہے لفظ لفظ تفصیل سے تفسیر ہے ان کی شخصیت اور فن کی۔ انداز میں اتنی تیزی ہے تندی ہے کاٹ، گہرائی اور بصیرت ہے کہ "دلہ" کے علاوہ کچھ اور کہا ہی نہیں جا سکتا۔

چند مضامین منتخب کر کے تاکہ انہیں بہتر طریقے سے خراج عقیدت پیش کیا جا سکے۔

نیا افسانہ کا "عصمت آپا"۔ اپنے منفرد رنگ کی اچھی تحریر ہے اور ڈرامائی انداز کا "وست" بھی۔ اس مرتبہ ایک فرق بہت زیادہ ہے عصمت کا نام اب کہیں اس سے ابھر کر سامنے آ جاتا ہے۔

دوسری چیزیں بھی بہت اچھی ہیں، لیکن اب کسی پر لکھنے کو جی نہیں چاہ رہا۔ عالمی کانفرنس اور سیمیناروں کے متعلق تمہارے خیالات سے مجھے پورا اتفاق ہے۔

عصمت آپا اور ہم مبالغے کے تعلق سے ہی میں ایک تصویری مضمون لکھ کر کسی رسالے میں چھپنے کے... وہ تیسری مرتبہ ہندوستان آئی تھیں اور تقریب کے سلسلے میں کل ہند ترقی پسند کانفرنس میں شرکت کیلئے...

وہ کانفرنس حقیقی ہم آہنگ سی کل ہند ترقی اردو اور وہ دور ترقی پسند تحریک کے عروج کا دور تھا۔

اور آخری مرتبہ اردو کا سب سے بڑا انعام "اقبال سمان" لینے۔

رفیق احمد تنہا۔ آزاد نگر، پوسٹ اور ضلع اورنگ آباد ۴۳۱۵۰۱

"شاعر" کا شمارہ نمبر ۹ موصول ہوا۔ سب سے پہلے میں نے عصمت چغتائی پر آپ کا لکھا ہوا مضمون پڑھا۔ آپ نے عصمت کے مزاج، عادات و اطوار کی حقیقی تصویر پیش کی ہے۔ آپ نے ان کی شخصیت کے ایسے گوشوں پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کے بارے میں ہماری معلومات ناکافی تھیں۔ یہ مضمون واقعی افادیت کا حامل ہے۔

اس مضمون میں آپ نے عصمت کے آرٹ پر جو اپنا ایک انفرادی تنقیدی نظریہ پیش کیا ہے اس سے میں متفق ہوں اور مطمئن اور مسرور بھی ہوں۔ آپ کا کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ "شمالی ہندوستان کے متوسط طبقوں کے مسلم گھرانوں کی داستانیں ان کی جادو بیانی سے بہت روشن ضرور ہوئیں۔ لیکن یہ داستانیں پورے مسلم معاشرے کو یکسر نہیں رد کر سکتیں" یہ میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں خود عصمت چغتائی کی شخصی زندگی کو بھی یکسر رد نہیں کیا جا سکتا مسلم معاشرے کی ایک آئیڈیل خاتون کا خاکہ ہمارے ذہن و تصور میں جب کبھی ابھرے گا، ہم عصمت چغتائی کی ذاتی زندگی کے متحرک لمحات پر سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور ہوں گے۔ آپ نے عصمت کی ابنارمل کیفیات پر بحث کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں طرز عمل اور پیغام عمل میں اگر ہم آہنگی اور ربط و توازن نہ ہو تو تمام حرکات و سکنات ابنارمل ہی لگیں گے۔ ان حالات میں عصمت چغتائی کی آخری وصیت کہ انہیں شمشان میں نذر آتش کر دیا جائے، بہت خاص ہے۔ اس باغی افسانہ نگار نے اپنی موت کے بعد بھی اپنی ابنارملٹی کو زندہ رکھا۔ ندا فاضلی کی یہ بات قابل فہم نہیں لگتی کہ عصمت آپا کی حیثیت سے زندہ رہیں گی عصمت اپنی تخلیق میں زندہ ہو سکتی ہیں لیکن بقول افتخار امام صدیقی۔ "بہت سے ہنگامے، قصے کہانیاں عصمت چغتائی کے ساتھ ختم ہو گئیں" اور اگر نہیں ہوئی تھیں تو وقت کے ساتھ ختم ہو جائیں گی۔ ن۔م۔ راشد کا نام اب کتنے ذہنوں میں محفوظ رہ گیا ہے؟ قرۃ العین حیدر نے سچ ہی لکھا ہے کہ صرف "کام رہے گا" باقی رہیں گے۔

کہانیوں میں مقدر حسین نے کسی حد تک مسئلہ کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ مظہر الزماں خان نے اپنی کہانی "عطر بیز" میں عطر کو علامتی پیکر دینے کی ہر ممکن کوشش کی ہے لیکن وہ یہ بھول گئے کہ کوئی لفظ اپنی معنویت میں کوئی الفاظ کے گورکھ دھندے کے علاوہ کچھ نہیں ہوا کرتا بلکہ روح عصر کے تقاضے اسے بہت بناتے ہیں۔ پھول کی آرائش دار نہ ہو تو اسے کشید کرنا محال ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کسی کم سن بچے کو زبردستی ملازمت کی کوشش کی جائے۔ "آنکھیں" اور "پینے" اور "بقیہ جات" بھی زبردستی کی کہانیاں ہیں۔

حالانکہ جب تاری آپ کے ... اور طلبہ کی ... مگر مجھے نہ پاکر ... گا۔ فائدہ کیا ہے جو مضمون عبرت...

...کوئی بات نہیں، انسانہ کا جزو بھی تو ہو سکتا ہے۔ مقدر انقر نے ہوشیاری کے سے کام لیا ہے اور اپنی بات سرقاے کہہ گئیں حالانکہ ان کا موضوع آسان نہیں تھا لیکن انہوں نے پہلے طے کر لیا کہ انہیں ایک افسانہ لکھنا ہے، تکمیل نہیں کرنی ہے۔

پرتپال سنگھ بیتاب۔ گورنمنٹ کوارٹرس، جموں

یوں تو آپ کے اداریے ہمیشہ ہی دل کو چھو لینے والے اور بامقصد ہوتے ہیں لیکن اس بار کے اداریے کے لئے آپ کو مبارکباد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا حالانکہ (آپ جانتے ہیں) میں خط لکھنے کے معاملے میں کافی سست ہوں۔

عالمی اردو کانفرنس، عالمی اردو مشاعرے اور انڈو پاک مشاعرے ٹی وی دیکھ کر رونا آتا ہے جانے کون کون سی صورتیں ادب کے نام پر نکھر کر کرسیوں پر براجمان ہو جاتی ہیں۔ ایسے ایسے لوگ شعر سنانے کے لئے اسٹیج پر دکھائی دیتے ہیں جن کا نام کبھی ادبی حلقوں میں سنا پڑھا نہیں ہوتا۔ کیسی کیسی عورتیں سرخی، بندی ساڑی وغیرہ میں غازے سے بھرے چہرے لئے کیا کیا اول جلول شاعری کے نام پر "ارشاد فرماتی" ہیں کہ خدا بچائے۔

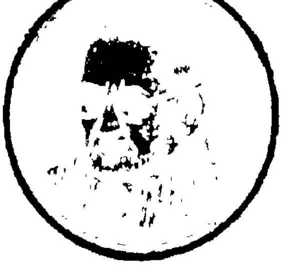
ظاہر ہے کہ اردو کے تاجر اپنی تجارت کو چمکانے کیلئے خوبصورت "مال" کو بازار میں لاتے ہیں اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ افسوس ان اچھے اور بڑے شاعروں پر ہوتا ہے، (انہیں تو شاید شرم بھی نہیں آتی) جو ان عورتوں کے ساتھ عالمی مشاعرے پڑھنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ دو تین برس پہلے زمانے میں ایک انڈو پاک مشاعرہ منعقد ہوا تھا جسے ٹی وی پر دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ جہاں ایک طرف ہند و پاک کے تمام نامور شعراء اس میں موجود تھے وہیں ساتھ میں سرخی بندی ساڑھی والی کچھ عورتیں اپنے خوب صورت چہرے لئے کیا کچھ اردو شاعری کے نام پر پڑھ رہی تھیں میں تو یہ تک سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ شاید جس اردو ادب سے ہم واقف ہیں اس کے علاوہ بھی کوئی دنیائے اردو ہندوستان میں موجود ہے۔

یہ تاجران اردو اپنا ترحلوہ ماشاء اللہ اپنائے جا رہے ہیں لیکن اردو زبان اور اس کے ادب کے ساتھ جو ظلم یہ لوگ کر رہے ہیں اس کا ان کو شاید احساس نہیں ہے اور اگر احساس ہوتے ہوئے بھی وہ لوگ یہ سب کر رہے ہیں تو بہت گھناؤنے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کے خلاف باقاعدہ مہم چلائی جانی چاہیے۔

ہندوستان سے باہر اردو ادب کی موجودہ صورت کو بگاڑ کر پیش کرنے والے یہ تاجر دراصل اردو کے دشمن ہیں اور یہ سلسلے اگر یونہی چلتا رہا تو وہ دن دور نہیں جب اردو کے مشاعرے بھی ہندی کے کوی سمیلنوں کی طرح ہو جائیں گے یعنی ادب تو رفتہ رفتہ آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گا۔

آپ سے امید ہے کہ آپ "شاعر" کی وساطت سے ان کی جو ذمہ داری کی مخالفت جاری رکھیں گے۔ اردو کے تمام ... اور ... اس تحریک میں آپ کے ساتھ ہیں۔

فکر امروز



ادب ہی ایک ایسا رابطہ اور واسطہ ہے جو بین الاقوامی ربط و ضبط اور بین الملکی یگانگت پیدا کر سکتا ہے۔ موجودہ عالم گیر جنگ نے انسانی احساسات و محسوسات کی مغائرت کو مساوات و یک رنگی میں تبدیل کر دیا ہے۔ ایک مغربی شاعر واقعات عالم پر جس طرح اظہار خیال کر سکتا ہے اسی طرح مشرق کا شاعر بھی کر سکتا ہے۔ ضرورت ہے صرف وسعتِ فکر اور بیداری ذہن کی اور یہ عالم گیر ذہنیت صرف اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ہم تقلید کی ظلمتوں سے نکل کر تجدید کے اجالوں میں نقل و حرکت کرنے لگیں اور اپنی شاعری کو محدود اور تنگ نہ سمجھیں۔

سیماب اکبرآبادی

شاعر

اشاعت کا ۶۳ واں سال

جلد ۔۔۔ ۶۳
شمارہ ۔۔۔ ۱۲

نومبر ۱۹۹۲ء

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت :۔ روپے

زرِ سالانہ ۵۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۶۰ روپے

تاحیات خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے ◆ ممالک غیر سے ۳۵۰ روپے

ترتیب

مقالات

کہانیاں

نئے نام — نئے استعارے

نظمیں

غزلیں

ناول

مخط شاعر

آنا نقطہ

محفل یاراں

معاونین
ایم جمال علوی۔ شاہد اختر۔ ایم اے شاد۔ اظہر افسر۔ عتیق احمد
عبدالقوی دسنوی۔ نائلی انصاری۔ احمد سہیل۔ سلیم شہزاد
شمارہ نمبر ۱۲ [۱۹۹۱ء] جلد ۶۲

محفل یاراں

قارئین سے!

قدرے تاخیر سے شاعر کے ۱۹۹۱ء کے دو شمارے ۱۱-۱۲ پیش خدمت ہیں۔ انھیں کے ساتھ ہم نے ۱۹۹۱ء میں شاعر کے ۱۲ شمارے پیش کرنے کی سعی کی، بہت حد تک اپنی کوشش میں ہم کامیاب بھی ہوئے۔ شمارہ نمبر ۹-۱۰ اور ۱۱-۱۲ ہر چند کہ چار الگ الگ شمارے ہیں، لیکن دو دو شمارے ایک ہی سرورق کے ساتھ شائع ہوئے۔ صفحات بھی معمول سے کم تھے، یہ اس لیے کیا گیا کہ ہم ۱۹۹۱ء کو جلد از جلد سمیٹنا چاہتے تھے۔

۱۹۹۱ء میں شاعر نے ۴۸۸ صفحات پیش کیے۔ ان صفحات میں شائع ہونے والا مواد بہ آسانی ۷۰۰ — ۸۰۰ صفحات میں پیش کیا جا سکتا تھا، لیکن ہم نے مواد کی چھپائی میں ہر وہ صورت اختیار کی جس سے زیادہ سے زیادہ میٹر دیا جا سکے، ۱۹۹۱ء میں شاعر میں شائع شدہ مضامین نثر و نظم سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ صفحہ اول سے آخر تک ہر شمارے میں ایک تخلیقی فضا، نیا رنگ، نیا تنوع پیش کیا گیا۔ بہتر سے بہتر مواد اپنے قارئین تک پہنچانے کی جستجو میں اکثر شاعر تاخیر کی نذر ہوا، لیکن شاعر کے ذریعہ اپنے قارئین کو متنوع دلچسپیوں کے ساتھ علمی و ادبی سمت و رفتار سے باخبر رکھنا ہمارا مطمح نظر رہا۔ اس میں ہم کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں شاعر کے ۱۹۹۱ء میں شائع ہونے والے شماروں کو دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور یہ صرف ۵۰/- روپے زر سالانہ یا کم قیمت عام شماروں میں پیش کیا گیا۔

گزشتہ دو سالوں سے کتابت و طباعت، کاغذ، فلم وغیرہ کی قیمتوں میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ اس کا بہت زیادہ اثر شاعر پر بھی پڑا مگر ہم نے شاعر کی قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ مگر موجودہ حالات کے پیش نظر اب مزید نقصان برداشت کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں رہا۔ زر سالانہ میں اضافہ کرنا اب ہمارے لیے ناگزیر ہو گیا ہے۔ شاعر کے معزز قارئین اور کرم فرماؤں نے شاعر کی ہمیشہ ہی سرپرستی کی ہے، ہمارے حوصلے بلند کیے ہیں۔ ایک بار پھر ہم آپ سب سے تعاون کے خواستگار ہیں۔ جنوری ۱۹۹۲ء کے شمارے سے شاعر کا زر سالانہ ۶۰ روپے اور فی کاپی کی قیمت ۶ روپے کی جا رہی ہے۔

۱۹۹۲ء کے کئی شمارے نت نئی دلچسپیوں کے ساتھ زیر ترتیب ہیں ساتھ ہی ہم عصر اردو ادب نمبر-۲ کے کام بھی تیزی سے انجام پا رہے ہیں۔ [ادارہ]

نجم آفندی بنام اعجاز صدیقی

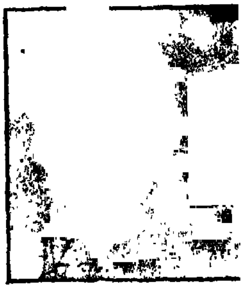
عزیزم سلام و دعا، آپ کا خط ملا۔ میں بھی علیل ہوں اور میری اہلیہ سال بھر سے مستقل علیل ہیں کہ امید زیست باقی نہیں رہی اس وجہ سے جواب میں تاخیر ہوئی۔ میں اپنی دو غزلیں بھیج رہا ہوں آپ دو پرچے میں شائع کر سکتے ہیں۔ اپنے عزیز شاگرد خاور نوری سلیم کو میں نے ہدایت کی تھی کہ وہ آپ کو اپنا کلام بھیجیں اور غالباً وہ ایک غزل بھیج چکے ہیں دوسری اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔

آپ کو میری دو کتابیں قصائد نجم اور تہذیب محمودات مل گئی ہوں گی ان پر تبصرہ بھی ضرور شائع کر دیں

معذرت ہے میرا ہاتھ کانپتا ہے مشکل ہی سے لکھ سکتا ہوں

نجم آفندی

بہ خطِ شاعر



حامدی کاشمیری

یہ کیسی رُت اب برس رہی ہے
ہرا مکھڑوں کو ڈس رہی ہے

کہیں ہیں بے سر چناروں کی جا
فضا سے آتش برس رہی ہے

بچھڑ چکی ہے، زمانہ گزرا
مرے خیالوں میں بس رہی ہے

سموم و آتش کے دشت میں بھی
صبا مری ہم نفس رہی ہے

ہنسی ہے خاک زمیں میسر
ہجوم ہر سمت برس رہی ہے

نہ قافلے ہیں نہ راہ و منزل
فقط صدائے جرس رہی ہے

ہم نے کیا کھویا اور پایا کیا
خونِ ناحق کا ہے تقاضا کیا

وادیِ شب میں روشنی سی ہے
ہے فروزاں کوئی ستارا کیا

تو نے شمشیر نیام میں رکھ لی
کیا خبر ہے ترا ارادہ کیا

ہیں شجر برگ و شاخ شعلہ فشاں
اب کے موسم کا ہے اشارا کیا

موت کی خامشی تھی راہوں میں
ہے قیامت کا شور و غوغا کیا

نکہتِ گل کی آنچ آئی ہے
کھل گیا ہے کوئی دریچہ کیا

دیکھی ہیں آنکھوں نے پامال ہوا
کیا کہوں کیا ہمارا حال ہوا

ہے عجب یہ دیارِ آزاداں
جو یہاں آیا یرغمال ہوا

رات کیا خواب آتش دیکھ لیا
صبح جاگا تو پُر زوال ہوا

کوئی صورت نہیں ہے جینے کی
سانس لینا بھی اب محال ہوا

یہ نگر اس کو راس کیا آتا
دشت آخر وہ خوش خصال ہوا

تیرا غم ہی تھا وجہِ کیفِ حیات
تیرا غم جان کا وبال ہوا

تیرگی روشنی میں ضم نہ ہوئی
دل کی آشفتگی ختم نہ ہوئی

اس کے جانے پہ بیٹھے بیٹھے
شہر میں کوئی آنکھ نم نہ ہوئی

کس کے سر پر فلک کا بوجھ نہ تھا
ایک میری جبین خم نہ ہوئی

گم ہوئے راستے بھی منزل بھی
قربت جب مری ہم قدم نہ ہوئی

کتنے دریا بہائے آنکھوں سے
جلتے صحرا کی پیاس کم نہ ہوئی

کتنے برہم تھے دستِ غارتگر
پر وہ تحریر کالعدم نہ ہوئی

ہم نے کیا کھویا اور پایا کیا
خونِ ناحق کا ہے تقاضا کیا

وادیِ شب میں روشنی سی ہے
ہے فروزاں کوئی ستارہ کیا

تو نے تلوار نیام میں رکھ لی
کیا خبر ہے ترا ارادہ کیا

ہیں شجر برگ و شاخ شعلہ فشاں
اب کے موسم کا ہے تقاضا کیا

موت کی خامشی ہے راہوں میں
ہے قیامت کا شور و غوغا کیا

نکہتِ گل کی آنچ آئی ہے
کھل گیا ہے کوئی دریچہ کیا

● مسعود منزل، بابا نگام، امیر کا باد، شالیمار، سری نگر کشمیر

غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ

ادبی فیچر

—۶—



"غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ" میں آپ نے تقریباً تمام باتیں سچی ہوئی اور کھری ہوئی کہی ہیں۔ میں بھی شروع سے یہ محسوس کرتا رہا ہوں کہ ادب و صحافت میں زبردست دھاندلی، زبردست حق تلفی، اور بڑے پیمانے پر سینہ زوری ہوتی رہی ہے۔ نقاد حضرات چاہے ترقی پسند گروپ سے تعلق رکھتے ہوں یا جدیدیت کے علم بردار ہوں، مخصوص ناموں کو، اپنے حلقے کے ناموں کو، من ترا حاجی بگویم کہنے والے ناموں کو، فائیو اسٹار ہوٹلوں میں شراب و شباب مہیا کرنے والے ناموں کو اور ہوائی جہاز میں سفر کرانے والے ناموں کو، بلینک چیک نذرانے کے طور پر پیش کرنے والے ناموں کو یا سفیر و وزیر کے درجے کے ناموں کو اچھالتے رہے ہیں۔ علامہ ثابت کرتے رہے ہیں۔ اور انہیں ہی معیار کا درجہ دیتے رہے ہیں۔ چوں کہ ایسے ناقد بڑی بڑی یونیورسٹیوں کے صدر شعبہ جیسے عہدے پر قابض رہتے ہیں۔ جن کے ہاتھ میں بہتوں کا کیریئر ہوتا ہے۔ ایسے ناقد حکومت میں بھی دخل رکھتے ہیں۔ اکادمیوں پر قابض ہوتے ہیں۔ اور بعض کسی تحریک کے اگوا ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کا فریب سر چڑھ کر بولتا ہے۔ لیکن اس گروپ بازی سے کوئی کب تک اپنا قد اونچا رکھ سکے گا۔ وقتی شہرت، وقتی لذت، وقتی واہ واہی ضرور مل جاتی ہے۔ فیض کی چند نظموں اور دو چار غزلوں کو چھوڑ کر بقیہ شاعری کیا زندہ رہنے والی ہے؟ علی سردار جعفری کی شاعری کو کیا آنے والی نسل ہضم کر سکے گی؟ احمد ہمیش سے مرزا حامد بیگ تک کے افسانے کیا بطور حوالہ ہی یاد رکھے جائیں گے؟ صلاح الدین پرویز کی کوئی بھی کتاب کیا ذہن و دل کو چھوتی ہے؟ اس طرح کی مثالیں بھری پڑی ہیں۔ ۱۹۶۰ء کے بعد، ۱۹۷۰، ۱۹۸۰ء کے بعد کی نسل کا منظر نامہ بہت وسیع ہے۔ ان کے تجزیے کا انداز اپنے پیش رؤوں سے جداگانہ ہے۔ یہ نسل وقتی اور ذات میں گم ہونے والی نہیں ہے۔ تخلیقی صورت حال کی سنگینی کو سمجھنے کی، فیصلہ کرنے کی اور عمل پیدا ہونے کی صلاحیت ان میں مختلف اس لئے بھی ہے کہ آج کا دور ... کا ہے، عراق، امریکہ، اور روس میں انقلاب کا ہے۔

جہاں تک غزل کی بات ہے۔ یہ صنف ہمیشہ گردن زدنی رہی ہے۔ جب کہ یہ صنف سخن اپنی داخلیت، فنی، تخیلی رفعت، اور جذباتی شدت کے لحاظ سے بھی اپنی خصوصیت رکھتی ہے۔ غزل اس آہنگ احساس اور آہنگ سماعت کے امتزاج کا دوسرا نام ہے کہ جس سے لطیف حیات و ذوق احساس حاصل ہوا اور جس میں عوام نے درد کی دوا اور لا دوا پائی ہو۔ آپ نے اپنے مضمون میں شاعری کے سلسلے میں بعض سوالات اٹھائے ہیں۔ اس لئے میں انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا سے ایک مثال دینا چاہتا ہوں۔ ایک پیراگراف نقل کرنا چاہتا ہوں کہ:۔

"JOUFFROY WAS PERHAPS THE FIRST AEST-
BETICIAN TO SEE QUITE CLEARLY THAT LYRI-
CAL POETRY IS, REALLY, NOTHING MORE
THAT ANOTHER NAME FOR POETRY ITSELF,
THAT IT INCLUDES, ALL THE PERSONAL AND
ENTHUSIATIC PART OF WHAT LIVES AND
BREATHES IN THE ART OF VERSE, SO THAT
THE DIVISIONS OF PEDANTIC CRITICISM
ARE OF NO REAL AVAIL TO US IN ITS CON-
SIDERATION. WE RECOGNIZE NARRATIVE
OR EPICAL POETRY WE RECOGNIZE DRAMA,
IN BOTH OF THESE WHEN THE INDIVIDUAL
INSPIRATION IS STRONG. THERE IS MUCH
THAT FREMBLES, ON THE VERGE OF THE
LYRICAL BUT OUT SIDE WHAT IS PURE EPIC
AND PURE DRAMA ALL OR ALMOST ALL IS
LYRICAL."

[PAGE 533 - 14TH EDI]

اس کے مطابق ساری کائنات شاعری غزل کی رہین منت ہے۔ اور ہر صنف سخن کی روح رواں ہیں۔ انفرادی جذبات سے معمور شاعری ہے۔ جو ہماری غزل کی جان ہے۔

آپ کے سوالات کے تناظر میں ذرا اور وسیع النظری کا ثبوت دیتے ہوئے کہنا چاہتا ہوں کہ انگریزی ادب میں غنائی شاعری کی دو قسمیں زیادہ اہم رہی ہیں۔ ایک کو غزل قنوطی LYRIC OF DESPONDENCY اور دوسری قسم کو غزل کارزاری LYRIC OF ACTION کہا گیا ہے۔ قنوطی غزل مایوسی و دل شکستگی کی ترجمان ہوتی ہے۔ اور انگریزی ادب میں آرنلڈ اور کیٹس ARNOLD & KEATS اس کے مخصوص نمائندے کہے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری رومانی دلگیری، افسردگی اور غم نصیبی سے خاص طور پر معمور ہوتی ہے۔ کارزاری غزل، حوصلہ انگیز و حیات آمیز سرگرمیوں کی نمائندگی کرتی ہے

اور قومی وطن انگریزی ورنج مسند ملک کے احساسات کو اجاگر کر کے احساس ذوقی
زندہ عمل پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ SPENCER کی QUEEN
ٹینیسن کی ULLYSIS شیلی کی WEST WIND
اور بائرن کی LIBERTY وغیرہ اس قسم کی معیاری چیزیں ہیں۔

اردو غزل میں تغزل و کارزاری دونوں انداز مختلف زمانوں میں ملتے ہیں اور اپنے وقت کے معاشرتی اور سیاسی نظام کی ترجمانی کرتے ہیں۔

جارج سیمپسن G. SAMPSON نے غنائی شاعری کے سلسلے میں تین خصوصیات کو سب سے اہم بتایا ہے۔

THREE MARKS OF TRUE LYRIC: BRIEF, INTENSE AND PERSONALS.
[THE CONCISE CAMBRIDGE HISTORY OF ENG. LITERATURE By GEORGE SAMPSON - PAGE: 140]

یعنی اختصار و ایجاز، شدت احساس اور انفرادی و ذاتی تاثرات غنائی شاعری کی جان اور خصوصی نشان ہیں۔

TILLYARD نے غنائی شاعری (لیکن بالواسطہ) OBLIQUE بلاواسطہ DIRECT شاعری سے بہت دلچسپ انداز میں بحث کی ہے۔ اور شاعری میں علامت کو SYMBOLS خاص طور پر بتایا ہے۔

ACHIEVED SYMBOLISM IS PURE OBLIQUITY
[POETRY: DIRECT AND OBLIQUE By E.M.W. TILLYARD - PAGE: 63]

کا کہنا ہے کہ شاعر کی لطیف قوت احساس، روزمرہ کی زندگی کی ترجمانی، حالات سے اثر گیری اور خوشگوار قنوطیت، ہمالہ کی رمزی اور ایمائی کی دلکش خصوصیات ہیں اور بالواسطہ شاعری OBLIQUE POETRY غنائی اجزائے ترکیبی ہیں۔ GRIERSON نے غنائی شاعری خصوصیات میں جذبات دل اور تاثرات قلبی کی ترجمانی ترنم و غنائی انداز احساسات کی نزاکت و لطافت، شیرینی و دلنشینی، دل و دماغ کی ملی جلی [illegible]ری، انفرادی درد کی کسک، خود حسی و خود فراموشی، شاعرانہ مزاج اور آئینہ داری، معاملہ بندی، عشق و محبت کی روداد نگاری، ذاتی تجربات و کیفیات، روحانیات و الہیات، کا ایمائی تذکرہ، مشاہدۂ حق کی گفتگو میں بادہ [illegible] استعمال، الفاظ کی موزونی اور حسن ادا کی لطافت وغیرہ سب باتوں کو [illegible] ہے۔ ورڈزورتھ WORDSWORTH نے جس چیز کو STILTS [illegible] MUSIC OF HUMAN کہا ہے۔ وہی خصوصیت اردو غزل کی کیفیت [illegible]ت کی لطافت رہا ہے۔ اور شاعری کے پیغام کو دل و دماغ کی گہرائی تک پہنچانے کی ذمہ دار ہے۔

ان مثالوں کی روشنی میں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اردو غزل کو دنیا کی بڑی زبانوں کی شاعری کے مقابلہ رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن مقابل رکھنے کی پہل ابھی تک نہیں ہوئی۔ کسی نے غزلوں کے عمدہ سرمایے کا انتخاب نہیں کیا ہے۔ اور ان کا ترجمہ نہیں کیا ہے۔ اور دوسری زبانوں کے صحیح ادراک اور روشن دماغ تک نہیں پہنچایا ہے۔ ہم اردو میں غزل کہتے ہیں، اردو غزل کی ٹانگ گھسیٹتے ہیں، اپنے حلقے کے غزل گو کو بانس پر چڑھاتے ہیں اور اپنی اپنی ڈفلی بجا کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔ اور خود کتنا قدر شناس ہیں یہ نا قدری ہیں کیونکہ ایماندار نہیں ہیں کہ تمام غزل گو کو پڑھیں اور پرکھیں۔ بانس پر چڑھے ہوئے شاعروں کے علاوہ اور بھی غزل گو ہیں جن کے یہاں بھرپور عصری حسیت ہے۔ تازہ کاری ہے اور جن کی غزلوں میں بیسویں صدی مثلاً اکیسویں صدی تک کے مسائل کی عکاسی ہے۔ چاہے یہ ماجد الباقری ہوں، سجاد مرزا ہوں، خالد یوسف ہوں۔ دیپک قمر ہوں، انیس انصاری ہوں، ساحل احمد ہوں، رشید امکان ہوں، پروین کمار اشک ہوں، احسان رانا ہوں، عباس تابش ہوں، مظفر ہاشمی ہوں، نجم عثمانی ہوں، شمیم قاسمی، بشیر سیفی، اختر امان، اقرار فرید، سلیم انصاری، فاروق شفق، کرشن کمار طور، امام اعظم ہوں، اور بھی سینکڑوں دیگر شاعر ہوں کیا انہیں پرکھا گیا ہے؟ کیا یہ نفیس سے، سردار جعفری سے، صلاح الدین پرویز سے اور اسی قبیل کے دیگر شاعروں سے اچھی شاعری نہیں کر رہے ہیں؟ کیا ان کا سرمایہ قابل قدر نہیں ہے؟ یہ لوگ بطور فیشن شاعری نہیں کر رہے ہیں بلکہ اپنے عہد سے قطرہ قطرہ حاصل کر کے الفاظ کے موتیوں سے جذبات و ماحول کی عکاسی کر رہے ہیں۔ یہ مختلف ہیں۔ نئے ہیں۔ ان کے یہاں نئے خیال، آج کے مسائل، الفاظ کا نیا روپ، نئی تراکیب، نئی علامتیں بننے استعارے سب کچھ ہیں اور اس لئے ہیں کہ غزل ہر پل نیا چاہتی ہے۔ آج کی غزلیں عربی اور فارسی کے تصرف سے نکلتی جا رہی ہیں۔ چونکہ آج کی نسل انگریزی داں ہے، ہندی داں ہے، مراٹھی، گجراتی، سندھی، بنگالی، پنجابی، کنڑا، تیلگو، اڑیہ، کشمیری، داں ہے۔ دوسری مقامی اور ملکی زبانوں سے آشنا ہے۔ اسی لئے اردو غزل کے مزاج میں بھی تبدیلی آتی جا رہی ہے۔ تصرف کا عمل مختلف ہوتا جا رہا ہے۔ اور بے پناہ ذخیرہ الفاظ اور دلچسپی موزونیت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ہمیں اس تبدیلی کو اس مزاج کو سمجھنا ہے اور ایمانداری سے پڑھ کر محسوس کرنا ہے۔ تبھی نئے پڑاؤ کو محسوس کر سکیں گے۔ تبھی اکیسویں صدی کی آمد کی دستک کو سن سکیں گے۔ اور تبھی میر، غالب، اقبال، اور سیماب کو ضرب المثل مان کر نئے تقاضوں سے نئے دستخط ایجاد کر سکیں گے۔ ورنہ یہ کٹر پنتھی غزل کو طاق نسیاں بنا دیں گے۔ کلاسیکی اساتذہ کو نصاب کی کتابوں تک محدود کر دیں گے یا کیپٹل

عزیز اندوری

۲۰۔۵ آشیانہ، جونار ساز، اسٹریٹ نمبر ۱، اندور ۶



اردو تحقیق کے چند مسائل

چند حقائق کی روشنی میں

اردو میں تحقیقی عمل کو مختلف مدارج میں تقسیم کیا جا سکتا ہے لیکن ہمیں اس وقت صرف ان تحقیقی پہلوؤں ہی پر گفتگو کرنی ہے جن کا تعلق یونیورسٹی اور کالجوں کے طلبا و طالبات سے ہے۔

اس سلسلے میں ہمارے تجربات مختلف ہو سکتے ہیں۔ اور ہم اپنی اپنی تحقیقی سہولتوں یا دشواریوں کے مطابق تحقیقی سطح یا معیار کا تعین کر سکتے ہیں۔

یوں تو تحقیق کے جن اصول و ضوابط کا تعین ہمارے معتبر محققین اب تک کر چکے ہیں انہیں پیش نظر رکھا جانا ضروری ہے۔ اور انہیں ہی تحقیق کا معیار بنا کر ہمیں اپنے نگرانی میں کام کرنے والے طلبا و طالبات سے اپنے اپنے موضوعات پر تحقیق کرنے کی توقع کرنا چاہیے۔ مگر تجربہ یہ بتاتا ہے مذکورہ اصول و ضوابط کی سختیاں بعض مرتبہ تحقیق کرنے والے طلبا و طالبات کے معیار سے کچھ زیادہ ہی مختلف بن جاتی ہیں یعنی یونیورسٹی یا کالج میں کیے جانے والے تحقیقی کاموں اور عام حالات میں کیے جانے والے تحقیقی عمل میں فرق صاف طور پر نظر آتا ہے۔ حالانکہ اصولاً اس فرق کو کسی صورت بھی تحقیقی عمل کے ادنیٰ یا اعلیٰ معیار کا پیمانہ نہیں بنایا جا سکتا۔ لیکن بعض صورتوں میں موجودہ تحقیق کرنے والے طلبا و طالبات کے تحقیقی رویوں کو دیکھتے ہوئے ہمیں سوچنا پڑتا ہے کہ اب تحقیقی عمل کو دو حصوں میں تقسیم کیے بغیر ہم اس سلسلے میں اپنی بات کو آگے نہیں بڑھا سکتے۔ یہ دو حصے وہی ہیں جن کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا ہے۔ اول تو یونیورسٹی اور کالج سے تعلق رکھنے والا تحقیقی رویہ۔ اور دوسرے عام حالات میں کیا جانے والا تحقیقی عمل۔

ان دونوں تحقیقی رویوں میں ہمیں جو نمایاں فرق نظر آتا ہے اس کا جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔ اور یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ ان دونوں تحقیقی رویوں کے اظہار کے لیے جو معیار اور حالات درپیش ہوں ان کا تجزیہ اس طرح کیا جائے کہ دونوں میں موجود فرق نمایاں ہو سکے۔

ظاہر ہے کہ طالبات یا طلبا کے تحقیقی کام اور عام حالات میں کیے جانے والے تحقیقی عمل میں سب سے بڑا فرق تو یہی نظر آتا ہے کہ اول الذکر کام کی تکمیل وقت مقررہ اور حالات و مسائل کی شکل میں کی جاتی ہے جب کہ مؤخر الذکر قسم کے تحقیقی عمل کے لیے اس قسم کی کوئی قید یا پابندی نہیں ہوتی۔ دوسرے ان دونوں صورتوں میں ذہنی اور علمی معیار میں بھی نمایاں فرق ہوتا ہے۔ طلبا یا طالبات کے تحقیقی کاموں کی ذہنی سطح اور علمی معیار میں بھی نمایاں فرق پایا جاتا ہے طلبا یا طالبات کے تحقیقی کاموں کی ذہنی سطح اور علمی معیار عام حالات میں کیے جانے والے تحقیقی عمل کی ذہنی سطح اور علمی معیار کو اکثر نہیں چھوتا۔ اس لیے اول الذکر قسم کے تحقیقی کاموں میں ذہنی سطح اور علمی معیار کے اعلیٰ تصورات کی اکثر کمی دکھائی دینے لگتی ہے۔

یہیں ہمیں اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیے کہ جو طلبا یا طالبات تحقیقی کاموں میں مصروف رہتے ہیں ان کی ذہنی سطح اور علمی معیار کی بھی دو صورتیں بن جاتی ہیں۔ پہلی صورت میں ان طلبا اور طالبات کا شمار کیا جاتا ہے جو محض نصابی میعاد کے پیش نظر تحقیقی میدان کی طرف قدم اٹھاتے ہیں۔ دوسری صورت ان طلبا اور طالبات کی ہوتی ہے جو ضابطے کے ساتھ ساتھ علمی یا ذاتی طور پر بھی مستعد ہو کر تحقیقی عمل میں مصروف رہتے ہیں۔ ان دونوں قسم کے طلبا اور طالبات کے کاموں میں بھی یقیناً نمایاں فرق ہوتا ہے۔ اول الذکر قسم کے تحقیقی کام کرنے والے تمام تر معتبر اور سنجیدہ اصولوں کی پیروی کرنے سے محروم رہتے ہیں۔ اور آخر الذکر قسم کے تحقیقی عمل کو اختیار کرنے والے سنجیدگی اور ضابطے کی پابندی کرتے ہیں۔ اسی لیے دونوں قسم کے کام کرنے والوں کے عمل اور معیار میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ اس فرق کو اس طرح بھی پرکھا جا سکتا ہے کہ اول الذکر قسم کی تحقیق مباحث کے ساتھ ساتھ ایک طرح سے متعلقہ موضوعات کے تعلق سے صرف چند اطلاعات بہم پہنچانے تک محدود رہتی ہے۔ اور اسی لیے اس میں کسی قسم کے تنقیدی شعور کی شمولیت تقریباً فقدان نظر آتا ہے۔ لیکن اگر انہیں اس قسم کی صورت پیش کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے تو وہ اپنے زاویے سے اس کی کوشش نہیں بن پاتی۔ اس قسم کے تحقیقی میں کام طور پر اپنے ذہن سے نتائج نکالنے کے بجائے دوسروں کی آرا یا نتائج کو بطور حوالہ پیش کرنے پر زیادہ زور صرف کر دیا جاتا ہے۔ اسی لیے اس قسم کے

کام میں معاملات کی اس قدر بھرمار نظر آتی ہے کہ ان کی طرف سے بہت جلد ہی اوب جاتا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس تحقیقی عمل میں تحقیقی اصول و ضوابط کی پابندی کے ساتھ ہی ذہنی اور عملی سنجیدگی کو بھی باقی رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور اس قسم کی کوشش کرنے والے طلبا، و طالبات محض نصابی معیار ہی کو پیش نظر نہیں رکھتے بلکہ عملی طور پر ایسے پہلوؤں کی تلاش میں رہتے ہیں جنہیں پیش کر کے وہ اپنے موضوعات سے پورا انصاف کر کے بہتر نتائج کا دعویٰ بھی کرنے کے لائق بن سکتے ہیں۔ اور اپنے تنقیدی شعور کے ذریعہ تحقیق کے اس معیار کو تر و تازہ کرنے میں نمایاں حصہ لے سکتے ہیں جن کی وجہ سے تحقیق اور تنقید کے باہمی رشتہ کو مضبوط بنایا جا سکے۔

ان دونوں قسم کے طلبا، و طالبات کو تحقیقی کام انجام دینے میں جن مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے ان میں اپنے ذہن سے نتائج نکالنے کے بجائے دوسروں کی آراء یا نتائج کو بطور حوالہ پیش کرنے والوں کو زیادہ پریشانی نہیں اٹھانی پڑتی اس لئے کہ وہ ان حوالہ جات پر اکتفا کر لیتے ہیں جو نصابی معیار کی شکل میں ان کے سامنے موجود رہتے ہیں مثلاً اگر وہ کسی شاعر کے کلام پر اپنی تحقیق کوشش پیش کرنا چاہتے ہیں تو وہ اس کے اسی کلام کو معتبر مان لیتے ہیں۔ جو ان تک کتب و رسائل کے ذریعہ پہنچا ہے۔ یعنی وہ تحقیق متن کی طرف پوری مستعدی اور سنجیدگی کے ساتھ متوجہ نہیں ہوتے۔ اور نہ اس بات کی پروا کرتے ہیں کہ مختلف حوالوں سے وہ اس بات کا پتہ چلائیں کہ اس کلام کی اصلیت کیا ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کی بہت سی غلط روایات جو شعری ادب میں مدت سے مروّج ہیں ان کی تردید کر کے اصل صورتوں کی وضاحت کرنا بھی تحقیق کے دائرے میں آتا ہے مگر بعض صورتوں میں ان کی طرف سے کوتاہی برتتے ہوئے اپنے تحقیقی دعوے کو پیش کرنے کا فرض جب اس قسم کے طلبا، و طالبات ادا کرنے لگتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ انہیں تحقیق کے مسائل سے دوچار ہونے اور تحقیق کے سلسلے میں درکار صبر و تحمل، سنجیدگی و بردباری اور اصول و ضوابط کی کوئی پروا نہیں ہے۔

لیکن تحقیق کرنے والے وہ طلبا، یا طالبات جن کا تعلق تحقیقی عمل کے اس حصے سے ہے جس کے تحت نصابی معیار کے ساتھ ہی ذہنی اور علمی سطح کو بھی پیش نظر رکھا جانا ضروری ہے۔ اصل میں تحقیقی مسائل سے دوچار ہوتے ہیں۔ اور اپنی تحقیقی کاوش کیلئے ایسے ہی موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جن کی تکمیل کیلئے انہیں صحیح معنوں میں فکری اور عملی سطحوں پر تحقیقی مناہج واصول کو صبر و تحمل اور سنجیدگی و بردباری کے ساتھ اختیار کرنا پڑے۔ اسی لئے ان کی تحقیق کے موضوعات عام سطح سے کچھ الگ اور منفرد نظر آتے ہیں وہ اس پہلو کی پوری طرح تحقیق کرتے ہیں کہ زیر مطالعہ تخلیقات کی بنیاد اور اصلیت کیا ہے۔ یعنی وہ ذہنی بردباری اور شعوری مستعدی کے قائل ہوتے ہیں۔ اسکے لئے جب وہ تحقیقی متن کی جانب متوجہ ہوتے ہیں تو اصلیت کی اس گہرائی تک پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں ان کے ذریعہ پیش کئے گئے تحقیقی دعوؤں کو رد نہیں کیا جا سکتا۔

طلبا، و طالبات کے تحقیقی کاموں کے ان دونوں رخوں کو پیش نظر رکھ کر جب ان مختلف سطحوں پر کئے جانے والے تحقیقی کاموں کا جائزہ لیا جاتا ہے تو تحقیقی عمل کی مختلف صورتیں سامنے آتی ہیں۔ علمی و کارآمد سطحیں بھی، اور کام نکال دینے والی سطحیں بھی۔ اسکے لئے تحقیقی عمل سے متعلق موضوعات کو بھی مختلف خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ وہ موضوعات جن کا تعلق تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقیدی شعور سے ہو، وہ موضوعات جن کا تعلق تحقیق کے تاریخی عوامل سے ہو، اور وہ موضوعات جو صرف تخلیقی عمل کے تحقیقی جائزے سے تعلق رکھتے ہوں ان تینوں قسم کے موضوعات کا انتخاب کرتے وقت تحقیق کرنے والے طلبا، و طالبات کی ذہنی سطحوں کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اور ان کے انتخاب کردہ موضوعات پر ان کے ذریعہ پیش کئے جانے والے تحقیقی کام کی اہمیت کا پتہ بھی اسی وقت چل جاتا ہے۔ جب وہ اس کام کو شروع کرنے کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔

موضوعات کے انتخاب کے سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض موضوعات سرسری طور سے تحقیقی عمل سے تعلق رکھتے ہیں یا یوں کہئے ان کا تعلق کسی ایسے ادبی پہلو سے ہوتا ہے جس میں تحقیق کے مقابلے میں جائزہ کی زیادہ گنجائش ہوتی ہے۔ یا پھر ان کا تعلق ایسے ادبی پہلو کے سے ہوتا ہے جن پر پہلے ہی سے تحقیق کی جا چکی ہو۔

اردو میں بہت کم ایسے طلبا، و طالبات ملتے ہیں جو اپنے ادبی سرمایہ کی روشنی میں دوسری زبانوں کے ادبی سرمایہ کی تلاش کریں۔ یا اپنے ادب کے تہذیبی پہلوؤں کو تلاش کر کے انہیں سیاسی، معاشی، ثقافتی اور علمی پیمانوں پر جانچنے کی کوشش کریں۔ یا پھر اپنے ادبی سرمایہ کے رشتہ کو دیگر علوم سے جوڑنے کی غرض سے اپنے تحقیقی عمل تیز کریں۔

ادھر زیادہ تر ایسے ہی موضوعات کو تحقیق کے لئے منتخب کرنے کا چلن سا ہو گیا ہے جن میں تحقیقی عمل کم اور تربائی کوشش زیادہ شامل ہوتی ہے۔ یا پھر جن موضوعات پر آسانی سے کتابی مواد مل جاتا ہے۔

آج جب کہ اردو کے سلسلے میں یاران طریقت ایک ایسے احساس میں مبتلا ہیں کہ اردو کا سرمایہ تہذیبی اور ثقافتی سطح پر دوسرے ملکی ادبی سرمایہ کے مقابلے میں کم وقعت ہے۔ اردو کے تحقیقی عمل اور خصوصاً تحقیقی موضوعات کے سلسلے میں ہمیں قدیم روایات کو تبدیل کرنے کی جانب سنجیدہ ہونے کی ضرورت ہے۔

آج جب کہ اردو زبان اور اس کے ادب کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ایسے موضوعات پر تحقیق کرائی

جانے بیرانی خلاقیاں اس اہلیتوں کو دکھا سکیں۔ حال ہی میں اپنی ایک طالبہ سے میں نے ایم فل کیلئے ایک مقالہ کی تکمیل کروائی ہے جس کا عنوان ہے "مسلمان شعراء اور ہندو تہذیب"۔ اس مقالہ میں بہیر سے لے کر ماضی تک تمام قابل ذکر مسلم شعراء کے اس کلام کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں ہندو تہذیب و تمدن کے بھرپور نقوش موجود ہیں۔ اسی طرح میرے ایک اور طالب علم "اردو کی منظوم گیتائیں" پر کام کر رہے ہیں۔

اگر ہم اور بہتر ہو کر ایسے موضوعات پر اپنے طلباء و طالبات سے تحقیقی کام کرائیں جن کا رشتہ اپنے ادب کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم اور ادب سے بھی قائم ہو سکے تو میں سمجھتا ہوں بہت سے تحقیقی کام کی اور بھی وقعت ہو سکے گی۔

طلباء و طالبات کے انتخاب کردہ موضوعات کی نگرانی کرنے والے حضرات [میری مراد اساتذہ سے ہے] اکثر موضوع کے سلسلے میں خود ایک امتحان میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور بعض مرتبہ کسی اخلاقی مجبوری [یا مصلحت] کے تحت انہیں اس سلسلے میں ذہنی کشمکش کا شکار بھی ہونا پڑتا ہے۔ اسی لئے نگراں کو بھی ذہنی اور علمی سطح پر نہ صرف فکر و شعور کی بیداری ہی سے کام لینا چاہیے۔ بلکہ اپنی نگرانی میں کام کرنے والوں کی فکری و شعوری سطحوں کو بھی پہلے ہی سے اچھی طرح جانچ لینا چاہیے۔

ہمارے اکثر طلباء و طالبات کی موجودہ نفسیات کا ایک بڑا تاریک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ تعلیم یافتہ ہونے کے بجائے ڈگری یافتہ ہونے پر زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔ جس کا انجام یہ ہو رہا ہے کہ ان کی اکثریت جیسے تیسے ڈگری کے حصول کی دوڑ میں شامل ہو گئی ہے۔ اب ڈگری کے حصول کی یہ دوڑ اعلیٰ سطح پر بھی دیکھنے کو مل رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ بعض صورتوں میں اعلیٰ سطحیں بھی اپنا وقار کھوتی جا رہی ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ڈگری کے حصول کا تعلق موجودہ صورتوں میں چونکہ ہمارے معاشی مسائل سے بہت گہرا ہو چکا ہے۔ اس لئے انہیں جیسے تیسے حل کرنے میں مصروف بیشتر طلباء و طالبات علمی و ذہنی وقار کی طرف سے غفلت برتنے پر آمادہ ہو چکے ہیں۔ اور اسی لئے تحقیق کا معیار بھی روز بروز گرتا جا رہا ہے بالغ نظر اور صاف ذہن انسان پوری طرح محسوس کرنے لگے ہیں اس سلسلے میں مجھے یہاں ایک واقعہ بیان کرنے کی اجازت دیجئے۔ قیام دہلی کے دوران جب میرا تقرر دیال سنگھ کالج کے شعبۂ اردو میں ہوا اور مجھے اپنے معاشی مسئلے کے پیش نظر جب تحقیقی کام یعنی PHD کر لینے کی طرف متوجہ ہونا پڑا تو اخلاقی طور پر میں نے دیال سنگھ کالج کے انتظامیہ کے چیئرمین آنجہانی دیوان آنند کمار سے اس بات کی اجازت طلب کی کہ میں برائے PHD دہلی یونیورسٹی میں رجسٹریشن کے لئے درخواست دینا چاہتا ہوں۔ دیوان صاحب کے ذہن میں PHD کے سلسلے میں غالباً چند تلخ تجربات موجود تھے۔ اسی لئے انہوں نے میرے اس ارادے کی پر زور تردید کی۔ اور فرمایا! میاں! اپنا کام کے بجائے اپنی لیاقت اور صلاحیت سے کام لے کر ایمانداری سے اپنے شعبہ کو ترو تازہ بنائے رکھو اور اپنے طلباء کو ذہین بنانے کی کوشش کرو یہی تمہاری PHD ہے۔

آنجہانی دیوان صاحب کے اس رویے کا میرے ذہن پر اثر تو ہوا لیکن میں یونیورسٹی اور حکومت کے ذریعہ بنائے گئے ان اصولوں کو اختیار کرنے پر مجبور بھی تھا۔ جن کے تحت میری معاشی فلاح اور ملازمتی مستقبل کی خاطر میرے لئے ڈگری کا حصول ضروری ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں نے ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب کی نگرانی میں "اردو اور ہندی شاعری میں ہندوستانی عورت کا تصور" پر PHD کے لئے رجسٹریشن کرایا۔ لیکن بدنصیبی سے مجھے ترک دہلی کر کے وطن واپس آنا پڑا۔ اور اس موضوع پر میرا کام ادھورا ہی رہ گیا۔

اب بھی بعض صورتوں میں اسی قسم کی پابندیاں عائد ہیں اسی لئے اکثر خانہ پری کی طرح تحقیقی کام کی طرف متوجہ ہونے اور اس کام کو جیسے تیسے مکمل کر لینے کا جذبہ کچھ زیادہ ہی تیز ہوتا جا رہا ہے۔ اگر اس قسم کی پابندیوں کے تحت تحقیقی کام جاری رہے تو یقیناً ہمارے ادب میں تحقیق سے متعلق مسائل میں اضافہ ہی ہوگا اور ہماری ادبی تحقیق زیادہ وقیع نہیں بن سکے گی۔

ایک اور پہلو کی جانب میں توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔ ادھر مدھیہ پردیش کی بعض یونیورسٹیوں نے RDC ختم کر کے اپنے طلباء کو یہ سہولت دی ہے کہ وہ کسی وقت بھی اپنے نگراں کے مشورے کے بعد رجسٹریشن پلان کے PHD کے لئے درخواست دے سکتے ہیں۔ اس کے لئے خاکہ وغیرہ بھی اس درخواست کے ساتھ دینے کی ضرورت نہیں رہتی۔ خاکہ اپنے نگراں کے مشورے سے بعد میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ طلباء کو دی گئی اس سہولت سے نگراں حضرات کی ذمہ داری میں اضافہ ہو جاتا ہے اس لئے کہ موضوع کے انتخاب اور خاکہ کی تیاری کی ذمہ داری کی تکمیل اب صرف انہیں ہی کرنی ہے۔ ایسی صورت میں اگر نگراں حضرات موضوعات کے انتخاب سے لے کر کام کی تکمیل تک سنجیدہ نہیں رہتے تو اس کا امکان ہے کہ اس تحقیق کے مسائل میں اور بھی اضافہ ہو جائے۔ اور اس طرح اس رنج کو اور تقویت مل جائے جس کے تحت جیسے تیسے ڈگری حاصل کر لینے کی ہوڑ میں آج ہمارے طلباء و طالبات کی اکثریت مبتلا ہو چکی ہے۔

یوسف عارفی
۲۹ ر سی۔ نور منزل۔ اے اسٹریٹ، اگرا ہرادا سرلی، بنگلور۔۹۷

بے سمت مسافر کا سفر

اس بار جب وہ اپنے وطن جانے لگا تو اُسے خیال گزرا کہ ریل کے ڈبوں میں ویسی ہی گندگی ہوگی جیسے پچھلے دس برسوں پہلے ہوا کرتی تھی اور ریل کا انجن بھی ایسا ہی ہوگا جیسے بیمار حالت میں چلتا ہوا کوئی مریض؛ لیکن جب وہ ریل کے ڈبے میں داخل ہوا تو فرطِ مسرت سے گم سم کھڑا ریل کے ستھرے اور بے حد چمکیلے ڈبے کی چمک میں کھو گیا۔ اس نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ وطن پہنچنے کے لئے اب چودہ گھنٹے نہیں بلکہ صرف پانچ گھنٹے درکار ہیں۔ انجن میں خاصی تبدیلیاں لائی گئی ہیں کوئلے کی جگہ اب ڈیزل استعمال کیا جانے لگا ہے۔

اس نے بڑی عجلت سے چل کر کھڑکی کے قریب اپنی سیٹ محفوظ کر لی، بڑے اطمینان سے جوتے کے فیتے کھولتا ہوا سوچنے لگا۔ پانچ گھنٹے کا مختصر سفر اخبار پڑھ کر اور باہر کے نظارے دیکھ کر با آسانی طے کیا جا سکتا ہے، لیکن اس نے سوچا اخبار تو روز ہی پڑھا جاتا ہے وہی بے سر و پیر کی سنسنی خیز خبریں ہوں گی۔ دہشت پسندوں کی بربریت اب اتنی عام ہو گئی ہے کہ لگتا ہے سو پچاس آدمیوں کی موت کوئی بڑا سانحہ یا کوئی بڑا مسئلہ نہیں رہ گیا ہے۔ دیس کے واقعات میں دن بدن اضافہ دیکھ کر ایسا لگتا ہے، اس نئے دور میں انسان کے مہذب بننے میں جو کسر رہ گئی تھی وہ اب پوری ہو گئی ہے اور ــــ اور ــــ

"اگر آپ اجازت دیں تو میں یہاں بیٹھ جاؤں۔" سامنے ایک نو وارد کندھے پر ٹھیک اس جیسا بیگ لٹکائے اس سے پوچھ رہا تھا:

"ہوں!" اس نے لاپرواہی سے ہنکارا بھری اور ایک طویل وقفے کے باوجود اس نے یہ جاننے کی ہرگز کوشش نہیں کی کہ نو وارد اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کس قدر اطمینان سے بیٹھا ہے اور اسے کن نظروں سے دیکھے جا رہا ہے۔

اخبار لپیٹ کر اس نے گھڑی پر وقت دیکھا ٹرین کے چل پڑنے میں صرف چند منٹ رہ گئے تھے اس لحاظ سے پورے پانچ گھنٹوں کے بعد یعنی دوپہر کے بارہ بجے وہ اسٹیشن پر اتر جائے گا۔ اسٹیشن کے خیال سے اسے جھرجھری سی آ گئی۔ گندے ناصاف سے اسٹیشن کا پلیٹ فارم، حبس کی دیواریں، فرش یہاں تک کہ آتے مسافر بھی ٹوٹے پھوٹے سے لگتے ہیں۔ آخر سرکار ان چھوٹی چھوٹی جگہوں کو ترقی دینے اور انہیں ستھرا رکھنے کے بارے میں کوئی پلان کیوں نہیں بناتی، کوئی عمدہ کام! کیا ہمدردی آج صرف بڑے شہر کا مقدر ہے؟

یکایک آس پاس کے شور شرابے، دھکم پیل اور ریل گاڑی کے دھیرے دھیرے چھک چھک کر چلنے نے اُسے چونکا دیا۔

سامنے بیٹھا نو وارد بدستور کھڑکی سے باہر دیکھے جا رہا تھا، شاید وداع کرنے کے لئے آئے ہوئے لوگوں میں اسے اپنے کسی آدمی کی تلاش تھی پلیٹ فارم جیسے ہی ختم ہوا۔ ٹرین نے رفتار پکڑ لی۔ دونوں اپنی اپنی سیٹ پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔

"آپ؟"

"آپ؟"

دونوں نے ایک دوسرے کو پلکیں اٹھا کر دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں وہ یکدم نو وارد سے بے تعلق ہو کر سوچنے لگا ــــ ریل سے اتر کر گاؤں جانے والی بس میں سوار ہونا بڑا جوکھم کا کام ہے، دس سال پہلے کا واقعہ وہ بھولا نہیں تھا جب سامنے کھڑی ایک بے ہنگم بھیڑ اور جگہ جگہ سے ادھڑی بس کے سامنے کھڑا کسان پٹی ہوئی آواز سے گھبرا کر پوچھ رہا تھا۔

"کیا یہ بس کرنکوٹ جاتی ہے؟"

بس میں شور مچاتے اور ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے مسافر اس سے اس قدر لاپرواہ تھے کہ نہ تو کسی نے جواب دینے کی کوشش کی اور نہ ہی اس کی جانب دیکھنا گوارا کیا۔ کس قدر غیر اہم آدمی ہے نا! ــــ وہ اپنے آپ پر جھلّا اٹھا تھا اور چل پڑنے ہی لگا تھا کہ بڑی سی پگڑی باندھے سامنے آتے ایک بوڑھے نے اسے اپنی گھنی مونچھوں میں مسکرا کر دیکھا تھا اور یوں اس کی جانب لپکا تھا جیسے برسوں کا شناسا ہے۔ وہ قدرے قریب آیا تو اس نے پہچان کر بڑے کہا۔

"یا خواجہ میاں تم کتنا بدل گئے ہو، میری عمر سے چھوٹے ہو کر بھی بڑے لگتے ہو۔" بڑے خواجہ میاں نے کہا کچھ نہیں، بس اپنی گھنی مونچھوں میں مسکراتا

رہا اور اسے تعریفی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے منہ میں بھرا تمباکو تھوکا اور سامنے کھڑکی سے بھاگتی جانب اشارہ کر کے کہا۔ "یہی بس کر نکوٹ جاتی ہے"
یکایک اس نے سوچا۔۔۔ ان دس برسوں میں کیا کچھ بدل گیا ہوگا۔
اور اب تو ریل سے اترنے کے بعد شاید ہی کوئی شناسا مل پائے کہ پچھلے دس برسوں سے اموات کی شرح تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔
"اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ اخبار دیکھ لوں۔۔؟"
سامنے بیٹھا نوواردا سے کھوتے کھوتے چہرے کو دیکھتا اس کی جانب جھک آیا۔ اس نے بڑی ناگواری سے نووارد کو دیکھا اور اخبار بڑھا دیا۔
"گولڈن ٹمپل" نووارد نے اخبار پڑھنا شروع کیا ہی تھا کہ۔۔ اس نے مداخلت کی:
"گولڈن ٹمپل کی خبریں اتنی ہی پرانی ہیں جتنا کہ گولڈن ٹمپل!"
اس بار نووارد نے اندازہ لگایا کہ سامنے بیٹھا شخص بالکل بکھرا بکھرا سا ہے اس نے اخبار پڑھنا چھوڑ کر عام مسافروں کی طرح اس سے پوچھا۔
"کہاں تک جائیں گے آپ؟"
"اپنے وطن تک!"
"وطن؟" نووارد کی سوالیہ نظریں ویسے بھی بُری طرح الجھن کا شکار ہو رہی تھیں۔
"جی ہاں! پورے دس برسوں کے بعد آج میں اپنے وطن جا رہا ہوں۔ سُنا ہے اور دیکھا بھی ہے۔۔ گزرتے وقت کے ساتھ ہر چیز میں تبدیلی آجاتی ہے لیکن میں چند اشیاء کو ان کی صحیح حالت میں دیکھنا پسند کرتا ہوں کہ اس سے وابستہ یادوں کے منظر نامے سب ایک جہاں پاتا ہوں"
نووارد کو لگا، سامنے بیٹھے مسافر کی سوچ کی رفتار ریل گاڑی کی رفتار سے زیادہ تیز ہے۔ ایسے میں اس سے کسی ایک موضوع پر بات چیت کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس نے کریدنے کے سے انداز میں پوچھا۔
"شاید آپ۔۔؟"
"جی ہاں! میں اسی اسٹیشن پر اترنے والا ہوں جس اسٹیشن پر اردو کے ناول نگار عزیز احمد یہ سمجھ کر ریل سے اتر پڑے تھے کہ شبیر الدولہ کا بسایا ہوا شہر آگیا ہے"
"جی کیا کہا آپ نے۔۔؟" اس بار نووارد ایک دم بوکھلا گیا اور سیٹ چھوڑ کر جانے لگا۔
"سنیئے!" اس نے آواز دی "شاید آپ کو میری باتیں کچھ عجیب و غریب سی لگی ہوں گی اپنی سیٹ پر اطمینان سے بیٹھ جائیے۔ میں کوشش کروں گا کہ وہ باتیں جو دوسروں کو سناتا ہوں خود ہی گنگناتا رہوں کہ اس میں میرا اپنا کچھ بگڑتا تو نہیں ہے۔ ہاں یہ جان کر مجھے بڑی خوشی ملتی ہے کہ میں نے اپنے اندر ایک نہ بجھنے والا جہان آباد کر رکھا ہے۔
اس کے بعد وہ نووارد سے بے تعلق ہو کر ریل کی کھڑکی سے باہر تیزی سے دوڑتے بھاگتے درختوں، چٹانوں اور کہیں کہیں سبزہ زاروں کو دیکھتا سوچنے لگا، ماں باپ کے بعد ہم تین بچے رہ گئے تھے، دو بھائی اور ایک بہن، ان میں ایک بھائی جو ہمیشہ بے آسرا ہونے کا رونا روتا تھا، قبائیلیوں اور مزدور پیشہ لوگوں میں اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا، اپنے اعلیٰ نسب خاندان سے کچھ ایسا دور ہوا کہ اپنی شناخت ہی کھو بیٹھا، اپنے پرانے کو بیٹھا اور آخر میں ان جیسے درختوں یا چٹانوں کی مٹی میں ابد تک کے لئے سو گیا۔۔۔ ہائے میرا بھائی!۔۔ اس نے چپکے سے اپنی نمناک پلکوں کے کنارے صاف کئے اب معلوم نہیں کس چٹان کے سائے میں اس کی تدفین ہوئی یا کس درخت کی چھاؤں میں اسے دفن کرنے کے بعد تربت جیسی شئے تعمیر کر دی گئی۔ اس نے یہ بھی سنا تھا کہ وہ بڑا اچھا ہوا آدمی تھا۔ جب کسی کو دکھائی دیتا، دیکھنے والا اپنا سر نگوں کر دیتا، جس گھر میں داخل ہوتا خیر و برکت بھی اس کے ہمراہ داخل ہو جاتی اور کہ جب گفتگو کرتا تو لوگ گھنٹوں اس کی باتوں کی حلاوت میں ڈوبے رہتے۔ اس کے نہ ہونے سے یقیناً گھر کے پچھواڑے کا وہ خوب صورت باغیچہ اب تو بالکل تاراج ہو چکا ہوگا۔ اسے اس باغیچہ میں اُگائی جانے والی دنیا جہاں کی جڑی بوٹیوں کے بارے میں بڑی اچھی جانکاری تھی۔ اپنے والد کی تحریر کردہ حکمت کی ضخیم قلمی کتابوں کو وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا کہ اس میں درج شدہ نسخے بزرگوں سے سینہ بہ سینہ ہو کر اس تک پہنچے تھے لیکن اب جبکہ باغ ہی اُجڑ چکا ہے تو ان جڑی بوٹیوں کے نام اور کام دونوں ہی بھلائے جا چکے ہیں۔
"کھٹ!" اچانک ہی اس کا سر کھڑکی کی سلاخوں سے جا ٹکرایا۔ تیز رفتار ریل اس وقت کوئی بڑا موڑ مڑ رہی تھی اور ریل کے ڈبے ایک دوسرے سے علٰحدہ ہو کر بھی ایک دوسرے کو تھامے جھک جھک دوڑے جا رہے تھے۔ اس نے اپنی نیند دوں نیند بوجھل پلکیں اٹھا کر سر ہلایا اور خجالت آمیز انداز میں ڈبے کے مسافروں کو دیکھا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔
سامنے بیٹھے نووارد کا بھی تقریباً یہی حال تھا۔ یک بیک اس کا جی چاہا کہ وہ اس نووارد کو جگائے اور باتیں کرنا شروع کر دے۔ دنیا جہان کی باتیں، گزرتے دنوں کی باتیں، تہذیبی اور شناختی یادوں کی باتیں۔ وہ نووارد کو جگانے کے خیال سے تذبذب و پس و پیش میں پڑ گیا اور سوچنے لگا، بھلا اس اجنبی کو اس کی ان باتوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ یہ سب کچھ تو میرے سر میں سمائی ہوئی دھول ہے، گویا گرد و غبار ہے اور ایک قسم کی دقیانوسی ہے کہ میں ان سب سے اب بھی بے ربط سا الجھا الجھا ہوں۔
"اگر آپ پسند کریں تو ایک کپ چائے پی لی جائے" اس نے چونک کر نووارد کی طرف دیکھا، نووارد کبھی کا جاگ چکا تھا اور اس کے چہرے پر آتے جاتے وہ سارے رنگ بھی اس نے دیکھ لئے تھے، وہ رنگ۔۔ پھیکے بے کیف اور بے جان۔

" چلتے چلاتے اپنی ضرورت کی چیزیں ساتھ ہوں تو منزل تک پہنچنے کا سفر فرحت بخش ہوتا ہے "

" اطمینان بخش، " اس نے تصحیح کی لیکن نوطارد اچانک بول پڑا۔

" اطمینان؟ موجودہ دور میں اب یہ چیز بہت کم لوگوں کو میسر ہے کہ دن اور رات کا تضاد، بھلے اور برے کی پہچان، گالی اور دعا کا فرق۔ یہ سب کچھ اب لٹ رہا ہے "

دونوں نے آخری بڑا گھونٹ لے کر چائے ختم کی اور کھڑکی سے باہر بڑی تیزی سے دوڑتے بھاگتے اشجار، پہاڑ اور سرسبز میدانوں پر نظریں جمائے سوچا۔ ہم جو ایک دوسرے کے مقابل دو علٰحدہ علٰحدہ سیٹوں پر بیٹھے ہیں اور دونوں کی منزل بھی جدا ہے۔ ایک... دوسرے سے کس قدر مماثلت رکھتے ہیں۔

ریل گاڑی دو متوازن پٹریوں پر تیزی سے دوڑی جا رہی تھی ـــ سفر ـــ مدام سفر ـــ

آنے والے دنوں کے بارے میں کوئی مستقل بات، کوئی اٹل فیصلہ کہ کل تم وہی رہوگے جو آج ہو، منظر بدلتے ہیں، منظر بدلتے رہیں گے۔ مغلیہ دور نے دلی میں اردو بازار بسایا، آصفی دور نے حیدرآباد میں بیگم بازار بسایا۔ لیکن اب ان بازاروں میں کس شان سے دھول اڑتی ہے کہ کمزور صحت والی معصوم نسل کے پھیپھڑے سانس کی بے عیب نالیاں اور سفید چمکیلی آنکھیں یوں ہی دھول میں برباد ہوتی جا رہی ہیں۔ اب اس پیش گوئی پر کوئی شک بھی رہا کہ سنہ ۲۰۰۰ء میں چالیس فیصد آبادی کینسر کا شکار ہوگی ۲۱ ویں صدی کی اس پیش گوئی کے بارے میں مجھے بھی معلوم ہے۔ نووارد اچانک بول پڑا۔ لیکن یہ اتنی تشویشناک یاد دہانی نہیں ہے کہ خواہ مخواہ ہی اسے مسئلہ بنایا جائے کہ آج کل نئی اور مہلک بیماریوں کے دفاع کے لئے نت نئے تجربے بھی ہو رہے ہیں، نئی دریافتیں۔ "

" شاید تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ موت آتی ہے پر نہیں آتی " اس نے نووارد کو بلاوجہ مسکرا کر دیکھا۔ " ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ علاج کے نت نئے طریقوں اور دریافتوں کے باوجود ہم سب کی منزل، ہم سب کا مقدر، ہم سب کا آخری پڑاؤ ایک ہی ہے ممکن ہے میں تم سے پہلے آخری منزل پر پہنچ جاؤں۔

" ممکن ہے " اچانک ہی نووارد نے ٹھنڈی سانس بھری اور کھڑکی میں دقت دیکھا ریل گاڑی چند ہی لمحوں میں بھاندری کے اس پل پر سے گزرنے والی تھی جس کے پل کا تصور کرتے ہی پورے بدن میں جھرجھری سی آجاتی ہے۔ ندی کے میلوں پھیلے دیسا و عریض ریتیلے پاٹ کو دیکھ کر لگتا تھا کہ سینے میں آتی جاتی صحت مند سانسیں بھی لوٹ جائیں۔ نووارد نے برق رفتار ریل کی کھڑکی سے اچانک کھنچے بہت نیچے ندی کے شانت بہتے پانی کو دیکھا اور اسے لگا تیز رفتار دوڑتی ریل کے شور کے ساتھ پل میں لگے لوہے کے بھاری بھرکم شہتیر بڑا بھیانک شور مچانے لگے ہیں۔ اور یوں اس شور سے ندی کا شانت بہتا پانی بھی گھبرا اٹھا ہے اور کانپنے لگا ہے۔ نووارد نے بڑی عقیدت کے ساتھ اپنی پلکیں بند کرلیں اور ہاتھ جوڑ کر بھاندری کو پرنام کرنے لگا۔

" بھاندری کے بعد آنے والا اسٹیشن ہی میری منزل ہے " اس نے نووارد کو بتایا۔ پھر پوچھا " تم شاید آگے جاؤ گے؟ "

نہیں میں بھی اسی اسٹیشن پر اترنے والا ہوں جس اسٹیشن پر تم اترنے والے ہو۔ "

نووارد کے جواب پر اسے قدرے حیرت ہوئی یعنی پانچ گھنٹوں کی طویل قربت کے باوجود ہم ایک دوسرے کو اپنی اپنی منزل کا اتہ پتہ بھی نہیں بتا سکے تھے اور یہ بھی کہ نام ـــ کام ـــ گھر ـــ بیوی، بچے ـــ یہ سب کچھ ـــ ان کے بارے میں کہ ـــ

" غیرضروری ـــ بالکل غیرضروری "

" فضول ـــ بالکل فضول "

نہ جانے کس نے کس کو کہا۔

یکایک دونوں نے محسوس کیا کہ ریل گاڑی کی رفتار دھیرے دھیرے کم ہونے لگی ہے۔ آؤٹر سگنل گزرنے سے قبل ہی دونوں نے جوتے کے فیتے باندھ لئے، کھلے ہوئے سفری بیگ کی زپ درست کی پھر دونوں نے ایک دوسرے کو اس طرح دیکھا جیسے کوئی اہم سوال پوچھنا رہ گیا ہو۔ لیکن کوشش کے باوجود وہ ایک دوسرے سے کچھ بھی نہ پوچھ پائے۔

ریل گاڑی سیٹی بجاتی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنچ کر رک گئی۔ مسافر اپنا اپنا سامان اٹھائے ریل سے اترنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس نے اٹھنے سے قبل نووارد کو دیکھا۔ لیکن اسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ وہ جگہ جس پر نووارد بیٹھا تھا، بالکل خالی تھی۔

❋

◆ بقیہ صٓ غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ ◆

کی حد تک قید کرکے عالی شعری منظرنامے سے الگ کردیں گے۔ کبھی پڑھا تھا کہ شاید دہلی میں غزل اکیڈمی قائم ہوئی ہے لیکن اس اکیڈمی نے غزل کو عالمی شعری سطح تک لے جانے کے لئے کیا کیا؟ ایسا کام چکانے والوں کی کمی نہیں ہے۔ اردو صحافت نے بھی غزل گو شاعروں کے ساتھ زیادتی کی ہے اردو رسائل بندھے ٹکے کالم طے کر لیتے ہیں۔ اور ہر ماہ ایک ذخیرہ چھاپ دیتے ہیں۔ کیا اس سے اردو شعر و ادب کی پرکھ ہوگی، سرمایہ کا اضافہ ہی سب کچھ نہیں ہے میں اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن ـــ!

● منظر عاشق ہرگانوی۔ گلزار۔ برہ پورہ۔ بھاگلپور ۸۱۲۰۰۱

سہیل وحید
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی - ۷

روسمّا

"کب آؤ گے۔؟ جلد جب بیت جاتا ہے تب ہی اچھا لگتا ہے۔ اس لئے اچھے دن کا انتظار فضول ہے۔ بقیہ سب بدستور ہے آجاؤ۔ چند دن خوشی گذر جائیں گے۔ اب پڑوس کے کمرہ میں ایک ساؤتھ انڈین لیڈی رہنے لگی ہے۔ صبح کی بیداری اور دودھ وغیرہ لینے کے وقت کی پابندی سے نجات مل گئی ہے۔ لیکن میں ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکا ہوں کہ کوئی سلسلہ زیادہ کا انتہا یا وہ یہ

میں نے اپنے دوست کو بس یوں ہی یہ سب خط میں لکھ دیا تھا۔ خط صرف خط لکھنے کے لئے لکھا گیا تھا۔ اس لئے کچھ نہ کچھ تو لکھنا ہی تھا تو یہ لکھ دیا۔ گذشتہ سال بھر سے میں اس مکان میں رہ رہا تھا۔ جو مکان کم سرائے زیادہ تھی۔ میرے علاوہ اس مکان میں چھ کرائے دار اور بھی تھے۔ میرا کمرہ مکان کے سامنے والے حصہ میں تھا پڑوس میں ایک کمرہ اور تھا جو پچھلے کئی مہینوں سے خالی پڑا ہوا تھا۔ ان دونوں کمروں کے لئے ایک ہی غسل خانہ اور پاخانہ تھا۔ سامنے کھلی چھت تھی۔ میں اپنے آفس کے کام سے ایک ہفتہ کے لئے باہر گیا تھا۔ اور جب واپس آیا تو پڑوس کے کمرہ کو بھرا پایا۔ کمرہ میں آنے والی ایک عورت تھیں۔ ان کی عمر تیس کے آس پاس تھی۔ جسم چھریرا تھا۔ عمر کے معاملے میں مجھے ہمیشہ دھوکا رہا ہے لیکن وہ مجھے لمبی تھی اور کبھی کچھ بڑی۔ وہ یہ یہاں ایک پرائیویٹ فرم میں اسٹینو تھیں۔ اور یہاں صرف نوکری کی خاطر اپنے گھر سے ہزاروں کلو میٹر دور تنہا رہ رہی تھیں۔ نام تھا۔ "روسمّا۔" رہنے والی تھیں کیرالا کے ارنا کلم کی۔ ان سے تھوڑے دن رسمی بات چیت رہی۔ پھر ہم دونوں قریب ہوتے گئے۔ وہ صبح سویرے مجھے جگا کر "گڈ مارننگ" کہتی اور میرے سامنے چائے کا پیالہ حاضر کر دیتی۔ اور میرے کہے بغیر ہی اپنے ساتھ میرے لئے بھی دودھ لے کر گرم کر کے لے آتی۔ میں اس سے کہتا بھی کہ میرے لئے یہ کیوں تکلیف کرتی ہو۔ تو وہ ہنس کر کہہ دیتی کہ اپنے لئے بناتی ہوں تو تمہارے لئے بھی بنا دیتی ہوں۔ سب کچھ اس طرح چلتا رہا۔ میرا دودھ گرم کرتا۔ چائے بناتے وہ تھوڑا ... [illegible]

اسی بیچ ایسا ہوا کہ یہاں بریج کارپوریشن کے میس انجینئرس میس میں کھانا کھاتا تھا اس نے کلرک میرا کھانا بند کر دیا۔ تفتیش کرنے پر پتہ چلا کہ غلطی میری ہی تھی کیونکہ بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ میں اکیلے کھانا کھانے جاتا۔ اکثر میرے ساتھ ایک دو لوگ ہوا کرتے تھے۔ اس وجہ سے ایک آدھ آدمی فالتو رہا کرتا تھا۔ دوسرے کئی انجینئر اس بات پر پہلے ہی اعتراض کر چکے تھے کہ میں دوسرے ڈپارٹمنٹ کا ہوں۔ اور حد تب ہو گئی جب میں نے اپنے ایک دوست کو مستقل طور پر وہاں کھانا کھانے کے لئے لگا دیا۔ اس بات کی اطلاع ملنے پر کئی انجینئروں نے اس کی شکایت کارپوریشن کے سینئر انجینئر سے کر دی۔ سینئر انجینئر نے کلرک کی سرزنش کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ میرا کھانا بند۔ اب میں جو کہ لوگوں کو بڑے فخر سے کھانے پر مدعو کیا کرتا تھا خود ہوٹلوں کی خاک چھانتا پھر رہا تھا۔

کھانے کی پریشانی ہو جانے پر روسمّا نے میرے لئے اور کبھی کبھار سے دودھ لینا شروع کر دیا تھا لیکن میرے لئے کھانا پکانے سے اس نے ہمیشہ گریز کیا۔ میں نے کہا کہ اب میں تمہارے یہاں ہی کھانا کھایا کروں گا۔ تو اس نے مجبوری ظاہر کی اور کہا کہ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ وجہ دریافت کرنے پر بولی تم دونوں وقت روٹی کھانے والے ہندوستانی ہو جبکہ ہم دسمبر جنوری میں ہی صرف دو تین مرتبہ روٹی پکا کر کھاتے ہیں ورنہ چاول سبزی۔ اور چاول سبزی بھی ایسی نہیں کہ جیسی تم کھاتے آئے ہو۔ اس نے کھانے پینے کے معاملے میں کیرالا کے کلچر کو ابھی تک نہیں چھوڑا تھا۔ عجیب عجیب قسم کی سبزیاں عجیب عجیب طرح سے پکاتی تھی یہی وجہ تھی کہ جب وہ پیاز چھیل رہی ہوتی تھی تو پڑوس کے بچے بڑے ہی معصومانہ انداز میں پوچھتے۔ "آنٹی آپ کو پیاز چھیلنا نہیں آتا کیا ...... ؟" ایسے میں اس کے ساتھ کھانا کھا کے سزا کم نہ تھا۔ اب میرے لئے اس کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہیں بچا تھا کہ یا تو میں خود پکاؤں یا ہوٹلوں میں کھانے کے ساتھ ساتھ گندگی بھی کھاؤں۔

پڑوس میں روسمّا کے آجانے سے مجھے اپنا کمرہ گھر جیسا لگنے لگا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اب میں کمرہ پر زیادہ وقت گذارتا۔ ٹی وی کے پروگرام اچھے لگتے

لے گئے تھے۔ میری چیز بار اور ظلم کے وقت میں روسما سے کہتا، یہیں بیٹھ کر دیکھو میرے پاس۔ لیکن وہ کبھی بھی میرے پاس والی کرسی پر نہیں بیٹھتی۔ ہمیشہ اس نے دروازے کے باہر ہی اپنی کرسی ڈالی۔ میرے پاس آنے جانے والے دوست بھی اس کو کہا بات کیلئے ٹوکتے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ میرے ایک دو دوست اس سے مذاق بھی کرتے لیکن اس نے کبھی کسی کی بات کا برا نہیں مانا۔ میرے کمرے پر تقریباً روز آنے والے میرے ایک دوست نے مجھ سے مذاق میں اس وقت یہ بات کہی تھی جب روسما ہم دونوں کے لیے چائے لا رہی تھی۔ "چھوڑو یار سب۔ اور خوشی قبول کر لو۔ اب تمہاری قسمت میں اسی کو کا نام درج ہو گیا ہے۔ تو کیا کیجئے؟" مجھے اس کا یہ مذاق اچھا بھی لگا تھا اور برا بھی۔ برا اس لیے کہ میرا دل روسما کی طرف سے ایسا ہی صاف تھا جیسے بارش کے بعد نکلنے والا پورا چاند۔ میرا دوست جب چلا گیا تو مجھے اس کی کہی بات یاد آ گئی۔ اور پہلی بار میں روسما کے بارے میں سوچنے لگا۔ دیر رات تک میں نے سوچا روسما کے بارے میں۔ پتہ نہیں کیا کیا۔ اور پھر سو گیا۔

دوسرے دن میں نے اس سے پوچھا۔ "تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟" اس نے بنا کسی ہچکچاہٹ اور بڑی بے باکی سے بتایا تھا کہ "کوئی ملا نہیں" یہ سوچ کر کہ ضرورت سے زیادہ کالی اس عورت سے شادی کرے گا کون؟ میں نے پھر پوچھا کہ کسی سے بات کی تو اس نے بتایا کہ "میری طرف کا لڑکا ہی مجھ سے شادی کر سکتا ہے۔ ادھر کا تم لوگ تو گوری مانگتا۔" میں نے کہا کہ اپنی طرف کے لڑکوں سے ہی بات کرو۔ اس مرتبہ وہ کچھ ہنسی پھر بولی کہ "اب کی بار جیسے ہی کوئی نوکری کرتا لڑکا ملے گا کروں گی۔ بزنس والے سے اپنے بس کا نہیں۔ میرے گھر کا لوگ بھی بزنس والے کو پسند نہیں کرتا"

ہم دونوں اس رات دیر تک ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے تھے۔ باتوں باتوں میں اس نے بتایا تھا کہ کیرالا میں روزگار کے مواقع بہت کم ہیں۔ آمدنی کے ذرائع بہت محدود ہیں اسی وجہ سے وہاں کے لڑکے لڑکیوں کو اپنے دیس سے دور تنہائی کی زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کی بڑی بہن بھی اسی طرح راجستھان میں نرس کی نوکری کرتی ہے اور اکیلی رہتی ہے۔ اس نے مزید بتایا تھا کہ سال میں ایک مرتبہ وہ راجستھان جاتی ہے۔ اپنی بہن سے ملنے اور ایک مرتبہ اپنے گھر اپنا گھر۔ وہاں اس کے ماں باپ بڑے بھائی بھابھی رہتے ہیں۔

مجھے اس کے حالات سن کر اس سے اور زیادہ ہمدردی پیدا ہو گئی تھی کیونکہ ہم جیسے لڑکوں کی مائیں گھر سے پانچ سو کلومیٹر دور نوکری کیلئے بھیجتے وقت آنسو بہاتے دعا کرتی ہیں اور یہی سمجھتی ہیں جب ہزار دو ہزار کیلومیٹر دور یہ لڑکیاں محنت مشقت کی تلاش میں آتی ہیں۔ اور یہیں کی ہو جاتی ہیں۔ روسما کہا

سات سال ہو گئے تھے۔

دن یوں ہی کٹ رہے تھے۔ صبح آفس جانا اور شام کو واپس آنا اور پھر رات دیر گئے سو جانا۔ ایک شام جب میں واپس آیا تو روسما کو بہت اداس پایا۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے۔ "کچھ نہیں۔" اس نے چھوٹا سا جواب دیا۔

"کچھ تو۔ کیا دودھ والا نہیں آیا۔ مجھے معلوم تھا دودھ نہ ملنے پر اکثر وہ ایسے ہی بنا کچھ کھائے پئے سو جاتی ہے۔"

"نہ دودھ والا ابھی نہیں آیا۔"

"یا نہ اسے دودھ کا پیکٹ لا دوں؟"

"نہ میرے کو نہیں لینا۔"

"پھر کیا بات ہے" میں نے پھر پوچھا۔

اس مرتبہ وہ کچھ نہ بولی اور خاموش لیٹی رہی میں نے اور زیادہ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ اور یہ سوچ کر کہ اس کو بھی میری طرح گھر کی یاد ستا رہی ہوگی۔ خاموش رہ گیا۔ مجھے اس طرح کی یادوں کا تجربہ تھا کہ جب گھر کی یاد آتی ہے تو دیر تک آتی ہے۔ اور اس وقت کوئی بھی کچھ بھی اچھا نہیں لگتا ہے۔ میں بھی کچھ تھکا ہوا تھا تو جلدی لیٹ گیا اور سو گیا۔

دوسرے روز صبح اس نے مجھے بیڈ ٹی نہیں پلائی۔ شام کو جب میں واپس آیا تو روسما کو اپنا منتظر پایا۔ مجھ سے بولی میرے نام ہندی میں کوئی خط آیا ہے۔ وہ مکان مالکن اور دوسرے کرایے داروں نے پڑھوا لیا ہے۔ اور پیچھے والی لڑکی کے پاس ہے اس نے مجھے دیا بھی نہیں۔ میں نے کہا ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ تم نے کہا نہیں خط میرا تھا پڑھا کیوں؟ کہتی تھی میرا نہیں تھا میرے نام سے تھا۔ میرے خط تو صرف میری بھاشا میں آتے ہیں ہندی میں آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ مجھے لگتا ہے اسی پیچھے والی لڑکی نے اس نے میرے نام سے منگا لیا ہے۔ اس لئے اپنے پاس رکھے جو مجھے دے بھی نہیں رہی ہے۔

یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی پھر بھی میں نے احتیاطاً کہا۔ میں کہا کہ تم کو اس کی شکایت کرنی چاہیے تھی۔ خط تمہارا تھا کسی نے پڑھا کیوں؟ اسی دوران میرے مکان مالک کا چھوٹا لڑکا آ گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ کیا تماشہ ہے تم لوگ دوسروں کے خط پڑھتے ہو۔ روسما کا خط تم لوگوں نے پڑھا اور پھر اس کو ابھی تک دیا بھی نہیں۔ یہ کیا بات ہوئی۔

پہلے تو وہ مسکرایا پھر بڑے ہی رازدارانہ سے انداز میں بولا۔ "وہ لو لیٹر تھا۔" اس کی بات سے مجھے حیرانی تو ہوئی لیکن میں نے پھر بھی اس سے کہا۔ "وہ جو بھی ہو، یہ کون سا طریقہ ہے لو لیٹر ہو یا آفیشل کسی کا خط کوئی کیسے پڑھ سکتا ہے۔" اس نے کہا ارے بھائی صاحب آپ نے اس لڑکی کی بات پر

یقین کریں اور میری سنی ہی نہیں۔ میں نے کہا تم اب ملے ہو۔ کہنے لگا۔ وہ خط کھلا ہوا تھا اور بھائی صاحب بس کیا بتائیں۔ غضب کی ڈرافٹنگ تھی اس کی۔ مزہ آ گیا پڑھ کر۔ واقعی کسی نے خون جگر سے لکھا ہے۔ اب تو لگتا ہے پچ مچ کوئی آپ کی کلو سے محبت کر بیٹھا ہے۔ پتہ نہیں کون بندی بھاشی بلہ زور ہے۔

وہ اور بھی کچھ کہتا لیکن میری ناگواری کے سبب اس نے اس خط کی بات ختم کر دی۔ اور جانے لگا لیکن واپس جاتے جاتے آیا اور کہنے لگا بھائی صاحب آپ تو آپ کو تکلیف ہو جائے گی آپ کی کلو جا رہی ہے۔ "یہ میرے لئے ایک نیا انکشاف تھا۔ میں نے اس کو بٹھا لیا اور پوچھا بات کیا ہے۔ اس نے بتایا کہ خط پڑھنے کے بعد ممی نے اس کو پندرہ دن کے اندر کمرہ خالی کرنے کا نوٹس دے دیا ہے۔ یہ سن کر میرا سر چکرا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کسی کا لو لیٹر آ جانے سے اس کا کمرہ کیوں خالی کروایا جا رہا ہے۔ کرایہ داروں کے معاشقے سے مکان مالک کو کوئی معاشی نقصان تو ہوتا نہیں ہے۔ ان کو تو وقت پر کرایہ سے مطلب ہے۔ میں نے پھر شرد سے کہا اس میں کمرہ خالی کروانے کی کیا بات ہے۔" ارے بھائی صاحب میرے کو کیا ہے کوئی چاہے جتنے عشق کرے بھگوان کرے کلو کو خوب عاشق ملیں۔ آپ بھی اچھی اچھی لڑکیاں عشق کریں لیکن گڑبڑ تو یہ ہو گئی کہ جب ڈاکیہ آیا تو ممی اور دیپو والی لڑکی گیٹ پر کھڑے تھے اور اس کا خط کھلا ہوا تھا وہ لڑکی پڑھنے لگی۔ خوب ہنس ہنس کر خوب اچھل اچھل کر مسکرا مسکرا کر پڑھ رہی تھی اور ممی کو بھی اس نے بتایا۔" تو اس میں کون سی بڑی بات ہو گئی۔ ".. کیا کوئی کسی سے عشق نہیں کر سکتا۔" میں نے جب لاچاری کے انداز میں اس سے پوچھا تو وہ بولا۔" ارے بھائی صاحب آپ تو بہت جذباتی ہیں۔ پوری بات سنئے تو سہی۔" پھر اس نے بتایا کہ جس مکان میں پہلے وہ رہا کرتی تھی اس کی مالکن نے ممی سے آ کر ایک روز بتایا تھا کہ یہ اچھی عورت نہیں ہے اس کے پاس کئی لوگ آیا جایا کرتے ہیں۔ اور ہاں۔ یہ تو آپ نے بھی دیکھا ہو گا؟ ... وہ ... ایک گھٹیا سا آدمی ہر تیسرے چوتھے دن اس کے پاس آتا ہے اور گھنٹوں اس کے پاس بیٹھتا ہے۔ اس کی پرانی مالکن کی بات آج آنے والے خط سے صحیح ثابت ہو گئی۔ اور بس ممی نے نوٹس دے دیا۔

یہ سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی میں نے شرد کو ایک گھنٹے تک خوب بھاشن پلائی اور جب وہ چلا گیا تو باہر آ کر میں نے روسما کو بلایا۔

"کیا ممی نے کمرہ خالی کرنے کو کہا ہے؟ میرے یہ پوچھنے پر پہلے تو وہ انکار میں سر ہلاتی رہی لیکن بعد میں کہنے لگی ہاں "میں نے پوچھا اسی خط والی بات پر کہنے لگی" ہاں " "یہ سماج بہت گندہ ہے کسی کو کسی سے کچھ لینا دینا نہیں پھر بھی ایک دوسرے کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔" میرے مزید پوچھنے پر اس نے بتایا کہ پہلے وہ جہاں رہتی تھی اس کی مالکن قطعی جاہل تھی۔ میں نے پوچھا اس سے پہلے کہاں رہتی تھیں۔ اس نے بتایا بڑا بازار میں۔ میں نے پوچھا وہاں کیا تکلیف تھی۔ "کچھ نہیں۔ اس کا مالک مجھے گھورتا تھا۔ اس نے بہت برا سا منہ بنا کر بتایا۔ میں نے پھر پوچھا اس سے پہلے کہاں رہتی تھیں۔؟" اس نے اس مرتبہ مجھے بڑی عجیب اور معصوم نظروں سے دیکھا اور بنا کوئی جواب دیئے چلی گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اس کے سابقہ مکانوں کے بارے میں پوچھ کر اس کو پریشان کیا ہے۔

اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ خط روسما کا ہی ہے لیکن اب مجھے اس بیچاری پر ترس بھی آ رہا تھا۔ اس بیچ شرد آ گیا۔ میں نے آتے آتے ہی اس سے پہلا سوال یہ کیا کہ تم لوگوں نے روسما کے بارے میں کیا سوچا ہے ممی سے کچھ بات کی؟ شرد نے بتایا کہ ممی اپنی بات پر بضد ہیں۔ میں نے کہا چلو چلتے ہیں آنٹی سے بات کرنے لیکن پھر مجھے خیال آ گیا کہ پہلے روسما سے پوچھ لوں اور یہ سوچ کر بیٹھ گیا اور پھر شرد سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے پھر شرد سے کہا کہ تم لوگ غلط کر رہے ہو۔ ذرا اس بیچاری کی مجبوری بھی تو سمجھو۔ اتنی دور تنہا رہتی ہے یہاں کوئی نہیں ہے اس کا اور تم لوگوں کو ذرا بھی خیال نہیں۔ میرے خیال سے وہ ایسی ویسی نہیں ہے اور کم سے کم پچھلے چھ مہینوں کا کریکٹر سرٹیفکیٹ تو میں دے سکتا ہوں۔

" ہاں ... ہاں ... آپ تو دے ہی دو گے۔ ایسے ہی دیتے ہیں سب سارٹیفکیٹ۔" مجھے لگا کہ میں نے کچھ غلط کہہ دیا ہے۔ کیونکہ میرے زیادہ وکالت کرنے پر اس کی بدکرداری ثابت ہو سکتی ہے۔ میں کچھ اور کہنے والا تھا کہ شرد پھر بول پڑا بہت دیکھے ہیں ساؤتھ انڈین سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ہاں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں وہ تو بہت اچھے ہوتے ہیں لیکن جو ذرا نچلے طبقے کے ہوتے ہیں وہ ایسے ہی اپنا پیار لٹاتے پھرتے ہیں۔ اب تو کسی ساؤتھ انڈین کو کمرہ دینا ہی نہیں ہے۔

اب میں سمجھ چکا تھا کہ یہ سب بلندی کو تکتے ہوئے پستی میں پیدا ہونے والی اوسط ذہنیت کے مشترک روح ہیں جو آج اپنے آپ کو باوقار اور با عزت بنا رہے ہیں ان کا مزاج فاسق کا رہا ہے۔ ان سے کسی انسانی پہلو پر بات فضول ہے میں یہ بھی اچھی طرح سے جانتا تھا کہ میں کسی بھی لڑکی کو اس کمرہ میں لے لا کر چاہے جتنے دن رکھوں اور کچھ بھی کروں یہ لوگ چوں نہیں کر سکتے لیکن اس بیچاری کو..

مجھے خاموش دیکھ کر شرد پھر پوچھنے لگا کیا بات ہے آپ ایکدم چپ ہو گئے " دکھ ہو رہا ہے ..... ؟ اب کیا بتائیں بھائی صاحب تکلیفیں تو آپ کو واقعی ہو جائیں گی۔ پھر ہنس کر بولا۔" ساری بھائی صاحب ... اب آپ کو ایسی پڑوسن نہ مل پائے گا ...... اور ہنستا ہوا چلا گیا۔

دو ہفتے پھر بیت گئے اور ایک شام جب میں واپس آیا تو دیکھا روسما سامان پیک کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا یہ کیا؟ کیا جا رہی ہو؟ کہنے لگی "ہاں میرا دل چاہا کہ اس سے کہوں کہ نہیں۔ رکو تم۔ ہمیں دکھ تمہیں یہاں سے کوئی نہیں

[باقی صفحہ ۱۸ پر دیکھئے]

سندر پرکاش
۳/۳۴ یوگی راج آشرم، ہنس بوگرا مارگ، ماٹونگا لیبر کیمپ بمبئی ۱۹

فسان [قسط نمبر ۱۰]

— ۵ —

زینب نے کوٹھے کی منڈیر پر چلتے چلتے ایک بار رک رک کر نیچے جھانکا۔ آنگن میں چھینٹ کے دولاف دو پلنگوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اور ان دونوں لحافوں میں سے دو سوئے ہوئے چہرے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی نظر چھینٹ کے پھولوں پتیوں پر سے پھسلتی ہوئی ایک چہرے پر جا کر رک گئی۔ وہ چہرہ ایک مرد کا تھا۔ یوں تو اس کا باپ، بھائی، مزارعے، نوکر چاکر، غلام اور بوڑھا برکت لالکڑی اور اس کا بیٹا سیتا رام سب ہی مرد تھے۔ لیکن یہ چہرہ کچھ ایسا تھا کہ زینب کے اندر چھپی ہوئی عورت تا چھا کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"زینب ۔۔ زینب ۔ یہ کس نے پکارا ہے ۔" زینب کو لگا وہ عورت اس کا نام پکار کر غائب ہو گئی ہے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی نظر کھیتوں، پہاڑوں اور فضاؤں پر پھیلنے لگی لیکن کوئی دکھائی نہ دیا جس نے اسے پکار کر بیدار کیا ہو۔

"زینب ... زینب ... " یہ آواز اس کی ماں کی تھی۔ وہ نیچے سے اسے پکار رہی تھی۔ "آئی اماں" کہتی ہوئی وہ سیڑھیوں کی طرف لپکی۔ اور جب اتر نے لگی اس کی پازیبیں پکار اٹھیں۔ "زینب۔۔ زینب۔۔۔" اسے اپنا نام بڑا پرکشش لگا۔ پل کے پل میں اسے اپنے آپ سے عشق ہو گیا۔

دور گاؤں کی مسجد سے اذان کی آواز گونجی۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر، گلی سے گذرتے ہوئے ڈھوروں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیاں کھنک اٹھیں۔ اور پھر کسی بھینسے کے ڈکارنے کی آواز ابھری۔ پھر ہانکے کی آواز۔

" ہا۔ ہا۔ ہا "

اقبال کی آنکھ اچانک کھل گئی۔ اس نے دیکھا سامنے میں ہلکا ہلکا کہرہ چھایا ہوا ہے۔ اور حویلی کا آنگن دھند لکے سے بھرا ہوا ہے۔ جس میں دو چار پائیاں دو قبروں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ اور ان چار پائیوں پر پھیلے ہوئے چھینٹ کے لحاف ایسے لگ رہے تھے جیسے کسی عقیدت مند نے چڑھاوے کے لئے پرمنت کی چادریں چڑھا دی ہوں۔

اذان کی آواز پھر گونجی۔ شوکت ایک جھٹکے سے اٹھا اور لپک کر اقبال کے پاس آ بیٹھا۔ اور بڑی رازداری اور گھبراہٹ میں اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر بولا۔

" اقبال اٹھ۔ جلدی سے بھاگ لے۔ آج جمعہ ہے۔ سب نماز پڑھنے آئیں گے۔ بری طرح پھنس جائیں گے یار۔"

اقبال کو ایسا لگا جیسے شوکت نے اسے محمود غزنوی کے پھر دھوبن جانے کی خبر دی ہو۔ ہڑبڑا کر اٹھا۔ ان دونوں کو حویلی کا دالان پار کرکے باہر نکلنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔ گلی میں سے چرواہا بھیڑیں لے کر چرانے جا رہا تھا۔ اور ڈھوروں کے ساتھ ہی نکلا۔ وہ بھی ان بھیڑوں کے گلے میں شامل ہو کر چلنے کی اداکاری کرتا گاؤں کی حدود سے باہر نکل آیا۔

ہر شہر، ہر قصبے اور ہر گاؤں کی حدود کے باہر سے کھیت شروع ہوتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے آبادی پہلے تھی یا کھیت یا پھر وہ جو ہڑ جو قصبے کے بیچوں بیچ پڑا ہے یا وہ ندی جو شہر کی فصیل کو چھو کر بہتی ہے۔ یہ نقشہ دنیا بھر کے شہروں کا ہے۔ گلیوں اور بازاروں کے رخ کا فرق ہو سکتا ہے۔ اب چولہے کے مقام کا فرق ہو سکتا ہے جو یا گاؤں کے رخ ہی میں ہونا چاہئے۔ مگر شمال، جنوب، مغرب، مشرق میں کوئی فرق نہیں تھا وہ اپنی جگہ اٹل ہیں۔ اور مشرق سے سورج نکلتا ہے۔ اقبال نے دیکھا مشرق سے سورج نکل کر گاؤں کے گرد پھیلے ہوئے لہلہاتے کھیتوں پر اپنا سنہری جال پھیلا رہا تھا۔ سے آسمان کی وسعت میں مرورد تھا۔

وہ کھیتوں کے بیچوں بیچ بنی پگڈنڈیوں پر چپ چاپ چلے جا رہے تھے۔ لیکن اندر شور مچا ہوا تھا ویسا ہی جیسے تیز ہوا کی وجہ سے سیلابی بچنے سے کھیتوں میں مچا تھا۔ لیکن تھے شاید ان کے پاس کہنے سننے کو کچھ نہیں تھا۔ دو دو جوان عورتیں اپنے جسم ڈھانپے سروں پر مٹکے گھڑے کو رکھے ڈھکنے سے پائل لگا کر گاؤں کی طرف لوٹ گئیں۔ ان کی بات چیت ہوا کے دوش پر سفر کرتی جب ان تک پہنچی تو محض رہ جاتی تھی۔ لفظ بیچ ہی میں کھو جاتے تھے۔ یا پھر اچانک مٹی کے الغوزے کی آواز تھی جس نے سناٹے کے طلسم کو پاش پاش کر دیا تھا۔ یا پھر کہیں سے ڈھول کے تھاپ سنائی آواز گونجی۔

گاؤں کی بستی ان چھوٹے چھوٹے پہاڑی ٹیلوں سے گھری تھی۔ اور ایک چھوٹے ٹیلے سے چھوٹا سا آبشار گرتا تھا۔ جو گاؤں کے لئے پانی کا ذریعہ تھا۔ اس ٹیلے کے پہلو میں پیر صاحب کی درگاہ تھی۔ اور اس سے ذرا سے فاصلے پر چھوٹی سی مسجد کے مینار سفید تھے۔ پیر صاحب کی درگاہ بہت پرانی تھی۔ ان پیر صاحب کی حقیقت سے کوئی واقف نہ تھا۔ شاید رحیم یار بھی نہیں جس کے والد کے وقت سے پہلے وہ پیر صاحب اس گاؤں میں موجود رہے ہوں گے۔ مگر اس کا تعلق رحیم یار کے خاندان سے تھا۔ جب رحیم یار دلاور خان کے جبر کی وجہ سے گاؤں چھوڑ کر گیا تو اپنے بزرگوں کے روحانی منبع کو بھی پیچھے چھوڑ گیا۔

اقبال یہ سب دیکھ رہا تھا۔ مگر اس نے شوکت سے کسی چیز کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا۔ وہ اپنے اندر اٹھنے والے سوالوں کے بوجھ سے دبا ہوا تھا۔ پھر وہ دونوں الگ چلتے اور کھیتوں میں گم ہو گئے۔

واپسی پر انہوں نے ڈھکی سے ہاتھ پاؤں دھوئے۔ اس کنارے یہ دونوں تھے۔ اس کنارے عورتیں پانی بھر رہی تھیں، کپڑے دھو رہی تھیں۔ اور نہا رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر چند عورتوں نے نہاتی ہوئی ننگی عورتوں اور ان کے درمیان دوپٹے تان دیئے لیکن دونوں نے چور نگاہوں سے ان جوان ننگے جسموں کو کئی بار دیکھا اور آگے بڑھتے رہے۔

اچانک شوکت نے کہا "یار ایک بات بتا۔" "کیا؟" اقبال نے چونک کر پوچھا۔ "کیا ہندوؤں میں یہ مانتے ہیں کہ روح دوبارہ جنم لیتی ہے؟" "ہاں۔ کیوں؟" شوکت بے ساختہ ہنسنے لگا ہے۔ "عجیب عقیدہ ہے کیسی روح بھی جنم لے سکتی ہے۔ جسم تو تم لوگ پھونک دیتے ہو۔"

"روح نیا جسم اختیار کر لیتی ہے۔" "کہیں جسموں کا بازار لگتا ہے کیا؟"

"اور تم مسلمان لوگ کیا سوچتے ہو موت کے بعد انسان کہاں چلا جاتا ہے؟"

"قبر میں۔ اور پھر حشر کے دن اس کے اعمال کا حساب ہوتا ہے۔ وہ خدا کے حضور میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور اس کے اعمال جنت یا جہنم میں لے جانے کے باعث بنتے ہیں۔"

"اور حشر تک اس کی روح کہاں رہتی ہے؟ جسم کو تو قبر کی مٹی چاٹ جاتی ہے۔ خدا کے حضور میں کیا پیش ہوتا ہے؟ جسم یا روح؟"

"چھوڑ یار کیسے کا معاملہ ہے۔ روح اور جسم کا رشتہ ہزار سر کھپانے پر بھی ہاتھ میں نہیں آنے لگا۔ سگریٹ کھینچے گا؟" شوکت کہا جاتا ہے "ہے تیرے پاس؟"

"نہیں۔ برکتو کو کہتے ہیں دیرکت کھتری بیٹے کی دوکان سے لے لیتے ہیں۔" "ان جب چھٹیوں میں آتا ہوں تو ایک دو ڈبی پاسنگ شو اور گیو لڑے لے آتا ہے۔"

ایک لمبے پر والا چھوٹا سا کیڑا اور گرد بیل مکئی کی فصل پر منڈلا رہا تھا۔

اقبال اسے دیکھ رہا تھا اور اس کی آواز کی گونج سن رہا تھا۔ اور دھیرے دھیرے شوکت کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔

گاؤں کی طرف جاتے ہوئے وہ طویلے کے قریب پہنچے۔ دلاور خان نماز ظہر سے فارغ ہو کر آ گیا تھا۔ اور اپنے ملازموں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ طویلے میں ایک گھوڑی کو گابھن کروائی جا رہی تھی۔ گھوڑے کو بمشکل تیار کر کے لایا جاتا۔ گھوڑی کے چاروں پاؤں جکڑے تھے۔ جب گھوڑا سوار ہونے لگتا تو کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہو جاتی۔ گھوڑی اپنی جگہ سے ہٹ جاتی یا گھوڑا اس کی پیٹھ پر سے پھسل جاتا۔ نہیں تو دونوں عضو مل نہ کھاتے۔ یہ عمل کئی بار دہرایا جا چکا تھا۔ لیکن کامیابی نہ ہو پا رہی تھی۔ دلاور خان بالکل جھلا گیا۔ اس نے گھوڑے کی پیٹھ پر چابک کا ایک بھرپور وار کیا۔ گھوڑا کانپ اٹھا۔ دلاور خان دہاڑا۔ "حرامزادے کی اولاد دنیا داری بھی نہیں آتی۔؟"

شوکت اور اقبال دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور پھر جھک کر دیوار کی اوٹ میں چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ (جاری)

بقیہ صفحہ ۱۶ ۔ روستا

نکال سکتا لیکن مجھے پھر یاد آ گیا کہ ایسا کرنے سے اس کی بدکرداری ثابت ہو جائے گی اور میں ایسا خاموش ہو گیا جیسے اس کے جانے سے مجھ پر کوئی اثر پڑنے والا نہیں

میں نے پوچھا کمرہ کہاں لیا... مل گیا...؟"

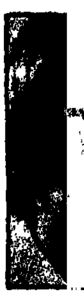
"یہیں تھوڑی دور پر۔"

اور زیادہ بات کرنے کی میری ہمت نہیں تھی۔ بس میں اس کو سامان پیک کرتا دیکھتا رہا۔ اور وہ سامان پیک کرتی رہی۔ سب سامان رکشے پر سوار کر کے بعد وہ میرے پاس آئی اور بولی۔ "میں تمہارے پاس آیا کروں گی۔ ہر تیسرے دن۔" شاید میری آنکھیں نم تھیں اسی وجہ سے میری نظریں جھک گئیں۔ میرے منہ سے ایک لفظ کا ادا ہونا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

وہ۔ پھر بولی "اپنے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کمرے سے اس کمرے میں ایسے ہی کٹے گی زندگی۔"

شادی کر لو۔ کم سے کم کپڑے تو نہیں بدلنے پڑیں گے۔ میں نے بمشکل تمام کہا۔ ہم دونوں کے بیچ مزید بات ہوتی کہ رکشا آ گیا۔ اب ہم تینوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے چند لمحے بعد رومانے بھرائے ہوئے لہجے سے "بائی" کہا اور چلی گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ جب اس گھر والوں کو اس کے عشق کی داستان معلوم ہو گی تو بیچ چوک کا وہاں سے بھی نکال دی جائے گی۔ کیسی عجیب دنیا ہے اس کے ساتھ ناسازگار حالات کی پیداوار غم روزگار کا مارا ہوا تنہائی میں اپنوں سے ہزاروں کیلو میٹر دور اس عورت کو کوئی پیار بھی نہیں کرنے دیتا۔ ... کاش ایسا ہوتا کہ مکان کے کرایے کے ساتھ محبت کرنے کا بھی کرایہ ادا کیا جا سکتا۔

نئے نام
نئے استعارے
۲



حمد غزلیہ

سلیم شہزاد

ریت دریاؤں کو آئینہ بنائے اللہ
آئینہ آب سے محروم کرے، آب ستارے کو سیاہی میں چھپائے اللہ

رنگ در رنگ مناظر پہ مسلط کرے شب ظلمت رنگ
اور شب دشت میں اک شمع جلائے اللہ

انا زیّنا کی تفسیروں میں
آسمانوں کو ستاروں سے (زمینوں کو چراغوں سے) سجائے اللہ

برق قندیل، شرر، چشم، گہر، اشک، ستارہ، جگنو
سارے الفاظ یہ روشن ہوں اگر ان میں کوئی موجۂ انوار بہائے اللہ

قُم باِذنِی وَانا رَبُّکُمُ الاَعلیٰ وَاقْرا کی جلا کر شمعیں
کبھی زیتون، کبھی طور و حرا میں نظر آئے اللہ

گائے کے سینگ پہ رکھی ہو، کسی ناگ کے پھن پر ہو کہ بہتی ہو کسی دریا پر
ہفت افلاک میں دھرتی کو گھمائے اللہ

کبھی تنکے کو ڈبو دے لیکن
کبھی سیلاب بلا بھی ہو تو کشتی کو تیرائے اللہ

ابر کیا، سبزہ دگل کیا، یہ ہوا کیسی ہے، کیسے یہ پری چہرہ لوگ
چار سُو پھیلے ہیں سائے اللہ

[illegible] لم یلد ولم یولد
[illegible] سوائے اللہ

◆

کوئی مشعل، نہ کوئی شمع، نہ قندیل کوئی
پھڑپھڑاتی ہے اندھیرے میں ابابیل کوئی
خشک و تر، زرد ہری فصل کعصف ماکول
اب کسی خواب سے چسپاں نہیں تاویل کوئی
غیر مربوط، گماں وصف، محرّف، مبہم
یعنی ہر شخص ہوا آیتِ انجیل کوئی
موج پہ، ریت پہ، پتے پہ، کہیں تو ہوگی
میرے یوں ٹوٹ بکھرنے کی بھی تفصیل کوئی
ریت میں، بازوؤں میں، خود میں یا پیڑ تلے
سر چھپائے ہوئے سب ہیں نہیں سر خیل کوئی

◆

دائرہ دائرہ وسواس میں دریا اترے
ریت دامن میں کبھی آب صحیفہ اترے
بہرے والوں کو ہے معلوم نہ پیاسوں کو خبر
خواہش آب کہ مجھ میں کوئی پیاسا اترے
ڈوبنے والے بہت، دیکھنے والے بھی بہت
کس کنارے سے یہ بپھرا ہوا دریا اترے
منتظر ہوں کہ مری کشتی گم گشتہ پر
شاخ زیتون لیے کوئی پرندہ اترے
چشم بے آب میں ٹھہرا ہوا بادل ہوں میں
اشک بن جاؤں تو احسان ہوا کا اترے

● ۳۲۳ منگلوار وارڈ، مالیگاؤں۔ ۴۲۳۲۰۳

سلیمان خمار

وہ شکستہ تھا، میں بھی ٹوٹا تھا
اس کا میرا عجیب رشتہ تھا

دوست تھا، دلربا تھا، کیا کیا تھا
وہ مری روح کا مسیحا تھا

اس کی آنکھیں نہیں دو مصرعے تھے
اس کا چہرہ نہیں صحیفہ تھا

ساتھ وہ تھا تو کتنے ساتھی تھے
اس سے بچھڑا تو میں اکیلا تھا

رُت ملن کی تو چار دن کی تھی
موسم ہجر عمر بھر کا تھا

ایک اک رات اک صدی سی تھی
ایک اک دن پہاڑ جیسا تھا

◆

نہ شام بھر تھی، نہ رات بھر تھی
وہ اک کسک تو حیات بھر تھی

افق افق تک پہنچ چکی ہے
وہ اک اداسی کہ بات بھر تھی

کہاں تلک دور جا گئے ہم
وہ اک صدا کائنات بھر تھی

لکھا تھا دیوار شہر پر یہ
کہ عافیت جنگلات بھر تھی

وہ ساتھ ہی کیا حیات جس کی
بس ایک دن ایک رات بھر تھی

وہ ذہن بھر سوچتا رہا تھا
کہ خودکشی بھی نجات بھر تھی

ہر ایک کوشش تھی رائیگاں سی
ہر ایک بازی کہ مات بھر تھی

وہ سارے رستوں سے آشنا تھا
ہر اک ڈگر حادثات بھر تھی

وہ ایک پہچان کی اذیت
فقط ہماری ہی ذات بھر تھی

◆

حیا بھی، آنکھیں بھی، وارفتگی بھی
بدن میں پیاس لب پر خامشی بھی

دریچے بند ہوں اچھا ہے لیکن
ضروری ہے ہوا بھی روشنی بھی

میں واقف ہوں تری چپ گوئیوں سے
سمجھ لیتا ہوں تیری ان کہی بھی

پہن لیں لمس کی آنچیں کسی دن
پگھل جائے یہ حد آخری بھی

کیا کرتی ہے سجدے مجھ کو ٹھوکر
مقدس ہے مری آوارگی بھی

تمہیں کھو کر بھی تم کو پا چکا ہوں
مرا حاصل مری لاحاصلی بھی

یہی اک موڑ تک آنا، بچھڑنا
یہی قسمت تمہاری بھی مری بھی

اظہر عنایتی

جو عظمتیں ہمیں پروردگار دیتا ہے
تو ریگزاروں میں ناقہ سوار دیتا ہے

کبھی اندھیروں میں جگنو کو ہم ترستے ہیں
کبھی وہ غار میں سورج اتار دیتا ہے

وہی جو بھرتا ہے کشکول ہم گداؤں کے
وہ بادشاہوں کو بھی افتخار دیتا ہے

کسی کے صبر کے لیتا تھا امتحاں کیا کیا
کسی کو بازوئے خیبر شکار دیتا ہے

کہیں نمائشیں کرتا ہے وہ نشیبوں کی
کہیں زمیں کو وہ کوہسار دیتا ہے

جدائیاں بھی وہ دیتا ہے ملنے والوں کو
تو ہمسفر بھی بڑے غمگسار دیتا ہے

وہ بھیجتا ہے کڑی دھوپ کے محاذوں پر
وہی شجر بھی ہمیں سایہ دار دیتا ہے

عطا کرے گا وہی خواب میری آنکھوں کو
وہ تتلیوں کو جو نقش و نگار دیتا ہے

منافقوں کو بھی دیتا ہے رزق وہ اظہر
خلوص کاروں کو بھی روزگار دیتا ہے

◆

غموں سے یوں وہ فرار اختیار کرتا تھا
فضا میں اڑتے پرندے شمار کرتا تھا
بچھڑ کے ایک ہی بستی میں دونوں زندہ ہیں
میں اس سے عشق تو وہ مجھ سے پیار کرتا تھا
بیان کرتا تھا دریا کے پار کے قصے
یہ اور بات وہ دریا نہ پار کرتا تھا
کل اپنی جان کو دن میں بچا نہیں پایا
وہ آدمی کہ جو آہٹ پہ وار کرتا تھا
یونہی تھا شہر کی شخصیتوں کو رنج اس سے
کہ وہ ضدیں بھی بڑی پروقار کرتا تھا
صداقتیں تھیں مری بندگی میں جب اظہر
حفاظتیں مری پروردگار کرتا تھا

◆

بچھڑ کے تم سے کچھ ایسے اداس ہوتے ہیں
کہ ہم کو دیکھ کے اب راستے بھی روتے ہیں
ذہانتوں کو کہاں وقت خوں بہانے کا
ہمارے شہر میں کردار قتل ہوتے ہیں
پلٹ چلیں کہ غلط آگئے ہمیں شاید
رئیس لوگوں سے ملنے کے وقت ہوتے ہیں
فضا میں ہم ہی بناتے ہیں آگ کے منظر
سمندروں میں ہمیں کشتیاں ڈبوتے ہیں
میں اس دیار میں ہوں بے سکوں برسوں سے
جہاں سکون سے اجداد میرے سوتے ہیں
گزار دیتے ہیں عمریں خلوص کی خاطر
پرانے لوگ بھی اظہر عجیب ہوتے ہیں

شمیم عباس

یہ جو دفتر مذاکرات کے ہیں
تذکرے تیری بات بات کے ہیں
آرزو، قرب، لمس، بوسہ، وصال
مرحلے سب تعلقات کے ہیں
لذتِ ہجر اور کربِ وصال
عقدے پیچیدہ نفسیات کے ہیں
تیرگی میں نثر سے نمائندے
چند جگنو تصورات کے ہیں
دم بخود صبح دور بیٹھی ہے
آج تیور عجیب رات کے ہیں

شاکی، بدظن آزردہ ہیں مجھ سے میرے بھائی یار
جانے کس جا بھول آیا ہوں رکھ کر میں گویائی یار

خاموشی کے صحرا چنگی میں آوازوں کے جنگل
کتنی بستی اجڑی ہم سے کتنی ہم نے بسائی یار

تنہائی میں اب بھی کوئی بالوں کو سہلاتا ہے
ہاتھ پکڑنا چاہیں تو ٹھٹھا مارے پروائی یار

آج اُسے پھر دیکھا جس کو پہروں دیکھا کرتے تھے
کچھ مدھم لب وہ بھی ہے کچھ منجھ گئی عیاں بینائی یار

اچھی بستی اچھا گھر اچھے بچے اچھے حالات
جس کے دیکھو سا تھ لگی ہے اک خواہش آبائی یار

فکر کی محفل سجتی تھی اور لفظوں سے یارانے تھے
تجھ کو زغے میں لینے کے کیا کیا خوب بہانے تھے
سر میں سودا اور ہی کچھ تھا تیرا ذکر بہانا تھا
نئے اچھوتے معنی رائج لفظوں کو پہنانے تھے
اپنی خاموشی کا ڈنکا اک عالم میں بجتا تھا
ایڑ لگائی گویائی نے ہم چت چاروں خانے تھے
میرا جرم وراثت تھا سوخوں تھوکا اور شعر کہے
کیا کیجے کہ پرکھوں کے عائد کردہ جرمانے تھے
عمر کھپائی خود کو جھونکا سب سرمایہ صرف کیا
آخر آخر جان پڑا ہم کھوٹ میں سولہ آنے تھے

جانے کون بھلا بیٹھا رویہ اپنا !
دونوں پٹ وا کیے رہتا ہے دریچہ اپنا
اب اگر کچھ بھی ہے عالم میں تو میں ہی میں ہوں
آنکھ اپنی ہے ہر اک سمت تماشہ اپنا
مصلحت کوشیٔ دنیا سے ہے جموو یا چل
موج در موج سمندر سا رویہ اپنا
زندگی ہم بھی ترے در پہ کھڑے ہیں کب سے
چھینا جھپٹی میں ملا ہم کو نہ حصہ اپنا
جاگتا ذہن قلم بولتا جیتے الفاظ
زندگی چھوڑ رہی ہے کہیں نقشہ اپنا

● اے ۲/۲ جلتے پرگتی'' ترن بھارت چکالہ اندھیری بمبئی ۹۹

واجد قریشی

◆

بے آب مر ہی جاؤں کوئی فیصلہ نہ دے
ے کار ریگ زار ابھی راستہ نہ دے

بڑھتا ہوں تیغ تیز لئے پھر اُسی طرف،
ڈرتا ہوں میرے سامنے وہ سر جھکا نہ دے

ہ ذائقہ زبان تو بے رنگ سے ہے لہو،
یرے روز و شب ہیں انھیں حوصلے نہ دے

یہ آگ جنگلوں کی طرح پھیل جائے گی
یہ آگ تیرے جسم کی گرمی بجھا نہ دے

ڈرتا ہوں اپنے "میں" سے بہت تُند رو ہے یہ
تیرے بغیر غم کے پتّا ہلا نہ دے

◆

معاملات کوئی اپنے سر نہیں رکھتا
وہ اپنے آپ کو کب بے ضرر نہیں رکھتا

تمام دشت و جبل، بحر و بر اُسی کے ہیں،
یہ واقعہ ہے کہ وہ اپنا گھر نہیں رکھتا

سبھی کے واسطے رکھے ہیں اُس نے دروازے
مگر وہ اپنے لیے کوئی در نہیں رکھتا

مسافتوں کی کڑی دھوپ اس کے ساتھ بھی ہے
اگرچہ پاؤں میں اندھا سفر نہیں رکھتا

مطالبات سرِ بزم چھوڑ آیا ہے،
وہ سخت جان ہواؤں کا ڈر نہیں رکھتا

◆

خط کشیدہ جسم پہ پتھر رکھے
جی رہا ہوں سر ہتھیلی پر رکھے

ڈال دی ہے آسمانوں پر کمند
اور امکانات مٹھی بھر رکھے

پھر ید بیضا نہ پیدا ہو سکا
لاکھ انگارے ہتھیلی پر رکھے

مشتعل ہوتا ہوا شہرِ جنوں
سینۂ ادراک پہ پتھر رکھے

سینۂ صد چاکِ گل جیسے کا فن
کیوں صدف اندر صدف گوہر رکھے

◆

جسم غائب ہے اور سر موجود
زندگی، تیغِ بے سپر موجود

اک مسافت کہ زیرِ پا ہے، ابھی
سامنے دوسرا سفر موجود

میں، کہ ہوں اک درخت بے سایہ
تو، کہ اک سایہ بے شجر موجود

اُس کی آنکھوں میں میرا غم پنہاں
میرے سینے میں اُس کا ڈر موجود

سر چھپانے کو قیدِ سایہ مگر
پاؤں دھرنے کو بحر و بر موجود

اگ۔۲۰ وائرلیس روڈ، ...کالونی، اوجین - ۴۵۶۰۰۱

احمد کمال پروازی

یہ سر نئے اسلوب کی بنیاد تو ہوگا
قائم کوئی میزان مرے بعد تو ہوگا

چلنے کو مرے پاؤں میں زنجیر تو ہوگی
رہنے کو مری پشت پہ جلّاد تو ہوگا

اِس کرۂ خاکی کو سمندر ہی بنا دے
دو حصّوں کی تقسیم سے آزاد تو ہوگا

جس وقت میں دکھی ہوئی خندق پہ کھڑا تھا
اُس ہاتھ کا برتاؤ تمہیں یاد تو ہوگا

اک روز تو برسیں گی مرے شہر پہ فصلیں
یہ خشک مقدر کبھی آباد تو ہوگا

◆

ہر لفظ سے تکلیف پُرانی نکل آئی
صندوق سے اک یاد دہانی نکل آئی

کب تک میں کواڑوں کو لگائے ہوئے رکھتا
دن اُگتے ہی احوال بیانی نکل آئی

اب تک مری دیوار پہ تنہائی نہیں رہتی
میں لوٹ کے آیا تو نشانی نکل آئی

ہم نے تو زمینوں میں دعا بوئی تھی لیکن
بے یار و مددگار کہانی نکل آئی

تیّاروں کے جس وقت قدم ڈوب رہے تھے
مٹّی کے چراغوں سے جوانی نکل آئی

◆

سمندروں کے غضب سے نباہ کیا کرتا
جہاز ڈوب گیا بادشاہ کیا کرتا

میں ننگے پاؤں تھا دنیا مرے دباؤ میں تھی
میں اپنے حال سے کم تر گناہ کیا کرتا

غموں کے سینکڑوں لشکر مری حمایت میں
مگر میں آخری لشکر تباہ کیا کرتا

تم ایک تخت نشیں تھے سلام کیا کرتے
میں ایک خاک بسر تھا نگاہ کیا کرتا

اندھیری رات مرے قتل سے نشانی تھی
یہ کارِ خیر کوئی بے گناہ کیا کرتا

◆

تم ایک غار میں ہو یہ دلیل تو ہوگی
سفر نہیں تو سفر کی سبیل تو ہوگی

کوئی تو نسل رکھے گی ہمارے نام پہ نام
ہماری عمر کسی دن طویل تو ہوگی

گو اس سے قبل بھی چاندی نہیں برستی تھی
مگر تمہارے زمانے میں جھیل تو ہوگی

ترے لئے تو ضروری ہے پیڑ کی چھاؤں
مگر یہ میرے سفر میں دخیل تو ہوگی

میں مانتا ہوں کہ اندیشے سائبان کی شکل
یتیم ہوگی مگر خود کفیل تو ہوگی

۶/۹، اہلیہ بائی مارگ، اوجین - ۴۵۶۰۰۶



شبیر آصف

◆

ہوتی ہے مخلصوں کی طرف ہی سے گھات بھی
ہم سائگی میں کٹ نہ سکی ایک رات بھی

رگ رگ میں تلخیِ غمِ موسم اتر گئی
مسموم ہوگیا گلِ شاخِ نبات بھی

دل میں چراغِ آگہی جلنے کی دیر تھی
روشن ہوئی نگاہ میں تاریک رات بھی

شب خون مارتی ہیں ہوائیں کہاں کہاں
گل ہو نہ جائے سہم کے شمعِ حیات بھی

آصف بساطِ وقت اُلٹنے کا غم نہیں
کھائی ہے شاہ کو ابھی پیادے سے مات بھی

◆

جب تک گذر نہ جائے کوئی اپنی جان سے
اُٹھتا نہیں حجابِ نظر درمیان سے

سانسوں کی رہگذر پہ سنبھلنا محال ہے
ہر دم گذرنا پڑتا ہے اک امتحان سے

آنکھوں نے کہدیا مرا مافی الضمیر کیوں
اک حرف بھی نکل نہ سکا جب زبان سے

ہر شخص پستہ قد نظر آنے لگا مجھے
دیکھا جو میں نے سمتِ زمیں آسمان سے

تم نے یہ سوچنے کی بھی تکلیف کی نہیں
کیوں کٹ کے رہ گیا ہے کوئی خاندان سے

◆

لہو کی آگ میں جلتی ہیں حسرتیں کیا کیا
ہمارے ساتھ لگی ہیں ضرورتیں کیا کیا

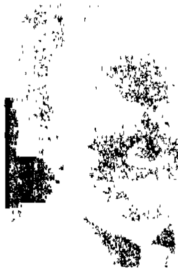
اب اعترافِ گناہ عین فرض ہے مجھ پر
مرے خلاف پڑی ہیں شہادتیں کیا کیا

دعا کے پھول بھی مرجھا رہے ہیں شاخوں پر
شجر پہ ٹوٹ رہی ہیں قیامتیں کیا کیا

خیال و خواب کی دنیا سے باہر آکر دیکھ
نظر اٹھائے کھڑی ہیں حقیقتیں کیا کیا

ہوا کے رخ پہ بھی جلتی ہے شمعِ بینائی
عطا ہوئی ہیں بشر کو بصارتیں کیا کیا

● ۲۱۸ م نیاپورہ، مالیگاؤں (مہاراشٹرا)



پروین کمار اشک

سینہ سینہ زخم لگاتے پھرتے ہو!
روز و شب تلوار چلاتے پھرتے ہو!
دنیا تو پہلے ہی آنسو آنسو ہے
تم کیوں اپنا درد سناتے پھرتے ہو!
اس کے عمل کا سوچ خود دیکھا ہے کبھی
بچوں کو اخلاق سکھاتے پھرتے ہو!
سامنے آؤ پانی میں چھپنے والو!
جلتی بستی آگ لگاتے پھرتے ہو
اک دن خود تم بھی بے گھر ہو جاؤ گے
گھر گھر میں دیوار اٹھاتے پھرتے ہو!
تم سے لپٹ کر اشک وہ رونا چاہتا ہے
تم جس شخص سے آنکھ چراتے پھرتے ہو!

◆

جب بھی خالی مکاں میں گھر کرنا!
ہو سکے تو مجھے خبر کرنا!
محسنوں کو خدا سمجھتے ہیں
ہم پہ احسان سوچ کر کرنا!
مجھ کو تفتیشِ دشتِ شب کا حکم
چاند خود آپ اِدھر اُدھر کرنا!
سرنگوں ہوں تو اچھے لگتے ہیں
پیڑ کوئی نہ بے ثمر کرنا!
دھوپ میں شمس شمس کی فریاد
سائے میں بھی "شجر شجر" کرنا!
بخشنا بحرِ حرف اور خود ہی
داستاں قطرہ مختصر کرنا!
چڑیا بھی گھر بدل رہی تھی اشک
اور مجھ کو بھی مت سفر کرنا!

◆

خیانت بدار ہو گیا ہوں میں!
میرے ہمسائے میں درد پلتے ہیں
دیکھو فن کار ہو گیا ہوں میں!
مثلِ دیوار ہو گیا ہوں میں!

قبر میں گھر بنا لیا میں نے
اک کمینے کی روٹیاں کھا کر
ہاں! زمیں دار ہو گیا ہوں میں!
سخت بیمار ہو گیا ہوں میں!

تجھ کو سوچا ہے اس قدر میں نے
تیز کردار ہو گیا ہوں میں!
خود مخالف ہوں اور حریفوں کا
کیوں طرف دار ہو گیا ہوں میں!

پھول سے جسم پر وہ ظلم ہوئے
اشک تلوار ہو گیا ہوں میں!

◆

درِ بینائی مقفل کر دے
جو نظر میں ہے وہ اوجھل کر دے

دنیا صحرا کی طرح پیاسی ہے
لے مرے آنسو تو جل تھل کر دے

برف ہو جائے گا سورج ورنہ
مرے سر پہ خدا آنچل کر دے

مجھ کو آ جائے مرے گھر کا خیال
رونقِ شہر کو جنگل کر دے

مسئلہ کیسے بنا یہ مت پوچھ
مسئلہ سب کا ہے تو حل کر دے

در داب تک جو ملے پھینکے
حادثہ وہ دے جو پاگل کر دے

روگ مت پال غزل کا اے اشک
تجھ کو یہ لڑکی نہ پاگل کر دے

کرشنا اسٹریٹ، پٹھان کوٹ۔ ۱۴۵۰۰۱

عین تابش

◆

قصۂ خواب ہوں حاصل نہیں کوئی میرا
ایسا مقتول کہ قاتل نہیں کوئی میرا

ہے بپا مجھ میں عجب معرکۂ سود و زیاں
اس لڑائی میں مقابل نہیں کوئی میرا

بہتا جاتا ہوں میں گمنام جزیروں کی طرف
وہ سمندر ہوں کہ ساحل نہیں کوئی میرا

ہے عجب بات کہ دشمن کا طرفدار بھی ہے
ایسا لگتا ہے کہ یہ دل نہیں کوئی میرا

روز دیتا ہے مرے سامنے اوروں کی مثال
اور کہتا ہے مماثل نہیں کوئی میرا

◆

ہر وفا اطوار اب کے بے وفا ہونے کو ہے
شہر میں یہ کیسا ہنگامہ بپا ہونے کو ہے

اس طرح ٹوٹا ہے قربت کا طلسم بے بہا
اب کہاں کوئی کسی کا آشنا ہونے کو ہے

اب کے موسم سانس لینا بھی گراں ہو جائے گا
اس قدر پھیکا لہو کا ذائقہ ہونے کو ہے

درد کا گنجینہ رستے میں لٹایا جائے گا
قرض یوں اس کی نوازش کا ادا ہونے کو ہے

وائے برآرائش زلف و لب و رخسار دوست
عکس رسوا آئینہ در آئینہ ہونے کو ہے

◆

مجھکو ناکردہ گناہ کا معترف ہونا پڑا
رسم ایسی بھی کہ خود سے منحرف ہونا پڑا

کوئی بھی مجھ سا نہ تھا بیباک بزم شوق میں
اس طرح مجھ کو سبھوں سے مختلف ہونا پڑا

ایک ہی شے تھی کہ جس پر بچ رہا تھا اعتماد
پس مجھے اپنی انا سے مستعفی ہونا پڑا

وہ یقیناً راز اندر راز تھا لیکن اسے
ایک دن مجھ ناتواں پر منکشف ہونا پڑا

کیا بتاؤں معبد تنہائی میں مجھ رند کو
عمر بھر کے واسطے کیوں معتکف ہونا پڑا

◆

تابش! یہ بھلا کون سی رت آئی ہے جانی
صحرا میں کوئی ریگ نہ دریا میں ہے پانی

خلوت کدۂ دل پہ زبوں حالی بسیار
ہے صورت گنجینۂ الفاظ و معانی

ہر چند ہوئی اس کے عوض دل کی خرابی
کیا کہیئے کہ بڑھتا رہا شوق ہمہ دانی

مجھ سے میری روتی ہوئی آنکھیں تو نہ چھینو
رہنے دو مرے پاس میری کوئی نشانی

دیوار و در و بام کی ویرانی نے اکثر
رو رو کے کہی موسم رفتہ کی کہانی

شعبۂ انگریزی، مرزا غالب کالج، گیا (بہار)

شاہد عزیز



پرندہ کیوں بھٹکتا ہے

پرندہ آسمانوں سے اتر کر
خواہشوں کے ...
سرد جنگل میں بھٹکتا ہے
پرندہ کیوں بھٹکتا ہے ؟
سمندر دور تک پھیلا ہُوا
اک اجنبی سایہ
مجھے آواز دیتا ہے
مگر کوئی نہیں سنتا
جزیروں کی صداؤں کو
کہاں تک بھاگتے لمحوں کو
کوئی روک سکتا ہے
سمندر سوکھ جائے گا
وہی اک زرد سایہ چاروں جانب پھیل جائے گا
پرندہ دھیرے دھیرے
سارا منظر بھول جائے گا
مگر کوئی نہیں سنتا جزیروں کی صداؤں کو
ہوائیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں
جانے کن زمینوں کو

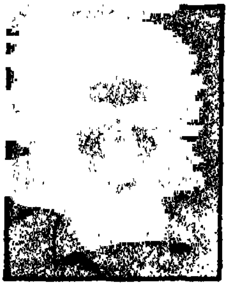
وہ کون ہے

وہ میرے شہر کی اندھی گلی سے واقف ہے
وہ جانتا ہے یہ رستہ کہاں پہ جائے گا
وہ آئے گا تو اُجالے بھی ساتھ لائے گا
گذرتا ہے کبھی سُورج کے پاس سے ہوکر
اترتا ہے کبھی تاریک رہ گذاروں میں
بھٹکتا ہے کبھی تنہائیوں کے جنگل میں
وہ کون ہے جو میرے جسم میں اترتا ہے
وہ کون ہے جو میرے سینے میں دھڑکتا ہے
وہ کون ہے جو میرا جسم چھوڑ جاتا ہے
وہ کون ہے میں کس کی جستجو میں ہوں ؟

◆

تمام دشت میں اُس نے گھما دیا مجھکو — جگہ جگہ پہ سمندر دکھا دیا مجھکو
لڑا دیا مجھے کالی ہواؤں سے اس نے — گذرتی رات کا سایہ بنا دیا مجھکو
پھر آسمان کو شاید زمین مل جائے — اس انتظار کی حد پہ بٹھا دیا مجھکو
میں بھاگ نکلا بدن کے حصار سے لیکن — وہ کیسی آگ تھی جس نے جلا دیا مجھکو
مرے وجود کو دھرتی میں گاڑ کر اس نے
نہ جانے کون سا پیکر بنا دیا مجھکو

● ١٧٩- ملہا تلائی، اودے پور- ٣١٣٠٠١



ریاض لطیف

وقت کی لاسمت گلیوں سے نکل کر لاپتہ
ان گنت کھوئی ہوئی صدیوں کے تیور لاپتہ
کس مسلسل جنگ کی گہرائیوں میں نقش ہے ؟
اِس ہوا کے اس طرف لمحوں کا لشکر لاپتہ
موج کے چہرہ پہ ڈھا کر خشک ساحل کا لہو
کشتیوں کی کوکھ میں پلتا سمندر لاپتہ !
اپنے اندر کا سفر کس تہہ میں آخر دفن ہو ؟
ہر طرف گردش کی جنبش اور محور لاپتہ
بس حرارت کا کھنڈر ہے بے خبر ماحول میں
جسم کی تعمیر میں جذبوں کا پتھر لاپتہ
یہ بھی اپنی تنگ دامانی کا اک اظہار ہے
آسماں کے شہر میں سرحد کا پیکر لاپتہ
ساعتیں، صدیاں، تمدّن منتظر میرے ریاضؔ
اور اک میں ہوں کہ خود اپنے ہی اندر لاپتہ !

◆

نئی پرواز ویرانی
ہر اک آغاز ویرانی

خوش آہنگ انکشافوں میں
خلا کا ساز ویرانی

ہوا خالی، نمو تیری
تری پرواز ویرانی

شفق کا ٹوٹنا گم صم
ترا اعجاز ویرانی

بدن گنبد سماعت کا
فضی آواز ویرانی

نفی اظہار ہے تیرا
تیرا انداز ویرانی

◆

سانس کی اس رائیگانی میں گزر اوروں کا ہے
ہے روانی کا بھرم مجھکو سفر اوروں کا ہے !
کن دراروں میں رکھوں اب اپنے ہونے کی صدا
میں بھٹکتی گونج ، دنیا کا کھنڈر اوروں کا ہے
کس لئے پھیلوں ، کہاں تک خود کو دہراؤں کہ جب
آج کی ہر شاخ پیر گل کا ثمر اوروں کا ہے
بحر امکاں ، میری گردش کی بیابانی سمجھ
میں تو کشتی کا تماشا ہوں بھنور اوروں کا ہے
اس لئے شاید بھٹکتا ہوں خود اپنے آپ میں
جسم کی بکھری ہوئی دنیا میں گھر اوروں کا ہے
اے ریاضؔ ایجاد کر خود ہی میں اک سورج نیا
آسماں کی کوکھ میں جو ہے شرر اوروں کا ہے

● ۳۰۔ ڈانڈی گراس رِل، کالوپور، احمد آباد ۔ ۱

◆

جسم کی ریت فراواں بھی نہیں
کیسا صحرا ہے کہ ویراں بھی نہیں

ہم زمانوں کی اٹھا لائے ہیں
اور یہاں کھیل کا امکاں بھی نہیں

جانے اب کیسے ملیں گے خود سے
اپنے اندر تو بیاباں بھی نہیں

ٹوٹے گنبد میں نہیں گونج کوئی
زخم تہذیب نمایاں بھی نہیں

ہم نے صدیوں سے چھپایا خود سے
اپنا وہ راز جو پنہاں بھی نہیں

ہم نے اوڑھی ہے سرابوں کی قبا
اور یہ دنیا ہے کہ عریاں بھی نہیں

رائیگاں موج ابھرتی ہے ریاضؔ
بحر امکاں میں طوفاں بھی نہیں

شبنم وحید

◆

خوشبوؤں سے مری ہر سانس کو بھر دیتا ہے
موسمِ گل ترے آنے کی خبر دیتا ہے
مجھ سے ملتا ہے مگر تیز ہواؤں کی طرح
ہر قدم پر مجھے جو شوقِ سفر دیتا ہے
بھر گئی ہے مرے دامن کو ندی کی اک موج
لوگ کہتے ہیں سمندر ہی گہر دیتا ہے
خامشی مہر لگا دیتی ہے ہونٹوں پہ مرے
اس طرح بھی وہ رفاقت کا ثمر دیتا ہے
اور بھی عمر بڑھا دیتا ہے میری شبنم
میرا سورج مجھے جب سیلِ شرر دیتا ہے

◆

کسی کی منتظر اب دل کی رہگزار نہیں
مگر مجھے تو کسی طرح بھی قرار نہیں
گلاب کیسے کھلے دشتِ آرزو میں کوئی
یہ سرزمین ابھی واقفِ بہار نہیں
سمٹ گیا تھا مرے بازوؤں میں رات گئے
یہ آسمان مری طرح بے کنار نہیں
تری نظر نے کھلائے مری نظر میں گلاب
خود اپنے آپ پہ موسم کو اختیار نہیں
لہولہان مری انگلیاں یہ کہتی تھیں
کسی چٹان میں اب کوئی آبشار نہیں

◆

کھنڈر میں وقت کے تنہا خموش بیٹھی ہوں
گزرتے لمحوں کے قدموں کی چاپ سنتی ہوں

مرے وجود کو دامن سے جھاڑنے والے
جو تیری منزلِ آخر ہے، میں وہ مٹی ہوں

میں کیا بتاؤں کہ کیا شے ہے چہرۂ ساحل
کہ میں تو صرف کھلے پانیوں کی کشتی ہوں

جو سوچیے تو قیامت کا شور ہے مجھ میں
جو دیکھیے تو فقط اک اجاڑ بستی ہوں

بلاتی ہے مجھے کرنوں کی رہگذر شبنم
بس ایک پل کے لئے برگِ گل پہ ٹھہری ہوں

◆

نئی بہار کا تھا منتظر چمن میرا
جو اس کا لمس ملا کھل اٹھا بدن میرا

خبر نہیں مری تنہائیوں میں رات گئے
نہ جانے کون بھگوتا ہے پیرہن میرا

مرے وجود کو چھو لے مجھے مکمل کر
ترے بغیر ادھورا ہے بانکپن میرا

ہر اک محاذ پہ مجھکو شکست دی اس نے
اگرچہ چارسو لشکر تھا خیمہ زن میرا

اب اس کے سامنے جاؤں تو خاک اڑاتی ہے
وہ دن گئے کہ تھا آئینہ ہم سخن میرا

● معرفت عبدالوحید خان ۲۸/۱۱ طلاق محل، کاسہ تھانہ روڈ۔ کانپور (یوپی)

مکتوب

ایم۔ جمال علوی ۔ ۹۹/۲۹۹ ۔ ایچ ۔ کا۔ آشیانہ، پرانا
نخاس لکھنؤ ۳

آٹھویں شمارے میں تحریر کردہ عالمی کانفرنس پر اداریہ بر وقت پر محل اور خوبصورت ہے۔ بساط سخن اور میرے الفاظ واپس دے دو۔ اختصار و تفصیل سے ایک ہی موضوع پر دو تحریریں حرف خود کو دوہرانے کے مترادف ہیں۔ ندا فاضلی کی عصمت آپا بھی طور پر ایک اچھی کاوش ہے۔ جتنی بھی غزلیں ہیں فن تو ہے، نیا پن نہیں ہے۔ مہتاب حیدر کے جدید قافیہ " ہیشانی" کی داد دیئے بنا چارہ نہیں ہے۔ یوں بھی ایطائے خفی و جلی کا تو ذکر ہی کیا، آج کل فن سے واقفیت ہی ضروری نہیں رہ گئی ہے۔ علاوہ ازیں اس ادبی آزادی، بے الفاظ دگر گمراہی کے جدید دور میں آپ کسی بھی لفظ کی گردن جس طرح چاہیں مروڑ سکتے ہیں۔ یعقوب راہی کے یہاں چند شعر قابل تعریف ہیں۔ احتشام اختر اور آشفتہ چنگیزی سے بھی ذوق سخن کی تسکین تو نہیں ہوئی لیکن اس حد نظر پھیلے ہوئے سراب میں پانی کے چند قطرے ہی غنیمت لگے۔ بلراج کومل بھی بس ٹھیک ہیں۔ ساجدہ زیدی نے البتہ کسی قدر مایوس کیا ہے۔ دھنک رنگ میں پنہاں اور آصف اظہار علی کے علاوہ تمام غزلیں ناقابل توجہ ہیں۔

" چھدر دروازے " افسانے کے بجائے مجذوب کی بڑ معلوم ہوتا ہے۔ ذہن میں جو بھی آتا جائے اسے تحریر کر دینا اور مختلف خیالات کا ایک تحریری کھچڑا پکا دینے کا نام ہی اگر جدید افسانہ نگاری ہے تو ایسے افسانے کو بہت دور سے سات سلام۔ ملاحظہ البتہ کسی قدر افسانوی رنگ لئے ہوئے ہے۔ آنکھیں اور پنجرے بھی ایک غنیمت کوشش ہے بقید حیات، خواہ مخواہ کی لفاظی اور منتشر اظہار خیال کا ایک نمونہ ہے۔ فن ۔ مشاعرہ چلانے کا بھی بس گزارہ ہے۔ منظومات کی جانب خصوصی توجہ دیں۔ جدید افسانے نگاری میں سوائے بیزاریت کے اور کچھ بھی پیدا کرنے سے قاصر ہیں۔ جن میں ماسوا الجھے ہوئے خیالات، بے جا لفاظی اور محدود موضوعات کے علاوہ اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ عصمت چغتائی کا کئی بار کا پڑھا ہوا افسانہ، اس گھٹے گھٹے، بوسیدہ ماحول میں ایک عنبر بیز اور فرحت افزا جھونکے کے مترادف ہے۔

شاہد اختر ۔ ۲/۲۲۴ جوہی لال کالونی، کانپور ۲۰۸۰۱۰

شاعر شمارہ نمبرہ میں عصمت چغتائی پر آپ کا اور ندا فاضلی کا مضمون بہت خوب ہے لیکن اسی شمارے میں عارف اقبال کا افسانہ " آنکھیں اور پنجرے " پڑھ کر مجھے بہت افسوس ہوا گو کہ عارف میرے دوست ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ افسانہ (جہاں تک میں جانتا ہوں اگر یہ افسانہ ہے تو میرے لئے اطلاع ہے) شاعر جیسے ادبی رسالے کے لئے تو ہرگز نہیں تھا۔ سریندر پرکاش کے فسان میں مزا آ رہا ہے دلچسپی برقرار ہے۔

ایم ۔ اے ۔ شاد ۔ ۱۰/۲ (پی ڈی ملے) کوہ فزا، بھوپال

شاعر کے گزشتہ عصمت چغتائی نمبر کی اشاعت پر مبارکباد قبول کیجئے۔ آپ کا مضمون " میرے الفاظ مجھے واپس دے دو" مطلعے کی چیز ہے۔ آپ نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ خانوادۂ سیماب کا کوئی اہل قلم اگر میدان نثر میں اپنے اشہب قلم کو مہمیز دیتا ہے تو اس کی برق رفتاری نظم سے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ آپ کے اداریئے دراصل اپنے اسلوب کے اعتبار سے انشائیوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ بہت بہت مبارکباد۔ غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ خاصے کی چیز ہے۔ زندہ رسالوں میں ایسی بحثیں نہ صرف اپنے وجود کا اعلامیہ ہوتی ہیں بلکہ سوچنے والے ذہنوں کو غور و فکر کے لئے کافی مواد فراہم کرتی ہیں۔ آپ نے سمت کا تعین کر دیا ہے۔ اب تو رہروان جادۂ ادب کا کام ہے کہ وہ اپنے ذخیرۂ علم سے کچھ گوہر فکر و خیال عام قارئین کے لئے بھی فراہم کریں۔

اظہر افسر ۔ چندن پرنٹرس، پرنس مارکیٹ، لاڈ بازار، حیدرآباد

ندا فاضلی سے عصمت چغتائی پر ایک اور عمدہ مضمون کی امید تھی۔ شاید انھوں نے جلدی میں یہ مضمون لکھا ہے پھر بھی ان کے منفرد اسلوب میں عصمت پر یہ اچھا مضمون ہے۔ آپ کا عنوان " میرے الفاظ واپس دے دو" بہت اچھا ہے۔ سریندر پرکاش کا ناول " فسان " اب بھی سمجھ سے باہر ہے آپ خواہ مخواہ شائع کئے جا رہے ہیں۔ غزلوں کا انتخاب اچھا ہے۔

عتیق احمد ۔ شعبۂ انگریزی، جناح گورنمنٹ کالج، کراچی، پاکستان

عصمت چغتائی صاحبہ کے بارے میں آپ کے لکھے ہوئے کوائف بہت مفید اور کارآمد ہیں۔ بہت سی باتوں کا پہلی بار علم ہوا۔ ابھی تک یہ لکھا جاتا رہا تھا کہ " گیندا " ان کا پہلا افسانہ تھا۔ جو غلط ثابت ہوا۔ جائے پیدائش بھی لوگوں نے غلط مشہور کر رکھی تھی۔ اس کی بھی تصحیح آپ نے کر دی۔ آپ کا مضمون بہت مختلف اور بحث طلب ہے۔ ندا فاضلی کا مضمون خاصے کی چیز ہے۔ بہت اچھا لگا۔ خاص طور سے بین السطور میں درد مندی اور لگاؤ کا احساس ابھرتا ہے وہ ندا صاحب کے سادہ اسلوب میں ان کی تخلیقی رویئے میں خلوص اور دیانت کی دلیل بن جاتا ہے۔

بحیثیت مجموعی شاعر آپ کی انتھک محنت اور لگن کے سہارے مسلسل ترقی کر رہا ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین میں بھی خاص سلیقہ اور جدت نمایاں ہے۔ مبارکباد۔

عبدالقوی دسنوی ۔ ۲۰۔ پرنس کالونی، نعت پورہ، عیدگاہ بازو بھوپال

نیا شاعر ملا۔ عصمت چغتائی کے متعلق مفید تحریریں آپ نے یکجا کر دیں، اچھا کیا۔ آپ کا نصف اداریہ اچھا ہے لیکن بقیہ نصف کے لئے کافی انتظار کرنا ہوگا۔

ایک دور تھا زمینداری کا۔ کسان محنت کرتا تھا، زمیندار اس کی محنت کا پھل کھاتا تھا۔ آج اردو کے خدمت گزار محنت کر رہے ہیں اور تکلیفیں اٹھا رہے ہیں اور اردو کے سوداگر اپنی تجارت کو فروغ دے رہے ہیں۔ خدا خیر کرے۔

نامی انصاری ۔ ۱۱۷ ب صاحب کا احاطہ، سول لائنز کانپور

شاعر کا شمارہ نمبر ۸ کا یادگار رنگ سرورق بہت معنی خیز ہے اور آپ نے ان کی شخصیت کا جو لفظی مرقع کھینچا ہے وہ ان کے مکمل تعارف کے لئے کافی ہے۔ شاعر کو یہ کریڈٹ بھی جاتا ہے کہ اس نے عصمت چغتائی کے انتقال کے فوراً بعد ہی ان کے فن اور شخصیت پر خاصہ مواد پیش کر دیا ہے۔

احمد سہیل 3125 KERMATH DRIVE
SAN JOSE • CA 95132
U • S • A

شمارہ نمبر ۸ میں آپ کا اداریہ پسند آیا۔ یوں کہ یہاں امریکہ میں پاکستان ۔ ہندوستان سے جس قسم کے شاعر آتے ہیں، خدا ان سے بچائے۔ موقع ملے تو اس سنجیدہ موضوع پر بھی اداریہ لکھئے۔ ان سے اردو شعر و ادب کو سب سے بڑا خطرہ لاحق ہے۔

سلیم شہزاد ۔ ۲۲۳ ۔ سنگوار روڈ، مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳

شاعر کے نئے شمارے کی رسید دے چکا ہوں جس میں عصمت چغتائی پر تمہارا مضمون ہے جو اگرچہ نامکمل ہے لیکن بہت سی باتوں میں خاصی تکمیل کا حامل نظر آتا ہے مثلاً تم نے مرحومہ کے متعلق لگی لپٹی کوئی بات نہیں کہی جیسا کہ اور ناقدین کہہ رہے ہیں۔

انیس رفیع ۔ ۲۰ سی، سدرہ اپارٹمنٹ، سیکٹر ۱۳، روہنی دہلی ۔ ۸۵

اردو افسانے کی خاتون اول عصمت چغتائی پر آپ کے اور ندا فاضلی کے مقالے پڑھے۔ ندا فاضلی نے جہاں ان کے باغی ادبی اور تہذیبی رویے کی پرزور حمایت کی ہے وہاں آپ نے محتاط رویہ اپنایا ہے۔ جس سے پتہ یہ چلتا ہے کہ عصمت کی فنکارانہ عظمت کے تو آپ قائل ہیں مگر ان کے سماجی اور (ذاتی) رویئے سے متعلق آپ کے کچھ [illegible] ہیں۔ میرا خیال ہے جس طرح ندا فاضلی نے کھل کر بات کہی ہے آپ کو بھی صاف صاف بات کہنی تھی تاکہ عصمت کے بارے میں سوچ کے جو دونوں دھارے ہیں وہ سامنے آ جاتے۔

ریڈیو پاکستان میں پوسٹنگ کے دوران اردو کی دو بڑی خاتون افسانہ نگار عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر سے تفصیلی ملاقات کا موقع ملا۔ عصمت چغتائی ۱۹۸۲ء میں سندھی ادبی اردو اکاڈمی کی شام افسانہ میں شریک ہونے آئی تھیں۔ ان دنوں وہ ان کی بھتیجی طاہرہ نیازی کے یہاں تھیں۔ قیام ان کے گھر تھا میں اکثر شام وہاں پہنچ جاتا۔ ان سے گپ کرتا۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگیں " انیس میاں عشق وشق کرتے ہو " میں تو آپکی عصمت آپا بھی کہنے کی جرأت رکھتا تھا اور وہ اس طرح بے تکلف ہو گئیں تو میں گھبرا گیا۔ طاہرہ نیازی مسکرا رہی تھیں۔ میں ان کے اس طور سے واقف نہ تھا۔ گھبراہٹ میں کوئی جواب نہ دے سکا جب تک ان کا دوسرا فقرہ آ گیا۔ " اگر عشق نہیں کیا تو پھر تم شاعری کیسے کرتے ہو۔" [illegible]

پھر کہیں واہو۔ مگر ریڈیو کی مصروفیتوں نے ملاقاتیں ہی کم کر دیا۔ ان کی بے باکی اور بے تکلفی دو ملاقات کو جیسے برسوں کی ملاقات بنا دیتے۔

قرۃ العین حیدر رام کرشنا مشن کلکتہ میں لیکچر دینے آئی ہوئی تھیں۔ مبین رشید (جو آج کل آئی۔جی پولس ہیں) کا گھر بالکل سامنے ہے۔ قیام کے دوران وہ اکثر شام ان کے یہاں آجاتیں۔ کم از کم دو بار وہاں ان سے ملاقات رہی۔ میں ان میں "پوم پوم ڈارلنگ" والی قرۃ العین حیدر تلاش کرتا رہا۔ وہ کہیں سے وہ نظر نہ آئیں۔ زہد و تقویٰ کی باتیں، روحانی باتیں پروقار تہذیبی ورثہ کی باتیں۔ "تم نے اپنی بیٹیوں کو اردو کیوں نہیں پڑھائی، قرآن کیوں نہیں ختم کرایا؟" مبین رشید کو ڈانٹتیں جاتیں۔ میں نے ان سے سوال کیا کہ ایک زمانے میں ترقی پسند حضرات آپ کو بے حد WESTERNISED ہونے پر "پوم پوم ڈارلنگ" کہا کرتے تھے اور آج آپ اردو اور ٹیاریج کے امام بائٹسہ کی خستہ حالی پر ماتم کناں ہیں: وہ جیسے بدک گئیں بولیں۔ ترقی پسندوں کے لئے تو منھ سے اول فول نکلتا ہے مگر کیا کروں آج کل مرید ہو گئی ہوں۔ ۴۲ برس کے ہیں پیر صاحب۔ مبین رشید نے کہا۔ "عینی آپا میں بھی تو ۴۲ برس کا ہوں یہ رہا میرا ہاتھ۔" پھر ڈھیر ساری باتیں ہوئیں ادب کلچر اور مٹی کی لو شبو پر۔ عصمت اپنے فطری رویے میں بے باک رہیں جبکہ قرۃ العین حیدر لگا مراجعت کر رہی ہوں۔ اور میں سمجھتا ہوں فن کاروں کے یہ دونوں رویے نامناسب نہیں۔

اس شمارے میں۔ فسان۔ کے علاوہ آشفتہ چنگیزی کی غزلیں تازہ دے گئیں۔ خوب تیسرے ہیں۔ مشتاق انجم کی کہانی۔ تقید حیات ان کے خوش آئند ادبی مستقبل کی طرف اشارہ ہے۔

خالد مشیح ۔ ۸۔ الکرا سوسائٹی، میاں محمد ربیع روڈ، کراچی (پاکستان)

حال ہی میں مجھے عصمت چغتائی پر شاعر کا شمارہ ملا ہے خوشی ہوئی۔ وہ بہت ہی بڑی افسانہ نگار تھیں۔ اپنے وقت کی ذہین ترین اور انقلابی خاتون۔ میں سمجھتی ہوں آج کل جتنی بھی آزادیٔ نسواں کی تحریکیں چل رہی ہیں ان کا سرچشمہ آپ تھیں۔ میں ان کی پرانی مداح ہوں جب پاکستان آئیں تو ہمارے کالج بھی مدعو کی گئیں۔ میں نے ان پر مختصر مضمون پڑھا۔ کافی اچھی اور دلچسپ نشست رہی۔ ان کے انتقال کی خبر جان کر بہت ہیرت اور افسوس ہوا۔ ایسے طوفانی لوگوں کا ذہن الٹ پلٹ ہو ہی جاتا ہے۔

رفیق انجم ۔ محلہ رتن پورا، ادھماؤلی چہرہ (بہار)

شاعر کا تازہ شمارہ ۸ نظر سے گذرا۔ بساطِ سخن کے تحت عصمت چغتائی کا خاکہ پسند آیا۔ دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ آپ کی تحریر و تدوین کا معیار بہت اعلیٰ ہے۔ آپ نے اپنے اداریہ میں حالیہ دور کانفرنس سیمینار اور مشاعرے کے سلسلے میں جن خیالات اور تاثرات کا اظہار کیا ہے میں ان سے متفق ہوں۔ مٹھی بھر لوگ چھکے دار بنے ہوئے ہیں۔ وہ اردو کے بہی خواہ نہیں بلکہ اپنی ذات کے لئے ایسے لوگوں کے خلاف آواز اٹھانے کی ضرورت ہے اور آپ نے

ہے۔

مضمون۔ عصمت آپا۔ سوانحی مزاج کا ہے جو شخصیت کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ سوانحی سطح پر ان کی انتقار کو بہت باکمال انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ مضمون عصمت آپا کی بہت حد تک تحلیل نفسی بھی ہے تر طرز روکھی اور بے باک زبان استعمال کرنے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ عصمت آپا کا فن بھی اس مضمون سے اجاگر ہوتا ہے لیکن بہت زیادہ نہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ مضمون عصمت آپا کی خدمت میں خراج عقیدت ہے یا صرف سرسری تذکرہ حالانکہ عصمت آپا کے حالات اس طرح بیان کئے گئے ہیں جیسے کہ ندا فاضلی عینی شاہد ہوں۔ بہرحال یہ مضمون BIOGRAPHY کی مختصر چھانہ پر بہترین مثال ہے۔

آپ کا مضمون۔ میرے الفاظ واپس دیدو۔ ندا فاضلی کے مضمون سے مختلف ہے اس کا تعلق عصمت آپا کے فن سے زیادہ ہے، شخصیت سے بہت کم۔ مضمون اعلیٰ معیاری متنوع اور معنی خیز MEANINGFUL ہے۔ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ بہت سے سوالوں کا جواب لکھ جاتا ہے جو عصمت آپا کے بھرپور ASSESSMENT کے لئے اشد ضروری ہیں۔ ظاہر ہے وہ ایک TOPICAL WRITER وقتی مصنف ہیں۔ یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ ان کے یہاں ابدیت ہے کہ نہیں۔ ان کے یہاں مشاہدات ہیں لیکن وہ کیا ان سے آگے جا سکیں۔ عصمت آپا کے یہاں SEX کا وہ اسکیل اور DIMENSION نہیں ہے جو ڈی ایچ لارنس، نابوکوف اور جان اپڈائک کے یہاں ہے ان کے یہاں SEX کا سماجی پہلو ہے تا انصافی کے خلاف غم و غصے کا پہلو ہے بہرحال میں آپ سے سو فی صد متفق ہوں کہ عصمت آپا کے فن کی پرکھ ابھی باقی ہے۔

ساجدہ زیدی ۔ گل برگ، دودھ پور، علی گڑھ،

شاعر کا شمارہ ۸۔ جلد ۶۲ میں آپ کا اداریہ پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ ہر نکتہ بلکہ ہر لفظ حق گوئی کا مظہر ہے یونہی بے نقاب کرتے رہیئے غلط چہروں کو۔ ہم سب ہمنوا ہیں۔

شاعر کا شمارہ ۸ مئی ۱۹۹۱ء۔ جلد ۶۲۔ میں میری جو دو نظمیں شامل ہیں ان میں کئی غلطیاں در آئی ہیں اور معنی خبط ہو گئے ہیں۔

• پہلی نظم کا عنوان۔ "عجب بالا نیز مرحلہ تھا" ہے۔ "صبح صادق" نہیں جو سہواً چھپ گیا ہے۔ صبح صادق میری دوسری نظم ہے نہ معلوم یہ غلطی میری ہے یا آپ کے پاس موجود نظموں میں گڑبڑ ہو گئی بہرحال اس کی تصحیح ضروری ہے۔

• پہلی نظم۔ پانچویں سطر۔ "حد آخریں تک" ہے۔ غلطی سے "تہ آخریں" چھپ گیا ہے۔

• نویں سطر۔ "نہ پائے رہ آخریں میں لغزش" ہے غلطی سے "رہ آخریں" چھپ گیا ہے۔

• دوسری نظم۔ چھٹی سطر۔ "بے بستہ" کی جگہ۔ "یک بستہ" چھپ گیا ہے۔ یہ سب غلطیاں بہت فاش، اور مفہوم کے لئے بہت تباہ کن ہیں تصحیح شائع کر کے ممنون فرمایئے۔

شمارے کے اکثر مشمولات اچھے ہیں

[مسودے میں نظم کا عنوان "صبح صادق" ہی درج ہے دیگر اغلاط کے لئے ادارہ معذرت خواہ ہے۔]

ارشد کمال ۔ ۲۷۴۳ تبلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

شاعر کا شمارہ ۸ موصول ہوا۔ اداریہ بہت ہی بے باک ہے اس طرح دو ٹوک انداز میں اظہار رائے کا حوصلہ بہت کم لوگوں کو ہے۔ میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیں۔ عصمت چغتائی پر ۱ کا مضمون بھی خاصہ تجزیاتی ہے، البتہ تحریر میں کہیں کہیں تسلسل کی کمی کا احساس ہوتا ہے (شاید اس لئے کہ یہ مضمون ایک طویل مقالہ کا محض اشاریہ ہے)۔ بہرحال آپ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اگر عصمت کے افسانوں میں جنسی بے باکی نہ ہوتی تو شاید وہ اتنی مشہور افسانہ نگار نہ ہوتیں: ـــــ بلا شبہ انسانی زندگی میں جنس بھی ایک اہم موضوع ہے، لیکن کیا یہ اتنا ہی اہم ہے کہ ایک بلند پایہ افسانہ نویس زندگی کے دوسرے موضوعات سے منہ موڑ کر اسی موضوع کو اپنا محور بنا لے۔ اور اگر وہ ایسا کرتا ہے تو کیا اس کا شمار صفِ اول کے افسانہ نویسوں میں ہونا چاہیئے کمینہ نسٹوں نے زندگی کے بنیادی اقدار کو پس پشت ڈال کر محض حصول معاش کو اپنی تصویری کا نیوکلیس بنایا تو اس کا جو حشر ہوا ہم لوگوں کے سامنے ہے!

عصمت کی افسانہ نویسی سے بحث کرتے ہوئے آپ نے (اور بیشتر دوسرے ناقدین نے بھی) ان کی "جنسی بے باکی" کا ذکر کیا ہے۔ بلکہ سراہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ عصمت کی تحریر سے بیباکی نہیں۔ ذہنی دیوالیہ پن کی بو آتی ہے، کیونکہ بیباک تو وہی ہو سکتا ہے جو ذہنی اور نفسیاتی طور پر نارمل ہو۔ جبکہ آپ عصمت کو نفسیاتی مریض مانتے ہیں (اور اس سلسلے میں آپ سے میں بھی اتفاق کرتا ہوں)

عصمت کی نفسیات کچھ ایسی ہو گئی تھی (اس کے اسباب و علل پر آپ روشنی ڈال چکے ہیں) کہ افسانہ نویسی ہو یا عملی زندگی ہر شعبے میں وہ CONSPICUOUS بننا چاہتی تھیں اور اپنی اسی خواہش کے زیر اثر کبھی وہ اردو رسم الخط کی مخالفت کرتیں تو کبھی دوستوں کی محفل میں بہ بانگِ دہل یہ اعلان کرتیں۔

"میرا جی چاہتا ہے میں ایک حرام کا بچہ جنوں، لیکن شاید زہر کھا لے گا" ذرا غور کیجئے ایک شادی شدہ عورت کی یہ کیسی الٹ پٹی خواہش تھی۔ ہر نارمل عورت ماں بننا چاہتی ہے، لیکن اس کیلئے ضروری نہیں کہ حرام کا بچہ جنے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ اس کا شوہر بقید حیات ہو! حقیقت تو یہ ہے کہ CONSPICUOUS بننے کی یہ خواہش عصمت کے تحت الشعور میں کچھ اس طرح سرایت کر گئی تھی کہ آخر دم تک اس نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ خود کو نذر آتش کرنے کا فیصلہ بھی اسی نفسیات کا نتیجہ تھا۔

مختصر یہ کہ بہترین نثر نگاری اور منفرد اسلوب کے باوجود نفسیات اور اس سے پیدا کردہ LIMITATIONS کی وجہ سے عصمت کا شمار صف اول کے افسانہ نویسوں میں کرنا مناسب نہیں ہوتا ہے۔

۱۔ آجکل (جنوری ۹۲) میں اوتچندر ناتھ اشک کا مضمون بعنوان "عصمت چغتائی ـــ دوزخی کی باتیں"

Regd. No. MH-B.Y.W. 311 Price: Rs.7

THE 'SHAIR" (MONTHLY) BOMBAY-400 008.

62 Years of Publication ❋ (Publishing Date: 27-28) ❋ Issue No.11-12 1991 ❋ Telephone No. 359804.

Registered with the Registrar of Newspapers at R.N. No. 14482/57.